

تذکرہ عُلماءِ اعظم گڈھ

بقلم

حَبیبُ الرحمٰن اعظمی

استاذ حدیث دارالعُلوم دیوبند

وایڈیٹر ماہنامہ دارالعُلوم دیوبند

ناشر

مرکز دعوۃ وتحقیق دیوبند

تذکرہ علماء اعظم گڈھ

بسم الله الرحمن الرحيم

سلسلہ مطبوعات مرکز دعوت وتحقیق (۱۲)

تذکرۂ علماء اعظم گڈھ

بقلم

حبیب الرحمٰن اعظمی

استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

و

ایڈیٹر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

ناشر

مرکز دعوت وتحقیق دیوبند

(ب)

(ش)

(ص)

(ض)

(ظ)

(ع)

(غ)

(ف)

(ق)

(ک)

(م)

(ی)

(تکملہ)

☆☆☆

فہرست رجال حواشی

❊❊❊

تقریظ

محدثِ جلیل حضرت مولانا الحاج ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی ادام اللہ علاہ (نوراللہ مرقدہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضلع اعظم گڈھ کی سرزمین سے جو نامور علماء پیدا ہوئے اور جنھوں نے علم دین کی بیش بہا خدمات انجام دے کر ایک مذہبی فریضہ ادا کیا اور ساتھ ہی اس سرزمین کا نام بھی اونچا کیا، ان کا ایک مفصل اور مستند تذکرہ لکھنا ہمارے ذمہ ایک قرض تھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن جگدیش پوری ہم سب کی طرف سے شکریہ اور مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے "تذکرہ علماء اعظم گڈھ" لکھ کر ہم سب کو اس قرض سے سبکدوش کر دیا۔

کئی سال پہلے میں نے بھی اس موضوع پر لکھنا شروع کیا تھا، مگر اس کام کو پورا نہیں کر سکا تھا کہ دوسرے کاموں میں الجھ گیا۔ آج تلاش کے بعد بھی وہ مسودہ مجھے نہیں مل سکا، مگر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی یہ تالیف دیکھ کر مجھے اپنے مسودہ کے نہ ملنے کا کچھ زیادہ غم نہیں ہے۔

میں موصوف کے حق میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ اور اس طرح کی خدمتوں کی مزید توفیق بخشے۔

حبیب الرحمٰن الاعظمی

۱۱ر ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ

تقریب

از: مولانا نجم الدین اصلاحی صاحب

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ اما بعد:

تاریخ شاہد ہے کہ ''اسلام ایک ابرِ کرم تھا اور سطحِ خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا؛ لیکن فیض بقدر استعداد پہونچا، جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی اسی قدر زیادہ فیض یاب ہوئی، ہندوستان کی یہ فضائے بسیط بھی اس ابرِ کرم سے محروم نہیں رہی، ہجرت کی پہلی صدی کا خاتمہ تھا کہ اس ابرِ کرم کی چھینٹوں نے اس کے سمندروں کے کناروں اور پہاڑوں کے دامنوں کو سرسبز وشاداب کردیا، چنانچہ ایک صدی کے اندر ہی اندر علم کا ایک ایسا عالم گیر نظام قائم ہوگیا کہ جس کی نظیر دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔

ابتداء میں ہندوستان مختلف قوموں کی بنا پر مختلف حصوں میں منقسم تھا، شاہانِ اسلام کے اقتدار سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہندوستان تقسیم در تقسیم کے خطرناک آئینِ سیاست سے کسی قدر محفوظ ہوگیا؛ لیکن برٹش امپائر نے چونکہ ہندوستان کے اطراف پر اور زیادہ وسعت سے قبضہ کیا، اس لیے بجائے اتحاد ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کے قانونِ غیر فطری کے جراثیم فاسدہ نے نہ جانے کتنے زمانہ تک کے لیے اختلاف وشقاق کی خلیج حائل کردی۔

اصل یہ ہے کہ اگر کوئی قوم بام ترقی پر گامزن ہونا چاہتی ہے تو اس کی اولین منزل نیک کرداری اور صلاحیت قومی ہے، ناتراشیدہ پتھروں سے دیوار چننا دشوار ہے، جب تک ایک ایک پتھر کے تمام پہلو ہموار نہ کردیے جائیں، تاکہ ایک پتھر دوسرے پتھر پر ٹھیک طور پر منطبق ہوجائے، اسی طرح قومیت کی مثال ہے، غرض اتحاد قوم کے لیے لازم ہے کہ پہلے ان کے اخلاق کی اصلاح کی جائے، کیونکہ دنیا کی بنیاد نیکی اور بھلائی پر ہے، دنیا ایک

باغیچہ ہے اس کی باغبانی وہی کرسکتا ہے جو فنِ باغبانی سے واقف ہو اور اپنی صلاحیتِ خداداد سے اس کو آراستہ رکھ سکے، پس اگر انسان میں ذاتی وصف نہ ہو تو اضافی وصف کا نام نہیں آتا۔ البتہ انسان کے وصفِ ذاتی سے خاندان کی عزت بڑھتی ہے اور ایسی حالت میں اس کو خاندانی شوکت وعزت کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بے ہنروں اور بداعمالوں کا خاندانی شوکت پر فخر کرنا کچھ مفید نہیں؛ بلکہ وہ ان کے لیے باعثِ ننگ ہے۔ عربی شاعر کہتا ہے ؎

اِنِ افْتَخَرْتَ بِاٰبَآءٍ مَضَوا سَلَفاً　　قُلْنَا صَدَقْتَ وَلٰكِنْ بِئْسَ مَا وَلَدُوْا

ترجمہ: اگر تو اپنے گذشتہ باپ دادوں پر فخر کرے تو ہم کہیں گے کہ جو کچھ تو کہتا ہے سچ ہے، مگر ان کی اولاد بہت بُری ہے جو خود تو کوئی قابلیت نہیں رکھتی اور اپنے آباء واجداد پر فخر کرتی ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم بتانا چاہتے ہیں کہ تاریخ اور تذکرہ نگاری نام ہے کسی چیز کے تغیرات کا ذکر اس غرض سے کرنا کہ ان سے عبرت حاصل کی جائے اور واقعات گذشتہ اور حالات موجودہ سے ایک منطقی قیاس مرتب کر کے یہ نتیجہ نکالنا کہ آیا حالاتِ موجودہ گذشتہ کے نتائج ہیں یا واقعات گذشتہ حالات موجودہ کے اسباب ہیں، اسی چیز کا نام تذکرہ نگاری ہے۔

اعظم گڈھ کا بانی اور ایک تاریخی غلطی کا ازالہ

اعظم گڈھ کا ضلع گو انگریزی عہد میں پیدا ہوا ہے، مگر اس کا نام ونشان پہلے سے ملتا ہے، مینہہ نگر کے راجہ بکرماجیت کے بڑے لڑکے شاہزادہ اعظم خان نے ۱۶۶۵ء میں اعظم گڈھ کی بنیاد ڈالی۔ گڈھ ہندی لفظ ہے جس کے معنی قلعہ کے ہیں، ہندوستان کے اکثر وہ شہر جن کے نام کا آخری جزء گڈھ ہے ان کی آبادی کا آغاز درحقیقت کسی فوجی آبادی سے ہوا، یعنی کسی زمیندار یا رئیس نے اپنے اور اپنی رعایا کے لیے کوئی گڈھ بنایا اور اس کو اپنے نام کی طرف منسوب کردیا، اعظم گڈھ بھی اسی قسم کا شہر ہے، اس راجہ کا خاندان یہاں اور سیدھاری پر اب بھی موجود ہے۔ وہاں مغلوں کے زمانہ میں سرکاروں کی جو تقسیم تھی وہ

موجودہ انگریزی تقسیم سے بالکل الگ تھی، آئینِ اکبری کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں سرکار جونپور کا رقبہ موجودہ فیض آباد کی سرحد سے لے کر موجودہ غازی پور کے حدود تک پھیلا تھا، جن کو آج کل اضلاع مشرقی کہتے ہیں، سرکار جونپور اس زمانہ میں ۴۱ محال یعنی پرگنوں پر مشتمل تھی، ان قصبوں کے پرگنوں کے نام آئینِ اکبری میں گنائے گئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ پورا ضلع اعظم گڈھ اور موجودہ ضلع بلیا پرگنہ سکندر پور غازی پور کے پرگنے شادی آباد اور بھتری، فیض آباد کے پرگنے چاندی پور، بڑہر، ٹانڈہ اور سرہر پور سب سرکار جونپور میں داخل تھے، یہی سبب ہے کہ ان مقامات کے اکابرو مشاہیر باہر کی دنیا میں جونپوری ہو کر رونما ہوئے، مثلاً شیخ عبدالقدوس شطاری نظام آبادی، میر سیّد علی عاشقاں سرائے میری، ملا محمود ولید پوری صاحب شمس بازغہ اور مولانا غلام نقشبندر حمہم اللہ تعالیٰ۔

انھیں اطراف میں اعظم گڈھ کا مشہور اور مردم خیز قصبہ چریا کوٹ قدیم آبادی ہے، ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں اس کا نام لیا ہے اور اس میں شیوخ اور راجپوتوں کی آبادی بتائی ہے، یہ غازی پور اور اعظم گڈھ کے بیچ میں واقع ہے، عباسی شیوخ جن کو قضا کی خدمت سپرد تھی، یہاں آباد تھے، اسی خاندان سے مولانا قاضی علی اکبر اور ان کے صاحبزادے مولانا عنایت رسول اور مولانا فاروق تھے، آخر الذکر کے مشہور تلامذہ میں مولانا شبلی نعمانی اور ہمارے استاد مولانا حمید الدین فراہیؒ صاحب تفسیر نظام القرآن تھے، بقول سہیل مرحوم

”جو ذرّہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیرّ اعظم ہوتا ہے“

ہمارے اسی ضلع کے مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اور مولانا حبیب الرحمٰن جگدیش پوری ہیں، جن کو اہلِ علم کے احوال و معارف کے قلم بند کرنے کا بڑا ستھرا ذوق اور سلیقہ ہے، اوّل الذکر بزرگ کے تعارف کے لیے کتاب (۱) رجال السند والہند اور (۲) العقد الثمین جیسی اہم تصنیف رہتی دنیا تک کے لیے مستند دستاویز ہے، موصوف کی یادگار رہنے کا فخر رکھتی ہے اور آپ کے رشحاتِ قلم کا ادنیٰ فیض ہے۔

مولانا جگدیش پوری بھی اعظم گڈھ کے نوجوان علماء میں اپنی علمی صلاحیتوں اور بلند پایہ مضامین کے لحاظ سے اپنا ممتاز مقام رکھتے ہیں، چنانچہ مشاہیر ہند پر آپ کے کئی نمبر

معارف جیسے معیاری رسالہ وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ "تذکرۂ علماء اعظم گڈھ" نامی کتاب آپ کی جدوجہد اور کاوش کا ایک کامیاب کارنامہ ہے، اس کتاب سے پہلے علماء اعظم گڈھ کے تذکرے متفرق طور پر جستہ جستہ ملتے ہیں، لیکن کتابی شکل میں میرے علم میں یہ پہلی کتاب ہے جو اپنے مستند ماخذ اور تحقیقی حوالجات کے ساتھ آپ کے سامنے موجود ہے، سیرت اور سوانح نگاری مسلمانوں کا وہ امتیازی وصف رہا ہے کہ آج تمام دنیا اس مصوری پر حیران ہے، جن میں ہزاروں واقعات عبرت پذیری اور نتیجہ رسی کے موجود ہیں، اس کتاب کے دیکھنے سے صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف کو کتنی زحمت برداشت کرنی پڑی اور سفر کر کے کتنے دفاتر دیکھنے پڑے، نیز مخطوطات اور ثقہ لوگوں سے معلوم کرنے اور سننے کے بعد تحقیق وتلاش کو جاری رکھ کر یہ کتاب مرتب کرنا آپ کا اہم کارنامہ ہے۔ مؤلف کی متانت تحریر، سنجیدگی، بیان کی خوبی سے دل خوش ہو جاتا ہے، جو ہر آئینہ مستحق مبارک باد ہے، بہر حال کتاب اپنے ماخذ اور معلومات کے اعتبار سے کامل ہے اور مصنف کی محنت وجانکاہی صفحہ صفحہ سے ظاہر ہے، امید ہے کہ یہ نقش اوّل نقش ثانی میں اور زیادہ نکھر جائے گا۔ انشاء اللہ یہ کتاب اہلِ علم میں مقبول ہوگی اور خصوصاً اعظم گڈھ کے علمی حلقہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ میری دعا ہے اللہ تعالیٰ کتاب کو مقبول اور مؤلف کی خدمات کو قبول فرمائے اور ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

کتاب مذکور تقریباً ۳۵۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اوّل تذکرہ شاہ ابو اسحٰق بھیرویؒ متوفی ۱۲۲۴ھ اور آخری مولانا ولی محمد گھوسویؒ پر ختم ہوتا ہے۔ پچاس سے زائد کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ والسلام

نجم الدّین اصلاحی، راجہ پور سکرور، اعظم گڈھ
یکم شعبان المعظم ۱۳۹۶ھ

تقدیم

(از حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری صاحب، ایڈیٹر ''البلاغ'' بمبئی)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ٥ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ ٥

موجودہ ضلع اعظم گڈھ کا علاقہ قدیم زمانہ میں بنارس اور اجودھیا کے درمیان جنگلوں پر مشتمل تھا، کہا جاتا ہے کہ اس خطہ میں تارک الدنیا سنیاسی اور فقیر اپنے طور پر عبادت وریاضت کرتے تھے اور اس میں ان کے کئی مرکز تھے، بعد میں یہاں کئی قومیں آباد ہوئیں، جس میں ''گھوسی'' قوم کا مرکز علاقہ ''گھوسی'' اور ''چیرو'' قوم کا مسکن نواحِ ''چریا کوٹ'' تھا اور راج بھر قوم کو غلبہ واقتدار حاصل تھا، اس قوم میں چار راجے گذرے ہیں، پورے ضلع میں ان کے آثار اب تک پائے جاتے ہیں، یہ علاقہ چھٹی صدی میں با قاعدہ اسلامی قلمرو میں شامل ہوا، سلطان شہاب الدین غوری اور اس کے غلام قطب الدین ایبک نے اس دیار کو فتح کرکے دہلی سے وابستہ کیا اور اسی زمانہ سے ارباب علم وفن کا مرجع بننے لگا، خاص طور سے آٹھویں صدی میں جب سلطان فیروز شاہ تغلق نے ۷۷۲ھ میں جونپور آباد کیا تو دیار پورب اسلامی علوم اور علمائے اسلام کے حسنات وبرکات کا گلشن سدابہار بن گیا اس کے چند ہی سالوں کے بعد سلاطینِ شرقیہ کا دور آیا اور جونپور یوں دار العلم اور دہلی ثانی بنا کہ یہ پورا علاقہ علمی وروحانی قدروں اور خانوادوں سے معمور ومشحون ہو گیا، سلاطین شرقیہ کے بعد لودھی خاندان آئے اور گئے مگر یہاں کے علما وفضلاء کی محفلیں جمی رہیں، حتی کہ تیموری سلاطین آئے اور شاہجہاں بادشاہ یہاں کی علمی ودینی رونق اور علماء وفضلاء کی کثرت دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھا

''مملکتِ پورب شیراز ماست''

اسی شیراز ہند کا ایک قابلِ قدر حصہ اعظم گڈھ کا خطہ تھا جس کی سرزمین میں اربابِ علم وفضل کے لیے بے پناہ کشش تھی اور بہت سے علمی وروحانی خانوادے یہاں آکر اس طرح اقامت پذیر ہو گئے کہ کئی صدیوں تک ان کے فیوض وبرکات کا سلسلہ جاری رہا، کہنا چاہیے کہ آج اس خطہ میں جو دینی وعلمی رونق نظر آرہی ہے، ان ہی پرانے چراغوں کا صدقہ ہے اوراعظم گڈھ کا علاقہ ان کی روشنی کا امین ہے۔

تغلق دور ہی میں خطۂ اعظم گڈھ کی دینی وعلمی مرکزیت ابھرنے لگی اور اس منزل میں علم کے قافلے اترنے لگے، چنانچہ اسی زمانہ میں ایک بزرگ شیخ خلیل اللہ فاروقی محمد آباد گوہنہ میں فروکش ہوئے جن کے خاندان کو دینی اور دنیوی اعتبار سے بڑا فروغ حاصل ہوا، مولانا غلام فرید محمد آبادی اسی خانوادہ سے تھے۔

مخدوم ظہیر الدین صدیقی متوفی ۷۴۵ھ نے محمد آباد کے قریب سکونت اختیار کی، جو مخدوم ابوالفتح رکن الدین ملتانی اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید وخلیفہ تھے، ان کی اولاد میں کچھ لوگ آج بھی پرگنہ ماہل میں موجود ہیں، نیز اس خاندان کی ایک شاخ بھاگلپور بہار میں موجود ہے۔

چریاکوٹ کے عباسی شیوخ وقضاۃ بھی غالباً اسی زمانہ میں یہاں آئے جن میں مشاہیرِ علم وفن پیدا ہوئے، مولانا عنایت رسول چریاکوٹی اور مولانا محمد فاروق چریاکوٹی اسی معدن علم کے جواہر تھے۔

شرقی دورِ سلطنت میں اس دیار میں متعدد علمی ودینی خاندان آباد ہوئے، چنانچہ شیخ فتح اللہ انصاری دہلوی اودھی نے پرگنہ ماہل کو اپنا مسکن بنایا اور اپنے صاحبزادے بہاء الدین کے نام پر بہاء الدین پور اور ایک گاؤں کندھیارا آباد کیا، ان کی اولاد میں مولانا گلشن علی بن عطاء اللہ انصاری ماہلی اور مولانا حسن علی انصاری ماہلی مشہور عالم گذرے ہیں، شیخ عبدالحکیم صدیقی کو سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے پرگنہ نتھوپور سیاہ میں جاگیر دی، جہاں ان کی اولاد کو دینی اور دنیوی جاہ وجلال حاصل ہوا اور علاقۂ گھوسی میں اسلامی شان وشوکت قائم ہوئی۔

شیخ جمال الدین ہانسوی متوفی ۶۵۵ھ کے فرزند شیخ بہاء الدین سندھالہ سے آکر

محمد آباد گوہنہ میں اقامت پذیر ہوئے، جن کی اولاد میں شیخ ابراہیم دانش مند تھے، اکبر بادشاہ نے ان کی خدمت میں حاضری دی تھی۔

نیز سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے شیخ محمد بن خضر فاروقی دہلوی کے فرزند شیخ مشید کو قریہ ولید پور، سلطان پور بھیرہ اور لہراو غیرہ کی جاگیر دی اور ان کی اولاد نے جونپور سے یہاں آکر قیام کیا، اسی خانوادہ میں مولانا حاجی شاہ ابوالخیر، ملا محمود جونپوری، مخدوم اسماعیل، شاہ ابوالغوث گرم دیوان اور مولانا شاہ ابو اسحٰق محدث لہراوی جیسے اہلِ علم وفضل پیدا ہوئے۔

تیموری دور میں بھی اعظم گڈھ کی سرزمین نے بہت سے مشاہیر علم وفضل کو اپنے دامن میں سمیٹا اور اس کے مختلف علاقوں میں علم ومعرفت کی نئی نئی انجمنیں قائم ہوئیں، چنانچہ ہمایونی دور میں خانوادۂ حامدیہ چشتیہ مانک پور کے مشہور بزرگ راجہ سیّد مبارک شاہ متوفی ۹۶۵ھ نے مبارک پور آباد کر کے اس کو اپنی روحانیت ومشیخت کا یوں مرکز بنایا کہ آخری دور تک ان کی اولاد نے اس دیار کو سرزمین چشت بنائے رکھا، راجہ سیّد خیر اللہ نے خیر آباد اور راجہ سیّد ابراہیم نے ابراہیم پور بسایا، راقم کا خانوادہ بھی راجہ سیّد مبارک کے ہمراہ یہاں آکر آباد ہوا، ان ہی ایام میں قاضی حبیب اللہ عثمانی اصفہانی گھوسی کے قاضی ہوئے اور انھوں نے یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی، ان کی نسل میں کئی ارباب ظاہر وباطن گذرے ہیں، مولانا غلام نقشبند گھوسوی لکھنوی اسی بزم کے ایک چراغ تھے۔

اس دور کے محاسن ومفاخر میں میر علی عاشقاں سرائے میری متوفی ۹۵۰ھ بڑے صاحبِ فیض بزرگ ہیں جو نواح دہلی سوانہ سے آکر یہاں رہ بس گئے، ان ہی کے نام پر سرائے میر (مرتضیٰ پور) ہے، ان کی اولاد میں مدتوں رشد وہدایت کا سلسلہ جاری رہا، ان کے خلفاء میں شیخ مبارک محمدی ماہلی ہیں جن کے والد شیخ خیر الدین پرگنہ ماہل میں آباد ہوئے اور باپ بیٹے کے نام پر مبارک پور اور خیر الدین پور دو بستیاں ہیں، نیز میر صاحب کے خلفاء میں میر سیّد قیام الدین سگڑوی ہیں جن کا فیض یہاں سے گورکھپور تک عام تھا۔

سلسلۂ قلندریہ کا اصل مرکز جون پور تھا، مگر اس ضلع میں اس کو بہت زیادہ فروغ ہوا، قلندر پور اپنے دور میں ''بزمِ قلندراں'' تھا، اس سلسلہ کے بانی شیخ قطب الدین بینادل

قلندر جونپوری کے خلفاء میں شیخ نصیر الدین عباسی سمرقندی تھے، ان کو نیگوں میں جاگیر ملی اور ان کا خاندان یہاں آباد ہوگیا، ان کو شیخ عبداللہ علمبردار کی سے بھی فیض ملا تھا۔

اسی طرح اور کئی علمی وروحانی خاندان، تغلقی، شرقی، لودی اور تیموری ادوار میں اعظم گڈھ کے اطراف وجوانب میں فروکش ہوئے جن کے یقین وایمان کی گرمی اور علم وفضل کی شادابی آج بھی اس کے قریات وقصبات میں علماء اور مدارس کی شکل میں نمایاں ہے اور یہاں کی موجودہ علمی ودینی روشنی ان ہی چراغوں کا فیض ہے۔

خاص اعظم گڈھ کی آبادی پر تقریباً ۳۲۰ سال گذرے ہیں، یہ شہر تیموری دور میں آباد ہوا، صورت یہ ہوئی کہ مینھ نگر کا راجہ ابھی مان سنگھ جہانگیر بادشاہ کے زمانے میں مسلمان ہوا اور اسے دولت خان کے خطاب کے ساتھ اس دیار کی ریاست ملی، دولت پور اسی کے نام پر ہے، اس کی رانی کے نام پر رانی کی سرائے ہے، آگے چل کر اس خاندان میں راجہ اعظم خاں اور راجہ عظمت خاں دو بھائی ہوئے، راجہ اعظم خاں نے ۱۰۷۶ھ (۱۶۶۵ء) میں اعظم گڈھ، راجہ عظمت خاں نے عظمت گڈھ بسایا، اور راجہ مہابت خان پسر راجہ عظمت خاں نے مدھوبن علاقہ گھوسی میں اپنی ریاست قائم کی اور ایک زمانہ تک یہ پورا علاقہ ان ہی نومسلم راجپوت راجوں کے زیر اقتدار رہا، بعد میں ان کو نوابان اودھ سے نبرد آزما ہونا پڑا، اور نوابِ اودھ نے اعظم گڈھ کو چکلہ قرار دے کر یہاں اپنا حاکم رکھا، ایک موقع پر فضل علی خاں والیٔ غازی پور نے اس کے دو پٹوں پر قبضہ کرلیا تھا، اس کے باوجود اعظم گڈھ کی ریاست اور جاگیر نومسلم راجوں کے خاندان میں رہی، ۱۷۷۲ء سے ۱۸۰۱ء تک نومبروں کی کمیٹی اس کا انتظام سنبھالتی رہی، اس دور میں بھی راجہ جہان خاں کی بیوہ رانی زر بھی اپنے بیٹے نادر خاں کو لے کر ریاست پر قابض ودخیل رہی، حتی کہ ۱۰ر نومبر ۱۸۰۱ء (۱۲۱۶ھ) کو نواب سعادت علی خاں اور برطانوی گورنر جنرل لارڈ ولزلی کے مابین ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے چکلہ اعظم گڈھ مع اپنے پرگنہ جات کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ضلع گورکھپور میں شامل کردیا گیا اور ۱۸۲۰ء (۱۲۳۶ھ) میں اس کا مغربی حصہ جونپور میں اور مشرقی حصہ غازیپور میں چلا گیا، اس کے بعد ۱۸ر دسمبر ۱۸۳۲ء (۱۲۴۸ھ) میں اعظم گڈھ مستقل ضلع قرار پایا

اور ۱۸۲۰ء میں اس کے جو علاقے جونپور اور غازی پور میں شامل کیے گئے تھے وہ بھی اس میں آ گئے۔ اس طرح ۷۷۲ھ سے ۱۲۴۸ھ تک تقریباً سواپانچ سو سال تک یہ علاقہ مع ضلع اعظم گڈھ کے مسلم فرمانرواؤں کے زیر تصرف رہا اور یہاں ان کی حکومت رہی، ساتھ ہی علماء، فضلاء اور مشائخ کے وجودِ باجود نے اس خطۂ علم وفن اور سرزمین فکر ونظر کو شیراز ہند بنائے رکھا، جس میں اضلاعِ جونپور، فیض آباد، غازی پور، بنارس، بلیا وغیرہ شامل تھے، مگر اعظم گڈھ کی مٹی میں زرخیزی اور شادابی کی شان جداگانہ تھی، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج اس کے قریات وقصبات میں علم وعلماء کی جو رونق اور کثرت پائی جاتی ہے، اس کی مثال دوسرے پڑوسی اضلاع میں نہیں ملتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دیار کی قدیم علمی ودینی قدریں اسی خطہ میں سمٹ آئی ہیں اور بقول مولانا سعید احمد اکبرآبادی: ''اعظم گڈھ ایک بڑا مردم خیز خطہ ہے، اس جیسے علاقوں کے سوتے خشک ہو گئے یا ہوتے جارہے ہیں، لیکن اس کی زرخیزی نہ صرف قائم ہے؛ بلکہ روز افزوں ہے'' (برہان جون ۱۹۷۶ء)

اور بقول اقبال سہیل ؎

اس خطۂ اعظم گڈھ پر مگر فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرّہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیّر اعظم ہوتا ہے

مگر اس لذیذ تر حکایت کی درازی میں یہ تلخی بھی ہے کہ اس دیار کے علماء وفضلاء کے حالات اور ان کے کارناموں کی سطح پر ہماری غفلت اور بے اعتنائی کا کثیف غبار چھایا ہوا ہے، بعض خاندانوں اور افراد کے تذکرے لکھے بھی گئے تو وہ زمانہ کی نذر ہو گئے یا پھر کبریت احمر کی طرح نادر ونایاب ہیں، اس المیہ کے نتیجے میں دیار پورب کی چھ سو سالہ اسلامی تاریخ کا حسن وجمال ہماری نظروں سے اوجھل ہے، اس لیے ضروری ہے کہ یہاں کے علمی ودینی محاسن ومفاخر کے چہرے سے غبار دور کیا جائے، الحمدللہ کہ عزیز گرامی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب جگدیش پوری نے ''تذکرہ علمائے اعظم گڈھ'' لکھ کر اس قرض کی ایک قسط ادا کر دی، اس فرض کفایہ کی ادائیگی پر وہ اہل علم کی طرف سے بہترین شکریہ کے مستحق ہیں، جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

اس موقع پر مجھے خانقاہ رشیدیہ جونپور کی ایک علمی وروحانی شام یاد آرہی ہے جب میں ۱۳۹۲ھ(۱) میں اس کے کتب خانہ میں بیٹھ کر گنج ارشدی سے راجہ سیّد مبارک بانی مبارکپور کے حالات نقل کررہا تھا اور مولانا موصوف کمال ذوق وشوق سے میری مدد کررہے تھے، ان کے ذوق کو دیکھ کر میں نے کہا کہ آپ بھی دیار پورب کے علماء وفضلاء کے حالات جمع کریں اس کی بڑی ضرورت ہے، اس کے بعد علمائے جونپور پر ان کے کئی تحقیقی مضامین معارف، برہان اور الفرقان وغیرہ میں شائع ہوئے اور اب ان کی یہ کتاب شائع ہورہی ہے۔

فاضل مرتب ومؤلف، جواں سال، جواں ہمت اور علمی وتحقیقی ذوق رکھنے والے ہیں، انھوں نے اس کتاب کے مرتب کرنے میں صرف چند مطبوعہ کتابوں پر اکتفاء نہیں کیا ہے؛ بلکہ اس کے لیے اسفار کرکے قلمی نوادرات سے استفادہ کیا ہے، کتبات پڑھے ہیں، اہل علم سے معلومات حاصل کی ہیں اور کئی ایسے نادرۂ روزگار اہل علم کے حالات معلوم کیے ہیں جن کے نام تک سے اب تک بے خبری تھی۔

بہر حال ایک بات مسلّم ہے کہ ''تذکرہ علمائے اعظم گڈھ'' اپنے موضوع پر بالکل نئی اور نہایت ضروری کتاب ہے، اس کی اشاعت کے بعد دیار پورب کی علمی تاریخ اور علماء کے تذکرہ کی اہمیت وضرورت کا احساس بہت بڑھ جاتا ہے، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی خوش بختی کے لیے یہی کیا کم ہے کہ انھوں نے اپنے اسلاف کا تذکرہ مرتب کرکے مسلمانوں کے محبوب فن سوانح نگاری اور تذکرہ نویسی سے حصہ پایا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبول عام بخشے اور اس سے مسلمانوں کو فائدہ پہونچائے۔

قاضی اطہر مبارک پوری

۲۰؍رجب المرجب ۱۳۹۶ھ

۱۹؍جولائی ۱۹۷۶ء

---

(۱) سہ شنبہ ۱۹؍محرم ۱۳۹۲ھ مطابق ۷؍مارچ ۱۹۷۲ء، بین العصرین۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علماء ومشائخ کے تذکرہ کا دینی پہلو

از: مولانا اعجاز احمد اعظمی

صدر مدرس مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپورہ، اعظم گڈھ

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ وصحبہ أجمیعن، أما بعد:

اللہ کے برگزیدہ پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے چند دعائیں کی تھیں، وہ دعائیں، اللہ رب العزت نے پسند فرمائیں، اور انھیں اپنے آخری صحیفۂ ہدایت میں نقل فرمایا، ان دعاؤں میں سے ایک دعا یہ ہے واجعل لی لسان صدق فی الآخرین (سورۃ الشعراء: ۸۴) اے میرے رب! میرے بعد والوں میں میرا سچا تذکرہ قائم اور جاری رکھیے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی، چنانچہ قبولیت کا بھی تذکرہ قرآن کریم میں ہے، حضرت ابراہیم اور ان کے صاحبزادے حضرت اسحٰق اور پوتے حضرت یعقوب (علیہم السلام) کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”ووھبنا لھم من رحمتنا وجعلنا لھم لسان صدق علیا“ (سورہ مریم: ۵۰) اور ہم نے ان سب کو اپنی رحمت عطا کی اور ہم نے ان سب کا نام نیک اور بلند کیا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا وترکنا علیہ فی الآخرین، سلام علی ابراھیم، کذلك نجزی المحسنین، انہ من عبادنا المومنین (سورۂ والصافات: ۱۰۹ تا ۱۱۱) ہم نے ان

کے متعلق پیچھے آنے والوں میں یہ بات رہنے دی کہ ابراہیم پر سلامتی ہو، ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں، بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا اور اس کی پسندیدگی و مقبولیت، پھر اس کا آخری صحیفۂ ربانی میں نزول، اور پھر قیامت تک اس کی لگاتار تلاوت، اس بات کی دلیل ہے کہ کسی صاحب ایمان کے ذکر خیر کا بعد والوں میں باقی رہنا، اللہ کی ایک نعمت ہے اور اس نعمت کی دعا اللہ کے صالح ترین بندے نے کی ہے، پھر بعد میں آنے والوں کی یہ سعادت ہے کہ ان کے حق میں دعا قبول ہوئی، اور انھیں اگلے نیک اور برگزیدہ بندوں کے ذکر خیر کی توفیق ملی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد میں جو بکثرت انبیاء علیہم السلام ہوئے، ان سب کا ذکر خیر، بعد والوں میں جاری ہوا، اور ان سب کے ساتھ ''علیہ السلام'' کا لاحقہ ضروری ہوا، ذکر خیر کے دستور کی بنیاد خود اللہ تعالیٰ نے ڈالی، چنانچہ ہر کتاب آسمانی میں حق تعالیٰ نے اپنے صالح بندوں کا تذکرہ اہتمام سے کیا ہے، بالخصوص سب کتب سماویہ کی جامع کتاب قرآن کریم میں تو ان صالحین کے تذکرے اتنی کثرت اور تکرار سے ہوئے ہیں کہ منکرین کو یہ وسوسہ ہونے لگا یہ شاید ''اساطیر الاولین'' کا -نعوذ باللہ- مجموعہ ہے، حالانکہ وہ تو کتاب ہدایت ہے، جس میں ان لوگوں کا راستہ واضح کیا گیا ہے، جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ہدایت کی راہ بتانے کا سب سے آسان ذریعہ یہی ہے کہ جو لوگ اس راہ پر چلے ہیں، ان کا اور ان کے طریقۂ عمل کا تعارف کرا دیا جائے اسی لیے قرآن کریم میں صالحین کا تذکرہ بکثرت کیا گیا ہے۔

صالحین کے تذکرۂ حسن اور ''لسان صدق'' کی جو بنیاد حق تعالیٰ نے رکھی، امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے علماء نے اس بنیاد پر تذکروں اور سوانح عمریوں کی بڑی عمارتیں کھڑی کردی ہیں، اس طرح ان کے ذکر خیر کا غیر منقطع اور استعداد محکم سلسلہ قائم ہوگیا۔

ان بزرگوں کا تذکرہ جہاں بجائے خود ایک بڑی نعمت و سعادت ہے، وہیں امت کی

ایک اہم اور بنیادی ضرورت بھی ہے، حق تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب اور اس کی بنیاد پر تعمیر ہونے والے دین اسلام کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے، اس وعدے کی تکمیل کے لیے ضروری تھا، کہ اس کتاب اور اس کی شرح وتفسیر اور تشکیل وتکمیل کے جتنے عناصر واسباب ہیں، ان سب کی حفاظت کی جائے، تا کہ قرآن بھی محفوظ رہے، اور اس کے لانے والے پیغمبر کے حالات، ان کے ارشادات وفرمودات بھی محفوظ رہیں اور ان کے اخلاق وسیرت کے جلوے بھی روشن اور واضح رہیں، اور یہ کہ ان میں کسی طرح کے تغیر وتبدل کو راہ نہ ملے، اس کے لیے اللہ نے ایسے مردان کار تیار کیے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ لفظ یاد رکھا، اور اسے دوسروں تک پہونچایا، انھوں نے آپ کی سیرت کو اپنے اندر جذب کیا، اور بعد والوں کے لیے نمونہ بنے، پھر انھیں رجال کار نے عصراً بعد عصرٍ دین کو اس کی اصل حالت میں تازہ بتازہ باقی رکھنے کا اہتمام کیا۔

یہ حضرات جب پچھلی نسلوں میں دین کے منتقل کرنے کے واسطہ بنے، تو ضروری ہوا کہ ان کی زندگیاں بھی محو وتغیر سے محفوظ رہیں، پس اس امت میں ایک مستقل فن ''علم الرجال'' کا وجود میں آیا، اور لاکھوں انسانوں کی زندگیاں محفوظ ہوگئیں اور ان کا ذکر خیر پچھلوں میں مسلسل باقی رہا۔

امت کے ہر طبقہ نے اپنے پیش رو علماء وصلحاء کے تذکروں کو ضبط کرنے کا اہتمام کیا ہے، اور اس کے لیے مختلف عنوان اختیار کیے ہیں، محدثین نے احادیث رسول کے راویوں کے حالات جمع کیے، تحقیق وتنقید کر کے ان کے مراتب ومدارج کا انضباط کیا، ان کے سنین ولادت ووفات کی تحقیق کی، ان کے حفظ واتقان، ان کی وسعت نظر اور دقت فکر کو بیان کیا، فقہا نے اپنے اساتذہ اور اساطین مذہب کے حالات مرتب کیے، ان کے درجات کا تعین کیا، اور ان کی ذہانت وذکاوت کے واقعات تحریر کیے۔

علماء کی ایک جماعت نے حضرات صحابہ کو موضوع بنا کر ان کے احوال وسوانح مرتب کیے، بعض علماء نے ائمۂ کبار کے حالات مدون کیے، بہتیرے علماء نے خلفاء وملوک کی داستان لکھی، بعض نے مختلف مذاہب ومسالک کے علماء کا عنوان قائم کر کے کتابیں تصنیف

کیں، چنانچہ طبقات حنفیہ، طبقات شافعیہ اور طبقات حنابلہ کے نام سے علماء کا تعارف کرایا، بعض اہل تحقیق نے وفیات کو موضوع بنا کر علماء کی بڑی تعداد کی زندگیاں محفوظ کیں، کسی نے انساب کو عنوان بنا کر داد تحقیق دی، موضوعات کی یہ ایک لمبی فہرست ہے، جن کے تحت ہزارہا ہزار بزرگان پیشیں کا ذکر خیر کیا گیا ہے۔

علماء کی ایک جماعت نے مختلف دیار وامصار کے اہل علم واصحاب فضل کو موضوع بنا کر ان کے حالات کی تحقیق کی، مثلاً علامہ خطیب بغدادی المتوفی ۴۶۳ھ نے ۱۴؍جلدوں میں تاریخ بغداد لکھی، پھر دوسرے عالم علامہ شمس الدین ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ نے ۸؍جلدوں میں اس کا ذیل لکھا(۱)، علامہ ابن عساکر المتوفی ۵۷۱ھ نے ۸؍جلدوں میں تاریخ دمشق لکھی، اس کے علاوہ علماء نے تاریخ مکہ، تاریخ مدینہ، تاریخ اصفہان وغیرہ مختلف ناموں سے ان مقامات کے علماء کا تذکرہ کیا، علامہ سیوطی نے تاریخ قاہرہ لکھی۔

تذکرہ، سوانح، تراجم اور اسماء الرجال کا یہ عظیم الشان کتب خانہ زیادہ تر بلکہ ایک عرصہ تک تمام تر عربی زبان میں رہا، جو قرآن وحدیث کی زبان ہے، عربی کے بعد فارسی زبان دین کی دولت سے مالا مال ہوئی، پھر جب ہندوستان میں اردو زبان کا وجود ہوا، اور علمی دنیا میں اس کی نشوونما ہوئی، اور علماء نے اس پر توجہ دی، تو علوم دینیہ کا بیشتر سرمایہ اردو زبان میں آیا، ان علوم کی فہرست میں، جنھوں نے اردو زبان میں نمایاں مقام حاصل کیا، تذکرہ وسوانح کا علم بھی ہے، اس فن میں اصحاب علم نے خوب خوب داد تحقیق دی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ پر ایک کتب خانہ کا کتب خانہ تیار کر دیا، آپ کے علاوہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے، صحابہ اور تابعین کے، محدثین وائمہ کے فقہاء وعلماء کے احوال وسوانح کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، جسے پچھلے طبقہ کے اہل علم نے اپنے پیشرو علماء واسلاف کے ذکر خیر کی سنت وسعادت کا سلسلہ جاری کیا اور اب تک وہ سلسلہ قائم ہے۔

اردو زبان میں بھی اہل تحقیق نے مختلف عنوانوں سے اسلاف کے تذکرے لکھے ہیں،

---

(۱) تاریخ بغداد کا ذیل حافظ ابوعبداللہ محمد بن سعید الدبیثی المتوفی ۶۳۷ھ نے لکھا تھا۔ علامہ ذہبی نے اس کا اختصار کیا۔ وہی اختصار تاریخ بغداد کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

طبقات کے لحاظ سے بھی، مختلف مکاتب فکر کے لحاظ سے بھی، مقامات اور جگہوں کے لحاظ سے بھی ولادت اور وفات کے اعتبار سے بھی علماء نے ان بزرگوں کے احوال جمع کیے ہیں۔

اس سلسلے کی ایک زریں لڑی ہمارے مخدوم فاضل گرامی مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کی مرتب کردہ کتاب ''تذکرۂ علماء اعظم گڈھ'' ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا، جس میں مولانا موصوف نے بڑی تحقیق وتدقیق کے ساتھ نہایت جانفشانی وتلاش وجستجو سے ضلع اعظم گڈھ کے تقریباً دوسو علماء کے حالات لکھے تھے۔ اس وقت سے اب تک کے وقفہ میں اور بھی بہت سے علماء دنیا کا سفر پورا کرکے منزل آخرت میں کمر کھول چکے ہیں۔ مولانا نے اس نئے ایڈیشن میں مزید محنت کرکے تقریباً پچاس علماء کے حالات کا اضافہ کیا۔

لیکن جغرافیائی اعتبار سے ضلع اعظم گڈھ ۱۹۸۸ء میں دو ٹکڑوں میں منقسم ہوکر چھوٹا ہوگیا، بڑے بڑے بہت سے علماء ضلع مئو کے حصہ میں آگئے، اور تذکرے کا دامن علماء اعظم گڈھ تک ہی محدود ہے، اس لیے انھیں دوسری کتاب یا دوسرے مؤرخ کے لیے چھوڑنا پڑا۔

بہرحال یہ ایک مستند علمی دستاویز ہے، جو اپنے نقش اوّل پر کیفیت اور کمیت ہر اعتبار سے فائق ہے۔ بزرگوں کا تذکرہ باعث سعادت ہے اور دعاء ابراہیمی کی قبولیت کا پیکر جمیل! اللہ تعالیٰ اس تذکرۂ حسن اور ذکر خیر کو قبول فرمائے، اور نافع بنائے، آمین۔

☆ ☆ ☆

لوحِ حسین بہ تواریخ

۱۳۹۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الماجد المتین

۱۳۹۶ھ

نحمد اللہ السمیع الحلیم و نصلی علی رسولہ الکریم

۱۳۹۶ھ

تذکرۂ ارباب ہمت

۱۹۷۶ء

جامع کمال علمائے اعظم گڈھ
۱۳۹۶ھ

پاکیزہ فکر علمائے ضلع
۱۳۹۶ھ

مجمعِ کمال علماء عظام
۱۳۹۶ھ

تذکرہ علمائے عقدہ کشا
۱۹۷۶ء

تذکرۂ افعال حمیدہ علماء کرام
۱۹۷۶ء

نقشِ جاوداں فضیلت علماء
۱۹۷۶ء

تذکرۂ ہادیاں

۱۳۹۶ھ

نوائے قلم محمد عثمان معروفی

۱۳۹۶ھ

جوان فاضل حبیب رحمٰن کا قوم وملت پہ ہے یہ احساں!
دکھادیا ہے ضلع کے علماء دین کا اسوۂ نمایاں
ہے کار علماء مفید عالم بہ سال تالیف کہہ دو عثماں
۱۹۷۶ء

کیا مرتب ہے ذکر اہل کمال اور ذکر اہل عرفاں
خلف کے ہوں گے نمونہ حق سلف کے یہ کارہائے تاباں
یہ "تذکرہ ہادیاں" ہے ملت کے واسطے اسوۂ درخشاں
۱۳۹۶ھ

حیطۂ قلم محمد عثمان اعظمی

۱۹۷۶ء

بسم اللہ العدل الغنی الرحمٰن الرحیم
۲۰۱۲ء

نطق تاریخ طبع ثانی

۲۰۱۲ء

ازفخر جگدیش پور
۲۰۱۲ء

ناصرِ علم حبیب الرحمٰن الاعظمی
۲۰۱۲ء

ساکن دارامن جگدیش پوراعظم گڈھ
۲۰۱۲ء

حق طلب مدرس حدیث دارالعلوم دیوبند
۱۴۳۳ھ

قال الواحد السمیع لقد کان فی قصصهم عبرة لاولی الالباب
۱۴۳۳ھ

قال النبی الولی البدیع اذکروا محاسن موتاکم
۲۰۱۲ء

تذکرہ محکم = امن خلق علمائے اعظم گڈھ
۱۴۳۳ ۲۰۱۲ء

تالیف محسن مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی زادمجدہ
۱۴۳۳ھ

تذکرۂ حق = سعید زماں علمائے اعظم گڈھ
۱۴۳۳ ۱۴۳۳ھ

ازامیر محفل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی زادمجدہ
۲۰۱۲ء

کان صفا علمائے اعظم گڈھ
۱۴۳۳ھ

احوال علمائے اعظم گڈھ
۱۴۳۳ھ

بابرکت علمائے اعظم گڈھ
۱۴۳۳ھ

سال تالیف کہہ دے طاہر ہے یہ ''تذکرہ راست گو'' ملت کے واسطے اسوہ کامل
۱۴۳۳ھ

ہے کار علماء مفید عالم یہ
۲۰۱۲ء

دلیل محمد طاہر الاعظمی = ساکن زمین ہدی منجیرپٹی اعظم گڈھ = فاضل ناجی دارالعلوم دیوبند
۱۴۳۳ھ ۲۰۱۲ء ۱۴۳۳ھ

==============

پیش لفظ

(طبع اوّل)

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ.

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرنے دفتر کو
ورق جب اس کا اڑا لے گئی ہوا اک ایک

اتر پردیش کے اضلاع میں ضلع اعظم گڈھ اپنی زرخیزی اور شادابی میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے، اس خطۂ ارض سے ایسے ایسے باکمال افراد ابھرے، جن کے کارناموں پر ملت اسلامیہ ہمیشہ فخر کرتی رہے گی، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ ضلع جس قدر مردم خیز ہے اسی قدر مسلمان مؤرخوں اور تذکرہ نویسوں نے اس سے غفلت اور بے اعتنائی برتی ہے، اسی لیے یہاں کی علمی ودینی تاریخ پر ناواقفیت کا ایک دبیز پردہ پڑا ہوا ہے اور یہاں کی بہت سی ایسی شخصیتیں جو اپنے علمی وروحانی کمالات کی بنا پر اس کی مستحق تھیں کہ ان پر مستقل کتابیں تالیف کی جاتیں، اس طرح گوشۂ گمنامی میں کھو گئیں کہ ان کے ناموں کے سوا آج ان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔

اس عبرت ناک اور تعجب خیز حقیقت کا احساس مجھے ایک عرصہ سے تھا، لیکن اپنی کم مائگی اور وسائل وذرائع سے محرومی کی وجہ سے خود کچھ کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی، وقت گذرتا رہا اور میں اس متاع گراں بہا کی اضاعت پر کفِ افسوس ملتا رہا کہ ضلع کے مشہور صاحب قلم عالم مولانا قاضی اطہر مبارکپوری سے اتفاقاً ملاقات ہوگئی، میں نے اپنی دلی کیفیات کا اظہار مولانا سے کیا، سنتے ہی فرمایا کہ ''ایک عرصے سے مجھے بھی اس بات کا شدت سے

احساس ہے اور میں نے ایک زمانہ میں اس سلسلے کی معلومات فراہم کرنا شروع بھی کر دیا تھا، مگر ہجوم کار کی وجہ سے وہ کام آگے نہ بڑھ سکا اور نہ زمانہ قریب میں ادھر متوجہ ہونے کی توقع ہی ہے، اس لیے کیا اچھا ہوتا کہ تم ہی اس کام کو کر ڈالتے، میرے پاس جو کچھ مواد ہیں وہ تمھیں دے دوں گا۔"

یہ حکم کچھ اتنا مؤکد تھا کہ اپنی نا اہلی کے احساس کے باوجود انکار نہ کر سکا اور اللہ کا نام لے کر کام کی ابتداء کردی۔ آغاز میں کام کو جتنا آسان سمجھا تھا معاملہ اس کے بالکل برعکس نکلا اور اندازہ ہوا کہ محض کتابوں کی ورق گردانی سے اس سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں، اس لیے شب و روز کی قید سے آزاد ہو کر آبادیوں اور ویرانوں کا چکر لگانا شروع کیا، بزرگوں کے مزارات کو قریب سے جا کر دیکھا، کتبات اور قلمی دستاویزات کی چھان بین کی، ثقہ اور قابلِ اعتماد لوگوں سے مل کر معلومات حاصل کی اور دور و نزدیک جہاں سے مطلب کی بات ملنے کی توقع ہوئی وہاں جانے سے دریغ نہیں کیا، اس طرح مسلسل تین سال کی جدوجہد کے بعد جو معلومات فراہم ہو سکیں اسے بغیر کسی خیانت یا دانستہ تقصیر کے ایک غیر جانبدار تذکرہ نویس کی حیثیت سے مآخذ و مصادر کے حوالہ کے ساتھ جمع کر دیا، ان تمام تر تلاش و جستجو کے بعد بھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تذکرہ جامع اور مکمل ہے اور اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں؛ البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مشاہیر کی حد تک۔ تذکرہ مکمل ہے۔

الحمدللہ کتاب "تذکرہ علماء اعظم گڈھ" اپنے قدر دانوں کے ہاتھوں میں پہونچ رہی ہے، اس موقع پر میں اپنے ان تمام بزرگوں، دوستوں اور قدر دانوں کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے کتاب کی تالیف وطباعت کے سلسلہ میں کسی قسم کا بھی تعاون کیا ہے، بالخصوص جناب مولانا عبدالمتین صاحب قاسمی خلفِ رشید حضرت مولانا عبدالجبار صاحب مرحوم کا، مولانا محترم نے طباعت کے سلسلے کی تمام دشواریوں کو اپنے ذرائع سے حل فرما کر اس اہم مرحلہ کو آسان کر دیا۔ ساتھ ہی حضرت مولانا نجم الدین اصلاحی اور مولانا قاضی اطہر مبارک پوری مدظلہما بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان دونوں بزرگوں نے "تذکرہ" کے لیے گراں قدر اور وقیع مقدمات لکھ کر حوصلہ افزائی فرمائی۔

استاذی حضرت مولانا عبدالحق صاحب جگدیش پوری، استاذی حضرت مولانا افتخار احمد صاحب جگدیش پوری، بزرگ عالی قدر حضرت مولانا محمد ادریس صاحب سرائے میری اور رفیقِ محترم مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی بنارسی کا بھی صمیم قلب سے مشکور ہوں کہ اوّل الذکر ہر دو بزرگوں نے تراجم کی فراہمی کے سلسلے میں اور آخر الذکر کرم فرماؤں نے آغاز سے لے کر انجام تک جمع وتالیف، کتابت اور طباعت ہر کام میں بڑی فراخ حوصلگی کے ساتھ ہر طرح کی معاونت کی، اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو جزائے خیر دے۔

آخر میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس ''تذکرہ'' میں انھیں بزرگوں کو شامل کیا گیا ہے، جو دنیا سے جا چکے ہیں اور زمرۂ اسلاف میں شامل ہو کر تاریخ کا عنوان بن گئے ہیں، پھر ان میں ان حضرات کو منتخب کیا گیا ہے جن کے علمی ودینی فیوض وبرکات سے امّت کو فائدہ پہونچا ہے، ممکن ہے اس انتخاب میں مجھ سے کچھ تقصیر بھی ہوئی ہو؛ لیکن یہ تقصیر دانستہ نہیں ہے؛ بلکہ اس کا سبب عدم علم ہوگا، کیونکہ مجھے اس امر کے اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ اس وقیع اور وسیع کام کے لیے جو وسائل وذرائع درکار تھے مجھے ان کا عشرِ عشیر بھی حاصل نہ ہو سکا، اس لیے اس سلسلہ میں مجھے معذور سمجھا جائے۔ ع

والعذر عند کرام الناس مقبولٗ

حبیب الرحمٰن قاسمی اعظمی متوطن جگدیش پور ضلع اعظم گڈھ

(مدرس جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس)

۱۵/ذی قعدہ ۱۳۷۶ہجری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ طبع ثانی

تاریخ نویسی اور تذکرہ نگاری مسلمانوں کا محبوب و مخصوص فن ہے، جس کے ذریعہ انھوں نے سلف کے اسلامی و دینی کارناموں اور علمی و فنی ورثہ کو خلف تک پہنچایا ہے، علماء اسلام کی اس فن کی تصانیف آج مہذب و متمدن دنیا کے کتب خانوں کے لیے باعث زینت و سرمایۂ افتخار ہیں، اسی فن سے اہل اسلام کی باکمال شخصیات کا نام روشن اور سربلند ہے، آگے چل کر اس میں بڑی وسعت ہوئی اور اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا، اور اہل قلم علماء نے اسلامی شہروں، اور قصبات وقریات اور خاندانوں تک کے حالات قلمبند کیے، خود ہمارے ملک ہندوستان میں مآثر الکرام تذکرہ علمائے بلگرام، سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، آثار الاول فی تراجم علمائے فرنگی، تجلی نور تذکرہ مشاہیر جون پور، وغیرہ صدہا کتابیں لکھی گئیں، اس سلسلے کی تفصیلی معلومات کے لیے مشہور مؤرخ مولانا عبدالحئی حسنی رائے بریلوی کی کتاب ''الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند'' کا مطالعہ مفید ہوگا۔

مشہور امام حدیث حافظ ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ معروف بہ حاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵ھ نے اپنی کتاب ''تاریخ نیشاپور'' کی تصنیف کے بعد ایک موقع پر اپنے تلمیذ حافظ خلیل بن عبداللہ کو مخاطب کر کے کہا:

''اعلم بان خراسان وماوراء النهر لكل بلدة تاريخ صنّفه عالم منها، ووجدت نيسابور مع كثرة العلماء بها لم يصنفوا فيه شيئاً، فدعا لي الى ان صنفت تاريخ النسيابوريين، فتأملته ولم يسبق الى ذلك احدٌ'' (سیر اعلام النبلاء ج ۱۷ ص ۱۷۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۰۴۱، از امام ذہبی)

دیکھو خراسان اور ماوراء النہر کے ہر شہر کی وہاں کے کسی عالم نے تاریخ تصنیف کی ہے، اور نیشا پور میں علماء کی کثرت کے باوجود میں نے پایا کہ یہاں کی کسی پیش رو عالم نے کوئی تاریخ نہیں لکھی، اسی بات نے مجھے آمادہ کیا تو میں نے نیشا پور کی تاریخ مرتب کی (حافظ خلیل کہتے ہیں کہ) میں نے غور کیا تو واقعی ان سے پہلے کسی نے یہاں کی تاریخ نہیں لکھی تھی۔

غور کیجیے امام حاکمؒ نے اپنے شہر نیشا پور کا جو حال پایا تھا، کیا اعظم گڈھ کے ساتھ یہی تاریخ نہیں دہرائی گئی، پھر جس داعیہ نے انھیں اپنے مسقط رأس نیشا پور کی تاریخ لکھنے پر آمادہ کیا، یقین جانیے اپنے ہم وطن بزرگوں کا نام روشن کرنے کا وہی جذبہ میرے اندر بھی ابھرا، مگر احوال وظروف میں یہ تفاوت کی وہاں علم وتجربہ کا ایک بیکراں خزانہ ان کے ہم رکاب تھا، اور یہاں اپنی بے مائیگی اور تہی دامنی کا احساس سدراہ بنا ہوا تھا، پھر بھی اپنے بزرگوں بالخصوص مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کی ترغیب وتحریص، بے لوث ہمت افزائیوں اور اخلاص سے معمور دعاؤں کے سہارے بغیر کسی ہم سفر اور نقشِ قدم کی رفاقت ورہنمائی کے اس لق ودق بیابان میں دیوانہ وار میرے قدم آگے بڑھتے گئے، اور دوڈھائی سال کی بادیہ پیمائیوں اور شب بیداریوں کے نتیجہ میں اپنے اسلاف اور بزرگوں کی حیات، خدمات اور کارناموں پر مشتمل ایک مجموعہ وجود میں آ گیا، فالحمد للہ علی ذالک۔

آگے کا مرحلہ اس کے چھپنے کا تھا، جس کی خدائے کارساز نے یہ صورت پیدا کر دی کہ "جامعہ اسلامیہ بنارس" (جہاں یہ خاکسار مدرس تھا) کے ذمہ دار اس کی طباعت پر بایں شرط راضی ہو گئے کہ اس پر جس قدر رقم خرچ ہوگی بعد میں تمہاری تنخواہ سے بالاقساط وضع کر لی جائے گی، اس طرح تذکرہ علماء اعظم گڈھ ۱۳۹۶ھ م ۱۹۷۶ء میں چھپ کر اپنے قدردانوں کے ہاتھوں میں پہنچ گیا، اور توقع سے کہیں زیادہ اس کی پذیرائی ہوئی، معارف اعظم گڈھ، برہان دہلی، البلاغ بمبئی، الداعی عربی دیوبند وغیرہ ملک کے مؤقر مجلّات وجرائد نے اس پر گرانقدر تبصرے لکھے، جامعہ ملیہ دہلی سے ڈاکٹر عبد اللطیف اعظمی مرحوم نے تہنیت نامہ ارسال کیا اور کتاب کے بارے میں نہایت تحسینی کلمات تحریر کیے، ساتھ ہی بندہ کی عمر کے متعلق بھی دریافت کیا کہ اس وقت تمہارا سن کیا ہے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی نے مسلم یونیورسٹی

علی گڈھ سے چار صفحات پر مشتمل مکتوب بھیجا، اور بڑے والہانہ انداز میں اس پر داد تحسین دی، اور از راہ نوازش ملاقات کی خواہش کا بھی اظہار کیا، مزید براں تراجم و تذکرے سے متعلق بعض مفید اور اہم مشورے سے بھی نوازا، جن کو اس جدید ایڈیشن میں حتی الوسع ملحوظ رکھا گیا ہے، معارف میں تبصرہ پڑھ کر پاکستان سے مشہور صاحب قلم پروفیسر محمد ایوب قادری نے بذریعہ ڈاک کتاب طلب کی، اور دستیاب ہوجانے پر بذریعہ مراسلہ اس کے بارے میں بڑی وقیع اور اچھی رائے کا اظہار کیا، اور مؤلف کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔

تذکرہ علماء اعظم گڈھ کو شائع ہوئے چھ سات مہینے ہی گزرے تھے کہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ کا مکتوب گرامی موصول ہوا، جس میں انھوں نے بندہ کو یہ خوش خبری دی تھی کہ بحمد اللہ تمہاری کتاب کو ماخذ کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، فلاں فلاں اہل قلم و تحقیق نے اپنے مضامین میں اس کا حوالہ دیا ہے، افسوس کہ یہ سارے وثیقے خطوط محفوظ نہ رکھنے کی میری عادت بد کی نظر ہو گئے۔

تذکرہ اپنے چھپنے کے چند سال بعد ہی ختم ہوگیا، اسی وقت سے دوسرے ایڈیشن کا تقاضا بھی شروع ہوگیا، اور جوں جوں وقت گذرتا گیا یہ تقاضا بڑھتا ہی رہا، بالآخر ۳۶-۳۷ سالوں کے بعد قضا وقدر کے فیصلہ کے مطابق اب یہ نقش ثانی اپنے قدردانوں کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے، اس میں ۶۰ سے زاید علماء و مشائخ کے حالات و خدمات کا اضافہ ہے، نیز بعض مذکور علماء کے تذکرے میں بھی کچھ باتیں زیادہ کی گئی ہیں، علاوہ ازیں تقریباً ۲۴ صفحات کا مقدمہ بعنوان ''خطۂ اعظم گڈھ کی مختصر تاریخ'' کا بھی اضافہ ہے، بہر حال مقدور بھر کتاب کو مفید سے مفید تر بنانے کی اپنی جیسی کوشش سے دریغ نہیں کیا گیا ہے، اس میں مؤلف کہاں تک کامیاب ہے اس کا فیصلہ آپ کی فکر ونظر کے حوالے ہے، ''وما توفیقی لا باللہ''

اس موقع پر اس امر واقعی کا اظہار ضروری ہے کہ برادر معظم مولانا محمد مستقیم اعظمی فاضل دیوبند صدر جمعیۃ علماء صوبہ مہاراشٹر زید مجدہ کا اگر دست تعاون ہماری یاوری نہ کرتا تو یقین جانیے کہ کتاب کی اشاعت ہمارے بس میں نہیں تھی، انھیں کی عالی ہمتی اور خیر کوشی کی

بدولت ہم اس خدمت کے لائق ہوئے، مالکِ جود وعطا برادر عالی قدر کو علم وعلماء کی جانب سے جزائے خیر دے، اور اپنے دار ودیار اور بزرگوں کے نام وکام کو روشن کرنے کی مزید سعادت سے بہرہ ور کرے۔

نیز ہمارے وہ احباب وکرم فرما جنھوں نے کتاب کی تالیف وطباعت کے سلسلے میں کسی نوع کی اعانت کی ہے یہ سب ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں، خصوصاً:

صاحب علم وقلم، بافیض عالم دین مولانا اعجاز احمد اعظمی زیدت حسناتہم جنھوں نے تذکرہ وتاریخ سے متعلق ایک گرانقدر مضمون تحریر فرما کر خاکسار کی عزت افزائی کی۔

عزیز محترم مولوی فضل الرحمٰن اصلاحی اسکالر دارالمصنفین اعظم گڈھ

عزیز مکرم مولوی مفتی محمد صادق قاسمی مبارک پوری

ان دونوں عزیزوں نے تذکرہ کے مواد کی فراہمی میں بڑے ذوق وشوق اور دلچسپی کے ساتھ ہمارا ہاتھ بٹایا۔

مولانا محمد اشفاق قاسمی مہتمم جامعہ شرعیہ فیض العلوم سرائے میر اعظم گڈھ

مولانا عبدالرشید سلطان پوری ناظم تعلیمات مدرسہ بیت العلوم سرائے میر اعظم گڈھ

مولانا نعیم الدین اصلاحی استاذ تفسیر وادب جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڈھ

رفیق محترم مولانا حماد الاعظمی فاضل دیوبند ناظم محاسبی جمعیۃ علماء ہند

ان کرم فرما دوستوں میں اوّل الذکر چار نے بعض تراجم وتذکرے کے حصول میں مدد بہم پہنچائی اور آخر الذکر نے طباعت سے متعلق ذمہ داریوں کو اپنے سر لے کر ہمارے کام کو آسان کر دیا۔ میں اپنے ان سب کرم فرماؤں کے لیے دعا کرتا ہوں کہ رب کریم ہم سب کو اپنی مرضیات سے ہمکنار فرمائے اور مزید کار خیر کی توفیق بخشے۔

ایں دعا از من، واز جملہ جہاں آمین باد

حبیب الرحمٰن اعظمی

دوشنبہ ۱۸؍ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ

۱۲؍ مارچ ۲۰۱۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطۂ اعظم گڈھ کی مختصر تاریخ

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی. امابعد:

شیراز ہند، دیار پورب جس کا ایک حصہ ''اعظم گڈھ'' بھی ہے، قدیم تاریخ کے مطابق اس علاقہ میں آبادیاں کم جنگل زیادہ تھے، ان جنگلوں میں تارک دنیا سادھو، سنتوں نے ریاضت اور تپسیا کرنے کی غرض سے اپنے مٹھ اور آشرم بنارکھے تھے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ موضع ''دُرباشا'' میں (جو قصبہ پھولپور سے شمال مشرق تین چار میل کے فاصلے پر واقع ہے اسی جگہ مجھوئی ندی دریائے ٹونس میں آکر ملی ہے) رشی درباشا جی کا مٹھ تھا، نظام آباد کے قریب موضع غوث پور میں ''ٹونس'' اور کنور ندی کے سنگم پر ''دتا ترے'' رشی کی کٹیا بتائی جاتی ہے اور موضع مظفر پور کے قریب ''سلنی'' ندی اور ٹونس کے سنگم پر ''چندرمان'' رشی کا آشرم ہے، ان کے علاوہ ''محمد آباد گوہنہ'' سے متصل دریائے ٹونس سے جانب شمال ''دیولاس'' گاؤں میں دیول جھوسی کا آشرم مشہور ہے، ان سب مقامات پر آج بھی ایک متعینہ تاریخ پر میلہ لگتا ہے اور ہندو عقیدہ کے مطابق پاپ سے پُوتر اور گناہوں سے پاک ہونے کے لیے اشنان (غسل) کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

قدیم تاریخ کے مطابق یہ پورا علاقہ دو راجیوں کاشی (بنارس) اور کوشل (اجودھیا) میں منقسم تھا، جن کی سرحد دریائے ٹونس تھی، اس کے شمال (اتر) کا حصہ کوشل کے ماتحت اور جنوبی (دکھنی) علاقہ کاشی کے زیر حکومت تھا، کوشل کا مرکزی مقام دیولاس تھا۔

اس سرزمین پر آفتاب اسلام کی ضیا پاشی کب سے ہوئی، اور دین وایمان کا نور کس

زمانہ میں پھیلا، اس کی حتمی تعیین تو مشکل ہے، البتہ تاریخ کی روشنی میں وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ''سلطان محمود غزنوی'' کی مسلسل فتوحات کے عہد میں یہ علاقہ اسلام اور مسلمانوں سے کسی قدر آشنا ہو گیا تھا، اس کے بعد سرخیل مجاہدان ''سالار مسعود غازی علوی'' (ولادت ۴۰۵ھ-شہادت ۴۲۴ھ) اور ان کے رفقاء کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے ذریعہ اس خطۂ ارض میں اسلام اور مسلمانوں کا شہرہ ہوا، حضرت سالار مسعود غازی نے دہلی، غازی آباد وغیرہ مقامات میں فتح ونصرت کا پرچم نصب کرنے کے بعد موضع ''ستِرکھ'' بارہ بنکی کو مرکز بنا کر ''قنوج، کٹرا مانک پور، بنارس وغیرہ میں کلمۂ توحید کا آوازہ بلند کیا، اور ۴۲۰ھ کے حدود میں اطراف وجوانب کی ہر بڑی آبادی میں مہمات روانہ کیں، شیخ عبدالرحمٰن دھنیتی چشتی مرأۃ الاسرار میں لکھتے ہیں:

''وبعد ازاں مَلک افضل را با اقرباء او بطرف بنارس ونواحی آں رخصت نمود، آستانہ او با دیگر شہداء آنجا شہرت دارد، وبعد ازاں مَلک عمر، وملک طغرل را با جماعت ایشاں بطرف پرگنات بیسواڑہ تعین کرد، دراں نواحی تردد نمایاں کردہ بشرف شہادت فائض گشتند... در ہر شہرے ودر ہر قصبہ مَلک، وبہر دیہے مردم اہل صلاح وصاحب شجاعت وکارداں جا بجا نصب نمود، چنانچہ دریں ملک ہر جا رسیدم اثرے از اصحاب الشہدا، یافتہ ام وہمہ جا زیارت گاہ خلق است''

(سالار مسعود غازی نے) اس کے بعد مَلک افضل کو ان کے آدمیوں کے ہمراہ بنارس اور اس کے اطراف میں بھیجا، اُن کا مزار دیگر شہداء کے مزاروں کے ساتھ بنارس میں مشہور ہے، اس کے بعد ملک عمر اور ملک طغرل کو ان کی جماعت کے ساتھ بیسواڑہ (دریائے گنگا ودریائے گھاگھرا کا درمیانی علاقہ) کے پرگنوں کی سمت متعین کیا، یہ مجاہدین اس اطراف میں مساعی جمیلہ کر کے شہادت سے بہرور ہوئے، (یوں ہی) ہر شہر، ہر قصبہ میں مَلِک کو اور ہر دیہات میں دیندار بہادروں وتجربہ کاروں کو مقرر کیا، چنانچہ میں اس خطّہ میں جہاں جہاں گیا، وہاں مجھے ان شہیدوں کے نشانات ملے، ہر جگہ ان کی زیارت گاہیں ہیں۔

شاہ ابوالحسن قطبی مانک پوری وضاحت کرتے ہیں کہ:

''کسی تاریخ میں سوائے لڑائی کٹڑا مانک پور کے اور کوئی لڑائی سید مسعود کی درج نہیں ہے، لیکن اکثر قبریں گنج شہیداں دیہات وقصبات متعلقہ اضلاع رائے بریلی وسلطان پور، وفیض آباد، وپرتاپ گڈھ، واعظم گڈھ، وجون پور، وبنارس، وغازی پور میں برابر پائی جاتی ہیں، اور جہاں جہاں قبریں ہیں باوجود تمادیٔ ایام کے عام طور پر بلا کسی اختلاف کے یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں معرکۂ مجاہدانہ غازی میاں ہوا ہے، اور یہ ان ہی کے ساتھی کی قبریں ہیں... (لہٰذا) ناظرین کتاب کو خیال رہے کہ ممالک مغربی وشمالی اودھ میں جہاں مقابر شہیدانِ ہمراہیان غازی میاں کہا جائے اسے باور کرنے میں تامل نہ کیا جائے۔'' (آئینہ اودھ ص ۴۷ مطبوعہ کانپور ۱۳۰۳ھ)

اسی مہم کے دوران سالار مسعود غازی کے رفقاء اعظم گڈھ کے علاقے میں بھی آئے تھے، اور دریائے گومتی وگھاگھرا کے درمیانی علاقے میں اپنی سرگرمیاں انجام دی تھیں، چنانچہ ان کا ایک قافلہ ''چندوک گھاٹ'' پر دریائے گومتی عبور کرکے ''دیوگاؤں'' آیا، یہاں جو غازی شہادت سے ہم کنار ہوئے ان کے مزارات قصبہ دیوگاؤں میں گوشت مارکیٹ کے جوار میں ایک حظیرہ میں اب تک موجود ہیں، شرکاء قافلہ میں سے بقیہ لال گنج ہوتے ہوئے محمد پور اور اس کے اطراف میں پہنچے یہاں بھی سڑک کے کنارے ان کی قبریں ہیں، یہاں سے ان کی ایک جماعت نظام آباد کے سمت آئی، چنانچہ نظام آباد میں ان کے آثار ماضی قریب تک موجود تھے اور باقی حصہ موجودہ شہر اعظم گڈھ کے اطراف میں گیا، پھر یہاں سے ان کی ایک جماعت شاہ گڑھ پہنچی، مواضعات جمڑی، فخر الدین پور، گجڑا، قاسم پورہ موجودہ مبارک پور) وغیرہ میں بھی ان کے مقبرے پائے جاتے ہیں۔ اور دوسری جماعت علاقۂ اعظم گڈھ سے جانب شمال بلریا گنج، جیگہاں، بھگت پور وغیرہ مواضعات میں گئی، ان جگہوں میں بھی ان کے شہیدوں کی قبریں مشہور ہیں، خاص بھگت پور میں سالار مسعود غازی کے والد والا تبار ''سالار ساہو'' شہید ہوئے، اور وہیں سپرد خاک ہوئے، اسی بناء پر غازیوں نے یہاں ایک دو دن قیام کیا، بھگت پور میں سالانہ غازی میاں کا میلہ لگتا ہے، بھگت پور سے

غازیوں کا قافلہ غازی میاں کے حقیقی چچا سالار باہو کی قیادت میں ''مہراج گنج'' کی جانب روانہ ہوا، اور اس کے اطراف میں اپنی مہم انجام دی، یہاں ''سالار باہو'' بھی شہید ہو گئے، اور مقام شہادت میں دفن ہوئے، بعد میں وہاں ایک بلند مقبرہ تعمیر ہوا اور اس موضع کو ''باہو سالار'' سے موسوم کیا گیا، جو اب بگڑ کر بابو سالار ہو گیا ہے۔

حدود اعظم گڈھ میں واقع یہ مقامات جن میں سالار مسعود غازی کے رفقاء کار نے اپنی سرگرمیاں انجام دیں وہ اس وقت راج بھر قوم کے زیر اقتدار تھے ان علاقوں میں اس زمانہ میں ان کے چار راجے بطور خاص بہت مشہور تھے، ان کی کوٹ (قلعوں) کے آثار ماضی قریب تک پائے جاتے تھے، یہ راجگان اور ان کے مرکزی مقامات درج ذیل ہیں:

نام راجہ	نام مقام
(۱) راجہ اصیل دیو	موضع اصلائی پرگنہ ماہل تحصیل پھول پور
(۲) راجہ گوہن دیو	موضع گوہنہ (موجودہ محمد آباد)
(۳) راجہ بوڑھن دیو	موضع بوڑھن پور تحصیل پھول پور
(۴) راجہ گرک دیو	سگڑی (تحصیل سگڑی)

(تاریخ اعظم گڈھ از حاجی شاہ افضال اللہ قادری)

ان چاروں کے علاوہ راجہ ہری چھات موجودہ نظام آباد میں اور راجہ اجودھیا رائے ''کوڑیا'' میں بھی اس دور میں اچھی خاصی طاقت وشہرت کے مالک تھے۔

یہی حضرت سالار مسعود غازی علوی رحمہ اللہ کے رفقاء ہیں جنھوں نے علاقۂ اعظم گڈھ میں سب سے پہلے عقیدۂ توحید کی تخم ریزی کی اور اسی زمانہ سے یہاں خال خال مسلم نوآبادیاں وجود میں آئیں، ان اللہ کے مخلص بندوں کی اس ابتدائی مہم کے بعد ایک طویل مدت تک اس علاقہ میں کوئی اسلامی مہم برپا نہیں ہوئی، اور ایک عرصۂ دراز تک بالکل خاموشی رہی اسی وجہ سے ان غازیوں وشہیدوں کے نام وکام کی تفصیلات بلکہ ان کی قبروں کا صحیح حال مانا مشکل ہو گیا، اور ان پراسرار بندوں کے سوانح بھی خود انھیں کی طرح پراسرار رہے۔

الحاصل سالار مسعود غازی کی اس مہم کے بعد ۵۹۰ھ میں سلطان شہاب الدین غوری

نے قنوج پر فوج کشی کی وہاں کے راجہ جے چند نے اٹاوہ سے قریب جانب شمال میں مقام چندواڑہ میں سلطان غوری کے لشکر سے مقابلہ کیا اور شکست کھائی، سلطان غوری نے قنوج پر قبضہ کے بعد بنارس کو بھی فتح کرلیا جو راجہ جے چند ہی کا مقبوضہ تھا، اس کے بعد گوالیار، بدایوں، کالپی، منہیج (ظفرآباد جون پور) اسلامی قلم رو میں شامل ہوگئے، اس طرح وہ پورا علاقہ جس کو برطانوی دور میں صوبہ متحدہ (یعنی اودھ) کہا جاتا تھا اسلامی سلطنت میں داخل ہوگیا، جس کا ایک حصہ موجودہ اعظم گڈھ بھی تھا، اسی دور سے اس علاقے میں مسلمانوں کا فی الجملہ عمل دخل شروع ہوا اور وہ اپنے دینی امتیازات کے ساتھ ابھرے۔

جیسا کہ تاریخ سے معلوم ہے کہ ابھی تک دہلی کی یہ حکومت ''غزنی سلطنت'' کے تابع تھی ۶۰۲ھ میں سلطان شہاب الدین غوری کی شہادت کے بعد اس کا تعلق غزنی سے ختم ہوگیا اور سلطان شہید کے ساختہ پرداختہ غلام، نائب السلطنت قطب الدین ایبک نے ہندوستان کی مستقل خودمختار سلطنت کی بنیاد قائم کردی، یہ اولین خودمختار ہندوستانی سلطنت جس خاندان کے ذریعہ وجود میں آئی اور پروان چڑھی اسے غلاموں کا خاندان کہا جاتا ہے، اس خاندان نے ۶۰۲ھ سے ۶۸۹ھ تک چھیاسی سال حکومت کی، اس کے خاتمہ ۶۸۹ھ پر جلال الدین فیروز شاہ خلجی سے خلجیوں کی سلطنت شروع ہوئی اور ۷۲۰ھ میں اپنی مدت کارپوری کرکے بساط حکومت سے یہ بھی غائب ہوگئی، غلاموں اور خلجیوں کے اس مجموعی دور میں علاقہ اعظم گڈھ سے مشرق میں کڑا مانک پور وغیرہ اور اس کے شمال مغرب میں اودھ (اجودھیا) اور اس کے اطراف اہل علم وصلاح کی علمی ودینی سرگرمیوں سے دارالعلم والدین بنے ہوئے تھے، ظاہر ہے ان دونوں مقامات کے درمیان واقع اعظم گڈھ کا علاقہ جو مسافت کے اعتبار سے بھی نسبتاً قریب ہے ان کے حسنات وبرکات سے کچھ نہ کچھ ضرور بہرہ ور ہوا ہوگا، مگر اس حوالے سے کوئی تصریح نظر سے نہیں گذری البتہ خلجیوں کے بالکل آخری یا تغلق کے اولین عہد میں شیخ رکن الدین ابوالفتح ملتانی متوفی ۷۳۵ھ نے اپنے دو خلفاء کو اس خطہ میں تبلیغ اسلام کے لیے مامور کیا تھا، چنانچہ مولوی نورالدین زیدی ظفرآبادی متوفی ۱۳۳۷ھ اپنی آخری تصنیف ''چراغ نور'' تاریخ ظفرآباد میں مخدوم سید اسدالدین کڑوی

ظفر آبادی متوفی ۷۹۳ھ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

"اپنے نانا حضرت مخدوم ضیاء الدین کٹروی سے تعلیم پائی پھر ملتان جا کر حضرت مخدوم شیخ رکن الدین ملتانی سہروردی سے مرید ہوئے بعد طے کرنے سلوک و معرفت کے... پیر نے خرقۂ خلافت دیا تو لقب آفتاب ہند کا بھی عطا کیا، دم رحلت ترویج دین اسلام کی ہدایت کی... چار مقام پر جد وجہد کی کنتھ، ساتھر ڈیہہ، بناوئی، ظفر آباد، اول کنٹھ (ضلع مرزا پور) یہاں کا راجہ قوم راجپوت سے تھا، ابتداءً صلح و وعظ سے کام لیا مگر آخر میں نوبت جنگ کی پہنچی اور راجہ بہت سے آدمیوں سمیت مسلمان ہوا... دوم ساتھر ڈیہہ (ضلع الہ آباد) یہاں کا راجہ بھی از قوم راجپوت تھا، اس سے سامنا ہوا، اور بالآخر وہ بھی مسلمان ہوا، قوم ترکمان جو اس جوار میں بکثرت ہے اسی راجہ کی اولاد سے مشہور ہیں... سوم: بناوئی بنسبت اور مقام کے یہاں کا راجہ زیاد ملک، فوج، وجاہ و حشم والا تھا، یہاں کی مہم نے زیادہ طوالت کھینچی چھ مہینہ تک سلسلہ رہا آخر نتیجہ واحد ہی نکلا اس نے بھی دین اسلام قبول کیا، چند مکانات و مسجد مخدوم کے وقت کی تعمیر شدہ یہاں موجود ہیں، یہ مقام پرگنہ سگڑی ضلع اعظم گڈھ میں ہے"۔

شیخ رکن الدین ملتانی کے دوسرے خلیفہ مخدوم شیخ صدر الدین چراغ ہند ملتانی ظفر آبادی متوفی ۷۹۵ھ کے ترجمہ میں یہی زیدی مرحوم رقمطراز ہیں:

قوم شیخ فاروقی، مذہب حنفی، طریق سلوک جذب، روش عاشقانہ خانوادہ شہروردی، مرید و خلیفہ حضرت مخدوم رکن الدین عالم ابوالفتح ملتانی... ۶۱۰ھ میں پیدا ہوئے، اپنے ماموں زاد بھائی حضرت مخدوم شیخ رکن الدین ملتانی کے مرید ہوئے، اور مقامات باطن طے کیے، پیر روشن ضمیر نے خرقۂ خلافت اور لقب چراغ ہند دے کر ترویج دین اسلام کی غرض سے پورب کی سیر کی اجازت دی، مخدوم وہاں سے ادھر تشریف لائے اور ہدایت خلق میں مصروف ہوئے، آپ کی برکت و رہنمائی سے ہزاروں آدمی راہ راست پر آئے... اکثر مقامات پر چلہ کھینچا ہے، دس مقامات بھوئلی، مہدیو پور، پہاڑ دھواں دری، پہاڑ پور وادری، (یہ سب مقامات ضلع مرزا پور میں ہیں) سید پور و مچھلی شہر (یہ دونوں ضلع جون پور میں ہیں) کھمولی، سرسال، مخدوم پور، منڈیار (یہ چاروں مواضعات اعظم گڈھ میں ہیں) میں ابھی

تک چلّہ کا مکان موجود ہے (چراغ نور ص ۴۴ سن تالیف ۱۲۹۸ھ)

ان مقامات میں چلّہ کشی سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ اس علاقہ میں مخدوم چراغ ہند کی تبلیغی واصلاحی جدوجہد اچھے خاصے عرصہ تک جاری رہیں اور لوگ ان سے وابستہ بھی ہوئے ورنہ چلّہ کشی کے لیے اطمینانِ مطلوب کیونکر میسر ہوتا۔

مخدوم رکن الدین ملتانی کے ایک تیسرے مرید وخلیفہ شیخ مخدوم ظہر الدین متوفی ۲۷/ذی الحجہ ۷۴۵ھ نے تو مستقل طور پر محمد آباد گوہنہ میں سکونت اختیار کر لی تھی، ان کا پیدائشی وطن تاج پور سارن (بہار) ہے، ان کے صاحبزادے شیخ جمال الدین ان کے بعد سجادہ نشیں ہوئے، اور ان کے بعد شیخ داؤد بن شیخ جمال کو ولایت وخلافت ملی، ان تینوں بزرگوں کی قبریں محمد آباد کے مغرب میں سڑک کے شمال جانب ٹیلہ پر ''آستانہ روضہ'' میں ہیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مخدوم رکن الدین ملتانی کی توجہ اس خطہ کی طرف زیادہ تھی، اسی بناء پر تو ایک کے بجائے ان کے تین تین خلفاء نے اسے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا محور بنایا، ان بزرگوں کی یہ دینی جدوجہد ۷۲۱ھ تک کے زمانہ کی ہیں؛ کیوں کہ مخدوم اسد الدین بناوی کی مہم سے فارغ ہو کر منیچ (ظفر آباد) کی مہم پر چلے گئے تھے، جہاں ان سے پہلے مخدوم صدر الدین ملتانی پہنچ چکے تھے، اور ۲۷/ربیع الاوّل ۷۲۱ھ کو یہ مہم خیر وفلاح کے ساتھ مکمل ہو گئی تھی؛ چونکہ اس مہم میں سلطان شہاب الدین تغلق متوفی ۷۲۵ھ کا صاحبزادہ ''ظفر خاں'' بھی شریک تھا، اس لیے فتح کے بعد اس کا نام منیچ کی بجائے ''ظفر آباد'' قرار پایا، شیخ اسد الدین کٹروی اور شیخ صدر الدین ملتانی کے ہمراہ علماء وصوفیاء کی ایک بڑی جماعت تھی جو ان دونوں بزرگوں کے ساتھ وہیں مستقل طور پر آباد ہو گئی تھی، اس طرح ظفر آباد علم ودین کا گہوارہ جون پور کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ہو گیا تھا حدود اعظم گڈھ میں ان بزرگوں کے اس نسبتاً دراز جہد وعمل کی بناء پر ہمارا خیال ہے کہ اس دیار میں توحید کے آوازہ کو بلند کرنے اور گلشن اسلام کو بہار بدوش بنانے میں اب تک کی مساعی حسنہ میں سب سے زیادہ موثر اور اپنے دیرپا مفید اثرات کے لحاظ سے قوی ترین ہدایت خیز مہم

ہے جو فی الواقع شیخ ابوالفتح رکن الدین فیض اللہ ملتانی سہروردی کی عنایت اور مخلصانہ مستجاب دعاؤں کے زیر حمایت انجام پائی۔

خلجی سلطنت کے خاتمہ پر ان کی جگہ کو تغلق فرمانرواؤں نے سنبھالی، انھوں نے ۷۲۱ھ سے ۸۱۷ھ تک ۹۶ سال حکومت کی، اس خاندان کا تیسرا حکمراں سلطان فیروز شاہ تغلق ماہ محرم ۷۶۰ھ میں حاجی الیاس الملقب بہ شمس الدین حاکم بنگالہ کی سرکوبی کے لیے بنگال جاتے ہوئے ظفر آباد کے قریب اپنے لشکر کے ساتھ چھ ماہ مقیم رہا اسی قیام کے دوران اس نے دریائے گومتی کے کنارے ایک شہر کی بنیاد رکھی اور اپنے پیش رو اور محسن سلطان محمد تغلق کے اصل نام ''جونا خان'' پر اس نئے شہر کا نام ''جونا پور'' تجویز کیا جو بعد میں جون پور کے نام سے مشہور ہوا، یہی شہر جون پور جس کی حدود میں اعظم گڈھ کا علاقہ بھی تھا، بعد میں ایک عظیم علمی و دینی مرکز کی حیثیت سے ہندوستان کے افق پر نمایاں ہوا اور تقریباً چار سو سال تک یہ شہر اپنے حدود سمیت علم و فضل اور علماء و فضلاء کا نادر المثال گھوارہ بنا رہا۔

اس اجمال کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ خاندان تغلق کے آٹھویں اور آخری حکمراں سلطان ناصر الدین محمود شاہ تغلق نے ۷۹۶ھ میں اپنے وزیر اعظم خواجہ جہاں ملک سرور کو سلطان الشرق کا خطاب دے کر جون پور کی فرمانروائی عطاء کی ۷۹۸ھ کے حدود میں ناصر الدین محمود کے مقابلہ میں نصرت خاں بن شیخ خان بن فیروز شاہ تغلق تخت دہلی کا دعویدار بن بیٹھا، اس بناء پر محمود شاہ اور نصرت خاں کے مابین لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہوگیا، جو ۸۰۰ھ تک جبکہ تیمور لنگ ہندوستان میں وارد ہوا جاری رہا، دہلی میں دو بادشاہوں کی موجودگی اور ان کی جنگ آزمائی کا حال سن کر گجرات، خاندیس، مالوہ اور جون پور کے صوبیداروں نے دہلی حکومت سے آزاد ہوکر اپنی خودمختار حکومتیں قائم کرلیں، اس طرح ۸۰۰ھ کے لگ بھگ خواجہ جہاں ملک سرور سلطان الشرق کے ہاتھوں سلطنت شرقیہ جون پور کا وجود عمل میں آیا، خودمختار سلطنت شرقیہ جون پور میں حسب ذیل چھ سلاطین تخت و تاج کے مالک ہوئے:

(۱) خواجہ جہاں ملک سرور سلطان الشرق — حدود ۸۰۰ھ-۸۰۲ھ

(۲) مبارک شاہ شرقی مَلِک قرنفل — حدود ۸۰۲ھ-۸۰۴ھ

(۳) سلطان ابراہیم شاہ شرقی برادر خرد مبارک شاہ حدود ۸۰۴ھ-۸۴۴ھ

(۴) سلطان محمود شاہ بن ابراہیم شاہ حدود ۸۴۴ھ-۸۶۲ھ

(۵) سلطان محمد شاہ شرقی بن محمود شاہ شرقی حدود ۸۶۲ھ پانچ ماہ

(۶) سلطان حسین شاہ بن محمود شاہ حدود ۸۶۲ھ-۸۸۱ھ

خواجۂ جہاں سلطان الشرق خودمختاری کے تقریباً دو سال بعد ۸۰۲ھ میں فوت ہو گیا، یہ لاولد تھا اس لیے اس کا متبنیٰ ملک قرنفل اس کی جگہ تخت نشین ہوا، یہ بھی دو سال حکومت کر کے ۸۰۴ھ میں انتقال کر گیا تو اس کے چھوٹے بھائی ابراہیم شاہ شرقی نے ۸۰۴ھ میں شرقی سلطنت کے تاج وتخت کو زینت بخشی، اس نے چالیس سال حکومت کی اس کا یہ چالیس سالہ دور فی الواقع سلطنت شرقی کا عہد زریں ہے، اس نے دل کھول کر اسلامی علوم وثقافت کی سرپرستی اور اصحاب فضل وکمال کی پذیرائی کی، اس کی عدل گستری، علم پروری اور علماء نوازی کی بدولت پورا خطۂ جون پور اسلامی علوم وادب اور علماء اسلام کے حسنات وبرکات سے لہلہا اٹھا، گاؤں گاؤں، قریہ قریہ میں ارباب فضل وکمال آباد ہو گئے، مدرسے قائم ہوئے، مساجد اور خانقاہیں تعمیر ہوئیں اور علم وذکر کی محفلیں آراستہ ہوئیں۔

محمد قاسم فرشتہ اس عہد تابناک کی ستائش میں یوں رطب اللسان ہے:

اما شاہے بود بعقل ودانش وتدبیر، در عصر وے فضلائے ممالکِ ہندوستان، ودانشمندان ایران وتوران کہ از آشوب جہاں پریشانِ خاطر بودند بدار الامان جون پور آمدہ در مہد امن وامان غنودند الخ

ابراہیم شاہ ایک ایسا فرمانروا تھا جو عقل وعلم اور خوش تدبیری سے متصف تھا، اس کے زمانہ میں ہندوستان کے مختلف شہروں کے فضلاء اور ایران وتوران کے ارباب دانش جو دنیا کی فتنہ سامانیوں سے پریشان دل تھے دارِ امن جون پور میں آ کر امن وسلامتی کے گہوارہ میں خواب راحت سے ہم دوش ہو گئے۔

ابھی اس عالی ہمت سلطان کے جلوس کا پہلا برس ہی تھا کہ خانوادہ عباسی کے ایک چشم وچراغ مخدوم زادہ ابوالجلال اسماعیل عباسی ستم روزگار سے پریشان اپنے اہل وعیال

اور حشم و خدم کے ساتھ جون پور وارد ہوئے، سلطان ابراہیم نے گرم جوشی کے ساتھ ان کا استقبال کیا، اور اپنے مراحم خسروانہ سے انھیں شادکام کرتے ہوئے پرگنہ چریا کوٹ اور اس کے اطراف کے اقطاع برسم مدد معاش عطاء کیے اور ان کے علمی وقار کی پاسداری میں منصب قضا سے بھی سرفراز کیا، مخدوم زادہ اپنے حشم و خدم کے ہم رکاب اپنی اس جاگیر میں پہنچے تو مقامی راجپوتوں نے مزاحمت کی، تین دن تک سلسلۂ جنگ و پیکار جاری رہا، اس کی اطلاع جون پور پہنچی تو وہاں سے تازہ دم فوج مدد کو آئی جس سے یہ شورش ختم ہوئی۔ (یادداشت چریا کوٹ بحوالہ اسلام اور عصر جدید جامعہ ملیہ دہلی)

مخدوم زادہ عباسی کی یہاں بود و باش سے اس آبادی کے بیشتر لوگوں نے اسلام قبول کرلیا، مخدوم زادہ نے قصبہ کا نام چریا کوٹ سے بدل کر اپنے چھوٹے صاحبزادے یوسف حسن کے نام پر جن کا یہاں آتے ہی انتقال ہو گیا تھا ''یوسف آباد'' رکھا، لیکن شہرت سابقہ نام ہی کی رہی نیا نام رواج نہ پاسکا، مولانا نجم الدین چریا کوٹی کہتے ہیں:

چریا کوٹ خوانندش عوامش   ولیکن یوسف آباد است نامش

یہی مخدوم زادہ اسماعیل عباسی علمائے چریا کوٹ کے مورث اعلیٰ ہیں جن کی نسل میں تقریباً چار سو سال تک اسلامی علوم و فنون کا رواج رہا اور بڑے بڑے نامور علماء و فضلا اس خاندان میں پیدا ہوئے، ابراہیمی عہد کا یہ اولین علمی قافلہ ہے جس نے سرزمین اعظم گڈھ میں اپنی اقامت کا خیمہ نصب کیا اور چریا کوٹ اور اس کے قرب و جوار کے لیے ذریعہ ہدایت اور سایۂ رحمت بنا۔

چریا کوٹ کا اصلی نام ''چیریا کوٹ'' تھا اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہاں راجپوت آبادی کے علاوہ ''چیریا'' قوم کا ایک گروہ بھی رہتا تھا، جس کا پیشہ قزاقی و رہزنی تھا، اس گروہ کے سردار نے جائے پناہ کے طور پر ایک کوٹ (قلعہ) تعمیر کر رکھی تھی جو اس قوم کے نام پر چیریا کوٹ سے مشہور تھی، آگے چل کر تصغیری تشدید کے ساتھ چریا کوٹ ہو گیا اور پورا قصبہ اسی نام سے جانا پہچانا جانے لگا۔

سلطان ابراہیم شاہ ہی کے ابتدائی دور میں امیر سید حمید الدین نے بھی خطۂ اعظم گڈھ

کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے عزت بخشی، اور موجودہ محمد آباد گوہنہ کو اپنی سکونت کے ذریعہ شہرت دوام عطا کی، امیر سید حمید الدین قاضی شہاب الدین دولت آبادی متوفی ۸۴۸ھ قاضی القضاۃ حکومت شرقی، اور اس عہد کے مشہور ترین بافیض شیخ طریقت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی متوفی ۸۰۸ھ کے ہم عصر تھے اور ان میں باہم رسم وراہ بھی تھی، چنانچہ تکملہ وفیات الاعلام مصنفہ شاہ میرن جان الہ آبادی میں مخدوم سمنانی کا ایک مکتوب بنام امیر سید حمید الدین منقول ہے، جس میں حضرت مخدوم سمنانی لکھتے ہیں:

"برادر اعز السادات والنقب النقبات سید حمید الدین، دعائے مشتاقانہ وثنائے دوستانہ از درویش اشرف مطالعہ نمایند، آنچہ بعرض نمودہ اندکہ اشتیاق ملازمت از حد گذرانست، انشاء اللہ تعالیٰ درنزدیکے ایام قربت انجام بملازمت خیر الانام رسیدہ دانند" الخ

اس مکتوب سے جہاں سید حمید الدین کے مقام ومرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں مخدوم سمنانی کے ساتھ ان کے یارانہ تعلق کا بھی پتہ چلتا ہے، چونکہ مخدوم سمنانی کی وفات ۸۰۸ھ یں ہوئی ہے، اس سے یہ بھی متعین ہوجاتا ہے کہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے ابتدائی دور حکومت میں ہی امیر سید حمید الدین محمد آباد گوہنہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔

حضرت شاہ اجمل الہ آبادی متوفی یکم ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ (جن کا نکاح سید حمید الدین کی خاندان میں ہوا تھا) نے اپنی بیاض میں امیر سید حمید کا شجرہ نسب یہ درج کیا ہے: سید حمید الدین ساکن محمد آباد گوہنہ، بن سید تاج الدین، بن سید سراج الدین، بن سید کمال الدین، بن سید محمود، بن امیر سید اجل ترمذی، بن سید فخر الدین، بن سید نصیر الدین بن سید احمد، بن سید زید شہید، بن سید علی ابن سید ابوبکر، بن سید محمد مدنی عرف شاہ ناصر ترمذی، بن سید موسیٰ خضر، بن سید حمزہ، بن سید عبید اللہ الاعرج، بن سید حسین اصغر، بن سید الساجد بن امام زین العابدین، بن سید الشہداء ابوعبداللہ الحسین بن حضرت اسد اللہ الغالب امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ ووجوہہم۔

امیر سید حمید الدین کے پانچ صاحبزادے تھے، سید محمد عرف سید بوڈھن، وسید

محی الدین، وسید حسن، وسید پھول، وسید میران، اور ہر ایک صاحب اولاد تھا، ان میں بڑے صاحبزادے کے نام پر اس موضع کا نام محمد آباد رکھا گیا اور بغرض تعریف قدیم نام ''گوہنہ'' کا لاحقہ اس کے ساتھ بڑھا دیا گیا، اور دوسرے صاحبزادے محی الدین کے نام پر دریائے ٹونس کے شمال میں محی الدین پور ہے۔

سید حمید الدین کی وفات محمد آباد ہی میں ہوئی اور اسی سرزمین میں آسودہ ہیں، شاہ میرن جان نواسہ شاہ اجمل الہ آبادی تکملہ وفیات الاعلام میں لکھتے ہیں:

''چند روز قبل از حادثہ غدر ۱۸۵۷ء بتقریب شادی برادر عزیز شاہ محمد علیم خلف جناب عمی حضرت شاہ امین الدین قیصر بمقام ولید پور رفتہ بودم یک روز بغرض زیارت مزار جدی حضرت امیر کبیر سید حمید الدین از ولید پور بہ محمد آباد گوہنہ کہ قریب دو فرسنگ دار درمیان آں جوے موسوم بہ ٹونس جاری شدہ بہ ملاقات حکیم صاحب موصوف کہ در حیات بودند رفتم ونشان قبر حضرت امیر دریافتہ در قبرستان کہ از مکان حکیم صاحب دو میل فاصلہ بودہ رسیدہ بشرف اندوز زیارت مزار جد شدم''

حادثہ غدر ۱۸۵۷ء سے چند دن پہلے برادر عزیز شاہ محمد علیم ابن عم محترم شاہ امین الدین قیصر ولید پور گیا ہوا تھا، ایک دن اپنے جدّ بزرگوار حضرت امیر کبیر سید حمید الدین کے مزار کی زیارت کی غرض سے ولید پور سے محمد آباد گوہنہ۔ جو تقریباً چھ میل کی مسافت پر ہے اور ان دونوں مواضع کے درمیان دریائے ٹونس جاری ہے۔ حکیم صاحب جو بقید حیات تھے کی ملاقات کو گیا، حضرت امیر کی قبر کا نشان معلوم کر کے قبرستان گیا جو حکیم صاحب کے مکان سے دو میل کے فاصلہ پر ہوگی اور جد بزرگوار کے مزار کی زیارت سے مشرف ہوا۔

امیر حمید الدین کی اولاد میں نسلاً بعد نسل اصحاب علم وارباب صلاح پیدا ہوتے رہے، انھی شاہ میرن کے صاحبزادے مولانا شاہ بشیر احمد تھے جو دائرۂ اجمل شاہ آباد کے سجادہ نشین تھے، اس خاکسار کی موصوف سے ملاقات ہے، آں موصوف ہی کی عنایت سے وفیات الاعلام مصنفہ شاہ خوب اللہ الہ آبادی متوفی ۱۱۴۴ھ اور اس کے تکملہ مصنفہ سید میرنجان کے مطالعہ سے مستفید ہوا۔

عہد ابراہیمی میں ایک اور کاروان فضل وکمال سرزمین اعظم گڈھ میں فروکش ہوا جس کی تفصیل ذکر کرتے ہوئے نورالدین زیدی مرحوم لکھتے ہیں کہ شیخ محمد بن خضر متوفی ۸۱۱ھ دہلی سے جون پور وارد ہوئے، سلطان ابراہیم نے بکمال عقیدت پورے اعزاز کے ساتھ انھیں رکھا، اور جب وہ رحلت کر گئے تو ان کے صاحبزادے شیخ مشید کو پرگنہ محمد آباد گوہنہ میں قریہ ولید پور وغیرہ متعدد گاؤں جاگیر میں دیئے، اسی خانوادہ کے فاضل باکمال شاہ ابوالخیر بھیروی متوفی ۱۰۵۹ھ نے اپنی تصنیف ''شیر وشکر'' میں لکھا ہے کہ شیخ مشید کے دوست میر صدر جہاں سید اجمل (یکے از امراء ابراہیم شاہ) ایک مرتبہ بنگال کی سفارت سے جون پور واپس ہوتے ہوئے والید پور پہنچے تو دیکھا کہ کارندوں نے پوری جاگیر میں لوٹ گھسوٹ مچا رکھی ہے، جونپور پہنچ کر شیخ مشید کو صورت حال سے آگاہ کیا، اور جاگیر کے انتظام کی جانب توجہ دلائی، چنانچہ ان کے مشورہ پر شیخ مشید کے بڑے لڑکے شمس العلماء، قدوۃ الاولیاء مخدوم شیخ معروف صوفیوں اور طلبہ علوم کی ایک جماعت کے ساتھ بھیرا ولید پور آگئے، ظاہر ہے کہ شمس العلماء وقدوۃ الاولیاء نے یہاں آکر جاگیر کے انتظام کے ساتھ طلبہ وصوفیہ کی تعلیم وتربیت کا کام جاری کیا ہوگا، ورنہ انھیں اپنے ساتھ کیوں لاتے، خطۂ اعظم گڈھ میں پہلا مدرسہ جو جاری ہوا وہ یہی ''بھیرا'' کا مدرسہ ہے، (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال) اسی خانوادہ کے افق پر شاہ ابوسعید، شاہ ابوالخیر، شاہ اسماعیل، ملا محمود صاحب شمس بازغہ، شاہ ابوالغوث گرم دیوان، شاہ ابواسحاق وغیرہ ایسے درخشاں ستارے نمودار ہوئے جن کی نورافشانیوں سے ایک عالم مستنیر ہوا۔

اسی دور میں ایک عالی قدر فاضل اور بلند پایہ شیخ طریقت شیخ فتح اللہ دہلی سے اودھ آئے، جنھوں نے جامع مسجد دہلی متصل منارۂ شمسی میں (قطب مینار) ایک طویل عرصہ تک درس دیا تھا، حضرت شیخ نصیرالدین محمود اودھی چراغ دہلی متوفی ۷۶۷ھ کے ایماء پر اجودھیا میں خود حضرت چراغ دہلی کے آبائی مکان میں مسند ارشاد بچھائی اور ایک عالم کو اپنے نور باطنی سے روشن کیا، شیخ محمد عیسیٰ تاج جون پوری جیسے عظیم المرتبت باکمال ان کے خلفاء کی فہرست میں شامل ہیں، سلطان ابراہیم شرقی نے ازراہ نوازش انھیں پرگنہ ماہل میں کئی گاؤں

جاگیر میں عطا کیے، شیخ فتح اللہ اودھی خود تو اجودھیا ہی میں رہے، البتہ ان کے صاحبزادے شیخ بہاء الدین نے اس جاگیر میں ایک گاؤں اپنے نام پر بہاء الدین پور آباد کیا اور مستقل طور پر وہیں اقامت پذیر ہو گئے۔ یہ گاؤں قصبہ پھولپور سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر جانب مغرب لب سڑک واقع ہے اور اب بگڑ کر بہادی پور سے مشہور ہے، اور فی الحال اہل تشیع کے چند گھرانے یہاں رہتے ہیں، شیخ بہاء الدین کی اولاد میں علمی سلسلہ چلتا رہا، آخری دور میں شیخ گلشن علی بن شیخ عطاء ماہلی، متوفی حدود ۱۲۰۰ھ اور فارسی کے مشہور شاعر اور متبحر عالم مولوی حسن علی بن نوازش علی ماہلی متوفی ۱۲۵۸ھ اسی علمی دینی خاندان کی یادگار تھے۔

غرضیکہ علوم وفضائل کے حامل قافلے عہد شرقی اور بعد کے ادوار میں سرزمین اعظم گڈھ میں اپنا خیمہ نصب کرتے رہے، اور اپنی علمی ودینی سرگرمیوں سے اس کے قصبات وقریات کو علم ودین کی روشنی سے جگمگاتے رہے، چنانچہ عہد لودھی میں شیخ خیر الدین ظفر آباد سے یہاں تشریف لائے، اور موضع کہنڈہ کے قریب جانب مغرب اپنے نام سے ایک گاؤں خیر الدین پور (موجودہ خیردی پور) بسا کر یہیں مقیم ہو گئے، اس اطراف میں ان کے ذریعہ بھی علم وایمان کا نور پھیلا، شیخ خیر الدین کے صاحبزادے شیخ مبارک خیر الدین پوری زبردست عالم اور مخدوم علی عاشقاں سرائے میری کے اجلہ خلفاء میں سے تھے، جن کا خود ان کے شیخ اکرام کیا کرتے تھے، ان کے پوتے شیخ عبد الشکور بھی اپنے عہد کے باکمال عالم تھے اور شیخ دیوان محمد رشید برونوی جون پوری کے خلیفہ تھے۔

اسی لودی دور میں ظفر آباد سے ایک اور صاحب فضائل بزرگ شیخ نصیر الدین قلندر عباسی متوفی ۹۱۵ھ نے ''موضع نیگو'' پرگنہ ماہل کو اپنے رشد وہدایت کا مرکز بنایا، شیخ نصیر قلندر کے یہاں بود وباش اختیار کر لینے کی وجہ سے یہ موضع قصبہ قلندر پور سے معروف ومشہور ہوا، اور اس دیار کو اپنی روحانی برکتوں سے مالا مال کیا، ان کے صاحبزادے شیخ نور الدین معروف بہ شیخ نور قلندر متوفی ۹۶۳ھ نے اپنے نام سے ایک گاؤں نور پور بسایا جو موضع مہوارہ ضلع اعظم گڈھ کے پاس واقع ہے، ایک زمانہ تک اسی گاؤں میں رہ کر بندگان خدا کی رہنمائی کی خدمت انجام دیتے رہے، پھر والد ماجد کے اشارہ پر یہاں سے منتقل ہو کر

ٹرہر پور (ضلع فیض آباد) چلے گئے تھے، اور وہیں آسودہ خواب ہیں۔ اس وقت قصبہ قلندر پور اور موضع نور پور میں مسلمانوں کا کوئی قابل ذکر خاندان موجود نہیں ہے۔

اسی خطۂ اعظم گڈھ کا ایک معروف قصبہ نظام آباد ہے، جو ایک قدیم بستی ہے، مسلم دور حکومت میں یہ سرکار جون پور کے ماتحت ایک پرگنہ تھا، سلطان جہانگیر نے "دولت خان کو جو جاگیر عطا کی تھی اس میں پرگنہ نظام آباد کا بھی ذکر ہے، اس کے کھنڈرات اس کی عظمت رفتہ کا پتہ دیتے ہیں، یہ قصبہ بڑا مردم خیز تھا، بڑے بڑے علماء دین اور اہل اللہ یہاں گذرے ہیں، چنانچہ حضرت شاہ نظام الدین اسی سرزمین میں محوخواب ہیں، یہ آبادی انھیں کے نام پر "نظام آباد" سے مشہور ہوئی، حضرت شاہ عبدالقدوس شطاری عرف شاہ قدن اور قطب صدیق اسی خاک میں پنہاں ہیں، جو حضرت علی عاشقاں کے پیرومرشد تھے، قاضی ابوالفخر کا خاندان بھی یہیں آباد ہے، جو شاہ فتح علی قلندر متوفی ۱۱۱۸ھ کے ہم عصر تھے، ملا عبدالقادر نظام آبادی استاذ صاحبزادگان شیخ فتح علی قلندر، اسی قصبہ کے روشن چراغ تھے، قاضی محمد جمیل نظام آبادی، قاضی محمد رضا نظام آبادی، مولوی اظہر نظام آبادی استاذ مولوی محمد بن سید عطا حسین جون پوری وغیرہ اسی بستی کے قابل ذکر سپوت تھے، مگر زمانہ نے انھیں اس طرح بھلا دیا کہ تذکرہ کی کتابوں میں ان کے ناموں کے علاوہ آج کچھ بھی معلوم نہیں۔

دسویں صدی ہجری کے وسط میں میر علی عاشقاں اپنے علم و عرفان، زہد و عبادت، جذب و کیف، کشف و کرامت کے لحاظ سے اس خطہ ہی کے نہیں؛ بلکہ اس عہد کے اولیاء کبار میں سے تھے، ان کی خانقاہ مرجع خلائق تھی، اسی قدسی صفت بزرگ کی بدولت قصبہ سرائے میر رشد و ہدایت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے نمایاں ہوا اور تقریباً ڈیڑھ سو سال تک اس کی مرکزیت قائم رہی، ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے میر سید نظر علی نے باپ کی وراثت کی نگہبانی کی اور اس گنج گراں مایہ کو اپنے اخلاف کے سپرد کر کے جہان دگر کی راہ لی، بارہویں صدی کے دوسرے دہے تک خاندان عاشقیہ میں رشد و ہدایت کا چراغ جلتا رہا، چنانچہ شیخ فتح علی قلندر متوفی ۱۱۱۸ھ کے خلفاء کی صف میں اس خانوادہ کے حسب ذیل افراد نظر آتے ہیں:

(۱) میر سید غلام حسن حسینی ترمذی عرف سید بھادن، (۲) میر سید ظہیر الدین حسینی (۳) میر سید ابراہیم حسینی، (۴) میر سید محمد مکی حسینی یہ چاروں حضرات علی عاشقاں کی اولاد میں سے ہیں اور سب کے سب سرائے میر ہی کے متوطن تھے، ان کے علاوہ ایک اور نام شاہ فیض اللہ سرائے میری کا بھی شیخ فتح علی قلندر کے خلفاء میں ملتا ہے، مگر یہ خاندانِ عاشقیہ سے نہیں ہیں۔ پھر شاہ پیر محمد بن فتح علی قلندر کے ایک خلیفہ میر سید خدا بخش حسینی عاشقانی سرائے میری بھی تھے، ایک چھوٹے سے قصبہ میں ارشاد وسلوک کے ان چراغوں کی موجودگی بتارہی ہے کہ میر علی عاشقاں رحمہ اللہ نے خلق خدا کی رہنمائی کے لیے اس قصبہ میں جو شمع ہدایت روشن کی تھی اس کی نورافشانیاں ابھی مدھم نہیں ہوئی تھیں۔

اس خطۂ اعظم گڈھ کو اپنے عہد کے فرد فرید دیوان محمد رشید برونوی (معروف بہ جونپوری) متوفی ۱۰۸۳ھ کے مولد ومنشا ہونے کا بھی فخر حاصل ہے، جو ''درکف جام شریعت درکف سندانِ عشق'' کے سچے مصداق تھے۔ (برونہ ضلع اعظم گڈھ کی ایک معروف بستی ہے جو تھانہ بردا سے شمال مشرق چھ کیلومیٹر اور مارٹین گنج سے جنوب مشرق تقریباً آٹھ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے یہی گاؤں دیوان محمد رشید کا جائے پیدائش ہے، (نظام آباد نہیں جیسا کہ بعض علماء نے لکھا ہے) شیخ دیوان محمد رشید اقلیم علم وفن کے تاجدار اور آسمان ارشاد وسلوک کے آفتاب عالمتاب تھے، ان کی خانقاہ سے علم وحکمت اور رشد وہدایت کی گرانمایہ سوغات صدیوں تک تقسیم ہوتی رہی، نادرالمثال فاضل ملا محمود بھیروی جون پوری ان کے رفیق درس اور یار غار تھے، استاذ الملک ملا افضل جون پوری اپنے ان دونوں فخر روزگار تلمیذوں کے بارے میں کہتے تھے کہ علامہ جرجانی اور علامہ تفتازانی کے بعد ایک عہد اور ایک شہر میں ان دونوں فضلاء کی مانند اب تک دو فاضل جمع نہیں ہو سکے تھے۔

اسی ارضِ علم افروز سے ''ملا محمد ماہ دیوگامی'' متوفی ۱۰۹۵ھ جیسا عبقری عالم وفاضل پیدا ہوا جس کے بارے میں عظیم مؤرخ مولانا عبدالحئی حسنی لکھتے ہیں: ''لم یکن فی زمانہ مثلہ فی کثرۃ الدرس والافادۃ'' درس کی کثرت اور فائدہ رسانی میں ان کے جیسا اس زمانہ میں کوئی نہیں تھا۔ نیز اسی زمین کی آب وگل میں پل کر ملا باب اللہ منور پوری (جونپوری)

جیسا علامۂ عصر پروان چڑھا جس کے متعلق مولوی نورالدین زیدی مرحوم لکھتے ہیں: ''در ہند ہیچ عالمے پنجۂ علمش برنتافت'' ہندوستان میں کوئی عالم ان کے پنجۂ علم کو موڑ نہ سکا۔

یہی وہ ہدایت خیز سرزمین ہے جہاں سے تصوف کی ایک شاخ سلسلہ قلندریہ چشتیہ کا سب سے زیادہ فروغ ہوا، اس کا اصل مرکز اگرچہ دارالخیور شہر جون پور تھا، مگر تذکرہ نگاروں کے حسب بیان شیخ فتح علی قلندر پوری کے ذریعہ اس سلسلہ کی جس قدر ترقی ہوئی، کسی اور بزرگ سے اس کا اس قدر رواج نہیں ہوا، اور یہ بات معلوم ہے کہ قلندر پور پرگنہ نظام آباد کا ایک قریہ ہے جس کو خود شیخ فتح علی قلندر نے بسایا تھا اور یہی قریہ ان کے جہد و عمل کا مرکز تھا۔

ان ہی علمی مراکز میں سے اسلامی علم و ثقافت کا ایک اہم مرکز قصبہ مبارک پور بھی ہے جس کی مکمل تاریخ ہمارے پیش رو مؤرخ و محقق مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے اپنی تصنیف شجرۂ مبارکہ یعنی تذکرہ علمائے مبارک پور میں بڑے شرح و بسط کے ساتھ بیان کردی ہے جس پر اضافہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

خطۂ اعظم گڈھ کی اس اجمالی سرگذشت سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ حضرت مسعود سالار غازی کے رفقاء اور ان کے بعد شیخ اسدالدین و شیخ صدرالدین نے اس علاقہ میں علم و ایمان کا جو چراغ روشن کیا تھا، بعد میں سلاطین شرقیہ نے ان چراغوں کے لیے فانوس فراہم کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ علم و عرفان اور حکمت و دانائی کے اس قدر مزید چراغ جلادیئے کہ اس خطہ کا قریہ قریہ، گاؤں گاؤں، ان کی ضیا پاشیوں اور نور افشانیوں سے جگمگا اٹھا، ان کے بعد لودی حکمرانوں بالخصوص سلطان سکندر لودی نے اس سلسلہ میں قابلِ قدر کارنامے انجام دیئے، ان کے اختتام کے بعد بساط حکومت پر مغل سلاطین جلوہ گر ہوئے ان کے دوصد سالہ دور میں بھی اس سرزمین کی علمی آب و تاب اسی شان کے ساتھ باقی رہی، تا آنکہ حکومت مغلیہ کے دور زوال ۱۱۳۰ھ میں شام اودھ سے ظلمت کی بادصرصر چلنی شروع ہوگئی جس کی زد میں آکر یہاں کے بعض چراغ خانے گل ہوگئے؛ لیکن اس تیز سیاہ آندھی کے باوجود علم و دانش کے اکثر چراغ اپنی روشنی بکھیرتے رہے اور اس دیار کی علم و حکمت اور نور و سرور کی محفلیں آراستہ رہیں اور آج بھی جبکہ مشرقی علوم کی کساد بازاری انتہا کو پہنچ گئی ہے اور علماء

کے قدیم خاندان کس مپرسی کی بدولت تباہ وشکستہ حال ہیں، اس سرزمین کی مردم خیزی باقی ہے۔ ع ''ہوا کے رخ پہ ہے اپنی شمع جلائے ہوئے''

جس کا واضح اور معتبر ثبوت یہ ہمدست کتاب ''تذکرہ علماء اعظم گڈھ'' ہے، اس کا مطالعہ کرنے والے ورق ورق سے محسوس کریں گے کہ واقعی یہ علم ودانش اور شعور وآگہی کی سرزمین ہے یہاں سے محدث، مفسر، فقیہ، مؤرخ، فلسفی، ادیب، مصنف، اصحاب درس، ارباب طریقت اور قوم وملت کے رہنما اور پاسبان پیدا ہوتے ہیں، سرزمین اعظم گڈھ کی یہی اصل تاریخ ہے، اور اپنی اس قابل ستائش تاریخ کو یہاں کا ذی شعور طبقہ زندہ وتابندہ رکھے ہوئے ہے، صحیح معنوں میں اعظم گڈھ کی یہی شناخت ہے، یہی اس کا واقعی چہرہ ہے، وہ نہیں جس کو بعض ظلم پیشہ، جہالت کے پاسبان اور تاریک فکر ونظر کے حامل بتانے کی بیجا تگ ودو میں مصروف ہیں۔

شہر اعظم گڈھ کی بناء اور اس کی روداد

شہر اعظم گڈھ کی داستان آج سے تقریباً چار صدی قبل سے شروع ہوتی ہے، جب بادشاہ جلال الدین اکبر کے دور میں کالپی کی جنگ کے بعد گوتم راجپوت خاندان کے راجہ شہدیو سنگھ کے چھوٹے بھائی چندر سین ضلع فتح پور اپنے وطن سے منتقل ہوکر موضع کھجوری میہنہ نگر میں آبسے تھے، ان کے دو لڑکے ابھیمن سنگھ اور ساگر سنگھ تھے، چندر سین کے بارے میں کوئی تفصیل دستیاب نہیں ہے، البتہ ان کے لڑکے ابھیمن سنگھ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے میہنہ نگر اور اس کے اطراف میں اچھی خاصی جائیداد بنالی تھی، گویا میہنہ نگر میں ان کی حیثیت ایک چھوٹے راجہ کی تھی، یہی ابھیمن سنگھ عہد جہانگیری میں کسی ضرورت سے آگرہ گئے، جہاں دین اسلام کی عالمگیر عظمت اور رواداری سے متاثر ہوکر مسلمان ہوگئے، سلطان جہانگیر نے ان کی عزت افزائی کی اور دولت خاں کے خطاب سے سرفراز کیا، نیز چوبیس پرگنوں کی جاگیر عطا کی، جاگیر کے یہ چوبیس پرگنے زیادہ تر موجودہ اعظم گڈھ میں واقع تھے۔

اس خاندان میں ایک شاہی فرمان بطور یادگار باقی تھا جس کی نقل شروع انگریزی عمل داری میں شامل مسل ہو کر ڈسٹرکٹ گزیٹر میں محفوظ ہے، اس فرمان کی اصل عبارت یہ ہے:

"دریں وقت میمنت اقتران فرمان والاشان واجب الاذعان صادر شدہ کی اُبھیمن سنگھ زمین دار مینہ نگر پرگنہ نظام آباد از بندہ مقبول بارگاہ والا جاہ بدین اسلام در آمدہ نظر بر استحقاق بہ خطاب راجہ نادر دولت خاں ممتاز شدہ بست و دو پرگنہ از صوبہ الہ آباد ابتداء نیسیاں خریف سخانوئیل حسب الضمن مرحمت فرمودیم، باید کہ فرزندان نامدار والا تبار، ووزرائے ذوی الاقتدار وحکام کرام، وعمال کفایت فرجام، ومتصدیان مہمات دیوانی، ومتکفلان معاملات سلطانی وجاگیر داران حال واستقبال ابداً موبداً در استقرار واستمرار ایں حکم مقدس ومعلی کوشیدہ برزمین داری پرگنات بہ خطاب مذکورہ نسلاً بعد نسل و بطناً بعد بطن خالداً ومخلداً بحال و برقرار داشتہ بہ زرہائے مشخص مال واجب سرکار مبلغ یک لک و بست وپنج ہزار روپیہ نانکسار بر قبولیت مجرا دادہ باشند کہ مع سرحد وسر دیہہ وغیرہ ابواب زمین داری صرف معیشت خود پردازد، واز تصادم تغیر وتبدل ایں امر مقدس مصون محروس دانستہ سند مجدد نہ طلبند از یرلیغ کرامت تبلیغ والا انحراف نہ دارند" (یازدہم شہر ربیع الآخر سنہ چہارم جلوس فقط)

پشت پر ضمنی عبارت یہ ہے:

"بر کتاب حسب ضمنی بست ودو پرگنہ نافگار یک لک ۲۵ ہزار، پرگنہ نظام آباد، پرگنہ کوڑیہ، پرگنہ تلہنی، پرگنہ گوپال پور، پرگنہ سگڑی، پرگنہ محمد آباد گوہنہ، پرگنہ گھوسی، پرگنہ چکیسر، پرگنہ تھوپور، پرگنہ چریاکوٹ، پرگنہ قریات متھوپور، پرگنہ بلہابانس، پرگنہ دیوگاؤں، پرگنہ مئوناتھ بھنجن، پرگنہ شادی آباد، پرگنہ بہری آباد، پرگنہ پچوتر، پرگنہ سید پور بھستری، پرگنہ ظہور آباد، پرگنہ بھوداؤں ابواب زمین داری سی صدو یک روپیہ۔

یہ جن پرگنوں کے نام لکھے ہیں ان میں سے اکثر اب اعظم گڈھ میں اور کچھ غازی پور میں ہیں (حیات شبلی ص ۷۳-۷۴)

جاگیر کے اس عطیہ کے ساتھ انھیں صوبہ جون پور اور صوبہ الہ آباد کا فوجدار بھی مقرر

کر دیا، دولت خاں ۱۶۱۲ء م ۱۰۱۲ھ میں پھر دربار جہانگیری میں حاضر ہوئے اور مراحم خسروانہ سے نوازے گئے، چنانچہ تزک جہانگیری میں ہے:

دولت خاں بفوج داری صوبہ الہ آباد و سرکار جون پور تعین یافتہ بود آمدہ ملازمت نمود برمنصب اوکہ ہزاری بود پانصدی افزودہ شد" (تزک جہانگیری جشن ہفتمیں نوروز)

دولت خاں کے کوئی اولاد نہیں تھی، البتہ ان کے بھائی ساگر سنگھ کے پانچ لڑکے تھے، ہری بنس سنگھ، دیال سنگھ، گوپال سنگھ، جے نرائن سنگھ، کھڑک سنگھ۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی ریاست کے مالک ہندو دستور کے مطابق ان کے بڑے بھتیجے ہری بنس سنگھ ہوئے، ہری بنس سنگھ نے بینہ نگر میں ایک کوٹ (قلعہ) تعمیر کرا کے اس کو ریاست کا مرکزی مقام بنا دیا، اور اپنی جاگیر کے حدود میں اپنے خاندان کے افراد کے ناموں پر کئی گاؤں بسائے جو سرائے ساگر، بھیمن پور، دولت پور، دولت آباد، دیال پور، گوپال پور، ہری بنس پور کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اسی ہری بنس پور میں دریائے ٹونس کے کنارے ایک کوٹ بھی تعمیر کرائی تھی جس کے نشانات ابھی موجود ہیں، ہری بنس سنگھ کے دو لڑکے گمبھیر سنگھ اور دھرڑی سنگھ، ان کے فوت ہو جانے پر گمبھیر سنگھ بڑے لڑکے کے حصہ میں یہ ریاست آئی، گمبھیر پور، اور گمبھیرین دو گاؤں ان کے بسائے ہوئے آج بھی موجود ہیں، انھیں ایک راج پوت نے قتل کر دیا تھا۔

ہری بنس سنگھ کے چچا بھیمن سنگھ (دولت خاں) کے مسلمان ہو جانے پر ان کی بیوی اپنے چھوٹے بھتیجے دھرڑی سنگھ کے ساتھ الگ رہنے لگی تھی اسی کی جائے قیام رانی کی سرائے سے مشہور ہوئی۔

گمبھیر سنگھ کے مقتول ہو جانے پر دھرڑی دھر جاگیر کے مالک ہوئے، انھیں کا بسایا ہوا گاؤں دھرڑی پور ہے، ان کے تین لڑکے تھے: وکرم جیت سنگھ، نارائن سنگھ اور رودر پرساد سنگھ، وکرم جیت باپ کے مرنے کے بعد ریاست کے حقدار بنے، ان کا اپنے دونوں بھائیوں سے نباہ نہ ہو سکا، اس لئے تینوں بھائیوں نے الگ الگ اپنی رہائش گاہ بنالی، نارائن سنگھ "ہنوا" میں کوٹ تعمیر کر کے رہنے لگے، اور رودر سنگھ نے بچھول کو اپنی سکونت کے

لیے منتخب کیا، وکرم جیت نے دونوں بھائیوں کو ان کی جائے سکونت کے قریب کے مواضعات گذر بسر کے لیے دے دیئے، رودر سنگھ کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی صرف ایک لڑکی تھی جس کی شادی انول میں ہوئی تھی، وکرم جیت کے دل میں یہ خدشہ ابھرا کہ رودر سنگھ کے مرنے کے بعد بچھول کی جائیداد ان کی لڑکی کے سسرال چلی جائے گی، اس لئے انھوں نے کسی کے ذریعہ رودر سنگھ کو قتل کرا دیا اور بچھول کی جائیداد پر خود قبضہ کرلیا، رودر سنگھ کی بیوی بھوانی کنور نے اپنے بھائی کی مدد سے قاضی کی عدالت میں فریاد رسی کی، چنانچہ وکرم جیت قید کر کے دارالحکومت بھیج دیئے گئے، یہاں آنے کے کچھ عرصہ بعد انھوں نے اسلام قبول کرلیا، انھیں قید سے رہائی مل گئی، چونکہ ان کی بیوی اپنے ہندوانہ مذہت ہی پر تھی اس لیے انھوں نے ایک نومسلم راجپوت کی لڑکی سے نکاح کرلیا، ان کی اسی مسلمان بیوی سے دو لڑکے اعظم خاں اور عظمت خاں ہوئے، یہی اعظم خاں اور عظمت خاں علی الترتیب اعظم گڈھ اور عظمت گڈھ کے بانی ہیں۔

ہری بنس سنگھ نے مینہ نگر کو ریاست کا مرکز قرار دیا تھا، جاگیر کا انتظام والنصرام یہیں سے انجام پاتا تھا، لیکن جب اعظم خاں ریاست کے مالک ہوئے تو انھوں نے ضرورت محسوس کی کہ ریاست کی راجدھانی ایسے درمیانی مقام پر بنائی جائے جہاں سے پوری ریاست کے انتظام اور بندوبست میں سہولت ہو، علاوہ ازیں اطراف کے راجپوت جو وقتاً فوقتاً ہنگامہ اور سرکشی کرتے رہتے ہیں ان کو قابو میں رکھنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ ان کے قریب رہا جائے، چنانچہ ان مقاصد کے تحت انھوں نے ۱۶۶۵ء م ۱۰۷۶ھ میں دریائے ٹونس کے شمالی ساحل پر اپنے نام سے ایک شہر آباد کیا، اس وقت سے مینہ نگر کے بجائے اس نئے شہر ''اعظم گڈھ'' کو مرکزیت حاصل ہوگئی، فی الواقع شہر اعظم گڈھ کی تاریخ کا سیاسی وانتظامی باب اسی وقت سے شروع ہوتا ہے۔

شہر اعظم گڈھ کی آبادی خاص منصوبہ کے تحت قائم کی گئی کہ اس کے محلے ذات، برادری اور حکومت کے اہل کاروں وغیرہ کے نام پر الگ الگ بسائے تھے۔

اعظم خاں جہاں ایک اچھے منتظم تھے، وہیں شجاعت اور بہادری میں بھی ان کی

شہرت تھی، اسی بناء پر سلطان عالمگیر نے انھیں اپنی فوج کے ساتھ شیواجی کے مقابلے کے لیے بھیجا تھا۔ اس مہم سے واپسی پر دہلی جانے کے بجائے یہ قنوج میں رک گئے، جس کی وجہ سے سرکاری حکام کو ان کی وفاداری پر بے اطمینانی ہوئی اور وہ قنوج کے قلعہ میں نظر بند کر دیئے گئے، اسی نظر بندی کی حالت میں ۱۶۷۷ء م ۱۰۸۸ھ میں ان کا انتقال ہوگیا، چونکہ وہ لاولد تھے اس لیے ان کے چھوٹے بھائی عظمت خاں نے ریاست کی گدی سنبھالی، چونکہ ان کے بڑے بھائی اعظم خاں کی وفات سرکاری قید میں ہوئی تھی، اس لیے مرکزی حکومت سے انھیں ایک طرح کی پرخاش ہوگئی اور انھوں نے حکومت کو محصول دینا بند کر دیا، سلطان عالمگیر نے ان کے مقابلے کے لیے فوج دار چھبیلے رام کو ایک دستہ فوج کے ساتھ بھیجا، عظمت خاں نے حکمت عملی سے چھبیلے رام کو مع ان کی فوج کے اپنے قلعہ میں محصور کرلیا، اس کی اطلاع جب مرکز کو پہنچی تو ایک دوسرا لشکر صوبیدار ہمت خاں کی ماتحتی میں یہاں پہنچا، عظمت خاں کی فوج اور مرکزی حکومت کے لشکر کے درمیان ہری بنس پور میں گھمسان کی جنگ ہوئی، عظمت خاں شکست کھا کر مع اہل وعیال اور اپنے وزیر بلدیو مصرا کے میدان چھوڑ کر بھاگے، ہمت خاں نے ان کا تعاقب کیا، اور ہر طرف سے ان کا محاصرہ کرلیا، تو وہ اپنے وفادار وزیر بلدیو مصرا کے ساتھ دریائے گھاگھرا میں کود گئے، بلدیو مصرا کسی طرح بچ کر کنارے پہنچ گئے، مگر عظمت خاں اسی میں غرق ہوکر لاپتہ ہوگئے، عظمت خاں کے دو بیٹے اکرام خاں اور مہابت خاں سرکاری فوج کے محاصرہ سے کسی طرح بچ کر نکل بھاگے، البتہ سردار خاں اور نوبت خاں پسران عظمت خاں گرفتار کرلیے گئے، یہی اکرام خاں بن عظمت خاں، اپنے والد کے بعد تخت نشین ہوئے، یہ بھی لاولد فوت ہوئے، تو ان کے جانشین مہابت خاں ابن عظمت خاں ہوئے۔ مہابت خاں کے دور میں ریاست اعظم گڈھ کو بڑا عروج حاصل ہوا، اس کی مشرقی سرحد پرگنہ گھوسی میں مدھوبن تھی، اور مغربی حد اترولیہ کے قریب کُہنارپور میں تھی، شمالی سرحد دریائے گھاگھرا اور جنوبی دریائے گنگا تھی، جس طرح ان کے والد عظمت خاں نے سرکاری محصول روک کر مرکز سے جنگ مول لی، اسی طرح مہابت خاں نے بھی محصول روک کر اودھ کے حکمراں سعادت علی خاں سے اختلاف

پیدا کرلیا، بالآخر دونوں میں جنگ کی نوبت پہنچی اور مہابت خاں گرفتار کر کے گورکھپور کے قلعہ میں نظر بند کر دیئے گئے اور اسی حالت قید میں وہ ۱۷۳۱ء م ۱۱۴۴ھ میں فوت ہوئے، تو ان کے لڑکے ارادت خاں ریاست کے گدی نشیں ہوئے، انھیں کے زمانہ میں، صفدر جنگ نواب اودھ اور نواب احمد خاں بنگش والیٔ فرخ آباد میں باہم مقابلہ آرائی ہوئی تو ارادت خاں نے احمد خاں بنگش کا ساتھ دیا، اس لیے نواب صفدر جنگ نے کامیابی کے بعد انھیں ہٹا کر ان کے لڑکے جہاں خاں کو ریاست کی گدی پر بٹھا دیا، جہاں خاں نے بھی سرکاری مال گزاری ادا نہیں کی، اس لیے نواب اودھ کے عامل نظام آباد اور جہاں خاں کے درمیان ۱۷۶۱ء م ۱۱۷۵ھ میں نظام آباد میں معرکۂ کارزار گرم ہوا اور دونوں اس جنگ میں مارے گئے، اس لیے اعظم گڈھ کی زمینداری غازی پور کے صوبیدار فضل علی خاں کے حوالہ ہوگئی، جس پر وہ تین سال تک قابض رہے، اور جب ۱۷۶۴ء م ۱۱۷۸ھ میں شجاع الدولہ کی انگریزوں کے مقابلہ میں شکست ہوگئی تو جہاں خاں کے بھائی جہانگیر خاں کے بیٹے اعظم خاں ثانی نے موقع پا کر اپنی موروثی زمینداری پر قبضہ کرلیا جس پر وہ اپنی آخری حیات ۱۷۷۱ء م ۱۱۸۵ھ تک قابض رہے۔

اعظم خاں ثانی ہندی زبان کا ادیب وشاعر تھا، ''سنگار درپن'' نام سے اس کی ہندی تصنیف ہے، اس کے بعد جہاں یار خاں برادر خرد اعظم خاں ریاست کے والی ہوئے، انھوں نے اپنے بھائی کے درباری شاعر ''برجو مصرا'' کو جس نے اعظم خاں کی توصیف میں ''اعظم خانی ستاسائی'' لکھی تھی ۵۲ بیگھ زمین انعام میں دی، جہاں یار خاں کچھ ہی دنوں حکومت کر سکے تھے کہ ۱۷۷۲ء م ۱۱۸۶ھ میں نواب اودھ کے وزیر ایلچ خاں نے ان سے یہ علاقہ چھین کر نوابی میں شامل کرلیا، اسی وقت سے یہ جاگیر اودھ حکومت کا ایک چکلہ (محلہ، ضلع) بن گئی، جس کے عامل و منتظم کو چکلہ دار کہا جاتا تھا، اس طرح ''دولت خان مینہ نگری نے جو ریاست قائم کی تھی اور موروثی طور پر ان کے اہل خاندان کے قبضہ میں رہی اودھ حکومت کی چیرہ دستی سے اس خاندان کے قبضہ سے ہمیشہ کے لیے نکل گئی، اور ۱۸۰۱ء م ۱۲۱۶ھ تک نواب اودھ کے چکلہ داروں کے ماتحت رہی، ان چکلہ داروں کے زمانے میں

مال گذاری وصول کرنے کی خدمت نمبرداروں کو انجام دینی پڑتی تھی۔ دل دار جہاں ماہلی، میر عبداللہ سرائے میری، میر فضل علی محمد آبادی، مترسین آرمی وغیرہ نمبردار مقرر کیے گئے تھے اور مرزا عطا بیگ خاں کابلی، راجہ بھوانی پرشاد، بابو جگروپ سنگھ وغیرہ چودہ چکلہ دار ۱۸۰۱ء م ۱۲۱۶ھ تک اس علاقہ پر مسلط کیے گئے، جنھوں نے (باستثناء دو کے) ظلم وزیادتی کی حد کردی تھی، آخری چکلہ دار جگروپ کے زمانہ ۱۸۰۱ء میں یہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری میں چلا گیا، اور بنارس کے انگریز کلکٹر نے اعظم گڈھ کے چکلہ دار سے چارج لیا، ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس چکلہ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ کو جون پور کے کلکٹر اور دوسرے حصہ کو گورکھپور کلکٹر کے ماتحت کردیا۔ پھر ۱۸۳۶ء م ۱۲۵۲ھ میں اعظم گڈھ کو مستقل ضلع کی حیثیت دی گئی اور سب سے پہلے کلکٹر مسٹر تھامسن مقرر ہوئے۔

چکلہ داروں کے زمانہ میں جہاں یار خاں کے بیٹے نادر خاں اپنی وراثت کے حاصل کرنے کی غرض سے چکلہ داروں سے برسرپیکار رہتے تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی نے انھیں تین سو ماہوار کی پنشن اور بارہ گاؤں کی زمین داری دے کر علاقہ میں امن وامان قائم کیا، ۱۸۲۶ء م ۱۲۴۲ھ میں ان کا انتقال ہوگیا، تو ان کے بیٹے مبارک خاں نے ان کی جگہ لی، جن کو راجہ کا موروثی خطاب دوبارہ ملا، مبارک خاں نے ۱۸۵۸ء م ۱۲۷۵ھ میں وفات پائی اور ان کے صاحبزادے راجہ سلامت خاں مسند نشین ہوئے، یہ گورنمنٹ اور عام پبلک میں نہایت مقبول تھے، ۱۹۱۲ء م ۱۳۳۱ھ میں ان کا بھی انتقال ہوگیا (حیات شبلی ص ۷۶) ان کی وفات کے بعد اس خاندان کے کسی فرد کا ذکر نوشتوں میں نہیں ملتا۔

یہ ضلع ۱۹۸۸ء م ۱۴۰۹ھ تک چھ تحصیلوں پر مشتمل تھا: (۱) صدر (۲) تحصیل پھولپور (۳) تحصیل لال گنج (۴) تحصیل محمد آباد (۵) تحصیل سگڑی (۶) تحصیل گھوسی، پھر اسی سن یعنی ۱۹۸۸ء میں تحصیل محمد آباد، تحصیل گھوسی اور تحصیل سگڑی کو ضلع اعظم گڈھ سے الگ کر کے ضلع مئو ناتھ بھنجن بنایا گیا، اور ضلع اعظم گڈھ کو کمشنری کا درجہ دیا گیا۔

یہ ہے اعظم گڈھ کی انتظامی اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والی سیاسی کشمکش کی مختصر روداد جو شبلی کالج کے ایک طالب علم کے بی۔ایڈ کے مقالہ سے ماخوذ ہے۔ اس مقالہ سے

زاید اگر کوئی بات لکھی گئی ہے تو اس کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ شہر اعظم گڈھ کی خوش بختی کے لیے یہ کافی ہے کہ اس کے گہوارہ میں دارالمصنفین (شبلی اکاڈمی) جیسا باوقار تصنیفی ادارہ ہے جو اپنی عہد آفریں مطبوعات کی بناء پر برصغیر ہی نہیں بلکہ ایشیا میں اپنا ایک ممتاز مقام و مرتبہ رکھتا ہے، اور اس کا ''ماہ نامہ معارف''، علم و ادب کے افق پر بدر کامل بن کر چمک رہا ہے۔

اس خطۂ اعظم گڈھ پہ مگر فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر تاباں ہوتا ہے

☆ ☆ ☆

الف

حضرت مخدوم ابراہیم بخاری مینہہ نگری

حضرت مخدوم ابراہیم کا مزار فیض بار قصبہ مینہہ نگر ضلع اعظم گڈھ میں بازار سے پچھم جانب ایک مسجد کے صحن میں ہے، آپ کہیں اور سے آکر یہاں مقیم ہو گئے تھے، اس وقت یہ علاقہ خالص راجپوتوں پر مشتمل تھا، جن میں آپ کا یہاں آبسنا انھیں گوارا نہیں تھا، چنانچہ حضرت مخدوم ایک مرتبہ ایک تالاب پر اپنے کپڑے دھو رہے تھے تالاب کے مالک نے آپ کو کپڑا دھونے سے منع کر دیا، آپ وہاں سے چلے آئے، آج بھی یہ تالاب ایک گندی گڑھی کی صورت میں موجود ہے، بادشاہ اکبر کے زمانہ میں جب دہلی سے فوج یا کوئی وفد بنگال کو جاتا تو رسالدار آپ سے ملنے ضرور آتا۔ مینہہ نگر کے علاقہ میں اسلام کی جو روشنی پھیلی اس میں آپ کا بڑا حصہ ہے۔ (مناقب غوثی)

تفصیلی حالات دستیاب نہیں ہیں۔

مخدوم شیخ ابراہیم دانشمند محمد آبادیؒ

حضرت مخدوم ابراہیم دانش مند نبیرۂ شیخ اسماعیل محمد آبادی دور اکبری کے مشہور و نامور مشائخ میں تھے، ان کے مورث اعلیٰ شیخ بہاء الدین جو حضرت شیخ جمال ہانسوی کی اولاد میں تھے، سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے عہد میں سندھالہ سے ترک وطن کر کے محمد آباد گوہنہ میں اقامت پذیر ہو گئے تھے، ان کے کشف و کرامات کے واقعات اس دیار میں اب تک مشہور ہیں۔

شیخ ابراہیم کی ولادت اور نشو و نما محمد آباد میں ہوئی اور تا حیات محمد آباد ہی میں مقیم رہے، اکبر بادشاہ بنگالہ کی مہم پر جاتے وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور دعا چاہی تھی، آپ کا مزار بیرون آبادی مرجع خلائق ہے، ایک زمانہ تک آٹھویں صفر کو سالانہ عرس بھی ہوتا تھا۔

حضرت مخدوم شیخ بوڈھن ساکن اپچولی شیخ ابراہیم دانشمند کے بڑے خلفاء میں سے ہیں۔
(حدائق البیان فی معارف القرآن ص ۲۳۲ بحوالہ مرأۃ الاسرار)

شیخ ابراہیم اور محمد آباد کے دیگر مشائخ کے حالات بحر ذخار میں بھی ہیں، آج سے دو سال قبل میں نے بحر ذخار میں ان بزرگوں کے حالات دیکھے تھے، مگر قلت وقت کی وجہ سے تحریر نہ کرسکا جس کا اب تک صدمہ ہے۔

حضرت شاہ حافظ ابواسحاق محدّث بھیرویؒ

آپ حضرت شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے فرزند ارجمند اور جانشین ہیں۔ حضرت گرم دیوان کے دو نامور خلیفہ تھے، ایک حضرت شاہ معشوق غازی پوری، دوسرے یہی حضرت شاہ ابواسحاق۔

آپ کی ولادت بھیرا میں ہوئی، قرآن کریم حفظ کرنے کے بعد اپنے والد ماجد اور دوسرے اساتذہ سے تحصیلِ علم کی، جن میں قاضی عبدالصمد بن ابوالحسن چریا کوٹی متوفی ۱۱۷۱ھ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ (تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲۱)

تراجم علمائے حدیث میں شاہ صاحب کے شیوخ میں مولانا شیخ محمد ناصح کے نام کی بھی تصریح ہے۔ (تراجم علمائے حدیث، ص ۳۸۲)

شیخ محمد ناصح مولانا محمد فاخر محدّث الٰہ آبادی کے مخصوص تلامذہ میں تھے، ان اساتذہ سے تحصیل علوم وفنون کرکے الٰہ آباد کا سفر کیا۔ اس وقت مولانا محمد فاخر محدّث الٰہ آبادی اپنے علم وفضل کی بنا پر مرجع بنے ہوئے تھے، شاہ صاحب ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے اور تکمیل کرکے سندِ فراغ حاصل کی۔ (۱)

(۱) مولانا محمد فاخر شیخ محمد یحییٰ خوب اللہ متوفی ۱۱۴۴ھ کے صاحبزادے ہیں، اپنے دور کے زبردست محدّث اور صوفی تھے، اپنے چچا شیخ افضل اور بھائی شیخ محمد طاہر سے کتب درسیہ کی تحصیل کی اور اپنے والد محترم سے فیضیاب ہوکر بائیس برس کی عمر میں ان کے خلیفہ ہوئے۔ ۱۱۴۹ھ میں زیارت حرمین شریفین کے موقع پر شیخ محمد حیات سندھی مدنی متوفی ۱۱۶۳ھ سے صحیح بخاری ومسلم وغیرہ پڑھ کر اجازت عامہ حاصل کی، اتباع سنت کا سخت اہتمام کرتے تھے، ساری زندگی تدریس وتالیف اور اصلاح وتبلیغ میں گذاردی۔ ۱۱/ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ میں بحالتِ سفرِ حج برہان پور میں فوت ہوئے اور شیخ عبداللطیف برہان پوری کے پہلو میں دفن ہوئے، تفصیل کے لیے دیکھیے: تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۶، سروآزاد۔ نزہۃ الخواطر۔

مولانا محمد فاخر فقہی مسائل میں مجتہدانہ شان کے مالک تھے، کتاب وسنت اوراپنے اجتہاد پرعمل کرتے تھے، ان کے تلمیذ رشید شاہ ابواسحاق پر بھی یہی رنگ غالب تھا۔ شاہ ابواسحاق علم وعمل کی جامعیت میں نادرۂ روزگار تھے، زہد وتقوی اور جادۂ شریعت ان کا شعار تھا۔ مولانا رحمان علی رقمطراز ہیں:

منظہر محاسن اخلاق شاہ ابواسحاق، ذات شریفش نادرۂ روزگار، مذکر شیم صحابۂ کبار بود، زہد وتقوی شعارش واحراز اسرار شریعت دثارش افتاد در تصحیح احادیث نبویہ علیہ الصلوۃ والتحیہ ملکۂ وہبی داشت وتعلیم علوم ظاہر وباطن پرداخت ودر مواظبت سنت سنیہ اندکے تغافل نمی ورزید۔

شاہ ابواسحاق محاسن اخلاق کے مظہر تھے، ان کی ذات نادرۂ روزگار تھی جس سے صحابۂ کبار کی سیرت کی یاد تازہ ہوجاتی تھی، زہد وتقویٰ اور رموز شریعت ان کا اوڑھنا بچھونا تھے، تصحیح احادیث میں وہبی ملکہ رکھتے تھے، ظاہری اور باطنی علوم کی تعلیم میں مشغول رہتے تھے، پابندیٔ سنت میں ذرا بھی غفلت نہیں کرتے تھے۔

شاہ ابواسحاق صاحب مولانا فاخر الہ آبادی کی خدمت وصحبت کے بعد لہرا آئے، جہاں آپ کے والد بزرگوار گھربار کے جھمیلوں سے الگ ہوکر ذکرواذکار اور تعلیم وارشاد میں مصروف تھے، والد ماجد کی خدمت میں رہ کر احسان وسلوک کی منزلیں طے کیں اور خرقۂ خلافت حاصل کرکے ان کے جانشین ہوئے اور مدت العمر یہیں رہ کر تعلیم وارشاد میں مشغول رہے، ایک بڑی جماعت نے آپ سے کسب علم وفضل کیا۔ (نزہۃ الخواطر، ص ۹، ج ۷)

ان میں مولانا احمد علی چریاکوٹی متوفی ۱۲۷۲ھ کا نام نامی سرفہرست ہے۔

نزہۃ الخواطر میں ہے:

ولازم الشیخ ابا اسحق بن ابی الغوث واخذ عنہ الاذکار والاشغال.

مولانا احمد علی نے شیخ ابواسحاق کی خدمت میں رہ کر ان سے اذکار واشغال کی تعلیم وتلقین حاصل کی۔

شاہ صاحب کی تصانیف میں ایک رسالہ عربی زبان میں ''نور العینین فی اثبات رفع

الیدین‘‘ ہے، اس کا قلمی نسخہ پٹنہ میں مولانا محمد سعید مغل پوری کے کتب خانہ میں تھا اور ایک روایت کے مطابق مولانا شمس الحق ڈیانوی کے کتب خانہ میں تھا۔ (تذکرہ علمائے مبارکپور، ص ۱۹۵ وتراجم علمائے اہل حدیث ص ۳۸۳)

شاہ ابواسحاق نے ۱۲۳۴ھ میں لہرا میں انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے بقول ضلع اعظم گڈھ میں مسلک اہل حدیث کی بنیاد شاہ ابواسحاق ہی کے ذریعہ وجود میں آئی۔ (تذکرہ علماء ہند، ص ۹ وتذکرہ علمائے مبارک پور ص ۹۶)

مولانا ابوالبرکات مئویؒ

حضرت مولانا ابوالبرکات ۱۲۹۳ھ میں ضلع اعظم گڈھ کے مشہور صنعتی قصبہ مئو میں پیدا ہوئے، والد محترم کا نام شیخ عبداللہ ہے، شیخ عبداللہ ایک صاحبِ نسبت بزرگ تھے اور معروف ومشہور بزرگ عارف باللہ حضرت چاند شاہ ٹانڈوی قدس سرہ کے مرید اور فیض یافتہ تھے۔

مولانا ابوالبرکات نے ابتدائی کتابیں گھر ہی پر پڑھیں، اسکے بعد اپنے بڑے بھائی حضرت استاذ العلماء مولانا عبدالغفار مئوی کی خدمت میں حاضر ہوئے، مولانا عبدالغفار صاحب اس وقت مدرسہ انوار العلوم نوانگر ضلع بلیا میں تدریسی خدمت انجام دے رہے تھے۔ مولانا ابوالبرکات نے یہیں مولانا سے صرف ونحو، ادب، بلاغت، فقہ، اصولِ فقہ، فرائض، حدیث اور تفسیر کی تعلیم حاصل کی، ان علوم میں دستگاہ حاصل ہوجانے کے بعد دورۂ حدیث پڑھنے کی غرض سے قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱) کی خدمت میں

(۱) قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد بن ہدایت احمد انصاری گنگوہی ان سربرآوردہ اور نادرۂ روزگار ہستیوں میں ہیں جن کی نظیر عالم میں خال خال ہی ملتی ہے۔ آپ ۶/ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۸/جمادی الاخری ۱۳۲۳ھ میں ۷۹ برس ۷ ماہ کی عمر پاکر اپنے محبوب حقیقی سے جاملے، اتباع سنت، عمل بالعزیمت، استقامت علی الشریعت اور ترک بدعت میں اپنی مثال آپ تھے، علمی وروحانی دونوں صفتوں کے جامع تھے اور تادمِ حیات طلبۂ علوم ومکتسبان فیوض کو مستفید فرماتے رہے، اجرائے سنت اور ازالۂ بدعت کے سلسلے میں آپ نے کارہائے نمایاں انجام دیے، ساتھ ہی متعدد اہم کتابیں بھی تصنیف فرمائیں۔ تفصیل کے لیے تذکرۃ الرشید، تاریخ مشائخ چشت، مقدمہ اکمال الشیم اور نزہۃ الخواطر ص ۱۴۸ کا مطالعہ کریں۔

گنگوہ حاضر ہوئے اور وہیں دورۂ حدیث کی تکمیل کی، پھر وہاں سے وطنِ مالوف کی جانب مراجعت کی اور پوری زندگی علماء وصلحاء کے طریق پر درس وتدریس اور وعظ وتذکیر میں گذار دی، بھوروواں ضلع بلیا، مئو ضلع اعظم گڈھ، بہادر گنج ضلع غازی پور کے مدارس میں تعلیمی خدمات انجام دیں۔ مولانا ابوالبرکات کے وعظ میں عجیب تاثیر تھی، امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں کسی کی کچھ پروانہ کرتے تھے۔

سلوک وتصوف میں ضلع کے مشہور مرشد حافظ حامد حسن (۱) ساکن کوہنڈا سے عقیدت وارادت رکھتے تھے، ۳۹ برس کی قلیل عمر میں بعارضۂ طاعون وفات ہوئی اور احاطہ حکیم محمد عمر محلہ اورنگ آباد میں دفن کیے گئے۔ سن وفات ۱۳۳۲ ہجری ہے۔ (از مولانا انعام الحق صاحب برادرزادہ مولانا ابوالبرکاتؒ)

قاضی ابوالحسن عباسی چریاکوٹیؒ

قاضی ابوالحسن چریاکوٹی، چریاکوٹ کے مشہور علماء میں سے تھے، مولانا محمد حاکم چریاکوٹی کے خاص شاگرد تھے۔ مولانا حاکم اپنے والد کی وفات کے بعد پروانہ قضا کے حصول کے لیے کسی وجہ سے خود دہلی نہ جاسکے تو انھوں نے قاضی ابوالحسن کو بھیج دیا، وہ نواب قمرالدین خاں وزیر سے ملے اور اس سلسلے میں گفتگو کی، وزیر موصوف نے کہا محمد حاکم کو خود آنا چاہیے تھا تاکہ ان کی لیاقت اور قابلیت پرکھی جاتی۔ ابوالحسن نے جواب دیا، چونکہ دہلی میں علماء کا قحط ہے، ان کی لیاقت کا پرکھنے والا کوئی نظر نہیں آتا، اس لیے انھوں نے اپنے حقیر شاگردوں میں سے مجھے بھیجا ہے۔ وزیر موصوف کو قاضی ابوالحسن کی یہ بات ناگوار گذری چنانچہ انھوں نے ابوالحسن کی رضامندی سے بزم مناظرہ منعقد کرائی جس میں علمائے دہلی جمع ہوئے، لیکن کوئی بھی بحث میں ابوالحسن سے پیش نہ لے جاسکا، نواب باوجود ناراضگی کے بہت

---

(۱) حافظ حامد حسن بن شیخ کریم بخش کی ولادت ۱۲۸۸ھ یا ۱۲۸۹ھ میں کوہنڈہ ضلع اعظم گڈھ میں ہوئی، ظاہری تعلیم حفظ قرآن، ابتدائی فارسی، ابتدائی عربی سے آگے نہ بڑھ سکی، لیکن باطنی علم میں کمال حاصل تھا، مسائل اور تاریخ اسلام میں بڑی اچھی نگاہ تھی، حضرت سیّد عبدالباری متوفی ۱۳۱۹ھ مدفون بندیل ضلع ہوگلی کے خلیفہ ارشد اور جانشین تھے، ۱۳۷۹ھ میں گونڈہ میں وفات ہوئی اور وہیں دفن ہوئے، آپ کے سلسلے میں عوام کے علاوہ بے شمار علما بھی داخل تھے۔

متاثر ہوا اور ابوالحسن کے انکار کے باوجود اس نے عہدۂ قضا کا فرمان محمد حاکم کے بجائے ابوالحسن کے نام لکھ دیا۔ (رسالہ اسلام اور عصر جدید جولائی ۱۹۷۳ء بحوالہ یادداشت چریا کوٹ قلمی)

مولانا ابوالحسن مئویؒ

حضرت مولانا ابوالحسن بن شیخ عبداللہ مئوی، مولانا ابوالبرکات مئوی کے چھوٹے بھائی تھے ۱۲۹۶ھ میں بمقام مئو پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر ہی پر مکمل کی، پھر اپنے بڑے بھائی استاذ العلماء حضرت مولانا عبدالغفار مئوی کی خدمت میں نوانگر ضلع بلیا کے مشہور مدرسہ انوار العلوم میں حاضر ہوئے اور جملہ علوم وفنون کی تعلیم انھیں سے حاصل کی اس کے بعد حضرت گنگوہیؒ کے آستانہ پر پہونچے اور وہاں دورۂ حدیث کی تکمیل کی اور وطن مالوف واپس آئے۔

اپنے دونوں بڑے بھائیوں کی طرح مولانا ابوالحسن نے بھی درس وتدریس اور وعظ و تذکیر کے مشغلہ کو اختیار کیا اور مختلف مدارس میں تعلیمی خدمات انجام دیں، قصبہ مئو کے مشہور مدرسہ جامعہ مفتاح العلوم میں آپ نے ایک عرصہ تک نظامت کے فرائض انجام دیے، اس کے علاوہ ایک مدرسہ قصبہ لار ضلع دیوریا میں مفیض العلوم کے نام سے قائم کیا، اس مدرسہ کے افتتاح کے وقت حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ اور حضرت مولانا عبدالغفار مئویؒ لار تشریف لے گئے تھے۔

انھیں مشاغل کے ساتھ مولانا نے جوانی کی عمر میں قرآن عزیز بھی حفظ کیا اور ہر سال تراویح میں بالالتزام قرآن سناتے رہے۔

مولانا کو سلوک وطریقت سے فطری لگاؤ تھا، چنانچہ اوائل میں ضلع کے مشہور مرشد حضرت حافظ حامد حسن کوہنڈوی سے اصلاح وتربیت کا تعلق قائم کیا، پھر حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سے عقیدت وارادت ہوئی اور ان سے بیعت کی اور خلافت سے سرفراز ہوئے۔

اس زمانہ میں خاتم المحدثین حضرت مولانا انورشاہ کشمیری شیخ الحدیث دارالعلوم

دیوبند کے درس حدیث کا غلغلہ بلند ہورہا تھا، مولانا ابوالحسن کے بعض تلامذہ جب دارالعلوم سے فارغ ہوکر وطن واپس آئے اور ان کی زبانی مولانا کو حضرت شاہ صاحبؒ کے کمالاتِ علمی کا حال معلوم ہوا تو مولانا کو بھی ان سے استفادہ کا شوق دامن گیر ہوا، چنانچہ ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء (۱۳۳۸ھ یا ۱۳۳۹ھ) میں دارالعلوم دیوبند پہونچے اور علامہ کشمیریؒ کے درس میں حاضر ہوکر اسباق حدیث کی سماعت کرتے رہے، اسی زمانہ میں مناظر اسلام مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری(۱) سے آپ کے مراسم اور دوستانہ تعلقات پیدا ہوئے، دیوبند کئی ماہ قیام کرنے کے بعد اپنے مرشد حضرت تھانویؒ کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوئے اور وہاں بھی کچھ دنوں تک قیام کیا اور حضرت حکیم الامت کے علمی و روحانی فیوض سے مستفیض ہوئے۔

مولانا ابوالحسن اہل اللہ اور علماء وصلحاء کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان کے آستانہ پر حاضری دینے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

مولانا کو فتویٰ نویسی اور علم الفرائض میں ملکہ تامہ حاصل تھا، رد بدعات میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، اس فن میں آپ کی تصنیفات اس بات کی شاہد ہیں، مولانا نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں الفرائض، الجواب المحمود اور ایک منظوم رسالہ جو حمد ونعت اور نصائح پر مشتمل ہے طبع ہوچکی ہیں۔

تین بار حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے اور شیخ الدلائل حضرت مولانا عبدالحق مہاجر مکّی (مولف تفسیر اکلیل علی مدارک التنزیل) کی خدمت میں حاضر ہوکر حزب البحر اور دلائل الخیرات کی سند لی۔

---

(۱) حضرت مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوریؒ، حضرت مولانا محمد یعقوبؒ نانوتوی اور حضرت شیخ الہندؒ کے تلمیذ رشید اور حضرت حکیم الامت کے ہمعصر تھے، ذکاوت وطبّاعی میں علماء عصر میں خاص امتیاز رکھتے تھے، ساتھ ہی خطابت ومناظرہ میں بھی بےنظیر تھے، عرصہ دراز تک دربھنگہ اور مرادآباد وغیرہ کے مدارس میں صدارت تدریس کے فرائض انجام دیے، آخر میں دارالعلوم دیوبند میں نظامتِ تعلیم پھر نظامت تبلیغ کے عہدے پر فائز ہوئے، دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی وتدریسی خدمات بھی انجام دیں، آپ کو ردّ بدعت اور ردِّ قادیانیت سے خاص شغف تھا، اس سلسلہ میں آپ کی بہت سی قابل قدر تصانیف شائع ہوچکی ہیں۔

مولانا کے شاگردوں کی فہرست بڑی طویل ہے، جن میں مولانا حبیب الرحمن بن رحمت اللہ مرحوم اور مولانا علی احمد کوئریا پاری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

۶۵ برس عمر پاکر ۱۳۶۱ھ میں بعارضۂ ہیضہ وفات ہوئی اور عیدگاہ کے پیچھے محلہ اورنگ آباد میں دفن ہوئے۔ مادۂ تاریخ یہ ہے:

سالِ وفات جناب مولوی ابوالحسن صاحب مئوی

۱۳۶۱ھ (از مولانا انعام الحق)

شیخ ابوالخیر بھیرویؒ

الحاج شیخ ابوالخیر (متولد ۱۰۰۸ھ) بن شیخ ابوسعید گیارہویں صدی ہجری کے علمائے کبار میں سے تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

مولانا حاجی شاہ ابوالخیر، بن شیخ ابوسعید، بن شیخ معروف ثانی بن شیخ عثمان، بن شیخ ماہ، بن شیخ چاند، بن شیخ معروف، بن شیخ مشیّد بن شیخ محمد، بن شیخ خضر جون پوری فاروقی۔

شاہ ابوالخیر کے چھٹے دادا شیخ مشیّد کو سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے پرگنہ محمد آباد (ضلع اعظم گڈھ) میں بارہ گاؤں کی جاگیر عطا کی تھی، اسی مناسبت سے شیخ مشیّد کے صاحبزادے شیخ معروف اور شیخ علیؒ نے ولید پور کے قریب سلطان پور بھیرا کے نام سے ایک بستی بسائی اور ان کی اولاد نے جونپور سے یہاں آکر جاگیرداری کا انتظام سنبھالا، اس طرح یہ خاندان یہاں مستقل آباد ہوگیا۔ شاہ ابوالخیر کی بھیرا ہی میں ۱۰۰۸ھ میں ولادت ہوئی، سنِ شعور کو پہنچے تو ابتدائی تعلیم اپنے والد شیخ ابوسعید سے حاصل کی، پھر طلب علم میں مختلف شہروں کا سفر کیا اور متعدد علماء سے تحصیل علم کر کے مروجہ علوم وفنون کی تکمیل کی، اور علمی لیاقت واستعداد میں یگانۂ روزگار ہوگئے کہ دیار پورب سے لے کر دہلی تک ان کے علم وفضل کا چرچا ہوگیا، حتی کہ ۱۰۳۲ھ میں جب شاہجہاں تخت نشیں ہوا، تو یہ دہلی گئے، امیر الامراء نواب شائستہ خاں نے نہایت احترام واکرام کے ساتھ اپنے یہاں رکھا اور ان سے حدیث، تفسیر، تصوف وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔

امیر الامراء کے ذریعہ شاہجہاں کو جب ان کے علمی کمالات کا علم ہوا، تو اس نے بھی نیازمندی اور قدردانی کا معاملہ کیا، اور چاہا کہ شیخ کوئی شاہی منصب یا جاگیر قبول کرلیں، مگر انھوں نے انکار کردیا۔ ایک مرتبہ شیخ صاحب شاہجہاں کی معیت میں سیالکوٹ گئے، شاہجہاں نے وہاں کے مشہور بزرگ شاہ میر کی خدمت میں نذرانہ پیش کیا، شاہ میر سیالکوٹی نے اس کے قبول کرنے سے انکار کردیا، بادشاہ نے جب اصرار کیا تو شاہ ابوالخیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''سزاوار ایں ہدیہ ایشانند کہ بانواع مشقت تحصیل علم نمودہ آں را بہجت آبروے بیجا صرف می نمایند'' اس نذرانہ کے لائق یہ ہیں کہ انھوں نے علم بڑی محنت سے حاصل کیا ہے اور اب اسے بیجا طور پر دنیوی عزت حاصل کرنے میں خرچ کررہے ہیں۔ میر صاحب کا یہ جملہ کام کرگیا، شیخ ابوالخیر کی علمی غیرت بیدار ہوگئی اور اسی وقت دربار شاہی سے بے تعلقی کا تہیہ کرلیا۔

شاہ ابوالخیرؒ نے ۱۰۵۶ھ میں حج کا ارادہ کیا اس موقع پر نواب شائستہ خاں نے عرض کیا کہ میرا آبی جہاز مکہ معظمہ جارہا ہے، اگر اجازت ہو تو اہل کاروں کو ہدایت کردی جائے کہ آنجناب کی خدمت اور راحت رسانی کا خیال رکھیں، شاہ صاحب نے یہ کہہ کر یہ پیش کش رد کردی کہ ''وائے بر ہمت وے کہ در راہِ دوست وسلۂ غیر درمیان آرد'' اس شخص کی ہمت پر افسوس ہے جو دوست کی راہ میں غیر کے سہارا کو درمیان میں لائے۔

اسی موقع پر شاہ صاحب نے اپنی مشہور کتاب ''شیر وشکر'' تصنیف کی تھی جس میں حرمین شریفین کی تاریخ، حج وزیارت کے احکام وآداب اور آخر میں اپنے خاندانی حالات درج کیے، یہی کتاب ان کے خانوادہ بالخصوص ملا محمود بھیروی جونپوری مصنف شمس بازغہ وغیرہ کے حالات کا سب سے مستند ماخذ ہے۔ شاہ صاحب نے حج وزیارت سے فراغت کے بعد کچھ مدت یہاں قیام کرکے حرمین شریفین کے علماء ومشائخ سے اکتساب فیض کیا، حج سے واپسی پر دنیوی علائق سے یکسو ہوکر موضع بھیرا میں گوشہ نشین ہوگئے۔

شاہ صاحب کا آستانہ سلطان پور عرف بھیرا دریائے ٹونس کے کنارے آبادی سے بجانب مغرب نہایت پر فضا مقام میں تھا، مکان کے سامنے ایک نہایت سایہ دار برگد کا

درخت تھا، جس کے نیچے ایک چبوترہ تھا، یہی چبوترہ آپ کی نشست گاہ تھا، ایک دن چبوترہ پر بیٹھے تھے کہ اچانک اٹھے اور اس چبوترہ پر چھڑی سے بقدر قبر نشان کھینچ دیا، موجود خدام نے آپ کے اس عمل پر کوئی توجہ نہیں دی، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اسی دن آپ بخار میں مبتلا ہو گئے اور شب گذار کر صبح کو اس دنیائے دوں کو چھوڑ کر دارِ آخرت میں اپنی منزل بنالی، یہ شوال کی گیارہویں تاریخ تھی اور سن ۱۰۵۹ھ تھا، اس وقت آپ کی عمر انسٹھ سال تھی، چنانچہ اسی خط کشیدہ مقام میں دفن ہوئے۔ (مناقب غوثی)

حضرت شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیرویؒ

شاہ ابوالغوث بن شیخ محمد شاہ بن شیخ اسماعیل بن شیخ حاجی ابوالخیر فاروقی بھیروی اس دیار کے ان علماء کبار ومشائخ عظام میں سے ہیں جنھوں نے اپنی علمی وروحانی سرگرمیوں سے مدرسہ وخانقاہ دونوں کو آباد کیا۔

آپ کے مورثِ اعلیٰ شیخ خضر فاروقی کو حضرت مخدوم ابوالفتح رکن الدین ملتانی متوفی ۷۳۵ھ سے خلافت واجازت حاصل تھی اور دارالحکومت دہلی میں متوطن تھے، یہیں ان کے صاحبزادے شیخ محمد کی ولادت ہوئی، تیموری فتنہ نے جب دہلی کو پرآشوب بنادیا تو شیخ خضر صاحبزادے کو لے کر جون پور چلے آئے، اس وقت جون پور سلطان الشرق ابراہیم شاہ شرقی کی علم نوازی، علماء پروری اور عدل گستری سے علم وامن کا باغ وبہار بنا ہوا تھا، سلطان الشرق نے شیخ خضر کی بڑی عزت افزائی کی، شیخ خضر کی وفات کے بعد شیخ محمد ان کے جانشین ہوئے، ان کے انتقال کے بعد ان کے لڑکے شیخ مشید ان کے جانشین ہوئے، تو سلطان الشرق نے انھیں ولید پور وغیرہ کی جاگیر عطا کی اور شیخ محمد کی وفات پر اظہار ہمدردی کیا۔ (تذکرہ علماء مبارک پور)

مناقب غوثی میں ہے:

سلطان ابراہیم از تعزیت کوفتہ شد آخر الامر حضرت مشید را صدر وجانشین آں مسند محتشم گردانید وبکمال نیازمندی در پرگنہ محمد آباد قریہ ولید پور بادیگر مواضع در وجہ معاش

مقرر داشت۔

سلطان ابراہیم شرقی شیخ محمد کے انتقال سے بہت رنجیدہ ہوا اور شیخ مشید کو ان کا جانشین مقرر کر کے از راہ نیازمندی پرگنہ محمد آباد میں ولید پور اور دوسرے مواضعات گذر بسر کے لیے مقرر کیے۔

جاگیر(۱) ملنے کے بعد یہ خاندان جون پور سے منتقل ہو کر بھیرا مستقل طور سے آباد ہو گیا، اس میں بڑے بڑے علماء مشائخ پیدا ہوئے۔ مولانا حاجی ابوالخیر متوفی ۱۰۵۹ھ شاہجہانی عہد کے علماء کبار اور مشائخ عظام میں تھے ان کے لڑکے مخدوم شاہ اسماعیل جو حضرت گرم دیوان کے دادا ہیں طبقۂ مشائخ میں خاص مقام ومرتبہ کے مالک تھے، ملا محمود مصنف شمس بازغہ بھی اسی سلسلۃ الذہب کی زریں کڑی تھے۔

حضرت گرم دیوان شب دوشنبہ ماہ ربیع الآخر ۱۱۰۰ھ کو بھیرا میں پیدا ہوئے، اس وقت ان کے دادا شیخ اسماعیل باحیات تھے، خاندانی رواج کے مطابق ان کے والد شیخ محمد نے تعلیم وتربیت کی طرف پوری توجہ دی، لیکن والد کا سایہ کم عمری ہی میں سر سے اٹھ گیا، والد کے انتقال کے بعد شاہ گرم دیوان نے بنارس غازی پور اور الہ آباد کا تعلیمی سفر کیا اور میر سیّد غلام احمد بن شاہ موسیٰ عاشقاں اودھی سے علوم مروجہ کی تکمیل کی، بعد ازاں شاہ فتح محمد حسینی میدانوی متوفی ۱۱۴۳ھ سے سلسلۂ چشتیہ میں بیعت کی، شاہ فتح محمد ہی نے آپ کو گرم دیوان کا لقب مرحمت فرمایا، چنانچہ شاہ شمس الدین حیدری جو شاہ گرم دیوان کے خاص مریدین اور خلفاء میں ہیں، شاہ صاحب کی سوانح مناقب غوثی میں لکھتے ہیں:

''بامر الٰہی از جناب ولایت مآب حضرت شاہ فتح محمد مرشد خود بخطاب گرم دیوان خطاب یافت''

صاحب مناقب کی اس تصریح سے تذکرہ علمائے ہند کی اس روایت کی کوئی اہمیت

---

(۱) تجلی نور سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی سے شیخ محمد اپنے اہل وعیال کے ساتھ جون پور آئے تھے، شیخ خضر کا کوئی ذکر نہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ خضر کی وفات دہلی ہی میں ہوئی، واللہ اعلم۔ شیخ محمد کی وفات ۳ر جمادی الاولی ۸۱۸ھ میں جونپور میں ہوئی اور وہیں محلہ سپاہ میں دفن ہوئے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے تجلی نور، حالات اولیا ص ۴۸-۴۶۔

باقی نہیں رہ جاتی کہ آپ کو گرم دیوان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ:

جسم مبارکش در بعض اوقات بخرق عادت غایت درجہ گرم می شد کہ نانِ گندم براں تواں پخت"۔

یعنی بعض اوقات خرقِ عادت سے آپ کا جسم اتنا گرم ہو جاتا تھا کہ اس پر گیہوں کی روٹی پکائی جا سکتی تھی۔ (تذکرہ علمائے ہند،ص ۵)

ظاہری و روحانی علوم میں تکمیل کے بعد شاہ ابوالغوث نے اپنے آبائی وطن بھیرا میں مسند ارشاد و تلقین کو زینت بخشی، مگر خانگی امور اور جاگیرداری کے کاموں کی وجہ سے سکون نہ مل سکا تو اپنے چھوٹے بھائی شیخ احمد شاہ کو زمینداری کا نظم و نسق سپرد کر کے خود موضع لہرا چلے گئے اور جنگل کے ایک گوشے میں سکونت اختیار کر کے عبادت الٰہی میں یوں مشغول ہوئے کہ کسی کو ان کے حالات کی خبر نہ تھی۔

لہرا کے دوران قیام میں شاہ ابوالغوثؒ نے راجہ سیّد خیر اللہؒ متوفی ۱۱۲۸ھ سے بھی سلسلۂ چشتیہ میں بیعت حاصل کی، راجہ سیّد خیر اللہؒ راجہ سیّد حامد شہ مانک پوریؒ کی اولاد میں بڑے مقام و مرتبہ کے مالک تھے، ان کا اصل نام راجہ سیّد غلام نظام الدین تھا اور خیر اللہ عرفیت تھی، مستقل قیام محمد آباد گوہنہ میں تھا اور یہیں ۷رجب ۱۱۲۸ھ میں فوت ہوئے۔

شاہ ابوالغوثؒ سے بے شمار خلق خدا کو فیض پہونچا، جن میں آپ کے صاحبزادے شاہ ابواسحاق بھیروی لہراویؒ اور بھتیجے شاہ عبدالحق اور شاہ معشوق علی غازی پوری خاص اہمیت اور شہرت کے مالک ہیں۔

شاہ ابوالغوث نے ۲۵رجمادی الثانیہ ۱۱۷۸ھ بعد نماز عشاء لہرا میں انتقال فرمایا اور اپنے حجرے کے سامنے باغ میں دفن کیے گئے۔ شیخ شمس الدین حیدری مصنف مناقب غوثی نے یہ تاریخ لکھی:

خمسہ عشرین از جماد اخیر — نیم شب از آدینہ آگاہ

گفت ہاتف بگوش اہل سخن — گشتہ محبوب حق فنا فی اللہ

شیخ حیدری کی اس تصریح سے نزہۃ الخواطر کی بیان کردہ تاریخ وفات ۲۶رجمادی الثانیہ

۱۱۷۸ھ غلط ہوجاتی ہے۔ نزہۃ الخواطر میں آپ کا مولد و مدفن دونوں بھیرا لکھا ہے، حالانکہ مدفن لہرا ہے، جس کا نام آپ نے وحدت آباد رکھا تھا، مگر یہ نام مشہور نہ ہوسکا، جہاں آپ کا مزار ہے اس جگہ کو اب روضہ کہتے ہیں، مزار اور خانقاہ کا علاقہ اب بالکل ویران ہے، مسجد کی دیواریں کھڑی ہیں، جنوب میں خانقاہ اور مدرسہ ٹیلہ کی شکل میں مٹی کا ڈھیر ہیں، دروازوں اور کمروں کی بعض دیواریں اب تک موجود ہیں، صحن میں قدیم زمانے کے کھجور اور دیگر مختلف قسم کے درخت ہیں، یہاں اب بھی روحانیت کا عجیب عالم نظر آتا ہے۔(۱)

مولوی حکیم سیّد ابومحمد دیوگامیؒ

مولانا سیّد ابومحمد بن سیّد نجابت علی بن میر الٰہی بخش بن میر نک چھیدن بن میر صاحب علی بن سیّد مہر علی دیوگامی سندو کے حدود میں دیوگام میں پیدا ہوئے، ابتدائی کتابوں سے متوسطات تک مدرسہ کرامتیہ ملاٹولہ شہر جونپور میں پڑھا، اس کے بعد ازہر ہند دارالعلوم دیوبند کا سفر کیا اور وہاں پہونچ کر بقیہ علوم دینیہ کی تکمیل کی حضرت شیخ الاسلام سیّد حسین احمد مدنیؒ فیض آبادی (۲) سے صحیح بخاری اور سنن ترمذی پڑھ کر سند و اجازت حاصل کی۔

دینی علوم کی تحصیل و تکمیل کے بعد علم و حکمت و طبابت کا شوق دامن گیر ہوا، چنانچہ لکھنؤ جاکر وہاجیہ کالج (موجودہ تکمیل الطب) میں ایک سال رہ کر وہاں کے اساتذہ سے فن طبابت سیکھا۔

ان ظاہری علوم سے فراغ کے بعد مولانا عبدالرب جونپوری سے سلسلۂ چشتیہ میں بیعت کی۔

---

(۱) مفصل حالات کے لیے دیکھیے "تذکرہ علماء ہند" ص ۵، نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۱۵، اور تذکرہ علمائے مبارک پور ص ۹۳-۸۸۔

(۲) حضرت شیخ الاسلام سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہ چودہویں صدی ہجری کے نادرۂ روزگار عالم، مجاہد اور شیخ تھے، آپ کی ولادت ۱۲۹۶ھ میں اور وفات ۱۳۷۷ھ میں ہوئی، آپ نے مسلسل ۳۱ برس تک دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت شیخ الحدیث وصدر مدرس کے بخاری و ترمذی کا درس دیا اس دور میں ہندوستان میں جتنے مدارس چل رہے ہیں سب کا سلسلہ آپ ہی سے ملتا ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے نقش حیات، حیات شیخ الاسلام، شیخ الاسلام نمبر الجمعیۃ دہلی وغیرہ۔

مولانا ابو محمدؒ نے ساری زندگی خلق خدا کی روحانی اور جسمانی خدمت میں گذاردی اور ۱۸ رجنوری ۱۹۷۳ء مطابق ۱۳۹۳ھ کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنے آبائی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

مولانا سیّد ابو محمد سادگی پسند، متواضع، خوش خلق اور بہت ملنسار تھے، طبیعت میں کبر ونخوت کا شائبہ تک نہیں تھا، اپنے چھوٹوں سے بھی ملتے تو اس طرح کہ گویا کسی مخدوم ومطاع سے مل رہے ہوں، راقم کو بھی چند بار مولانا سے ملنے کا اتفاق ہوا، واقعی تواضع وانکساری کے مجسمہ تھے۔

پسماندگان میں مولوی سیّد عقیل احمد دیوگامی قابل ذکر ہیں جو والد محترم کے صحیح جانشین ہیں، موصوف اس وقت مدرسہ قرآنیہ جونپور میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، مولانا سیّد ابو محمد صاحب سے متعلق جملہ معلومات موصوف ہی نے بہم پہونچائی ہیں۔

مولانا اِحسان علی وَاعظ بھیرویؒ

مولانا احسان علی بن فصیح الدین حنفی بھیروی اس دیار کے اجلۂ علماء میں سے تھے، چند ابتدائی درسی کتابیں بھیرا میں وہاں کے اساتذہ سے پڑھیں، اس کے بعد مولانا احمد علی عباسی چریاکوٹی متوفی ۱۲۷۲ھ کی خدمت میں حاضر ہوئے، انھیں کی صحبت میں رہ کر جملہ علوم وفنون کی تکمیل کی، بعد ازاں دہلی کا سفر کیا اور مولانا محبوب علی جعفری دہلویؒ (۱) کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر فقہ اور حدیث کی تحصیل کر کے سند فراغت حاصل کی اور وطنِ مالوف واپس ہوئے، یہاں چندے قیام فرما کر حج بیت اللہ کے سفر میں نکلے اور ۱۲۷۳ھ میں حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہو کر ہندوستان واپس ہوئے، اس حج کے بعد بھی کئی بار حجاز تشریف لے گئے اور حج وزیارت کی دولت سے بہرہ مند ہوئے۔

(۱) مولانا محبوب علی محدث بن مصاحب علی بن حسن علی حسینی دہلویؒ یکم محرم ۱۲۰۰ھ میں دارالخلافہ دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۰ رذی الحجہ ۱۲۸۰ھ میں فوت ہوئے، حضرت شاہ عبدالقادرؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا اور حضرت سیّد احمد شہیدؒ کے مریدین میں تھے، ساری زندگی علماء وصلحاء کے طریقہ پر درس وتدریس اور رشد وہدایت میں گذاردی، قاضی محمد بن عبدالعزیز مچھلی شہریؒ آپ کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ (نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۰۶)

مولانا احسان علی وعظ وتذکیر میں اپنے دور کے امام تھے۔ بیشمار گم کردہ راہ آپ کے وعظ سے ہدایت یاب ہوئے۔ نزہۃ الخواطر میں ہے:

وكان اٰية ظاهرة في الموعظة والتذكير هدى الله سبحانه خلقاً كثيراً من عباده.

مولانا احسان علی وعظ وتذکیر میں واضح آیت تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ اپنے بہت سے بندوں کو ہدایت بخشی۔

۱۳۹۹ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۱)

مولانا احمد مئویؒ

حضرت مولانا احمد بن ملا حسام الدین بن جمال الدین (عرف جمن) اپنے آبائی وطن قصبہ مئو ضلع اعظم گڈھ میں ۱۲۹۰ھ میں پیدا ہوئے، فارسی مکمل اور صرف ونحو شرح جامی تک اپنے والد ماجد ملا حسام الدین سے مدرسہ اسلامیہ جمال پورہ (موجودہ مدرسہ عالیہ مئو) میں پڑھ کر ۱۳۱۳ھ میں مدرسہ جامع العلوم کانپور تشریف لے گئے اور وہاں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد اسحاق بردوانی اور مولانا محمد حسن قدس اسرارہم سے تین سال تک تعلیم حاصل کی، دورانِ تعلیم میں مدرسہ کے طلبہ کو کافیہ اور شرح تہذیب کا درس بھی دیتے تھے، اسکے بعد ۱۳۱۶ھ میں یہاں سے مدرسہ احمدیہ آرہ چلے گئے جہاں حافظ عبداللہ غازی پوری کا درس جاری تھا، آپ نے حافظ صاحب مرحوم سے صحیح بخاری نصف اوّل، مسلم شریف، ترمذی شریف، حمد اللہ، رسالہ میر زاہد، حماسہ، سبعہ معلقہ سبقاً سبقاً پڑھیں، ایک سال یہاں پڑھ کر ۱۳۱۷ھ میں دہلی مولانا سیّد نذیر حسین محدث دہلوی کی خدمت میں پہونچے اور ان سے ترجمۂ قرآن حکیم، جلالین، صحیحین اور ابوداوٗد شریف کی تحصیل کی اور سند فراغ لی، یہاں سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے شرح چغمینی، شمس بازغہ، رسالہ میر زاہد، جامع ترمذی ودیگر کتب درس نظامیہ مکرر پڑھیں اسی زمانہ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے درس میں شرکت کے لیے پاپیادہ

گنگوہ تشریف لے گئے، الحاصل ۱۳۱۹ھ میں مکمل فراغت حاصل کر کے مولانا عبداللہ غازیپوری کے ایماء پر مدرسہ محمدیہ کلیانی مظفر پور (بہار) میں تدریس و تعلیم کا سلسلہ شروع کیا اور دو سال یہاں مصروفِ درس وافادہ رہ کر ۱۳۲۲ھ میں اہلِ مئو کے اصرار پر محلہ قاسم پورہ میں درس دینا شروع کیا، اس وقت اس مدرسہ کا نام مدرسہ اسلامیہ تھا۔ مولانا مرحوم تنہا اس چشمۂ فیض کی آبیاری کرتے رہے تا آنکہ مولانا عبداللہ شائق مئوی اور ان کے ہم سبق طلبہ کو کتب فارسی سے لے کر درس نظامیہ کی تمام کتب معقولات و منقولات صحیح بخاری تک تنہا پڑھایا، مولانا شائق کے بخاری پڑھنے کا زمانہ ۱۳۳۰ھ تھا، اس کے بعد جب آپ کے تلامذہ تعلیم و تحصیل سے فارغ ہوئے تو اور مدرسین کا اضافہ ہوا اور مدرسہ کا نام "مدرسہ فیض عام" قرار پایا۔

مولانا احمد صاحب مدرس اعلیٰ تھے اور آپ کے تلامذہ آپ کی نگرانی میں درس دیتے تھے یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا اور مدرسہ تدریجاً ترقی کرتا رہا، یہاں تک کہ ۱۳۴۱ھ میں آپ ہی کے ایک شرانگیز تلمیذ نے آپ کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں، جس کی وجہ سے آپ کا دل یہاں سے اچاٹ ہو گیا اور یہاں سے علاحدہ ہو کر مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے چلے گئے، لیکن ۱۳۴۳ھ میں اہل مئو کے اصرار پر پھر فیض عام میں آگئے اور تا دم زیست اسی سے منسلک رہے، یہاں تک کہ مؤرخہ ۲۹ر ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ مطابق ۱۹۴۸ء کو ٹھیک ظہر کے وقت نماز کی حالت میں رحمت حق سے پیوست ہو گئے، اسی دن نماز مغرب کے وقت تجہیز و تکفین عمل میں آئی اور چتون تالاب کے مشرقی ٹیلے پر اپنے والد ملا حسام الدین کی قبر کے پاس مدفون ہوئے۔

اپنے والد ماجد ملا حسام الدین کی طرح مولانا احمد مرحوم بھی جملہ علوم میں تبحر رکھتے تھے، نصاب میں شامل جملہ علوم کو بے تکان پڑھاتے تھے، بالخصوص فقہ اور حدیث کے درس میں بڑی مہارت حاصل تھی۔

اگرچہ مسلکاً اہل حدیث تھے، مگر مزاج میں تحزب و تعصب کے بجائے اعتدال تھا، علمائے دیوبند کا تذکرہ انتہائی ادب واحترام سے کرتے تھے۔

آپ کا حلقۂ درس بڑا وسیع تھا، اطراف واکناف کے علاوہ دیگر صوبہ جات کے طلبہ

نے بھی کثیر تعداد میں آپ سے اکتساب فیض کیا، قدرتاً تعلیمی وتدریسی خدمات کا موقع بھی آپ کو اچھا خاصا ملا۔ فراغت کے فوراً بعد ہی تدریسی سلسلہ شروع کردیا تھا اور زندگی کی آخری سانس تک یہ مشغلہ جاری رہا، اس طویل مدت میں آپ کے درس سے کتنے علماء وفضلاء پیدا ہوئے یہ جاننا مشکل ہے، البتہ مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری شارح مشکوٰۃ، مولانا عبداللہ شائق بانی مدرسہ دارالحدیث مئو اور مولانا نذیر احمد املوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا عبیداللہ رحمانی ابقاہ اللہ ابھی باحیات ہیں اور تصنیف وتالیف میں مشغول اور آخرالذکر دونوں حضرات خدا کو پیارے ہو چکے ہیں، جن کے حالات اسی کتاب میں اپنے اپنے موقع پر ملاحظہ فرمائیں۔ (از تذکرۃ الشیخین)

مولانا احمد حسین رسول پوریؒ

حضرت مولانا احمد حسین بن عبدالرحیم بن شیخ جمال الدین جمن بن شیخ پہاڑ بن شیخ کھیدو حنفی رسول پوری اپنے عہد کے علماء کبار میں سے تھے، ان کا خاندان عہد جہانگیری میں رسول پور آکر آباد ہوا۔

مولانا احمد حسین ۱۲۸۸ھ میں رسول پور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم دستور کے مطابق گھر پر ہوئی، اس کے بعد قریب کے گاؤں سریاں میں حافظ شاہ نظام الدین سے عربی وفارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، یہاں سے مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور گئے جہاں اپنے بڑے بھائی مولانا عبدالعلیم صاحب رسول پوری سے نورالانوار اور میبذی وغیرہ کی تحصیل کی اور مولانا محمد فاروق چریاکوٹی متوفی ۱۳۲۷ھ سے شافیہ، قطبی، تلخیص المفتاح اور سبعہ معلقہ وغیرہ کی تعلیم پائی، اس زمانہ میں مدرسہ چشمہ رحمت کے بعد دیار مشرق میں دوسرا علمی مرکز مدرسہ امامیہ حنفیہ جون پور تھا، جو مولانا ہدایت اللہ خاں رامپوری متوفی ۱۳۲۶ھ (۱)

(۱) مولانا ہدایت اللہ بن رفیع اللہ رام پوری علامہ فضل حق خیرآبادی کے مشہور تلامذہ میں تھے، اپنے وقت میں منطق وفلسفہ کے استاذ الکل تھے، مدرسہ حنفیہ جون پور میں عرصۂ دراز تک تعلیمی وتدریسی خدمت انجام دی اور بیشمار طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا، رمضان ۱۳۲۶ھ میں جون پور میں آپ کی وفات ہوئی اور محلہ رشید آباد میں دیوان رشید جونپوری کے حظیرے میں دفن ہوئے۔ (تذکرہ کاملان رام پور، تجلی نور)

کی وجہ سے طالبین علوم کا مرجع بنا ہوا تھا، مولانا احمد حسین نے جون پور جا کر ۱۳۰۹ سے ۱۳۱۳ھ تک مولانا ہدایت اللہ خاں صاحبؒ سے ملا حسن، ملا جلال، رسالہ میرزاہد مع حاشیہ غلام یحییٰ، حاشیہ بحر العلوم اور دیگر علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں پھر یہاں سے مدرسہ جامع العلوم کانپور گئے جہاں حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی (۱) قدس سرہ کے علم وفضل کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا، آپ نے حضرت تھانوی سے ہدایہ، جلالین، مشکوۃ، صحیح بخاری اور صحیح مسلم پڑھیں اور کتاب وسنت میں ان سے خصوصی تلمذ کر کے دینی علوم فقہ وحدیث میں سلسلۂ ولی اللٰہی سے منسلک ہوئے۔ اس کے بعد مدرسہ عالیہ رام پور گئے جو نواب کلب علی اور نواب حامد علی خاں کے علمی قدردانی سے علوم وفنون کا مرکز بنا ہوا تھا، یہاں آپ نے مولانا عبدالحق خیرآبادی (۲)، مولانا ظہور الحسن فاروقی رام پوری (۳) اور مولانا وزیر علی رامپوری

(۱) حکیم الامت مولانا اشرف علی بن عبدالحق تھانوی ۵/ربیع الآخر ۱۲۸۰ھ میں تھانہ بھون میں پیدا ہوئے اور ۱۶/رجب ۱۳۶۲ھ میں فوت ہوئے، آپ اپنے وقت کے متبحر عالم اور مسلم شیخ تھے، مریدین کی اصلاح وتربیت میں آپ کو خاص ملکہ حاصل تھا، وعظ وتبلیغ میں اس عہد میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا، آپ کی اصلاحی وتربیتی سرگرمیوں سے بیشمار لوگوں کو فیض پہونچا، تصنیف وتالیف میں بھی آپ کو یدطولیٰ حاصل تھا، چودھویں صدی ہجری میں کثرت تصانیف میں مولانا کا کوئی ہمسر نہیں تھا، آپ کی تصانیف کی تعداد آٹھ سو تک پہونچتی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: سوانح حکیم الامت، مقدمہ امداد الفتاویٰ مطبوعہ پاکستان، اشرف السوانح اور معارف ۲ ۱۹۴ء وغیرہ۔

(۲) علامہ عبدالحق بن فضل حق خیرآبادی منطق وفلسفہ میں اپنے وقت کے امام تھے، ایک عرصہ تک مدرسہ عالیہ رامپور میں تدریسی خدمت انجام دی اور نواب کلب علی کی وفات کے بعد خیرآباد چلے آئے، پھر یہاں سے حیدرآباد گئے، وہاں آپ کی بڑی پذیرائی ہوئی اور دوسو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوگیا، چنانچہ اسی وظیفہ پر گھر رہ کر گذر بسر کرنے لگے۔ بعد میں پھر رامپور میں استاذ مقرر ہوئے اور یہیں ۱۳۱۸ھ میں فوت ہوئے، منطق وفلسفہ کے علاوہ فن نحو اور ادب میں بھی آپ کو یدطولیٰ حاصل تھا، نحو اور منطق میں آپ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جو اہل علم میں آج تک مقبول ومتداول ہیں۔ (نزہۃ ج۸ ص ۲۲۲)

(۳) مولانا ظہور الحسن بن نیاز اللہ حنفی رام پوری نے مولانا ارشاد حسین وغیرہ سے تعلیم حاصل کی تھی، مدتوں مدرسہ عالیہ رامپور میں مدرس رہے اس کے علاوہ راندیر صوبہ گجرات، مدرسہ حنفیہ جونپور میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں، آپ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے معتقدین میں تھے اور اکثر مسائل بدعیہ میں ان کے پیرو تھے، ۱۲/جمادی الثانی ۱۳۴۲ھ میں انتقال کیا، (نزہۃ ص ۲۰۶)

سے بقیہ کتابوں کی تعلیم وتحصیل کی اور ادب وعربیت کی تعلیم مولانا شیخ محمد طیب عرب مکی (۱) سے حاصل کی اور عربی ادب وشاعری میں وہ کمال پیدا کیا کہ دیار مشرق میں عربی شاعری میں کوئی ان کی ہمسری نہ کرسکا۔

رامپور ہی کے قیام کے زمانہ میں مولانا حکیم محمد حسین خاں سے طب وحکمت کی تحصیل کی اور ان کے مطب میں نباضی کرکے طب کی سند لی، رامپور ہی میں فلکیات اور ریاضی میں بھی کامل مہارت حاصل کی، الغرض ۱۳۲۰ھ میں مروجہ علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل سے فارغ ہوکر روحانی واحسانی سلسلہ میں مولانا سیّد ضیاء النبی رائے بریلوی قدس سرہ (۲) کے ہاتھ پر بیعت کی۔

فراغت کے بعد مدرسہ مظہر العلوم محلہ کچی باغ شہر بنارس میں تعلیمی خدمات پر مامور ہوئے اور تین برس یہاں تعلیم دے کر اپنے بھائی کی طلب پر مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں چلے گئے اور وہاں ۱۳۲۶ھ تک تدریسی خدمات انجام دیں اور اسی سنہ میں اہل ڈھاکہ کی طلب پر آپ ڈھاکہ منتقل ہوگئے اور مدرسہ حسینیہ ڈھاکہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے درس وتدریس کی مسند پر رونق افروز ہوئے، وہاں سے علیحدگی کے موقع پر مدرسہ کے مہتمم نے آپ کے بارے میں یہ تاثرات تحریر کیے:

برترک تعلقش انگشت بدنداں گرفتیم وبصد حسرت وداعش کردیم ودولت گرانمایہ گم

---

(۱) مولانا محمد طیب بن محمد صالح مکی مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے اکثر فنون عربیہ کی تحصیل اپنے والد ماجد سے کی ۲۵ برس کی عمر میں ہندوستان آئے اور مولانا عبد الحق خیر آبادی، مولانا ارشاد حسین رامپوری وغیرہ سے معقول ومنقول کی تعلیم حاصل کی، فراغت کے بعد مدرسہ عالیہ میں مدرس ہوگئے تھے اور یہیں شادی کرکے مستقل سکونت اختیار کرلی تھی، ایک عرصہ تک مدرسہ عالیہ میں تدریسی خدمات انجام دیں بعد میں کچھ دنوں کے لیے حیدرآباد بھی گئے تھے، ایک سال ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بھی مدرس رہے، ۲/ذیقعدہ ۱۳۴۳ھ میں رام پور میں فوت ہوئے۔ (تذکرہ کاملانِ رامپور وزہہ ص ۲۲۵)

(۲) مولانا شاہ سیّد ضیاء النبی بن سعید الدین بریلوی کی پیدائش ۱۲۴۲ھ کے حدود میں رائے بریلی میں ہوئی۔ مولانا حبیب اللہ دہلوی اور مفتی سعد اللہ مراد آبادی وغیرہ سے علوم درسیہ کی تکمیل کی اور سلوک وطریقت کی تعلیم مولانا سیّد خواجہ احمد نصیر آبادی سے حاصل کی اور ان کی وفات کے بعد شیخ فیض اللہ اورنگ آبادی سے تکمیل کرکے خلافت واجازت حاصل کی، شیخ ضیاء النبی عبادت وریاضت اور زہد وتقویٰ میں امتیازی شان رکھتے تھے، بہت سے علماء وفضلاء نے آپ سے اخذ فیض کیا ۱۵/ذی قعدہ ۱۳۲۶ھ میں آپ کا وصال ہوا اور اپنے آبائی مقبرہ میں دفن ہوئے۔ (نزہۃ الخواطر ص ۱۹۶ تا ۱۹۸، ج ۸)

کردیم ماو جملہ کارکنانِ مدرسہ بر حسن کارگزاری اوشاں شہادت می دہیم۔

مولانا احمد حسین مدرسہ حسینیہ سے الگ ہوکر مدرسہ حمادیہ میں پھر مدرسہ دارالعلوم میں صدر مدرس ہوئے ڈھاکہ کی ان تینوں درسگاہوں میں تعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد ایک سال مدرسہ عالیہ ہوگلی میں صدر مدرس رہے، پھر مدرسہ اسلامیہ ڈھاکہ میں چار سال تک نظامت اور مدرسی کے فرائض انجام دیے، یہیں کے دوران قیام میں ۱۳۴۳ھ میں فریضہ حج ادا کیا، واپسی پر مدرسہ اسلامیہ ڈھاکہ میں تقریباً دس برس تک رہے، اس کے بعد انجمن اسلامیہ گورکھپور میں چھ سال تک صدر مدرس رہ کر ۱۳۵۷ھ میں وہاں سے مستعفی ہوگئے، یعنی ۱۳۲۰ھ سے ۱۳۵۷ھ تک کامل ۳۷ سال تک مسلسل تعلیم وتدریس کا مشغلہ جاری رکھا اور اسی کے ساتھ تصنیف وتالیف اور طبابت وحکمت کا سلسلہ بھی قائم رہا۔

مولانا جملہ علوم وفنون میں تبحر کا درجہ رکھتے تھے اور طب وحکمت میں تو مجتہدانہ شان کے مالک تھے، فن خطاطی کے بھی ماہر تھے، اپنی تصانیف کی طباعت کے وقت کتابت خود ہی کرتے تھے، نسخ اور نستعلیق کے بہترین کاتب تھے۔ آپ کی تصانیف کی فہرست بڑی طویل ہے جس میں متعدد کتابیں طبع ہوچکی ہیں۔ مطبوعہ کتابیں حسب ذیل ہیں:

(۱) تحفۃ الاحباء فی فضل المدینہ ومناقب سیّد الشہداء، یہ اسی نام کی ایک عربی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جس میں مدینہ منورہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب درج ہیں ڈھاکہ میں اردو ٹائپ میں چھپی تھی۔

(۲) احسن المیراث فی ہدیۃ الاحیاء الی الاموات، اصل رسالہ عربی زبان میں مولانا شیخ احمد بن عثمان مکی کا ہے، جب مولانا ۱۳۴۲ھ میں حج کے لیے گئے تو شیخ موصوف سے کتاب کے ترجمہ کی اجازت حاصل کی، اس میں مردوں کے لیے ایصال ثواب پر احادیث وآثار درج ہیں، ایک صفحہ میں ایک جانب متن اور دوسری طرف ترجمہ درج ہے۔

(۳) القلائد من الفرائد، علم معانی وبیان میں ملا محمود جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ کی کتاب الفرائد اپنے مضامین اور اسلوب بیان کے اعتبار سے نہایت اہم اور مفید کتاب ہے مگر بعض مقامات بہت مشکل ہیں، مولانا نے عربی میں اس کی شرح سمط الفرائد کے نام

سے لکھی، پھر طلبہ کی سہولت کے پیش نظر اسے مختصر کر کے فارسی میں بطور حاشیہ کے لکھا جو عربی متن کے نیچے درج ہے۔

(۴) حاشیہ ملتقی الابحر، علامہ شیخ ابراہیم علی کی تالیف کردہ فقہ حنفی میں نہایت جامع اور مختصر کتاب ہے، مولانا نے اس میں سے بقدر نصاب الگ کر کے اس کا حاشیہ تحریر فرمایا اور خود ہی کتابت کی۔

(۵) حاشیہ قصیدہ بردہ وقصیدہ فرزدق عربی، یہ دونوں قصیدے بہت مشہور ہیں، مولانا نے دونوں قصائد کا عربی میں مختصر حاشیہ لکھا، یہ کتاب ڈھاکہ میں چھوٹے سائز پر ٹائپ میں چھپی ہے۔

(۶) سبیل الآخرت، مولانا کی مشہور اور نہایت مقبول تصنیف ہے، جس میں عالم برزخ کے حالات اردو میں درج ہیں، اب تک اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، دوبارہ مصنف نے خود کتابت کر کے گورکھپور سے شائع کیا تھا، تیسری بار مولانا محمد عیسیٰ الٰہ آبادیؒ خلیفہ حضرت تھانویؒ نے حضرت تھانویؒ کے بعض مواعظ کے اضافہ اور اصل کتاب میں کہیں کہیں معمولی توضیح کے ساتھ شرح الصدور کے نام سے شائع کیا، اس کا پہلا ایڈیشن الٰہ آباد سے دوسرا ڈھاکہ سے اور تیسرا نہایت آب وتاب کے ساتھ کراچی سے شائع ہوا، مگر کسی کے سرورق پر نہ مولانا احمد حسین مرحوم کا نام ہے اور نہ سبیل الآخرۃ کا، البتہ کتاب کے اندر تصریح ضرور ہے۔

(۷) تجہیز الاموات، اس میں نہایت جامع طور سے مُردوں کی تکفین وتدفین کے مسائل فقہ کی معتبر کتابوں سے بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب اپنے باب میں نہایت مفید ہے، سبیل الآخرۃ کی پانچوں اشاعتوں میں اس کے آخر میں چھپی ہے اور چھٹی بار مولانا مرحوم کے نواسہ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے بمبئی میں اسے الگ طبع کرایا ہے۔

(۸) مجربات احمدی، اس کتاب میں مولانا نے اپنے خاص مجرب نسخے درج کیے ہیں اور سر سے پیر تک کے جملہ امراض کا علاج بیان کیا ہے۔

(۹) دیوان احمد، یہ ان کے اشعار کا مجموعہ ہے، جسے مولانا قاضی اطہر مبارک پوری

اور مولانا کے صاحبزادے مولانا محمد یحییٰ نے ۱۳۰۷ھ میں بمبئی میں چھپوایا ہے، اس کے کل ۴۸ صفحے ہیں۔

ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ اور کئی اہم کتابیں اور حواشی تصنیف کیے اور بعض کے مسودات تیار کیے جن میں حاشیہ سلم العلوم، حاشیہ مسلم الثبوت، التحصیل والتکمیل، کتاب الفروق فی اللغۃ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مولانا احمد حسین آخر کے چند سالوں میں گھر پر زیادہ رہنے لگے تھے اور تصنیف وتالیف کے ساتھ طبابت کے مشاغل رکھتے تھے، ایک مرتبہ ایک دوست کے علاج کے لیے بڑہل گنج گئے واپسی میں جین پور میں مولوی عبدالرحمٰن کے یہاں رات کو قیام کیا صبح ہوتے ہوتے دو تین دست آئے اور طبیعت قدرے سست ہوگئی اور قریب ہی عظمت گڈھ میں اپنے بھتیجے مولوی حکیم عبدالمجید کے یہاں گئے، یہاں دست کی کثرت ہوگئی اور دن بھر یہ سلسلہ جاری رہا اسی حال میں رات گذر گئی اور صبح سات بجے ۲۶/رجب ۱۳۵۹ھ کو وہیں انتقال فرما گئے اور اسی روز شام کو چار بجے رسول پور کے اپنے آبائی باغ میں دفن کیے گئے۔

تفصیل کے لیے مقدمہ دیوان احمد عربی، معارف اعظم گڈھ شمارہ مارچ ۱۹۵۰ء، رسالہ البلاغ تعلیمی نمبر ماہ فروری ۱۹۷۰ء اور تذکرہ علمائے مبارک پور دیکھیے۔

مولانا احمد علی چریا کوٹیؒ

مولانا احمد علی بن غلام حسین بن سعد اللہ عباسی حنفی ہندوستان کے علماء کبار میں سے ہیں، فقہ، اصول فقہ اور فلسفہ میں انھیں تبحر کا درجہ حاصل تھا، ۱۲۰۰ھ میں چریا کوٹ میں پیدا ہوئے، نحو وصرف کی ابتدائی کتابیں مولانا غلام علی عباسی چریا کوٹی سے پڑھیں اس کے بعد رام پور کا علمی سفر کیا اور مولانا غلام جیلانی (۱) کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوکر مولانا حیدر علی

(۱) شیخ غلام بن احمد رامپور کے علمائے کبار میں سے تھے، آپ کی ولادت پیلی بھیت میں ہوئی ملا حسن بن غلام مصطفیٰ لکھنویؒ اور ملا بحر العلوم فرنگی محلیؒ سے علوم وفنون کی تعلیم پائی، حدیث میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے شرف تلمذ حاصل تھا، سلسلۂ سلوک میں حضرت سید احمد شہید قدس سرہ سے منسلک تھے، پوری زندگی علماء وصلحاء کے طریقہ پر درس وتدریس میں گذار دی اور ۲۷/ذی الحجہ ۱۲۳۴ھ کو اسّی برس کی عمر میں وفات ہوئی۔

رامپوری (۱) کی رفاقت میں فن ریاضی کی تحصیل کی اور بعض کتابیں مولانا حیدر علی سے بھی پڑھیں، رامپور ہی میں قرأت و تجوید کی تعلیم قاری نسیم رامپوری (۲) سے حاصل کی، پھر یہاں سے دوسرے مختلف شہروں میں جا کر وہاں کے علماء و فضلاء سے ادب و بلاغت، فقہ، اصول فقہ اور فلسفہ کی تحصیل و تکمیل کر کے حضرت مولانا حافظ ابو اسحاق بھیروی کے ہاتھ پر بیعت کی اور ارشاد و تلقین پائی۔ الغرض جملہ علوم و فنون میں پوری مہارت اور کامل طور پر دستگاہ حاصل ہو جانے کے بعد تیس سال کی عمر میں اس علمی سفر سے واپس آئے اور خاندان کی ایک خاتون سے نکاح کیا اس کے بعد مسند درس و افادہ کو زینت بخشی، تفہیم مطالب میں وہ ملکہ حاصل تھا کہ اہم اور پیچیدہ مسائل کو چٹکیوں میں حل فرما دیتے اور غبی سے غبی طالب علم بھی آپ کے درس سے کچھ لے کر ہی جاتا۔

مولانا نے ۱۲۵۱ھ میں ایک چرخا ایجاد کیا تھا جو بخار کے ذریعہ سے خود بخود حرکت کرتا تھا، آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر زر کثیر مساعدت کرتا تو بزور دانش ایسا آلہ ایجاد کرتا جس پر پانچ آدمی سواری کر سکتے اور ایک روز میں سو فرسخ راہ طے کرتے۔ آپ نے مختلف علوم و فنون پر تقریباً سو کتابیں بھی تصنیف کی تھیں جن میں بعض یہ ہیں: (۱) نور النواظر فی علم المناظر (۲) منبع الصرف (۳) میزان الاوزان (۴) شرحِ کافیہ (۵) طلسم احمدی (۶) مغالطہ عامۃ الورود (۷) محیط (۸) شرح تہذیب (۹) حاشیہ میبذی

(۱) شیخ حیدر علی بن عنایت علی کی ولادت دہلی میں ہوئی، بچپن ہی میں رامپور چلے آئے تھے، نحو اور ادب شیخ غلام اور عبدالرحمٰن قہستانی سے حاصل کیا، پھر لکھنؤ آ کر ملا محب اللہ انصاری لکھنوی کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور طویل مدت تک ان سے استفادہ کرتے رہے پھر دہلی جا کر حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ سے حدیث کی تحصیل کی، رامپور میں شادی کر لی تھی اسی تعلق سے وہیں رہتے تھے، لیکن آخر عمر میں ٹونک منتقل ہو گئے تھے اور وہیں ۱۲۷۳ھ میں فوت ہوئے۔

(۲) قاری نسیم رامپوری نے ولایت سے رام پور میں آ کر سکونت اختیار کر لی تھی، آپ قاری عبید اللہ تلمیذ مولانا مغربی کے ارشد تلامذہ میں تھے، علم قرأت اور خوش الحانی میں بے نظیر تھے، چنانچہ مولانا عبدالقادر غمگینؔ اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں "تحقیق قرات اور حروف مخارج، مدات، اوقاف اور رسم خط میں آیاتِ الٰہی سے ایک نشانی تھے، میں نے نہ ان سے پہلے نہ ان کے بعد کوئی ایسا آدمی دیکھا، فنِ تجوید کے علاوہ دیگر علوم و فنون میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ۱۲۱۴ھ کے حدود میں آپ کا وصال ہوا۔ (تذکرۂ کاملانِ رامپور، ص ۴۱۳ و ۴۱۴)

(۱۰) فوائد العقائد (۱۱) اثبات التقلید (۱۲) فوائد نجمیہ (۱۳) حاشیہ تلویح (۱۴) شرح سبعہ معلقہ (۱۵) فرائض احمدیہ (۱۶) منبع المناظر شرح نخبۃ الفکر (۱۷) عجالۂ جوابیہ۔

مولانا کے چشمۂ فیضان سے بیشمار تشنگانِ علم سیراب ہوئے، جن میں مندرج حضرات اپنے اپنے عہد میں آسمان علم وفن کے آفتاب وماہتاب بن کر چمکے: مولانا سخاوت علی جونپوری، مولانا کرامت علی جونپوری، مولانا نصراللہ خورجوی، علامہ عنایت رسول چریاکوٹی، قاضی علی اکبر چریاکوٹی۔

۲۴؍ذی الحجہ ۱۲۷۲ میں موضع علی پور ضلع اعظم گڈھ میں آپ کی وفات ہوئی اور وہیں دفن ہوئے۔ (نزہۃ ج ۷ ص ۴۲-۷-۴، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰-۱۹، چراغ حکمت ص ۴۱)

مولانا احمد مکرّم عباسی چریاکوٹیؒ

مولانا احمد مکرم بن مولانا محمد اعظم چریاکوٹی جید عالم، ممتاز ادیب اور ماہر تاریخ داں تھے، ریاست حیدرآباد سے منسلک رہے، داغ دہلوی اور مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی سے خاص دوستانہ مراسم تھے، مولانا شرر نے تاریخ اسلام کا خاکہ تیار کرنے میں مولانا موصوف سے خاص طور سے استفادہ کیا تھا۔ ایام ضعیفی میں حیدرآباد چھوڑ کر چریاکوٹ چلے آئے تھے، تصنیف وتالیف کا سلسلہ آخر وقت تک قائم رہا، متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں جن میں بعض یہ ہیں:

(۱) حکمتِ بالغہ، ۳ جلدوں میں (۲) السمع الاسمع (۳) چراغ حکمت (۴) کرامت اللطائف (۵) الاخلاق (۶) تاریخ مکرّم (۷) رحل الغنا (۸) بارہ امام (۹) رسالہ شطرنج۔

مولانا احمد مکرمؒ کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی، قصبہ چریاکوٹ سے علمی مذاق تقریباً ختم ہوچکا تھا، مجبوراً اپنی ساری کتابوں کے مسودے خاندان کے دیگر افراد کی تصانیف کے ساتھ دائرۃ المعارف حیدرآباد کو منتقل کردیے۔ (اسلام اور عصرِ جدید، ماہ جولائی ۱۹۷۲ء)

☆ ☆ ☆

مولانا اختر احسن اصلاحیؒ

مولانا اختر احسن اصلاحی اس دیار کے علماء کبار میں شمار ہوتے ہیں، فن تفسیر میں اس عہد کے علماء میں آپ کو امتیاز خاص حاصل تھا۔ حضرت مولانا حمید الدین صاحبؒ کے علوم وافکار کے آپ سب سے بڑے حامل وناشر تھے۔

مولانا نے پوری زندگی افکار فراہی کی نشر واشاعت میں گذار دی۔ آپ کی ذات اس دیار میں علوم قرآنی کا مرجع بنی ہوئی تھی اور آپ کے درس قرآن کا غلغلہ پورے ہندوستان میں پھیل گیا تھا۔

مولانا کی ولادت ۱۹۰۱ء کے حدود میں ضلع اعظم گڈھ کے ایک غیر معروف گاؤں چکیا پرسہا میں ہوئی، لیکن نشو ونما اور پرورش موضع سیدھا سلطان پور میں ہوئی جو آپ کا نانیہال تھا، اس لیے اکثر لوگ آپ کو سیدھا ہی کا باشندہ سمجھتے ہیں، جب ذرا کچھ بڑے اور سمجھدار ہوئے تو خاندانی روایت کے مطابق مکتب کی تعلیم شروع کی اور اس سے جلد ہی فارغ ہوکر اپنے دیار کی مشہور درس گاہ مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہو گئے، مولانا نے جس دور میں داخلہ لیا وہ اصلاح کا دور زریں کہلاتا ہے۔ مولانا شبلی بمھوری، مولانا محمد احمد لہراوی، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی اور مولانا عبدالصمد ندوی جیسے اساطین علم وفن تعلیمی وتدریسی خدمات میں مصروف تھے اور خود مولانا فراہی کی ذاتِ گرامی مغتنمات میں سے تھی۔ مولانا اختر احسن نے انھیں اساتذہ سے تعلیم پائی۔ فراغت تعلیم کے بعد یہیں مدرس مقرر ہو گئے اور ترقی کرتے کرتے ایک دن صدارت تدریس کے منصب تک پہونچے، آپ نے اپنی مادر علمی کے علاوہ کسی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا اور قلیل مشاہرہ پر قناعت کرتے ہوئے یہیں پڑے رہے، اگر آپ دوسری درس گاہوں کا رخ کرتے تو اپنی صلاحیتوں اور علوم قرآنی میں مہارت کی بدولت بڑی سے بڑی تنخواہ پاتے، مگر انھوں نے اس کا خیال بھی نہیں کیا۔ البتہ مدرسۃ الاصلاح میں آپ کو خوب اقتدار حاصل ہوا، اس وقت عملی طور سے آپ ہی مدرسہ کے سب کچھ تھے، آپ کی رائے اور مشورہ کے بغیر مدرسہ میں ایک تنکا بھی

حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

بڑے متواضع متحمل اور بردبار واقع ہوئے تھے، کوئی کتنا ہی سخت جملہ کیوں نہ کہہ دے، لیکن اسے انگیز کر جاتے، نہایت عابد و زاہد اور متقی تھے، سادگی، سنجیدگی اور متانت میں اسلاف کے نمونہ تھے۔

آخر میں ملک کے دوسرے بہت سے علماء کی طرح مودودیت کے دام میں پھنس گئے تھے جس کی وجہ سے ان کے اکثر تلامذہ بھی اس کے داعی و نقیب بن گئے، سچ ہے "زَلّۃُ العالِمِ زَلّۃُ العالَم" جماعتِ مودودی کو آپ کی ذات سے اس دیار میں بڑا فروغ حاصل ہوا، کاش کہ مولانا اس سے بچ گئے ہوتے تو آپ کا فیض اور بھی عام ہوا ہوتا۔

آپ نے کم و بیش ۳۵ برس مدرسۃ الاصلاح میں تعلیمی و تدریسی خدمات انجام دیں، اس مدت میں بیشمار افراد آپ کے حلقۂ درس سے عالم و فاضل بن کر نکلے جن میں مولانا ابواللیث اصلاحی اعظمی سابق امیر جماعت اسلامی ہند، مولانا صدرالدین اصلاحی اعظمی صدر شعبۂ تصنیف و تالیف جماعت اسلامی، مولانا ابوبکر اصلاحی سابق ناظم جامعۃ الفلاح، مولانا بدرالدین اصلاحی سابق ناظم مدرسۃ الاصلاح، مولانا عبدالرحمٰن ناصرؔ مرتب حیاتِ حمید، مولانا محمد ایوب جیراجپوری استاذ جامعۃ الفلاح، مولانا شہباز اصلاحی، مولانا نظام الدین اصلاحی، مولانا احتشام الدین اصلاحی صدر مدرسۃ الاصلاح نے علمی میدان میں خوب ترقی کی اور بڑی شہرت و ناموری کے مالک ہوئے، باقاعدہ درس کے علاوہ اہل علم کا ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جس نے وقتاً فوقتاً مولانا اسے استفادہ کیا۔ ۷۵ سال کی عمر میں ۲۴/ربیع الاوّل ۱۳۷۸ھ مطابق ۹/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو مدرسۃ الاصلاح پر آپ کا وصال ہوا اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔

مولوی اسد اللہ رونویؒ

رونوان ضلع اعظم گڈھ میں ایک مشہور گاؤں ہے، مولوی اسد اللہ وہیں پیدا ہوئے، علوم و فنون کی تعلیم چشمۂ رحمت غازی پور میں مولانا عبداللہ اور دوسرے اساتذہ سے حاصل

کی، حدیث کی تعلیم مولانا سیّد نذیر حسین دہلوی (۱) سے پائی تھی، بڑے متشدد اہل حدیث تھے اور مولانا عبداللہ غازی پوری کے خاص معاونین میں تھے، مولانا عبداللہ غازی پوری اس دیار میں جب بھی آتے تو انھیں کے یہاں قیام کرتے۔

ان کا مولانا شبلی نعمانی سے تقریراً وتحریراً مناظرہ بھی ہوا تھا۔ (حیات شبلی، ص ۱۰۱)

ابتداء میں شہر اعظم گڈھ میں وکالت کرتے تھے، لیکن بعد میں اس مشغلہ کو ترک کر کے گھر پر رہ کر کھیتی باڑی کی نگرانی کرتے تھے۔ ۱۳۳۱ھ میں رونواں میں ہی انتقال کیا۔ (تراجم علمائے اہلحدیث، ص ۲۹۳)

مولانا اسلام الحق کوپا گنجیؒ

حضرت الاستاذ مولانا اسلام الحق بن شیخ اسد اللہ بن حاجی یعقوب بن ولی محمد ۱۳۲۲ھ میں قصبہ کوپا گنج ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی مکتبی کتابیں محلہ کے ایک میاں صاحب سے پڑھیں، قرآن مجید ختم کرنے کے بعد اردو کی چند کتابیں اپنے والد ماجد شیخ اسد اللہ سے پڑھیں، اس کے بعد مقامی مدرسہ مصباح العلوم کوپا گنج میں داخل ہوئے، جس میں اس وقت مولانا عبدالصمد کوپا گنجی تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، مولانا عبدالصمد مرحوم نہایت ذی استعداد اور ذہین وفطین عالم تھے، طلبہ کو نہایت توجہ اور شفقت سے تعلیم دیتے تھے، مولانا کا عام دستور تھا کہ ماہانہ طلبہ کا امتحان لیا کرتے تھے جس سے طالب علم کی استعداد اور محنت وسرگرمی کا اندازہ ہوتا رہتا تھا، استاذ محترم نے مولانا موصوف سے اردو اور فارسی کی کتابیں گلستان، بوستاں تک پڑھیں اسی دوران میں ان کے

---

(۱) مولانا سیّد نذیر حسین باختلاف روایات ۱۲۲۰ھ یا ۱۲۲۵ھ میں بہار کے ایک قریہ سورج گڈھ میں پیدا ہوئے، الہ آباد اور دہلی کے اساتذہ سے علوم وفنون کی تکمیل کر کے مولانا شاہ عبدالغنی قدس سرہ سے حدیث کی تحصیل کی، حضرت مولانا شاہ محمد اسحاقؒ سے بھی انھیں اجازت حاصل تھی، دہلی ہی میں شیخ عبدالخالق دہلوی کی صاحبزادی سے نکاح کر لیا تھا، جو دہلی کی سکونت کا سبب ہوا، مسلکاً متشدد اہل حدیث تھے، آپ کے شاگردوں کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ ۱۰ رجب ۱۳۲۰ھ میں دہلی میں فوت ہوئے۔ تفصیل کے لیے الحیات بعد الممات، مقدمہ عون المعبود، نزہہ، ص ۴۲۹، ج ۸ وغیرہ دیکھیے۔

والد کا ارادہ ہوگیا کہ تعلیمی سلسلہ یہیں سے ختم کراکے انھیں گھر گرہستی کے کاموں میں لگادیا جائے، چنانچہ مدرسہ سے آپ کو الگ کر کے کاروبار کے حوالے کر دیا گیا، حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں مولانا کے بڑے بھائی مولوی شمس الرحمٰن صاحب تعلیم سے فارغ ہو کر مکان آگئے، انھوں نے والدین کو راضی کر کے مولانا کو پھر سے تعلیم پر لگانا چاہا مگر اب یہ خود پڑھنے سے کترانے لگے، لیکن ان کی عدم رضا کے باوجود مدرسہ میں بٹھادیا گیا اور مولانا عبدالصمد مرحوم کی حکمت عملی اور حسن تدبیر سے چند ہی دن کے اندر آپ کی طبیعت تعلیم و تحصیل سے مانوس ہوگئی اور شوق سے مدرسہ آنے لگے، انھیں ایام میں مدرسہ میں مزید ایک استاذ کی ضرورت پیش آگئی اور مولانا محمد اسحاق مرحوم کا تقرر عمل میں آیا۔ مولانا موصوف نہایت صالح اور عالم باعمل تھے اور مولانا سیّد نذیر حسین دہلوی سے شرف تلمذ رکھتے تھے، ابتدائی نحو وصرف کی تعلیم میں انھیں بڑا ملکہ حاصل تھا، جس طالب علم کو بھی پڑھادیا اسے صیغوں کی پہچان اور عبارت کی صحت پر پوری قدرت حاصل ہوجاتی تھی۔

غرض مولانا نے مولانا اسحاق صاحب کے پاس میزان الصرف شروع کی اور علم الصیغہ، وہدایۃ النحو تک پڑھ کر والدین کی اجازت واطلاع کے بغیر کو پاگنج سے جونپور چلے گئے اس وقت مسجد اٹالہ میں مولانا عبدالاحد منجیر پٹی اعظمی تلمیذ حضرت شیخ الہند تعلیمی خدمات انجام دے رہے تھے۔

مولانا عبدالاحد مرحوم کے تبحر علمی کا یہ حال تھا کہ منتہی اور ادق کتابوں کو بھی بلا مطالعہ کے نہایت تحقیق کے ساتھ پڑھایا کرتے تھے، چنانچہ مولانا موصوف کی خدمت میں انھوں نے کافیہ اور اس درجہ کی دوسری کتابیں شروع کیں، لیکن مولانا عبدالاحد صاحب ہی تنہا مدرس تھے، احادیث کی کتابوں سے لے کر کافیہ تک تقریباً تیرہ اسباق انھیں پڑھانا پڑتے تھے، اکثر ایسا ہوتا کہ بڑی کتابوں کے درس میں وقت ختم ہوجاتا، کافیہ کی جماعت کے اسباق کی نوبت ہی نہ آتی اس لیے اس جماعت کے طلبہ یہاں سے دوسرے مدارس میں چلے گئے، مولانا اسلام الحق صاحب بھی اپنے دو ساتھیوں کی معیت میں ۱۳۳۹ھ میں جون پور سے کان پور چلے گئے اور مدرسہ ضیاء العلوم کانپور میں داخل ہوگئے، اس وقت مولانا

عبدالستار تلمیذ مولانا عبدالوہاب بہاری صدارت تدریس کے عہدہ پر متمکن تھے، ان کے پاس کافیہ اور تہذیب کا درس ہوتا تھا اور دوسرے اساتذہ کے یہاں اس درجہ کی دوسری کتابیں ہوتی تھیں، اسی درجہ میں شریک ہوکر اخیر سال تک یہیں پڑھتے رہے، شعبان میں مدرسہ بند ہوا تو گھر آئے پھر کان پور خانگی مجبوریوں کی وجہ سے نہ جاسکے اور گھر ہی پر رہ کر مقامی مدرسہ مصباح العلوم میں دو سال تک تعلیم حاصل کی اور ۱۳۴۱ھ میں دوسرا علمی سفر کیا اور اس مرتبہ ریاست مینڈھو کی مشہور درس گاہ مدرسہ یوسفیہ میں پہونچ گئے، یہاں اس وقت مولانا عبدالوحید صاحب سنبھلی مرحوم مرجع خلائق بنے ہوئے تھے، مولانا نے انھیں سے ہدایہ اخرین، مشکوٰۃ شریف، جلالین شریف اور شرح عقائد نسفی وغیرہ کی تحصیل کی اور ۱۳۴۳ھ میں یہاں سے دارالعلوم دیوبند چلے آئے جہاں تین سال رہ کر بقیہ علوم کے ساتھ حدیث کی تکمیل کی، جس کی تفصیل یوں ہے:

حضرت العلامہ مولانا انور شاہؒ سے بخاری اور ترمذی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے صحیح مسلم، ابن ماجہ اور طحاوی کے علاوہ تفسیر بیضاوی، مولانا غلام رسول خاں صاحبؒ سے توضیح وتلویح، مسلّم الثبوت، امورِ عامّہ، حمداللہ اور شمس بازغہ، حضرت مولانا میاں اصغر حسین دیوبندیؒ سے ابوداؤد، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ سے حماسہ اور سبعہ معلقہ، مولانا نبیہ حسن مرحوم سے تصریح وشرح چغمینی، مولانا ابراہیم بلیاویؒ سے قاضی مبارک اور میر زاہد ملاّ جلال اور مولانا عبدالسمیع صاحبؒ سے میر زاہد رسالہ کی تعلیم حاصل کی اور ۱۳۴۵ھ میں علوم مروجہ متداولہ سے فارغ ہوکر مکان آئے اور اسی سال دارالعلوم مئو ضلع اعظم گڈھ میں مدرس سوم کی حیثیت سے تدریسی خدمت پر مقرر ہوگئے، کچھ عرصہ کے بعد ترقی کرکے مدرس دوم ہوئے اور ساتھ ہی فتویٰ نویسی کی خدمت بھی انجام دیتے رہے اور جب موجودہ صدرالمدرسین مولانا عبدالوحید سنبھلی کی وفات ہوگئی تو عارضی طور سے آپ کو صدارت تدریس کے عہدے پر نامزد کردیا گیا دو سال کے بعد مولانا میرک شاہ کشمیری کا تقرر اس عہدہ پر ہوگیا تو آپ بدستور سابق مدرس دوم ہوگئے، اسی زمانہ میں تحریک آزادی کا غلغلہ پورے ہندوستان میں بلند ہوا اور جمعیۃ علماء ہند اور مسلم لیگ نے متحد ہوکر صوبائی ومرکزی

الیکشن میں حصہ لیا، مگر صوبائی حکومت کے قیام کے بعد اتحاد باقی نہ رہ سکا اور دونوں جماعتیں الگ ہوگئیں جس کے نتیجہ میں ملک کے سارے مسلمان جمعیۃ اور لیگ کے نام پر دو حصوں میں بٹ گئے، مئو میں بھی یہی صورت پیش آئی، یہاں دارالعلوم کے مقابل کا ایک اور مدرسہ مفتاح العلوم کے نام سے تھا، ان دونوں کے ارباب انتظام میں ہمیشہ ٹھنی رہتی تھی اور ایک دوسرے کی مخالفت گویا ان کے لیے فرض کا درجہ رکھتی تھی، اہل مفتاح نے اس سیاسی اختلاف میں جمعیۃ کا ساتھ دیا تو دارالعلوم کے منتظمین دوسرے گروپ یعنی مسلم لیگ کے حامی ہوگئے، مولانا کا رجحان جمعیۃ کی جانب تھا، اہل دارالعلوم نے جسے برداشت نہیں کیا اور مولانا کو بالآخر مدرسہ چھوڑنا پڑا، چنانچہ آپ دارالعلوم سے علیحدہ ہوکر گھر چلے آئے اور اپنے مادر علمی مدرسہ مصباح العلوم میں استاذ مقرر ہوگئے اور تین سال یہاں رہ کر تعلیم وتدریس میں مشغول رہے اس درمیان میں اہل دارالعلوم مئو نے پھر کوشش شروع کردی کہ مولانا یہاں کی مدرسی قبول کرلیں، ان کی خواہش پر آپ نے وہاں دوبارہ تعلیمی سلسلہ شروع کردیا، لیکن اس بار بھی تین سال سے زیادہ یہاں نہ رہ سکے اور ۱۳۶۸ھ مطابق ۱۹۴۸ء میں بعض اختلاف کی بنا پر مدرسہ سے الگ ہوگئے، اس بار مولانا کی طبیعت تعلیمی مشغلے سے بالکل اچاٹ ہوگئی اور فیصلہ کرلیا کہ کسی مدرسہ کی ملازمت نہیں کروں گا، مگر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن محدث اعظمی نے ان کے اس خیال کی مخالفت کی اور انھیں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرس کی حیثیت سے بھیج دیا، لیکن اسی سال مولانا کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا، گھر پر چھوٹے چھوٹے پانچ بچے تھے، جن کی نگہداشت کرنے والا کوئی نہیں تھا، اس لیے آپ مجبوراً یہاں سے مستعفی ہوکر گھر چلے آئے اور گذر اوقات کے لیے تجارتی مشغلہ شروع کردیا جو آپ کا آبائی پیشہ تھا اور اسی کے ساتھ ایک جدید مدرسہ میں جسے یہاں کے حامیان جمعیۃ علماء نے جامع العلوم کے نام سے قائم کیا تھا تعلیم وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا، اسی حال میں تقریباً تین سال گذر گئے، اسی درمیان میں اللہ تعالیٰ نے زیارت حرمین کے شرف لازوال سے بھی مشرف فرمادیا، حج سے واپسی کے بعد مولانا عبدالجبار اعظمی شیخ الحدیث جامعہ قاسمیہ مرادآباد کے مشورہ سے ۱۳۷۳ھ میں تعلیم الاسلام آنند گجرات کے مدرسہ میں مدرس

ہو گئے (جس کے مولانا عبدالجبار صاحب صدر تھے) اور پورے اطمینان وانہماک سے خدمت مفوضہ کی انجام دہی میں مصروف ہو گئے، مگر بُعدِ مسافت کی وجہ سے ہر سال یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر کہیں قریب میں مناسب جگہ نکل آئے تو بہتر ہوتا، چنانچہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے اس سلسلے میں خط وکتابت ہوئی اور ندوہ جانے کا آپ نے ارادہ بھی کرلیا جس پر مطلع ہوکر اہل ندوہ نے آپ کا تقرر بھی کرلیا، مگر بعض احباب کے مشورہ سے ندوہ کا ارادہ فسخ کردیا، اسی ادھیڑ بن میں چھ برس کا طویل عرصہ گذر گیا اور تعلیم الاسلام میں تدریس وافتاء کا کام کرتے رہے تا آنکہ ۱۳۷۹ھ میں محدث عصر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے ایماء پر مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے آگئے، یہاں ابھی پورا سال بھی نہیں گذرا تھا کہ دارالعلوم دیوبند میں طبقۂ علیا کے مدرس کی حیثیت سے آپ کا انتخاب ہو گیا، اولاً آپ کو وہاں جانے میں تردد ہوا، لیکن حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ وغیرہ نے آپ کو اطمینان دلایا اور بغیر کسی تردد کے اس پیش کش کو قبول کرنے کی ہدایت کی چنانچہ آپ احیاء العلوم سے علیحدہ ہوکر ۱۳۸۰ھ میں دارالعلوم دیوبند چلے گئے اور بعض مدرسین کی بیجا مداخلت کی بنا پر درجۂ علیا کے بجائے درجۂ وسطیٰ میں آپ کا تقرر ہوا، لیکن اتنی رعایت کی گئی کہ بعض کتابیں علیا کی بھی آپ کے پاس رکھی گئیں، اس مرکزِ علوم فنون میں آنے کے بعد ہر طرف سے بے نیاز ہوکر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں اس طرح منہمک ہوئے کہ پھر مر کر ہی اس سے جدا ہوئے۔

مولانا کا درس قدماء کے طریقہ پر ہوتا تھا، آج کل کی طرح دھواں دھار تقریر نہیں ہوتی تھی؛ بلکہ متعلقہ مباحث پر جچی تلی، حشو وزوائد سے پاک، مختصر اور جامع تشریح پر اکتفا فرماتے تھے۔ میں نے مولانا سے طحاوی شریف پڑھی ہے، مولانا کے اس طریقۂ درس سے بڑا نفع ہوتا تھا، تقریر مختصر ہونے کی وجہ سے ذہن کی گرفت میں آجاتی تھی، نقلِ مذاہب میں تصحیح کا بڑا اہتمام فرماتے تھے، امام طحاوی کے طرز استدلال کو اس طرح سے ذہن نشین کردیتے تھے کہ بے ساختہ مولانا کی علمی مہارت پر کلمۂ تحسین زبان پر آجاتا تھا۔

درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف سے بھی شغف تھا، چنانچہ دارالعلوم دیوبند

کے زمانۂ قیام میں متعدد کتابوں پر حواشی اور تشریحی نوٹ تحریر فرمائے جو ان کی زندگی ہی میں شائع ہو کر طلبہ و علماء کے حلقے میں مقبول ہوئے۔ تصانیف کی فہرست یہ ہے:

التوضیح الاحسن شرح ملاحسن، شرح قطبی دو جلدوں میں، فیض الملہم شرح مقدمہ صحیح مسلم۔ یہ تینوں کتابیں مکتبہ نعمانیہ دیوبند سے شائع ہو چکی ہیں، ان کے علاوہ نبراس شرح شرح عقائد نسفی کا ترجمہ سلیس اردو زبان میں کیا تھا، جو ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا ہے۔

مولانا نہایت سادہ مزاج، کم آمیز، عزلت پسند اور متواضع تھے، اپنے شاگردوں سے بھی نہایت اخلاق و تواضع سے پیش آتے، کھانے پینے میں کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے تھے، وقت پر جو مل گیا کھا پی لیا، یہی حال لباس کا بھی تھا۔

بالآخر تقریباً نصف صدی تک تدریسی و تصنیفی خدمات انجام دے کر ۷۰ برس کی عمر میں ۲۴ ربیع الآخر ۱۳۹۲ھ مطابق ۷ جون ۱۹۷۲ء چہار شنبہ کو طویل علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے آبائی قبرستان کوپاگنج میں دفن ہوئے۔

مخدوم زادہ ابو الجلال اسماعیل عباسی جد اعلیٰ علماء چریاکوٹ

فتنۂ ہلاکو خاں اور سلطنت بنو عباسیہ کی بربادی کے وقت شیخ اسماعیل بن ابو العلا اعز الدین ہندوستان وارد ہوئے۔ یہ محمد تغلق ۷۴۰ھ کا عہد تھا، بادشاہ نے علماء و مشائخ کی رفاقت میں دلی سے باہر نکل کر آپ کا استقبال کیا، اور مخدوم زادہ عباسی کے لقب سے ملقب کیا، دس لاکھ تنکہ، قنوج کا علاقہ، کوشک سیری اور حصار سیری کے تمام محصلات، بہت ساری زمین، حوض اور باغات مخدوم زادے کی نذر کیں (۱)۔

مخدوم زادہ حسب و نسب کی وجاہت کے ساتھ علم و فضل میں بھی بلند درجہ رکھتے تھے، علوم عقلیہ کے ساتھ حدیث، تفسیر اور فقہ میں انھیں خاص اختصاص حاصل تھا (۲)، اس لیے بادشاہ انھیں سفر و حضر میں ساتھ رکھتا تھا، حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی رحمہ اللہ سے بھی

(۱) تاریخ فیروز شاہی ص ۴۹۶، تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۱۳۹، منتخب التواریخ از بدایونی ص ۲۲۳۔

(۲) یادداشت چریاکوٹ۔

ان کی مخلصانہ رسم وراہ تھی۔ (۱)

سلاطین تغلق کے زوال کے بعد مخدوم زادہ کو دلی کی سکونت ترک کرنی پڑی، وہ دلی سے نکل کر فتح پور ہنسوہ پہنچے، پھر وہاں سے ۸۰۴ھ میں جون پور وارد ہوئے، اس وقت ابراہیم شاہ شرقی سریر آرائے سلطنت تھا، شاہ شرقی نے خاطر خواہ پذیرائی کی اور مراحم خسروانہ سے نوازا، پرگنہ چریا کوٹ اور اس کے آس پاس کے اقطاع برسم مدد معاش ان کو معافی میں عطا کیے اور قضا کی خدمت سپرد کی جو کئی نسلوں تک اس خاندان میں رہی، مخدوم زادہ اپنے حشم وخدم کے ساتھ جب وہاں پہنچے تو مقامی راجپوت آبادی نے مزاحمت کی، تین چار یوم تک طرفین میں جنگ ہوئی، جس میں کئی آدمی مارے گئے، بالآخر مخدوم زادہ نے ان پر غلبہ حاصل کرلیا، بعد میں بیشتر آبادی نے اسلام قبول کرلیا، مخدوم زادہ کے تین لڑکے تھے: (۱) محی الدین عاشق نور، (۲) محمد مبارک، (۳) یوسف حسن، آخر الذکر کا یہاں آنے کے بعد مختصر عرصہ میں انتقال ہوگیا، محمد مبارک کے صرف ایک لڑکے تھے، ان سے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی، بڑے صاحبزادے محی الدین عاشق نور سے مخدوم زادہ کی نسل چلی، انھیں کا خاندان چریا کوٹ میں آباد رہا، جن میں نسلاً بعد نسل علماء وفضلاء پیدا ہوتے رہے، چریا کوٹ ہی میں مخدوم زادہ نے ۸۲۲ھ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے، قبر آج بھی موجود ہے۔ (اسلام اور عصر جدید، اپریل ۱۹۷۳ء)

مولانا اشرف علی بھوریؒ

مولانا اشرف علی بن شیخ امیر علی موضع بھور کے رہنے والے تھے، ابتدائی کتب درسیہ اپنے دیار کے اساتذہ سے پڑھیں پھر لکھنؤ جاکر مولانا ابوالحسنات عبدالحئی فرنگی محلی (۲) کے

(۱) تاریخ فیروز شاہی ص ۴۹۶ میں، بدایونی نے لکھا ہے کہ مخدوم زادہ شیخ نصیر الدین چراغ کے مرید تھے، یادداشت چریا کوٹ۔

(۲) علامۂ زماں مولانا عبدالحئی بن عبدالحلیم فرنگی محلی کی علمی عبقریت وجلالت پر علمائے امت کا اتفاق ہے ۱۲۶۴ھ میں باندہ میں آپ کی ولادت ہوئی، سترہ برس کی عمر میں جملہ علوم وفنون میں کامل دستگاہ حاصل کرکے مسند تدریس پر رونق افروز ہوئے، درس وتدریس کے ساتھ مختلف علوم وفنون پر آپ نے سو سے زائد کتابیں تصنیف کیں اور عین عالم شباب میں ۳۹ برس کی عمر میں ۲۹/ربیع الاول ۱۳۰۴ھ کو آپ کی وفات ہوگئی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے مقدمہ شرح وقایہ، احوال علمائے فرنگی محلی، تذکرہ علمائے ہند ص ۱۱۴ ونزہۃ ج ۸ ص ۲۳۶ وغیرہ۔

تلمذ سے شرف یاب ہوئے اور انھیں سے علوم وفنون کی تکمیل کی، مولانا محمد مسلم بھوری نے جو مولانا محمد اشرف کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، راقم سے بیان کیا کہ مولانا مرحوم کے دست خاص کی ایک تحریر ایک خطبہ کے حاشیہ پر اب تک محفوظ ہے جس میں آپ نے لکھا ہے کہ "یہ خطبہ استاذ محترم ابوالحسنات مولانا عبدالحئی دامت برکاتہم نے احقر کو عنایت کیا" اس تحریر پر ۱۳۰۴ھ کی تاریخ پڑی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اشرف علی مولانا فرنگی محلّی کے آخری تلامذہ میں سے ہیں، کیونکہ اسی سال میں مولانا کا انتقال ہوا ہے۔

تحصیلِ علوم سے فراغ کے بعد خانگی امور اور موروثی زمینداری کے انتظام واہتمام میں ایسا الجھے کہ ساری زندگی اسی میں گذر گئی، درس وافادہ اور تصنیف وتالیف کا موقع نہ مل سکا۔

مولانا اشرف علی اپنے علم وفضل اور شان وشوکت میں خاص امتیاز رکھتے تھے، بھور اور آس پاس کے مواضعات پر ان کا خاص اثر تھا اور کوئی اجتماعی کام ان کے حکم اور مشورہ کے بغیر انجام نہیں پاتا تھا۔ ۱۳۲۷ھ میں حضرت مولانا سیّد محمد امین حسینی نصیر آبادی کے ہاتھ پر بیعت بھی کی تھی، سنِ وفات اور مزید حالات دستیاب نہ ہوسکے۔

(تذکرہ علمائے مبارک پور ص ۱۲۱، یادگارِ سلف ص ۴۲)

مولانا الٰہی بخش کوپاگنجیؒ

کوپاگنج ضلع اعظم گڈھ کا ایک مشہور قصبہ ہے، جہاں پارچہ بافی کی صنعت مئو وغیرہ کی طرح بڑے عروج پر ہے، مولانا الٰہی بخش اسی صنعتی قصبہ میں ۱۲۵۸ھ میں پیدا ہوئے، وطن میں تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کر لینے کے بعد جون پور آئے، جہاں مدرسہ امامیہ حنفیہ شیراز ہند، دہلی ثانی شہر جون پور کی عظمت رفتہ کی یاد تازہ کیے ہوئے تھا۔

مولانا الٰہی بخش نے مدرسہ حنفیہ میں داخل ہوکر مولانا عبدالحلیم بن امین اللہ فرنگی محلّی (۱)

(۱) مولانا عبدالحلیمؒ بن امین اللہ ۱۲۳۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۸۵ھ میں فوت ہوئے، آپ نے باندہ، جون پور اور حیدرآباد میں علمی وفقہی خدمات انجام دیں اور مختلف علوم وفنون پر کثیر کتابیں تصنیف کیں، مولانا عبدالحئی فرنگی محلی آپ ہی کے صاحبزادہ ہیں۔ احوال فرنگی محل ص ۶۲، مقدمہ شرح وقایہ ونزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۴۷ وغیرہ دیکھیں۔

سے علوم دینیہ کی تحصیل کی، اسی زمانہ میں مولانا سخاوت علی جون پوری سے بھی علمی استفادہ کیا اور بعض کتابیں ان سے پڑھیں، تکمیل شیخ تراب علی لکھنوی (۱) مدفون محمد آباد سے رسڑا ضلع بلیا میں کی، تحصیل و تکمیل کے بعد رسڑا ہی میں درس و تدریس کی مسند کو رونق بخشی اس کے بعد مدرسہ ناصر العلوم گھوسی کے صدر مدرس منتخب ہوئے اور عرصہ ۴۰ برس تک وہاں تعلیمی و تدریسی خدمت انجام دی، آپ کی وفات حسب تصریح صاحب نزہۃ الخواطر ۱۳۱۶ھ میں ہوئی، لیکن مولانا محمد نصیر گھوسوی اپنے روزنامچہ مورخہ ۲۹ رمحرم ۱۳۱۹ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

امروز از کوپا خبر انتقال مولوی الٰہی بخش صاحب رسیدہ بود چنانچہ بعد نماز عصر خود مع برادر صاحب (مولانا عبد القادر) بسواری ٹم ٹم روانہ شدہ، بعد نماز مغرب رسیدم و بعد تجہیز و تکفین و ادائے نماز جنازہ قریب نصف اللیل واپس بمکان رسیدم۔

اس عبارت سے صاف واضح ہے کہ مولانا کی وفات ۲۹ رمحرم ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹ رمئی ۱۹۰۱ء یوم یکشنبہ کو ہوئی۔

مولوی صاحب کا آخری زمانہ بڑی عسرت و تنگی میں بسر ہوا، گذر اوقات کے لیے مولانا محمد نصیر صاحب کے یہاں سے دس روپے ماہانہ بطور پنشن کے ملتے تھے، یہی کل سرمایہ تھا۔

مولانا کے شاگردوں میں مولوی امام بخش جون پوری بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا الٰہی بخش کے تفصیلی حالات دستیاب نہیں ہو سکے جس سے ان کے علم وفضل کا اندازہ ہوتا، لیکن اگر اساتذہ کی علمی شان و شوکت سے تلامذہ کے علم و فضل کا درجہ قائم کرنا درست ہے تو بلا خوف کہا جا سکتا ہے کہ مولانا الٰہی بخش ایک متبحر اور علوم و فنون میں ماہر عالم تھے۔

---

(۱) مولانا تراب علی لکھنوی ۱۲۱۳ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۸۱ھ میں محمد آباد ضلع اعظم گڈھ میں فوت ہوئے، معقول و منقول دونوں میں آپ کو تبحر حاصل تھا، تیرہویں صدی ہجری کے آپ مشہور اصحاب درس میں تھے، بہت سے طلبہ کو آپ سے فیض پہونچا، تصنیف و تالیف میں بھی مہارت رکھتے تھے اور متعدد اہم کتابیں تصنیف کیں۔

(نزہہ ج ۷، ص ۱۰۵، تذکرہ علمائے ہند ص ۳۵)

مولانا حکیم الٰہی بخش مُبارکپوریؒ

مولانا حکیم الٰہی بخش بن حکیم عبداللہ بن شیخ بھولن بن شیخ لعل بن شیخ عبداللطیف بن شیخ غلام محمد مبارکپوری ضلع کے مشہور اطباء اور ماہر حکماء میں تھے اور بڑی سوجھ بوجھ کے عالم تھے، علمی استعداد نہایت ٹھوس تھی۔

۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے، قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد حکیم عبداللہ سے حاصل کی اور فارسی کی تکمیل مولوی ولی محمد اور میاں عبداللہ شفاء سے کی جو ایک صوفی منش بزرگ اور فارسی کے اچھے عالم اور شاعر تھے بعد ازاں مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری سے فنون کے علاوہ حدیث کی بعض کتابیں پڑھیں، اس کے بعد کان پور مدرسہ فیض عام میں مولانا احمد حسن کانپوری (۱)، مولانا حافظ نور محمد پنجابی اور مولانا عبدالوہاب بہاری (۲) سے پڑھ کر معقولات و منقولات کی تکمیل کی۔

ابتدائی عمر میں پڑھنے کی طرف توجہ نہیں تھی اور جوانی تک لاابالی پن میں رہے، اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں کہ ۱۳۱۷ھ میں میرے دوسرے لڑکے عبدالباری تولد ہوئے اور اسی سال تحصیل علم سے فراغت ہوئی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فراغت کے وقت آپ پختہ عمر کو پہونچ گئے تھے، اسی سال ۱۳۱۷ھ میں مدرسہ احیاء العلوم کا اجراء عمل میں آیا، جس کے پہلے ناظم آپ مقرر کیے گئے اور تقریباً ۲۰ سال تک یہ اہم دینی خدمت انجام دی۔

(۱) مولانا احمد حسن کانپوریؒ کی پیدائش پٹیالہ ضلع گورداس پور میں ہوئی، مولانا لطف اللہ علی گڈھی سے تعلیم وتحصیل کی فراغت کے بعد مظاہر علوم سہارن پور میں مدرس ہوئے پھر یہاں سے مدرسہ فیض عام کان پور میں تعلیمی خدمت پر مقرر ہوئے، بعد میں یہیں شادی کرکے مستقل سکونت اختیار کرلی تھی، اس لیے کانپوری کی نسبت سے مشہور ہوئے؛ آپ جملہ علوم میں کامل مہارت رکھتے تھے، پوری زندگی علماء وصلحاء کے طریقہ پر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں گذاردی، ۱۳۲۲ھ میں کانپور میں وفات پائی۔ (نزہہ ص ۴۳، ج ۸)

(۲) مولانا عبدالوہاب بہاری، مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کے تلامذہ میں سے تھے، منطق وفلسفہ میں امتیازی صلاحیت کے مالک تھے، کانپور، حیدرآباد اور کلکتہ کے مدارس میں تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دیں، حاشیہ رسالہ میر زاہد اور شرح ہدایۃ الحکمۃ آپ کی علمی یادگار ہیں؛ ۱۳۲۵ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ (نزہہ ج ۸ ص ۳۱۶)

مولانا الٰہی بخش نے اپنے آبائی پیشہ طبابت کے ساتھ تعلیم وتدریس کی بڑی مفید خدمات انجام دیں اور مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا محمد محمود معروفی کے ساتھ جو مستقل مدرس تھے طلبہ کو درس دیتے رہے، بہت سے طلبہ آپ سے مستفید ہوئے۔

آخر عمر میں آپ مستقل طور سے شہر اعظم گڈھ میں مطب کرنے لگے تھے اور ضلع کے طبی بورڈ کے صدر منتخب ہو گئے تھے۔ ۱۳۵۶ھ میں مبارک پور میں انتقال کیا اور پورہ دولہن میں اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ (تذکرہ علمائے مبارک پور ص ۲۱۳ تا ۲۱۵)

مولانا امجد علی گھوسویؒ

مولانا امجد علی گھوسی ضلع اعظم گڈھ کے متصل کریم الدین پور نامی ایک بستی میں ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد جون پور مدرسہ حنفیہ میں درسِ نظامی کی تکمیل کی اور یہیں سے سند فراغت حاصل کی، تکمیل علوم کے بعد قصبہ گھوسی میں مطب شروع کیا لیکن ایک شخص کی ترغیب سے مطب چھوڑ کر بریلی چلے گئے اور مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ (۱) بانی مسلک رضا خانی کے مدرسہ میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا اس کے بعد تو پھر آپ مولانا احمد رضا خاں ہی کے ہو کر رہ گئے، مولانا احمد رضا خاں نے بھی ان کی صلاحیتوں کو دیکھ کر بڑی نوازشوں سے نوازا اور اپنی خلافت سے امتیاز بخشا۔

مولانا امجد علیؒ نے اپنی علمی صلاحیتوں سے کام لے کر مسلک رضا خانی کو بڑی تقویت پہونچائی اور بہشتی زیور مؤلفہ حضرت حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کے طرز پر سترہ جلدوں میں ایک کتاب مرتب کی، جس کا نام بہار شریعت رکھا۔ اس کتاب میں انھوں نے مسلک بریلوی کے جملہ معتقدات کو بڑی خوبی سے جمع کر دیا ہے۔ یہ کتاب جماعت بریلوی میں بڑی مقبول ہوئی اور اس جماعت کی اساسی اور بنیادی کتابوں میں شمار

(۱) مولانا احمد رضا بریلویؒ ۱۲۷۲ھ میں بریلی میں پیدا ہوئے، اپنے والد مولوی نقی خاں سے علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی۔ ذہانت وطباعی میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ ہندوستان میں بدعت کو ایک مستقل مسلک کی شکل میں منظم کرنے والے یہی ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن کی تعداد بعض لوگوں نے پانچ سو تک نقل کی ہیں۔ دیکھیے نزہۃ الخواطر ص ۳۹ و ۴۰، ج ۸)

ہوتی ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے مولانا کے تبحر علمی اور استعداد کا پتہ چلتا ہے۔

مولانا کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے جن میں مولانا غلام جیلانی علی گڈھی، مولانا اسرار احمد پنجابی، مولانا رفاقت حسین کان پوری، مولانا محمد سلیمان بھاگلپوری، مولانا غلام یزدانی گھوسوی، مولانا محمد مصطفیٰ گھوسوی، مولانا شمس الدین جون پوری اپنی جماعت میں بڑی شہرت ومقبولیت کے مالک ہیں، آخر الذکر نے بہار شریعت کی تلخیص کر کے اس کا نام قانون شریعت رکھا ہے، یہ کتاب بھی اصل کی طرح بہت مقبول ہے۔

مولانا امجد علی نے طحاوی شریف پر ایک مبسوط حاشیہ لکھنا شروع کیا تھا، تقریباً نصف سے زائد کام ہو چکا تھا، لیکن آنکھ کی بینائی ختم ہو جانے کی وجہ سے مکمل نہ ہو سکا۔

۱۹۴۸ء میں حج بیت اللہ اور زیارت نبوی ﷺ کی غرض سے روانہ ہوئے، بمبئی پہونچ کر بیمار ہو گئے اور اسی مبارک سفر میں رحلت کر گئے، جنازہ گھوسی لایا گیا اور آبائی قبرستان میں دفن کر دیا گیا، آپ کا مزار پختہ اور نہایت عالیشان ہے، ہر سال ۲/ ذی قعدہ کو عرس ہوتا ہے، جس میں ان کے متوسلین ومعتقدین کی بہت بڑی جماعت شریک ہوتی ہے۔

مولانا انوار الحق مئوی اعظمیؒ

مولانا انوار الحق بن حضرت مولانا عبد الغفار مئوی اعظمی ۱۳۱۳ھ میں پیدا ہوئے، تاریخی نام محمد غلام علیم تھا، آپ نے علمی ماحول میں آنکھ کھولی، گھر میں علوم وفنون کا چرچا تھا، والد ماجد مولانا عبد الغفارؒ کا شمار سربرآوردہ علماء میں تھا، دونوں چچا مولانا ابو الحسن اور مولانا ابو البرکات بھی علم وعمل میں اپنی مثال آپ تھے، تینوں حضرات تدریس وتالیف اور وعظ وتبلیغ میں مصروف کار تھے، اس ماحول کا اثر مولانا انوار الحق پر پڑا، عام بچوں کی طرح لہو ولعب اور کھیل کود کی بجائے سنجیدگی، متانت اور علمی ذوق وشوق گویا گھٹی میں پلایا ہوا تھا، اسی لیے بہت جلد ابتدائی تعلیم سے فراغت ہو گئی اور قصبہ مئو کی مشہور درسگاہ دار العلوم میں داخل ہو گئے، یہاں الہ آباد بورڈ سے مولوی کا امتحان پاس کیا اس کے علاوہ دوسرے علوم وفنون کی بھی تحصیل کی پھر یہاں سے دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے اور وہاں خاتم المحدثین

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ (۱) رئیس المفسّرین حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی (۲) اور دوسرے اساتذہ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کرکے سندِ فراغت حاصل کی، تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد قصبہ گودنا ضلع چھپرہ کے مدرسہ میں تعلیمی و تدریسی خدمت پر مامور ہوئے، پھر یہاں سے مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں استاذ ادب کی حیثیت سے تقرری ہوئی اور تقریباً دس برس تک یہاں رہ کر تعلیمی خدمت انجام دی۔ بالآخر مدرسہ عزیزیہ ہی میں آپ بیماری کے شکار ہوگئے، مرض نے جب شدت اختیار کرلی تو اسی حالت میں گھر تشریف لائے اور تقریباً دو سال بستر علالت پر رہ کر ۱۳۷۱ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

مولانا انوار الحق مرحوم بڑے ذی صلاحیت اور جید الاستعداد عالم تھے، قوت حافظہ نہایت قوی تھا، عربی اور فارسی کے اشعار برجستہ کہتے تھے، تصنیف و تالیف سے بھی ذوق تھا، مولانا سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں مگر عمر نے وفا نہ کی اور عین جوانی میں یہ گل سرسبد مرجھا گیا اور دل کی آرزوئیں دل ہی میں رہ گئیں۔

---

(۱) حضرت العلامہ مولانا انور شاہ کشمیری ۱۲۹۲ھ میں پیدا ہوئے اکثر علوم متداولہ کی تحصیل دار العلوم دیوبند میں کی، فراغت کے بعد چند سالوں تک مدرسہ امینیہ دہلی میں تدریسی خدمت انجام دی بعد ازاں دیوبند میں مدرس مقرر ہوئے اور ۱۳۳۳ھ میں دار العلوم دیوبند کی مسند صدارت پر فائز ہوئے اور تیرہ سال یہاں صحیح بخاری و سنن ترمذی کا درس دے کر ڈابھیل تشریف لے گئے اور وہاں بھی ایک عرصہ تک حدیث کا درس دیا۔ مولانا عبد الحئی حسنی لکھتے ہیں کہ "انتھت الیہ ریاسۃ تدریس الحدیث فی الھند" وسعتِ معلومات اور قوتِ حفظ میں آپ نادرۂ روزگار تھے۔ تدریس کے ساتھ تصنیف میں بھی آپ نے اہم تصانیف یادگار چھوڑیں ۱۳۵۲ھ میں دیوبند میں آپ کی وفات ہوئی اور عیدگاہ کے متصل دفن ہوئے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: نفحۃ العنبر، حیات انور، نزہۃ الخواطر ص ۸۰ تا ۸۵، ج ۸ وغیرہ۔

(۲) حضرت العلامہ مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی جملہ علوم متعارفہ میں یدطولیٰ رکھتے تھے بالخصوص حدیث، فقہ اور کلام میں امتیازی شان کے مالک تھے۔ ۱۳۲۵ھ میں آپ نے دیوبند سے فراغت کی، فراغت کے بعد مدرسہ فتحپوری دہلی میں صدر مدرس بن کر گئے اس کے بعد دیوبند میں مدرس ہوئے، ۱۳۴۸ھ میں ڈابھیل چلے گئے اور وہاں تفسیر و حدیث کے استاذ مقرر ہوئے ۱۳۵۴ھ میں دار العلوم دیوبند کے صدر مہتمم منتخب ہوئے، ۱۳۶۲ھ میں یہاں سے علیحدگی اختیار کرکے دوبارہ ڈابھیل گئے اور کچھ عرصہ کام کرکے بیماری کی وجہ سے دیوبند چلے آئے، ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء میں جشنِ پاکستان کے موقع پر کراچی تشریف لے گئے پھر وہیں مقیم ہوگئے۔ مولانا نے ساری زندگی دین اسلام کی خدمت میں گذاری، بہترین مدرس کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے مصنف اور خطیب بھی تھے۔ ۲۱/صفر ۱۳۶۹ھ میں کراچی میں آپ کا انتقال ہوا۔ ملاحظہ ہو فیوض عثمانی مطبوعہ پاکستان۔

تصانیف میں ادراک الفریضہ عربی، تحفۂ سلیمانیہ عربی غیر مطبوعہ آپ کی علمی یادگار ہیں، ادراک الفریضہ کو حضرت انور شاہ کشمیری قدس سرہ نے دیکھا تو مولانا کے علمی تبحر اور وسعت معلومات کی بڑی تعریف فرمائی۔ (معلومات از مولانا انعام الحق برادر حقیقی مولانا انوار الحق)

================

﴿ب﴾

مولانا بابُ اللہ منوّر پوریؒ

منوّر پور تحصیل پھولپور میں ایک چھوٹی سی بستی ہے جو دیدار گنج روڈ سے جانب مغرب شمال تقریباً تین میل کے فاصلے پر واقع ہے، کسی زمانہ میں یہاں شرفاء اور امراء آباد تھے، مگر انقلاب زمانہ سے اب ان کا نام ونشان تک باقی نہیں رہ گیا ہے، یہ قریہ مدتوں مولانا سخاوت علی جونپوری کے خاندان کی جاگیر میں رہا ہے اور آج بھی یہاں کی چند بیگھوں کی زمین پر مولانا کے پڑپوتے مولوی علی اعلیٰ صاحب قابض ہیں اور اس کی نگہداشت کے لیے وہیں رہتے ہیں، جس زمانہ میں احقر مولانا سخاوت علی پر مقالہ لکھ رہا تھا، مولوی علی اعلیٰ صاحب کی خدمت میں خاندانی معلومات کی فراہمی کے سلسلے میں وہاں گیا تھا، اس اجڑے ہوئے گاؤں کے آثار دیکھ کر انتہائی صدمہ ہوا تھا۔

غرض اسی مرحوم بستی کے ایک نامور فرزند ملا بابُ اللہ تھے جو جونپور میں رہنے کی وجہ سے جونپوری کی نسبت سے علمی دنیا میں مشہور ہوئے، مثل مشہور ہے ”ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات“ یہ مثل شیخ باب اللہ پر حرف بحرف صادق آتی ہے، یہ بچپن ہی سے نہایت روشن ضمیر، ذکی اور طباع تھے، سن شعور کو پہنچے تو تحصیل علم کا شوق دامن گیر ہوا، مقامی علماء سے قدرے استفادہ کر کے غربت کی راہ اختیار کی اور مختلف علماء وفضلاء سے اخذِ فیض کرتے ہوئے آغازِ شباب میں مولانا احمد اللہ سندیلوی کی خدمت میں پہونچ گئے اور انھیں سے بقیہ علوم وفنون کی تحصیل کر کے فراغت حاصل کی اور اس شان کے عالم ہوئے کہ صاحب تجلی نور کو لکھنا پڑا:

”درہند ہیچ عالمے پنجۂ علمش برنہ تافت“۔

چونکہ دیہات میں علم وفضل کی اشاعت کے وہ ذرائع میسر نہیں ہوسکتے جو شہر

وقصبات میں حاصل ہوتے ہیں اس لیے ملا باب اللہ نے ترکِ سکونت کر کے جون پور میں اقامت اختیار کر لی اور محلہ خواجگی ٹولہ میں ایک مدرسہ اور خانقاہ تعمیر کر کے مصروف درس وافادہ ہو گئے، سیکڑوں طلبہ آپ کی درسگاہ سے عالم فاضل بن کر نکلے، جن میں ملا یحییٰ بہاری شارحِ سلّم علمی دنیا میں بے مثال شہرت کے مالک ہوئے۔ مُلاّ کے حالات لکھنے کے بعد شیخ نورالدین زیدی حسرت ویاس کے عالم میں لکھتے ہیں:

لیکن حالتِ انقلاب زمانہ تا اینجا رسید کہ اکنوں سالِ وفاتش ونشان قبر ایں چنیں سرمایۂ ناز وافتخار دریافت نمی شود وندانم کہ کدام سرزمین آب حیاتش چکید وبکجا آں گوہر یکتا غلطید۔ (تجلی نور ص ۹۲-۹۳)

لیکن انقلابِ زمانہ نے حالت یہاں تک پہنچادی کہ اب اس سرمایۂ ناز وافتخار کی تاریخ وفات اور نشان قبر کچھ بھی نہیں معلوم کہ کس سرزمین پر ان کا پیمانہ عمر لبریز ہوا اور کہاں پہ در نایاب گم ہوا۔

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس جیسے یکتائے زمانہ کا اخلاف کی ناقدریوں سے زاویۂ خمول میں گم ہوجانا باعثِ صد حسرت ہے اور اس پر جتنا بھی آنسو بہایا جائے کم ہے۔

مولانا بخشیش احمد کوئر یا پاریؒ

مولانا بخشیش احمد بن محمد حسن بن ظہور محمد فاروقی ابن عم ومعاصر مولانا علی احمد کوئر یا پاری اپنے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کے اعتبار سے ممتاز مقام کے مالک تھے، حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی تھی اور حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلۂ چشتیہ میں مرید اور مجاز بیعت تھے، کھانے پینے اور ضروریات زندگی میں ہمیشہ فتویٰ کے بجائے تقویٰ پر عمل کرتے تھے، فراغتِ تعلیم کے بعد علماء وصلحاء کے طریقہ پر علوم دینیہ کی نشرواشاعت میں پوری زندگی بسر کردی، آپ کے تلامذہ اس دیار میں آج بھی موجود ہیں اور آپ کے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کے بڑے عجیب عجیب واقعات بیان کرتے ہیں۔

مولانا کے مفصل حالات دستیاب نہیں ہوسکے۔

مولانا بہادر حسین مئویؒ

مولانا بہادر حسین قصبہ مئو ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے اور بنارس جا کر وہاں کے اساتذہ سے تحصیل علم کی، نہایت تیز فہم اور قوی الحفظ تھے، اس لیے علمائے عصر میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے، ساتھ ہی نہایت صالح، پرہیز گار اور دیانت شعار تھے۔ پارچہ بافی کے ذریعہ تحصیل معاش کرتے تھے۔ ۱۲۷۰ھ میں انتقال کیا۔ (نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۰۳)

مولانا بشیر احمد غالب پوریؒ

مولانا بشیر احمد غالب پوری علمائے اعظم گڈھ میں بڑی شہرت و مقبولیت کے مالک تھے، قدرت نے علم و عمل کے ساتھ زور بیان سے بھی حصۂ وافر عطا فرمایا تھا۔

مولانا نے ابتداءً پرائمری اسکول میں پڑھا، یہاں کی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد ضلع اعظم گڈھ کی مشہور درس گاہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں داخل ہوئے اور وہاں کتاب النحو اور کتاب الصرف پڑھی، اسی زمانہ میں مولانا کو کسی نے دیوبند جانے کا مشورہ دیا، مولانا کے دل میں یہ مشورہ کچھ اس طرح بیٹھ گیا کہ گھر اطلاع کیے بغیر دیوبند چلے گئے، دیوبند میں داخلہ کے لیے شرحِ جامی کے معیار کی کتابوں میں کامیابی شرط تھی اس لیے وہاں داخلہ نہ ہو سکا، چونکہ مولانا گھر سے بغیر کسی اطلاع کے آئے تھے اور اپنے بھائی محمد عیسیٰ خاں کو بھی خبر نہ دی تھی جو مولانا کی کفالت کرتے تھے اور اس وقت حصول معاش کی غرض سے ملیشیا میں تھے، اس لیے مولانا کا ہاتھ بالکل خالی تھا، داخلہ کی کوئی صورت نہیں تھی اور نہ گھر ہی واپس ہو سکتے تھے، غرض بڑی الجھنوں میں گرفتار ہو گئے، ''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'' اس وقت دار العلوم میں اعظم گڈھ کے بہت سے طلبہ اونچے درجوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے جن میں حضرت مولانا علی احمد کوئریا پاری ثم سرائے میری، مولانا حبیب الرحمٰن مئوی اور حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری قدس اسرارہم خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

حضرت فتحپوریؒ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اعظم گڈھ کا ایک طالب علم ان دشواریوں میں

پھنسا ہے تو مولانا نے مولانا بشیر احمد کو بلا کر بڑی حوصلہ افزائی کی اور فرمایا کہ گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں، ایک سال کے اندر محنت وجانفشانی کر کے شرحِ جامی کے معیار تک تعلیم مکمل کرلو اور کھانے کے سلسلے میں بے فکر رہو، میرا دوپہر کا پورا کھانا اور شام کا نصف تمھیں مل جایا کرے گا، مولانا فتحپوری اکثر روزے سے رہتے تھے، شام کے کھانے سے آدھا افطار وغیرہ کے لیے رکھ لیتے تھے اور بقیہ مولانا بشیر صاحب کے حوالے کر دیتے تھے، یہ قابل رشک اور بے نظیر مجاہدہ اور ایثار ہے جو مولانا فتحپوری نے زمانہ طالب علمی میں پیش کیا۔ سچ ہے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔

غرض سال بھر کی کوشش کے بعد جس میں دیگر اساتذہ کے علاوہ مولانا فتحپوری کا بھی ہاتھ تھا۔ مولانا شرحِ جامی کے معیار تک پہونچ گئے اور دوسرے سال باقاعدہ وظیفہ طعام کے ساتھ آپ کا مدرسہ میں داخلہ ہو گیا اور ۶-۷ برس وہاں رہ کر درس نظامیہ کی تکمیل کی دورۂ حدیث حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی (۱) اور حضرت مولانا اصغر حسین محدّث دیوبندیؒ سے پڑھا۔ آپ کے دیوبند کے اساتذہ میں حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ، حضرت مولانا اعزاز علی شیخ الادبؒ اور حضرت غلام رسول خاں سرحدیؒ (۲) بھی تھے، یہ جملہ اساتذہ اس عہد میں ہندوستان ہی میں نہیں دنیا کے

---

(۱) حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن بن فضل الرحمٰن عثمانی دیوبندی مفتی اعظم دیوبند ۱۲۷۵ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے، ۱۲۹۸ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی اس کے بعد کچھ دنوں تک میرٹھ میں تدریسی خدمات انجام دیں بعد ازاں دارالعلوم میں تدریس اور افتاء کی خدمت پر مامور ہوئے اور ۱۳۴۵ھ تک دارالعلوم میں خدمت مفوضہ کو انجام دے کر ڈابھیل چلے گئے، وہیں کے زمانہ تدریس میں ۱۳۴۷ھ میں دیوبند میں وفات پائی۔ فقہی جزئیات کی معلومات اور اس کے استحضار میں آپ کو قوت راسخہ حاصل تھی، عموماً فتاوی کی تحریر کے وقت کتب فقہیہ کی طرف مراجعت کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندی سے خلافت بھی حاصل تھی۔ (نزہۃ الخواطر ص ۳۲۰، ج ۸)

(۲) حضرت غلام رسول خاں سرحدی دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے تھے آپ کا اصل وطن ضلع ہزارہ پاکستان ہے، آپ بلند پایہ خطیب بھی تھے، ایک عرصہ تک دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی خدمات انجام دیں۔ آخر میں آپ کی صلاحیتوں کے پیش نظر آپ کو جمعیۃ علماء پاکستان کا ناظم منتخب کیا گیا اور تادم زیست اس عہدہ پر متمکن رہے۔ موصوف کی علمی شہرت کی بنا پر مصر نے بطور نمائندہ جمعیۃ علماء پاکستان آپ کو دعوت دی، آپ نے وہاں کی عالمی موتمر میں علماء عالم کو خطاب فرمایا۔ الغرض علماء پاکستان میں آپ ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔

علماء میں اپنی نظیر آپ تھے، تکمیل کے بعد جو غالباً ۲۳-۱۹۲۴ء میں ہوئی ناصری گنج ضلع شاہ آباد آرہ کی ایک قدیمی درس گاہ میں استاذ مقرر ہوئے جس میں ہدایہ اخرین، مشکوٰۃ شریف اور متنبی وغیرہ تک تعلیم ہوتی تھی۔

مولانا تدریسی صلاحیتوں کے علاوہ بہت عمدہ خطیب اور واعظ بھی تھے، اسی لیے اس علاقہ میں آپ کو بہت جلد شہرت ومقبولیت حاصل ہوگئی جس سے مدرسہ کو بہت نفع ہوا، مدرسہ کی عمارت جو بہت چھوٹی اور بے حیثیت تھی اسے آپنے ایک وسیع اور کشادہ عمارت میں تبدل کردیا، مولانا ابھی وہاں ۵-۶ برس ہی رہنے پائے تھے کہ آپ کے قدیم ساتھی مولانا علی احمد سرائے میری نے جو اعظم گڈھ کے ایک مشہور ادارہ ناصر العلوم قصبہ گھوسی میں تدریسی وتعلیمی خدمت انجام دے رہے تھے آپ کو باصرار ناصر العلوم میں آنے کی دعوت دی، مولانا نے ان کی طلب پر ۲۸-۲۹ء مطابق ۱۳۴۸-۴۹ھ میں ناصری گنج کو خیرباد کہا اور ناصر العلوم میں چلے آئے، مولانا کے یہاں آجانے سے تعلیم میں جان آگئی اور بڑے اچھے طلبہ سالہا سال یہاں سے تکمیل کے لیے دیوبند بھیجے گئے۔ ۶-۷ برس یہاں رہنے کے بعد آپ محمد آباد گوہنہ کے رئیس علی حماد فاروقی کی کوششوں سے محمد آباد چلے آئے اور وہاں ایک عربی درسگاہ قائم کی اور تقریباً آٹھ برس یہاں رہ کر حضرت مولانا شاہ عبد الغنی پھولپوری قدس سرہ کے اصرار پر مدرسہ بیت العلوم سرائے میر میں آگئے اور یہاں وعظ وتبلیغ کے شعبہ میں کام شروع کیا، لیکن ۳-۴ سال کے بعد اپنی سب سے پہلی تدریسی منزل معین الغرباء ناصری گنج کے ارباب حل وعقد کی دعوت وطلب پر بیت العلوم کو چھوڑ کر ناصری گنج چلے گئے اور وہیں تعلیمی وتبلیغی مشاغل میں مصروف تھے کہ سخت بیمار پڑ گئے اسی حالت میں آبائی وطن غالب پور تشریف لائے۔ اور پینسٹھ (۶۵) برس کی عمر پا کر ۱۳۶۵ ہجری میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے، جن میں مولانا عتیق الرحمٰن آروی سابق مبلغ دار العلوم دیوبند حال استاذ ڈیری آنسون، مولانا محمد اسلم فاروقی اعظمی صدر مدرس مخزن العلوم ولدار نگر غازی پور، مولانا جمال الدین خاں غالب پوری استاذ شعبہ اسلامیات

جامعہ ملیہ دہلی، مولانا محب الحق چندیروی اور مولانا حکیم مصلح الدین نے بڑی شہرت ومقبولیت حاصل کی اور اپنے اپنے حلقہ میں علوم اسلامیہ کی ترویج واشاعت میں مصروف ہیں۔

(معلومات از مولانا جمال الدین غالب پوری برادرزادہ وتلمیذ رشید مولانا بشیر احمدؒ)

==================

﴿ح﴾

ملّا حامد عبّاسی چریاکوٹیؒ

ملا حامد عباسی شیخ فیض اللہ عباسی چریاکوٹی کی اولاد میں تھے، چریاکوٹ میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور آغاز شباب میں اعلیٰ تعلیم کے لیے گھر سے نکل پڑے اور دہلی جاکر وہاں کے مشہور درباری عالم محمد زاہد بن محمد اسلم کابلی سے تحصیل علم کیا، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیمؒ آپ کے رفیق درس تھے، بعض کتابیں دانشمند خاں وزیر سے بھی پڑھیں، ان اساتذہ کے علاوہ بعض فنون مدرسہ ملا شفیعا میں بھی حاصل کیے۔

فراغتِ تعلیم کے بعد دربار عالمگیری سے منسلک ہوگئے اور گذر اوقات کے لیے دو روپے یومیہ وظیفہ پانے لگے۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے فتاویٰ عالمگیری(۱) کی ترتیب و تالیف کے لیے جب علماء کی مجلس تشکیل کی تو اس میں ملا حامد کو بھی شامل کیا، چنانچہ مرتبینِ فتاویٰ کے ہمراہ یہ بھی اس کی تالیف میں شریک رہے۔ ملا حامد نے اپنے ساتھ شاہ عبدالرحیم

---

(۱) فتاویٰ عالمگیری علماء ہندوستان کا قابل فخر کارنامہ ہے، جسے اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمہ کے حکم سے اس وقت کے پچاس منتخب علماء نے آٹھ سال کی مسلسل جد وجہد کے بعد مکمل کیا تھا، یہ فتاویٰ اپنی جامعیت اور جزئیات کے استقصاء کے لحاظ سے گذشتہ فتاویٰ کی کتابوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے، اس فتاویٰ کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر مسئلہ کے ساتھ اس کے ماخذ کا مفصل حوالہ بھی دے دیا گیا۔ حوالہ کی کتابیں تقریباً ۱۲۳ ہیں جن میں فقہ حنفی کی تقریباً تمام اہم اور معتبر کتابیں آگئی ہیں، آٹھ برس کی مسلسل محنت وکاوش اور کم وبیش دو لاکھ روپے کے صرفہ سے یہ عظیم فتاویٰ تیار ہوا، ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہی مسائل لیے گئے ہیں جو راجح، مفتیٰ بہ یا ظاہرُ الرّوایت کے ہیں، اگر کوئی مسئلہ ظاہرُ الرّوایت میں نہیں ہے تو اسے نوادرات سے اس تصریح کے ساتھ لیا گیا ہے کہ کتاب میں اس پر فتویٰ کا اشارہ موجود ہے۔

صاحب والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کو بھی ترتیب فتاویٰ میں شریک کرلیا تھا۔ فتاویٰ کی تکمیل کے بعد کچھ عرصہ تک شہزادہ اکبر ثانی کی تعلیم و تربیت پر مقرر رہوئے، آخر عمر میں وطن چلے آئے تھے اور یہیں فوت ہوئے۔ تاریخ وفات اور مزید تفصیلات تلاش بسیار کے باوجود دستیاب نہ ہوسکیں۔

(تکملہ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۴، اسلام اور عصر جدید شمارہ جولائی ۱۹۷۲ء بحوالہ یادداشت چریاکوٹ)

مولانا حبیب الرحمٰن مئویؒ

مولانا حبیب الرحمٰن بن مولانا ابوالحسن بن عبداللہ بن شیخ تراب علی بن شیخ میہان بن شیخ ہمت علی عراقی مئوی ۱۳۱۵ھ میں مئو میں پیدا ہوئے، تاریخی نام شیخ عبدالرحمٰن ہے۔ متوسطات تک اپنے والد ماجد مولانا ابوالحسن سے پڑھ کر دیوبند تشریف لے گئے اور وہاں علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ وغیرہ سے کتب تفسیر و حدیث کی تحصیل و تکمیل کی، فراغت کے بعد والد ماجد کی طرح تعلیمی مشغلہ شروع کیا، مگر عین جوانی میں ۲۶ برس کی عمر میں وفات پاگئے۔

مولانا حبیب الرحمٰن نہایت ذی استعداد اور باصلاحیت عالم تھے، زمانہ طالب علمی میں بڑے بڑے اہم علمی مسائل کو قوت مطالعہ سے حل کرلیا کرتے تھے، حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ آپ کی ذہانت و فطانت اور تیزیٔ فہم کے بڑے مداح تھے، مولانا سے علمی حلقہ کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں، آپ کی وفات سے علمی دنیا کا بڑا نقصان ہوا، آپ کی وفات پر آپ کے والد محترم مولانا ابوالحسن نے عربی اور فارسی میں طویل مرثئے لکھے اور تاحیات اس غم کو بھلا نہ سکے۔ (از مولانا انعام الحق عراقی مئوی)

قاضی حبیب اللہ گھوسویؒ

قاضی حبیب اللہ بن احمد بن ضیاء الدین بن یحییٰ بن شرف الدین بن نصیر الدین بن مفتی حسین عثمانی گھوسوی حضرت میر علی عاشقاں سرائے میری متوفی ۹۵۵ھ کے مریدین میں سے تھے، فقہ، اصول فقہ اور ادب و عربیت میں تبحر کا درجہ رکھتے تھے۔ (رسالۂ عاشقیہ قلمی ص ۶۳)

زمانہ دراز تک قصبہ گھوسی ضلع اعظم گڈھ میں عہدۂ قضا پر فائز رہے، آخر میں اپنے شیخ حضرت میر علی عاشقاں کے اشارے پر قضاء کے عہدہ کو اپنے صاحبزادے کو تفویض کر کے خود ذکر و شغل میں مصروف ہو گئے۔ رسالہ عاشقیہ میں ہے:

منقول است کہ وے عالم بود بعلوم شرائع و مرید صادق حضرت ایشاں بودہ، مدتے در خدمت قضا گزارنیدہ واکثر در خاطر می آید کہ از حضرت ایشاں برائے اذکار واستفادہ عرض کنم و برائے آں امر از قوت بہ فعل نہ آمد روزے در محفل شریف نشستہ بود، فرمودند کہ قاضی حبیب اللہ نام تو حبیب اللہ است وحُبّ الٰہی وقتے متحقق گردد کہ معرفت او حاصل کنی، قاضی عرض کردند کہ حضرتم ایں عین مطلبے ما بودہ است کہ عمر آخر رسید ودل از دنیا شیر شدہ، فرمودند کہ خاتم قضا را بہ پسر خود دہ وتو بکار خدا مشغول باش، وے حسب الامر کار بند شد، در خدمت ایشاں راہ یافت و بدولت تربیت و تلقین رسید۔ (رسالہ عاشقیہ قلمی ص ۶۳)

قاضی حبیب اللہ علوم شریعت کے جامع اور حضرت علی عاشقاں کے مخلص مرید تھے، زمانہ دراز تک قضاء کی خدمت انجام دی، ان کی دلی خواہش تھی کہ حضرت میر علی عاشقاں سے بیعت کر کے ذکر واذکار کے لیے عرض کروں مگر یہ خواہش مدتوں پوری نہ ہو سکی، ایک دن حسنِ اتفاق سے قاضی میر صاحب کی مجلس میں بیٹھے تھے کہ میر صاحب قاضی کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ آپ کا نام حبیب اللہ ہے لیکن حُبّ الٰہی بغیر معرفت کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ قاضی صاحب نے عرض کیا کہ حضور میری یہی عین خواہش ہے عمر ختم ہونے کو آئی دل دنیا سے آسودہ ہو چکا ہے، میر صاحب نے فرمایا کہ مہر قضا اپنے بیٹے کو سپرد کر دو اور یادِ الٰہی میں مشغول ہو جاؤ، انھوں نے حکم کی تعمیل کی اور حضرت میر علی عاشقاں کی تربیت میں شامل ہو گئے۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب حضرت میر علی عاشقاں سرائے میری کے مریدین میں تھے اور اس وقت ان کی عمر کا آخری دور تھا اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ آپ دسویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں۔ اس سے زیادہ حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔

مولانا حسن علی بہاءُ الدّین پوری ماہلیؒ

مولانا حسن علی بن نوازش علی حنفی انصاری ماہلی سواد قصبہ ماہل کی ایک بستی بہاء الدین پور میں ۱۱۹۶ھ میں پیدا ہوئے، تحصیل علم کی غرض سے بچپنے ہی میں وطن مالوف کو خیرباد کہہ کر بنارس چلے گئے اور یہاں ملا محمد عمر بن غوث عمری بنارسی متوفی ۱۲۲۵ھ(۱) سے فارسی کی تحصیل کی اور پندرہ برس کی عمر میں یعنی ۱۲۱۰ھ میں فارسی کی تعلیم سے فارغ ہو گئے۔ صبح وطن میں انھوں نے خود اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھا ہے:

"در ایام طفولیت از وطن مالوف برآمد در بنارس تحصیل کتب درسیہ فارسیہ بخدمت ملا محمد عمر کہ بلاواسطہ نسبت تلمذ بہ سراج الدین علی خاں آرزو و شیخ علی حزیں داشتند در سنہ پانزدہ سالگی کردم"۔

فارسی کی تعلیم سے فراغت کے بعد مختلف مقامات پر علوم مروجہ کی تحصیل کر کے پچیس سال کی عمر میں یعنی ۱۲۲۰ھ میں عالم فاضل ہو گئے۔ جیسا کہ مولانا حسن نے خود لکھا ہے:

"و بمرور ایام ولیالی تحصیل علوم عقلیہ ونقلیہ جا بجا کردہ در سن بست و پنج سالگی فراغ حاصل نمودم نسبت تلمذ در علومِ متداولہ معقول ومنقول بیک واسطہ بمولوی برکت الہ آبادی قدس سرہ کہ از علمائے فحول بودند می رسد"۔

مولانا کے اس بیان میں تحصیل علم کے سلسلہ میں صرف ایک مقام بنارس اور ایک استاذ ملا محمد عمر بنارسی کا نام آتا ہے، اس کے بعد جا بجا علومِ متداولہ کی تحصیل کی اور بیک واسطہ مولوی برکت الہ آبادی سے شرفِ تلمذ کی تصریح ہے۔ ظاہر ہے کہ جا بجا مختلف اساتذہ سے استفادہ کیا ہوگا، مگر ان میں سے ایک کے علاوہ کسی کا نام نہیں لیا، اس کی کوئی خاص وجہ ان کے نزدیک رہی ہوگی۔

---

(۱) ملا محمد عمر بنارسی تلمیذ آرزو، اکبرآبادی و شیخ علی حزیں کی ولادت ۱۱۳۳ھ میں مرزاپور کے ایک گاؤں میں ہوئی اور ۹۲ سال کی عمر میں ۱۲۲۵ھ میں بنارس میں فوت ہوئے۔ (تذکرہ مشائخ بنارس)

فراغت کے بعد کلکتہ میں مدرس ہوئے جہاں کم وبیش بارہ برس تک تدریسی خدمات انجام دیں پھر ۱۲۳۲ھ میں کلکتہ ہی سے مدراس چلے گئے اور وہاں سرکاری مدرسہ میں بیس سال سے زائد تک تعلیم دی ۱۲۵۲ھ کے بعد مدراس ہی میں صدر مفتی کے عہدہ پر فائز ہوئے اور چار سال اس منصب پر رہ کر ۲۹ رجب ۱۲۵۸ھ میں راہی ملکِ عدم ہوئے۔

مولانا حسن علی نہایت ذہین وطباع اور ذی علم تھے، علوم مروجہ متداولہ میں مہارت کے ساتھ ریاضی اور شاعری سے خاص تعلق تھا اور ان میں وہ استاذِ وقت مانے جاتے تھے، ریاضی میں ان کی متعدد کتابیں اور رسائل ہیں، نواب والا جاہ نے لکھا ہے:

"حسن تخلص مولوی محمد حسن ماہلی است کہ درعلم فارسی وعربی وریاضی استاذ وقت خود است رسالہ تبصرۃ الحکمۃ درطبعیات والہیات بنام ایں راقم السطور رقم ساختہ ورسالہ منتخب التحریر درعلم ریاضی ورسائل تکسیر وجفر ورمل وغیرہ ازمؤلفاتِ اوست۔ (صبح وطن ص ۵۶)

دینی علوم میں بھی اپنے معاصرین میں ممتاز تھے، کتاب وسنّت اور فقہ میں ان کو مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ مدراس میں صدر مفتی ہونا اس کی دلیل ہے، لیکن یہ وصف بعد میں نمایاں ہوا، جبکہ شعر وسخن اور ریاضی کی شہرت عام ہو چکی تھی، اس لیے ان کے تذکرہ نگاروں نے ان ہی گوشوں کو زیادہ اجاگر کیا ہے۔ مولانا حسن کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

اے یاد پیش یار برو باادب بگو! کیں دل برائے دیدنِ تو زار می طپد
چشم تو دوست دارم اگر می طپم بجاست تیمار دار از غمِ بیمار می طپد

دوشینہ در برآں بتِ عیار داشتم خوش طالعے کہ دولت بیدار داشتم
کامم پُر از حلاوتِ دنیاست اے حسنؔ شاید بخواب لب بہ لب یار داشتم

دوش چوں بے رحمئ ظالم دل ما یاد کرد من جدا فریاد کردم، دل جدا فریاد کرد
از سرشک لالہ گوں گشتم چوں گل رنگیں قبا نور چشم من لباس دیگرم امداد کرد

شاید کہ بت ما گذرد برسر رہا ہے　　برخاک نشینم بامید نگاہ ہے!
ہر چند ضعیفم و دلے حامیٔ عشقیم　　سر تیزی آتش بود از برگ گیا ہے

مولوی حسن علی صاحب کی پوری زندگی وطن سے دور کلکتہ اور مدراس میں گذری ان ہی دونوں جگہوں میں ان کے کمالات علم وادب کے میدان میں ظاہر ہوئے، کلکتہ کی بہ نسبت مدراس میں انھیں قیام کرنے کا موقع زیادہ ملا اس لیے یہیں ان کی علمیت وقابلیت کے جوہر نمایاں ہوئے، چنانچہ شاعری میں ان کے کئی تلامذہ کے حالات کتابوں میں ملتے ہیں جن کا تعلق جنوبی ہند سے ہے ان میں سے چند یہ ہیں:

مولوی سیّد حمید الدین ولاؔ، مولوی تاج الدین بہجتؔ، شاہ روح اللہ بلیغؔ نقشبندی، مولوی حاجی محی الدین حیرانؔ، مولوی غلام علی صاحبؔ، مولولی قادر علی قادرؔ۔

مولانا حُسام الدّین مئویؒ

مولانا حسام الدین مئوی اس دیار کے علمائے اعلام میں تھے، جملہ علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل مولانا فیض اللہ مئوی تلمیذ مولانا سخاوت علی جون پوری متوفی ۱۲۷۴ھ اور مولانا علی عباس چریاکوٹی سے کی، آپ مولانا فیض اللہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، تکمیل کے بعد استاذ محترم کے ایماء پر مئو میں مدرسہ اسلامیہ کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی اور مدت العمر اسی درس گاہ میں علوم دینیہ کی نشر واشاعت میں مشغول رہے، بیشمار طلبۂ علوم نے آپ کے درس سے فراغ حاصل کر کے فروغ پایا۔

مولانا حسام الدینؒ صبر وقناعت کے مجسمہ تھے، مختلف مدارس سے بڑے بڑے مشاہروں پر آپ کو طلب کیا گیا مگر انھوں نے سب کو پائے استغناء سے ٹھکرا دیا اور اپنے قائم کردہ مدرسہ میں قلیل معاوضہ پر کام کرتے رہے، درس وافادہ سے فرصت ملتی تو تسبیح وتہلیل میں مشغول ہو جاتے، مزاج میں حد درجہ سادگی تھی، قصبہ مئو میں آپ کا علمی وقار اس درجہ کا تھا کہ جب تک آپ کے دستخط نہ ہو جاتے کوئی فتویٰ صادر نہ ہوتا تھا، فقہ اور حدیث دونوں میں کامل دستگاہ اور مہارت رکھتے تھے، اپنے استاذ مولانا فیض اللہ مئوی سے چار سال

قبل ۱۳۱۰ھ میں انتقال فرمایا، تلامذہ میں مولانا محمد سعد اللہ واعظ، ابو الفیاض، عبد القادر اور ابو المکارم محمد علی وغیرہ نے درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں خاص شہرت پائی۔

(تراجم علمائے اہلحدیث ص ۴۱۵)

شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ بندویؒ

نامِ نامی حفیظ اللہ کنیت ابو الفضل اور لقب شمس العلماء ہے، نومبر ۱۸۴۷ء مطابق ۱۲۶۴ھ میں موضع بندی ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، (۱) قرآن حکیم اور اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر والدِ محترم شیخ دین علی سے حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں داخل ہوئے، وہاں مولانا احمد حسین رسول پوری، حافظ عبد اللہ غازی پوری اور دیگر اساتذہ سے فارسی اور نحو وصرف وغیرہ کی تکمیل کی اور متوسطات کی تعلیم بنارس میں مولانا سلامت اللہ جیراج پوری سے پائی، اس کے بعد لکھنؤ جا کر مولانا ابو الحسنات عبد الحئی فرنگی محلی متوفی ۱۳۰۴ھ کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور پانچ سال مولانا کی خدمت میں رہ کر درسیات کی تکمیل کر کے سند فراغت حاصل کی، صحاح کی سند واجازت مولانا سیّد نذیر حسین محدث دہلوی سے بھی حاصل کی، درسِ نظامی کے علاوہ حضرت مولانا عبد الحئی مرحوم سے انھوں نے شرح تذکرہ، شرح عقائد جلالی، حاشیہ قدیمہ وجدیدہ اور الٰہیات شفا کا غیر مسلسل حصہ بھی پڑھا تھا، تحصیل علوم سے فراغ کے بعد مولانا عبد الحئی مرحوم کی سعی سے کاکوری کے ایک مدرسہ میں تدریسی خدمت پر مامور ہوئے، اسی زمانہ میں آپ کے استاذ اجل مولانا عبد الحئی فرنگی محلیؒ مرض وفات میں مبتلا ہو گئے اور اپنی جانشینی کے لیے کاکوری سے آپ کو لکھنؤ طلب کیا، استاذ محترم کی طلبی پر آپ لکھنؤ حاضر ہوئے اور مولانا کے داماد محمد یوسف اور باہر سے آئے ہوئے دوسرے طلبہ کو درس دینا شروع کیا، تقریباً دو سال یہاں قیام کر کے مولانا مرحوم کی جانشینی کا حق ادا کرتے رہے پھر نواب رام پور کی دعوت پر مدرسہ عالیہ رام پور چلے گئے اور مدرسہ کے صدر منتخب ہوئے۔ مسلسل نو سال مدرسہ عالیہ میں تعلیم وتدریس کے ذریعہ علوم دینیہ کی

(۱) حیاتِ شبلی ص ۱۷۴ کے حاشیہ پر علامہ سیّد سلیمان ندوی نے مولانا حفیظ اللہ کی ولادت کا سن ۱۸۵۶ء لکھا ہے۔

نشر و اشاعت کی ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں جب ندوۃ العلماء کی نگرانی میں دارالعلوم ندوہ کا اجراء ہوا تو باتفاق اراکین ندوہ آپ دارالعلوم کے مدرس اوّل بنائے گئے اور گیارہ برس تک یہاں درس و افادہ میں سرگرم عمل رہے پھر اگست ۱۹۰۹ء میں حکومتِ انگلشیہ کی طلب پر مجبوراً ڈھاکہ مدرسہ محسنیہ میں تشریف لے گئے اور وہاں چار سال تک تدریسی خدمات انجام دیں، اسی زمانہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور انھیں یونیورسٹی کا پروفیسر بنایا گیا، چونکہ دو جگہ سرکاری ملازمت کرنا خلاف قانون ہے، اس لیے مدرسہ محسنیہ سے آپ ریٹائر ہو گئے اور یونیورسٹی میں چلے آئے۔

یونیورسٹی ہی کے قیام کے زمانہ میں ۱۹۲۱ء مطابق ۱۳۳۹ھ کو فریضہ حج کی ادائیگی سے مشرف ہوئے، حج سے واپسی کے بعد پھر اراکین ندوہ نے دارالعلوم میں قیام پر اصرار کیا، اس لیے مولانا نے پروفیسری سے استعفاء دے کر اور چار سو روپے کے بجائے ڈیڑھ سو پر دارالعلوم ندوہ کی نظامت و صدارت قبول کر لی، ڈھاکہ یونیورسٹی سے متعدد خطوط اور تار آئے مگر آپ نے وہاں جانا منظور نہیں کیا اور تقریباً دس برس تک مسلسل دارالعلوم ندوہ میں درس و تدریس اور انتظام و اہتمام کے فرائض انجام دیتے رہے، آخر میں ضعف بصر کی وجہ سے ۱۳۴۸ھ میں دارالعلوم کو الوداع کہا اور آبائی وطن بندی ضلع اعظم گڈھ میں گوشہ نشین ہو گئے۔

مولانا حفیظ اللہ مرحوم نے تقریباً ۴۵ سال درس و تعلیم کا مشغلہ جاری رکھا اور ایک دن بھی اس سے جدا نہیں ہوئے، اس طویل عرصہ میں کتنے طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا ہوگا، اس کا اندازہ دشوار ہے، البتہ مشاہیر تلامذہ میں سے علامہ سیّد سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا شبلی جیراج پوری اور مولانا مسعود علی ندوی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا کی تصنیفات میں کنز البرکات لمولانا ابی الحسنات اور حاشیہ تصریح الافلاک طبع ہو چکی ہے اور دستیاب ہیں۔

مولانا ندوہ سے الگ ہونے کے بعد تقریباً چودہ برس تک باحیات رہ کر ۷ رذی الحجہ ۱۳۶۴ھ میں اپنے وطن بندی میں انتقال فرمایا۔

سیر و صید کے بہت دلدادہ تھے اور یہ شوق زندگی کے آخری ایام تک برقرار رہا، بڑھاپے

میں بھی بڑے چاق وچوبند رہتے تھے، چلنے پھرنے میں پیری کا اثر بالکل ظاہر نہ ہوتا تھا۔
حضرت مولانا عبدالحئیؒ سے شرف تلمذ کے باوجود آخر میں وہ عامل بالحدیث ہو گئے تھے، عدم تقلید کا رجحان پہلے ہی سے تھا جو شاید مولانا سلامت اللہ جیراج پوری کی صحبت کا اثر ہو۔ (نزہۃ الخواطر ص ۲۴-۱۲۳، ج ۸، تذکرہ علمائے حال ص ۲۳، تراجم اہل حدیث ص ۹۸-۳۹۵، حیاتِ شبلی ص ۱۷۵)

ملّا حمید عبّاسیؒ چریاکوٹی

ملا حمید بن ملا ابراہیم راجو عبّاسی چریاکوٹی علمائے چریاکوٹ میں بڑی اہمیت کے مالک تھے، سترہ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فارغ التحصیل ہو گئے تھے، وسعتِ علم اور جودتِ طبع میں بڑی شہرت پائی تمام فنون میں تبحر حاصل تھا بالخصوص فنِ لغت میں امامت کے مرتبہ پر فائز تھے۔ آپ کے علم و فضل کی شہرت جب بادشاہ شاہجہاں تک پہونچی تو آپ کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ دربار میں طلب کیا اور میر عدل کے منصب پر مامور کر دیا، لیکن زندگی نے وفا نہ کی، بیمار ہو کر گھر آئے اور یہیں آپ کا انتقال ہو گیا، کسی شاعر نے مرثیہ لکھا جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

درماتم یکتائے جہاں شیخ حمید است — چوں دامن گل چاک گریبان دو عالم
برداشت فغاں بلبل کلکم بہ ستائش — خوں شد دل فضل و ہنر و علم بیک دم

(اسلام اور عصر جدید شمارہ جولائی ۱۹۷۳ء، بحوالہ یادداشت چریاکوٹ)

مولانا حمید الدّین فراہیؒ

مفسّر قرآن حضرت مولانا حمید الدین بن عبدالکریم بن قربان قنبر بن تاج الدین فراہی ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں پھریہا میں جمادی الاخریٰ ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے، مولانا کا خاندان ضلع کے معزز خاندانوں میں شمار ہوتا ہے جو تعلیم اور دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے پہلے سے ممتاز رہا ہے۔

مولانا حمید الدین علامہ شبلی نعمانی کے ماموں زاد بھائی تھے، مولانا کا اصل نام حمید الدین ہی ہے، مگر وہ اس نام کو جو عربی قاعدہ سے لقب ہے، اپنے لیے معنوی حیثیت سے بلند سمجھتے تھے، اس لیے وہ اپنی تصانیف میں حمید الدین کے بجائے عبد الحمید لکھتے تھے۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی، سب سے پہلے انھوں نے قرآن حفظ کیا، اس کے بعد فارسی زبان کی تحصیل مولوی مہدی حسین چتاروی سے کی، اس زمانے میں شرفاء کی تعلیم کا فارسی ادب سب سے اہم جزو تھا، مولانا نے اپنی فطری ذہانت وطباعی کی بنا پر فارسی زبان میں بہت جلد اس قدر ترقی کرلی کہ شعر موزوں کرنے لگے، شاعری کا ذوق ان میں فطری تھا، تھوڑے ہی عرصہ میں زبان سے اس قدر گہری مناسبت پیدا کرلی کہ وہ اساتذہ کے رنگ میں شعر کہنے لگے۔

فارسی کے بعد مولانا نے عربی کی تحصیل شروع کی اور مولانا شبلی نعمانی سے عربی پڑھنے لگے، چنانچہ متوسطات تک مولانا شبلی ہی سے تعلیم پائی، اس کے بعد لکھنؤ جاکر فرنگی محل میں حضرت مولانا عبد الحئی قدس سرہ سے کچھ پڑھا، اس زمانہ میں لکھنؤ میں خواجہ عزیز الدین صاحب عزیزؔ لکھنوی فارسی کے نہایت مستند استاذ اور شاعر تھے ان کی مجلسوں میں بھی برابر شرکت کرتے رہے، اسی فارسی کے رشتہ سے تعلقات محبّت عزیزانہ حیثیت تک پہونچ گئے تھے، لکھنؤ کے بعد لاہور کا علمی سفر کیا اور مشہور ادیب مولانا فیض الحسن سہارنپوری (۱) کی خدمت میں حاضر ہوئے، مولانا موصوف اس وقت اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر تھے اور عربی ادب میں پورے ملک کے اندر اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، مولانا حمید الدین صاحب نے ان کی شاگردی سے پورا فائدہ اٹھایا اور مولانا فیض الحسنؒ نے بھی بڑی شفقت کے ساتھ مولانا کو علمِ ادب کی تکمیل کرائی، یہیں کے زمانۂ قیام میں مولانا کی ملاقات مولانا وحید الدین صاحب سلیمؔ پانی پتی سے ہوئی اور وہ دوستی تک پہونچی جو آخر دم تک قائم رہی

(۱) مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولانا فضل حق خیرآبادی کے شاگرد تھے، مولانا خیرآبادی معقولات اور ادب عربی دونوں کے استاذ تھے۔ مولانا فیض الحسن اس پایہ کے ادیب تھے کہ خاکِ ہند نے صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو، حدیث میں شیخ احمد بن ابی سعید دہلویؒ سے آپ کو تلمذ حاصل تھا، آپ نے پوری زندگی تدریس وتصنیف میں گذاردی اور ۱۲ر جمادی الاولی ۱۳۰۴ھ میں وصال فرمایا۔ (نزہہ ص ۳۶۶ وحیات شبلی ص ۸۰)

اسی دوستی کی کشش تھی کہ مولوی وحیدالدین صاحب سلیمؔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد تک پہونچے۔
غرض مولانا بیس برس کی عمر میں ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں عربی تعلیم سے فارغ ہوگئے اور عربی ادب میں وہ کمال پیدا کیا کہ اس عہد میں کوئی ان کے ثانی کم تھے، ان کا عربی دیوان جس کا شاہد ہے۔

عربی زبان اور دینی علوم کی تحصیل سے فراغت کے بعد بیس سال کی عمر میں انگریزی زبان کی تحصیل کے لیے علی گڈھ کالج میں داخل ہوئے، کالج میں داخلہ کے وقت مولانا فارسی اور عربی میں جو قابلیت پیدا کر چکے تھے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ خود سرسیّد نے مولانا کے لیے انگریزی پرنسپل کے پاس سفارشی خط لکھا اور اس میں پرنسپل کو خطاب کرتے ہوئے تحریر کیا کہ میں آپ کے پاس ایسا طالب علم بھیج رہا ہوں جو عربی اور فارسی میں اتنا قابل ہے کہ آپ کے کالج کے طلبہ میں تو کجا پروفیسروں میں بھی کوئی اس کے ٹکر کا نہیں ہے، اس زمانہ میں کالج کے پروفیسروں میں علامہ شبلی مرحوم جیسے عربی و فارسی میں یگانۂ روزگار ماہرین شامل تھے۔

مولانا کی طالب علمی ہی کے زمانہ میں سرسیّد نے مولانا سے طبقات ابن سعد سے سیرت نبوی کا کچھ حصّہ فارسی میں ترجمہ کرا کے کالج کے نصاب میں داخل کیا۔ علی گڈھ میں مولانا نے انگریزی اور دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ خاص توجہ سے فلسفۂ جدیدہ کی تحصیل کی، لیکن بی اے کی سند الٰہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں عربی میں ایم اے کا امتحان دینا چاہا مگر بعض عوارض کی بناء پر یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔

۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں مولانا نے تعلیمی سلسلہ ختم کر دیا اور مدرسۃ الاسلام کراچی میں مدرّس ہوگئے، یہ مسلمانوں کا انگریزی کا ایک بہت پرانا اسکول ہے، سندھ میں اس کو کافی شہرت حاصل ہے، مولانا اس میں ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء تک رہے، یہاں کے زمانۂ قیام (۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء) میں ان کا فارسی کا دیوان شائع ہوا، جمہرۃ البلاغۃ بھی اسی زمانہ کی علمی یادگار ہے، اسی زمانہ (غالباً ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء) میں جب اس وقت کے وائسرائے لارڈ کرزن نے سواحلِ عرب اور خلیج فارس کا سیاسی بحری سفر کیا تھا اور

سواحل کے عرب شیوخ اور امراء کو اپنی ملاقات کے لیے جمع کیا تھا تو مولانا کا انتخاب ترجمان کی حیثیت سے کیا، نیز ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں گورنمنٹ نے علی گڈھ کالج کو ایک معتد بہ عطیہ عربی تعلیم کے لیے دیا تھا، جس کے لیے یہ شرط تھی کہ اس کا پروفیسر کوئی یوروپین ہو، چنانچہ جرمن فاضل یوسف ہارویز کا اس کے لیے انتخاب ہوا، ساتھ ہی مولانا کا انتخاب مددگار پروفیسر کی حیثیت سے ہوا، چنانچہ مولانا لاہور سے علی گڈھ چلے آئے، یہیں ہارویز نے آپ سے عربی کی تکمیل کی اور آپ نے ہارویز سے عبرانی سیکھی۔ اسی زمانہ میں مولانا نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف ''اقسام القرآن'' لکھی؛ اس کے بعد اس کو مزید تحقیقات سے موید کر کے ''امعان فی اقسام القرآن'' کے نام سے علی گڈھ میں چھپوایا۔ ''اقسام القرآن'' کے علاوہ اگست ۱۹۰۶ء مطابق ۱۳۲۴ھ میں سورۂ ابی لہب اور سورۂ قیامہ کی تفسیریں بھی چھپیں اور اہل علم نے ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

دو برس علی گڈھ میں رہ کر ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے، کالج کے درس کے علاوہ وہ بقیہ اوقات تصنیف وتالیف میں خرچ کرتے تھے، یہیں سے انھوں نے سورۂ تحریم کی تفسیر شائع کی اور خالص فارسی میں یعنی عربی الفاظ کی آمیزش کے بغیر حضرت سلیمان علیہ السّلام کے مواعظ کا عبرانی سے فارسی نظم میں ترجمہ شروع کیا، الہ آباد یونیورسٹی میں مولانا ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۳ء تک رہے اور ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۴ء کے اوائل میں یہاں سے حیدرآباد دارالعلوم حیدرآباد کے پرنسپل ہو کر چلے گئے، اس دارالعلوم کا مجوزہ خاکہ یہ تھا کہ یہ عربی زبان کی ایک یونیورسٹی ہوگی جس میں علومِ جدیدہ کی آمیزش بقدر ضرورت ہوگی، مولانا حمید الدین مرحوم کے تصور نے مجوزہ دارالعلوم کی شکل ہی بدل دی، انھوں نے عربی علوم وفنون کی، اردو زبان میں تجویز پیش کی اور اس کا خاکہ تیار کیا، ان کا تخیل یہ تھا کہ دینیات کی تعلیم عربی میں ہو اور باقی علوم یہاں تک کہ اصول فقہ بھی اردو میں پڑھایا جائے، راس مسعود اور نواب سر حیدر نواز جنگ حیدری نے ان کے اس تخیل کو کہ علوم کی زبان اردو ہو کو قبول کیا مگر یہ کہ تمام لڑکوں کو دینیات کی تعلیم دی جائے، قبول نہیں کیا، یہی دراصل مولانا کی دل برداشتگی کا سبب ہوا، ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۷ء سے

جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں کی اصطلاحات کا کام شروع ہوا، مولانا اس علمی مجلس کے رکن تھے اور وضع اصطلاحات میں مفید مشورے دیتے تھے تا آنکہ ۱۳۳۸ھ مطابق 1919ء میں باقاعدہ اسکے افتتاح کی نوبت آئی، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی (۱) جو اس زمانہ میں صدر الصدور ہو کر حیدر آباد پہنچ چکے تھے، وہ جامعہ عثمانیہ کے سب سے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے تھے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ جامعہ عثمانیہ کی بنیاد رکھنے والوں میں مولانا کا ہاتھ بھی تھا، مگر بعض وجوہ سے یہ ہاتھ فوراً اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور عین اس وقت جب جامعہ عثمانیہ کا ہیولیٰ صورت اختیار کر رہا تھا، مولانا مستعفی ہو کر حیدر آباد سے گھر چلے آئے، یہاں خاندانی موروثی زمینداری کا کچھ کام کبھی کبھی دیکھ لیتے تھے، ایک دو لڑکوں کو کچھ پڑھا دیتے تھے ورنہ زیادہ تر وقت یاد الٰہی، نماز، تلاوت اور قرآن پاک میں غور و فکر میں گذارتے، اسی زمانہ سے مولانا نے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے تعلق استوار کیا اور براہِ راست اس کی تکمیل و ترقی کی اسکیموں میں دلچسپی لینے لگے، ہر ہفتہ میں تین دن شب و روز مدرسہ ہی پر قیام فرماتے اساتذہ و منتہی طلبہ کو درس دیتے، منتظمین کو اپنے تعلیمی اور اصلاحی نظریات سے آگاہ کرتے، چند آدمیوں کو منتخب کر کے انھوں نے ان کی خاص طور سے تربیت بھی کی تاکہ وہ ان کے طریق فکر و نظر کو اچھی طرح اپنا لیں اور ان کے بعد اس تعلیمی اور فکری اصلاح کے کام کو جاری رکھ سکیں جو مولانا نے شروع کیا تھا، اسی طرح انھوں نے دارالمصنّفین کے معاملات سے بھی پوری دلچسپی لی اور اس کی مجلس عاملہ کے جلسوں میں جس کے وہ ابتداء سے مستقل صدر تھے شریک ہوتے اور وہاں مصنّفین و رفقاء کی علمی

(۱) نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی ہندوستان کے مشاہیر علماء میں ہیں، ۲۸ر شعبان ۱۲۸۳ھ میں موضع بھیکن پور ضلع علی گڈھ میں آپ کی ولادت ہوئی، علوم عربیہ کی تحصیل مولانا عبدالحیٔ قائم گنجی و مولانا لطف اللہ علی گڈھی سے پائی، حدیث کی تعلیم شیخ حسین بن محسن انصاری سے بھوپال میں حاصل کی، شیخ عبدالرحمٰن بن محمد پانی پتی سے بھی سند و اجازت حاصل کی تھی، علومِ دینیہ کے علاوہ انگریزی تعلیم میں بھی ماہر تھے، ان علمی صلاحیتوں کے ساتھ متدین و متقی بھی تھے اور حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی سے بیعت تھے، متعدد اہم کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔
۷ر ذی قعدہ ۱۳۷۰ھ میں علی گڈھ میں فوت ہوئے اور اپنے وطن حبیب گنج میں سپرد خاک ہوئے۔ (نزہۃ الخواطر ص ۱۰۱ تا ۱۰۵)۔

رہنمائی بھی فرماتے تھے۔

مولانا کی عام صحت بہت اچھی تھی، وہ ابتداء سے ورزش کے عادی تھے اس کا اثر ان کی صحت پر بہت نمایاں تھا، لیکن دو بیماریاں ان کو بہت سخت چمٹ گئی تھیں ایک دردسر جس کا حملہ اکثر ہوتا تھا، دوسری شکایت ان کو کبھی کبھی پیشاب کے رک جانے کی تھی، یہ تکلیف ان کو کئی بار ہوئی، آخری مرتبہ جب ان کو یہ تکلیف ہوئی تو آپریشن کرنا پڑا آپریشن کے لیے وہ اپنے ہم وطن ڈاکٹر کے پاس اعظم گڈھ سے متھرا گئے، وہیں آپریشن ہوا، مگر آپریشن ناکام ہوگیا، بالآخر وہیں ۱۹/جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۱/نومبر ۱۹۳۰ء کو انتقال فرمایا اور وہیں غریبوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

یوں تو مولانا فلسفی بھی تھے، متکلم بھی تھے اور عربی وفارسی کے بے نظیر ادیب وشاعر بھی، لیکن یہ ساری چیزیں ان کے یہاں ضمناً تھیں، اصل چیز جو ان کے دل ودماغ پر چھائی ہوئی تھی وہ قرآن تھا، قرآن کی ایک ایک آیت پر انھوں نے پوری حاضر دماغی اور دل جمعی کے ساتھ غور کیا تھا، مولانا نے یہ کام اسی زمانہ سے شروع کردیا تھا جب وہ علی گڈھ میں بحیثیت ایک طالب علم کے مقیم تھے اور اس وقت سے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک برابر اس کام میں لگے رہے، ان جملہ صفات کے ساتھ اخلاق وکردار میں مولانا بلند مقام پر فائز تھے، ان کے جاننے والوں میں ہمیشہ یہ بحث رہی ہے کہ ان کا علم زیادہ تھا یا تقویٰ؟ — اور واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں پہلوؤں میں سے یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ ان کی زندگی کا راجح پہلو کون سا تھا۔

سچائی اور صبر کی عادت مولانا میں ابتداء سے نہایت پختہ تھی، معاملات میں حد درجہ کھرے اور نہایت انصاف پسند تھے، ان کے انصاف پر مخالفوں کو بھی پورا بھروسہ تھا، خود مولانا کے والد کے خلاف جائداد کا ایک مقدمہ تھا اس مقدمہ میں فریق مخالف نے مولانا کو حکم بنادیا، مقدمہ فیصلہ کے لیے عدالت سے مولانا کے پاس منتقل ہوگیا، مولانا نے اس کا فیصلہ اپنے والد کے خلاف کردیا، جس کے نتیجے میں مولانا کے والد کی جائداد کا ایک خاصہ حصہ ان کے قبضہ سے نکل گیا جو بالآخر مولانا ہی کی طرف منتقل ہوتا۔

ایک خوش حال گھرانے سے تعلق رکھنے اور بیش قرار تنخواہ پانے کے باوجود نہایت

سادہ زندگی بسر کرتے، کپڑے نہایت سادہ پہنتے، کھانے میں کبھی تکلف نہیں کرتے تھے، تنخواہ کا بیشتر حصہ یا تو کتابوں کی خریداری اور ان کی پُر تکلّف جلد پر خرچ ہوتا یا پھر مستحقین خصوصاً غریب اہلِ علم اور نادار شرفاء کی امداد پر، اس دوسری مد کا خرچ ان کے ہاں وسیع تھا۔

حد درجہ خلوت پسند تھے، عام لوگوں سے ان کا ملنا جلنا بہت کم تھا، اپنے شاگردوں اور اہل علم کی مجلس میں بیٹھنا پسند فرماتے تھے، گفتگو ہمیشہ علمی اور مختصر کرتے تھے، ان کی مجلس میں ہجو، غیبت اور طعن و تشنیع کا کبھی گذر بھی نہیں ہو پاتا تھا، ہمیشہ شب میں ڈھائی تین بجے اٹھ جاتے، چارپائی اور اپنا بستر وغیرہ خود ٹھیک کر لیتے تا کہ شاگردوں یا ملازم کو زحمت نہ اٹھانی پڑے، اس کے بعد تہجد پڑھتے، اس سے فارغ ہو کر اگر طبیعت موزوں ہوتی تو کچھ تصنیف کا کام کرتے، دن میں تصنیف کا کام بہت کم کرتے تھے۔

سب سے خاص چیز جو مولانا کی ذات میں تھی یہ ان کا وہ اثر تھا جو ان کی صحبت میں بیٹھنے والے پر پڑتا تھا، آدمی ان کے پاس بیٹھ کر فی الواقع دنیا اور دنیا کی دل فریبیاں بھول جاتا تھا، علامہ شبلی مرحوم کے متعلق مشہور ہے کہ وہ مولانا کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ حمید کے پاس بیٹھ کر آدمی کا دل دنیا سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔

مولانا فراہیؒ ان معنوں میں مصنف نہیں تھے جن معنوں میں لوگ عموماً مصنف ہوا کرتے ہیں، وہ محض لکھنے کی خاطر لکھنے کے قائل نہیں تھے، لکھنے کے لیے صرف اس وقت قلم اٹھاتے تھے جب ان کے سامنے کوئی نئی تحقیق آتی تھی، مولانا کی تصانیف کی تعداد تقریباً تینتیس (۳۳) تک پہونچتی ہے، جن میں بہت سی شائع ہو چکی ہیں اور بہت سی مسودہ کی شکل میں دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں محفوظ ہیں، مسودہ میں بعض نامکمل ہیں۔ فہرست یہ ہے:

تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان کے مندرجہ ذیل اجزاء جو مستقل تصنیف کی حیثیت سے شائع ہو چکے ہیں:

(۱) فاتحہ نظام القرآن: اس مجموعہ میں تفسیر نظام القرآن کا مقدمہ ہے جس میں مولانا نے اپنے اصول تفسیر سے بحث کی ہے، نیز آیہ بسم اللہ اور سورہ فاتحہ کی تفسیر ہے۔

(۲) امعان فی اقسام القرآن: اس رسالہ میں پہلے قسم کی حقیقت اور اس کی مختلف قسموں پر اصولی بحث کی ہے، اس کے بعد ان قسموں کی حقیقت واضح کی ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کھائی ہیں، یہ کتاب اپنے حجم کے اعتبار سے اگرچہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی، لیکن اپنے معارف ومطالب ک لحاظ سے صدہا کتابوں پر بھاری ہے۔

(۳) الرای الصحیح فی من ہوالذبیح: اس رسالہ میں پہلے قربانی کی حقیقت اور اسلام میں اس کی اہمیت پر بحث کی گئی ہے، اس کے بعد توریت اور قرآن مجید کے دلائل سے نہایت تفصیل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اپنے جس بیٹے کی قربانی کی وہ حضرت اسماعیل ہیں نہ کہ حضرت اسحاق جیسا کہ یہود کا دعویٰ ہے۔

(۴) تفسیر سورۂ ذاریات

(۵) تفسیر سورۂ تحریم

(۶) تفسیر سورۂ قیامہ

(۷) تفسیر سورۂ مرسلات

(۸) تفسیر سورۂ عبس

(۹) تفسیر سورۂ والشمس

(۱۰) تفسیر سورۂ والتین

(۱۱) تفسیر سورۂ والعصر

(۱۲) تفسیر سورۂ فیل

(۱۳) تفسیر سورۂ کوثر

(۱۴) تفسیر سورۂ کافرون

(۱۵) تفسیر سورۂ لہب

(۱۶) تفسیر سورۂ اخلاص

(۱۷) دلائل النظام: اس کتاب میں مولانا نے اپنے اس دعویٰ کو کہ قرآن میں نظم ہے نہایت مضبوط دلائل سے ثابت کیا ہے اور مشکلاتِ نظم کے حل کے لیے اصول بیان

کر کے قرآن کی مثالوں سے ان کو اچھی طرح واضح کیا ہے۔

(۱۸) اسالیبُ القرآن: قرآن میں زبان کے بہت سے ایسے اسلوب استعمال ہوئے ہیں جو صرف عربی زبان اور قرآن کے ساتھ مخصوص ہیں، مولانا نے کلامِ عرب اور قرآن کی مثالوں سے ان اسالیب کو اس کتاب میں نہایت خوبی سے واضح کیا ہے۔

(۱۹) مفردات القرآن: اس رسالہ میں قرآن کریم کے بعض مشکل الفاظ کی جس کے بارہ میں مولانا دوسرے مفسرین اور عام اہل لغت سے اختلاف رکھتے ہیں تحقیق بیان کی ہے۔

(۲۰) اصول التاویل: اس رسالہ میں مولانا نے وہ اصول بیان کیے ہیں جو قرآن کی تاویل میں پیش نظر رکھنے چاہئیں اور جن کی خود انھوں نے اپنی تفسیر نظام القرآن میں رعایت کی ہے۔

(۲۱) القائد الی عیون العقائد: اس میں دین کے اصولی مباحث، توحید، رسالت، معاد وغیرہ پر قرآنی دلائل کی وضاحت کی ہے۔

(۲۲) جمہرۃ البلاغۃ: اس کتاب میں مروّجہ علم بلاغت کو یونانیوں سے ماخوذ ثابت کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ عربی ادب خصوصاً قرآن حکیم کی خوبیوں کو جانچنے کے لیے یہ فن بلاغت کسی طرح کسوٹی کا کام نہیں دے سکتا، ساتھ ہی فصحائے عرب کے کلام سے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق بلاغت کے وہ اصول متعین کیے ہیں جو قرآن کی بلاغت کو پرکھنے کے لیے معیار کا کام دے سکتے ہیں۔

(۲۳) اسباق النحو حصہ اوّل و دوم: ان دونوں کتابوں میں ابتدائی صرف ونحو کو نہایت آسان طرز پر مرتب کیا ہے۔

(۲۴) تحفۃ الاعراب: اس میں اردو نظم میں عربی نحو کے مسائل نہایت آسان اور عمدہ طریقہ سے بیان کیے ہیں۔

(۲۵) امثال آصف الحکیم: یہ عربی مدارس کے ابتدائی درجوں کے لیے بہترین ریڈر ہے۔

(۲۶) خرد نامہ: امثال سلیمان کا خالص فارسی منظوم ترجمہ، جس میں عربی الفاظ کو استعمال نہیں کیا گیا ہے۔

(۲۷) دیوانِ حمید: مولانا کے عربی کلام کا مجموعہ۔

(۲۸) نوائے پہلوی: مولانا کے فارسی کلام کا مجموعہ۔

(۲۹) شفاعت اور کفارہ کی تردید میں ایک رسالہ (بزبان انگریزی)

(۳۰) ملکوت اللہ: اس میں مولانا نے پہلے ان قوانین کی وضاحت کی ہے جو قوموں کے عروج وزوال اور حق کی فتح اور باطل کی شکست سے متعلق قرآن میں بیان ہوئے ہیں، پھر ان کی روشنی میں اسلامی نظامِ سیاست کی وضاحت کی ہے۔

یہ جملہ کتابیں عربی اور اردو ترجمے کے ساتھ دائرہ حمیدیہ سے شائع ہوچکی ہیں اور اہلِ علم کے حلقہ میں خصوصی نگاہوں سے دیکھی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ یہ کتابیں ابھی طبع نہیں ہوسکی ہیں۔

(۱) حجج القرآن: اس میں پہلے منطق، فلسفۂ قدیم اور فلسفۂ جدید کی خامیوں سے بحث کی ہے، اس کے بعد قرآنی فلسفہ کے اصول بیان کرکے ان کی عقلی قدروقیمت واضح کی ہے۔

(۲) کتابُ الحکمۃ: اس رسالہ میں حکمتِ قرآن اور اس کے استنباط کے طریقوں کی وضاحت کی ہے۔

(۳) کتاب الرسوخ فی معرفۃ الناسخ والمنسوخ: اس رسالہ میں مولانا نے قرآن کے ناسخ ومنسوخ سے متعلق اپنے نظریات کی وضاحت کی ہے۔

(۴) اسبابُ النزول: اس میں آیاتِ قرآن کے شانِ نزول سے متعلق اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔

(۵) الاکلیل فی شرح الانجیل: اس کتاب میں انجیل کے ان الفاظ اور عبارتوں کی شرح ہے جن کی نصاریٰ نے خاص طور سے تحریف کی ہے۔

(۶) رسالہ فی اصلاح الناس: اس میں مسلمانوں کی اصلاح سے متعلق اپنا نقطۂ نظر بیان فرمایا ہے۔

(۷) الازمان والادیان: اس رسالہ میں اس امر سے بحث کی ہے کہ دین میں خاص خاص مہینوں، دنوں اور تاریخوں اور اوقات کا جو اہتمام ہوتا ہے اس میں کیا رمز ہے۔

(۸) الرائع فی اصول الشرائع

(۹) احکام الاصول باحکام الرسول

(۱۰) کتاب العقل وما فوق العقل

(۱۱) تاریخ القرآن

(۱۲) اوصاف القرآن

(۱۳) فقہ القرآن

(۱۴) فلسفۃ البلاغۃ

(۱۵) سلیقۃ العروض

(۱۶) النحو الجدید

غیر مطبوعہ تصانیف میں اکثر نا تمام ہیں، لیکن ان کو سامنے رکھ کر ان مباحث پر بہت کچھ کام کیا جا سکتا ہے۔

جس طرح مولانا نے تصنیف وتالیف کے ذریعہ قرآن حکیم کو مرکز بنا کر گرانقدر علمی خدمات انجام دیں، اسی طرح درس وتدریس کے ذریعہ بھی آپ کے فیض سے ایک بڑی جماعت سیراب ہوئی جن میں مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا محمد سعید ندوی، مولانا نجم الدین اصلاحی، مولانا محمد شبلی ندوی، مولانا عبد الصمد ندوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، جنھوں نے علمی حلقوں میں بڑی شہرت ومقبولیت حاصل کی اور ان کے ذریعے مولانا فراہی کے علوم وافکار کی ترویج واشاعت ہوئی۔

مولانا حیدر حسن چاند پٹیؒ

مولانا حیدر علی کا مولد ضلع اعظم گڈھ کی مشہور بستی چاند پٹی ہے، مولانا سلامت اللہ جیراج پوری اور مولانا حافظ عبد اللہ غازی پوری ونیز دیگر اساتذہ سے علوم وفنون کی تحصیل کر کے مولانا سیّد نذیر حسین محدّث دہلوی سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی، فراغت کے بعد دانا پور میں مدرسہ محمدیہ میں تدریسی خدمات پر مامور ہوئے۔

مولانا حیدر علی عالم باعمل تھے، تقویٰ اور تدین میں بڑا بلند درجہ رکھتے تھے، تدریس کے ساتھ تالیف کا بھی مشغلہ تھا، مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے چند یہ ہیں، ضرب الخیام فی الرد علیٰ ظل الغمام، الحجۃ الساطعہ فی شرح الزبدہ، اطفاء الشرور المواعظ، تاریخ وفات اور تفصیلی حالات کا علم نہ ہو سکا۔

================

﴿خ﴾

مولوی خدابخش مہراج گنجیؒ

قصبہ مہراج گنج اعظم گڈھ کے مضافات میں کسی زمانہ میں مشہور تجارتی مرکز تھا، مگر اس کی یہ مرکزیت انقلابِ زمانہ کی نذر ہوگئی اور وہ پہلے کی ساری چہل پہل اب یکسر ختم ہوچکی ہے۔

مولوی خدابخش اسی اجڑے دیار کے چشم و چراغ تھے، آپ نے عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا فیض اللہ مئوی سے پڑھیں اور بعض کتابیں مولانا علیم الدین بہاری تلمیذ مولانا نذیر حسین دہلوی سے بھی پڑھیں، تکمیل قاضی محمد مچھلی شہری سے کی، چونکہ ان کے سارے اساتذہ مسلک اہل حدیث کے پابند تھے اس لیے یہی اثر ان میں بھی پیدا ہوگیا۔

مولوی خدابخش فارسی اور عربی دونوں میں کامل مہارت رکھتے تھے، فارسی میں شاعری بھی کرتے تھے، خالص فارسی کے دلدادہ تھے، اس علمی مہارت کے باوجود ہمیشہ مکتب کی مدرسی کی، شہر اعظم گڈھ کے مضافات میں بیشمار ہندو اور مسلم بچوں نے ان سے تعلیم حاصل کی، آخر میں محلہ میر پٹیو اعظم اگڈھ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

آپ کی علمی یادگار میں صرف ایک رسالہ ''رفع الیدین علی الصدر'' کا پتہ چلتا ہے، فارسی کے اچھے شاعر تھے اور اس زمانہ میں ان کے اشعار علمی حلقوں میں بہت مقبول تھے، مگر اس وقت نمونہ کے طور پر بھی کسی شعر کا ملنا دشوار ہے۔

================

﴿ د ﴾

مولانا ریاست علی چھانویؒ

موضع چھانوں اعظم گڈھ ضلع کا ایک معروف قریہ ہے، عصر حاضر کے مشہور عالم دین اور شیخ و مرشد مولانا شاہ عبدالغنی پھول پوریؒ کے مولد و منشا ہونے کا افتخار اس موضع کو حاصل ہے، فاضل لوذعی مولانا ریاست علی بھی اسی موضع چھانوں کے ایک قابل قدر ہونہار سپوت تھے، جنھیں ان کے ہم وطنوں نے یکسر بھلا دیا، ان کی ایک علمی یادگار ''مفید الانام فی ذکر سید الانام'' نامی مطبوعہ تصنیف نہ ہوتی تو شاید ان کا نام تک نئی نسل کو معلوم نہ ہوتا۔ چھانوں میں ان کا خاندان آج بھی آباد ہے، مگر کسی کو بھی صحیح طور سے ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے، بس ایک صاحب نے اتنا بتایا کہ گھر میں ایک بڑا چوبی صندوق تھا جو کتابوں سے بھرا ہوا تھا، جس سے یہ معلوم ہوا کہ مولانا موصوف کا اپنا ذاتی کتب خانہ تھا، مولانا نے ''مفید الانام'' میں حدیث و فقہ وغیرہ کی کتابوں کا جس کثرت سے حوالہ دیا ہے، وہ بغیر کتب خانہ کے ممکن نہیں ہے، لیکن ان کے بعد اس کتب خانہ کا کیا ہوا، اس کا پتہ دینے والا کوئی نہیں۔

مولانا ریاست علی مرحوم نے اپنے اس رسالہ میں اپنی کنیت ''ابوعبید'' تحریر کی ہے، جبکہ خاندان کے لوگ بتاتے ہیں کہ مولانا کے کوئی اولاد نہیں تھی، اس لیے قرین قیاس یہ ہے کہ انھوں نے یہ کنیت اظہار عبدیت کے لیے وضع کی تھی، ''رسالہ'' کے سرورق پر بحیثیت مصنف کے مولانا کا نام ان القاب کے ساتھ لکھا گیا ہے ''عالم المعی فاضل لوذعی مولانا مولوی محمد ریاست علی صاحب اعظم گڈھی چھانوی عمّ فیضہ'' جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسالہ کی تصنیف کے زمانہ میں مولانا ایک صاحب فہم و فراست عالم کی حیثیت سے متعارف تھے۔

رسالہ مفید الانام اکتیس صفحات پر مشتمل ہے، جس میں سے بیس صفحات میں یوم جمعہ کے فضائل و مسائل اور آداب کا ذکر ہے، مسائل کے ضمن میں غیر عربی زبان میں خطبہ کے

عدم جواز پر بڑی سنجیدہ بحث کی ہے، بقیہ گیارہ صفحات میں جمعہ فی القریٰ کے جواز سے متعلق گفتگو ہے، اس مسئلہ میں بھی اپنے نقطۂ نظر کے اثبات میں متانت وسنجیدگی کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

ہمارے دیار مشرق میں چودھویں صدی کے نصف اوّل کے علمائے احناف میں حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی (متولد ۱۲۷۵ھ ومتوفی ۱۳۴۹ھ) اپنے فضائل وکمالات اور حسنات وبرکات کے لحاظ سے معاصر علماء میں ممتاز مقام ومرتبہ کے حامل تھے، اعظم گڈھ سے مولانا کا خاص تعلق تھا، اس خطے میں ان کا تبلیغی واصلاحی دورہ کثرت سے ہوا کرتا تھا، اس دور میں ضلع اعظم گڈھ کا کوئی قریہ اور گاؤں مشکل ہی سے ملے گا جہاں ان کے عقیدت مند نہ ہوں۔

حضرت سید صاحب فقہ حنفی کے زبردست عالم تھے۔اور مسلکاً بھی حنفی تھے بایں ہمہ جمعہ فی القریٰ کے مسئلہ میں وہ فقہ حنفی کی بجائے فقہ شافعی پر عامل تھے، ان ہی کے زیر اثر اعظم گڈھ کے بہت سے علماء بھی دیہات میں جمعہ کے جواز کے قائل تھے، ہمارا خیال ہے کہ مولانا ریاست علی مرحوم بھی حضرت سید صاحب سے متعلق تھے اور ان کے اسی تفرد کی تائید وتصویب میں یہ رسالہ تصنیف کیا تھا۔ مذکورہ رسالہ جادو پریس جون پور سے ۱۳۲۴ھ مطابق مارچ ۱۹۰۶ء میں چھپا ہے۔ چنانچہ تتمہ میں تحریر ہے:

الحمدللہ والمنہ کہ رسالہ ہذا بتاریخ ۲۵ / مارچ ۱۹۰۶ء کو حسب فرمائش مولانا مولوی محمد ریاست علی صاحب مولف رسالہ ہذا جادو پریس جون پور میں چھپا۔

مولانا مرحوم نے جس خوش اسلوبی کے ساتھ یہ رسالہ مرتب کیا ہے اور کتاب کے مضمون کو جس طرح دلائل سے مدلل اور زبان وبیان کی وضاحت اور صفائی سے قریب الفہم بنایا ہے، اس سے ان کی تصنیفی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی کے ساتھ طبیعت بھی موزوں پائی تھی، کیونکہ اس مختصر سے رسالہ میں انھوں نے اپنے دسیوں اشعار نقل کیے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نثر کے ساتھ نظم پر بھی ان کو قدرت حاصل تھی۔

مولانا نے تعلیم کہاں اور کن اساتذہ سے پائی اب اس کا جاننے والا کوئی نہیں ہے،

خاندان کے لوگ کہتے ہیں کہ جون پور میں پڑھا تھا، جون پور میں اس وقت دو درسگاہیں تھیں ایک بڑی مسجد میں مدرسہ فاروقیہ کے نام سے اور دوسری مدرسہ حنفیہ۔ لہٰذا اگر آپ کی تعلیم جون پور میں ہوئی ہے تو انھیں دونوں مدرسوں میں سے کسی ایک سے آپ کا تعلیمی وتربیتی تعلق ہوگا۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ مولانا ریاست علی صاحب عمر میں حضرت پھولپوریؒ سے زیادہ بڑے تھے، کیونکہ مولانا کا رسالہ مفید الانام جس سن میں شائع ہوا ہے تقریباً وہی سن مولانا پھولپوری کی تعلیم وتحصیل سے فراغت کا ہے، وہ اس طرح سے کہ حضرت پھولپوریؒ کے تذکرہ میں ہے کہ ان کے استاذ مولانا فضل حق نے رام پور ہی سے انھیں سیتاپور کے مدرسہ اسلامیہ عربیہ میں مدرس اوّل کی حیثیت سے بھیج دیا تھا، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسی تاریخ کو آپ کے تحصیل واستفادہ کا دور اختتام کو پہنچا اور درس وافادہ کے نئے دور کا آغاز ہوا۔

پھر آپ کے حالات کے ذکر میں یہ بھی مذکور ہے کہ سیتاپور میں آپ کا قیام چند ماہ (غالباً چھ مہینہ) ہی رہا، وہاں سے الگ ہوکر اپنے قدیم ابتدائی استاذ مولانا ابوالخیر مکی جونپوری کی طلب پر مدرسہ فاروقیہ بڑی مسجد جون پور آگئے، یہاں قیام پانچ سال رہا، یہیں کے زمانۂ قیام میں یکم ربیع الاوّل ۱۳۲۸ھ کو حضرت تھانوی قدس سرہ سے بیعت ہوئے، اب اگر یہ مانا جائے کہ جون پور میں قیام کے تیسرے یا چوتھے سال بیعت سے مشرف ہوئے تھے تو سیتاپور اور جون پور دونوں کی مدت درس بوقت بیعت زیادہ سے زیادہ چار پانچ سال ہوگی، اس حساب سے آپ کا سن فراغت تقریباً ۱۳۲۳ھ ہی بنتا ہے۔ اور یہی سال مولانا ریاست علی صاحب کے رسالہ کی طباعت کا ہے، رسالہ مذکورہ میں مولانا ریاست علی صاحب جس پر اعتماد لہجے میں بحث کرتے ہیں اور احادیث مبارکہ کا ترجمہ وتشریح اور فقہی مسائل کی توضیح وتوجیہہ جس انداز سے کرتے ہیں وہ ان کے مطالعہ کی وسعت اور علم کی پختگی کا پتہ دیتے ہیں اور اس وسعت ومتانت کے لئے ایک زمانہ درکار ہوتا ہے۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس رسالہ کی تالیف کے وقت موصوف کی عمر اور ان کا علمی مشغلہ اچھا خاصا طویل ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت مولانا قاری ریاست علی مئویؒ

شیخ القرّاء مولانا قاری ریاست علی بحری آبادی ثم مئوی ۱۹۰۰ء میں اپنے آبائی وطن بحری آباد ضلع غازی پور میں پیدا ہوئے، لیکن آپ نے عمر کا بیشتر حصہ قصبہ مئو ضلع اعظم گڈھ میں گذارا، جہاں مع اہل وعیال کے آپ نے سکونت اختیار کرلی تھی اور آج بھی آپ کے وارثین یہیں آباد ہیں اس لیے مئوی اعظمی نسبت سے مشہور ہوئے۔

قاری صاحب نے ابتدائی تعلیم بحری آباد ہی میں حاصل کی، مکتب کی تعلیم مکمل کرلینے کے بعد مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ میں داخلہ لیا، جہاں آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کے مشہور عالم وادیب مولانا جان محمد بحری آبادی (۱) تعلیمی وتدریسی خدمت دے رہے تھے۔

قاری صاحب نے یہاں رہ کر مولانا جان محمد بحری آبادی، مولانا سیّد علی زینبی اور مولانا مفتی نصیر الدّین اعظمی سے علوم عربیہ کی تحصیل کی اور اسی کے ساتھ قاری محمد صدیق میمن سنگھی سے روایت حفص کی تکمیل کی اس وقت مدرسہ فرقانیہ میں حدر کی سند کے لیے کافیہ کے امتحان میں کامیابی شرط تھی، قاری صاحب کے رفقائے درس کی تعداد چالیس تھی، مگر اس شرط میں قاری صاحب کے علاوہ کوئی پورا نہیں اترا، اس لیے حدر کی سند صرف قاری صاحب کو دی گئی۔ مدرسہ فرقانیہ سے روایت حفص کی تکمیل کے بعد آپ قرأتِ سبعہ کی تحصیل کے لیے مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد چلے گئے جہاں اس وقت استاذ الکل حضرت مولانا ضیاء الدین الٰہ آبادی (۲)

---

(۱) مولانا محمد جان بن یعقوب بحری آبادیؒ نے مولانا محمد فاروق چریا کوٹی اور شیخ عین القضاۃ حیدرآبادی سے تحصیل وتکمیل کی تھی، مولانا جان محمد اپنے وقت میں ادب عربی میں ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے، کچھ دنوں تک مدرسہ مہابت خاں جونا گڈھ کے مدرسہ میں مدرس رہے پھر مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ چلے آئے اور عرصہ دراز تک یہاں تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دی ۱۳۳۳ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ (نزہہ ص ۴۱۶، ج ۸)

(۲) مولانا قاری ضیاء الدین بن منشی عبدالرزاق نارہ ضلع الٰہ آباد میں ۲۹/ جمادی الاولی ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے، اپنے چچا مولانا منیر الدین اور شیخ القراء مولانا عبدالرحمٰن مکّی سے علوم مروجہ اور تجوید وقرات کی تکمیل کی، فراغت کے بعد مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ میں قرأت کے استاذ مقرر ہوئے، جہاں مدرسی کے ساتھ تعلیمی سلسلے کو بھی جاری رکھا اور مولانا عبدالرحمٰن محدث امروہی سے درس نظامیہ کی تکمیل کی۔ امروہہ کے علاوہ ہندوستان کے دیگر اہم مدارس میں بھی آپ نے تدریسی خدمات انجام دیں، ہندوپاک کے گوشے گوشے میں آپ کے تلامذہ پھیلے ہوئے ہیں۔ ۷/ ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (تذکرہ قاریان ہند ص ۳۵۵)

تجوید کی تعلیم میں مشغول تھے، حضرت قاری ضیاء الدین ان اصحابِ درس میں سے ہیں جن کے سلسلۂ درس کی وسعت پورے ملک کو گھیرے ہوئے ہے۔

قاری صاحب نے یہیں حضرت قاری ضیاء الدین سے قرأت سبعہ کی تحصیل وتکمیل کی اور فنِ تجوید کے استاذ بن کر نکلے، فنِ تجوید وقرأت کے ساتھ حسبِ عادت یہاں بھی عربی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا، مگر اس سے پہلے کہ درسِ نظامیہ کی تکمیل ہو آپ مدرسہ اشاعت الاسلام بریلی میں قرأت اور فن تجوید کے استاذ بن کر چلے گئے اور عربی کی تعلیم کا سلسلہ رک گیا، لیکن بریلی سے بہت جلد دار العلوم مئو چلے آئے، دار العلوم میں آپ کی آمد ماہ صفر ۱۳۴۰ھ میں ہوئی، قاری صاحب نے یہاں ایک طرف پڑھنا اور دوسری طرف پڑھانا شروع کیا، چار گھنٹہ بحیثیت استاذ کے طلبہ کو درس دیتے اور دو گھنٹہ خود طالب علم بن کر وہاں کے اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے، اس طرح ۱۳۴۰ھ سے ۱۳۵۲ھ تک یعنی بارہ سال میں آپ نے درسِ نظامیہ کی تکمیل کرلی اور ساتھ ہی قُرّاء کی ایک بڑی جماعت بھی تیار کردی، آپ کے دار العلوم کے مشہور اساتذہ میں حضرت مولانا کریم بخش سنبھلی، مولانا محمد صدیق بگڑاوی، مولانا عبد الوحید اور عبد المتین پشاوری ہیں، درس نظامیہ کی تکمیل کے بعد سالانہ امتحان میں شرکت کی اور اچھے نمبرات سے کامیابی حاصل کرکے سند لی اور صرف عمومی سند ہی نہیں؛ بلکہ ایک مخصوص سند بھی سند اعلیٰ کے عنوان سے آپ کو دی گئی جو شاید دار العلوم مئو کی تاریخ میں اپنی آپ مثال ہے، یہ آپ کی تعلمی صلاحیت، ذہانت اور فضل وکمال کا ایک عظیم ثبوت ہے، تحصیل وتکمیل کے بعد اب مکمل طور سے تعلیمی وتدریسی خدمات میں مصروف ہوگئے اور بہت جلد وہ مقام حاصل کرلیا جس کی وجہ سے آپ کے نام کے ساتھ شیخ القراء کی جگہ صدر المدرسین اور شیخ الحدیث بھی لکھا جانے لگا۔

قرأت اور فنِ تجوید میں آپ ہندوستان کے ان اساتذہ میں تھے جن سے فن کی آبرو قائم ہے، آپ نے کم وبیش چالیس برس تک دار العلوم میں اس فن کی خدمت انجام دی، مشرقی یوپی اور بہار کی تو شاید ہی کوئی درس گاہ ہوگی جس میں قرأت اور فن تجوید کی تعلیم کا سلسلہ آپ تک نہ پہونچتا ہو۔

حضرت قاری صاحب دار العلوم مئو کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث بھی تھے، بخاری شریف کے درس کے ساتھ آخری عمر میں روایت حفص وقرأت سبعہ وعشرہ کے اسباق بھی پڑھاتے تھے، ابتدائی تعلیم کی جانب آپ خصوصی توجہ فرماتے تھے، آج ہمارے بڑے اساتذہ ابتدائی کتابوں کے پڑھانے میں کسر شان محسوس کرتے ہیں، لیکن قاری صاحب بخاری وترمذی کے ساتھ علم الصیغہ جیسی ابتدائی کتاب بھی نہایت ذوق وشوق اور دلچسپی سے پڑھاتے تھے، درس کا انداز نہایت نرالا تھا، تقریر نہ بہت زیادہ مختصر نہ طویل، صاف ستھرے اور سلیس پیرائے میں اس طرح تقریر فرماتے کہ طلبہ کے ذہن میں پیوست ہوجاتی، جلالین شریف اور مختصر المعانی میں راقم الحروف کو بھی حضرت قاری صاحب سے شرفِ تلمذ حاصل ہے، جلالین کے درس میں عام اساتذہ کی طرح مفسرین کے رطب ویابس اقوال کی بھرمار نہ فرماتے؛ بلکہ جو بات اہلِ تحقیق کے یہاں راجح اور مزاج قرآن کے مطابق ہوتی اسی کے بیان پر اکتفاء فرماتے، یہی طریقہ قریب قریب مختصر کے درس میں بھی تھا، ترجمہ ایسا سلیس اور معنی خیز کرتے تھے کہ بہت سے شبہات صرف ترجمہ ہی سے ختم ہوجاتے۔

قاری صاحب نے نسبتاً ایک محدود حلقہ میں اپنی زندگی بسر کردی، اس لیے انھیں وہ شہرت اور ناموری نہ مل سکی جو بالعموم ان صلاحیتوں کے افراد کو ملا کرتی ہے۔

آپ نے فنِ تجوید میں ایک کتاب خلاصۃ التجوید کے نام سے لکھی جسے اہلِ فن نے بڑی اہمیت کی نگاہ سے دیکھا اور عربی مدارس کے نصاب میں داخل کرلیا۔

آپ کا فیض مدرسہ کی چہاردیواری ہی تک محدود نہیں تھا، وعظ وتقریر کے ذریعہ باہر کے لوگوں کو بھی فیض پہونچاتے تھے، وعظ بہت سادہ آسان اور دلچسپ ہوتا تھا، قرآنی موضوع پر البتہ بڑی بلیغ اور علمی تقریر کرتے، آپ کی تقریر اتنی پُرتاثیر اور دردانگیز ہوتی تھی کہ حاضرین پر ایک خاص کیفیت طاری ہوجاتی تھی، زبان نہایت شستہ اور سلیس تھی، لکھنؤ میں رہنے کی وجہ سے زبان کے ماہر ہوگئے تھے، محاورات کے برمحل استعمال اور جملوں کی چستی میں آپ کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔

قاری صاحب ایک اچھے بذلہ سنج بھی تھے جس محفل میں آپ پہونچ جاتے وہ باغ و بہار بن جاتی تھی۔

اپنی مادر علمی دار العلوم مئو سے آپ کو بڑا خاص تعلق تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ مدرسہ آپ کے لیے سب کچھ تھا، اسی کے لیے جینا اسی کے لیے مرنا تھا- فرماتے تھے: ''مجھے ذاتی طور پر کسی سے تکلیف پہونچتی ہے تو میں اسے معاف کرسکتا ہوں؛ لیکن جو لوگ دار العلوم کو نقصان پہونچانا چاہتے ہیں انھیں معاف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔''

شعر و ادب کا بھی آپ بڑا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے، شعراء میں علامہ اقبالؔ، حالیؔ اور اکبرؔ الہ آبادی آپ کے محبوب اور پسندیدہ شاعر تھے، خود بھی تفنناً کبھی کبھی اشعار کہا کرتے تھے اور جب کہتے تھے تو خوب کہتے تھے، راقم الحروف کے زمانۂ تعلیم میں حضرت قاری صاحب کے مندرجہ ذیل قطعہ سے دار العلوم کی چہار دیواری گونج رہی تھی اور طلبہ سے لے کر اساتذہ تک کو اسے گنگناتے ہوئے پایا۔قعہ

ہماری درس گاہیں قوم کے معمار جنتی ہیں ــــ مفکرؔ، فلسفی، زاہد، مورخ، رہنما، عالم

مگر محروم ہوجاتی ہیں جب دین و دیانت سے ــــ تو پھر یہ قوم وملت کے لیے اک عار بنتی ہیں

قاری صاحب کے اشعار کا کافی حصہ عدم توجہی کی وجہ سے ضائع ہوگیا، پھر بھی بہت سی غزلیں اور نظمیں ان کے پرانے کاغذات میں موجود ہیں، جس کے مالک آج کل قاری صاحب کے بڑے صاحبزادے ماسٹر محمد انیس ادیبؔ مدرس دار العلوم مئو ہیں۔

ان جملہ خوبیوں کے ساتھ آپ کے اندر ایک خوبی اور تھی، جو سب پر فوقیت رکھتی ہے وہ آپ کی صفتِ تعلق مع اللہ ہے، دین و مذہب کے مقابلہ میں آپ نے کبھی بھی کسی کی پرواہ نہیں کی، اسی وجہ سے اپنے آبائی وطن بحری آباد کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا، اہلِ خانہ کو بھی خلاف شرع امور پر برابر ٹوکتے رہتے تھے، جس کی وجہ سے بعض اوقات تعلقات میں ناخوشگواری پیدا ہوجایا کرتی تھی، مگر آپ نے کبھی بھی اس کا خیال نہ کیا، حضرت مولانا وصی اللہ فتحپوریؒ سے بیعت وارادت کا بھی تعلق تھا، حضرت فتحپوریؒ جب بھی مئو تشریف لاتے حضرت قاری صاحب ضرور ان کی مجلس میں شرکت کرتے اور کبھی کبھی ملاقات واصلاح کے

لیے حضرت فتحپوریؒ کی جائے اقامت الہ آباد بھی تشریف لے جاتے۔ اس کے علاوہ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھول پوریؒ قدس سرّہ سے بھی خاص تعلق تھا، اکثر پھولپور کا بھی سفر کرتے اور حضرت پھولپوریؒ کے فیوض وبرکات سے استفادہ کرتے۔

حضرت قاری صاحب اپنے معمولات کے نہایت پابند تھے، زندگی کے آخری لمحات تک اپنے اس معمول پر عمل پیرا رہے کہ رات کے پچھلے پہر بیدار ہوجاتے، نماز تہجد اور نوافل سے فراغت کے بعد ذکر واشغال میں لگ جاتے اور پھر اسی وضوء سے نماز فجر ادا کرتے، نماز کے بعد نصف گھنٹہ تلاوت قرآن میں مشغول رہتے اس کے بعد ایک بیڑا پان کھاتے اور مدرسہ چلے آتے، ناشتہ کرنے کا معمول نہیں تھا۔

مزاج میں نہایت سادگی اور تواضع تھی، اپنے چھوٹوں سے بھی ملتے تو اس طرح گویا اپنے مخدوم سے مل رہے ہیں، اپنا کام خود اپنے ہاتھوں انجام دینے کے عادی تھے، مدرسہ کے طلبہ یا گھر کے افراد سے کوئی خدمت لینا پسند نہ کرتے تھے، اسی طرح استغناء اور صبر وتوکّل کا یہ عالم تھا کہ ۵۵ برس کی مدت تدریس میں کبھی بھی اضافۂ تنخواہ کے لیے کوئی تحریک نہیں کی؛ بلکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ مدرسہ کے مصالح کے پیش نظر آپ کی تنخواہ میں کمی کردی گئی، مگر اس پر بھی آپ نے رضاء ہی کا اظہار فرمایا۔

آخر عمر میں آپ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہوگئے تھے اور یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا، مرض جب حد سے بڑھ گیا تو متعلقین کے اصرار پر بنارس یونیورسٹی کے اسپتال میں بغرض علاج داخلہ لے لیا، جہاں ہر ممکن علاج کیا گیا، مگر وقتِ موعود آن پہونچا تھا، اس لیے دوا نے کچھ کام نہ کیا اور بالآخر ۴؍ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ مطابق ۲۱؍جنوری ۱۹۷۲ء کو جمعہ کے دن علم وفن کا یہ شیدائی علم کی محبت سینے سے لگائے عالم الغیب والشہادۃ کے دربار میں حاضر ہوگیا؛ آپ کی وفات پر ملک کے موقر رسائل وجرائد نے تعزیتی نوٹ لکھے اور ہر طبقۂ خیال کے علماء وفضلاء نے دارالعلوم مئو اور پسماندگان کے نام تعزیت نامے ارسال کیے، شعراء اور تاریخ نویسوں نے مرثیے اور تاریخیں لکھیں جن میں دو تاریخیں حسب ذیل ہیں:

از مولانا محمد عثمان معروفی:

آہ علامہ قاری ریاست علیؒ چل بسے دارِ فانی سے ملک عدم
سایۂ فضل ورحمت ہو رحمان کا قبر میں بارش عیش ہو دم بہ دم

از صاحبزادہ ماسٹر انیس ادیبؔ:

قاری ریاست علی کی رحلت سے زندگی کتنی سوگوار ہے آج
لکھ دو حالؔی کا مصرعۂ تاریخ ''رحلتِ فخر روزگار ہے آج''

نمازِ جنازہ محدّثِ عصر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے پڑھائی اور مئو کی مشہور قبرستان میں دفن کر دیے گئے۔

حضرت مولانا رشید احمد کوئریا پاریؒ

مولانا رشید احمد بن محمد زماں بن ظہور محمد فاروقی بھی اپنے برادران عمومی مولانا علی احمد ومولانا بخشیش احمد کی طرح فاضل دیوبند اور حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کے تلامذہ میں سے تھے، فراغت غالباً ۱۹۲۰ء مطابق ۱۳۲۹ھ میں ہوئی۔

تکمیل کے بعد ۱۹۲۱ء میں شبلی اسکول کے شعبۂ عربی کے استاذ مقرر ہوئے، لیکن تحریک ترکِ موالات کی وجہ سے جلد ہی وہاں سے الگ ہو گئے، بعد ازاں ۱۹۲۵ء مطابق ۱۳۴۴ھ میں جارج اسلامیہ کالج گورکھپور میں عربی ٹیچر ہوئے اور آخر تک وہیں رہے، ۱۹۴۶ء مطابق ۱۳۶۶ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

================

س

مولانا شاہ سراج الدین نظام آبادیؒ

حضرت مولانا شاہ سراج الدین بن قاضی محمد ناصر بن قاضی باسط علی نظام آبادی کا اصل نام محمد حسن تھا؛ لیکن سراج الدین کے لقب سے مشہور ہوئے، تقریباً ۱۲۹۱ھ میں نظام آباد ضلع اعظم گڈھ میں آپ کی ولادت ہوئی، والدین نے کم سنی ہی میں مولانا شاہ عبدالعلیم

آسی غازی پوری سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ جون پور کے حوالہ کر دیا، چنانچہ آپ انھیں کی تربیت میں پروان چڑھے، مولانا عبدالعلیم اپنے گوناگوں مشاغل کی بنا پر خود تعلیم نہ دے سکے، اس لیے مدرسہ حنفیہ میں داخل کر دیا، جہاں مولانا سراج الدین نے مولانا عبدالحئی مونگیری، مولانا امجد علی بنگالی اور مولانا ہادی حسن شاہ گورکھپوری اساتذۂ مدرسہ حنفیہ سے تحصیل وتکمیل کی، فراغت تعلیم کے بعد سلوک وطریقت کی طرف مائل ہوئے، نوافل، تلاوت قرآن پاک اور دلائل الخیرات پڑھنے کا خاص اہتمام تھا، ساتھ ہی ہر جمعرات کو رشید آباد پہونچ کر حضرت دیوان محمد رشید اور دیگر بزرگوں کو ایصال کا بھی معمول تھا، ۱۳۰۰ھ میں خانقاہ رشیدیہ کے سجادہ نشین منتخب ہوئے اور جانشینی کے چودہ برس بعد ذی قعدہ ۱۳۱۴ھ میں جون پور میں وفات ہوئی اور شیخ محمد رشید جون پوری کے حظیرہ میں دفن ہوئے۔ (سمات الاخیار ص ۱۶۵)

مولانا سراج الدین کوپاگنجیؒ

مولانا سراج الدین بن فتح محمد بن خدا بخش بن عبداللہ بن نظام الدین بن محمد خلیل اپنے پدری وطن قصبہ کوپاگنج میں ۱۲۸۲ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسۂ چشمہ رحمت غازی پور میں مولانا عبدالعلیم رسول پوری اعظمی اور دیگر اساتذہ سے علوم مروجہ کی تحصیل وتکمیل کر کے ۱۳۰۷ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

فراغت کے بعد درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، اولاً مالے گاؤں ضلع ناسک صوبہ مہاراشٹر میں دس برس تعلیمی خدمات انجام دیں پھر یہاں سے منتقل ہو کر مٹیا برج کلکتہ میں آگئے اور تقریباً تیس برس تک یہیں جم کر تعلیم وتدریس میں مشغول رہے، افسوس کہ مولانا کے تفصیلی حالات معلوم نہ ہو سکے، آخر میں مٹیا برج سے الگ ہو کر گھر چلے آئے تھے اور گھر ہی پر ۱۳۴۷ھ میں انتقال کیا، آپ کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے، جن میں مولانا انوار احمد اعظمی اور مولانا عبدالقیوم اعظمی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مولانا کی تصنیفی یادگار میں فنِ منطق میں "سراج المنطق" نام کا ایک مطبوعہ رسالہ ہے جو اپنے موضوع پر نہایت عمدہ ہے۔

مولانا سلامت اللہ اعظمی

حافظ مولانا سلامت اللہ اعظم گڈھی مولانا ارشاد حسین رام پوری کے تلمیذ رشید اور مجاز بیعت تھے، جملہ علوم وفنون میں کامل تھے، مدت العمر مدرسہ خواجہ احمد رام پور میں تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دیں ساتھ ہی ہفتہ میں وعظ بھی فرماتے۔

مولانا سلامت اللہ نہایت برگزیدہ متورع اور پابند اوقات عالم تھے، امراء اور رؤساء سے ہمیشہ بے تعلق رہے، اس کے برخلاف غریبوں وناداروں کے ساتھ بڑی انسیت ومحبّت رکھتے تھے اور محلہ کے تنگدستوں کی موقع بے موقع روپے پیسے سے مدد کرتے رہتے تھے، دینی امور میں نہایت سخت تھے، حتی کہ غیر شرعی داڑھی رکھنے والوں سے سلام ومصافحہ تک نہ کرتے تھے، متانت ووقار میں اسلاف کے نمونہ تھے۔

۸/جمادی الاولیٰ ۱۳۳۸ھ کو جمعہ کے انتقال ہوا اور اپنے استاذ ومرشد مولانا ارشاد حسین کے مقبرہ میں مدفون ہوئے۔

مندرجہ ذیل کتابیں علمی یادگار چھوڑیں:

بلوغ المرام اردو، ردغیر مقلدین میں ۱۳۲۰ھ میں مراد آباد میں چھپی۔ احکام الملۃ الحقہ فی تفسیق قاطع اللحیہ، تالیف ۱۳۲۴ھ ۴۲ صفحات پر پٹنہ سے شائع ہوئی۔ التحفۃ المضیفہ والہدیۃ الاحمدیہ فی ادلۃ سماع الموتی وحیاتہم السرمدیہ، یہ بھی طبع ہو چکی ہے۔ (تذکرہ کاملان رام پور، ص ۱۵۸)

مولانا سلامت اللہ جیراج پوریؒ

آپ فرقۂ قرآنیہ کے مشہور عالم اور نامور مؤرخ حافظ اسلم جیراج پوری کے والدِ محترم ہیں، موضع جیراج پور ضلع اعظم گڈھ کو آپ کے مولد ومنشا ہونے کا فخر حاصل ہے، مولانا سلامت اللہ مرحوم بچپن ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے تھے، والدہ کے علاوہ کوئی اور نگراں وسرپرست نہیں تھا، مگر دل میں علم کا شوق جاگزیں تھا، اس لیے راہِ طلب میں بڑے سے بڑا حادثہ بھی رکاوٹ نہ بن سکا اور یتیمی وناداری کی مشقتوں کے ساتھ کتب ابتدائیہ کی

تحصیل اپنے موضع کے مشہور عالم مولانا عبداللہ جیراج پوری سے مکمل کرلی اور بعض کتابیں اسی زمانہ میں مولانا عبدالغنی بن شاہ میر فرخ آبادی سے پڑھیں، اس کے بعد گیارہ برس کی عمر میں دیار مشرق کی مشہور ترین درس گاہ مدرسہ حنفیہ جون پور میں داخلہ لیا، جہاں مولانا مفتی محمد یوسف فرنگی محلّی کا فیض پوری توانائیوں کے ساتھ جاری تھا، اسی مدرسہ میں مولانا نے جملہ علوم متداولہ کی تحصیل وتکمیل کی پھر یہاں سے سہارن پور تشریف لے گئے اور اس عہد کے مشہور محدّث مولانا احمد علیؒ محدث سہارنپوری کے حلقۂ درس میں شامل ہوکر حدیث کی تحصیل کی اور سند واجازت حاصل کی، مولانا احمد علی کے علاوہ مولانا سیّد نذیر حسین دہلویؒ اور شیخ حسین بن محسن یمنی نزیل بھوپال سے بھی انھیں سند واجازت حاصل تھی۔

تحصیل علوم کے بعد اپنے مکتب فکر کی روشنی میں علوم دینیہ اور احکام شرعیہ کی نشر واشاعت میں ہمہ تن مشغول ہوگئے، اعظم گڈھ، جونپور اور غازی پور کے اضلاع میں ان کی ذات سے مسلکِ اہل حدیث (غیر مقلدیت) کی خوب ترویج ہوئی۔ ایک زمانہ تک آپ کا قیام بنارس میں رہا جہاں علوم وفنون کی تدریس کے ساتھ حدیث وتفسیر کا بھی درس دیتے تھے، یہاں سے نواب صدیق حسن خاں (۱) کی طلب پر بھوپال تشریف لے گئے اور مدرسہ سلیمانیہ کے استاذ مقرر ہوئے، شاہجہاں بیگم والیۂ بھوپال آپ کی بیحد معتقد تھیں اور مدرسہ سلیمانیہ کی مدرسی کے ساتھ انھیں واعظ شہر کا منصب بھی عطا کردیا تھا، کوئی عالم ان کی اجازت کے بغیر جامع مسجد میں وعظ نہیں کرسکتا تھا، کچھ عرصہ کے بعد تدریس کے ساتھ

---

(۱) علامہ نواب صدیق حسن خاں بن اولاد حسن قنوجی ہندوستان کے ان علماء میں ہیں جن پر اہلِ ہند کو بڑا ناز ہے، آپ کی ولادت ۱۹/ جمادی الاولی ۱۲۴۸ھ میں بانس بریلی میں ہوئی، یہاں سے اپنے والد کے ساتھ قنوج آئے چھ برس کی عمر میں یتیم ہوگئے تھے، کتب فارسی اور ابتدائی نحو وصرف منطق اور بلاغت وغیرہ اپنے بڑے بھائی احمد حسن سے پڑھا، فرخ آباد اور کانپور میں بھی قیام رہا اور وہاں کے اساتذہ سے تحصیل علم کیا پھر ۱۲۶۹ھ میں دہلی پہونچے اور مفتی صدرالدین خاں صدر الصدور اور وہاں کے دوسرے علماء سے استفادہ کیا، مفتی ہی صاحب سے حدیث پڑھ کر ۲۱ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے، نواب صاحب نے تقریباً دوسو اکیس کتابیں مختلف علوم وفنون میں تصنیف کیں، جن میں فتح البیان، عون الباری، التاج المکلل، مسک الختام وغیرہ بہت اہم ہیں، ۲۹/ جمادی الاخریٰ ۱۳۰۷ھ میں انسٹھ برس کی عمر میں وفات ہوئی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: مآثر صدیقی، نزہۃ الخواطر ص ۱۸۷ تا ۱۹۵، والتاج المکلل ص ۵۴۱ وغیرہ۔

مدرسہ کے نائب مہتمم بھی بنادیے گئے پھر مولانا بشیر سہسوانی کے ریٹائر ہونے کے بعد والیۂ بھوپال نے آپ کو مدرسہ کا مہتمم اور ریاست کے جملہ مدارس کا نگراں بنادیا۔

ان ہمہ گیر مشاغل کے ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ برابر جاری رہا اور اپنی قدیم عادت کے مطابق حدیث وتفسیر کے علاوہ فنون کی تعلیم بھی دیتے رہے، طلبہ کی ایک بڑی جماعت نے آپ سے استفادہ کیا، جن میں شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ اعظمی، مولانا احمد اللہ شیخ الحدیث مدرسہ رحمانیہ دہلی، مولانا حبیب اللہ چاند پاری اور مولانا فتح اللہ سابق مہتمم مدرسہ سلیمانیہ علمی حلقوں میں خاص شہرت کے حامل ہیں۔

آخر عمر میں ریاست بھوپال نے گذر اوقات کے لیے آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا اس تقریب سے بھوپال ہی میں مستقل اقامت اختیار کرلی تھی اور وہیں ۳۰/ربیع الاول ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۵/جون ۱۹۰۴ء میں تریپن برس کی عمر میں انتقال کیا اور تکیہ شاہ محبت میں دفن ہوئے۔

مولانا سلامت اللہ ترک تقلید، آمین بالجہر، رفعِ یدین اور قرأت خلف الامام جیسے مجتہد فیہ مسائل میں بہت متشدد تھے اور بارہا شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی سے ان مسائل پر مناظرہ بھی کیا۔ بایں ہمہ نہایت خلیق، متواضع اور منکسر المزاج تھے، ان معنوی خوبیوں کے ساتھ قدرت نے حسن صورت سے بھی حصہ وافر عطا کیا تھا، جس کی وجہ سے اکثر ہنود آپ کو دیوتا کہتے تھے۔ (نزہۃ الخواطر ص ۶۰-۱۵۹ و تراجم علمائے اہل حدیث ص ۸۸-۳۸۷ و تذکرہ علمائے حال)

مولانا سلطان احمد مئویؒ

مولانا سلطان احمد مئوی اعظمی زمرۂ علمائے اعظم گڈھ کے گل سرسبد تھے، سرزمینِ اعظم گڈھ اپنے اس سپوت پر جتنا بھی ناز کرے بجا ہے۔

آپ ماہ شعبان ۱۲۸۵ھ میں قصبہ مئو میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم قصبہ کے اساتذہ سے حاصل کی جن میں استاذ الکل حضرت مولانا امام الدین پنجابیؒ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں اس دور میں مدرسہ چشمۂ رحمت کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، حضرت مولانا محمد

فاروق چریاکوٹی حضرت مولانا عبدالعلیم حسین آبادی اور حضرت مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری جیسے باکمال اصحابِ علم وفن کی تعلیمی وتدریسی سرگرمیوں سے چشمہ رُحمت بحرالعلوم بنا ہوا تھا۔ مولانا سلطان احمد نے ابتدائی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد مدرسہ چشمہ رُحمت ہی کو اپنی علمی تگ ودو کا مرکز بنایا اور مذکورہ بالا اساتذہ کی خدمت میں رہ کر علوم مروجہ کی تعلیم وتحصیل کی اور ۱۳۰۹ھ میں فاتحہ فراغ پڑھی، فراغتِ تعلیم کے بعد علماء وفضلاء کے طرز پر وطن مالوف میں درس وتدریس کا مشغلہ شروع کردیا، درس میں منطق اصول اور ادب سبھی علوم کی کتابیں رہتی تھیں۔

مولانا کی زندگی کا سب سے تابندہ اور روشن کارنامہ جس نے آپ کے نام کو حیاتِ جاوید بخشی مدرسہ دارالعلوم مئو کا قیام ہے، ضلع اعظم گڈھ کی علمی تاریخ میں دارالعلوم مئو ایک مرکزی اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اس کی آغوشِ تربیت میں ایسے ایسے نادرۂ روزگار اور شہرۂ آفاق علماء ومشائخ نے نشوونما پائی ہے جن کی علمی تحقیق کا غلغلہ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ عالم اسلام میں بھی بلند ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا سلطان احمد کو بے پناہ علمی صلاحیتوں سے نوازا تھا، مگر افسوس کہ آپ اوائل عمر ہی میں ایسے مہلک مرض کے شکار ہوگئے تھے کہ تعلیمی وتدریسی مشغلے کو یکسر بند کردینا پڑا اور ان صلاحیتوں کو منظرِ عام پر آنے کا موقع نہ مل سکا، البتہ مولانا اس مرض کی حالت میں بھی اپنے قائم کردہ مدرسہ دارالعلوم کی تنظیم وترقی میں زندگی کی آخری سانس تک منہمک رہے اور بالآخر دارالعلوم ہی کی محبت کو سینے سے لگائے ہوئے چالیس برس کی عمر میں ۱۳۲۵ھ میں دارِ فانی سے رحلت فرماگئے، پسماندگان میں ایک بیوہ، ایک کم سن لڑکا محمد مصطفیٰ کو چھوڑا جو بعد میں ایک ممتاز شاعر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں مشہور ہوئے۔

مولانا سلیمُ اللہ مئویؒ

مولانا سلیم اللہ بن محمد صادق کا مولد ومنشا قصبہ مئو ضلع اعظم گڈھ ہے، علوم وفنون کی تعلیم ملاؔ حسام الدین مئوی، مولانا فیض اللہ مئوی اور مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری

سے حاصل کی، اس کے بعد دہلی گئے اور مولانا سیّد نذیر حسین محدّث سے حدیث وتفسیر کی تحصیل کر کے سند اجازت حاصل کی، فراغت کے بعد چند سال مرزاپور میں تدریسی خدمات انجام دیں پھر لکھنؤ چلے آئے اور مطبع منشی نولکشور میں تصحیح کی خدمت پر مامور ہوئے، کچھ دنوں تک مدرسہ صدیقیہ مئو میں بھی درس دیا، ۱۳۳۴ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

(تذکرۂ علمائے حال ص ۳۰، تراجم علمائے اہل حدیث ص ۴۲۰)

================

﴿ش﴾

مولانا شاہ محمد سریانویؒ

مولانا شاہ محمد بن حاجی محمد اسماعیل بن شیخ کتوارو سریانوی چودہویں صدی کے ابتداء میں موضع سریاں ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم حافظ نظام الدین سریانوی سے پائی، ان دنوں حافظ صاحب کی ذات اس دیار کے طلبہ کا مرجع تھی۔ ابتدائی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری سے کتب درسیہ کی ابتدائی کتابیں پڑھیں پھر چشمہ رحمت غازی پور میں داخل ہوئے جہاں مولانا عبدالعلیم رسول پوری، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی اور وہاں کے دوسرے اساتذہ سے علوم مروّجہ کی تکمیل کی اس کے بعد دہلی جا کر مولانا سیّد نذیر حسین دہلوی سے حدیث وتفسیر کی تحصیل کی، اسی زمانہ میں ڈپٹی نذیر احمد دہلوی متوفی ۱۳۳۱ھ سے عربی ادب اور دیوانِ حماسہ وغیرہ پڑھا۔

مولانا سیّد نذیر حسین کے اعظمی تلامذہ میں مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری، مولانا عبدالسلام مبارک پوری، مولانا محمد لہراوی، مولانا عبدالحق املوی وغیرہ اہل حدیث مسلک کے تھے مگر مولانا شاہ محمد پر مولانا محمد فاروق چریاکوٹی اور مولانا عبدالعلیم رسول پوری کے تلمذ سے حنفیت کا رنگ باقی رہا۔

فراغت کے بعد علماء وفضلاء کی طرح تعلیم وتدریس اور دوسرے علمی مشاغل میں پوری زندگی بسر کی، آخری ایام میں مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کے یہاں بہت آتے جاتے

تھے، اختلافِ مسلک کے باوجود دونوں بزرگوں میں علمی تعلقات بہت خوش گوار تھے۔

مولانا شاہ محمد علم و عمل کے امتزاج کے نمونہ تھے، مزاج میں سادگی اور انکسار غالب تھا، نیک نفسی، شرافت اور توکل میں سلفِ صالحین کی یادگار تھے، ۱۳۹۰ھ میں تقریباً ستر برس کی عمر پا کر انتقال کیا۔ (تذکرہ علمائے مبارک پور ص ۲۳۳)

مولانا علامہ شبلی نعمانیؒ

مورخِ اسلام شمس العلماء مولانا شبلی نعمانیؒ کی پیدائش ماہ ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق مئی ۱۸۵۷ء میں عین اس ہنگامہ خیز زمانہ میں ہوئی، جو عام طور سے غدر کے نام سے مشہور ہے، والدین نے محمد شبلی نام تجویز کیا، ابتدائی تحریروں میں مولانا اپنا نام محمد شبلی ہی لکھتے تھے، بعد میں صرف شبلی کر دیا اور نام کے ساتھ نعمانی لکھنے لگے۔

ضلع اعظم گڈھ میں ایک مشہور موضع بندول نام کا ہے، اسی موضع کو مولانا شبلی کے مولد و منشا بننے کا فخر حاصل ہے، بندول میں راجپوتوں کی آبادی تھی جس کے مورثِ اعلیٰ آج سے چار سو برس قبل مسلمان ہوئے تھے، اسی خاندان میں مولانا کی ولادت ہوئی، شجرۂ نسب یہ ہے:

علامہ شبلی نعمانی بن شیخ حبیب اللہ بن منشی حسن علی بن شیخ عباد اللہ بن شیخ کریم الدین بن شیخ محمد رضا بن شیخ محمد قاسم بن شیخ محمد فخر جہاں بن شیخ امان اللہ بن شیخ محمد اسماعیل بن شیخ مہدی چودھری بن شیخ لال محمد بن شیخ احمد چودھری بن شیخ سہراب بن شہباز بن سراج الدین شیوراج سنگھ۔

قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حکیم عبد اللہ جیراج پوری متوفی ۱۳۰۷ھ اور مولوی شکر اللہ صبر حدی اعظمی متوفی ۱۳۱۵ھ سے حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ اسلامیہ شہر اعظم گڈھ میں مولانا فیض اللہ مئوی اور مولانا علی عباس سے عربی کی کچھ کتابیں پڑھیں، مولانا ہدایت اللہ خاں رام پوری استاذ مدرسہ حنفیہ جون پور سے بھی تلمذ کی تصریح تذکروں میں ملتی ہے، مگر درحقیقت مولانا کی تعلیم کا سلسلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب وہ مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کی خدمت میں حاضر ہوئے، مولانا نے درسیات کی تکمیل مولانا

فاروق چریاکوٹی ہی سے کی جو اپنے دور میں منقول و معقول اور ادبیات و ریاضیات کے مسلّم امام تھے، جملہ علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کے بعد بھی آپ کے علمی ذوق کو سیری اور آسودگی نہ ہوئی اور آپ دوسرے خرمنوں سے بھی خوشہ چینی کے لیے تیار ہو گئے، اس زمانہ میں مدارس کا رواج کم تھا زیادہ تر مشاہیر اپنی اپنی جگہوں پر مسند درس و افادہ کو زینت دے رہے تھے، یہی آستانے اس وقت کی یونیورسٹیاں اور جامعات تھے، لکھنؤ میں مولانا عبدالحئی مرحوم کا شبابِ علم سرگرم عمل تھا، سہارن پور میں مولانا احمد علی محدّثؒ، دیوبند میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور گنگوہ میں قطب الارشاد مولانا رشید احمد کی بدولت خاتم المحدثین حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ کا سلسلۂ فیض جاری تھا، رام پور میں نواب کلب علی خاں کی جوہر شناسیوں نے ہر فن کے اربابِ کمال یکجا کر دیے تھے۔ اول اول علامہ شبلیؒ کو مولانا عبدالحئی مرحوم کی شہرتِ کمال لکھنؤ لے گئی مگر وہاں طبیعت نہ جمی اور زانوئے ادب تہ کرنے سے پہلے ہی قدم اٹھ گئے اور رام پور کا قصد کیا جہاں ان دنوں دو باکمال اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے، معقولات میں سلسلۂ خیر آباد کے خاتم مولانا عبدالحق خیر آبادی اور فقہ میں مولانا ارشاد حسین مجددی (۱)، معقولات میں مولانا فاروق چریاکوٹی کے فیض سے علامہ شبلیؒ کی بصیرت اتنی کافی ہو چکی تھی جس پر اضافہ کی توقع محض امید موہوم تھی، اس لیے آپ نے مولانا ارشاد حسین کے حلقہ درس کو منتخب کیا اور انھیں کے شرفِ تلمذ پر اکتفا فرمایا اور فقہ واصول فقہ کی تعلیم حاصل کی یہاں سے فراغ کے بعد بھی طلب کی تشنگی باقی رہی، تو مولانا

(۱) مولانا ارشاد حسین بن احمد حسین بن محی الدین بن فیض احمد بن کمال الدین بن درویش احمد عمری رامپوری اپنے عہد کے مشہور علمائے احناف میں تھے اور حضرت مجدّد الف ثانی قدس سرہ کی نسل سے ہونے کا شرف حاصل تھا۔

آپ کی ولادت رام پور میں ہوئی اور یہیں ملا نواب بن سعد اللہ افغانی سے معقول و منقول کی تکمیل کی اور جملہ علوم میں اپنے معاصرین میں ممتاز مقام پر فائز ہو گئے، پھر یہاں سے دہلی مولانا شیخ احمد سعید بن ابوسعید مجدّدی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے حدیث کی سند کے ساتھ تصوف کی تعلیم حاصل کی بعد ازاں رام پور واپس آئے اور ہر طرف سے بے نیاز ہو کر درس و فادہ اور ارشاد و تلقین میں مشغول ہو گئے۔

تدریسی خدمات کے ساتھ بہت سی اہم کتابیں بھی تصنیف کیں جن میں انتصار الحق بہت مشہور ہے، دوشنبہ کو ۱۵/ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۱ ہجری میں وفات ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۴۹)

فیض الحسن سہارنپوری پروفیسر اورینٹل کالج لاہور کے چشمہ فیض سے سیراب اور شادکام ہونے کی غرض سے لاہور پہونچے اور مولانا فیض الحسن سے ادب عربی کی تحصیل کی، مولانا فیض الحسن اس پایہ کے ادیب تھے کہ خاک ہند نے صدیوں میں کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہوگا، علامہ شبلی کو مولانا فیض الحسن کے درس سے عربی ادب کا صحیح مذاق حاصل ہوا، ان تمام علوم سے فراغت کے بعد اس عہد کے دستور کے مطابق علم حدیث کی تحصیل کی جانب متوجہ ہوئے اور اس دور کے نامور محدث مولانا احمد علی سہارن پوری متوفی ۱۲۹۷ھ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور محدّث سہارن پوری سے حدیث کی تعلیم حاصل کی، اس وقت مولانا کی عمر ۱۹ برس کی تھی اور کل مدتِ تحصیل چودہ برس ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۲۷۹ھ سے تعلیم شروع اور ۱۲۹۳ھ میں تمام ہوئی۔

ابھی آپ مولانا سہارنپوری ہی کی خدمت میں تھے کہ آپ کے والد محترم اور خاندان کے بعض اعزّہ نے حج کا قصد کیا، علامہ شبلی کو بھی حج و زیارت کا شوق دامن گیر ہوا، استاذ محترم سے اس مبارک سفر میں جانے کی اجازت چاہی، استاذ نے بطیب خاطر اجازت مرحمت فرمائی اور علامہ حاجیوں کے اس مقدس قافلہ کے ساتھ حجاز کے لیے روانہ ہو گئے۔

حج سے واپسی کے بعد علامہ شبلی ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۷۶ء تک اعظم گڈھ اور اس کے اطراف میں رہے اور اس مدت میں کبھی وکالت کا امتحان دیا، کبھی نیل کی تجارت اور زمینداری کی دیکھ بھال کی، مگر ان مصروفیتوں کے باوجود ان کے مذہبی، علمی اور ادبی مشاغل بھی جاری رہے، یہی وہ زمانہ ہے جس میں علامہ نے مولانا سلامت اللہ جیراجپوری اور مولوی اسد اللہ روانوی سے ترک تقلید، آمین بالجہر، قرأت خلف الامام جیسے مسائل پر متعدد تقریری وتحریری مناظرے کیے، بالآخر ۱۸۸۳ء مطابق ۱۳۰۱ھ میں علی گڈھ کالج میں اسسٹنٹ عربک پروفیسر کے عہدہ پر ان کی تقرری ہوئی، بعد میں ترقی کر کے پروفیسر ہو گئے تھے۔

علامہ شبلیؒ نے ۱۸۹۸ء مطابق ۱۳۱۶ھ تک علی گڈھ کالج میں تدریسی خدمت انجام دی، یہیں علامہ کا تاریخی اور تصنیفی ذوق نمایاں ہوا، اسی زمانہ میں انھوں نے قسطنطنیہ، بیروت، بیت المقدس اور مصر کا علمی سفر کیا اور وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا، کالج

ہی کے زمانۂ قیام میں شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز ہوئے، الغرض ۱۸۹۸ء میں علامہ شبلیؒ نے کالج سے رخصت ہوکر اعظم گڈھ کا رخ کیا، جہاں شہر سے باہر اپنے خاندانی باغ میں انھوں نے ایک چھوٹا سا بنگلہ بنوالیا تھا اور جس کو شبلی منزل کا خطاب دیا تھا، جواب شبلیؒ کا مدفن اور دار المصنّفین کا مسکن ہے، یہیں آکر قیام کیا اور اپنے علمی مشاغل میں مصروف ہوگئے، مگر اعظم گڈھ کا قیام آپ کو راس نہ آیا اور شدید مرض میں مبتلا ہوگئے جس کا سلسلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا، اس ابتلاء سے نجات ملی تو آپ کے والد شیخ حبیب اللہ کا انتقال ہوگیا، شیخ صاحب کی رحلت تنہا مصیبت نہ تھی بلکہ مصیبتوں کا مجموعہ تھی، تیس ہزار کا قرض، کارخانہ کا انتظام جس کے لیے سرمایہ کی ضرورت، سوتیلی ماں اور ان کے طرفداروں سے جھگڑے کی صورت، یہ اور ان جیسی بہت سی مصیبتیں تھیں، جو شیخ صاحب کے مرتے ہی علامہ شبلی کے گرد منڈلانے لگیں، آخر انھوں نے ۱۹۰۱ء میں حیدر آباد کا رخ کیا جہاں ان کی بڑی پذیرائی ہوئی اور سررشتۂ علوم وفنون کی نظامت پر تقرر ہوگیا اور تقریباً چار برس اس عہدہ پر رہ کر ۱۹۰۵ء میں ندوۃ العلماء کی طلب پر لکھنؤ چلے آئے اور ۱۵؍صفر ۱۳۲۲ھ مطابق اپریل ۱۹۰۵ء میں دار العلوم ندوہ کے معتمد تعلیم منتخب ہوئے جولائی ۱۹۱۳ء تک اس عہدہ پر فائز رہ کر دار العلوم کی تعلیمی اور تنظیمی ترقیوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے، بالآخر ارکین ندوہ سے اختلاف رونما ہوجانے کی وجہ سے سنہ مذکورہ میں وہاں سے الگ ہوکر پھر اعظم گڈھ چلے آئے یہاں اپنی خدمات کا مرکز اپنے قائم کردہ اسکول کو بنایا جسے ندوہ کے کاموں میں انہماک کی وجہ سے بھول سے گئے تھے، اسی کے ساتھ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی اصلاح وترقی میں بھی سعی بلیغ کی۔

اسی زمانہ میں دار المصنّفین کا خاکہ بھی مرتّب کیا جس کی عمارت کے لیے اپنے آبائی باغ کو وقف کردیا، مگر ابھی باقاعدہ طور سے دار المصنّفین کی بنیاد پڑی نہیں تھی کہ ۲۸؍ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ کی وفات ہوگئی، آپ کی وفات کے بعد آپ کے شاگردوں نے آپ کے مجوّزہ خاکہ کے مطابق دار المصنّفین کو قائم کیا، جو بحمد اللہ اب تک شان وشوکت کے ساتھ باقی ہے، خدا کرے کہ علامہ مرحوم کی یہ یادگار تادیر باقی رہے اور

اپنی تصنیفات سے دین وملت کی رہنمائی کرتی رہے۔

علامہ شبلیؒ مختلف النوع کمالات کے مالک تھے، یعنی وہ ایک عظیم شاعر، عظیم مفکر، عظیم مؤرخ اور عظیم انشاء پرداز تھے، انھوں نے اسلامی تاریخ کو اس تحقیق وتنقیح کے ساتھ پیش کیا کہ مستشرقین بھی دنگ رہ گئے، آپ کی تصنیفات کی فہرست بڑی طویل ہے، جن میں الجزیہ، الفاروق، المامون، شعرالعجم، سیرت النعمان، سیرت النبی حصہ اوّل، الغزالی، موازنۂ انیس ودبیر، الکلام، مقالاتِ شبلی، سفرنامہ روم ومصر وشام وہ معرکۃ الآرا تصنیفات ہیں جن کی نظیر اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی کم ہی ملے گی۔ علامہؒ کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے حیاتِ شبلیؒ مصنفہ مولانا سیّد سلیمان ندوی مطبوعہ دارالمصنّفین اعظم گڈھ۔

مولانا شبلی جیراج پوریؒ

مولانا شبلی بن محمد علی جیراج پور ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مقامی طور سے حاصل کر کے مدرسہ عالیہ رام پور میں داخل ہوئے، جہاں ان کے دیار کے مشہور عالم مولانا حفیظ اللہ شمس العلماء مدرس اعلیٰ تھے، مولانا شبلی نے مدرسہ عالیہ میں مولانا حفیظ اللہ اور دیگر اساتذہ سے درسیات کی تحصیل وتکمیل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں مدرس ہوئے، مولانا علوم متداولہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، بالخصوص فقہ، اصولِ فقہ اور حدیث میں مہارتِ تامہ حاصل تھی، جزئیات فقہیہ پر بڑی وسیع نظر تھی، انھیں اوصاف کی بنا پر علامہ شبلی نعمانی نے انھیں ندوہ آنے کی دعوت دی، چنانچہ ان کی طلب پر مولانا جیراجپوری دارالعلوم ندوہ تشریف لائے اور یہاں عرصۂ دراز تک تدریسی خدمت کے ساتھ افتاء کا کام بھی کرتے رہے، آپ نہایت متواضع، منکسر المزاج اور غریب پرور تھے، دارالعلوم ندوہ سے جو کچھ ملتا تھا اسے نادار طلبہ پر خرچ کردیا کرتے تھے اور خود نہایت سادگی اور عسرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، آپ کے درس سے بہت سے طلبہ نے فیض پایا، ۲۶؍رمضان ۱۳۶۴ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

مولانا شبلی نندانوی رح

حضرت علامہ مولانا شبلی بن عبدالجلیل بن شیخ ہدایت اللہ بن شیخ نثار علی نندانوی کی ولادت ۱۲۹۵ ہجری کے حدود میں موضع نندانوں ضلع اعظم گڈھ میں ہوئی، آپ کا شمار اس دیار کے علماء کبار میں ہوتا ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم نندانوں ہی میں مقامی اساتذہ سے حاصل کی اس کے بعد جون پور تشریف لے گئے اور دو برس تک وہاں پڑھ کر ۱۳۲۱ھ میں دیوبند گئے اور مسلسل پانچ سال وہاں رہ کر جملہ علوم متداولہ مروجہ کی تکمیل کی، مولانا خود اپنی بیاض میں لکھتے ہیں: ''انی ذھبت الی دیوبند ۱۳۲۱ھ وجئت منھا فی ۱۳۲۵ھ وقد وقع الفراغ من تحصیل العلوم المرسومۃ''

دوسری جگہ ذرا اور تفصیل سے لکھتے ہیں: ''اسی سال ۱۹۰۲ء میں جون پور میں عربی شروع کی دو سال وہاں رہا بعدہ دیوبند ۵ رشوال ۱۳۲۱ھ کو پہونچا، تقریباً پانچ برس دیوبند میں جملہ علومِ متداولہ مروجہ کی تعلیم حاصل کی اور امتحان میں کامیاب ہوتا رہا۔ ۱۹۰۹ء مطابق ۱۳۲۶ھ میں کانپور میں تقریباً چھ ماہ مدرسہ الٰہیات میں رہ کر علم مناظرہ اور سنسکرت وبھاشا وانگریزی پڑھا اور ایک طبیب کے مطب میں مشق طب ومعالجہ میں مصروف رہا''۔

مولانا کے رفقائے درس میں رئیس المفسرین علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہ جیسے امام علم وفن بھی تھے، بعض ثقہ لوگوں سے معلوم ہوا کہ زمانہ طالب علمی میں مولانا شبلی مرحوم علامہ شبیر احمد عثمانی کو تکرار کرایا کرتے تھے اور ان سے اچھے نمبرات سے کامیاب ہوتے تھے۔

تحصیل وتعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے متعلق ہوگئے اور فراہمی مالیات کے سلسلے میں مدرسہ کی جانب سے ۱۹۰۹ء میں رنگون کا سفر کیا اور واپسی کے بعد تعلیمی وتدریسی خدمت میں مشغول ہوگئے اور تقریباً دو سال وہاں رہ کر ہدایہ اخیرین، مختصر المعانی اور حدیث میں امام طحاوی کی مشہور تالیف شرح معانی الآثار وغیرہ کا درس دیا، پھر مدرسۃ الاصلاح سے علیحدگی کے بعد بختیار پور ضلع مونگیر کے مدرسہ میں مدرس مقرر ہوئے، ابھی بختیار پور میں صرف دو برس گذرے تھے کہ مدرسۃ الاصلاح کے اربابِ

انتظام نے مولانا کو دوبارہ اصلاح پر آنے کی دعوت دی اور بڑا زور ڈالا، چنانچہ ان حضرات کے اصرار پر ۱۹۱۳ء میں بحیثیت صدر مدرس کے دوبارہ مدرسۃ الاصلاح میں تشریف لائے، لیکن اس بار آپ کا قیام یہاں بہت مختصر رہا، مولانا اپنی بیاض میں لکھتے ہیں:

"۱۹۱۳ء میں پھر مدرسۃ الاصلاح کے اراکین کی دعوت پر صدر مدرس کی حیثیت سے آیا، لیکن چار ماہ کے بعد کارپردازان مدرسہ کی بے اعتنائیوں کے سبب مدرسہ چھوڑ دیا۔"

مولانا شبلی مرحوم جملہ علوم میں دستگاہ رکھتے تھے، بالخصوص فقہ اور حدیث میں امتیازی درجہ حاصل تھا، دیوبند کے اکابر آپ کے فضل وکمال کے بڑے مداح اور معترف تھے، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس اللہ اسرارہم کا عام دستور تھا کہ جب مولانا شبلی آپ کے درس میں پہونچ جاتے تو آپ فوراً کھڑے ہوجاتے اور بڑی عزت واحترام کا معاملہ فرماتے۔ علامہ عثمانی مرحوم بھی اپنے اس ہونہار اور باصلاحیت ساتھی کو آخر دم تک بھولے نہیں تھے اور اپنے علمی عروج کے زمانہ میں بھی طلبائے اعظم گڈھ سے ان کے احوال وکوائف پوچھتے رہتے تھے۔

مولانا شبلی مرحوم علوم ظاہرہ وباطنہ دونوں کے جامع تھے اور آخر میں تو باطنی علوم ہی کا غلبہ ہوگیا تھا، ضلع کے مشہور پیر ومرشد مولانا حامد حسن کوہنڈوی سے آپ کو خلافت واجازت حاصل تھی اور خود بھی بحیثیت مرشد کے بیعت لیتے تھے، صوبۂ یوپی کے علاوہ بہار اور بنگال تک آپ کے مریدین کا جال پھیلا ہوا تھا، سال میں کئی بار مختلف صوبوں اور ضلعوں میں اصلاحی دورہ بھی کرتے تھے، چنانچہ دورانِ سفر ہی مظفرنگر میں آپ کا وصال ہوا، وفات سے چند ہفتہ پہلے اپنے مرید خاص محمد اکرام خاں منیجر ریاست کرنال کی دعوت پر مظفرنگر تشریف لے گئے تھے، وہیں سینے میں پھوڑا نکل آیا جس کا وہاں کے اسپتال میں آپریشن ہوا، ابھی آپریشن کا زخم بھرنے نہیں پایا تھا کہ نمونیہ کے شکار ہوگئے، کمزوری پہلے سے تھی ہی اس لیے اس نئے مرض کا تحمل نہ ہوسکا بالآخر اسی مرض میں بائیس یوم مبتلا رہ کر ۱۶ راگست ۱۹۳۸ء کو آپ نے انتقال فرمایا۔ تیمارداری کے فرائض محمد اکرام خاں اور ان کے ملازمین کے علاوہ

مولانا کے شاگرد اور ہم وطن مولانا محمد رفیق سندانوی نے انجام دیے جو اس وقت دار العلوم دیوبند میں پڑھ رہے تھے اور علالت کی اطلاع ملنے پر مدرسہ سے رخصت لے کر مولانا کی خدمت میں پہونچ گئے تھے، وفات کی خبر فوراً دار العلوم دیوبند بھیجی گئی، چنانچہ اطلاع ملتے ہی مدرسہ بند کر دیا گیا اور تمام اساتذہ مظفر نگر آ کر جنازہ میں شریک ہوئے، نماز جنازہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے پڑھائی۔

مولانا شبلی متکلم بھوریؒ

مولانا شبلی بن شیخ عنایت علی بن شیخ شیر علی بن شیخ ڈمر بھوری تیرہویں صدی کے آخر یا چودہویں صدی کی ابتداء میں بھور ضلع اعظم گڈھ کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے، مکتب کی تعلیم گھر پر مکمل کر کے مدرسہ حنفیہ جون پور میں داخل ہوئے اور مولانا ہدایت اللہ خاں رام پوری اور دیگر اساتذہ سے نحو وصرف، منطق وفلسفہ وغیرہ کی تحصیل کی پھر مزید تعلیم کے لیے دار العلوم ندوہ میں آ گئے اور یہیں سے جملہ علوم وفنون کی تحصیل کر کے سند فراغت حاصل کی، فراغت کے بعد مزید ایک سال اور پڑھ کر علمِ کلام میں امتیاز وتخصص کی سند لی۔

مولانا نہایت ذہین وطباع اور ذی صلاحیت عالم تھے، زمانۂ طالب علمی ہی سے آپ کی صلاحیتوں کے جوہر نمایاں تھے، اس لیے تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اربابِ ندوہ نے دار العلوم میں بحیثیت مدرس ان کا تقرر کر لیا ۱۹۲۴ء مطابق ۱۳۳۲ھ میں علامہ شبلی نعمانی کی طلب پر ندوہ سے اعظم گڈھ چلے آئے اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے صدر مدرس منتخب ہوئے اور تقریباً ۱۳۶۲ھ کے بعد تک اسی عہدہ پر متمکن رہے، لیکن آخر میں بچند وجوہ مدرسۃ الاصلاح سے الگ ہو گئے، علیحدگی کے وقت تقریباً بیس صفحے کا استعفاء قلم بند کیا تھا (جو ممکن ہے آج بھی مدرسہ کے دفتر میں محفوظ ہو) جس میں تین عنوان قائم کیے تھے: ''میں کیوں آیا، میں نے کیا کیا، اب کیوں جا رہا ہوں۔ تینوں عنوانات پر نہایت بسط سے مدلل بحث کی تھی، جس سے آپ کی تصنیفی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔

مدرسۃ الاصلاح سے علاحدہ ہو کر مدرسہ قرآنیہ جون پور میں مدرس ہوئے، مگر یہاں

بھی زیادہ دن نہ رہ سکے اور مستعفی ہوکر جھنگ (صوبہ پنجاب) کے کسی مدرسہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے تشریف لے گئے، شعبان کی تعطیل میں وہاں سے گھر آئے تو ۴۷ء کا فساد پھوٹ پڑا جس کی وجہ سے وہاں کا ارادہ ملتوی کر دیا اور گھر ہی پر رہنے لگے، آخر میں پھر ارباب اصلاح نے مولانا کو دعوت دی، چنانچہ ان کی خواہش پر آپ بلا تنخواہ مدرسۃ الاصلاح کی خدمت کرنے لگے۔

مولانا شبلی مرحوم جملہ علوم میں استادانہ نظر رکھتے تھے۔ مولانا فراہیؒ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا شبلی اس صلاحیت کے مالک ہیں کہ متعلقہ کتابوں کے مباحث کو ان کے مصنفین سے بہتر طور پر بیان کر سکتے ہیں بالخصوص معقولات اور علمِ کلام میں امتیازی شان رکھتے تھے۔

اس دیار میں مولانا کے بے شمار شاگرد ہیں جن کا شمار کرنا نہایت دشوار ہے، البتہ ان میں مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا نجم الدین اصلاحی، مولانا ابواللیث ندوی، مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا داؤد اکبر اصلاحی، مولانا صدر الدین اصلاحی، مولانا بدر الدین اصلاحی وغیرہ علمی حلقوں میں خاص شہرت کے مالک ہوئے۔

مولانا شبلی مرحوم جس وقت ندوہ میں زیر تعلیم تھے اس وقت وہاں تین شبلی جمع ہو گئے تھے اور تینوں اعظم گڈھ کے تھے، علامہ شبلی معتمد دار العلوم، مولانا شبلی جیراج پوری مدرس و مفتی اور یہ مولانا شبلی متکلم، ان کے نام کے ساتھ فرق و امتیاز کی غرض سے متعلّم کا لفظ لگایا گیا، یہ لفظ ان کے نام کے ساتھ ایسا جزء لازمی ہو گیا کہ اس کے ملائے بغیر ان کی شخصیت کا تصور نہیں آتا تھا، مگر جب انھوں نے علم کلام کی تکمیل کر لی تو اسی وزن پر متکلم کا لفظ ان کے نام کے ساتھ لگا دیا گیا، جو آخر تک قائم رہا۔

مولانا بڑے بے تکلف، ملنسار اور با مروت انسان تھے، سیر و صید کا شوق بڑھاپے تک رہا، روشن خیالی میں طبقۂ علماء میں بہت مشہور تھے، اسی روشن خیالی کی وجہ سے ان کے اکثر متعلقین بھی ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔

۵/ ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ مطابق ۳۰/ دسمبر ۱۹۷۳ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا اور وہیں دفن

کیے گئے، اس وقت ان کی عمر سو کے قریب تھی، لکھنؤ اپنے کسی عزیز سے ملنے گئے تھے وہیں بیمار ہوئے اور آخری وقت آپہونچا۔ (حیات شبلی ص ۶۸۷ وتذکرہ علمائے مبارک پور ص ۲۸۲)

مولوی حکیم شبلی شیدا خیرآبادیؒ

مولانا حکیم شبلی شیدا ؔابن حکیم جان محمد خیرآباد ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، ابتداء سے آخر تک مکمل تعلیم مولانا محمد شاہ سریانوی اعظمی تلمیذ مولانا عبدالحئی فرنگی محلّی سے مدرسہ منبع العلوم خیرآباد میں حاصل کی، طبابت اور خوشنویسی میں بھی انھیں سے کمال پیدا کیا، پھر دلّی جاکر طب کی تکمیل کی اور وہیں شاعری میں بھی درک پیدا کیا، کچھ دنوں دلّی میں بغرضِ تجارت رہے پھر ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۶ء میں مدرسہ معروفیہ پورہ معروف میں بحیثیت مدرس آپ کا تقرر ہوا، اور ۱۳۶۶ھ تک مسلسل اکیس برس بڑی شان وشوکت کے ساتھ تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دیں، مدرسہ معروفیہ کی زندگی میں اتنی طویل مدت تک کسی نے مدرسی نہیں کی، فارسی میں بڑی اچھی مہارت رکھتے تھے، فارسی کی پہلی کتاب سے لے کر آمدنامہ، گلستاں، بوستاں، مالابدمنہ، یوسف زلیخا، اخلاق محسنی، سکندرنامہ، انوار سہیلی اور بہار بوستاں تک تنہا پڑھاتے تھے، مدرسہ معروفیہ کے مشہور ماہنامے المعروف کے مرتب آپ ہی تھے، آپ کی نظمیں بھی اس میں چھپتی تھیں، تاریخ گوئی میں یدِطولیٰ حاصل تھا، تاریخی اشعار برجستہ کہا کرتے تھے شاعری میں اس دیار میں ان کی حیثیت استاذ الکل کی تھی۔

ان صلاحیتوں کے ساتھ طب میں بھی بیحد مہارت تھی، ایک بار گھر سے پورہ معروف تشریف لارہے تھے، راستہ میں ایک جگہ آہ وبکاء کا ہنگامہ برپا تھا جہاں ایک شخص کو مردہ سمجھ کر کفن باندھا جارہا تھا، آپنے دیکھ کر فرمایا کہ یہ شخص مردہ نہیں ہے؛ بلکہ اسے سکتہ کی بیماری ہوگئی ہے، چنانچہ آپ کی ہدایت پر عمل کیا گیا اور وہ مریض اچھا ہوگیا۔

مولانا شبلی شیدا تواضع وخاکساری کے پیکر تھے، طلبہ کے ساتھ بیحد شفقت کا برتاؤ کرتے تھے، سچے عاشق رسول تھے، کبھی کبھی عشق نبی میں بیخودی کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی، خاص کر سفرحج ۱۳۷۴ھ میں زیارت حرمین شریفین کے موقع پر وارفتگی اتنی بڑھی کہ

اپنی کچھ خبر نہیں رہتی تھی، بالآخر اسی حالت میں حج کے بعد ۲۸ ر ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ مطابق یکم اگست ۱۹۵۵ء کو مکہ معظمہ میں وفات پا کر سرزمین پاک میں پیوند خاک ہو گئے۔ آپ کی مشہور نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو:

میں نے گلشن میں دیکھی ہر اک گل کی خو   سب کے وردِ زباں وحدہ وحدہ
قو موا تھا ورد سرو لبِ آبِ جو   شاخِ گل پڑھتی تھی وارکعوا واسجدوا
اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو

بطور نمونہ غزل کا ایک شعر درج ہے:

پہلو سے چھوٹ کر وہ چلا چیختا ہوا   میرے دلِ غریب کو یارب یہ کیا ہوا

(مشاہیر پورہ معروف ص ۴۹ تا ۵۱)

مولانا شکر اللہ مبارک پوریؒ

حضرت مولانا قاری مفتی شکر اللہ بن عبدالواحد محلہ رانی پور، قصبہ مبارک پور میں چودہویں صدی کی ابتدا میں پیدا ہوئے، قرآن شریف اور اردو کی تعلیم اپنے گھر اور محلہ میں حاصل کی، اس کے بعد ۱۳۱۷ھ میں احیاء العلوم کا اجراء ہوا تو اس میں داخل ہو کر مولانا محمد محمود معروفی متوفی ۱۳۷۰ھ سے عربی کی کتابیں پڑھیں، ان دنوں مولانا کے گھریلو حالات نہایت ابتر تھے اور معاشی فکر ہر دم دامنگیر رہتی تھی، اسلیے صبح دو گھنٹہ کام کر کے مدرسہ جاتے تھے اور مدرسہ سے واپس آکر رات کو بھی کام کرتے تھے، اس طرح سے تعلیمی شوق اور خانگی مشاغل کی کشاکش میں نحو، صرف وغیرہ کی تعلیم مدرسہ میں مولانا محمد محمود معروفی سے حاصل کی۔ گھر کے لوگ کام میں لگانا چاہتے تھے اس ڈر سے گھر سے چپکے سے نکل بھاگے اور الٰہ آباد جا کر مدرسہ مصباح العلوم میں مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے، ان ہی ایام میں مولانا حکیم الٰہی بخش ناظم مدرسہ احیاء العلوم الٰہ آباد گئے تو راستے میں ان سے مولانا کی مڈبھیڑ ہو گئی، انھوں نے مکان چلنے پر اصرار کیا، آخر اس شرط پر راضی ہو گئے کہ گھر پر مجھے تعلیم سے روکا نہ جائے گا، چنانچہ بھائیوں کی طرف سے پوری

آزادی مل گئی اور مولانا لاہر پور ضلع سیتاپور کے ایک مدرسہ میں چلے گئے جہاں سلسلۂ خیرآباد کا فیض جاری تھا، آپ نے وہاں معقولات ومنقولات کی تعلیم کے ساتھ فنِ تجوید اور قرأت کی بھی تعلیم حاصل کی، یہاں کے اساتذہ میں مولانا حیدر حسن اور مولانا فیض اللہ صاحب خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، انھیں اساتذہ سے مولانا نے شرحِ مطالع، توضیح وتلویح اور افق المبین وغیرہ پڑھیں، یہاں سے نکل کر ریاست مینڈھو علی گڈھ چلے گئے جہاں اس دور کے نامور عالم مولانا ماجد علی مانوی جونپوری (۱) متوفی ۱۳۵۲ھ کا دریائے فیض ٹھاٹھیں مار رہا تھا، مولانا نے ان سے کسبِ علم کیا، پھر یہاں سے جاکر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، جہاں اس وقت حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ، مولانا حافظ احمد صاحبؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس اسرارہم کا فیض جاری تھا، آپ نے انھیں اساتذہ وشیوخ سے تعلیم مکمل کی اور ۱۳۳٦ھ میں دارالعلوم سے سند فراغت حاصل کی، وطن آئے تو مولانا حکیم الٰہی بخش نے مدرسہ احیاء العلوم کی نظامت سپرد کردی، اس وقت مدرسہ ایک مسجد میں تھا، اس کے پاس کوئی مستقل عمارت نہیں تھی، مولانا نے سب سے پہلے مدرسہ کی مستقل عمارت بنوائی، اس کے بعد اپنی نگرانی میں ایک جامع مسجد بھی تعمیر کرائی ۱۳۵۹ھ کو ایک عظیم الشان جلسہ میں اس کی بنیاد پڑی، یہ مسجد فنِ

(۱) حضرت مولانا ماجد علی مانوی جونپوری ان علماء کبار میں ہیں جن کی وسعتِ معلومات اور دقتِ نظر کی مثالیں کم ملتی ہیں، مولانا نے علوم وفنون کی تعلیم وتحصیل علامہ عبدالحق خیرآبادی، مفتی لطف اللہ علی گڈھی اور قاضی عبدالحق کابلی جیسے اساطینِ علم سے کی تھی اور علمِ حدیث قطبِ عالم محدّث عصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے حاصل کی، گلاوٹی، میڈھو اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدتوں تدریسی خدمت انجام دی، آخر عمر میں مدرسہ بیت العلوم سرائے میر میں وہاں کے اساتذہ کو بخاری کا درس دیتے تھے جس میں مدرسۃ الاصلاح کے بعض اساتذہ بھی شریک ہوتے تھے، مولانا معقولات اور منقولات دونوں کے ماہر عالم تھے اور جملہ علوم کو نہایت تحقیق وتدقیق سے پڑھاتے تھے۔ تدریس کے ساتھ آپ نے متعدد کتابیں اور مختلف مسائل پر رسالے تصنیف کیے، مگر آپ کی کوئی تصنیف اب تک طبع نہ ہوسکی، درسِ حدیث کے وقت حضرت گنگوہیؒ کی تقریر بخاری نہایت اہتمام سے تحریر کی تھی جو ابھی تک ان کے خاندان میں محفوظ ہے، ابوداؤد شریف، ترمذی شریف اور شامی پر آپ نے مفید حواشی بھی لکھے تھے، مگر یہ سب علمی خزانہ اخلاف کی ناقدری کا شکار ہوگیا۔ آپ نے عید کے دن یکم شوال ۱۳۵۳ھ میں وصال فرمایا۔

تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے، نیز قصبہ کے باہر دکھن جانب عظیم الشان عیدگاہ تعمیر کرائی جو ۱۳۵۷ھ میں مکمل ہوئی۔ مدرسہ جامع مسجد اور عیدگاہ مولانا کی تعمیری یادگار ہیں۔

مولانا پر دارالعلوم دیوبند کا اصلاحی، دینی اور سیاسی رنگ اس طرح چڑھ گیا تھا کہ اسی مکتب فکر وخیال کے سرگرم رکن وترجمان بن کر زندہ رہے بدعات وخرافات کے خلاف نہایت بے باکی سے جنگ کی، مولانا نہایت کامیاب واعظ تھے، ایک موضوع پر بلاتکلف تین تین چار چار گھنٹے تقریر کرتے تھے، موت وحیات، شادی، بیاہ، ذات برادری کی غلط رسموں میں اصلاح اور سدھار پیدا کرنا ان کا عظیم کارنامہ ہے۔

ساتھ ہی علمی استعداد نہایت ٹھوس تھی ہر علم وفن کی کتابیں بلاتکلف پڑھاتے تھے اور خوب پڑھاتے تھے، افہام وتفہیم میں خداداد ملکہ حاصل تھا، آخری دور میں جب دوسری مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں منطق، فلسفہ اور دیگر علوم وفنون کی منتہی کتابیں بے مطالعہ اس طرح پڑھاتے تھے کہ مشہور اساتذہ بھی نہیں پڑھا سکتے تھے۔ ابتداء میں دورۂ حدیث بھی پڑھاتے تھے، حج وزیارت کی دولت سے بھی بہرہ ور اور مشرّف تھے، سفر حج پر جاتے وقت جہاز میں برطانوی حکومت کے خلاف تقریر کی جس کی تحقیقات بعد تک ہوتی رہی ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹؍جون ۱۹۲۳ء کو بدیسی حکومت کے خلاف ستیہ گرہ کرنے پر گرفتار بھی ہوئے اور چھ ماہ تک قید میں رہ کر اسلاف کی سنّت کو زندہ کیا۔

مدرسہ کے مشاغل، جماعتی معاملات اور دوسرے کام کی ہماہمی میں مولانا انتھک محنت کرتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ صحت گرنے لگی اور دق کا موذی مرض لاحق ہوگیا، ابتداء میں اپنے استاذ مولانا محمود معروفی کا علاج کیا پھر لکھنؤ تشریف لے گئے، مگر مرض کی شدّت اور ضعف ونقاہت بڑھتی ہی رہی بالآخر دوشنبہ ۵؍ربیع الاوّل ۱۳۶۱ھ میں چاشت کے وقت داعیٔ اجل کو لبیک کہا، مولانا کے وصال کا دن مبارک پور میں یوم غم اور جنازہ مشہودہ تھا۔

آپ کے تلامذہ میں مولانا قاضی اطہر مبارک پوری مصنف کتب متعددہ، مولانا عبدالباری اعظمی، مولانا شمس الدین اعظمی، مولانا بشیر احمد وغیرہ خاص شہرت کے مالک ہیں۔

(تذکرہ علمائے مبارک پور ص ۲۱۵ تا ۲۲۶)

مولانا شکر اللہ اعظمیؒ

آپ ضلع اعظم گڈھ کے ایک موضع میرٹھ نامی میں پیدا ہوئے، سلسلۂ نسب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، ابتدائی تعلیم اپنے دیار میں مکمل کر کے جون پور مدرسہ حنفیہ میں داخل ہوئے اور وہیں مولانا مفتی محمد یوسف فرنگی محلی سے درسیات کی تکمیل کی، فراغت کے بعد شہر اعظم گڈھ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی جہاں درس وتدریس کے ساتھ وعظ وتذکیر کا سلسلہ بھی جاری رکھا، اس کے بعد بریلی کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے، وہاں بھی وعظ وتذکیر کا سلسلہ قائم تھا اسی کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا مشغلہ بھی تھا، چنانچہ مناظرۃ الحنفی بالحنفی، ہدایت التحقیق، رسالۂ العجالہ فی ازالۃ الازالہ آپ کی مشہور تصنیفات ہیں۔ ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں وفات ہوئی۔ (تراجم علمائے حدیث ص ۳۹۴)

مولوی شمس الحق گجراویؒ

مولوی شمس الحق بن گدا حسین موضع گجرا میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد فارسی اور عربی کی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ ناصر العلوم گھوسی میں متوسطات پڑھیں اور دار العلوم دیو بند میں کئی سال رہ کر وہیں سے سند فراغت پائی، تعلیم مکمل کر لینے کے بعد مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور میں مدرس ہوئے اور آخر دم تک اسی میں رہے۔ ۹ر شعبان ۱۳۹۳ھ مطابق ۷ر ستمبر ۱۹۷۳ء، روز جمعہ قلب کی حرکت بند ہو جانے سے وطن میں فوت ہوئے، اس وقت ان کی عمر ستر کے حدود میں تھی۔ (تذکرہ علمائے مبارک پور ص ۲۸۳)

مولانا مفتی شمس الدین برونوی

شیخ فاضل علامہ شمس الدین، بن نور الدین، بن عبد القادر، بن زین الدین، بن نظام الدین، بن خیر الدین، بن احمد، بن جمال الدین، بن تقی الدین صدیقی اودھی برنوی

(موضع برونہ، تھانہ بردہ سے شمال مشرق چھ کیلومیٹر، اور مارٹن گنج سے جنوب مغرب آٹھ کیلو میٹر پر واقع ہے) اپنے زمانہ کے علماء مشاہیر میں تھے، برونہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشونما ہوئی، فضلاء عصر کی ایک جماعت سے علوم وفنون کو حاصل کر کے فارغ التحصیل ہوئے۔

تعلیم سے فراغت ہو جانے کے بعد شہنشاہ اکبر نے شاہزادہ پرویز کی تعلیم وتربیت پر انھیں مامور کر دیا، اسی بناء پر ایک مدت تک الہ آباد میں مقیم رہے، اس کے بعد شہر جونپور میں منصب افتاء پر مقرر ہوئے تو الہ آباد سے جون پور منتقل ہو گئے اور یہاں افتاء کی خدمت کے ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا، شمس بازغہ کے مصنف ملا محمود جیسے فاضل روزگار اور علامۂ دہر نے ان سے بعض کتابیں پڑھیں، اور ان کے بھانجے دیوان محمد رشید صاحب رشیدیہ نے، شرح جامی، حاشیہ کافیہ مع شرح ملا الہ داد جون پوری تا مرفوعات، قصیدہ بردہ، الآداب الحنفیہ، وحسامی کے کچھ حصے، مختصر المعانی، شرح وقایہ، ہدایہ اور تلویح انھی سے پڑھیں اور اس دور کے مشہور صاحب درس عالم علامہ رکن الدین بحری آبادی نے تو سب کچھ انھیں سے پڑھا تھا، ۱۰۴۷ھ میں وفات پائی اور اپنے مدرسہ شہر جون پور میں سپرد خاک ہوئے، ان کے بعض تلامذہ نے ان کی تاریخ وفات ان الفاظ میں بیان کی "دخل الجنة بلا حساب" (گنج ارشدی بحوالہ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۸۴ مطبوعہ ۱۴۱۲ھ)

مولانا مفتی شمس الدین بڑے عابد وزاہد اور خوش اوقات عالم تھے ان کی نسل سے ایک خاندان آج بھی برونہ میں آباد ہے، جن میں قاضی محمد ضیاء برونہ ہی میں رہتے ہیں اور ان کے ایک بھائی قاضی شمیم احمد ایڈوکیٹ بسلسلۂ وکالت شہر اعظم گڈھ میں اقامت پذیر ہیں، اور ایک بھائی نے لکھنو میں گھر بسالیا ہے۔

مولانا شیخ محمد مئوی ؒ

استاذ العلماء حضرت مولانا شیخ محمد مئوی ربیع الاولی ۱۳۴۲ھ میں قصبہ مئو ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، حفظِ قرآن کے بعد ابتداء سے موقوف علیہ تک کی تعلیم دار العلوم مئو میں مولانا میرک شاہ، مولانا اسلام الحق کوپا گنجی، مولانا قاری ریاست علی مئوی اور مولانا

مفتی نظام الدین اعظمی وغیرہ سے حاصل کی پھر دورۂ حدیث پڑھنے کے لیے ۱۳۶۱ھ میں دار العلوم دیوبند کا سفر کیا اور وہاں پہونچ کر حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا اعزاز علی امروہی، حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی وغیرہ سے ۱۳۶۲ھ میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی، چونکہ مولانا ابتداء ہی سے نہایت ذہین وطباع واقع ہوئے تھے اس لیے اپنے رفقائے درس میں ہمیشہ ممتاز اور اساتذہ کی نگاہوں میں باعزت رہے اور دوران تعلیم ہی میں اپنی ٹھوس استعداد کی بنا پر علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے، چنانچہ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی ارباب دار العلوم مئو نے آپ کا تقرر بحیثیت استاذ کے دار العلوم میں کرلیا۔ یہاں آپ نے مسلسل سات برس تک تعلیمی خدمت انجام دی اور نصاب کی چھوٹی بڑی اکثر کتابوں کا درس نہایت کامیابی کے ساتھ دیا، اس درمیان میں آپ کی علمی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور مختلف مقامات سے طلبی آنے لگی اور خود مولانا کے اندر بھی یہ داعیہ پیدا ہو گیا کہ کچھ دنوں گھر کے جھمیلوں سے الگ ہو کر پورے طور سے علمی مشاغل میں وقت گذارا جائے جو دار العلوم مئو میں رہتے ہوئے میسر نہیں آسکتا، اس لیے اپنے شفیق استاذ مولانا اعزاز علی کے مشورہ سے دار العلوم سے علیحدہ ہو کر بحیثیت صدر مدرس رڑکی ضلع سہارنپور کے مدرسہ میں چلے گئے اور یہاں بھی سات سال تک نصاب مروجہ کی اعلیٰ اور اہم کتابوں کا درس دیا، اس مدت میں مولانا نے شروحِ احادیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ اور ادب وغیرہ کی بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا دورانِ مطالعہ جو علمی اشکالات سامنے آئے اسے حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی سے حل کیا، رڑکی میں سات برس قیام کرنے کے بعد مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار واڑیسہ کے طلب پر جامعہ رحمانی مونگیر میں شیخ الحدیث اور صدر مدرس کی حیثیت سے تشریف لے گئے اور اس شان سے بساط درس بچھائی کہ بہار کی جملہ درس گاہوں کی رونق سرد پڑ گئی اور پورے بہار میں آپ کے تبحر علمی کی دھوم مچ گئی، یہاں درس وتدریس کے ساتھ افتاء کی خدمت بھی آپ سے متعلق رہی اور پانچ برس کی مدت کے اندر سیکڑوں فتاویٰ آپ نے تحریر کیے جو علمی حلقوں میں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے گئے، پانچ برس جامعہ رحمانی میں افتاء اور درس کی خدمات انجام دے کر اہل وطن

اور دارالعلوم مئو کی خواہش پر شوال ۱۳۸۱ھ میں دوبارہ دارالعلوم مئو میں استاذِ حدیث ونائب مفتی کے منصب پر فائز ہوئے، جامعہ رحمانی سے علیحدگی کے موقع پر مہتمم جامعہ مولانا منت اللہ رحمانی نے اپنے جس تاثر کا ذکر کیا ہے اس سے مولانا کے کمال علمی اور ہر دلعزیزی کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا رحمانی اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"میں سفر میں تھا پرسوں شام کو واپسی ہوئی کل کی ڈاک سے آپ کا وہ گرامی نامہ ملا جس نے ہم لوگوں کے قلوب کو افسردہ کردیا، اس کا افسوس ہے کہ جامعہ ایک اچھے استاذ کی خدمات سے محروم ہوگیا اور یہ فقیر ایک عالم دین کی صحبت سے محروم، ہمیں توقع ہے کہ باہمی رابطہ جو ہم لوگوں میں پیدا ہوچکا ہے کمزور نہ ہوگا۔" (مکتوب ۱۷ رشوال ۱۳۸۱ھ)

الغرض ۱۳۸۱ھ میں مولانا جامعہ رحمانی سے مستعفی ہوکر دارالعلوم مئو میں آگئے، اس وقت دارالعلوم میں آپ کے اساتذہ میں سے حضرت مولانا قاری ریاست علی مئوی اور حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمی تعلیمی خدمات انجام دے رہے تھے، مولانا شیخ محمد مرحوم نے بھی ان کہنہ مشق اور تجربہ کار اساتذہ کی موجودگی میں مسندِ درس کو زینت دی حسن اتفاق سے اسی سال راقم بھی بغرض تحصیل علم دارالعلوم میں داخل ہوا تھا اور ملاحسن جیسی ادق کتاب کا درس مولانا مرحوم کے یہاں مقرر رہا، پہلے سے کسی قسم کا تعارف اور نہ مولانا کے کمالات علمی کی خبر لیکن سبق پڑھتے ہی مولانا کی عقیدت ومحبت ایسی پیدا ہوئی کہ آج تک اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی، مولانا کا حافظہ غضب کا تھا شرح ملاحسن کے دو دو تین تین صفحات زبانی پڑھتے چلے جاتے اور کیا مجال کہ ایک نقطہ کا فرق پڑ جائے، درس کی تقریر شروع کرتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم کا ایک بحر بیکراں ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے، ایک ایک مسئلے پر نہایت بسط اور تفصیل سے کلام کرتے، بعض مقامات پر ملاحسن پر نقد وتبصرہ بھی فرماتے، اس وقت دوسرے حکماء کے اقوال کا ذکر اس انداز سے کرتے کہ معلوم ہوتا کہ معقولات کا پورا ذخیرہ مولانا کے دماغ میں محفوظ ہے، دوسرے سال یعنی ۱۳۸۲ھ میں مولانا مرحوم ہی سے مشکوٰۃ شریف پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، اس وقت مولانا کا کمال علمی مزید نکھر کر سامنے آیا اور اندازہ ہوا کہ مولانا کا فن دراصل معقولات نہیں؛ بلکہ منقولات ہے، اسی طرح جو طلبہ ان

سے نحو و بلاغت کے فنون پڑھتے تھے ان کا تاثر یہ تھا کہ مولانا کو ان فنون میں درجہ اختصاص حاصل ہے، غرضیکہ جس فن کو بھی آپ پڑھاتے ایسا معلوم ہوتا کہ اس فن کے آپ امام ہیں، اکثر کتابوں کی عبارتیں انھیں زبانی یاد تھیں اور طلبہ کو شوق دلانے کے لیے اکثر پڑھ پڑھ کر سناتے بھی رہتے تھے، اگرچہ اس وقت مولانا دارالعلوم میں تیسرے درجہ کے مدرس تھے؛ لیکن طلبہ میں جس قدر و مقبولیت انھیں حاصل تھی بس وہ انھیں کا حصہ تھی۔

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب جب دارالعلوم دیوبند کی طلب پر مئو سے دیوبند چلے گئے تو مولانا مرحوم ان کی جگہ پر مفتی اور نائب صدر منتخب ہوئے اور تادم آخر اس منصب پر قائم رہے، درس و تدریس کے ساتھ مولانا شیریں بیان واعظ بھی تھے، قصبہ اور قرب وجوار میں آپ کا وعظ اکثر ہوتا رہتا تھا، جس میں عوام کے علاوہ خواص اور اہل علم بھی نہایت ذوق و شوق سے شرکت کرتے تھے، افسوس کہ مولانا کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ آج وہ علمائے ہند کی صف میں ممتاز حیثیت کے مالک ہوتے، آپ کی وفات کا حادثہ بالکل اچانک پیش آیا، ۱۹/ ربیع الثانی کو حسب معمول بعد نماز عصر احباب کے ساتھ تفریح میں گئے، مغرب بعد واپس لوٹے اور کھانا کھا کر گھریلو مشاغل میں لگ گئے بعد نماز عشاء کچھ دیر مطالعہ کیا اور سو گئے۔ حسب عادت آخر شب میں اٹھے معمولات سے فارغ ہو کر کچھ دیر مطالعہ کیا اتنے میں فجر کی اذان ہو گئی، سنت پڑھ کر مسجد گئے وہیں شکم میں درد محسوس ہوا، کچھ دیر بیٹھے رہے لیکن درد کی شدت سے بیٹھا نہ رہا گیا تو بغیر نماز پڑھے گھر چلے آئے کسی طرح سے نماز فجر ادا کی، مولانا کے بڑے بھائی شیخ عبداللہ کو خبر ہوئی تو وہ ڈاکٹر کے پاس دوڑے گئے، لیکن جب تک ڈاکٹر آیا، علم و دانش کا یہ پیکر ابدی نیند سو چکا تھا، یہ سنسنی خیز خبر سورج کے بلند ہوتے ہی پورے قصبے میں بجلی کی طرح پھیل گئی اور سارا قصبہ آپ کے مکان پر ٹوٹ پڑا، ہر فرد بشر محو حیرت بنا تھا، طلبائے دارالعلوم مئو شدتِ غم سے نڈھال ہو رہے تھے، ارباب مدرسہ فرط الم میں از خود رفتہ تھے، عجیب درد و کرب کا عالم تھا جو پورے مجمع پر چھایا ہوا تھا۔

یہ حادثۂ فاجعہ ۲۰/ ربیع الثانی ۱۳۹۰ھ مطابق ۵/ جولائی ۱۹۷۰ء کو پیش آیا اور اسی

دن علماء وصلحاء کی کثیر جماعت کے ساتھ نماز جنازہ ادا کی گئی اور مئو کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

مولانا نے کل ۲۸ سال تعلیمی خدمات انجام دیں اس مدت میں بے شمار طلبہ آپ کے درس سے عالم وفاضل بن کر نکلے، جن میں مولانا سلطان احمد مئوی، مولانا نذیر احمد مئوی، مولانا ولی رحمانی مونگیری، مولانا سعید الرحمن بہاری وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

لوحِ مزار پر مندرجہ ذیل عبارت اور تاریخ وفات کندہ ہے:

حضرت الحاج الحافظ مولانا شیخ محمد صاحب نور اللہ مرقدہ، شیخ الحدیث ومفتی دار العلوم مئو

۲۰/ربیع الثانی ۱۳۹۰ھ مطابق ۵/جولائی ۱۹۷۰ء بروز یکشنبہ

داخلِ جنت ہوئے ذی علم وہ　　سالِ رحلت ہے کہ ہے دل کی پکار

۱۹۷۰ء

=================

﴿ص﴾

مولانا صاحب علی گھوسویؒ

حضرت العلامہ مولانا صاحب علی خان بہادر بن دولت علی بن عبداللہ بن احمد بن لعل محمد بن ابراہیم بن شیخ بودھن بن ملک جلال بن ملک کمال صدیقی گھوسوی دسویں صدی ہجری میں اس دیار کے علماء کبار میں سے تھے، علوم اسلامیہ کی ترویج واشاعت میں آپ نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

آپ کے مورث اعلیٰ ملک محمد کمال نے شہنشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں کٹرہ مانک پور سے ترک سکونت کر کے قصبہ گھوسی کو اپنا موطن ومسکن بنایا، یہیں ۱۲۰۹ھ میں مولانا صاحب علیؒ کی ولادت ہوئی، سن شعور کو پہونچے تو تحصیل علم کی غرض سے جون پور کا سفر کیا، جون پور اس زمانے میں علوم دینیہ کا اہم ترین مرکز تھا اور اربابِ علم کی ایک کثیر تعداد یہاں قیام پذیر تھی، مولانا صاحب علی نے یہاں کے مشاہیر علماء وفضلاء سے اکتساب فیض کیا، جن

میں الشیخ مولانا سخاوت علی العمری الجونپوری متوفی ۱۲۷۴ھ (۱) اور ہادیٔ بنگال الشیخ مولانا کرامت علی جونپوری متوفی ۱۲۹۰ھ (۲) کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے، پھر یہاں سے کلکتہ تشریف لے گئے اور مولانا مفتی محمد مراد تلمیذ رشید حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی سے فقہ حنفی کی مشہور ترین کتاب ہدایہ کی تحصیل کی، مولانا صاحب علی کے اساتذہ میں شیخ علی کبیر کا ذکر بھی تذکرہ کی کتابوں میں ملتا ہے۔

تحصیل وتکمیل کے بعد کلکتہ میں رئیس المفتیین کے عہدہ پر مولانا کا تقرر ہو گیا پھر اس عہدہ سے ترقی کر کے ۱۲۴۲ھ میں حکومت برطانیہ کے گورنر جنرل ہند کے میر منشی منتخب ہوئے اس دور میں میر منشی کا عہدہ بڑا ہی اہم تھا، چنانچہ اس عہدہ پر فائز ہو جانے کے بعد مولانا کی شہرت ومقبولیت میں چار چاند لگ گئے اور انگریزی حکومت میں آپ کا بڑا اثر ورسوخ پیدا ہو گیا امراء اور حکامِ سلطنت آپ کے علم وفضل کے بڑے معترف تھے اور آپ کے ساتھ نہایت تعظیم وتوقیر کا معاملہ کرتے تھے، آپ کی علمی صلاحیت اور حسنِ کارکردگی کے اعتراف میں حکومتِ برطانیہ نے خان بہادر کا لقب دیا تھا اور خلعتِ فاخرہ سے بھی ممتاز کیا، اس وقت کابل بھی حکومتِ برطانیہ ہی کے زیر نگیں تھا جس کے انتظام وانصرام کی ذمہ داری

---

(۱) حضرت مولانا سخاوت علی جون پوری تیرہویں صدی کے علماء مشرق میں شریعت وطریقت کے مسلم مقتدا اور امامت وعبقریت کے اعلیٰ مقام پر تھے، آپ کی پیدائش ۱۲۲۶ھ یا ۱۲۲۵ھ میں ہوئی، مولانا احمد علی چریاکوٹی، مولانا احمد اللہ انامی اور حضرت اسماعیل شہید ومولانا عبدالحئی بڈھانوی سے جملہ علوم وفنون کی تعلیم وتحصیل کی تھی اور مجدد عصر سیّد احمد شہید سے خلافت واجازت پائی تھی، آپ کے درس سے سیکڑوں علماء وفضلاء پیدا ہوئے آخر میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ میں مقیم ہو گئے تھے، وہیں ۶؍شوال ۱۲۷۴ھ میں وفات پائی۔ (تجلی نور ص ۱۰۸، نزہہ ص ۱۹۲ ج ۷)

(۲) حضرت مولانا کرامت علی جون پوری ۱۷؍محرم ۱۲۱۵ھ میں جون پور میں پیدا ہوئے اور ۳؍ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ میں رنگ پور (بنگال) میں وفات پائی، آپ حضرت سیّد احمد شہید بریلوی کے اہم خلیفہ تھے، آپ کے اصلاحی وعظوں سے ڈھاکہ اور بنگال میں ہزاروں کی اصلاح ہوئی اور سیکڑوں غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا، اپنے وقت کے جید علماء میں شمار ہوتے تھے آپ کے اساتذہ میں مولانا احمد علی چریاکوٹی اور مولانا احمد انامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، مولانا فن تجوید اور کتابت میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں، تفصیل کے لیے دیکھیے سوانح مولانا کرامت علی مؤلفہ مولانا عبدالباطن جون پوری وغیرہ۔

گورنر ہند ہی سے متعلق ہوتی تھی، چنانچہ ۱۲۵۲ھ میں گورنر ہند کابل گیا تو مولانا صاحب علی کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا، مولانا نے وہاں دوسال قیام کیا اور اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے ساتھ وہاں کے علماء وفضلاء سے علمی استفادہ بھی کرتے رہے۔

مولانا صاحب علی مرحوم خالص علمی آدمی تھے، مطالعۂ کتب اور علماء کی مجلسوں میں نشست وبرخاست اور ان سے علوم وفنون میں مباحثہ ومذاکرہ مولانا کی اصل فطرت تھی جس کے لیے ملازمت کی ہنگامہ خیز زندگی میں کوئی جگہ نہیں تھی، ساتھ ہی حکومت کی پالیسیوں سے بھی مولانا کو بالکل اتفاق نہیں تھا، انگریزوں کی اسلام دشمنی کی وجہ سے مولانا کو برطانیہ حکومت سے انتہائی تنفر ہوگیا، اس لیے ۱۲۵۵ھ میں کابل سے رخصت لے کر گھر چلے آئے اور یہاں سے اسی سال حج وزیارت کی غرض سے حرمین شریفین چلے گئے اور حج سے واپسی کے بعد ملازمت سے بالکلیہ الگ ہوگئے۔

اب مولانا کو اپنے ذوق علمی کے تقاضوں کی تکمیل کا موقع میسر ہوا اس سلسلے میں آپ نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے آبائی وطن قصبہ گھوسی میں ۱۲۵۵ھ میں ایک دینی درسگاہ کی بنیاد رکھی اور اس کے پہلو میں ایک عالی شان جامع مسجد بھی تعمیر کی، ساتھ ہی ایک کتب خانہ بھی قائم کیا جس میں تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ اور لغت کی ہزاروں کتابیں تھیں، آگے چل کر مولانا صاحب علی کے ابناء واحفاد نے ان کی قائم کردہ درس گاہ کو بڑی ترقی دی اور اس کے تعلیمی معیار کو بلند کیا جس کے لیے ضلع کے مشاہیر اساتذہ کی خدمات حاصل کیں؛ لیکن تقسیم ہند وپاک کے بعد جب حکومت نے زمیندارانہ نظام کو ختم کردیا تو دیگر نجی مدارس کی طرح یہ مدرسہ بھی انقلاب کی نذر ہوگیا اور اس کی ساری علمی چہل پہل ختم ہوگئی، تاہم مدرسہ اب بھی جاری ہے اور اپنی بساط کے مطابق علوم دینیہ کی خدمات انجام دے رہا ہے۔

مولانا صاحب علی مرحوم حرمین شریفین کی زیارت اور وہاں کے ایمان افروز مناظر سے دیدۂ ودل کو شادکام کرآئے تھے، مگر روح کی تشنگی تاہنوز باقی تھی اس لیے ۱۲۷۵ھ میں دوبارہ اس پاک دیار میں حاضر ہوئے اور اس بار مسلسل دوبرس تک مقیم رہ کر حرمین شریفین کی برکتوں سے خوب خوب استفادہ کیا، حرمین شریفین کے قیام کے دوران حضرت مولانا

شاہ عبدالغنی مجددی مہاجر مدنی (۱) سے بیعت بھی کی، چنانچہ اپنے روزنامچہ میں ۲۳/ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۵ھ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"امروز قریب باب النساء، درحرم شریف مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام از جناب مولانا مرشدنا مولوی عبدالغنی عرف حاجی میاں برادر کوچک حضرت شاہ ابوسعید صاحب زیدت فیوضہم و برکاتہم مشرف بیعت بخاندان قادریہ شدم وارشاد شد کہ ذکر وشغل درخاندانِ مابرطریقۂ نقشبندیہ می نمود۔" الخ

بیعت کے ساتھ حضرت شاہ صاحب سے حدیث پاک کی اجازت وسند بھی حاصل کی، اسی مدتِ قیام میں حضرت شاہ صاحب نے مولانا صاحب علی مرحوم کو اپنی خلافت واجازت سے سرفراز فرمایا اور ہندوستان کی جانب مراجعت کا حکم دیا، چنانچہ اپنے شیخ ومرشد کے حکم سے ۱۲۷۷ھ میں وطن تشریف لائے اور علوم دینیہ کی خدمت میں مصروف ہوگئے تاآنکہ ماہ جمادی الاخریٰ ۱۲۸۱ھ میں محبوبِ حقیقی کا پیغام آگیا اور آپ نے مسکراتے ہوئے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، مولانا اس وقت اپنی چھاؤنی واقع حیدرگنج ضلع غازی پور میں تھے وفات کے بعد جنازہ گھوسی لایا گیا جہاں اس علم وعمل کے شیدائی کو سپردِ خاک کردیا گیا۔

حضرت مولانا صبغت اللہ اعظم گڈھیؒ

مولانا صبغت اللہ ضلع اعظم گڈھ کے باکمال علماء میں تھے، الدراسۃ الوافیہ فی مصطلح العروض والقافیہ (عربی) مولفہ مولانا حافظ ابوالرضاء محمد بن احمد مطبوعہ سعید المطابع بنارس ۱۳۰۵ھ کے آخر میں مولانا صبغت اللہ کا عربی میں ایک طویل قصیدہ ہے جس سے ان کی علمی صلاحیت وقابلیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں:

(۱) حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددی ۱۲۳۵ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۲۹۶ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی، آپ کی جلالت وولایت پر ہندوعرب کا اتفاق ہے، آپ نے حضرت شاہ اسحاق دہلوی سے علم حدیث حاصل کیا تھا اور آپ سے بے شمار علماء وفضلاء نے اس علم پاک کو حاصل کیا ۱۲۷۳ھ میں جب انگریز دہلی پر قابض ہوگئے تو آپ اپنے اہل وعیال کو لے کر مدینہ منورہ ہجرت کرگئے اور وہیں آپ کی وفات ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر ص ۲۸۷، ج ۷ وآثار الصنادید)

انجم الثریا ام عقود من الدر ام الغادة الھیفاء فی صورۃ البدر
ام اللولؤ المنظوم فی سلک فضۃ ام الروضۃ الزھراء تعبق بالذخر
ام العقد من ثغر الحبیب منضدا ام الحِلیۃ الحسناء صیغت من التبر
ام الخمر فی کاس الطروس ام احرف ام الشھد فی البلور اصفی من الخمر

(از بیاض مولانا قاضی اطہر مبارک پوری)

بس اس کے علاوہ ان کے بارے میں طلب وجستجو کے باوجود کچھ معلوم نہ ہوسکا، کتاب ہذا کے سن طباعت سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف اوائل چودھویں صدی کے علماء میں سے تھے۔

=================

﴿ض﴾

مولانا ضمیر احمد قدسیؒ

مولانا حکیم ضمیر احمد قدسی عراقی مئوی اپنے عہد کے مشاہیر علماء میں سے تھے ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں اپنے آبائی وطن قصبہ مئو (محلّہ شاہی کٹرہ) ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مئو ہی میں وہاں کے علماء وفضلاء سے حاصل کی جن میں حضرت مولانا عبد الغفار مئوی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، ابتدائی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد آپ نے دیوبند کا علمی سفر کیا اور دار العلوم دیوبند میں داخلہ لے کر اس وقت کے اساتذہ سے جملہ علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل کی، آپ کے رفقائے درس میں خاتم المفسّرین علامہ شبیر احمد عثمانی اور حضرت مولانا شبلی نندانویؒ نے علمی وروحانی دنیا میں بڑی شہرت ومقبولیت حاصل کی، مولانا ضمیر احمد جس زمانے میں دار العلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھے اس وقت حضرت شیخ الہند قدس سرہ مسندِ صدارت پر جلوہ افروز تھے، قدسی مرحوم نے حضرت شیخ الہند ہی سے بخاری و ترمذی پڑھی اور سند فراغت حاصل کی، حضرت شیخ الہند قدس سرّہ مولانا قدسی کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی علمی صلاحیتوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، درس نظامیہ کی تکمیل

کے بعد اس عہد کے رواج کے مطابق آپ علم طب کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنی خداداد ذہانت وفطانت سے اس فن میں بھی قلیل مدت میں پوری دستگاہ حاصل کر لی۔

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد آپ نے قصبہ مئو میں طبابت شروع کر دی اور تھوڑے ہی دنوں میں اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی، لیکن قدرت کو آپ سے اس سے زیادہ اہم کام لینا تھا اس لیے پیشۂ طبابت کے اختیار کرنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد انجمن اسلامیہ گورکھپور میں ایک ایسے باصلاحیت ذی استعداد استاذ کی ضرورت پیش آگئی جو تدریسی خدمات کے ساتھ فرائض صدارت کو بھی بخوبی انجام دے سکے، چونکہ مولانا قدسی تعلیم میں مہارت کے ساتھ انتظامی صلاحیت کے بھی حامل تھے اسی لیے چشم انتخاب آپ ہی پر پڑی اور آپ اربابِ انجمن کی دعوت وطلب پر طبابت کے مشغلہ کو چھوڑ کر گورکھپور چلے گئے اور تقریباً بیس برس تک نہایت کامیابی اور خوش اسلوبی سے تعلیمی وانتظامی امور کو انجام دیتے رہے، اس کے بعد بنارس کے احباب نے مدرسہ مطلع العلوم کمن گڈھا میں باصرار طلب کیا، مولانا احباب کے تقاضوں کو رد نہ کر سکے اور گورکھپور سے بنارس چلے آئے اور یہاں بھی ایک مدت تک صدر مدرسی کے فرائض انجام دیتے رہے۔

مولانا قدسی کو تعلیمی وتدریسی صلاحیت کے ساتھ تصنیف وتالیف میں بھی ملکہ حاصل تھا، مگر کثرتِ درس کی وجہ سے اس کی جانب زیادہ توجہ نہ کر سکے، آپ کی تصنیفی یادگار میں ''تجارِ عراق-عراقی تاجروں کی تاریخ'' کے موضوع پر بڑی اہم اور تحقیقی کتاب ہے جو زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر اہلِ علم سے دادِ تحسین لے چکی ہے، اس کے علاوہ آپ نے الفروق کے نام سے ایک عربی لغت تقریباً ۴۵۰ صفحات پر مرتب کی جس میں قرآن وحدیث کے ان الفاظ کے معانی بیان کیے گئے ہیں جو الفاظ کے اعتبار سے تو متحد ومتفق ہیں لیکن ان کے معانی مختلف ہیں، مولانا نے اس کتاب کو بڑی محنت اور کاوش سے جمع کیا ہے اور لغت کی سیکڑوں کتابوں سے استفادہ کیا، حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مولانا کا ایک ایسا علمی شاہکار ہے جس کی مثال دورِ حاضر میں تلاش کرنا بے سود ہے، کتاب کے مطالعہ سے مولانا کی علم لغت میں وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے، یہ علمی ذخیرہ ابھی تک طبع نہیں ہو سکا ہے، کاش کہ مولانا کے ورثاء

اس کی طرف توجہ کرتے تاکہ اہل علم کو اس جوہرِ بے بہا سے استفادہ کا موقع ملتا۔

قدسی مرحوم ایک اچھے شاعر بھی تھے غزلیں بڑی مرصّع اور شستہ زبان میں لکھتے تھے آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے راقم نے قدسیؔ مرحوم کو مدرسہ مطلع العلوم کے جلسۂ دستار بندی میں دیکھا تھا اس وقت مولانا بڑھاپے کی آخری منزل میں تھے، جسمانی اور دماغی توانائیاں تقریباً ختم ہوچکی تھیں، اس کے باوجود جس موضوع پر گفتگو کرتے بڑی مدلّل اور واضح کرتے، شام کے کھانے کے بعد شعروادب کی بات چل پڑی، مولانا نے اس ذیل میں اپنا ایک واقعہ سنایا کہ میں ایک مرتبہ کلکتہ میں مقیم تھا وہاں ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا اور دوستوں کے اصرار پر میں بھی گیا، مشاعرہ طرحی تھا اور مصرع طرح

''کیوں ٹھیس لگے پیمانے کو، کیوں بات بڑھے میخانے میں''

تھا، میں نے پہلے سے کوئی غزل کہی نہیں تھی، وقت پر دوستوں نے مجھ سے بھی شعر سنانے کی فرمائش کی، اسی وقت پانچ سات شعر پر مشتمل ایک غزل کہہ ڈالی اور اسٹیج پر پہنچ کر پڑھنی شروع کی اور جب مصرع طرح کے بند پر پہونچا تو داد وتحسین سے پورا ہال گونج اٹھا، مجمع فرطِ عقیدت میں میری طرف بڑھنے لگا، یہ دیکھتے ہی میں اسٹیج سے اتر کر کار میں سوار ہوکر مشاعرہ گاہ سے بھاگ آیا۔

آپ نے بڑی طویل عمر پائی، آخر میں دماغی توازن کبھی کبھی درست نہیں رہتا تھا، امراض کی بھی کثرت تھی، اس لیے عموماً گھر ہی پر پڑے رہتے تھے، اسی حالت میں ۸؍جنوری ۱۹۶۲ء مطابق ۱۳۸۲ھ میں بعد نماز مغرب اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔

=================

﴿ظ﴾

شمس العلماء حضرت مولانا ظفر حسن عینی مبارک پوریؒ

حضرت مولانا ظفر حسن بن شیخ نجیب اللہ بن شیخ احمد علی بن شیخ محمد مکرم بن شیخ محمد اعظم بن شیخ لطف اللہ بن شیخ مخدوم رشید بن مخدوم سعید بن مخدوم مشید بن شیخ بڑے بن شیخ محمد

فاروقی مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ تیرہویں صدی کے نصف آخر میں محلہ رانی پورہ مبارکپور میں پیدا ہوئے، شیخ محمد بن شیخ خضر فاروقی جون پوری کی اولاد سے تھے جن کا خاندان سلطان ابراہیم شاہ شرقی متوفی ۸۴۴ھ کے عہد میں ولید پور بھیرا اور لہراوغیرہ میں جاگیردار ہوا اور بعد میں بھیرا میں مستقل بودوباش اختیار کرلی، ملا محمود بھیروی جون پوری متوفی ۱۰۶۲ھ صاحب شمس بازغہ شیخ بڑے کے پوتے تھے۔

مولانا ظفر حسنؒ کے آباء واجداد میں شیخ مخدوم رشید نے مبارک پور میں اقامت اختیار کرلی تھی، یہیں مولانا کی پیدائش ہوئی تھی، مولانا عینی نے تعلیم کہاں پائی، کن کن اساتذہ سے پڑھا، تلاشِ بسیار کے باوجود معلوم نہ ہوسکا، البتہ بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مولانا محمد فاروق چریاکوٹی اور علامہ شبلی نعمانی سے تعلیم حاصل کرکے دارالعلوم دیوبند سے استفادہ کیا تھا، خاندانی رئیس اور زمیندار ہونے کے ساتھ زبردست عالم اور ذہانت وذکاوت میں بے مثل تھے، حکومت کی طرف سے ان کو شمس العلماء کا خطاب ملا تھا، اچھے شاعر تھے اور عینی تخلص کرتے تھے، مجموعۂ کلام کا قلمی نسخہ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے جس میں اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے اشعار ہیں جو زیادہ تر نعت اور منقبت سے متعلق ہیں۔ مولانا ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے، کتابوں کے بڑے شوقین تھے، ان کا کتب خانہ نہایت شاندار اور نوادرات پر مشتمل تھا، انتقال کے بعد ان کے بھائی مولوی ولی الحسن مرحوم نے اس کو مدرسہ احیاء العلوم پر وقف کردیا، مولانا عینی کی کسی مستقل تصنیف کا پتہ نہ چل سکا، البتہ ان کا مرتب کردہ خاندانی شجرۂ نسب ان کی علمی یادگار ہے نیز مولانا احمد حسین رسول پوری کی کتاب سبیل الآخرۃ طبع اول پر ان کی ایک تقریظ موجود ہے اور مجموعہ اشعار قلمی بیاض کی شکل میں ہے، مولانا کی وفات مبارک پور میں ۱۳۴۷ھ میں مطابق ۱۹۲۸ء میں ہوئی اور جامع مسجد راجہ مبارک شاہ کے جانب شمال والے احاطے میں دفن کیے گئے جو ان کا آبائی قبرستان ہے۔ (تذکرہ علمائے مبارک پور ص ۲۰۷)

=================

ع

مولانا قاضی عاشق نورمحی الدین عباسی چریاکوٹیؒ

مولانا قاضی عاشق نور، مخدوم زادہ ابوالجلال اسماعیل متوفی ۸۲۲ھ مورث اعلیٰ علمائے چریاکوٹ کے بڑے صاحبزادے تھے، جملہ علوم وفنون اور فروع واصول میں یدطولیٰ رکھتے تھے، جودت ذہن اور دقتِ رائے میں آپ اپنی نظیر تھے، دور دور سے لوگ آپ کے گلستان علم وفن کی خوشہ چینی کے لیے حاضر ہوتے اور دامن بھر کر لے جاتے تھے، اکثر فنون میں ان کی متعدد تصانیف تھیں جو دست برد زمانہ کا شکار ہوگئیں، چریاکوٹ میں قضاء کے عہدہ پر فائز تھے، موضع نور پورا اپنے نام سے آباد کیا، اپنے والد شیخ اسماعیل کی وفات کے بارہ سال بعد ۸۳۴ھ میں وفات پائی۔ ''نورافزائے جنت'' مادۂ تاریخ ہے۔

(اسلام اور عصرِ جدید جولائی ۷۳ ۱۳ھ بحوالہ یادداشت چریاکوٹ)

مولانا عبدالاحدؒ منجیرپٹی

استاذ العلماء مولانا عبدالاحد بن شیخ توجہ حسین بن شیخ کرم حسین یکے از بانیانِ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ ۴/ اگست ۱۹۶۳ء (۱۲۸۰ھ) میں موضع منجیرپٹی ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے۔ موضع منجیر پٹی قصبہ سرائے میر سے ۴ میل کے فاصلے پر جانب شمال واقع ہے۔ یہی تاریخ ولادت مولانا کے صاحبزادہ نے بیان کی ہے، مگر بندہ کو اس کی صحت میں تردد ہے، واللہ اعلم۔

مولانا عبدالاحد نے خاندانی روایت کے مطابق پہلے قرآن کی تعلیم حاصل کی حفظ قرآن سے فراغت کے بعد حضرت مولانا محمد شفیع ساکن سیدھا سلطان پور سے اردو فارسی کی تعلیم پائی، مولانا محمد شفیع اس وقت موضع بڈہریا موطن علامہ اقبال سہیلؔ میں تدریسی خدمت انجام دے رہے تھے، ابتدائی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد مدینۃ العلم شہر جونپور کا علمی سفر کیا اور وہاں مولانا محمد اسماعیل صاحب سے محلہ اکرم پور میں عربی کی متوسطات تک تعلیم حاصل کی اور پھر اپنے چچا شیخ علی بخش مرحوم کے ہمراہ سفر حج کا قصد کیا اور زیارتِ حرمین شریفین سے

مشرف ہوئے، حج سے واپسی کے بعد پھر سے تعلیمی سلسلہ شروع کیا اور دیوبند جا کر بقیہ نصابِ درس کو پورا کیا اور سند فراغت لے کر وطن واپس آئے، تعلیم و تحصیل سے فراغ کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ شروع کیا اور مدرسہ صدیقیہ جامع الشرق (بڑی مسجد) شہر جونپور میں تدریسی خدمت پر مامور ہوئے، کچھ دنوں تک وہاں کام کرنے کے بعد بعض اختلاف کی وجہ سے مدرسہ سے الگ ہو کر گھر چلے آئے ان کے ساتھ بہت سے طلبہ بھی آئے جنھیں گھر ہی پر درس دیتے رہے، کچھ دنوں کے بعد طلبہ کا رجوع اس قدر بڑھا کہ مکان پر ان کے قیام وطعام کا نظم مشکل ہو گیا، اسی زمانے میں اطراف و جوانب کے بعض اہل خیر وصلاح نے معاشرتی اصلاح کی غرض سے ایک انجمن کی تشکیل کی اور انجمن کا نام اصلاح المسلمین تجویز کیا گیا، آگے چل کر اسی انجمن کی زیر نگرانی ۱۹۰۸ء میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کا قیام عمل میں آیا، مدرسہ کا سنگ بنیاد مولانا سیّد اصغر حسین محدث دیوبندی کے دستِ مبارک سے رکھا گیا، حضرت مولانا سیّد اصغر حسین صاحب اس وقت مسجد اٹالہ شہر جونپور میں مسند آرائے درس وافادہ تھے۔

مدرسہ کے مدرس اوّل مولانا عبدالاحد صاحب اور ناظم مولانا محمد شفیع صاحب منتخب ہوئے، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ اور مولانا شبلی نندانویؒ بھی مدرسہ کے نظم ونسق میں دخیل تھے، لیکن مولانا شبلی بمھوری جب مدرس ہو کر آئے تو باہم اساتذہ میں اختلاف پیدا ہو گیا، جس کی وجہ سے مولانا عبدالاحد نے مدرسۃ الاصلاح کو چھوڑ دیا اور جون پور مسجد اٹالہ میں چلے گئے؛ لیکن کچھ دنوں کے بعد اراکین مدرسہ نے پھر آپ کو باصرار مدرسۃ الاصلاح پر بلایا، چنانچہ ان کی طلب پر مولانا پھر اصلاح میں تشریف لائے اور تادمِ حیات مدرسہ کی خدمت میں مصروف رہے اور یہیں بیمار ہو کر گھر تشریف لائے اور دس بارہ یوم بیمار رہ کر ۱۲/ اکتوبر ۱۹۲۸ء (۱۳۴۷ھ) میں وفات پائی، مولانا کے تلامذہ کی تعداد بڑی کثیر ہے جن میں مولانا امین احسن اصلاحی مقیم پاکستان، مولانا نجم الدین اصلاحی مرتب مکتوبات شیخ الاسلام اور مولانا بشیر احمد بھٹا خاص شہرت کے مالک ہیں۔

(بروایت مولانا قمر الدین صاحب صاحبزادہ مولانا مرحوم)

مولانا عبدالحئی مبارک پوریؒ

مولانا عبدالحئی بن مولانا محمد ہارون بن حافظ عبداللطیف بن میانجی فتح محمد ۱۳۲۱ھ میں پیدا ہوئے، تاریخی نام غفران ہے، بعد میں اس کو شاعری کا تخلص قرار دیا، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر کے قصبہ کے بعض مدرسوں میں پڑھا اس کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) گئے، اس زمانے میں یہ مدرسہ اربابِ علم وفضل کا مرکز تھا۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا حافظ عبدالرحمٰن (۱) امروہی جیسے فضلاء روزگار سے مولانا نے تعلیم حاصل کر کے سند تکمیل وفراغت پائی، تکمیل تعلیم کے بعد درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا، کوٹواری ضلع بلیا کے ایک مدرسہ میں کئی سال تک مدرس رہے، اردو شاعری کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے، بڑے صالح اور نیک عالم تھے، افسوس کہ جوانی ہی کے عالم میں ۲۵؍ذوالحجہ ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۹۴۶ء مغرب وعشاء کے درمیان مبارکپور میں فوت ہوئے اور روضہ کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ (تذکرہ علمائے مبارک پور ص ۲۸۱)

حضرت مولانا عبدالحئی چشتیؒ

حضرت مولانا عبدالحئی چشتی بن مولوی محمد رفیع خاں بن اسعد علی خاں اس دیار کے زمرہ علماء میں گل سرسبد تھے، مولانا اپنے علم وفضل، زہد وورع اور اخلاق وفضائل کے اعتبار سے اپنے معاصرین میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے، آپ کی ولادت ۵ ۱۳۴ھ مطابق اپریل ۱۹۲۶ء میں انجان شہید میں ہوئی جو شہر اعظم گڈھ سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر

(۱) مولانا حافظ عبدالرحمٰن امروہی بمبئی میں پیدا ہوئے، مکہ معظمہ اور دیوبند میں پڑھا، آپ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے آخری شاگرد ہیں، حضرت نانوتوی سے سنن ترمذی پڑھی تھی، بقیہ کتابیں حضرت گنگوہی قدس سرہ اور مولانا احمد حسن محدث امروہی سے پڑھیں، جامعہ قاسمیہ مرادآباد، مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں آپ نے تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دیں، آپ کی تصنیفات میں حاشیہ تفسیر بیضاوی، حاشیہ مطول، حاشیہ مختصر بہت مشہور ہیں۔ حضرت حاجی امداداللہ قدس سرہ سے خلافت واجازت بھی حاصل تھی، ۲۳؍جمادی الاخریٰ ۱۳۶۷ھ میں امروہہ میں آپ کی وفات ہوئی اور اپنے شیخ علامہ احمد حسن امروہی کے جوار میں دفن کیے گئے۔

جانب شمال مشرق واقع ہے۔

مولانا چشتی کی ابتدائی تعلیم موضع خالص پور ضلع اعظم گڈھ کے اسلامیہ اسکول میں ہوئی جہاں آپ کے والد مولوی محمد رفیع صاحب ہیڈ مدرس کی حیثیت سے تعلیمی خدمات انجام دے رہے تھے، چار سال یہاں زیر تعلیم رہ کر ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۴۶ء میں جب آپ کے والد کا تبادلہ انجان شہید ہو گیا تو یہ بھی ان کے ہمراہ انجان شہید کے اسکول میں آ گئے اور یہیں سے ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۸ء میں درجہ پنجم پرائمری کا امتحان پاس کیا چونکہ یہاں اس وقت اس سے زیادہ تعلیم کا نظم نہیں تھا اس لیے قریب کے قصبہ جین پور کے مڈل اسکول میں داخلہ لیا، اس وقت یہ اسکول مولوی ممتاز احمد خاں کی علمی سرگرمیوں کی وجہ سے بڑی شہرت کا حامل تھا، مولوی ممتاز احمد خاں اس دیار کے مشہور ماہر تعلیم اور نہایت باصلاحیت استاذ تھے، مولانا انھیں کی نگرانی میں تعلیم حاصل کرنے لگے، چونکہ فطرتاً نہایت ذہین وطباع واقع ہوئے تھے اس وجہ سے مولوی ممتاز خاں نے پوری توجہ اور نہایت سرگرمی کے ساتھ انھیں تعلیم دی دو سال کے بعد یہاں سے اپنے نانیہال موضع بلریا گنج ضلع اعظم گڈھ کے مڈل اسکول میں چلے آئے اور یہیں مڈل کی تعلیم مکمل کر کے امتحان دیا۔

مڈل تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اب دو راستے تھے یا تو عربی کی تعلیم وتحصیل شروع کریں یا انگریزی کی لائن اختیار کریں، مولانا کے والد ماجد ایک تجربہ کار مدرس تھے اس لیے اوپر کی تعلیم کے لیے مولانا کی مرضی کا معلوم کر لینا ضروری سمجھا، کیونکہ حصول علم میں قلبی رجحان کا بہت دخل ہے، اس کے بغیر صحیح معنوں میں تعلیم حاصل کرنا نہایت دشوار اور عموماً غیر نفع بخش ہوتا ہے، چنانچہ والد ماجد نے مولانا کا عندیہ معلوم کیا تو آپ نے عربی تعلیم حاصل کرنے کا خیال ظاہر کیا، حالانکہ گاؤں اور گھر کا ماحول انگریزی تھا، لوگ انگریزی پڑھ پڑھ کر اعلیٰ عہدے حاصل کر رہے تھے، مگر مولانا چشتی نے اپنے فطری دینی رجحان کی بنا پر دنیاوی مناصب ومراتب کے مقابلہ میں آخرت میں کام آنے والے علم کو ترجیح دی، آپ کے والد محترم نے جو خود بھی نہایت متدین اور شب زندہ دار بزرگ ہیں ان کی خواہش کے مطابق ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹۴۳ء میں عربی پڑھنے کے لیے جامع العلوم جین پور میں داخل

کردیا، اس وقت اس مدرسہ میں مولانا افضال الحق قاسمی اور مولانا محمد کامل انجان شہیدی تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، چونکہ عربی کی تعلیم مولانا کے رجحان کے عین مطابق تھی اس لیے بڑی جانفشانی اور نہایت محنت وتوجہ سے اس میں لگ گئے، مدرسہ کے علاوہ گھر پر بھی مولوی صدرالدین بیگ ندوی سے استفادہ کرتے رہتے تھے اس طرح سے تین سال کی مدت میں صرف، نحو، ادب، فقہ اور منطق وغیرہ کی معتد بہ تعلیم حاصل کرکے ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۹۴۵ء میں حضرت مولانا ابوالوفا، شاہجہاں پوری کی ترغیب وتشویق پر مدرسہ قاسمیہ شاہی مسجد مرادآباد میں داخل ہوگئے، مدرسہ شاہی کا یہ عہد، عہد زریں تھا، مولانا عبدالحق مدنی اور مولانا سیّد محمد میاں دیوبندی (۱) جیسے باکمال اساتذہ کی علمی سرگرمیوں سے مدرسہ قاسمیہ دارالعلوم ثانی بنا ہوا تھا، مولانا چشتی مرحوم نے انھیں نادرۂ روزگار اساتذہ سے متوسطات کی تعلیم وتحصیل کی مولانا عبدالحق مدنی، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے شیدائی اور عاشق تھے، درس کے علاوہ اپنی نجی مجلسوں میں حضرت شیخ الاسلام کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز میں کیا کرتے تھے، مولانا چشتی کو حضرت شیخ الاسلام سے یک گونہ تعلق خاطر پہلے سے تھا، لیکن مولانا عبدالحق مدنی کی صحبتوں نے اس تعلق کو عشق میں تبدیل کردیا، ان کے لیے

---

(۱) حضرت مولانا سیّد محمد میاں کی ولادت ۱۳۲۱ھ میں دیوبند میں ہوئی، ابتداء سے انتہاء تک دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرکے ۱۳۴۳ھ میں سند فراغ حاصل کی دورۂ حدیث حضرت علامہ انورشاہ کشمیری سے پڑھا، فراغت کے بعد پہلے مدرسہ عربیہ شاہ آباد میں پھر مدرسہ شاہی مرادآباد میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی، ساتھ ہی سیاسی تحریکوں میں پوری سرگرمی سے حصہ لیتے تھے، چنانچہ ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑو کی تحریک میں حضرت شیخ الاسلامؒ اور مجاہد ملتؒ کے ساتھ انھیں بھی گرفتار کیا گیا اور مجاہد ملت کے ساتھ بریلی جیل میں دو سال قید وبند کی مشقت برداشت کی، تقریباً ۳۸ برس تک جمعیۃ علماء ہند کی نظامت کے فرائض انجام دیے اور مرتے دم تک اپنے شیخ ومرشد حضرت شیخ الاسلامؒ کی منشاء کے مطابق جمعیۃ سے منسلک رہ کر بے لوث خدمات انجام دیتے رہے، مولانا دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن اور مدرسہ شاہی مرادآباد کے مہتمم اور ۱۳۸۴ھ سے مدرسہ امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث، صدر مفتی اور جمعیۃ علماء کے ادارۂ مباحث فقہیہ کے ذمہ دار اعلیٰ تھے، ان سیاسی اور دینی خدمات کے ساتھ مولانا کثیر التصانیف مصنف بھی تھے، آپ کی زودنویسی اور تصنیف وتالیف میں انہماک کو دیکھ کر حضرت شیخ الاسلام مزاحاً آپ کو حیوان کاتب کہا کرتے تھے، ۱۶ر شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۳ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کو ساڑھے ۶ بجے شام کو آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

حضرت شیخ سے مفارقت شاق گذرنے لگی چنانچہ عین ہنگامہ آزادی میں جبکہ سفر کا دوسرا نام موت تھا وہ بھی مغربی یوپی کا سفر جس کے قصبے قصبے اور قریے قریے میں فسادات کا لاوا پھوٹ رہا تھا پوری پوری ٹرینوں کو لوٹ لینا اور مسلمان مسافروں کو شہید کر دینا ایک معمولی کھیل تھا، عین اسی قیامت خیز حالات میں ۱۳۶۷ھ مطابق اگست ۱۹۴۷ء میں دیوبند کا قصد کرلیا اور حضرت شیخ الاسلام کے درِ دولت پر پہونچ گئے اور مدرسہ میں داخلہ لے کر تعلیم شروع کردی، اس وقت دارالعلوم کے اساتذہ میں حضرت شیخ الاسلام کے علاوہ حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی، حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا عبدالخالق ملتانی، مولانا عبدالجلیل دیوبندی اور مولانا محمد بشیر خاں وغیرہ اپنے علم وفضل اور تدین وتقویٰ کے اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے مولانا چشتی نے انھیں اساتذہ کی خدمت میں جملہ علوم مروجہ کی تحصیل وتکمیل کی اور حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ سے ترمذی وبخاری پڑھ کر ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۰ء میں فراغت حاصل کی۔

مولانا مرحوم کو اپنی فطری ذہانت وفطانت کی بنا پر منطق وفلسفہ سے بیحد مناسبت تھی اس لیے فراغت کے بعد ایک سال مزید دارالعلوم میں رہ کر معقولات میں تخصص کیا، منطق وفلسفہ کے ساتھ اسی طبعی رجحان کی وجہ سے حضرت علامہ بلیاوی سے بھی جو اپنے وقت کے معقولات کے امام تھے آپ کو کافی لگاؤ تھا اور آخر تک ان کے بڑے مداح وگرویدہ رہے، فرماتے تھے کہ حضرت علامہ بلیاوی کا سینہ اپنے اکابر کے علوم کا گنجینہ ہے، اپنے اکابر کے علوم ومسلک اور ان کی کتابوں کی تشریح جتنے عمدہ طریقے سے وہ کرسکتے ہیں شاید ہی کوئی دوسرا کرسکے۔

مدرسہ قاسمیہ مرادآباد کے قیام کے دوران تقریر وتحریر کی مشق بھی شروع کردی تھی دارالعلوم میں اس کے لیے بڑا سازگار ماحول ملا اور آپ تعلیم وتحصیل ہی کے زمانہ میں اچھے خاصے خطیب ومقرر بن گئے اور ہر طرح کے موضوع پر فی البدیہہ ایسی مبسوط ومدلل تقریر کرنے لگے تھے کہ سننے والے یہ سمجھتے تھے کہ آپ اس موضوع پر مکمل تیاری کر کے آئے ہیں۔ البتہ لکھنے کا اتفاق کم پڑا تھا، لیکن جب کبھی لکھتے تھے تو اتنا عمدہ لکھتے تھے کہ کہنہ مشقی کا

گمان ہوتا تھا، ان خداداد صلاحیتوں کی بنا پر طلبۂ دار العلوم میں آپ نے بہت جلد مقبولیت حاصل کرلی اور تھوڑے ہی عرصہ میں جمعیۃ الطلبہ کے صدر منتخب ہوگئے جس کی وجہ سے طلبہ کی سیاست میں بھی پوری سرگرمی سے حصہ لینے لگے، اسی سیاست میں ایک ایسا موڑ آیا جس نے مولانا کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مولانا چشتی مرحوم اپنی وسعت ظرفی اور بلند حوصلگی کی بنا پر یہ چاہتے تھے کہ مدنی دار المطالعہ جو طلبائے یوپی کا مخصوص علمی ادارہ تھا اسے طلبۂ دار العلوم کے لیے عام کردیا جائے تاکہ یوپی کے طلبہ کے علاوہ دوسرے صوبوں کے طالب علم بھی اس سے علمی استفادہ کرسکیں، مگر چشتی مرحوم کی اس خواہش پر طلبۂ یوپی نے سخت برہمی اور بیزاری کا اظہار کیا، مولانا چشتی اپنی تجویز کی اصابت اور درستگی کی بنا پر اس پر اڑ گئے، فریق مخالف نے جس کی اکثریت بھی تھی اس کی پوری قوت سے مخالفت کی، بالآخر اس معاملہ نے اتنا طول کھینچا کہ صورت حال نہایت نازک ہوگئی، حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کو جو ادارہ کے سرپرست تھے اطلاع ہوئی تو آپ نے ایک دن تمام طلبہ کو دار الحدیث میں جمع کرکے استصواب رائے کیا، چونکہ چشتی مرحوم کے حامی تعداد میں کم تھے اس لیے فیصلہ ان کے خلاف ہوا، فیصلہ کے بعد حضرت شیخ نے فرمایا: ''کون ہیں عبد الحئی؟ کھڑے ہوں!'' -مولانا عبد الحئی مرحوم کھڑے ہوگئے، حضرت شیخ نے ان سے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور خوب ڈانٹا پھٹکارا، یہ نگاہ نیچی کیے دم بخود کھڑے رہے، خدا جانے حضرت شیخ کی اس زجر و توبیخ میں کیا تاثیر تھی کہ مولانا عبد الحئی کا دل اسی دم طلبہ کی سیاست سے بالکل سرد پڑ گیا اور اسی وقت ان جھمیلوں سے کناہ کش ہونے کا فیصلہ کرلیا، چنانچہ اس واقعے کے فوراً بعد شیخ کے دولت کدہ پر حاضر ہوکر معافی کے خواستگار ہوئے، شیخ نے نہایت بشاشت اور خوشی سے انھیں معاف کردیا اور پند ونصائح کے ساتھ اپنے متبرک لباس سے بھی سرفراز فرمایا، اب مولانا عبد الحئی طلبہ کی سیاست سے الگ ہوکر عبادت وریاضت میں لگ گئے اور اتنا سخت مجاہدہ کیا کہ دو سال کے قلیل عرصہ میں اس مقام تک پہونچ گئے جہاں لوگ مدتوں کے بعد پہونچتے ہیں تا آنکہ ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۲ء میں ختم بخاری کے موقع پر اسی دار الحدیث میں جہاں آج سے دو سال قبل طلبہ کے مجمع میں

شیخ نے انھیں سخت زجر وتوبیخ کی تھی اوران سے اپنی سخت بیزاری کا اظہار کیا تھا آج اسی دارالحدیث میں علماء وطلبا کے کثیر مجمع میں شیخ نے ان کی خلافت کا اعلان فرمایا۔

اس سلسلہ میں جن حضرات کو شیخ کا معمول معلوم تھا انھیں نہایت حیرت ہوئی کیونکہ شیخ طویل مدت تک ریاضت ومجاہدہ کرانے کے بعد خلافت کے اعزاز سے نوازتے تھے، غالباً مولانا چشتی مرحوم حضرت شیخ کے وہ پہلے خلیفہ ہیں جنھیں اتنی قلیل مدت میں یہ عظیم دولت ملی، تمغۂ خلافت حاصل ہوجانے کے بعد بھی ایک سال تک حضرت شیخ کی خدمت میں رہ کر نہایت غور سے حضرت کے سفر وحضر کے معمولات، اتباع سنت، عبادت وریاضت اور طریقۂ نشست وبرخاست کا معائنہ کرتے رہے، جس کا اثر یہ ہوا کہ ان کی زندگی اپنے باکمال شیخ کے سانچے میں ڈھل گئی اور اکثر معاملات میں حضرت شیخ کے نمونہ نظر آنے لگے، حتی کہ حضرت کے بعض وہ تفردات جو محض استحبابی درجہ رکھتے تھے، مگر شیخ بعض وجوہ سے ان پر سختی سے عمل پیرا تھے، مثلاً مہر فاطمی کے بغیر نکاح نہ پڑھانا، صرف کھدر کے کفن کی صورت میں نماز جنازہ پڑھانا وغیرہ، مولانا چشتی بھی ان پر شدت کے ساتھ عامل تھے، اسی طرح عیدین وجمعہ کے خطبات اور نماز کی قرأت میں بھی انھیں کے لہجے کی اتباع کرتے تھے۔

حضرت شیخ کی طرح جماعتِ مودودی کے غلط افکار ونظریات پر بڑی سخت تنقید کرتے تھے اور اپنی تقریروں میں اس کے غلط نظریوں کی نہایت مدلل تردید کرتے تھے جس سے اس دیار کے عوام کو بڑا نفع ہوا اور اکثر لوگ اس کے بڑھتے ہوئے فتنہ سے محفوظ ہو گئے۔

علوم ظاہر وباطن میں تکمیل کے بعد مولانا نے تدریسی کام شروع کیا، سب سے پہلے ۱۳۷۴ھ مطابق ۱۹۵۴ء میں دارالعلوم اشرفیہ راندیر میں استاذ حدیث مقرر ہوئے، ایک سال یہاں حدیث کی تعلیم دے کر مدرسہ اسلامیہ عربیہ وساڑا (سوراسٹر) چلے گئے، ایک ہی سال بعد یہاں سے علاحدہ ہوکر ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۹۵۶ء میں دارالعلوم معینیہ اجمیر میں آگئے یہاں منتہی کتابوں کے درس کے ساتھ مثنوی مولانا روم کا عوامی درس بھی جاری کیا جو بہت کامیاب ہوا اور ایک بڑی جماعت کو اس سے فیض پہونچا۔ تین سال یہاں رہ کر

۱۳۷۸ھ مطابق ۱۹۵۸ء میں دار العلوم پنڈوہ، ضلع ہگلی کی صدارت تدریس پر فائز ہوئے، مولانا کا قیام اس درس گاہ میں ہر جگہ سے طویل رہا اور اس دیار میں آپ کی علمی، اصلاحی اور روحانی سرگرمیوں سے دین خالص کی خوب ترویج ہوئی اور بے شمار عوام جاہلی رسوم اور بدعات سے تائب ہوکر صراط مستقیم پر لگ گئے۔ ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۹۶۵ء میں ہگلی اور اس کے اطراف میں زبردست فرقہ وارانہ فساد ہوگیا اور وہاں کے حالات نے نہایت تشویشناک صورت اختیار کرلی تو ارباب مدرسہ کی اجازت سے مولانا گھر چلے آئے، ہنگامہ کے فرو ہوجانے کے بعد اہل مدرسہ نے آپ کو پھر بلایا اور تقریباً ایک سال تک مسلسل کوشش کرتے رہے، لیکن مولانا دوبارہ وہاں جانے پر راضی نہ ہوئے اور ارادہ کرلیا کہ درس وتدریس سے یکسو ہوکر عبادت وریاضت میں مشغول رہیں، لیکن ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۹۵۶ء میں حضرت مولانا سیّد اسعد مدنی کے حکم پر مدرسہ قرآنیہ ضلع گونڈہ میں بحیثیت مہتمم کے تشریف لے گئے اور دو سال کی قلیل مدت میں مدرسہ کو اپنے حسنِ انتظام سے اتنا آگے بڑھادیا کہ گونڈہ کے تمام مدارس پر اس کو فوقیت حاصل ہوگئی، یہاں کے قیام کے زمانہ میں حسب دستور مسجد چوڑیہاراں میں عوامی درس کا سلسلہ قائم فرمایا جس میں زبردست اجتماع ہوتا تھا، مولانا کا قیام گونڈہ میں دو سال سے زیادہ نہ رہ سکا اور اپنے والد ماجد کی پیرانہ سالی کی وجہ سے ۱۹۷۰ء میں گھر چلے آئے اور مستقل طور سے گھر ہی پر رہنے لگے، اسی زمانہ میں مسجد لال دروازہ شہر جون پور میں جامعہ حسینیہ کا قیام عمل مین آیا اور بانیانِ مدرسہ نے باصرار آپ کو اس کا مہتمم منتخب کیا، چنانچہ زندگی کی آخری سانس تک آپ اس کے مہتمم رہے اور گھر پر رہتے ہوئے اس کے حالات وکوائف سے پورے طور پر باخبر رہتے تھے ساتھ ہی گاہے بگاہے وہاں جاکر ہفتہ عشرہ کا قیام فرماتے اور تمام شعبہ جات کا معائنہ کرتے، مولانا کے اخلاص وللّٰہیت اور حسنِ انتظام کا یہ اثر ہوا کہ پانچ چھ سال کی مختصر مدت میں جو مدارس کی زندگی میں روز اوّل کی حیثیت رکھتی ہے جامعہ حسینیہ اس دیار کی قدیم وعظیم درس گاہوں کی فہرست میں شمار ہونے لگا؛ بلکہ ضلع جون پور کے تمام دینی مدرسوں سے اپنی ٹھوس تعلیم اور موثر تربیت کے لحاظ سے آگے نکل گیا۔

مولانا چشتی کو دینی مدارس کے قیام سے خاص شغف تھا، چنانچہ اپنے پدری وطن موضع انجان شہید میں دو بیگھ کے رقبہ میں ایک تعلیم گاہ کی بنیاد رکھی اور زمین خود اپنے والد سے حاصل کی اور مدرسہ کے جائے وقوع کا نام اپنے شیخ کے نام پر حسین آباد رکھا اور مدرسہ کے متصل قلندری مسجد کے نام سے پچاس ہزار کی لاگت سے ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی جو ابھی نامکمل ہے، ساتھ ہی مدنی دار المطالعہ کے نام سے ایک لائبریری بھی قائم کی جس میں بروقت پونے دو ہزار معیاری کتابیں جمع ہو چکی ہیں۔

خاص بات یہ ہے کہ مولانا چشتی مرحوم نے مدرسہ کی تعمیر کے لیے مقامی طور سے کسی سے چندہ نہیں لیا؛ بلکہ اپنی جیب خاص اور بیرونی احباب و متعلقین کے تعاون سے ایک لاکھ کی لق ودق عمارت کھڑی کردی، اس وقت اس مدرسہ میں تقریباً ساڑھے تین سو طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور مولانا کے معتمد خاص مولانا بشیر احمد صاحب نہایت محنت و سرگرمی سے تدریس کے ساتھ مدرسہ کا نظم و نسق بھی دیکھتے ہیں۔

اس مدرسہ کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی مولانا خاص طرز کی تعلیم گاہیں قائم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے جس کے لیے عملی تدبیریں بھی سوچتے رہتے تھے اور متعلقہ جگہوں کے بااثر لوگوں سے اس سلسلے میں بات چیت بھی کرتے رہتے تھے، مگر افسوس کہ دل کی یہ آرزو دل ہی میں رہ گئی اور پیغامِ اجل آپہونچا۔

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

مولانا ۲۳/ ذی قعدہ مطابق ۲۸/ نومبر کو جامعہ حسینیہ جون پور میں تشریف لائے یہاں سے ۲۷/ ذی قعدہ مطابق ۲/ دسمبر کو اپنی ذاتی ضرورت کے تحت بنارس آئے اور مولانا منہاج احمد لاری صدر جمعیۃ علماء یوپی کی دوکان واقع محلہ نخاس پر قیام فرمایا، یہیں شام کو ٹھنڈک کے ساتھ بخار آگیا، مولانا منہاج صاحب کے صاحبزادے ڈاکٹر شمیم احمد نے دوا دی جس سے دوسرے دن بخار کم ہو گیا اور مولانا روبصحت ہو گئے تیسرے دن پنجشنبہ کو حالت مزید بہتر رہی البتہ ضعف ونقاہت کا غیر معمولی اثر تھا، اگلے دن جمعہ کو بھی آرام ہی رہا، البتہ مولانا کے چہرے بشرے سے گھبراہٹ اور اضطراب کے آثار نمایاں

تھے جسے مولانا کی عادت وطبیعت پر محمول کیا گیا، لیکن چار بجے کے بعد حالت یکا یک دگرگوں ہوگئی اور ساڑھے چار بجتے بجتے یکم ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۷۵ء کو علم وعمل، اخلاص وللّٰہیت اور زہد وورع کا یہ پیکر ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گیا، اسی دن مدرسہ دینیہ غازی پور میں ایک دینی تقریب میں حضرت مولانا سیّد اسعد مدنی تشریف لائے ہوئے تھے، بنارس کے اکثر احباب غازی پور ہی تھے بذریعۂ فون اس اندوہناک خبر کی اطلاع دی گئی، مگر حضرت مولانا وہاں سے روانہ ہو چکے تھے اس لیے بنارس پہونچنے پر انھیں اور بقیہ لوگوں کو اس سانحہ کی خبر ہوئی تمام لوگ فرط غم سے حیرت زدہ ہو کر رہ گئے، اسی دن مولانا اسعد میاں کے حکم سے دس بجے شب میں بذریعۂ کار مولانا محمد ادریس سرائے میری، مولانا محمد مسلم بمھوری اور راقم میّت کو مرحوم کے آبائی وطن انجام شہید لے کر چلے تقریباً ایک بجے شب میں اس امانت گراں بہا کو اس کے ورثاء کے سپرد کیا، دوسرے دن شنبہ کو ۱۱ بجے حسین آباد میں قلندری مسجد کے متصل بجانب مغرب جنوب اس گنجینۂ علم وعمل کو دفن کر دیا گیا، نماز جنازہ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب سرائے میری نے پڑھائی، جنازہ میں عوام کے علاوہ علماء وصلحاء کا ایک عظیم اجتماع تھا، حضرت مولانا سیّد اسعد میاں بنارس سے ۵ دسمبر کی شب میں دہلی جانے والے تھے ٹکٹ پہلے سے بک تھا مگر تجہیز وتکفین میں شرکت کی غرض سے ٹکٹ واپس کر کے سفر ملتوی کر دیا۔ دوسرے دن ۶ دسمبر کو حافظ عبدالکبیر صاحب ناظم اعلیٰ جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس کی کار سے انجان شہید کے لیے روانہ بھی ہو گئے، مگر راہ میں بعض ایسی رکاوٹیں پیش آگئیں جس سے وقت پر پہونچ نہ سکے، تدفین کے تقریباً ایک گھنٹہ بعد پہونچے جس کا قلق حضرت مولانا کو بھی ہوا اور دوسرے سبھی احباب کو بھی۔

مولانا چشتی مرحوم اس دور کے علماء میں علم تصوف میں اپنی مثال آپ تھے، تصوف کے اہم سے اہم تر مسائل کو باتوں باتوں میں سمجھا دینا مولانا کا معمولی کام تھا، ادھر چند سالوں میں مجاہدہ وریاضت میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا تھا، اکثر قلندری مسجد میں تنہا مراقب رہا کرتے تھے، کتابوں کا مطالعہ بھی اسی وجہ سے بہت کم ہو گیا تھا، البتہ مثنوی مولانا روم، ہنس جواہر پدماوت، فصوص الحکم، الیواقیت والجواہر اور حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم

نانوتوی قدس سرہ کی تصنیفات کا مطالعہ جاری تھا، مولانا کے مطالعہ کا ایک خاص انداز تھا، تھوڑی دیر کتاب دیکھتے پھر غور وخوض میں ڈوب جاتے، کچھ دیر کے بعد کتاب کھول کر دیکھ لیتے اور پھر سوچنے لگتے عصر کی نماز کے بعد مغرب تک مسجد کے حجرہ میں نہ جانے کون سی ریاضت کرتے تھے کہ جب باہر نکلتے تو کڑاکے کی سردی میں بھی پسینے میں شرابور ہوتے، اس وقت عجیب جلال کا عالم ہوتا تھا کہ نگاہ ملانا دشوار ہوتا تھا، عموماً خلوت میں استغراقی کیفیت طاری رہتی اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ایسی پُر درد آواز میں الاّ اللہ کی ضرب لگاتے کہ سنتے ہی رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے۔

مولانا کے اندر تواضع اور اخفاء کی صفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اپنے چھوٹوں اور شاگردوں سے بھی اس طرح ملتے تھے کہ دیکھنے والے کو گمان ہوجاتا تھا کہ یہ بھی مولانا ہی کے درجہ کا کوئی شخص ہے، خلافت حاصل ہوجانے کے بعد کافی عرصہ تک خود بیعت کرنے سے کتراتے رہے، جب کوئی اس کی خواہش ظاہر کرتا تو دوسرے بزرگوں کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دے دیتے تھے، بالخصوص حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا اور حضرت مولانا اسعد میاں دامت برکاتہما کی طرف مراجعت کا حکم فرماتے تھے، آخر میں جب معتقدین کا اصرار بہت بڑھ گیا تو بیعت کا سلسلہ شروع کیا، مگر وہ بھی بڑے محدود پیمانے پر، ارادت مندوں کو اولاً اپنے معتمد خاص مولانا بشیر احمد صاحب کے سپرد کردیتے وہ جب ہر طرح سے اطمینان کر لیتے اور اس کی طلب صادق کو پرکھ لیتے تو بیعت کی سفارش کرتے، اس کے بعد مولانا بیعت کرتے، انھیں سختیوں کی وجہ سے مریدین کی تعداد سوسوا سو سے آگے نہ بڑھی اور مولانا بھیڑ کو پسند بھی نہ کرتے تھے۔

ان جملہ صفات کے ساتھ مولانا ایک اچھے مصنّف بھی تھے لیکن تصوّف کا غلبہ اس قدر ہوا کہ کچھ لکھنے کی نوبت نہ آسکی، متعلقین جب کبھی اس کی طرف توجہ دلاتے اور کچھ لکھنے پر اصرار کرتے تو یہ کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے کہ ہمارے اکابر کا پورا زور قابل اور لائق افراد تیار کرنے پر تھا پھر شمار کراتے کہ دیکھو فلاں فلاں حضرات کے فیض تربیت سے فلاں فلاں کیسے بزرگ تیار ہوئے، حالانکہ ان کی تصانیف بہت کم ہیں، البتہ اوائل میں وحدۃ الوجود

کے موضوع پر اسی نام سے ایک رسالہ تصنیف فرمایا تھا جو ماہنامہ معارف اعظم گڈھ میں ۱۹۶۰ء کے شماروں میں قسط وار شائع ہوا جس سے مولانا کی تصنیفی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔

(از مولانا بشیر احمد انجان شہیدی)

حضرت مولانا عبدالحئی مئویؒ

حضرت مولانا عبدالحئی بن سلامت اللہ محلہ بھکاری پورہ قصبہ مئو ضلع اعظم گڈھ کے باشندہ تھے، محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی اور مولانا عبداللطیف نعمانی کے رفقائے درس میں سے تھے، ملا فاضل کا امتحان دینے کے لیے ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۶ء میں ان تینوں حضرات نے ساتھ ہی اس کا کورس پڑھنا شروع کیا مگر چند دنوں کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ان لوگوں کا ساتھ چھوڑ کر مولانا عبدالغفار عراقی کے ساتھ گورکھپور چلے گئے پھر ۱۹۱۹ء مطابق ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم دیوبند میں تینوں حضرات کا ساتھ ہو گیا لیکن دو ڈھائی ماہ کے بعد مفارقت ہوگئی، دارالعلوم میں فصلی بیماری پھوٹ پڑی، اس کی زد میں مولانا عبدالحئی اور مولانا عبداللطیف بھی آگئے اور مجبوراً دیوبند سے محرم ۱۳۳۸ھ کے مہینہ میں گھر چلے آئے اور یہیں اپنی مادر علمی دارالعلوم مئو میں تعلیمی سلسلہ جاری رکھا پھر ۱۳۳۹ھ میں مینڈھو گئے، لیکن گذشتہ سالوں کے اعتبار سے اس سال کا تعلیمی معیار بہترین نہ تھا اس لیے اپنے رفیق مولانا عبداللطیف کے ہمراہ وہاں سے واپس چلے آئے اور ہر طرف سے یکسو ہو کر دارالعلوم مئو میں پڑھنے لگے، تا آنکہ ۱۳۴۱ھ میں مولانا کریم بخش سنبھلی سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی اور مولانا عبداللطیف نعمانی کے ساتھ دارالعلوم مئو سے فارغ ہوئے۔

فراغت کے بعد ۱۳۴۳ھ میں مدرسہ معروفیہ معروف پورہ ضلع اعظم گڈھ میں بحیثیت صدر مدرس کے آپ کا تقرر ہو گیا، یہاں ۱۳۵۵ھ تک مسلسل تیرہ سال آپ نے درس دیا، علمی استعداد اس قدر ٹھوس تھی کہ معلوم ہوتا کہ ہر فن کی کتابیں آپ کو ازبر ہیں۔

آپ کتاب پڑھا دینے اور رٹا دینے کے قائل نہ تھے؛ بلکہ بطور خود کتابوں کے حل کرنے کی استعداد طلبہ میں پیدا کر دیتے تھے، روزانہ پچھلا سبق سن کر آگے درس دیتے

تھے، سبق پڑھنے والے کے لیے لازم ہوتا کہ وہ سبق کی ہر غلطی کو خود درست کرے، جب تک عبارت کی غلطی درست نہ ہوجاتی سبق آگے نہ پڑھتا۔

شوال ۱۳۵۲ھ سے ۱۳۵۵ھ تک مدرسہ معروفیہ سے آپ کے زیر ادارت ایک معیاری ماہنامہ ''المعروف'' نکلتا رہا جس میں مولانا کا ایک اصلاحی مضمون بعنوان ''ناقص تربیت کا نتیجہ'' قسط وار شائع ہوا کرتا تھا۔

۱۳۵۵ھ میں مسلمانان پورہ معروف میں باہمی کشیدگی پیدا ہوگئی جس کے نتیجہ میں ۱۳۵۶ھ میں مدرسہ اشاعت العلوم پورہ معروف کا قیام عمل میں آیا، چنانچہ مولانا عبدالحیؒ مدرسہ معروفیہ سے علاحدہ ہوکر اشاعت العلوم میں چلے آئے اور سات برس اس مدرسہ میں تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دے کر ۱۳۶۳ھ میں دار فانی سے رحلت فرما گئے۔

مولانا ایک عمدہ خطاط بھی تھے، بالخصوص خط نسخ آپ کا نہایت پاکیزہ تھا، علمی صلاحیتوں کے ساتھ آپ ایک اچھے گھڑی ساز بھی تھے، خراب سے خراب گھڑی کو بنا کر چلا دینا آپ کے لیے کوئی اہم کام نہ تھا، آپ کے تلامذہ پورہ معروف اوراس کے اطراف میں بے شمار پھیلے ہوئے ہیں، جن میں مولانا عبدالجبار صاحب معروفی شیخ الحدیث مدرسہ شاہی مرادآباد، شیخ القراء مولوی قاری ظہیرالدین معروفی، مولانا محمد نذیر خیرآبادی اعظمی صدر مدرّس مدرسہ منبع العلوم خیرآباد، مولانا سلیمان صاحب شمسی خیرآبادی، مولانا عبدالمصطفیٰ گھوسوی نے علمی دنیا میں بڑی شہرت ومقبولیت حاصل کی۔

مولانا عبدالحق اعظمیؒ

مولانا عبدالحق شہر اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مقامی طور سے حاصل کرکے مدرسہ امینیہ دلی میں داخلہ لیا، وہاں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ (۱) اور

(۱) حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ بن عنایت اللہ بن فیض اللہ شاجہاں پوری اپنے زمانہ کے مشہور ومسلّم مفتی اور فقیہ تھے، ۱۲۹۲ھ میں شاجہاں پور میں آپ کی ولادت ہوئی، ابتدائی تعلیم مدرسہ اعزازیہ میں حاصل کی، پھر یہاں سے مدرسہ شاہی مرادآباد چلے آئے اور مولانا عبدالعلی میرٹھی، مولانا محمد حسن سہوانی اور مولانا محمود حسن سہوانی وغیرہ سے متوسطات تک کی تعلیم پائی، اس زمانہ میں گذراوقات کے لیے مولانا ٹوپی سل کر فروخت کرتے تھے اوراس سے جو کمائی ہوجاتی وہی =

دوسرے اساتذہ سے پڑھ کر فراغت حاصل کی، مولوی عبدالحق مفتی کفایت اللہ صاحب کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے، مفتی صاحب جب بھی اس دیار میں تشریف لاتے مولانا عبدالحق کے مکان پر ضرور آتے۔

مولانا عبدالحق نے اپنے اساتذہ کے نقشِ قدم پر تحریک آزادی میں بڑی جرأت و بیباکی اور سرگرمی سے حصہ لیا، ۱۳۳۸ھ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہ کا فتویٰ ترکِ موالات جسے جمعیۃ علماء ہند نے بعد میں متفقہ فتویٰ کی حیثیت سے پانچ سو علماء کے دستخط سے شائع کیا اس میں مولانا عبدالحق صاحب کا دستخط بھی ثبت تھا، چنانچہ اسی جرم میں گرفتار ہوئے اور چھ ماہ کی سزا ہوئی، فیض آباد جیل میں آپ کو رکھا گیا وہیں آپ ڈنگو بخار میں مبتلا ہوگئے، بیماری کی وجہ سے آپ کو رہائی مل گئی، لیکن مرض کو اس رہائی سے تسکین نہ ہوئی، بالآخر قیدِ حیات کی رہائی پر اس نے ساتھ چھوڑا، افسوس کہ اس مجاہد حریت کے تفصیلی حالات دستیاب نہ ہوسکے۔ (پروانہ چراغِ مزارِ خود ایم ما)

مولانا عبدالحق عباسی چریاکوٹیؒ

مولانا عبدالحق عباسی چریاکوٹی شیخ حمید عباسی کی اولاد میں مجمعِ کمالات تھے، مختلف

= گذر اوقات کے کام آتی، پھر ۱۳۱۲ھ میں دیوبند پہونچے اور یہاں مولانا منفعت علی دیوبندی، مولانا غلام رسول ہزاروی، مولانا خلیل احمد انبیٹھوی، مولانا عبدالعلی میرٹھی اور حضرت شیخ الہند قدس اسرارہم سے علوم وفنون اور حدیث کی تعلیم مکمل کرکے ۱۳۱۵ھ میں سند فراغت حاصل کی، بخاری حضرت شیخ الہند سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ فراغت کے بعد مدرسہ عین العلوم شاہجہاں پور میں پانچ سال تک تدریسی خدمت انجام دی ۱۳۲۱ھ میں مدرسہ امینیہ دہلی میں آئے اور تقریباً ۳۴ سال تک مسلسل مدرسہ امینیہ میں تدریسی خدمت کے ساتھ نظامت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے، تعلیمی تدریسی خدمات کے ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں بھی پورے طور سے حصہ لیتے تھے، جمعیۃ علماء ہند کے پہلے صدر آپ ہی منتخب ہوئے اور بیس سال تک اس عہدہ پر فائز رہے، کانگریس کی تحریکوں میں بھی نمایاں حصہ لیا اور کئی بار جیل گئے، مولانا درس وافتاء کے لحاظ سے تصنیف وتالیف کی جانب توجہ نہ کرسکے۔ آپ کی تصنیف میں تعلیم الاسلام چہار حصے بہت مقبول ہوئی، فتاویٰ کا مجموعہ آپ کے صاحبزادے مولانا واصف صاحب کفایت المفتی کے نام سے مرتب کرکے شائع کررہے ہیں، اب تک ۵ جلدیں شائع ہوچکی ہیں، کل نو جلدوں میں مکمل ہوگا۔ ۱۳/ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ میں دہلی میں آپ کا انتقال ہوا اور قطب الدین بختیار کاکی کے مقبرے کے سامنے دفن ہوئے۔

علوم میں متعدد کتابیں تصنیف کیں، کچھ عرصہ اردوئے معلّٰی شاہجہانی میں احتساب کی خدمت پر مامور رہے، معاصر علماء کی ریشہ دوانیوں کے سبب سعد اللہ خاں وزیر سے ناچاقی ہوگئی، تو ترک خدمت کر کے وطن چلے آئے، یہاں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، قدماء کی کتابوں پر حاشئے لکھے، خود بھی متعدد کتابیں تصنیف کیں، شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے طلبی کے لیے دستِ خاص سے فرمان لکھا، مولانا عبدالحق کبرسنی کی وجہ سے خود نہ جاسکے، اپنے صاحبزادے مفتی محمد یحییٰ کو بھیج دیا جنھیں قضا کی خدمت تفویض ہوئی اور موضع بھیکن پور مدد معاش کے طور پر عطا ہوا، جہاں انھوں نے چک مفتی محمد یحییٰ آباد کیا۔ (اسلام اور عصر جدید جولائی ۱۹۷۳ء)

مولانا عبدالحق املویؒ

حضرت مولانا ابومحمد عبدالحق بن شیخ جہانگیر غازی املوی مترجم تلبیس ابلیس اعظم گڈھی کے نام ونسبت سے اہلِ علم میں مشہور ہیں، ان کے والد شیخ جہانگیر حضرت سیّد احمد شہید بریلوی قدس سرّہ کی تحریک جہاد کے سرگرم غازیوں میں تھے۔

افسوس کہ مولانا عبدالحق کے حالات زندگی معلوم نہ ہوسکے، صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ مولانا سیّد میاں نذیر حسین دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور فراغت کے بعد مدرسہ میاں صاحب واقع پھاٹک حبش خاں میں تعلیمی خدمت انجام دی اور وہیں انتقال کیا، کسی بات پر گھر سے خفا ہو کر چلے گئے تو پھر واپس نہیں آئے۔

مولانا مسلک کے اعتبار سے اہلحدیث تھے اور نہایت ذی علم اور نیک نفس عالم اور علمی تبحر اور حدیث وفقہ میں وسعت نظر کے مالک تھے، فتاویٰ نذیریہ میں ان کے بہت سے فتاویٰ درج ہیں اور بہت سے فتاویٰ پر دستخط ہیں، فتاویٰ نذیریہ میں عام طور سے تین عبدالحق کے نام ملتے ہیں: (۱) ابومحمد عبدالحق لودیانی (۲) محمد عبدالحق ملتانی (۳) اور ابومحمد عبدالحق اعظم گڈھی، یہی مولانا عبدالحق املوی ہیں جن کے بہت سے مستقل فتاویٰ اس کتاب میں درج ہیں اور ان کے آخر میں حررہ محمد عبدالحق اعظم گڈھی عفی عنہ لکھا ہے، کہیں صرف عبدالحق اور کہیں محمد عبدالحق اور کہیں ابومحمد عبدالحق ہے، اس طرح کے فتاویٰ جلد اوّل

کے صفحات ص ۴۴۶، ۴۵۵، ۵۰۵ اور جلد ثانی کے ص ۹۹، ۱۹۳، ۱۹۷، ۲۰۱، ۲۵۵، ۲۹۷، ۳۹۱ وغیرہ پر موجود ہیں، جلد اوّل کے ص ۳۱۶ پر فقیر محمد عبدالحق ۱۲۹۵ھ درج ہے، اگر ان کے فتاویٰ یکجا کیے جائیں تو مستقل تصنیف ہو جائے۔

مولانا کی تصنیفی یادگار میں امام ابن جوزی متوفی ۵۵۷ھ کی شہرہ آفاق کتاب تلبیس ابلیس کا ترجمہ اسی نام سے ہے جو دوبار چھپ چکا ہے، مولانا عبدالحق نے اس کتاب کی ابتداء میں دس صفحات میں امام جوزی کے حالات نہایت سلیقہ مندی سے جمع کیے ہیں اور اس کے آخر میں لکھا ہے کہ آپ کے حالات زندگی پندرہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ طبقات ابن رجب میں مذکور ہیں جن میں بڑے بڑے علمی معرکوں کا بیان ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو سوانح نگاری کا بھی خاص ذوق تھا، یہ کتاب پونے سات سو صفحے میں چھپی ہے، ترجمہ کی زبان نہایت صاف اور سلیس ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو عربی زبان کے غوامض کو واضح طور سے بیان کرنے میں بڑی قدرت حاصل تھی، مولانا سیّد نذیر حسین دہلوی کے مبارک پوری تلامذہ میں سب سے قدیم الوفات ہیں۔

(علمائے مبارک پور ص ۲۰۹، ۲۱۰)

حضرت مولانا عبدالرحمٰن محدّث مبارک پوریؒ

مولانا، محدّث، فقیہ، مفتی، حکیم ابوالعلیٰ عبدالرحمٰن بن عبدالرحیم بن شیخ حاجی بہادر رحمہ اللہ کی ذاتِ گرامی پورے عالم اسلام کے دینی اور علمی حلقوں میں مشہور ومتعارف ہے ہمارے تعارف کی مطلق محتاج نہیں ہے، تحفۃ الاحوذی، شرح جامع ترمذی آپ کی وہ شہرہ آفاق اور مقبول کتاب ہے جو محدثین کی تصانیف کی ہمسری کرتی ہے، فی الجملہ آپ کے حالات درج کیے جاتے ہیں۔

مولانا کے والد ماجد حافظ عبدالرحیم عالم باعمل اور مشہور طبیب تھے، ان کے تین لڑکے تھے، مولانا عبدالرحمٰن محدّث، مولوی حکیم محمد شفیع اور شیخ محمد علی، مولانا عبدالرحمٰن لاولد مرے حکیم محمد شفیع صاحب کی اولاد پھلی پھولی اور اس میں علمی سلسلہ جاری رہا۔

مولانا عبدالرحمٰن ۱۲۸۳ھ میں محلہ پورہ صوفی قصبہ مبارک پور میں پیدا ہوئے، قرآن شریف اور عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں اس زمانہ میں ان کا گھر قصبہ کا مدرسہ تھا، اس کے بعد قصبہ کے اطراف کے علماء واساتذہ یعنی مولوی خدابخش مہراج گنجی، مولوی محمد سلیم فراہیؒ متوفی ۱۳۳۴ھ، مولانا سلامت اللہ جیراج پوری اور مولانا فیض اللہ مئوی سے متوسطات تک تعلیم حاصل کی اور فقہ واصول فقہ کی چند کتابیں مثلاً نورالانوار وغیرہ پڑھ کر چشمہ رحمت غازی پور گئے جو ان دنوں مشرقی یوپی کا مشہور علمی ودینی ادارہ تھا اور اس میں وقت کے مشاہیر اساتذہ درس دیتے تھے، بالخصوص مولانا حافظ عبداللہ مئوی کے علوم دینیہ اور مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کے علومِ عقلیہ اور ادبیہ کا چشمہ فیض پوری توانائیوں کے ساتھ جاری تھا، مولانا نے ان دونوں حضرات سے متوسطات اور منتہی تک کتابیں پڑھیں اور یہیں صرف، نحو، ادب، عربیت، معانی، بیان، منطق، فلسفہ، ریاضی ہیئت، فقہ، اصولِ حدیث، تفسیر وغیرہ مروجہ علوم وفنون کی تکمیل کی، یہاں پانچ سال رہ کر مولانا عبداللہ غازی پوری کے ایماء پر مولانا سیّد نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے مشکوٰۃ، جلالین، بلوغ المرام، اوائل ہدایہ، تفسیر بیضاوی، نخبۃ الفکر، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داود اور سنن نسائی کے اواخر اور سنن ابن ماجہ کے اوائل پڑھے۔ نیز قرآن حکیم کے چھ پاروں کا ترجمہ سنا اور سند حاصل کی اس کے بعد علامہ شیخ حسین بن محسن انصاری یمانی (۱) سے صحاح ستہ، موطا امام مالک، مسند امام شافعی، مسند امام احمد بن حنبل، الادب المفرد، معجم طبرانی الصغیر اور سنن دارمی کے اطراف پڑھ کر ان کتابوں کی روایت کی اجازت حاصل کی پھر ۱۳۱۳ھ

(۱) مولانا قاضی حسین بن محسن بن محمد بن مہدی یمن کے ایک شہر حدیدہ میں ۱۴؍جمادی الاولی ۱۲۴۵ھ کو پیدا ہوئے وہیں حفظ قرآن کے بعد نحو، صرف، ادب اور فقہ شافعی کی تعلیم حاصل کی، فنون کی تکمیل کے بعد علامہ حسن بن عبدالباری الاہدل اور مفتی زبید شیخ محمد اور ان کے صاحبزادے شیخ سلیمان سے حدیث کی تعلیم سے فراغت کے بعد یمن کے کسی شہر کے قاضی مقرر ہوئے، مگر چار سال کے بعد اس عہدہ سے مستعفی ہوکر ہندوستان کی مشہور ریاست بھوپال چلے آئے اور یہیں ۱۰؍جمادی الاخری ۱۳۲۷ھ میں انتقال کیا، شیخ حسین فن حدیث میں بڑی مہارت رکھتے تھے، ہندوستان میں ان سے بے شمار علماء نے استفادہ کیا۔ (نزہہ ص ۱۱۱ تا ۱۱۵)

میں قاضی محمد بن عبدالعزیز مچھلی شہری رحمہ اللہ (۱) سے حدیث مسلسل بالاولیۃ کی سند لی، قاضی محمد مچھلی شہری کا سلسلۂ سند یہ ہے: عبدالرحمٰن عن الشیخ محمد مچھلی شہری، عن الشیخ عبدالحق البنارسی عن القاضی الشوکانی، اسی سند پر مولانا نے فاتحۃ الفراغ پڑھی اور اسی سال اپنے مدرسہ دارالتعلیم مبارکپور کی بنیاد رکھی۔

مولانا نے فراغت کے بعد تعلیمی وتدریسی مشغلہ کو اختیار کیا، دارالتعلیم مبارکپور کے علاوہ بلرام پور گونڈہ میں ایک مدرسہ قائم کیا اور کچھ دنوں اس میں تعلیم دی، پھر وہاں سے اللہ نگر گونڈہ میں پڑھایا اس کے بعد گونڈہ ہی کے ایک مدرسہ سراج العلوم میں تشریف لائے جو آپ ہی کے لیے قائم کیا گیا تھا، یہاں کافی دونوں تک تعلیمی خدمات انجام دیں، اس زمانہ میں آپ کے استاذ مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری مدرسہ احمدیہ آرہ کے صدر مدرس تھے، شاگرد نے استاذ کی طلب پر مدرسہ احمدیہ آرہ کا رخ کیا، اب استاذ وشاگرد دونوں ایک ساتھ دینی وعلمی خدمت انجام دینے لگے اس دوران میں مولانا کی علمی قابلیت کا شہرہ ہوگیا اور دور دور کے اہلِ مدارس کی نظر آپ پر اٹھنے لگی، چنانچہ مدرسہ دارالقرآن والسنہ کلکتہ کے ناظم نے مولانا کو دعوت دی، مولانا اپنے استاذ کی اجازت ومرضی سے کلکتہ چلے گئے، چند سال وہاں بھی درس وتدریس کے فرائض انجام دیئے، مولانا کے تدریسی سفر کی یہ آخری منزل تھی اس کے بعد کسی مدرسہ میں نہیں گئے؛ بلکہ تصنیف وتالیف میں مشغول ہوگئے۔

مولانا نے ۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۳ھ تک مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی کے ساتھ رہ کر عون المعبود شرح سنن ابی داؤد کی تصنیف وتالیف میں پوری مدد کی۔

(۱) قاضی محمد بن عبدالعزیز مچھلی شہری شوال ۱۲۵۲ھ میں پیدا ہوئے، اپنے چچا مولانا عبدالشکور، مولانا سخاوت علی جونپوری میر محبوب علی جعفری، مولانا شیخ محمد تھانوی وغیرہ سے علوم کی تحصیل وتکمیل کی اور جب اپنے چچا شیخ عبدالشکور کے ساتھ حج کو گئے تو مکہ مکرمہ میں شیخ عبدالحق بنارسی، شاہ عبدالغنی مجددی اور شیخ محمد العظام سے بھی حدیث کی سند واجازت حاصل کی۔ گورنمنٹ کی ملازمت اختیار کی پھر اس سے الگ ہوکر ۱۲۹۷ھ میں بھوپال کے قاضی القضاۃ ہوئے ۱۳۰۲ھ میں جب نواب صدیق حسن خاں معزول کردیے گئے تو یہ بھی اپنے عہدہ سے مستعفی ہوگئے، بھوپال سے علیحدہ ہوکر یورپ کا سفر کیا، سفر سے واپس آکر پھر ریاست سے منسلک ہوگئے، بھوپال ہی میں رجب ۱۳۲۴ھ میں انتقال کیا۔ (تراجم علمائے اہلحدیث ص ۳۷۴)

چنانچہ عین المعبود مطبوعہ مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ کے مقدمہ میں ہے:

کتب العلامۃ ابو الطیّب شمس الحق العظیم آبادی و توفر علیٰ معاونتہ فی اکمالہ العلامۃ ابو العلیٰ محمد عبد الرحمٰن بن عبد الرحیم المبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی مدۃ اربع سنین الخ... (مقدمہ ص ۷)

عون المعبود میں تعاون و اشتراک کے بعد مولانا نے تحفۃ الاحوذی کا کام شروع کیا، مولانا کو اللہ تعالیٰ نے علم و عمل سے بھرپور نوازا تھا دقت نظر، حدّتِ ذہن، ذکاوت طبع اور کثرت مطالعہ کے اوصاف و کمالات نے آپ کو جامع علوم بنا دیا تھا، خاص طور سے علم حدیث میں تبحر و امامت کا درجہ رکھتے تھے، روایت کے ساتھ درایت کے مالک اور جملہ علوم آلیہ و عالیہ میں یگانۂ روزگار تھے، قوت حافظہ بھی خداداد تھی، بینائی سے محروم ہو جانے کے بعد بھی درسی کتابوں کی عبارتیں زبانی پڑھا کرتے تھے اور ہر قسم کے فتاویٰ لکھوایا کرتے تھے، مولانا اپنی تصانیف میں مجتہدانہ شان رکھتے تھے، فقہاء خاص طور سے احناف کے بارے میں نہایت شدید رویہ رکھتے تھے اور بڑی شد و مد سے ان کا رد کرتے تھے، مگر یہ معاملہ صرف تصانیف تک محدود تھا۔

مولانا براہ راست عامل بالحدیث تھے، صفات باری تعالیٰ کے سلسلے میں ماورد بہ الکتاب والسنۃ پر ایمان رکھتے تھے، تحفۃ الاحوذی میں اس سلسلے میں ان کے خاص مختارات بھی ہیں۔

مولانا کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے جن میں عرب و عجم کے علماء شامل ہیں، چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

مولانا عبد السلام مبارک پوری صاحب سیرۃ البخاری، شیخ عبد اللہ نجدی، شیخ علامہ ڈاکٹر محمد بن عبد القادر تقی الدین الہلالی المراکشی حال استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، مولانا عبید اللہ مبارکپوری صاحب مرعاۃ المفاتیح، مولانا محمد محمود معروفی، مولانا شاہ محمد سریانوی، مولانا نذیر احمد دہلوی، مولانا عبد الجبار جے پوری، مولانا محمد اسحاق آروی، مولانا ابو النعمان عبد الرحمٰن منوی، مولانا نعمت اللہ بردوانی وغیرہم۔

مولانا کے تبحر علمی اور علم حدیث میں مہارت پر ان کی تصانیف شاہد ہیں یوں تو آپ کی بہت سی مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصانیف ہیں، مگر ان میں تحفۃ الاحوذی، شرح جامع ترمذی کو اللہ نے عالم اسلام اور عرب ممالک میں جو شہرت و مقبولیت دی ہے شاید متاخرین علمائے ہند میں سے کسی کی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی، اسی طرح ابکار المنن اور تحقیق الکلام آپ کے تبحر علمی کے شاہکار ہیں، تصانیف کی مختصر فہرست یہ ہے:

(۱) تحفۃ الاحوذی (۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی (۳) ابکار المنن فی تنقید آثار السنن (۴) تحقیق الکلام فی وجوب القرأۃ خلف الامام اردو (۵) خیر الماعون فی منع الفرار عن الطاعون اردو (۶) المقالۃ الحسنیٰ فی سنیۃ المصافحہ بالید الیمنیٰ اردو (۷) کتاب الجنائز اردو (۸) نور الابصار اردو جمعہ فی القریٰ کے وجوب پر (۹) ضیاء الابصار بتائید نور الابصار (۱۰) تنویر الابصار (۱۱) القول السدید فیما یتعلق بتکبیرات العید۔

ان مطبوعہ کتب و رسائل کے علاوہ مولانا کی متعدد کتابیں اور رسائل غیر مطبوعہ ہیں اور یہ اردو میں ہیں مثلاً الوشاح الابریزی فی حکم دواء الانکلیزی، ارشاد الہائم الیٰ منع خصاء البہائم، الکلمۃ الحسنیٰ فی المصافحۃ بالید الیمنیٰ ناتمام وغیرہ۔

مولانا نے اپنے استاذ سیّد نذیر حسین دہلوی کے فتاویٰ مولانا شمس الحق ڈیانوی کی فرمائش پر دو ضخیم جلدوں میں مرتب کیا، اس کے ساتھ مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری کے فتاوے بھی فقہی ابواب پر جمع کیے جو اب تک چھپ نہیں سکے۔

آخری زمانے میں مولانا کو نزول الماء یعنی موتیابند کا مرض لاحق ہو گیا تھا اور دونوں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ رجب ۱۳۵۳ھ میں تحفۃ الاحوذی کی چوتھی جلد چھپوانے دہلی تشریف لے گئے، وہیں آنکھ کا علاج بھی کرایا، ایک آنکھ کا آپریشن ہوا جو کامیاب رہا، وطن آنے کے بعد اختلاجِ قلب کا دورہ پڑنے لگا نصف شعبان اور پورا رمضان بڑی تکلیف میں گذرا اور دورۂ قلب کے بار بار ہونے سے امید و یاس کا عالم رہا اسی دوران میں بخار بھی رہنے لگا، یہاں تک کہ ۱۶ر شوال ۱۳۵۳ھ کو احادیثِ رسول کا یہ مہر درخشاں رات کے پچھلے پہر غروب ہو گیا (رحمۃ اللہ علیہ) اور اسی دن عصر کے بعد اپنے آبائی قبرستان

میں دفن کیے گئے جو قصبہ مبارک پور کے پچھم طرف روضہ کے احاطے میں عیدگاہ کی قبلی دیوار سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہے اور قبر کے سرہانے تاریخ وفات کا کتبہ نصب ہے۔

حضرت مولانا عبدالرحمٰن بکھراویؒ

حضرت حافظ قاری مولانا شیخ عبدالرحمٰن بکھراوی اس دیار کے مشاہیر علماء ومشائخ میں سے تھے، آپ نے نائب رسول ہونے کی حیثیت سے تلاوتِ آیات، تزکیۂ نفوس اور تعلیم کتاب وسنّت میں اپنی پوری زندگی بسر کردی، شہر وقصبات کی ہنگامہ خیزیوں سے الگ ہوکر گاؤں کے خاموش اور پرسکون ماحول کو اپنا دائرۂ عمل بنایا اور ابھی آپ کا جوہر کمال پوری طرح نمایاں نہیں ہوا تھا کہ ۴۵ سال کی قلیل عمر میں وفات پاگئے، اس لیے آپ کی شہرت وعظمت اہل علم کے ایک خاص طبقہ تک محدود رہ گئی۔

حضرت مولانا کے ترجمہ کے لیے راقم نے مولانا کے صاحبزادے استاذی واستاذ العلماء حضرت مولانا عبدالقیوم بکھراوی مدظلہ العالی سے گذارش کی، استاذ محترم نے ازراہ شفقت وعنایت اس سلسلے میں ایک قابل قدر تحریر لکھ کر احقر کی عزت افزائی فرمائی، وہ تحریر حصول برکت کی غرض سے بعینہٖ درجِ ذیل ہے اور امید ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ اس تحریر کی برکت سے اس تذکرہ کو پایۂ تکمیل تک پہونچائیں اور قبولیت عام سے نوازیں گے۔

تذکرہ حضرت الشیخ مولانا عبدالرحمٰن صاحب بکھراوی المتوفی ۱۳۴۰ھ

آپ ۱۲۹۵ھ میں موضع بکھرا میں (جو ضلع اعظم گڈھ کے مشہور قصبہ سرائے میر سے پانچ میل مغرب میں واقع ہے) پیدا ہوئے، یہ گاؤں پہلے بھی مشہور ومعروف تھا اور ہمیشہ حُفّاظ اور زمانہ کے مطابق علم وشہرت کا حامل تھا اور بہت زمانہ سے اچھے اور پڑھے لکھے لوگوں کا مرکز تھا اور اب ۱۳۹۵ھ میں آبادی اور تہذیب وتمدن، دولت اور عملی ترقی کی وجہ سے ایک قصبہ کی حیثیت رکھتا ہے اور بہت ہی شہرت کا حامل ہے۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار حافظ رمضان صاحبؒ (جو حضرت حاجی

امداد اللہ مہاجر مکی کے مجاز بیعت تھے اور بہت ہی با فیض حافظ اور عبادت گذار زاہد تھے) سے حاصل کی اور خداداد قابلیت کی وجہ سے بہت جلد حافظ ہو گئے، مولانا کے قرآن پڑھنے کا انداز اور آواز کی دلکشی ایسی تھی کہ سننے والا کبھی آسودہ نہ ہوتا تھا۔

ابتدائی تعلیم حاصل کر لینے کے بعد آپ نے جون پور کا رخ کیا اور وہاں حضرت مولانا سیّد اصغر حسین دیوبندی اس وقت مسجد اٹالہ شہر جون پور میں تدریسی خدمت انجام دے رہے تھے، مولانا سیّد اصغر حسین علوم وفنون میں مہارت رکھنے کے ساتھ ولی مادرزاد تھے، مولانا عبدالرحمٰن بھی فطری بزرگ تھے حسن اتفاق سے دو ولیوں کا اجتماع ہو گیا، مولانا سیّد اصغر حسین رحمۃ اللہ علیہ نے انتہائی شفقت ومحبت کے ساتھ مولانا کو پڑھایا اور علوم ظاہرہ وباطنہ سے بہرہ ور فرمایا۔

مولانا عبدالرحمٰن کی قرات وحفظ کی شہرت اسی زمانہ میں ہو گئی تھی، شہر سے اکثر دعوتیں وعظ کی آتی تھیں، مگر مولانا سیّد اصغر حسین صاحب تعلیم کے ہرج کے خیال سے منع فرماتے تھے۔ دونوں بزرگوں کا جون پور میں چند سال قیام رہا۔ شعر

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم وبہار آخر شد

سیّد صاحب نے جون پور کی ملازمت ترک کر کے دیوبند کا ارادہ کیا اور دارالعلوم دیوبند میں مدرس مقرر ہوئے، یہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب نوراللہ مرقدہ کی صدارت کا زمانہ تھا، اس وقت حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی اور مولانا سیّد انور شاہ کشمیری ابتدائی مدرّس تھے۔

مولانا عبدالرحمٰن نے بھی استاذ محترم کے جون پور سے چلے جانے کے بعد دیوبند کا قصد کیا اور حضرت شیخ الہند اور مولانا اصغر حسین صاحب و دیگر متعلقہ مدرسین سے استفادہ کیا اور سند فراغت حاصل کی، دیوبند سے فراغت کے بعد چند سال مختلف جگہوں میں رہے اور وعظ وتبلیغ اپنی طبعی مناسبت کی وجہ سے کرتے رہے، مگر ان کی اصل طلب اور تھی، ان کا طبعی رجحان زہد واتقاء، دنیا سے بے رغبتی، عبادت وریاضت اور ذکر ومراقبہ تھا، ایک منزل کلام اللہ

کی تلاوت کا بلا ناغہ معمول تھا اور نوافل و وظائف کی پابندی مزید برآں۔

علمِ ظاہری اللہ نے بہت دیا تھا، حفظ قرآن، تجوید، علوم فارسی و عربی پر کافی عبور تھا، مگر بہت سے بزرگانِ دین کی طرح ان علوم سے لگاؤ کم تھا اور علوم باطنہ سے مناسبت زیادہ تھی، اکثر ان اشعار کو پڑھا کرتے تھے۔

علم رسمی سر بسر قیل است و قال | نے از و کیفیتے حاصل نہ حال!
علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت | رنگ گمراہی ز دل بر دایدت
بینی اندر خود علوم انبیاء | بے کتاب و بے معین و اوستا!
جملہ اوراق و کتب در نار کن | سینہ را از نور حق گلزار کن!

دنیا سے بے رغبتی آپ کی فطرت میں داخل تھی، اللہ تعالیٰ نے مولانا عبدالرحمٰن کو جگہ، زمین، مکان، باغ اور دنیا میں پھنسانے والی بہت سی چیزیں عطا فرمائی تھیں، مگر ان کو کسی چیز سے لگاؤ نہیں تھا اور نہ انھوں نے جانا کہ میرا کھیت اور باغ کہاں ہے، بھائی لوگ تمام چیزوں کی دیکھ بھال کرتے، مولانا عبادت و ریاضت کو اپنا موضوع زندگی بنائے تھے، غلبۂ حال اور وجد میں حافظ شیرازی کے اشعار اکثر پڑھا کرتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس عالم سے دل بیزار ہے، مندرجہ ذیل اشعار کو بار بار پڑھتے ہوئے سنا گیا۔

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش | کہ انچہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است
نصیحتے کنمت بشنود و در عسل آر | کہ ایں حدیث ز پیر طریقتم یاد است
مجو درستیٔ عہد از جہانِ سست نہاد | کہ ایں عجوز عروس ہزار داماد است

مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم | جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس | در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید

حافظا در کنج فقر و خلوتِ شبہائے تار | تا بود وردت دعا و درس قرآں غم مخور

بالآخر غالباً ۱۳۳۵ھ یا ۱۳۳۶ھ میں تھانہ بھون کا ارادہ کیا، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی ان کے والد کے پیر تھے، مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے حاجی صاحبؒ کے خلیفہ (مولانا تھانویؒ) کو اپنا پیر تجویز کیا اور چند ماہ تھانہ بھون میں قیام کے بعد خلافت سے سرفراز ہوئے، لوگوں کو سخت تعجب تھا کہ لوگوں کو بہت دنوں تک مجاہدہ و ریاضت کے بعد بھی یہ دولت نہیں ملتی یہ کیا ہوا لیکن بات یہ ہے کہ برتن تو پہلے ہی سے صاف تھا صرف قلعی کی ضرورت تھی۔

غافل مرو کہ مرکب مردان مرد را　　در سنگلاخ بادیہ پیما بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندانِ بادہ نوش　　ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

ہر شخص کو اپنے پیر سے بہت لگاؤ ہوتا ہے، استاذ سے تو بدظنی و بدگمانی ہو سکتی ہے، مگر پیر سے خصوصاً سچے پیر سے تو کوئی بدبخت ہی ہوگا جس کو بدگمانی ہوتی ہوگی یہ ایسا مضبوط رشتہ ہے جس کا ٹوٹنا مشکل ہوتا ہے، یہ محبت بالکل طبعی اور غیر اختیاری ہوتی ہے، ہر عاقل، عالم و فاضل اس کو پسند کرتا ہے، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری، بانی مدرسہ بیت العلوم سرائے میر جن کو اللہ نے ظاہری و باطنی خوبیاں عطا فرمائی تھیں بہت ہی مشکل سے کسی کے معتقد ہوتے تھے، مگر حضرت تھانویؒ کے خلاف کوئی معمولی تنقید جس میں حضرت اقدس مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تنقیص بھی نہ ہوتی سننے کو گوارا نہ فرماتے۔

اسی اصول کے مطابق حضرت مولانا عبدالرحمٰن کو بھی اپنے پیر و مرشد حضرت تھانوی سے بیحد محبت و عقیدت تھی اور چند ماہ تھانہ بھون رہے تھے کہ زیور خلافت سے آراستہ ہو کر مکان واپس آئے، اس وقت عجیب حال تھا، ایک نئی دنیا تھی۔ شعر

صد سالہ دور چرخ کہ ساغر کا ایک جام　　اک بار کیا پیا تھا کہ دنیا بدل گئی!

جو شہرت اور مقبولیت پہلے تھی اب اس میں کئی گنا اضافہ ہو گیا، خلق کا رجحان اور عقیدت مندوں کا ہجوم اور بڑھنے لگا، تھانہ بھون سے واپسی کے وقت حضرت تھانوی نے فرمایا کہ علماء کے لیے علمی مشغلہ کا ترک کرنا مناسب نہیں اس مشغلہ کا قائم رہنا ضروری ہے اس لیے تھانہ بھون ہی سے ایک مدرسہ کو تجویز کر کے اور مدرسہ کا نام رحمۃ العباد رکھ کر واپس

کیا اس کے بعد غالباً ۱۳۳۵ھ یا ۱۳۳۶ھ میں اس کی بنیاد رکھی گئی اب دن میں درس وتدریس، تعلیم رشد وہدایت اور رات میں اللہ اللہ لا الہ الا اللہ کی آواز سے مسجد کے گونجنے کا ایک عجیب پُرکیف منظر ہوتا تھا، مگر افسوس کہ ''ما در چہ خیالیم وفلک در چہ خیال است'' ادھر یہ پُرکیف منظر تھا کہ اسی دوران میں مولانا کو ذیابیطس کا عارضہ شروع ہوگیا اور مرض کا حملہ اتنا شدید ہوا کہ کمزوری بہت تیزی سے بڑھنے لگی، ایسی حالت میں کام میں کمی کے بجائے تصنیف وتالیف کا بھی اضافہ کرلیا، اسی بیماری کے زمانہ میں تین ابواب پر مشتمل ایک رسالہ لکھا جس کا نام حضرت تھانوی نے رحمۃ المتعلمین رکھا اور بیحد پسند فرمایا، رسالہ طبع ہوکر شائع ہوا، اسی کتاب کے تینوں ابواب کو الگ الگ کرکے مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی مدظلہ العالی ناظم مدرسہ اشرف المدارس ہردوئی وخلیفہ حضرت تھانوی نے جدید ایڈیشن کے ساتھ شائع کیا ہے، ایک کتاب متشابہات قرآنیہ کے موضوع پر خاص میرے (عبدالقیوم کے) لیے لکھا، مگر میں نے کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں، مجھے مشابہت نہیں لگتی، اس جواب سے تھوڑی سی ناگواری اور زیادہ تر خوشی ہوئی، میرے بچپن اور مولانا کی وفات کی وجہ سے یہ کتاب غیر مطبوع رہ گئی اور کہیں ضائع ہوگئی، ایک کتاب تصوف میں لکھ رہے تھے جو مکمل نہ ہوسکی۔

القصہ مختصر شعبان ۱۳۴۰ھ تک باوجود بیماری وضعف کے مدرسہ اور درس وتدریس مریدوں کی نگرانی، خطوط کے جوابات تمام کاموں کو انجام دیا، رمضان شریف میں ضعف ونقاہت بہت بڑھ گئی اور شوال میں چارپائی پکڑلی اور اندرونِ خانہ رہنے لگے، اس وقت مریدین مکان کے اندر جانہیں سکتے تھے، طلبہ دیگر مدارس میں جاچکے تھے، مولانا کے خادم خاص ومعتقد وشاگرد حاجی محمد نذیر صاحب بکھراوی مدظلہ ناظم مدرسہ بیت العلوم سرائے میر اس وقت غالباً ملایا تھے، غرضیکہ میدان صاف تھا اور بیماری بڑھتی جارہی تھی، دست بہت آتے تھے، راقم الحروف عبدالقیوم ابن مولانا عبدالرحمٰن نے اور میری والدہ نے ۸؍شوال ۱۳۴۰ھ سے ۱۹؍ذی قعدہ ۱۳۴۰ھ تک اس خدمت کو بلاشرکت غیرے انجام دیا، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

اسی آخری وقت میں ایک صاحب سے جو مولانا کی عیادت اور ملاقات کے لیے

آئے تھے، فرمایا کہ میرے ایک ہی لڑکا ہے جو حافظ قرآن ہوگیا ہے، خیال تھا کہ عربی پڑھاؤں گا حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کی تعلیم کا غیب سے بندوبست فرمائے۔

بالآخر ۱۹/ذی قعدہ ۱۳۴۰ھ کو بعد نماز عشاء ۴۵ برس کی عمر میں یہ روشن چراغ خاموش ہوگیا اور ۲۰/ذی قعدہ کو اپنے آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

مولانا کی وفات کے بعد مجھ کو (عبدالقیوم) دنیا کے مصائب وحوادث نے گھیر لیا اور میری زندگی والد صاحب کی زندگی کے بالکل برعکس ہے وہ دنیا سے جتنے آزاد تھے میں اتنا ہی جکڑا ہوا ہوں، مگر والد صاحب کی دعاء کا یہ اثر ہوا اور ان کی یہ کرامت ظاہر ہوئی کہ انھیں حوادث اور ہجوم وافکار میں میری طالب علمی اور مدرسی برابر چلتی رہی اور چلی جارہی ہے۔

جب میں دیوبند سے فارغ ہوکر ۱۳۵۰ھ میں مکان آیا، آنے کے ساتھ ہی حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ بانی مدرسہ بیت العلوم سرائے میر جو میرے والد کے پیر بھائی اور حقیقی دوست تھے، ۱۵/محرم ۱۳۵۱ھ میں مجھے مدرسہ بیت العلوم میں مدرس رکھا اور انھیں دشواریوں میں اللہ نے یہ خدمت لی، اب میری ملازمت کو چھیالیس سال ہورہے ہیں، یہ بزرگوں کی دعا کا اثر ہے کہ حوادث اور مصائب کے باوجود اتنے زمانہ تک علوم دینیہ کی خدمت کا موقع ملا، اب میری حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ میری بقیہ زندگی بھی انھیں طلبہ وعلماء وصلحاء کی خدمت میں گذرے اور انھیں لوگوں سے تجہیز وتکفین کرائے اور حشر اللہ کے مقبول بندوں کے ساتھ ہو اور ایمان پر خاتمہ ہو۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

عبدالقیوم ابن مولانا عبدالرحمٰن صاحب بکھراویؒ مدرسہ مدرسہ بیت العلوم سرائے میر

۲۰/شوال ۱۳۹۵ھ

مولانا عبدالرحمٰن مئویؒ

مولانا عبدالرحمٰن اپنے آبائی وطن محلہ اورنگ آباد قصبہ مئو ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم بھی وہیں مقامی اساتذہ سے حاصل کی پھر مدرسہ غفاریہ رسڑا میں داخل ہوکر مولانا عبداللہ مئوی اور مولانا ولی محمد گھوسوی کی رفاقت میں مولانا تراب علی لکھنوی سے

فنون کی تکمیل کی، جس زمانہ میں آپ یہاں پڑھ رہے تھے اسی زمانہ میں مولانا الٰہی بخش کوپا گنجی اور مولانا عبدالحق مہاجر مکی (شیخ الدّلائل) بھی مولانا تراب علی سے اکتسابِ فیض کرر ہے تھے یہاں سے فراغت کے بعد دہلی جاکر مولانا سیّد نذیر حسین کے حلقۂ درس میں داخل ہوکر حدیث کی تحصیل وتکمیل کی اور سند فراغت لی، تعلیمی سلسلہ کے مکمل کر لینے کے بعد شہر بنارس میں تدریسی خدمت پر مامور ہوئے اور مسجد گیان باپی میں طویل عرصہ تک مصروف درس وافادہ رہے، ساتھ ہی بی بی رضیہ کی مسجد واقع چوک میں خطابت وامامت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے، ان تعلیمی وتدریسی خدمات کے ساتھ آپ کپڑے کی تجارت بھی کرتے تھے جس میں آپ کو بڑا فروغ حاصل ہوا، آپ کی ملی یادگار میں فاطمان کی مشرقی عیدگاہ ہے جو بادشاہ باغ میں واقع ہے اور آج بھی موجود ہے۔

۱۴ محرم ۱۳۱۵ھ میں بنارس میں فوت ہوئے اور اپنی تعمیر کردہ عیدگاہ میں دفن ہوئے۔ (تذکرہ مشائخ بنارس ص ۸۹ وحیاتِ ولی ص ۱۲)

مولانا عبدالرحمٰن آزاد مئویؒ

مولانا ابوالنعمان عبدالرحمٰن آزاد بن عبدالرزاق مئوی کی ولادت ۱۲۹۵ھ میں قصبہ مئو میں ہوئی، ابتدائی تعلیم قصبہ ہی کے اساتذہ سے حاصل کی اس کے بعد مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور میں داخل ہوئے اور مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، مولانا عبداللہ غازی پوری اور مولانا عبدالرحمٰن بقاؔ غازی پوری سے درس نظامیہ کے اکثر حصہ کی تحصیل کی، بعدازاں یہاں سے منتقل ہوکر جامع العلوم کانپور چلے گئے اور وہاں حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ اور مولانا احمد حسن کانپوری وغیرہ سے نصاب کی بقیہ کتابیں پڑھیں، تکمیل نصاب کے بعد تحصیل حدیث کی غرض سے دہلی چلے گئے اور ایک سال تک مولانا سیّد نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں رہ کر اس علم شریف کو علیٰ وجہ الاتم حاصل کیا، فراغتِ تعلیم کے بعد ۱۳۱۴ھ میں دربھنگہ کے کسی مدرسہ میں استاذ مقرر ہوئے، پھر یہاں سے علیحدہ ہوکر آسنسول کے مدرسہ میں چلے گئے، کچھ دنوں کے بعد یہاں سے بھی الگ ہوکر کلکتہ کے کسی مدرسہ میں مدرس ہوگئے، کلکتہ

کے زمانۂ قیام میں قصبہ مئو میں ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی جس میں بہت سے افراد لقمۂ اجل بنے، ان میں مولانا عبدالرحمٰن کے بھائی اور دو صاحبزادے بھی تھے، اس حادثے کی اطلاع پر مولانا کلکتہ سے مئو تشریف لائے اور پھر عائلی جھمیلوں میں اس طرح الجھے کہ مئو سے باہر قدم نکالنے کی نوبت نہ آئی۔

مولانا عبدالرحمٰن مرحوم ایک لائق مدرس ہونے کے ساتھ بلند پایہ مصنف بھی تھے جس پر ان کی تصانیف شاہد عدل ہیں، آپ کی تصانیف میں تفسیر القرآن (ناتمام) ترجمہ طبقاتِ ابن سعد (ناتمام) بڑی اہمیت کی حامل ہیں، ان کے علاوہ بحر الفرائض اور شرح قصیدۂ بانت سعاد بھی آپ کی اہم علمی یادگار ہیں۔

ان صلاحیتوں کے ساتھ شعر وادب میں بھی انھیں کامل درک حاصل تھا، بالخصوص مادہائے تاریخ کے استخراج میں بڑی مہارت تھی۔آپ کی وفات ۱۳۵۷ ہجری میں ہوئی۔

مولانا حافظ عبدالرحیم صاحب مبارک پوریؒ

مولانا حاجی حافظ حکیم عبدالرحیم بن شیخ حاجی بہادر مبارک پور کے مشہور علماء واطباء میں تھے، مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری کے والد ہیں، حفظ قرآن اور قرأت وتجوید کی تعلیم قاضی امام الدین جون پوری سے حاصل کی، اور نحو وصرف ودیگر علوم کی تکمیل مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں مولانا فیض اللہ مئوی، مولانا حسام الدین مئوی سے کی، حدیث کی تحصیل مولانا قاضی شیخ محمد مچھلی شہری سے کی جن کو شیخ عبدالحق بنارسی تلمیذ قاضی شوکانی سے سند حدیث حاصل تھی، نیز شیخ عبدالحق نے مولانا سخاوت علی جونپوری، مولانا فضل رسول بدایونی، مولانا احمد اللہ نامی تلمیذ شاہ محمد اسحاق دہلوی اور آخر میں مولانا اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحئی دہلوی سے تعلیم پائی تھی۔

حافظ عبدالرحیم صاحب نے قاضی محمد مچھلی شہری سے سند مسلسل بالاوّلیۃ، سند مناولہ، بلوغ المرام اور سند اتحاف الاکابر حاصل کی تھی یہ سندیں آپ کے امتیازات میں ہیں، چونکہ ان کے اکثر اساتذہ وشیوخ مسلک اہلحدیث کے داعی تھے اور ترکِ تقلید پر زور دیتے تھے

اس لیے ان پر بھی اپنے اساتذہ کا رنگ غالب رہا اور آپ نے بھی اسی مسلک کو اختیار کیا، طبابت کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ بھی گھر پر رکھتے تھے، لوگوں کا بیان ہے کہ حافظ صاحب اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہوئے قاضی مبارک اور حمد اللہ جیسی معقولات کی کتابیں بے تکلف پڑھاتے تھے، اس کے علاوہ نحو وصرف عربی فارسی اور حفظ وتجوید کا درس بھی دیا کرتے تھے، قصبہ مبارک پور کے سیکڑوں حفاظ نے ان کی شاگردی میں حفظ قرآن کی نعمت پائی، ان کے مخصوص تلامذہ میں مولانا عبدالسلام مبارک پوری اور حافظ شاہ نظام الدین سریانوی تھے۔

حافظ صاحبؒ نے رمضان المبارک ۱۳۳۰ھ میں انتقال فرمایا، کہا جاتا ہے کہ آپ ہی سے مبارک پور میں اہل حدیث کا رواج ہوا۔

(تذکرہ علمائے حال ص ۴۳ وتراجم علمائے اہلحدیث ص ۳۹۸ وتذکرہ علمائے مبارک پور ص ۱۳۶)

مولانا عبدالرؤف کوپاگنجیؒ

مولانا عبدالرؤف بن عبدالشکور اپنے آبائی وطن محلہ چندن پورہ قصبہ کوپاگنج ضلع اعظم گڈھ میں ۱۹۱۳ء مطابق ۱۳۳۳ھ کے حدود میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مقامی درسگاہ مدرسہ مصباح العلوم میں مولانا عبدالصمد کوپاگنجی اور مولانا عظیم اللہ کوپاگنجی سے حاصل کی، آگے کی تعلیم کے لیے مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں دو سال رہے اور متوسطات تک یہاں پڑھ کر دارالعلوم دیوبند کا علمی سفر کیا اور پورے ایک سال یہاں زیر تعلیم رہ کر رمضان کی تعطیل میں گھر آئے اور تعطیل کے ایام گذار کر دارالعلوم جانا چاہتے تھے، مگر بعض مجبوریوں کی وجہ سے وہاں نہ جاسکے اور جامعہ قاسمیہ شاہی مسجد مرادآباد میں دورۂ حدیث پڑھ کر ۱۳۵۸ھ میں سند فراغت حاصل کی، اساتذۂ حدیث میں حضرت مولانا سیّد فخرالدین احمد متوفی ۱۳۹۲ھ اور حضرت مولانا سیّد محمد میاں متوفی ۱۳۹۵ھ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، مولانا قاضی اطہر مبارک پوری مرادآباد میں بعض کتابوں میں آپ کے ساتھی تھے، قاضی صاحب ان سے ایک سال بعد ۱۳۵۹ھ میں فارغ ہوئے، قاضی صاحب کا

بیان ہے کہ دور طالب علمی میں مولانا عبد الرؤف صاحب بہت زندہ دل اور رنگین طبیعت تھے، لیکن فراغت کے بعد جب حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوریؒ متوفی ۱۳۸۷ھ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی تو طبیعت کی ساری رنگینیاں کافور ہوگئیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں تک جمعیۃ علماء اور کانگریس کے پلیٹ فارم سے سیاسی کاموں میں حصہ لیا، لیکن تھوڑے عرصہ میں اس سے الگ ہوکر مدرسہ مصباح العلوم کوپاگنج میں اعزازی طور سے تدریسی سلسلہ شروع کردیا، تقریباً تین برس تک یہاں تعلیمی خدمت انجام دے کر ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۹۴۴ء میں مدرسہ اشاعت العلوم پورہ معروف میں تدریسی خدمت پر مامور ہوئے اور درمیان میں تین سال کے علاوہ آخر دم تک یہیں مدرس رہے، درمیان کے تین سالوں میں اشاعت العلوم سے علیحدہ ہوکر اپنے شیخ ومرشد حضرت فتحپوری کی خدمت میں بغرض اصلاح فتحپور گئے تھے جہاں عبادت وریاضت کے ساتھ تعلیمی مشغلہ بھی جاری رہا۔ اسی زمانہ میں ایک سال کے قریب مدرسہ وصیۃ العلوم کوپاگنج میں بھی اعزازی طور پر درس دیا، بالآخر ارباب پورہ معروف کے شدید اصرار پر تین سال کے بعد پھر اشاعت العلوم میں آگئے اور زندگی کی آخری سانس تک صدارت تدریس پر فائز رہے۔

مولانا نے یہیں نئی بستی موضع پارہ میں زمین خرید کر مکان بنوالیا تھا اور کوپا کے بجائے پورہ معروف ہی میں سکونت اختیار کرلی تھی، اپنے مکان کے متصل اہل قصبہ کے تعاون سے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔

مولانا عبد الرؤف صاحبؒ زہد وتقویٰ اور سادگی وبے تکلفی میں بے مثال تھے، طلبہ اور اساتذہ آپ کا بیحد احترام کرتے تھے، جب مدرسہ میں آجاتے تھے سناٹا چھا جاتا تھا، خلاف شرع امور پر نہایت سخت گرفت فرماتے تھے، زبان میں قدرے لکنت تھی اس لیے تقریر نہیں کرپاتے تھے، بایں ہمہ آپ کے اخلاص وایثار نے وہ کام انجام دیا جو اچھے اچھے مقرر نہیں کرسکے۔

کم وبیش ۲۷ برس اشاعت العلوم میں تدریسی خدمت انجام دی، آپ کے شاگردوں میں اچھے اچھے اہل علم پیدا ہوئے جو مختلف اداروں میں تعلیمی خدمات

انجام دے رہے ہیں۔

مولانا آخر عمر میں ایک موذی مرض میں مبتلا ہو گئے تھے جب اس کا دورہ پڑتا تو بیہوش ہو جاتے اور تمام اعضاء میں تشنج پیدا ہو جاتا، مرض نے جب شدت اختیار کر لی تو شہر بنارس کے صدر اسپتال کبیر چورا میں بغرض علاج داخلہ لے لیا اور یہیں یکشنبہ ۲۰ر جمادی الاخریٰ ۱۳۹۳ھ مطابق ۲۲ر جولائی ۱۹۷۳ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا، میت بذریعہ کار پورہ معروف لائی گئی اور دوسرے دن بعد نماز ظہر انسانوں کے زبردست ازدحام میں مدرسہ اشاعت العلوم کے جانب مغرب مقبرۂ پارہ میں سپرد خاک ہوئے، مولانا محمد عثمان معروفی نے لوح قبر کے لیے چند تاریخی مادے برآمد کیے جن میں سے دو یہ ہیں:

وفات مولوی عبدالرووف صاحب رحمہ اللہ

۱۳۹۳

بحر فہم صدر المدرسین اشاعت العلوم

۱۹۷۳

(مشاہیر پورہ معروف ص۵۹ تا ۶۲)

مولانا حکیم عبدالسلام مبارک پوریؒ

مولانا حکیم ابوالہدیٰ عبدالسلام بن شیخ خان محمد بن شیخ امان اللہ بن شیخ حسام الدین مبارک پور کے مشہور علمائے دین سے تھے، جنھوں نے درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے ساتھ حکمت وطبابت میں زندگی بسر کی۔

تذکرہ علماء حال میں مولانا کا نام حکیم سلامت اللہ درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا قدیم نام یہی تھا بعد میں اس کے بجائے عبدالسلام رکھ لیا تھا، آپ کی ولادت بحسب تصریح تذکرہ علمائے حال ۱۲۸۸ھ میں ہوئی۔ کافیہ شافیہ تک حافظ عبدالرحیمؒ مبارکپوری اور دیگر علماء سے پڑھا پھر شرح تہذیب اور شرح جامی مولانا عبدالرحمٰن محدث سے اور شرح وقایہ مولانا حسام الدین مئوی سے پڑھی بقیہ کتب مولانا عبدالرحمٰن محدث اور

مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری سے پڑھ کر دہلی گئے اور مولانا عبدالحق ولایتی (۱) مدرس مدرسہ فتحپوری سے تحصیل علم کرنے کے بعد مولانا سیّد نذیر حسین دہلوی سے صحاح ستہ، تفسیر جلالین، تفسیر بیضاوی، نخبۃ الفکر پڑھیں، اور انھیں سے علم حدیث کی سند واجازت پائی، نیز مولانا شیخ حسین عرب سے حدیث کی اجازت عامہ حاصل کرکے مولانا قاضی محمد مچھلی شہری سے بھی اجازت حدیث و مسلسل بالاولیہ حاصل کی اور طب وحکمت کی تعلیم حکیم عبدالولی بن حکیم عبدالعلی لکھنوی سے پائی۔

مولانا عبدالسلام کے اکثر شیوخ اہلحدیث مسلک کے تھے اور خود مولانا بھی اسی مسلک کے زبردست عالم تھے۔

مولانا نے مروجہ علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل کے بعد تعلیم وتدریس اور تصنیف و تالیف میں زندگی بسر کی، پندرہ سال تک صادق پور پٹنہ کے مدرسہ میں تعلیم دی اسی دوران میں اپنی مشہور کتاب ''تاریخ المنوال واہلہ'' تصنیف کی تین سال تک مدرسہ فیض عام مئو میں تعلیم دی، اس کے بعد ضلع گونڈہ کے ایک مدرسہ میں چار سال تک پڑھایا، آخر میں مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں تشریف لے گئے، یہیں زمانہ تعلیم وتدریس میں ۱۳۴۲ھ میں انتقال فرمایا۔

مولانا تدریسی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف اور تحقیق کا کام جاری رکھتے تھے اور ہر دور میں کچھ نہ کچھ لکھا کرتے تھے، مولانا بے نظیر مدرّس اور بے مثل عالم ہونے کے ساتھ نہایت اچھے مصنف وادیب اور مورخ ونقاد تھے، تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کا نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے، آپ کی مشہور تصانیف میں ''سیرۃ البخاری'' اور ''تاریخ المنوال واہلہ'' ہے۔

(۱) مولانا عبدالحق بن محمد میر حنفی ۱۲۶۰ھ میں کمتھلہ (پنجاب) میں پیدا ہوئے، مولانا عبدالحق کانپوری، شیخ لطف اللہ علی گڈھی اور مولانا سیّد نذیر حسین دہلوی سے علوم وفنون کی تحصیل کی، فراغت کے بعد عرصۂ دراز تک مدرسہ فتحپوری میں تعلیمی خدمات انجام دی، آخر میں درس وتدریس کو چھوڑ کر تصنیف وتالیف میں مشغول ہوگئے تھے، حیدرآباد سے آپ کا وظیفہ مقرر تھا جو ماہانہ ملتا رہتا تھا، آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جس میں تفسیر حقانی کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی، دہلی میں مستقل طور سے سکونت اختیار کرلی تھی یہیں ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ میں وفات پائی۔ (نزہہ ج ۸ ص ۲۳۲)

مولانا عبدالسلام ندویؒ

ادیب فاضل مولانا عبدالسلام بن دین محمد اعظمی ہندوستان کے مشہور فضلا میں سے تھے، ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں علاؤالدین پٹی میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اعظم گڈھ کے اساتذہ وعلماء سے حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے لکھنؤ ندوۃ العلماء دارالعلوم میں داخلہ لیا اور مولانا سیّد علی زینبی شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ اعظمی، مولانا شبلی بن محمد علی جیراج پوری وغیرہ اساتذہ دارالعلوم سے جملہ علومِ متداولہ کی تحصیل کی اور سند فراغت لی، تعلیم سے فراغ کے بعد دارالعلوم ندوہ میں تدریسی خدمت پر مامور ہوئے، دوان تدریس میں ماہنامہ الندوہ کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے، تحریر وانشاء میں نومشق ہونے کے باوجود اس دور کے آپ کے مقالات علمی حلقوں میں بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور آپ کی تحقیقات وتدقیقات دیکھ کر علماء دنگ رہ جاتے تھے، چنانچہ علامہ شبلی نعمانیؒ نے اسی زمانہ میں ان کے ایک کامیاب مصنف بننے کی پیشین گوئی کردی تھی جو آگے چل کر حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔

جب ۱۹۱۴ء میں دارالمصنّفین کا قیام عمل میں آیا تو ندوہ سے علیحدہ ہوکر شبلی منزل چلے آئے اور دارالمصنّفین سے وابستہ ہوگئے اور مرکر ہی اس سے جدا ہوئے۔

مولانا عبدالسلام فطری مصنف اور انشاء پرداز تھے، قوتِ آخذہ بڑی تیز تھی، سرسری مطالعہ سے کتابوں کا جوہر کھینچ لیتے تھے، قلم برداشتہ لکھتے تھے اور اس پر نظر ثانی اور اصلاح کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی، ان کا مسودہ اولیٰ ہی مبیضہ ہوتا تھا۔

مولانا ایک مشہور مصنف اور صاحب طرز اہل قلم تھے مگر اس حیثیت کا احساس تک ان کو نہ تھا، علم کا پندار اور شہرت ونام ونمود کی طلب کا تصور بھی ان کے دماغ میں نہ تھا، پوری زندگی قناعت اور شانِ استغناء کے ساتھ ایک گوشہ میں گذار دی، تحمل وبردباری اور انکساری کے پیکر تھے اس قدر سادہ لوح اور بے تکلف تھے کہ چھوٹے بڑے ادنیٰ اعلیٰ ہر شخص سے ایک طرح سے ملتے تھے اور ادنیٰ ملازمین تک ان سے بے تکلف تھے، باتیں ایسی معصومانہ اور بھولی کرتے تھے کہ ناواقف آدمی ان کو بہ مشکل پڑھا لکھا تصور کرسکتا تھا جو لوگ ان کی

تصانیف کے ذریعہ انھیں جانتے تھے ان سے ملنے کے بعد ان کے مصنف ہونے کا یقین نہیں کرسکتے تھے، ان کا پورا اثاثہ دارالمصنفین کی پینتالیس سالہ زندگی کا حاصل چند جوڑے کپڑوں دو بکس ایک پلنگ اور ایک بستر سے زیادہ نہ تھا۔

مولانا نے نصف صدی تک علم وفن کی خدمت کی اور مختلف علمی، ادبی اور مذہبی موضوعات پر ہزاروں صفحات لکھے، شعر وادب سے خاص ذوق تھا اور اس پر بڑی گہری استاذانہ نظر رکھتے تھے جس پر ان کی تصنیف شعرالہند شاہد ہے، مذہبی تصانیف میں تاریخ اخلاق اسلامی، اسوۂ صحابہ، اسوۂ صحابیات اور سیرت عمر بن عبدالعزیز جیسی کتابیں لکھیں مولانا کی آخری تصنیف حکمائے اسلام حصہ دوم شائع ہوئی تو وہ اس کو لے کر اپنے پرانے رفیق مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنے کے لیے دلّی جانے والے تھے اور بڑے ذوق وشوق سے اس کی تیاری بھی کررہے تھے کہ ۲۸ صفر ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۹۵۶ء کو پیام اجل آگیا۔

مولانا عبدالسلام مرحوم کی مستقل تصانیف کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے جن کی فہرست یہ ہے:

حکمائے اسلام حصہ اول ودوم، اقبال کامل، شعرالہند اوّل ودوم، انقلاب الامم، تاریخ فقہ اسلامی (عربی سے ترجمہ) امام رازی، طبقات الامم، تاریخ اخلاق اسلامی، اسوۂ صحابہ، اسوۂ صحابیات، سیرت عمر بن عبدالعزیز، مقالات عبدالسلام۔

یہ سب کتابیں اہلِ علم میں مقبول ومتداول ہیں اور بعض کے اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

مولانا کی وفات پر علمی حلقوں نے بڑے رنج وغم کا اظہار کیا، ملک کے مقتدر رسالوں اور جریدوں نے اداریے لکھے، شعراء اور تاریخ نویسوں نے مرثیے اور تاریخیں لکھیں۔

(نزہہ ص ۲۵۲ ومعارف ماہ صفر ۱۳۷۶ھ)

شیخ عبدالشکور خیرالدین پوریؒ

حضرت شیخ عبدالشکور، شیخ مبارک محمدی بن شیخ خیرالدین کی اولاد میں سے تھے، گنج ارشدی قلمی میں ہے کہ ''حضرت شیخ عبدالشکور موطن وے موضع خیرالدین پور من اعمال

جونپوراست''، شیخ اپنے عہد کے ایک زبردست عالم اور صاحب نسبت بزرگ تھے، حضرت دیوان محمد رشید جونپوری کے اجلّ خلفاء میں تھے، بحر ذخار میں ہے کہ شیخ محب اللہ الہ آبادی اور شاہ جمال کٹروی سے بھی روحانی نعمت پائی تھی۔

اپنے والد شیخ مبارک محمدی کی طرح انھوں نے بھی اپنی علمی وروحانی سرگرمیوں کے لیے شہر جون پور کا انتخاب کیا، چنانچہ صاحب گنج ارشدی لکھتے ہیں:

بعد ازاں در جونپور تشریف آورد واستقامت نمود، در درس وتدریس تا آخر عمر مشغول بوده... اکثر طلبہ از وے فاتحہ فراغ علم خوانده اند''

خیرالدین پور کی سکونت کے بعد جونپور آکر مقیم ہو گئے تھے اور تاعمر درس وتدریس میں مشغول رہے۔

اسی کے ساتھ ارشاد وسلوک کا سلسلہ بھی جاری تھا، شیخ درویش جد سادات مفتی محلہ جونپور شیخ عبدالشکور کے داماد اور خلیفہ وجانشین تھے، فقہ حنفی کی مشہور کتاب شرح مختصر وقایہ کی ایک شرح بھی لکھی تھی، جس میں بطور خاص ماء کثیر کے بارے میں مسئلہ دہ در دہ کی بہترین تحقیق کی تھی ۲۰/ جمادی الاولیٰ ۱۰۹۵ھ میں علم وفن اور رشد وہدایت کا یہ نیر تاباں شہر جونپور میں غروب ہو گیا۔ افسوس کہ اس فاضل اجل کے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

(گنج ارشدی قلمی ج ا ص ۳۲۱ مملوکہ خانقاہ رشیدیہ جون پور)

مولانا قاضی عبدالصمد چریا کوٹی

قاضی عبدالصمد بن قاضی ابوالحسن بن ملا محمد ماہ بن قاضی منصور عباسی چریاکوٹی اپنے وقت کے نامور علماء وفضلاء میں شمار ہوتے تھے، گرمیٔ طبع میں آپ اپنی مثال تھے، جملہ علوم معقول ومنقول کی تحصیل پدر بزرگوار قاضی ابوالحسن سے کی، فراغت تعلیم کے بعد والد کے ایماء پر سند قضا کے حصول کی غرض سے دہلی تشریف لے گئے اور وہاں کے علماء وفضلاء میں علمی صلاحیت وقابلیت کا علَم فوقیت بلند کر کے فرماں روائے دہلی محمد شاہ کے حکم سے چریاکوٹ کی مسند قضا لے کر چریاکوٹ واپس آئے، قاضی عبدالصمد فیصل مقدمات میں

یدطولیٰ رکھنے کے ساتھ درس وتدریس میں بھی گانۂ روزگار تھے، شاہ محمد اسحاق بھیرویؒ ثم لہراوی آپ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ ۱۱۷۱ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ قاضیٔ منصف مادۂ تاریخ ہے۔ (تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۱ ونزہۃ ص ۱۵۲ ج ۶)

مولانا عبدالصمد حسین آبادیؒ

مولانا عبدالصمد بن شیخ محمد اکبر بن شیخ محمد علی بن شیخ مومن علی بن شیخ فقیر اللہ ماہ رمضان ۱۳۲۳ھ میں حسین آباد میں پیدا ہوئے جو قصبہ مبارک پور ضلع اعظم گڈھ کے شمال میں ایک میل کے فاصلے پر مسلمانوں کی ایک بستی ہے۔

قرآن مجید اور اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم مولوی علی احمد مبارک پوری سے حاصل کر کے مدرسہ دارالتعلیم میں داخل ہوئے اور مولانا حکیم محمد اصغر مبارکپوری سے فارسی کی تکمیل کی، نیز انھیں سے فصولِ اکبری، شرح تہذیب اور شرحِ جامی وغیرہ پڑھیں اور مولانا عبدالرحمٰن محدث سے شرح وقایہ جلد اوّل، بلوغ المرام، مشکوٰۃ، جلالین پارہ اول، سراجی اور قطبی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مدرسہ عالیہ مئو میں مولانا عبدالسلام مبارکپوریؒ سے بقیہ جلالین، شرح وقایہ جلد ثانی، شرحِ نخبۃ الفکر، میر قطبی وغیرہ کی تحصیل کی، اور ۱۳۸۸ھ میں مدرسہ حضرت میاں صاحب پھاٹک حبش خاں دہلی میں مولانا شرف الدین دہلویؒ سے مختصر المعانی، دیوانِ متنبی، میر زاہد، ملاّ جلال، ملاحسن، ترمذی شریف، نسائی شریف وغیرہ پڑھیں، اسی درمیان تین ماہ کے لیے سیالکوٹ جاکر مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اور دیگر اساتذہ سے ملاحسن، مختصر المعانی، میبذی اور مقامات وغیرہ پڑھیں۔

تحصیل وتکمیل کے بعد تعلیم وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور مدرسہ اسلامیہ بڑوا، مدرسہ دارالتعلیم مبارک پور، مدرسہ احمدیہ سلفیہ دربھنگہ اور مدرسہ محمودیہ دیوریا میں مدتوں تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دیں، اس کے بعد تصنیف وتالیف میں لگ گئے۔

مولانا نہایت ذی صلاحیت عالم ومدرس تھے، نیکی وشرافت کا نمونہ اور حلم وصبر کا مجسمہ تھے ان کی زندگی سلفِ صالحین کا پرتو معلوم ہوتی تھی، کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے بینائی کمزور

ہوگئی تھی، مگر مطالعہ اور تصنیف وتالیف میں لگے رہتے تھے، وہ کامیاب مصنف ومؤلف اور نہایت اچھے مضمون نگار اور انشاء پرداز تھے، ان کے ذوقِ تصنیف وتالیف اور حدیث ورجال میں دقّتِ نظر کی شہادت کے لیے یہی کافی ہے کہ مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری کے وصال کے بعد مقدمہ تحفۃ الاحوذی کی منتشر یادداشتوں اور نامکمل مباحث کے ابواب وفصول کو مولانا نے مکمل کیا اور اس اہم کتاب کو نہایت سلیقہ مندی اور علمی تحقیق وکاوش سے یوں مرتب ومدون کیا کہ وہ ہر اعتبار سے مکمل ہوگئی۔

مولانا نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے اکثر شائع نہ ہوسکیں ان کے نام یہ ہیں:

(۱) تائید حدیث بجواب تنقید حدیث: یہ کتاب مولوی اسلم جیراج پوری منکر حدیث کے رد میں ہے۔

(۲) شرفِ حدیث: اس کتاب میں بھی مولوی اسلم کے ان مضامین کا رد ہے جو ''طلوعِ اسلام'' نامی پرچے میں چھپے تھے۔

(۳) شانِ حدیث: مولانا کی تصانیف میں منکرینِ حدیث کے رد میں سب سے اہم کتاب ہے، ان تینوں کتابوں کے مضامین اخبار ''اہلحدیث'' امرتسر میں پچاس پچپن قسطوں میں شائع ہوئے، باقی قسطیں شائع نہ ہوسکیں۔

(۴) الفتوحات الربانیہ: تاریخ وہابیہ کے رد میں یہ کتاب چھپ چکی ہے۔

(۵) تذکرۃ الاخوان بمنع شرب الدخان: اس میں حقہ وغیرہ کی ممانعت ہے۔

(۶) ذم غنا ورقص وسرود (۷) احوال الصحابہ (۸) شرح سنن ابن ماجہ ناقص (۹) التبیان لما یجب معرفتہ علیٰ اہل الایمان (عربی) (۱۰) حق پرستی بجواب شخصیت پرستی (۱۱) فقہ حنفی پر ایک نظر وغیرہ۔

افسوس کہ مولانا کی عمر نے وفا نہ کی، ورنہ وہ ہندوستان کے مشاہیر علماء میں ہوتے اور ان کے علمی ودینی کارناموں سے بڑا فائدہ پہونچتا، ان کی وفات ۱۴؍ربیع الاوّل ۱۳۶۷ھ مطابق ۲۶؍جنوری ۱۹۴۸ء یوم دوشنبہ دس بجے رات میں ہوئی اور دوسرے دن حسین آباد کے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ (تذکرۃ علمائے مبارکپور ص ۲۵۷ تا ۲۶۱)

مولانا عبدالصمد کوپاگنجیؒ

مولانا عبدالصمد بن مولوی دین محمد کوپاگنجی اعظمی اپنے دیار کے مشاہیر علماء میں تھے اپنی ٹھوس علمی صلاحیت واستعداد کی بناء پر بڑے مولانا کے لقب سے مشہور تھے۔آپ کی ولادت ۱۳۰۵ھ میں ہوئی ابتدائی تعلیم اپنے والد مولوی دین محمد سے حاصل کی،اس کے بعد مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد میں مولانا منیر احمد سے پڑھا،پھر یہاں سے میڈھو کے مدرسہ میں داخلہ لیا اور وہاں ہندوستان کے مشہور اور نامور معقولی عالم اور محدث حضرت مولانا ماجد علی جونپوری سے جملہ علوم کی تکمیل کر کے سند فراغت حاصل کی۔

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد قصبہ اندارا کے کسی مدرسہ میں مدرس ہوئے،لیکن ایک ہی ماہ میں یہاں سے علیحدہ ہوکر اہل وطن کی خواہش اور طلب پر مدرسہ مصباح العلوم کوپاگنج چلے آئے جہاں پہلے سے آپ کے والد تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، مولانا نے اپنی پوری زندگی مدرسہ مصباح العلوم میں گذار دی،آپ کی ذات سے مدرسہ مذکور کو خوب ترقی ہوئی اور قرب وجوار کے بے شمار طلبہ نے آپ سے اکتساب فیض کیا،جن میں مولانا شکر اللہ مبارک پوری،مولانا اسلام الحق کوپاگنجی،مولانا محمد ایوبؒ مئوی شیخ الحدیث مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل،مولانا عبدالستار ندوی اور مولانا عظیم اللہ کوپاگنجی اپنے اپنے وقت میں علمی حلقوں میں بڑی شہرت ومقبولیت کے مالک ہوئے۔

مولانا کا طریقۂ درس اتنا عمدہ اور دلکش تھا کہ بدشوق سے بدشوق طالب علم کو چند ہفتوں کے اندر علمی اشتیاق پیدا ہوجاتا تھا،طلبہ سے نہایت شفقت ومحبت کے ساتھ پیش آتے اور ان کی تعلیم وتربیت سے کبھی بھی غافل نہ ہوتے تھے۔

علم کے ساتھ قدرت نے صفاتِ حسنہ سے بھی حصہ وافر عطا کیا تھا،ہر چھوٹے بڑے سے نہایت تواضع اور انکساری کا معاملہ فرماتے تھے،تدریس میں انہماک کی وجہ سے تالیف وتصنیف کی جانب توجہ نہ ہوسکی،۸۱ برس کی عمر پاکر ۱۳۸۶ھ مطابق ۶ رجنوری ۱۹۶۶ء میں اپنے آبائی وطن کوپاگنج میں وفات ہوئی اور وہیں اپنے بزرگوں کے جوار میں دفن ہوئے۔

مولانا عبد الصمد ندوی رح

مولانا عبد الصمد ندوی مرحوم کا مولد و منشا موضع چیوٹی ضلع اعظم گڈھ ہے جو محمد پور سے جانب مغرب تقریباً چار میل کے فاصلے پر واقع ہے، لیکن آپ نے زندگی کا اکثر حصہ راجہ پور سکرور میں بسر کیا جہاں آپ کی سسرال تھی، اس لیے اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا اصل وطن یہی ہے۔

مولانا دار العلوم ندوہ کے فارغ التحصیل تھے اور جملہ علوم مروجہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے بالخصوص فن ادب میں ید طولیٰ حاصل تھا، عربی میں بلا جھجک گھنٹوں تقریر کرتے تھے، مدرسۃ الاصلاح میں عربی ادب کے استاذ تھے اور ادب کی اعلیٰ کتابیں متنبی، حماسہ وغیرہ کا درس دیتے تھے، عربی کے اشعار ترنم سے پڑھنے کے عادی تھے۔ راقم سے مولانا عبد الرحمٰن پرواز اصلاحی نے ایک مجلس میں بیان کیا کہ جس زمانہ میں ہم لوگ مولانا سے حماسہ پڑھ رہے تھے، ایک عرب مدرسۃ الاصلاح دیکھنے آئے، اتفاق سے جس وقت وہ مولانا کی درس گاہ میں پہونچے حماسہ کا درس ہو رہا تھا اور مولانا جھوم جھوم کر ترنم کے ساتھ حماسہ کے اشعار پڑھ رہے تھے، عرب صاحب پر آپ کے پڑھنے کا اس قدر اثر ہوا کہ وہ وجد میں ناچنے لگے۔

مولانا عبد الصمد نے مدرسۃ الاصلاح میں بیس برس سے زائد عرصہ تک تعلیمی خدمات انجام دیں، آخر میں بعض وجوہ سے مدرسہ سے الگ ہو کر گھر پر رہنے لگے تھے۔ تقریباً ۱۳۶۵ھ میں آپ کا وصال ہوا افسوس کہ مولانا کے تفصیلی حالات دستیاب نہ ہو سکے، مولانا کے تلامذہ جو اس دیار میں کثیر تعداد میں موجود ہیں ان سے بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

مولانا عبد العزیز رُوانوی رح

مولانا عبد العزیز بن مولوی اسد اللہ موضع رواں ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی صرف ونحو کی تعلیم چشمہ رحمت غازی پور میں حاصل کی اس کے بعد مدرسہ حنفیہ جونپور میں مولانا ہدایت اللہ خاں رامپوری سے منطق فلسفہ اور دیگر علوم کی تحصیل کی پھر یہاں سے

مدرسہ جامع العلوم کانپور میں داخلہ لیا، جہاں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا فیض سرگرم عمل تھا، مولانا عبدالعزیز نے یہاں حضرت تھانوی سے فقہ، اصول فقہ وغیرہ پڑھا، یہاں سے پھر دوبارہ چشمہ رحمت میں چلے آئے اور حافظ عبداللہ غازی پوری سے حدیث اور تفسیر کی کتابیں پڑھیں، یہیں مولانا عبدالرحمٰن بقا غازی پوری (۱) کی خدمت میں معقولات اور ادب کی اعلیٰ کتابوں پر نظر ثانی کی اس طرح سے مختلف اساتذہ سے درسیات کی تکمیل کرکے مولانا سیّد نذیر حسین محدث دہلوی کی خدمت میں پہونچے اور ان سے صحاح ستہ پڑھ کر سند واجازت حاصل کی۔

تکمیل کے بعد مدرسہ احمدیہ آرہ میں تعلیمی وتدریسی خدمت پر مامور ہوئے، پھر یہاں سے شاہجہاں پور کے کسی مدرسہ میں چلے گئے، آخر میں مدھو پور کے مدرسہ میں مدرس ہوئے اور یہیں ۲۴ رصفر ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۰ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو چوالیس (۴۴) برس کی عمر میں وفات پاگئے۔

مولانا عبدالعزیز مرحوم کی مسائل علمیہ پر بڑی وسیع نظر تھی، مطالعہ کتب میں اس درجہ انہماک تھا کہ کھانے پینے کی فکر نہیں رہتی تھی، سفر وحضر دونوں میں کتب بینی کا سلسلہ جاری رہتا تھا، مولانا نے بعض کتابیں بھی تصنیف کی تھیں، مگر مالی دشواریوں کی وجہ سے وہ طبع نہ ہوسکیں۔ (تراجم اہلحدیث ص ۳۹۲)

مولانا عبدالعلیم رسول پوریؒ

مولانا حاجی حکیم مفتی ابوالامجد عبدالعلیم بن شیخ عبدالرحیم بن شیخ جمال الدین بن شیخ بھکاری بن شیخ پہاڑ بن شیخ کھیدو حنفی رسول پوری اعظمی ۱۲۷۰ھ اور ۱۲۸۰ھ کے درمیان پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور فارسی کی تعلیم املو میں ایک میاں صاحب سے حاصل

(۱) مولانا عبدالرحمٰن بقا غازی پوری کے والد کا نام چھچھو تھا، آپ مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری کے بھانجے ہیں ۲۵ر رجب ۱۲۸۱ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، ابتداءً حفظ قرآن کیا بعدہ علوم عربیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور مولانا عبدالاحد لکھنوی ومولانا عبداللہ غازی پوری ودیگر اساتذۂ چشمۂ رحمت سے تحصیل وتکمیل کی، فراغت کے بعد چشمۂ رحمت ہی میں مدرس مقرر ہوئے اور طویل مدت تک اسی خدمت پر باقی رہے، آخر میں بلا معاوضہ تنخواہ پڑھاتے تھے۔

کر کے میاں جان محمد مبارک پوری سے تکمیل کی اس کے بعد گورکھپور گئے اور متوسطات کی تعلیم حاصل کی، بعد ازاں مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی متوفی ۱۳۰۴ھ کی خدمت میں لکھنؤ پہونچے اور ان سے فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت اور اسطرلاب کی تعلیم حاصل کی، پھر مولانا مفتی ابوالحیا محمد نعیم بن مولانا عبدالحکیم فرنگی محلی (۱) سے حدیث کی تکمیل کی اور ان ہی کے ہاتھ پر بیعت کی، علوم دینیہ کی تحصیل و تکمیل کے بعد بنارس میں مولانا حکیم عبدالعلی صاحب لکھنوی سے علم طب کی تحصیل کر کے ان ہی کے یہاں نسخہ نویسی سیکھی۔ چند ماہ مرزاپور میں مولانا معین الدین (۲) سے بھی پڑھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ سراپائے غم اور دوسری کتابوں میں مولانا عبدالحیٔ کے تلامذہ میں اعظم گڈھ کے متعدد علماء کا نام موجود ہے، مگر مولانا عبدالعلیم کا نام نہیں ہے، حالانکہ ان کی متعدد کتابوں پر میں نے ان کے قلم سے مولانا عبدالحیٔ سے تلمذ کی تصریح دیکھی ہے، مولانا نے جن شیوخ واساتذہ سے علم حدیث کی تکمیل کی ہے اپنی سند میں ان کے ناموں کی تصریح کی ہے اور ان میں ان کے ان دونوں فرنگی محلی شیوخ کے اسمائے گرامی بھی ہیں چنانچہ ان کی سند میں ہے:

منهم العلامة الجليل رحلة عصره معتمد دهره ذوالتصانيف الجليلة مجدد دين الله على راس ثلثمأة والف شيخنا وسيّدنا مولانا ابوالحسنات محمد عبدالحی اللكنوی، منهم العارف الربانی فقيد المثل والثانی معتمد العلم والعلماء ولی من اولياء الله شيخنا وسيّدنا و مولانا ابوالحيا محمد

(۱) مولانا محمد نعیم بن عبدالحکیم فرنگی محلی اپنے عہد میں فقہ، اصول فقہ اور علم کلام میں امتیازی شان رکھتے تھے، جملہ علوم مروجہ کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی تھی، حدیث میں شیخ احمد بن زین دحلان مکی سے بھی سند واجازت حاصل کیا تھا، مولانا صفت علم کے ساتھ زیور زہد وتقویٰ سے بھی آراستہ تھے، آپ کا وصال ۲۱/ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ میں لکھنؤ میں ہوا۔ (نزہہ ص ۵۹ ۴ وص ۴۶۰ واحوال علمائے فرنگی محل)

(۲) مولانا معین الدین بن خیرات کڑوی چالیس برس تک درس وافادہ میں سرگرم عمل رہے، ہزاروں طلبہ آپ کی درسگاہ سے عالم وفاضل ہوکر نکلے، آپ نے علوم وفنون کی تحصیل مولانا عبدالحکیم فرنگی محلی، مفتی ظہور اللہ فرنگی محلی اور مرزا حسن علی محدث وغیرہ سے کی تھی، کچھ دنوں تک لکھنؤ میں درس دیا اس کے بعد مرزاپور چلے آئے، تدریس کے ساتھ مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ۳/ربیع الاول ۱۳۰۴ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ (نزہہ ص ۴۷۹)

نعیم اللکنوی من احفاد ملا نظام الدین صاحب السلسلۃ النظامیۃ.

معلوم نہیں ان کو مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کے تلامذہ کی فہرست میں کیوں نہیں ذکر کیا گیا، فراغت کے بعد کچھ دنوں اطراف لکھنؤ کی ریاست میں تعلیمی خدمات انجام دیں، اس کے بعد قصبہ مئو ضلع اعظم گڈھ میں شیخ نورعلی عباسی کے مدرسہ میں جوان کے مکان کے ایک حصہ میں تھا تعلیم دی، پھر وہاں سے غازی پور چلے گئے اور چشمہ رحمت میں تدریسی خدمت کا سلسلہ شروع کیا، اس زمانہ میں مدرسہ چشمہ رحمت میں مولانا حافظ عبداللہ مئوی غازی پوری، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، مولانا امانت اللہ غازی پوری اپنے ذوق اور معیار کے مطابق خدمات انجام دے رہے تھے، یہاں آنے کے بعد مولانا نے متوسطات سے لے کر منتہی کتابوں تک کا درس دینا شروع کیا، اسی زمانے میں مولانا مفتی محمد ابراہیم بنارسی نے ان سے حدیث پڑھ کر سند فراغت لی ۱۳۱۵ھ میں ان کی تعلیمی و تدریسی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔

مولانا چشمہ رحمت میں گئے تو آخر وقت تک اس سے جدا نہ ہوئے اور کم و بیش ۲۵ سال تک وہاں صدر مدرسی کے فرائض انجام دیے اور اس پوری مدت میں مفتیٔ شہر بھی رہے۔

مولانا عبدالعلیم اپنے زمانے میں اس دیار کے زبردست فقیہ، اصولی، مفتی اور حنفی عالم تھے، علوم نقلیہ و عقلیہ میں جامع تھے اور علم کلام میں یدطولیٰ رکھتے تھے، طب اور حکمت میں اپنی مثال آپ تھے، ذہانت اور طباعی بلا کی تھی۔

مولانا نے کم و بیش چالیس سال تک مروجہ علوم وفنون کا درس دیا اور تصنیف وتالیف کا شغل جاری رکھا، ان کی درس گاہ سے ہزارہا طلبہ فارغ ہوکر نکلے، ان میں سے چند مشاہیر کے نام یہ ہیں:

مولانا مفتی محمد ابراہیم بنارسیؒ متوفی ۱۳۸۴ھ مفتیٔ اعظم شہر بنارس، مولانا احمد حسین رسول پوریؒ برادر خورد مولانا عبدالعلیم صاحب، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا شاہ محمد سریانوی، مولانا شیخ محمد عباسی، صدر قانون گو گورکھپور، مولانا ابوالحسن حیدری غازی پوری، مولانا محمد طفیل املوی۔

آپ نے درس وافادہ، افتاء اور طبابت کے ساتھ تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور متعدد کتابیں لکھیں جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) اساس التوحید فارسی: یہ کتاب علم کلام وعقائد میں ہے، مولانا کی یہ سب سے پہلی تصنیف ہے، جسے فراغت کے بعد ۱۳۰۴ھ میں لکھا۔

(۲) سیّد التخریج مسمّٰی بہ توضیح الفرائض: یہ کتاب علم الفرائض والمواریث میں ہے اس کا سنہ تالیف ۱۳۱۹ھ ہے۔

(۳) التبصرہ فی تحقیق الاشربہ: یہ رسالہ حُقّہ وغیرہ کی حلّت وحرمت اور کراہت کی بحث میں ہے۔

(۴) کتابُ الشہادت: اس کتاب کی تصنیف کا باعث مبارک پور میں ۱۳۲۱ھ و ۱۳۲۲ھ کا وہ قیامت خیز طاعون ہے جس سے ہزاروں گھر کے چراغ گل ہوگئے، یہ کتاب مولانا شیخ محمد عباسی کے اہتمام سے ۱۳۳۲ھ میں گورکھپور میں چھپی۔

(۵) درۃ التاج الانور فی اذان الجمعۃ عند المنبر: مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے رد میں یہ کتاب تالیف فرمائی۔

(۶) الخطب المنبر یہ من الآیات القرآنیہ: اس مجموعۂ خطب کو قرآنی آیات سے مرتب کیا ہے جو نہایت مقبول ہوا۔

(۷) سفرنامہ حجاز: حج وزیارت کے دوران مولانا نے ممالکِ اسلامیہ سے آئے ہوئے علماء وفضلاء سے مل کر جمعہ کی اذان ثانی کے بارے میں ان کا تعامل معلوم کرکے اس رسالہ میں بیان کیا ہے۔

ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ آپ کی کئی علمی وتحقیقی اور فنی تصانیف غیر مطبوعہ ہیں، مثلاً:

(۱) اصول فقہ: یہ آپ کی آخری تصنیف ہے اس پر سن تصنیف ربیع الثانی ۱۳۴۱ھ درج ہے، اسی سال آپ کا وصال ہوا۔

(۲) الدّوحۃ الناظرہ فی علم المناظرہ: فنِ مناظرہ میں ہے، اس کے مسودہ پر سن تصنیف ۱۳۲۴ھ ہے۔

(۳) الفرید الوضعیہ فی الحکمۃ الالٰہیہ: یہ کتاب عربی زبان میں الٰہیات پر ہے۔

(۴) رواۃ البخاری المجروحون: یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور صحیح بخاری کے بعض رجال ورواۃ پر امام دار قطنی کے انداز پر نقد ونظر ہے۔

(۵) مجموعہ فتاویٰ علیمی: یہ مولانا کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو کئی ضخیم جلدوں میں ہے، اس میں آخری فتویٰ پر یکم اپریل ۱۹۲۱ء درج ہے اس کے ایک سال بعد ۲۲/اپریل ۱۹۲۲ء کوریل کے ایک حادثہ میں آپ کا انتقال ہوا۔

مولانا بنارس تشریف لے جارہے تھے، اوڑیہار جنکشن پر غازی پور سے آنے والی ٹرین کھڑی تھی جس پر مولانا سوار تھے اسی ٹرین سے دوسری آنے والی ٹرین ٹکرا گئی جس کے صدمہ سے مولانا جس بوگی میں بیٹھے تھے اس کی چھت پھٹ گئی، اس میں بیٹھے ہوئے تمام مسافر زخمی ہو گئے، مولانا کو بھی سخت چوٹ آئی، سر پھٹ گیا تھا، آپ کو وہاں سے لاکر بنارس اسپتال میں داخل کیا گیا، مگر زخم بہت شدید تھا، آپ جانبر نہ ہو سکے اور اسپتال ہی میں ۲۲/اپریل ۱۹۲۲ء مطابق ۱۳۴۱ھ کو آپ کا انتقال ہو گیا اور محلہ بکی باغ بنارس میں ٹیاؤ شہید کے مزار کے قریب بلندی پر دفن کیے گئے۔ (تذکرۂ علمائے مبارک پور ص ۱۵۷)

حضرت مولانا عبدالغفار مئویؒ

استاذ العلماء مولانا مفتی حکیم ابوالانوار عبدالغفار بن شیخ عبداللہ بن شیخ تراب علی بن شیخ میہان بن شیخ ہمت علی عراقی مئوی حنفی کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں، آپ کے تلامذہ کی کثرت وشہرت نے آپ کو پورے ہندوستان میں روشناس کر دیا ہے۔

۲/صفر ۱۲۸۳ھ میں آبائی مکان محلہ اورنگ آباد قصبہ مئو ضلع اعظم گڈھ میں مولانا کی ولادت ہوئی، والد محترم نے ظہور المنان تاریخی نام تجویز کیا۔

آپ کے آباء واجداد اصل باشندہ قاسم آباد ضلع غازی پور کے تھے، مولانا کے جد اعلیٰ شیخ ہمت علی کا عقد مئو کے رئیس اور آنریری مجسٹریٹ شیخ روشن علی بن شیخ زور آور کی دخترِ نیک اختر سے ہوا تھا، چونکہ شیخ روشن علی کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی اس لیے ان کی وفات کے بعد

شیخ ہمت علی ان کی تمام جائداد کے مالک ہوئے اور مستقل طور سے مئو میں سکونت اختیار کرلی، یہیں ۱۲۵۲ھ میں مولانا کے والد شیخ عبداللہ پیدا ہوئے، شیخ عبداللہ، اردو فارسی اوراحکام دینیہ سے پوری واقفیت رکھتے تھے اور علمِ ریاضی میں انھیں خاص ملکہ حاصل تھا، علماء وصوفیہ کی مجلسوں میں بڑے ذوق وشوق سے حاضر ہوتے اوران کے علمی وروحانی فیوض وبرکات سے مستفید و مستفیض ہوتے تھے اور اس وقت کے مشہور مرشد حضرت چاند شاہ ٹانڈوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت بھی تھے، کہتے ہیں کہ بیعت کے بعد آپ پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی اور ترک وتجرید کا ایسا غلبہ ہوا کہ گھر، جائداد اور اہلِ خانہ سب چیزوں سے بے نیاز ہوکر حضرت چاند شاہ کے آستانہ پر پڑے رہے اور مسلسل تین برس تک حضرت چاند شاہ کی صحبت میں رہ کر تصوّف کے اسرار ورموز اوراس کے حقائق سے آگاہی حاصل کی۔

ایسے دینی وروحانی ماحول میں مولانا عبدالغفار نے آنکھیں کھولیں جس کا اثر ان کی نشوونما پر یقینی طور سے پڑا، مولانا کی عمر جب چار سال کی ہوگئی تو والد ماجد شیخ عبداللہ سے قرآن پڑھنا شروع کردیا اور انھیں سے اردو، فارسی کی ابتدائی کتابیں سکندر نامہ تک پڑھیں، اس کے بعد قصبہ کے فارسی خواں اساتذہ سے انشائے بہارِ عجم، انشائے فائق، رقعاتِ مرزا قتیل وابوالفضل، نہر الفصاحت، شجر الامانی، بہارِ دانش، مینا بازار، دیوانِ غنی، سہ نثرِ ظہوری، قصائدِ عرفی اور بزم چاچ وغیرہ کتب فارسیہ کی تحصیل وتکمیل کی۔

فارسی زبان میں مہارتِ تامہ حاصل ہوجانے کے بعد عربی شروع کی اور صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں مولوی جمال الدین مئوی سے ختم کرکے استاذ الاساتذہ مولانا فیض اللہ مئوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اوران سے ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی، شرح وقایہ، قال اقول، قطبی، میر قطبی اور مشکوٰۃ شریف کی تعلیم حاصل کی، حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں صوبہ سرحد کے مشہور عالم اور مثالی مدرس مولانا امام الدین خاں پنجابی (۱) مئو تشریف لائے تو مولانا نے

(۱) مولانا امام الدین پنجاب کے رہنے والے تھے، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے تعلیم حاصل کی تھی، آپ نے مئو میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی اور یہیں قریب کے گاؤں میں شادی کرلی تھی، آپ سے قصبہ مئو کو بہت زیادہ فیض پہونچا اور یہاں کے اکثر علماء آپ کے سلسلہ تلمذ میں شامل ہیں، مئو ہی میں آپ کا وصال ہوا اور محلہ اورنگ آباد میں مدفون ہوئے۔ تاریخ وفات ۱۳۳۵ ہجری ہے۔

ان سے شافیہ، کنز الدقائق، تلخیص المفتاح، مختصر المعانی، عجب العجاب اور علم الفرائض کے ساتھ دوبارہ شرح جامی، قطبی، شرح تہذیب نہایت تحقیق و تمحیص سے پڑھیں، اس کے بعد ضلع بلیا کے مشہور مدرسہ نوانگر میں داخلہ لیا جہاں اس وقت مولانا حکیم عبداللہ مجددی (۱) تلمیذ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی محدث مجددی تدریسی خدمت انجام دے رہے تھے، مولانا عبدالغفار نے ان سے شرحِ وقایہ، قطبی تصدیقات، مختصر المعانی، نور الانوار، شرحِ عقائد نسفی، میبذی، رشیدیہ، سراجی اور ملا حسن کی تعلیم و تحصیل کی، پھر یہاں سے غازی پور پہونچے اور ملا عارف ولایتی سے دوبارہ ملا حسن اور مسلّم الثبوت پڑھ کر گھر واپس ہوئے۔

اس دور میں مولانا عبدالاحد الہ آبادی (۲) شاگرد رشید حضرت مولانا عبدالحئی فرنگی محلی علمائے درس میں بڑی شہرت کے مالک تھے، مولانا کو اس گلستانِ علم سے بھی خوشہ چینی کا شوق دامن گیر ہوا اور ۱۸۸۴ء مطابق ۱۳۰۲ھ میں آپ مرزاپور پہونچ گئے، جہاں کے ہائی اسکول میں مولانا عبداللہ الہ آبادی تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، تقریباً دو

(۱) مولانا عبداللہ بن عمر مجددی دہلوی ۱۲۷۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں اپنے والد کے ہمراہ مکہ معظمہ چلے گئے اور وہیں شیخ عبدالحق بن شاہ محمد الہ آبادی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا حبیب الرحمٰن ردولوی اور شیخ سیّد احمد دحلان وغیرہ سے تعلیم حاصل کی، پھر دہلی واپس آکر ایک عرصہ تک عزلت گزیں رہے، بعد ازاں درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا، آپ کو خدا نے بڑی مقبولیت دی تھی ۱۳۴۱ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ (نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۲۱۹)

(۲) مولانا عبدالاحد بن شیخ امام علی صدیقی الہ آباد کے ایک محلہ مہندوری (جو دریائے گنگا کے کنارے پھاپھامئو پل کے قریب واقع ہے) میں ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مکمل کر کے حضرت مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کی خدمت میں لکھنؤ پہونچے اور ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر علوم مروجہ کی تکمیل کی، رفقاء درس میں الہ آباد کے مشہور عالم و شیخ مولانا محمد حسین الہ آبادی بھی تھے، مشہور ہے کہ لکھنؤ کے زمانۂ طالب علمی میں حضرت مولانا عبدالحئی کے حکم سے نیچے کے درجات کے طلبہ کو آپ پڑھاتے تھے، مولانا کا علم بہت مستحضر تھا اور جملہ علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے، بالخصوص معقولات میں امامت کے درجہ پر فائز تھے۔ علوم دینیہ کے علاوہ علم طب میں بھی مہارت رکھتے تھے، شعر و سخن میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، تعلیم و تدریس کے ساتھ تصنیفی مشاغل سے بھی دلچسپی تھی متعدد کتابیں یادگار چھوڑیں، جن میں پارۂ عم کی تفسیر بے نقط فیضِ غیب کے نام سے لکھی، جو آپ کے تبحر علمی کی روشن دلیل ہے، اس کے علاوہ حاشیہ التصریح فی التشریح، حاشیہ قاضی مبارک، دیوان فارسی، دیوان اردو، یہ کتابیں طبع ہو چکی ہیں اور اہل علم سے داد تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اپنے استاذ و شیخ مولانا فرنگی محلی کی طرح یہ آفتاب بھی عالم شباب میں ۲۲ر اگست ۱۸۹۷ء مطابق ۱۳۱۵ھ کو مہندوری میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

سال وہاں رہ کر مولانا عبدالاحد سے شرحِ تہذیب، ملا جلال مع حاشیہ میر زاہد ومنہیہ، رسالہ میر زاہد مع رسالہ غلام یحییٰ، شرح مواقف امور عامہ، شرح حمد اللہ، شرح قاضی مبارک، صدرا، شمس بازغہ، شرح چغمینی، مقامات حریری اور ہدایہ وغیرہ اہم کتابیں پڑھیں اور ۱۸۸۶ء مطابق ۱۳۰۴ھ میں یہاں کی تعلیم مکمل کر کے سالانہ امتحان میں شریک ہوئے اور کامیابی حاصل کر کے اسکول سے سندِ فراغت لے کر مکان واپس آئے۔

مولانا عبدالاحد ایک اچھے شاعر بھی تھے اور شعر وادب کی مجلسوں میں بڑے ذوق وشوق سے شرکت کرتے تھے، ان کی صحبت کے اثر سے مولانا عبدالغفار نے بھی مشقِ سخن شروع کر دی اور مولانا عبدالاحد کے ہمراہ ادبی مجلسوں میں شریک ہوتے اور اپنی غزلیں سناتے جو بہت پسند کی جاتیں۔

اب مولانا عبدالغفار نے علوم مروّجہ، متداولہ کی تحصیل وتکمیل کر لی تھی اور تمام علوم وفنون میں آپ کو خاص مہارت حاصل ہو چکی تھی، اس لیے علم حدیث کی تحصیل کی جانب توجہ کی، اس وقت حضرت مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی کے شبابِ علم کا علمی دنیا میں غلغلہ بلند تھا کوئی علمی مجلس ایسی نہ ہوتی جس میں مولانا کا ذکرِ خیر نہ ہوتا ہو، اس لیے ۱۳۰۴ھ میں مولانا عبدالغفار نے لکھنؤ کا علمی سفر کیا، لکھنؤ پہنچ کر معلوم ہوا کہ حضرت مولانا مرضِ صرع میں مبتلا ہیں، مولانا عبدالغفار صاحبؒ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پرسشِ احوال کے بعد حاضری کی غرض بیان کی، حضرت مولانا نے فرمایا کہ ابھی میں علیل ہوں صحت کے بعد جب درس شروع ہوگا تو آپ بھی شریک ہو جایئے گا، اس گفتگو کے تیسرے دن ۳۰ ربیع الاوّل ۱۳۰۴ھ یوم دوشنبہ کو بوقتِ صبح صادق یہ آفتابِ علم ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا، مولانا عبدالغفار صاحب کو اس حادثۂ غیر متوقعہ پر ایک زبردست جھٹکا لگا اور اپنی ناکامی ونامرادی کا سخت صدمہ ہوا۔

حضرت مولانا عبدالحیٔ قدس سرہ کی وفات کے بعد چونکہ لکھنؤ میں کوئی دوسری شخصیت ایسی نہیں تھی جس سے علم حدیث کی تحصیل کی جاتی اس لیے مولانا عبدالغفار صاحب نے اپنی تمام تر توجہ علمِ ادب اور طب پر مبذول کر دی اور حکیم سیّد باقر حسین سے شرح

حمیات، کلیات اور حکیم عبدالعزیز دریابادی (۱) سے سدیدی، نفیسی اور کلیات وغیرہ طب کی کتابیں پڑھیں اور مطب میں حاضر ہوکر طریقۂ معالجہ کی مشق بھی کی، اس کے ساتھ ہی نواب سیّد مہدی حسن نقوی سے ادب میں کوکب دری، دیوان متنبی، سبعہ معلقہ، دیوانِ حماسہ اور مقاماتِ حریری وغیرہ کی تحصیل کی اور دونوں فنون میں کامل دستگاہ حاصل کرکے ان کے اساتذہ سے سند لی۔

آگے ذکر ہو چکا ہے کہ مرزا پور میں مولانا عبدالاحد الٰہ آبادی کی ترغیب سے مولانا نے شاعری بھی شروع کردی تھی، لکھنؤ آئے تو یہاں اس کا خوب میدان ملا، حکیم باقر حسین کے دولت کدہ پر اکثر ادبی مجلسیں ہوا کرتی تھیں، ان مجلسوں میں مولانا بھی ایک شاعر کی حیثیت سے شریک ہوتے اور حاضرین سے دادِ سخن لیتے لکھنؤ کے قیام سے مولانا کے ذوق شعری میں جلا آگئی اور آپ ایک کہنہ مشق شاعر کی طرح شعر کی نزاکتوں سے اچھی طرح واقف ہوگئے۔

مولانا کا یہ سفر علم حدیث کی تحصیل کی غرض سے ہوا تھا، مگر حضرت مولانا عبدالحئی قدس سرہ کی وفات سے مولانا کو ناچار اپنا رخ بدلنا پڑا تھا، اس لیے ایک سال کے قیام کے بعد آپ لکھنؤ سے گنگوہ روانہ ہوگئے، جہاں قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہ کا چشمہ فیض تشنگانِ علوم نبویہ کو سیراب کررہا تھا، مولانا عبدالغفار مرحوم ماہ ذیقعدہ ۱۳۰۵ھ کے کے آخری عشرہ میں حضرت گنگوہی قدس سرہ کی خدمت میں گنگوہ پہنچ گئے اور پورے ایک سال حضرت کی صحبت میں رہ کر صحیح ستہ کو سبقاً سبقاً پڑھا، تکمیل کے بعد شعبان ۱۳۰۶ھ میں حضرت گنگوہی سے مکان آنے کی اجازت طلب کی اور حدیث پاک کی سند واجازت مانگی، حضرت نے مراجعت کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا تم جاؤ میں سند بھیج دوں گا، چنانچہ مولانا عبدالغفار مرحوم کے مکان چلے آنے کے بعد اسی سال حضرت گنگوہی نے اپنے دستِ مبارک سے لکھ کر سند بھیج دی پھر دوسرے سال ۱۳۰۷ھ میں ایک مطبوعہ سند بھی ارسال فرمائی اس طرح ۲۳ برس کی عمر میں مسلسل ۱۹ سال تک محنت وجانفشانی سے وقت کے مشاہیر علماء

(۱) حکیم عبدالعزیز بن نور کریم دریابادی کی پیدائش ۱۲۶۱ھ میں اور وفات ۱۳۱۴ھ میں ہوئی، علوم عربیہ کی تعلیم مولانا محمد نعیم اور ان کے والد مولانا عبدالحکیم فرنگی محلی اور مفتی سعد اللہ مرادآبادی سے حاصل کی اور طب وحکمت کی تحصیل حکیم ابراہیم اور ان کے والد حکیم یعقوب سے کی اور ان سے بہت سے اطباء نے تعلیم حاصل کی۔ کیننگ کالج (تکمیل الطب) میں مدرس تھے۔

واساتذہ سے جملہ علوم وفنون کی تحصیل فرما کر آپ نے فاتحۂ فراغ پڑھی۔

حضرت گنگوہی قدس اسرارہ کے تلامذہ کی فہرست میں مولانا کا اسمِ گرامی سرفہرست ہے جس سے مولانا کی علمی صلاحیت واستعداد کا پتہ چلتا ہے، تحصیل وتکمیل کے بعد علماء فضلاء کے طریق پر آپ نے درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور قصبہ مئو کی شاہی مسجد میں درس دینا شروع کیا، اس درسگاہ کو مولانا کے استاذ مولانا امام الدین پنجابی نے ۱۲۹۶ھ میں قائم کیا تھا، یہاں دو سال تعلیمی خدمت انجام دے کر ۱۳۰۸ھ میں مولانا عبدالباری کی طلب پر مہراج گنج ضلع بتیا کے مدرسہ میں چلے گئے اور ۱۳۱۱ھ تک یہاں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا اس مدت میں مولانا کی علمی صلاحیت واستعداد کا جوہر خوب نمایاں ہوگیا اور آپ کے تبحر کا چرچا عام طور سے طلبہ وعلماء میں ہونے لگا، مہراج گنج کے زمانۂ قیام ہی میں مدرسہ انوار العلوم نوانگر ضلع بلیا کے منتظمین نے باصرار آپ کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، چونکہ اس درسگاہ سے آپ نے استفادہ کیا تھا اس لیے اس کی خدمت اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتے تھے، اس تعلق کے پیش نظر ۲۴؍شعبان ۱۳۱۱ھ میں آپ مدرسہ انوار العلوم چلے آئے اور پورے اٹھارہ سال نہایت استقلال اور دلجمعی کے ساتھ یہاں تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دیں، اس زمانے میں آپ کی علمی اور تدریسی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا، طلبہ کا رجوع اس قدر ہوا کہ اطراف وجوانب کی درسگاہوں کی رونق ماند پڑ گئی اور بیشمار طلبۂ علوم نے آپ سے استفادہ کیا۔

انوار العلوم نوانگر کے زمانۂ تدریس ۱۳۲۱ھ میں حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً وتعظیماً کی زیارت سے مشرف ہوئے اور خاص بلد امین کے جوار میں حضرت مولانا عبدالحق (۱)

(۱) حضرت مولانا عبدالحق شیخ الدلائل الہ آبادی نیواں نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، مولانا تراب علی اور شیخ قطب الدین نواب دہلوی سے تعلیم حاصل کی، مولانا عبداللہ گورکھپوری سے آپ کو خلافت واجازت حاصل تھی، بہت دنوں تک رسڑا ضلع بلیا کے مدرسہ غفاریہ میں مدرس رہے، یہاں مولانا تراب علی سے تعلیم بھی حاصل کی تھی، آخر میں مکہ معظمہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے وہاں بھی بہت سے علماء نے آپ سے تعلیم حاصل کی جن میں مولانا عبداللہ مجددی اور مولانا عبدالاول بن مولانا کرامت علی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ الدر المختار پر آپ نے حاشیہ لکھا تھا اس کے علاوہ تفسیر میں اکلیل شرح مدارک التنزیل کئی ضخیم جلدوں میں آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ ۱۹؍شوال ۱۳۳۳ھ میں مکہ معظمہ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (نزہۃ ص ۲۲۰ ج ۸)

مہاجر مکّی صاحبِ اکلیل سے حدیث کی اجازت وسند حاصل کی، مہراج گنج سے اگرچہ آپ الگ ہو گئے تھے اور علیحدگی کی مدت بھی دراز ہو چکی تھی، لیکن وہاں کے اہل علم کے دلوں سے آپ کی علمی صلاحیتوں کا نقش مٹا نہیں تھا اور طلبی کے خطوط برابر ارسال کرتے رہے، ان کے مسلسل اصرار پر آپ دوبارہ مہراج گنج تشریف لے گئے اور دو سال وہاں درس وتدریس کی خدمت انجام دے کر ۱۳۳۱ھ میں انجمن اسلامیہ گورکھپور میں مسند صدارت کو زینت بخشی اور تین برس یہاں گذار کر ۱۳۳۴ھ میں جامعہ مظہر العلوم کچی باغ بنارس میں صدر المدرسین کے عہدہ پر فائز ہوئے، اسی زمانہ میں یعنی ۱۳۳۱ھ سے ۱۳۳۶ھ کے درمیان میں محدث عصر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مئوی نے آپ سے استفادہ کیا، یہاں سے پھر انجمن اسلامیہ گورکھپور چلے آئے اور یہیں تاحیات درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہ کر ۱۳۴۱ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ''جزاءہ مغفرۃ'' مادۂ تاریخ ہے۔

مولانا نے کم وبیش ۳۵ سال تک مروجہ علوم وفنون کا درس دیا اور تصنیف وتالیف کا شغل جاری رکھا، اس طویل مدت میں ہزاروں طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا، ان میں چند مشاہیر علماء کے نام یہ ہیں: محدّثِ عصر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی، شیخ المعقول حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی سابق صدر مدرس دار العلوم دیوبند، مولانا ریاض احمد بتیاوی سابق استاذ دار العلوم دیوبند، مولانا ابوالحسن حیدری غازی پوری، مولانا ضمیر احمد قدسی مئوی، مولانا ابوالحسن مئوی، مولانا ابوالبرکات مئوی۔

مولانا نے تعلیم وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور متعدد کتابیں لکھیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) غرائب البیان فی مناقب النعمان: امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔

(۲) مسلک البررہ فی منسک الحج والعمرۃ: حج اور عمرہ کے مناسک واحکام میں۔

(۳) مقوی الذریٰ لمن تمسک باوثق العریٰ: ''رسالہ اوثق العریٰ'' مصنفہ حضرت گنگوہی کے رد میں ایک اہل حدیث عالم نے ایک رسالہ لکھا تھا، مولانا نے اسی رسالہ کا اس

کتاب میں مدلل جواب دیا ہے اور اپنے استاذ حضرت گنگوہیؒ کے اقوال کو دلائل و براہین کی روشنی میں درست قرار دیا ہے۔

(۴) طیب الاقاصی فی مسائل الاضاحی: موضوعِ بحث نام سے واضح ہے۔

(۵) کشف الحقیقۃ فی مسائل العقیقۃ۔

(۶) تحقیق قول الطرفین فی الکلام بین الخطبتین۔

(۷) کشف المکنون فی الخروج من الطاعون: یہ کتاب اپنے موضوع پر نہایت جامعیت اور تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے اور اس سلسلے کی جملہ احادیث و آثار کو نہایت قرینے سے جمع کیا گیا ہے۔

(۸) راحۃ المحزون فی شرح الطاعون: یہ رسالہ بھی اول الذکر رسالہ کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔

(۹) مذہبی مکالمہ: آریہ دھرم کی تردید میں نہایت جامع رسالہ ہے اور اندازِ بیان نہایت اچھوتا، پڑھتے جایئے اور لطف اٹھاتے جایئے۔

ہدایۃ المہتدی فی حکم اہاب الاضاحی: چرمِ قربانی کے احکام و مسائل سے اس رسالہ میں بحث کی گئی ہے۔

یہ کتابیں مولانا کی حیات ہی میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر مقبول ہو چکی ہیں ان میں سے بعض بعض رسالوں کے دو دو تین تین ایڈیشن شائع ہوئے۔

ان کے علاوہ بہت سے رسائل اور کتابیں غیر مطبوع ہیں جن میں: (۱) ردّ عقائد نیچریہ، (۲) الستر عن جلستی الوتر (۳) ترغیب المتلاقین فی المصافحۃ بالیدین (۴) کحل العینین لمن لم یتبصر بقول الطرفین (۵) الجام المتعنتین، اپنے موضوع پر نہایت جامع اور بڑی اہم ہیں بالخصوص الجام المتعنتین علمی دنیا کے لیے ایک تحفۂ بے بہا ہے، کاش مولانا کے متعلقین اس کے شائع کرنے کا انتظام کرتے، مولانا نے اس کتاب کو بڑی محنت و کاوش سے مرتب کیا ہے، اس کتاب میں بہت سی ایسی کتابوں کے بھی حوالے ہیں جو اس وقت ہندوستان میں نایاب تھیں، تقریباً ۳۰۰ کتابوں کے حوالے اس کتاب میں دیے گئے ہیں۔

مولانا کی شاعری کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے، مولانا اشعار میں اپنا تخلّص ضیاء لکھتے تھے، عربی وفارسی کے اشعار پر مشتمل دیوان تحفۂ ضیائی کے نام سے غیر مطبوع مولانا کے صاحبزادے مولانا حکیم انعام الحق عراقی مئوی کے پاس موجود ہے، میں نے اسے دیکھا ہے، فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں مولانا کا کلام نہایت بلند پایہ اور شاعری کی جملہ صفات کا حامل ہے۔

مولانا علومِ ظاہری میں تبحر رکھنے کے ساتھ علومِ باطنی میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے اور اپنے والد ماجد کے پیرومرشد حضرت چاند شاہ ٹانڈوی سے ۱۱ رشوال ۱۳۰۹ھ میں باقاعدہ بیعت ہو گئے تھے اور بیعت کے بعد چاند شاہ کی خدمت میں حاضر بھی ہوئے تھے، آخری بار ۱۳۱۷ھ میں ٹانڈہ تشریف لے گئے اس کے بعد پھر چاند شاہ کی صحبت نہ مل سکی: کیونکہ اسی سال چاند شاہ کا وصال ہو گیا۔

(نخبۃ الاخبار من سوانح ابی الانوار خودنوشت سوانح ونزہۃ ج ۸ ص ۲۶۹، تذکرہ علمائے حال ص ۷ ۴)

مولانا عبدالغفار کھنڈویؒ

مولانا عبدالغفار بن محمد شبیر ضلع اعظم گڈھ کے مشہور گاؤں کھنڈہ میں پیدا ہوئے، جو قصبہ پھول پور سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر جانب شمال ومغرب واقع ہے، مکتب کی تعلیم آبائی وطن میں حاصل کر کے اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں داخل ہوئے اور صرف ونحو وغیرہ کی تحصیل کر کے یہاں سے ۱۳۴۵ھ میں دیوبند چلے گئے، دارالعلوم دیوبند کے مشہور اختلاف واقع ۱۳۴۶ھ کے وقت مولانا عبدالغفار دارالعلوم میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اس موقع پر جبکہ مدرسہ کے قدیم طلبہ دارالعلوم سے بالکل منحرف ہو گئے تھے اور دارالعلوم کے خلاف انھوں نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو داؤں پر لگا دیا، مولانا برابر مدرسہ کے حق میں رہے اور منتظمین دارالعلوم کی حمایت میں نہایت قابلِ قدر خدمات انجام دیں جس کی بنا پر اراکین و منتظمین آپ سے بیحد خوش ہوئے، فراغت تعلیم کے بعد اپنے ابنائے وطن کی معیت میں برما چلے گئے تھے اور زندگی کا بقیہ حصہ وہیں تجارت کے ساتھ دینی وعلمی خدمت میں بسر کیا، ۱۳۶۳ھ میں برما کے سفر سے گھر آئے اور ایک ماہ کی علالت کے بعد

انتقال کر گئے، مولانا عبدالغفار کے تعلقات دارالعلوم کے اکابر سے بڑے اچھے تھے بالخصوص حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس اسرارہ سے آپ کے روابط بہت گہرے تھے، حضرت شیخ مدنی قدس سرہ کے پاس آپ اپنی امانتیں بھی رکھتے تھے، چنانچہ جس وقت آپ کا انتقال ہوا، اس وقت بھی حضرت کے پاس ان کے ایک ہزار روپے بطور امانت کے رکھے ہوئے تھے۔ وفات کی اطلاع پر حضرت شیخ نے اپنے مخلص مرید شیخ ولی محمد جون پوری کو امانت کی واپسی میں ایک مکتوبہ لکھا جس میں تحریر فرمایا کہ:

"کہنڈہ ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے مولوی عبدالغفار مرحوم فاضل دیوبند برما میں تجارت کرتے تھے ان کے ایک ہزار روپے میرے پاس امانت ہیں جو کہ محفوظ رکھے ہوئے ہیں، قاری صاحب کو اس کی خبر ہے، معلوم ہوا کہ مولوی عبدالغفار صاحب برما سے آکر ایک ماہ اپنے مکان پر رہے پھر بیمار ہو کر وفات پا گئے، ہم کو ان کے ورثاء کی تفصیل معلوم نہیں، انتقال کی خبر ابھی ملی تھی، جب کہ میں نے قاری صاحب سے تقاضا کیا کہ ان کے وطن میں خط بھیج کر دریافت کریں، چنانچہ انھوں نے دریافت کیا، جواب ملا اس پر میں نے قاری اصغر علی صاحب کو لکھا ہے کہ یا تو خود منشی محمد شفیع صاحب ان روپیوں کو لے کر آپ کے پاس جون پور جائیں اور آپ کے ہمراہ کو ہنڈہ مولوی عبدالغفار کے مکان پر پہنچ کر ان کے شرعی ورثاء کو دریافت کریں اور مل کر پوچھیں کہ آیا کوئی وصیت مرحوم کی ان روپیوں وغیرہ کے متعلق ہے یا نہیں اگر ہو تو اس پر عمل درآمد ہو، اور اگر نہ ہو تو ورثاء کو دو گواہوں کے سامنے روپئے دے دیے جائیں اور رسید لے لی جائے الخ" (مکتوبات شیخ الاسلام جلد ۲ ص ۱۳۵)

اس سے زیادہ حالات مولانا مرحوم کے معلوم نہ ہو سکے۔ وفات تقریباً ۱۳۶۳ھ ماہ جمادی الاولیٰ میں ہوئی۔ (از استاذنا المحترم مولانا عبدالقیوم بکھراوی)

مولانا عبدالغفور محمد آبادیؒ

مولانا عبدالغفور بن محمد اکرام عمری فاروقی محمد آبادی ۱۲۶۵ھ میں قصبہ محمد آباد میں پیدا ہوئے، مولانا کریم الدین غالب پوری، مولانا واحد علی نتھوپوری سے علوم وفنون کی تعلیم

حاصل کی اور تکمیل مفتی محمد یوسف بن محمد اصغر فرنگی محلی سے کی، تحصیل و تکمیل کے بعد حکومت کی ملازمت کرلی اور ترقی کرتے کرتے صدر الصدور کے عہدہ پر فائز ہوئے، آخر عمر میں ریٹائر ہوکر پنشن لینے لگے تھے، آپ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں مصباح الکلام فی الاسلام ۱۹۰۶ء میں اور حدائق البیان فی معارف القرآن جسے ۱۹۰۹ء میں خود موصوف نے شائع کی تھی، حدائق البیان کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۰ء میں مولانا کے پوتے جناب مصباح الدین صاحب نے خاندان کے ایک فرد جناب مدحت کریم کے اشتراک عمل سے چھپوایا ہے جو ۲۳۴ صفحات پر مشتمل ہے، کتاب کے مطالعہ سے مولانا عبدالغفور کے وسعت مطالعہ اور تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے۔ حدائق البیان فی علوم القرآن ایک اچھی کتاب ہے، جس زمانہ میں یہ کتاب تصنیف ہوئی، اس وقت کے حالات وضروریات کا پورا لحاظ کیا گیا ہے، پوری کتاب ۳۰ حدائق پر مشتمل ہے اور اختلافی مسائل میں مسلک احناف کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے۔ مولانا کی بقیہ کتابیں غالباً شائع نہیں ہوئیں، غفور منزل کے نام سے ایک شاندار عمارت میں مولانا نے ایک تصنیفی ادارہ بھی قائم کیا تھا، مگر مولانا کی وفات کے بعد یہ ادارہ ختم ہوگیا۔

تاریخ وفات اور تفصیلی حالات دستیاب نہیں ہوسکے۔

مولانا عبدالغفور جیراج پوریؒ

فاضلِ اجل مولانا ابوالذکاء عبدالغفور بن سخاوت علی فاروقی جیراج پوری مشہور اصحابِ تدریس میں سے تھے، آپ نے جملہ علوم عقلیہ ونقلیہ کی تحصیل وتکمیل شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ اعظمی سے کی اس کے بعد لاہور کالج سے امتحان دے کر مولوی فاضل کی سند حاصل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور مدرسہ معینیہ چشتیہ اجمیر شریف میں مدرس اوّل مقرر ہوئے اور مدتوں وہاں تدریسی خدمات انجام دیں، اس کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تعلیمی وتدریسی خدمت پر مامور ہوئے لیکن یہاں سے جلد ہی اہلِ ندوہ کی دعوت پر دارالعلوم ندوہ لکھنؤ چلے آئے، درس وتدریس میں آپ کا انہماک بہت بڑھا ہوا

تھا، بہت سے طلبہ آپ کے درس سے مستفید ہوئے، قاضی مبارک اور حمد اللہ پر آپ نے حواشی بھی لکھے ہیں، ۱۳۱۷ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (نزہہ ج ۸ ص ۲۰۷ و تذکرہ علمائے حال ص ۴۸)

حضرت مولانا شاہ عبد الغنی پھول پوریؒ

حضرت مولانا حافظ قاری شاہ عبد الغنی بن شیخ عبد الوہاب بن شیخ امانت اللہ پھولپوری ۱۲۹۳ھ میں ضلع اعظم گڈھ کی ایک بستی چھاؤں میں پیدا ہوئے اور وہیں پہلے بڑھے، لیکن بعد میں وہاں سے منتقل ہو کر مستقل سکونت قصبہ پھول پور میں اختیار کر لی تھی، اس لیے پھولپوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

آپ نے ایک دیندار گھرانے میں آنکھیں کھولی تھیں، جس کا اثر آپ کی نشو ونما پر نہایت مفید پڑا، آپ کے والد صاحب مولانا عبد السبحان مچھلی شہریؒ (۱) سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے، جن کا سلسلہ چار واسطوں سے حضرت مرزا مظہر جان جاناں دہلویؒ سے مل جاتا ہے اور والدۂ ماجدہ مولانا عبد السبحان کے خلیفہ مولانا حافظ محمد صاحب سے بیعت تھیں، مولانا کی والدہ بڑی ذاکر و شاغل تھیں، نماز تہجد کے بعد ۱۲ ہزار مرتبہ اسمِ ذات کا معمول تھا۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم گھر پر مکمل کر لینے کے بعد جون پور کا علمی سفر کیا اور مولانا ابو الخیر (۲)

---

(۱) مولانا عبد السبحان بن مولانا فضل امام مچھلی شہری کی ولادت ۱۱ر ذی الحجہ ۱۲۳۴ھ میں ہوئی اور بنارس میں مولانا طالب الحق، مولانا خادم حسین، مولانا مصطفیٰ بہاری اور سید عبد اللہ قندھاری وغیرہ سے علوم وفنون کی تحصیل کی اور بیعت وارادت کا تعلق حضرت شاہ گلزار کشتوی سے تھا، بنارس ہی میں محلہ کندی گرٹولہ میں مستقل طور سے رہنے لگے تھے، بنارس اور اس کے اطراف میں آپ کے مریدین کثرت سے تھے۔ ۲۷ر ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ میں بعمر ۸۹ سال آپ کا وصال ہوا اور مسجد انچو اقریب شکر تالاب میں مدفون ہوئے۔ (تذکرۂ مشائخ بنارس ص ۶۷)

(۲) مولانا ابو الخیر محمد مکی بن مولانا سخاوت علی جونپوری کی ولادت ۱۹ر جمادی الثانی ۱۲۷۴ھ کو مکہ معظمہ میں ہوئی، والد ماجد کی وفات کے بعد اپنی والدہ کے ہمراہ جون پور آئے، حافظ نعمت اللہ سرائے میری سے حفظِ قرآن کیا اور اپنے بڑے بھائی مولانا محمد شبلی، مولانا محمد عبد اللہ چھپراوی، مولانا سعادت حسین عظیم آبادی، اور مولانا محمد اکرم آروی سے علوم وفنون کی تحصیل کی۔ حدیث مولانا عبد الحئی فرنگی محلی سے پڑھی، حضرت سید ضیاء النبی بریلوی سے بیعت وارادت کا تعلق تھا، پوری زندگی درس وتدریس وعظ وافتاء میں گذاری، آپ سے اس دیار کے بہت سے لوگوں نے کسب فیض کیا، ۱۳۲۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (القول الجلی ص ۹ و نزہہ ج ۸ ص ۴۵۷)

مکّی بن مولانا سخاوت علی جون پوری کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر شرح تہذیب اور شرح جامی تک تعلیم حاصل کی اس کے بعد حضرت مولانا سیّد محمد امین (۱) نصیر آبادی متوفی ۱۳۴۹ھ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دو سال تک وہیں تعلیمی مشاغل کو جاری رکھا، پھر یہاں سے جامع العلوم کانپور میں داخل ہوئے اور وہاں کے اساتذۂ وشیوخ سے مشکوٰۃ تک پڑھا۔

چونکہ اس عہد میں معقولات کا رواج بہت زیادہ تھا جس کا اثر مولانا پر بھی پڑا اور آپ منطق وفلسفہ کے مشہور ترین مرکز رام پور پہونچے، جہاں مولانا فضل حق (۲) رام پوری کا چشمۂ فیض پوری آب وتاب سے جاری تھا، حضرت پھول پوری نے مولانا فضلِ حق سے معقولات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی، تکمیل معقولات کے زمانہ میں آپ نیچے کے طلبہ کو ہدایہ، رسالہ میر زاہد، ملاحسن وغیرہ کا درس بھی دیتے تھے، اتفاق سے اسی زمانہ میں مولانا قاری علی حسین تلمیذ رشید مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی مدرسہ عالیہ میں تدریسی خدمت انجام دے رہے تھے، مولانا

(۱) حضرت مولانا سیّد محمد امین نصیر آبادی کی ولادت ۹/ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ میں ہوئی، اپنے چچا مولانا سیّد احمد اور مولانا عبداللہ چھپراوی، مولانا محمد شبلی جون پوری سے متوسطات تک پڑھ کر حضرت مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے اور انھیں سے حدیث اور دیگر فنون میں سند واجازت حاصل کی، عمر کا بیشتر حصہ درس وتدریس اور اصلاح وتبلیغ میں بسر ہوا، نحو وصرف کی تعلیم میں خاص ملکہ تھا، حدیث وتفسیر میں امتیازی شان رکھتے تھے، آپ کو قدرت نے بڑی صلاحیتوں سے نوازا تھا، بڑے جاہ وجلال کے بزرگ تھے، دیار پورب میں آپ کی اصلاحی سرگرمیوں سے بڑا فائدہ پہونچا، متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ۱۳۴۹ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ نوّر اللہ مرقدہٗ۔
(تفصیل کے لیے دیکھیے: ''یادگارِ سلف'' مصنفہ حضرت مولانا نجم الدّین اصلاحی مرتب ''مکتوباتِ حضرت شیخ الاسلام'' قدس سرّہٗ)

(۲) علامہ فضلِ حق بن عبدالحق رام پوری کی ولادت ۱۲۷۸ھ میں اور وفات ۲۸/ذی قعدہ ۱۳۵۸ھ میں ہوئی، ابتدائی کتابیں رام پور میں مولوی عبدالرحمٰن قندھاری سے پڑھیں اس کے بعد بھیکن پور جا کر کچھ درسیات مولانا عبدالکریم رام پوری سے پڑھیں، کتب مطولات اور قدماء کی تصنیفات کی تحصیل مولانا لطف اللہ علی گڈھی اور مولانا ہدایت اللہ بریلوی سے کی فراغت کے بعد مدرسہ طالبیہ بریلی میں مدرس ہوئے، یہاں سے علیحدگی کے بعد مدرسہ عالیہ رام پور میں تعلیمی خدمات پر مامور ہوئے، اسی زمانہ میں تدریسی مشاغل کے ساتھ علامہ عبدالحق خیر آبادی سے بعض اہم اور اعلیٰ کتابیں پڑھیں، رام پور سے کچھ دنوں کے لیے بھوپال چلے آئے اور مدرسہ سلیمانیہ میں خدمتِ تدریس پر مقرر ہوئے، یہاں سے پھر رام پور گئے اور مدرسہ عالیہ میں مدرس ہوئے اور ترقی کر کے صدارت کے عہدہ تک پہونچے، آپ سے بہت سے اہلِ علم نے فیض پایا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے تذکرۂ کاملانِ رام پور ص ۳۱۷ تا ۳۲۰ و نزہۃ ص ۳۶۱ ج ۸)

نے قاری علی حسین سے مسلم شریف اور فن تجوید کی تحصیل کی۔ درس نظامیہ کی تکمیل کے بعد آپ علم حدیث کی جانب متوجہ ہوئے اور اس عہد کے مشہور محدث اور معقولی عالم حضرت مولانا ماجد علی جون پوری کی خدمت میں گلاوٹی حاضر ہوئے، مولانا ماجد علی اپنے عہد کے مشہور ترین معقولی عالم تھے اور حضرت مولانا عبدالحق خیر آبادی اور مولانا احمد حسین کانپوری کے شاگرد تھے، حدیث میں حضرت قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا، حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی قدس سرہ حدیث میں دو سال آپ کے رفیقِ درس رہے۔ مولانا ماجد علی کا قاعدہ تھا کہ حضرت گنگوہی کے درس کی پوری تقریرات کے وقت لکھ لیا کرتے تھے، بعض راتوں میں تقریر لکھتے لکھتے فجر کی اذان ہوجاتی تھی، مولانا ماجد سے تکمیل درس حدیث کے بعد آپ پھر رام پور پہونچے اور مولانا فضلِ حق رام پوری کے درس میں شریک ہوکر دو سال تک اعلیٰ کتابوں کی سماعت کرتے رہے، ایک دن مولانا فضلِ حق نے فرمایا: ''بھائی اب جاؤ کہیں پڑھاؤ کب تک یہیں رہوگے، اب تمہارے اور ہمارے علم میں اعم واخص من وجہ ہی کا فرق ہے۔ اسی زمانہ میں سیتاپور سے مولوی عبدالقادر والد مولانا عبدالماجد دریابادی کا خط مولانا فضل حق صاحب کے پاس ایک باصلاحیت ذی استعداد مدرس کی طلب کے لیے آیا، مولانا فضل حق کی نظر انتخاب آپ ہی پر پڑی اور انھوں نے آپ کو سیتاپور مدرسہ اسلامیہ عربیہ میں مدرس اوّل کی حیثیت سے بھیج دیا۔

مولانا نے وہاں تعلیم وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا، چند ماہ گزرنے کے بعد وہاں کے لوگوں نے مولانا سے کہا کہ آپ بھی یہاں کی رسم کے مطابق تیجہ، دسواں، چالیسواں وغیرہ میں شرکت کیجئے، مولانا نے یہ سنتے ہی برجستہ جواب دیا کہ ان خرافات کے لیے کسی بدعتی روحی ملاّ کو بلالو، میں یہاں دین بیچنے نہیں آیا ہوں، اس واقعہ کے بعد مولانا، مدرسہ اسلامیہ سیتاپور سے الگ ہوگئے اور مولانا ابوبکر جونپوری کی دعوت پر اپنی مادرِ علمی مدرسہ قرآنیہ جامع مسجد جونپور چلے آئے، یہاں پانچ سال تک صدر مدرس کی حیثیت سے درس وتدریس میں مصروف رہے، مولانا کے قویٰ جوانی میں بہت قوی تھے، اس لیے صبح سے شام تک بخاری شریف، ترمذی شریف ودیگر کتب صحاح کے علاوہ معقول ومنقول کو ملاکر سولہ

اسباق پڑھاتے تھے اور ایک بجے رات تک مطالعہ میں مشغول رہتے تھے، اسی زمانہ میں ایک بار حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرّہ جون پور تشریف لائے اور وہاں سے سرائے میر آئے، مولانا بھی حضرت تھانویؒ کے ہمراہ سرائے میر آئے اور وعظ کے بعد قصبہ کی عیدگاہ میں یکم ربیع الاوّل ۱۳۲۸ھ کو بعد نمازِ فجر حضرت تھانوی سے بیعت کی۔

درس وتدریس کے ساتھ اذکار واوراد کا بڑا اہتمام فرماتے تھے، نو ہزار بار ذکر اسم پاک کا معمول تھا، بیعت کے چار سال بعد یکم ماہ ربیع الاوّل ۱۳۳۲ھ یوم دوشنبہ کو اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے۔

جون پور سے الگ ہوجانے کے بعد مدرسۃ الاصلاح کی تاسیس وتعمیر میں بانیانِ مدرسہ مولانا محمد شفیع اور مولانا عبدالاحد کے ہمراہ نمایاں خدمات انجام دیں اور مدرسہ کے قائم ہوجانے کے بعد لوجہ اللہ مدرسہ میں درس وافادہ کا سلسلہ شروع کردیا اور مدتوں مدرسہ کی خدمت انجام دیتے رہے، بعد میں بعض اہم وجوہ کی بنا پر مدرسۃ الاصلاح سے الگ ہوگئے۔

۱۳۳۳ھ میں آپ نے اپنی جائے اقامت قصبہ پھول پور میں حضرت تھانویؒ کے مشورہ سے ایک درس گاہ قائم کی جس کا سنگ بنیاد حضرت تھانویؒ نے اپنے دست مبارک سے رکھا اور خود ہی مدرسہ کا نام قصبہ پھول پور کی مناسبت سے روضۃ العلوم تجویز فرمایا، اس کے بعد ۱۳۴۹ھ میں قصبہ سرائے میر میں عیدگاہ کے متصل ایک اور مدرسہ جاری کیا جس کا نام حضرت تھانوی ہی نے وہاں کی مناسبت سے بیت العلوم منتخب کیا، اس مدرسہ میں درس نظامیہ کی مکمل تعلیم کا انتظام فرمایا، مدرسہ کی سرپرستی حضرت تھانوی نے قبول فرمائی، انتظام اور نگرانی کا کام خود حضرت پھول پوری ہی انجام دیتے رہے اور مدرسہ میں اس دور کے مشاہیر اساتذہ کو تعلیمی وتدریسی خدمات کے لیے مقرر فرمایا جن میں حضرت مولانا محمد مسلم (۱)

---

(۱) حضرت مولانا محمد مسلم صاحب جون پوری کی ولادت ۱۳۰۱ھ میں ضلع جون پور کی ایک بستی ''پوٹریا'' میں ہوئی، مکتب کی تعلیم مکمل کرکے جون پور تشریف لے گئے، جہاں مولانا محمد صدیق جون پوری اور مولانا ہدایت خاں رام پوری سے مدرسہ حنفیہ میں عربی نحو وصرف اور فقہ ومنطق کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد کان پور گئے اور مولانا فضل کریم سے استفادہ کیا، پھر مدرسہ عالیہ رام پور پہونچے اور مولانا فضلِ حق رام پوری ومولانا طیب عرب سے ادب ومعقول کی تحصیل کی، جملہ فنون میں مہارتِ تامہ حاصل ہوجانے کے بعد حدیث کی جانب متوجہ ہوئے اور حضرت مولانا ماجد علی جونپوری=

صاحب جون پوری، حضرت مولانا علی احمد صاحب سرائے میری آسمانِ علم کے آفتاب وماہتاب تھے، خود اپنے استاذ حدیث حضرت مولانا ماجد علی جونپوری کی خدمات بھی چند مہینوں کے لیے حاصل کیں، کبھی کبھی خود بھی بخاری شریف کا درس دیا کرتے تھے، آج بھی مدرسہ بیت العلوم تعلیم وتربیت کے لحاظ سے ضلع کا ایک ممتاز ادارہ ہے، جہاں ٹھوس تعلیم کے ساتھ بچوں کی تربیت پر خصوصیت کے ساتھ توجہ دی جاتی ہے۔ بندہ نے ابتدائی تعلیم عربی شرح جامی تک اسی مدرسہ میں پائی ہے۔

حضرت پھول پوریؒ مختلف النوع اور گوناگوں صفات کے جامع تھے، علوم ظاہر وباطن میں اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے ساتھ آپ کو پہلوانی اور فن سپہ گری کا بھی کامل ذوق تھا، چنانچہ قیام رام پور کے زمانہ میں تعلیم کے ساتھ حکیم عبدالمجید خاں دہلوی کے استاذ پہلوان تفضل حسین خاں سے کشتی بھی سیکھتے تھے اور فن سپہ گری کی تحصیل کے لیے اس دور کے مشہور استاذ ذاکر حسین غازی پوری کو معتد بہ مشاہرہ پر دس برس اپنے یہاں رکھا اور اس فن میں کمال پیدا کیا۔

مزاج میں حد درجہ سادگی تھی خود حضرت تھانوی قدس سرہ آپ کی سادگی کے مدّاح تھے، حسن العزیز ص ۸۳ میں حضرت تھانوی کا ارشاد درج ہے:

"مولوی عبدالغنی صاحب ماشاء اللہ سپاہی آدمی ہیں، بڑے مستعد ہیں، پہلوان ہیں پھر علمی اور عملی کمال جدا، مگر وضع سے مطلق نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کچھ بھی ہیں۔"

= کے حلقۂ درس میں شامل ہوکر پانچ برس مسلسل مولانا سے استفادہ کرتے رہے، تعلیم سے فراغت کے بعد تدریسی سلسلہ شروع کیا، اولاً مدرسہ حنفیہ آرہ میں ۲۸ برس تک صدارت تدریس کے فرائض انجام دیے اس کے بعد مدرسہ مطلع العلوم بنارس میں صدر کی حیثیت سے تشریف لائے؛ لیکن ارباب مدرسہ حنفیہ آرہ کے شدید اصرار پر ۲ سال کے بعد پھر آرہ چلے گئے، آرہ ہی سے حضرت مولانا عبدالغنی پھول پوری کی طلب پر مدرسہ بیت العلوم سرائے میر میں تشریف لائے جس دور میں حضرت مولانا محمد مسلم صاحب بیت العلوم پر تھے وہی دور مدرسہ کا دور زریں ہے، اسی دور میں دورۂ حدیث کا سلسلہ شروع ہوا اور بڑے اچھے اچھے صاحب استعداد طلبہ عالم وفاضل بن کر مدرسہ سے نکلے، آخر میں بعض وجوہ سے بیت العلوم سے علاحدہ ہوکر دارالعلوم مئو میں شیخ الحدیث ہوکر چلے آئے اور یہیں ۲۱ر رجب ۱۳۹۱ھ میں وفات پائی اور مئو ہی میں دفن ہوئے، مولانا چودہویں صدی کے منتخب علماء میں تھے، اس دیار میں معقول ومنقول میں آپ جیسا کوئی دوسرا عالم نہیں تھا۔

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"مولوی عبدالغنی کس قدر سادے ہیں کہ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ یہ پڑھے لکھے بھی ہیں۔"

آخر عمر میں خشیت ومحویت کا یہ عالم تھا کہ لفظ "اللہ" زبان پر آتے ہی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے تھے، حتیٰ کہ کثرتِ گریہ سے آنکھوں کی بینائی نہایت کمزور ہوگئی تھی، تلاوت قرآن کے وقت عجیب محویت کا عالم ہوتا، نودس آیت کے بعد بے ساختہ آہ نکل جاتی اور ساتھ ہی "یا اللہ" فرماتے، اس وقت درد وکرب کی ایسی کیفیت پیدا ہوجاتی تھی کہ سخت سے سخت دل والا بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔

درسِ مثنوی کے وقت بھی محویت وبیخودی کی یہی کیفیت ہوتی تھی، میں جس زمانہ میں مولانا کی خانقاہ کے مدرسہ میں فارسی پڑھا رہا تھا، حسنِ اتفاق سے چند دنوں حضرت مولانا سے گلستاں کے اسباق پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، دوسرے باب کا درس چل رہا تھا، ایک حکایت آئی جس میں شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عابد کا واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ دریا کے کنارے تنہائی میں یادِ خداوندی میں مصروف رہتے تھے، ایک بار چیتا نے ان پر حملہ کر کے شدید زخمی کردیا، سارا جسم سڑ گیا، اس تکلیف کے باوجود بھی شکرِ خالق میں ان کی زبان تر رہا کرتی تھی، ایک شخص کا ان کے پاس سے گذر ہوا اس نے ان کی اس حالت کو دیکھ کر سوال کیا کہ اس سخت تکلیف کے ہوتے ہوئے کس بات کا شکر ادا کررہے ہیں، عابد نے جواب دیا کہ اس بات کا شکر ادا کررہا ہوں کہ مصیبت میں گرفتار ہوں معصیت میں نہیں، اس جملہ پر پہونچتے ہی مولانا پر شدید گریہ کا حملہ ہوا اور ہچکی بندھ گئی، تقریباً نصف گھنٹہ تک یہی عالم رہا بعد میں جب کچھ سکون ہوا تو اپنے خادم خاص مولانا حکیم اختر صاحب کو بلایا اور ان کو بھی سنایا اور سناتے ہی پھر پہلی کی سی کیفیت طاری ہوگئی، آخر عمر میں آپ پاکستان چلے گئے تھے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔

۲۲/اپریل ۱۹۶۳ء کو اپنے مرید خاص جناب غلام سرور صاحب کے بے حد اصرار پر کراچی سے لاہور تشریف لے گئے اور ان کے دولت خانہ پر قیام فرمایا ۲/جون ۱۹۶۳ء مطابق ۹/محرم ۱۳۸۳ھ کو غسل خانہ میں تشریف لے گئے، اتفاقاً پیر پھسل گیا اور آپ فرش

پر گر پڑے جس کے صدمہ سے کولھے کی ہڈی میں چوٹ آگئی اور چلنا پھرنا سب بند ہو گیا، اسی حالت میں ۲۶؍جون کو کراچی واپس آئے، یہاں ڈاکٹر عبدالرحیم کا علاج جاری ہوا، تین ہفتہ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے تھوڑی دور چلنے پھرنے کی رائے دی لیکن شدّتِ ضعف کی وجہ سے اس مشورے پر عمل کرنا دشوار تھا، اسی حالت میں ایک دوسرا عارضہ پیش آگیا، سینے کا بلغم بہت بڑھ گیا اور ضیق نفس کے شدید دورے پڑنے لگے، حضرت شاہ ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب کا علاج ہوا، جس سے قدرے افاقہ ہوا۔ ۳؍اگست ۱۹۶۳ء یوم شنبہ کو بعد نماز عصر مولانا نے حاضرینِ مجلس کو اپنے ملفوظات سے مستفید فرمایا، مولانا پھول پوری کی یہ آخری مجلس تھی، اسی دن تقریباً چار بجے شب کو آپ پر فالج کا حملہ ہوا، اپنے خادم مولانا حکیم اختر سے لرزتی ہوئی آواز میں فرمایا کہ مجھے کلمہ پڑھا دو، انھوں نے کلمہ پڑھوایا، کلمہ پڑھتے ہی مولانا کی زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی، دو تین دن تک اشارے سے بات فرماتے رہے، بالآخر ۲۱؍ربیع الاوّل ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۲؍اگست ۱۹۶۳ء کو ۶ بجے شام روح مبارک قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی نے غسل دیا اور تجہیز وتکفین کا نظم کیا، حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی، جنازہ میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، مولانا احتشام الحق کاندھلوی اور شہر کے بے شمار علماء وفضلاء نے شرکت کی، ہجوم اس قدر ہو گیا تھا کہ کندھا دینا مشکل ہو رہا تھا، ۱۲؍بجے شب میں بغیر کسی اہتمام اور خاص اعلان کے اس قدر اژدہام دیکھ کر ہر شخص انگشت بدنداں تھا، غرض ۱۲؍بجے شب میں پاپوس نگر کراچی کے قبرستان میں صدر دروازہ کے متصل داہنی طرف رشد وہدایت کا یہ ماہتاب ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔

ہندو پاک میں مولانا کے مریدین ومعتقدین بہت کثرت سے ہیں، جن میں مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی، مولانا نصرت علی استاذ مدرسہ کنز العلوم ٹانڈہ، حافظ عبدالولی بہرائچی، مولانا نذیر الحسن سیتاپوری، جناب حاجی حبیب الحسن شیروانی، جناب حفیظ اللہ لاری مقیم کراچی، جناب عبدالحافظ لکھیم پوری، جناب محمد جلیل جج شہر اعظم گڈھ، مولانا بشارت نائب ناظم مجلس دعوت الحق ہردوئی، مولانا حافظ عبدالرحمٰن نیپالی امام مسجد ساساموسیٰ

مل چھپرہ، حاجی نذیر احمد بکھراوی ناظم مدرسہ بیت العلوم سرائے میر، حاجی منشی محمد ناظر جونپوری سابق نائب ناظم مدرسہ بیت العلوم، ڈاکٹر عبد القادر محلہ پہاڑ پور شہر اعظم گڈھ شرف خلافت سے مشرف ہوئے۔

مولانا جب تک زندہ رہے اظہار حق اور تردید باطل میں نفع وضرر سے بے نیاز ہوکر کوشاں رہے، اس کی وجہ سے کبھی کبھی بڑی مشکلات کا سامنا ہوجاتا تھا، مگر آپ ان کی مطلقاً پروانہیں کرتے تھے۔

عمر کے آخر دور میں جب اس دیار میں مودودیت نے سر اٹھایا تو وہ مولانا ہی کی ذات تھی جو اس کے مقابلے میں سینہ سپر ہوگئی، آپ برملا اپنی مجلسوں اور دینی جلسوں میں اس کی بھرپور تردید کرتے اور اپنے ماننے والوں کو اس سے احتراز کرنے اور بچنے کی ہدایت فرماتے اور اسی پر بس نہیں کیا؛ بلکہ ملک کے مشاہیر علماء جیسے حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی صاحب، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب، حضرت مولانا ابوالوفاء شاہجہاں پوری، حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی وغیرہم کو اپنے مدرسہ بیت العلوم کے سالانہ جلسہ میں شرکت کی دعوت دی ملک کے ان اکابر علماء نے اس جماعت کے سربراہ کی تصانیف کے حوالہ سے دین کی تعبیر وتفہیم میں ان کی غلطیوں کو واضح کیا جس کا اثر یہ ہوا کہ لوگ اس جماعت سے الگ ہوگئے۔

حضرت پھول پوری اگرچہ جملہ علوم وفنون میں ید طولیٰ رکھتے تھے، مگر تصوف کا آپ پر اس قدر غلبہ ہوا کہ آخر عمر میں علمی مشاغل تقریباً ختم ہوگئے تھے، حضرت شیخ الحدیث سیّدنا ومرشدنا مولانا محمد زکریا کاندھلوی ادام اللہ ظلال فیوضہم کو آپ کے بارے میں اکثر فرماتے ہوئے سنا کہ حضرت پھول پوریؒ اپنے دور کے جید عالم تھے، مگر آپ کے علم پر تصوف کا پردہ پڑ گیا تھا۔ متعدد ثقہ لوگوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے ایک زمانہ میں حضرت تھانوی سے فرمایا کہ دار العلوم میں تدریسی خدمت کے لیے کسی اپنے آدمی کو بھیجیے تو حضرت تھانوی نے مولانا ہی کا نام پیش کیا تھا، لیکن بات ابھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچی تھی کہ حضرت شیخ الہند سفر حج میں چلے گئے اور پھر اسی سفر میں گرفتار کرلیے گئے۔

آپ نے کبھی باقاعدہ تصنیف وتالیف کا مشغلہ اختیار نہیں کیا، گاہے بگاہے متوسلین ومعتقدین کے اصرار پر قلم اٹھایا تو ہفتوں اور مہینوں کی قلیل مدت میں کوئی کتاب تصنیف کردی اگر آپ مستقل طور سے اس کام کو کرتے تو آج آپ کا شمار کثیر التصانیف مصنّفین کی فہرست میں ہوتا۔

مولانا کی تصانیف کی تفصیل یہ ہے:

(۱) اصول الوصول: یہ کتاب ۱۳۴۹ھ کی تصنیف ہے، اس میں آپ نے فیوض اشرفیہ اور مطبِّ اشرفی کے بیش بہا نسخے جمع کردیے ہیں، حضرت تھانوی قدس سرہ نے اسے اپنی خانقاہ کے مدرسہ میں داخل درس فرمایا لیا تھا اور حضرت تھانوی ہی نے اس کا نام تجویز فرمایا اور ساتھ ہی اس کی شرح لکھنے کی بھی فہمائش کی۔

(۲) معیت الٰہیہ: یہ کتاب ۱۳۸۰ھ میں کراچی سے شائع ہوئی، اس میں قرب خداوندی کے اصول وطریقے بڑے لطیف انداز میں بیان کیے گئے ہیں "حدیث قدسی" "لایزال العبدیتقرب من النوافل الخ" کی عجیب وغریب چھ عنوانات سے الہامی تشریح کی ہے۔

(۳) صراط مستقیم: یہ رسالہ ۱۳۸۱ھ میں کراچی ہی سے شائع ہوا، معرفت ومحبّت خداوندی پر عجیب الہامی مضمون ہے۔

(۴) براہین قاطعہ: وحدانیت، رسالت، حشر ونشر وغیرہ کو دلائل عقلیہ ونقلیہ سے کتاب میں ثابت کیا ہے، اہلِ علم کے لیے یہ کتاب ایک قیمتی تحفہ ہے۔

(۵) معرفتِ الٰہیہ: حضرت پھول پوریؒ کی یہ نہایت اہم تصنیف ہے، اللہ کی معرفت محبت اور تصوف کے مضامین کا یہ ایک ضخیم مجموعہ ہے، مصنف کے تقویٰ، خشیت، معرفت اور محبّت خداوندی کا اثر سطر سطر سے ظاہر ہوتا ہے، اس کتاب کے اب تک تین ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں ایک کراچی سے دوسرا ادارۂ ملیہ کان پور اور تیسرا کتب خانہ اشرفیہ تھانہ بھون سے، حضرت پھول پوری اپنے متوسلین کو اس کتاب کو مطالعہ میں رکھنے کی بڑی تاکید فرماتے تھے، یہ کتاب جس طرح مبتدیوں کے لیے ایک نسخۂ کیمیا ہے اسی طرح سے منتہیوں کے لیے بھی اکسیر اعظم ہے۔

(۶) شراب کی حرمت کا ثبوت قرآن سے: یہ آپ کی آخری تصنیف ہے، پاکستان میں ایک جماعت ایسی پیدا ہوگئی تھی جس کا دعویٰ یہ تھا کہ قرآن میں شراب کی حرمت کا ثبوت نہیں ہے، یہ جماعت اپنے دعویٰ پر بالکل مصر تھی، چنانچہ حضرت الحاج مولانا مفتی محمد شفیع سابق مفتیٔ اعظم دارالعلوم دیوبند نے آپ سے اس کتاب کے لکھنے کی فرمائش کی، ان کی خواہش پر آپ نے یہ کتاب لکھی۔

ان کتابوں کے علاوہ آپ نے جون پور کے قیام کے زمانہ میں اصول فقہ کی مشہور کتاب توضیح وتلویح کا ایک بسیط حاشیہ عربی زبان میں تحریر کیا تھا، مگر وہ طبع نہ ہوسکا، راقم سے استاذ محترم مولانا عبدالحق صاحب قاسمی جگدیش پوری صدر المدرسین دارالعلوم مئو نے بیان کیا کہ مولانا نے خود ان سے اس حاشیہ کی بڑی تعریف فرمائی اور اس کے ضائع ہوجانے پر سخت صدمہ کا اظہار کیا۔ (مقدمہ معرفتِ الٰہیہ وغیرہ)

مولانا عبدالفتاح چریا کوٹیؒ

فاضل اجل شیخ عبدالفتاح بن شیخ مبارک چریاکوٹی اپنے عہد کے مشہور فقہاء میں تھے، آپ کی ولادت ۹۹۴ھ میں چریاکوٹ میں ہوئی، وطن ہی میں وہاں کے اساتذہ سے علوم وفنون کی تحصیل کی، تریسٹھ برس کی عمر میں ماہ ربیع الاول ۱۰۵۷ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا، آپ کی علمی یادگار میں زبان فارسی میں ایک منظوم رسالہ ''میراث نامہ'' ہے جس میں میراث کے مسائل کو بڑے سہل پیرائے میں نظم کیا ہے، کتاب کی ابتداء اس شعر سے ہوئی ہے ؎

خدارا شکر کز تحریر خامہ　　مہذب گشت ایں میراث نامہ

(تاریخ مکرم بحوالہ نزہہ ص ۲۲۲)

مولانا عبدالقادر مئویؒ

مولانا عبدالقادر بن شیخ عبداللہ مئوی اعظمی ۱۲۷۹ھ میں بمقام مئو ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، صرف، نحو اور منطق کی ابتدائی کتابیں مولوی حسام الدین مئوی اور مولانا ابوالمکارم

محمد علی مئوی سے پڑھیں، اور فقہ، اصول فقہ، ادب، بلاغت اور نحو وغیرہ کی بقیہ متداول کتابیں مولانا فیض اللہ مئوی سے پڑھ کر ۱۳۰۳ھ میں تکمیل فنون کی سند حاصل کی۔

کتبِ فنون کی تحصیل وتکمیل کے بعد حدیث کی جانب متوجہ ہوئے اور مولانا سیّد نذیر حسین محدّث دہلوی، مولانا محمد طاہر سلہٹی اور ملا عبدالحکیم پنجابی سے صحاحِ ستہ پڑھ کر حدیث کی سند لی۔

علوم ظاہری سے فراغت کے بعد مولانا شاہ سیّد ضیاء النبی رائے بریلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت ہوکر سلوک کے مراحل طے کیے اور سیّد صاحب سے خلافت حاصل کی، جملہ علوم ظاہری و باطنی میں دستگاہ حاصل ہوجانے کے بعد درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کیا، پہلے وطن ہی میں تقریباً چار سال تک تعلیمی خدمات انجام دیں اس کے بعد مدرسۃ المسلمین شہر کاٹھی چھاونی ناگ پور میں تین برس تک درس وتدریس کے فرائض انجام دیے، پھر وہاں سے مدرسہ احمدیہ آرہ میں چلے آئے۔ آپ کی تصنیفات میں ''حل المغلقات فی بیان طلقات، تفریح الجنان باحکام القیام فی رمضان، عمدۃ الکلام فی الرد علی درۃ النظام، الروضۃ النّاظرہ فی علم المناظرہ، تاریخ حضرت عمر بن عبدالعزیز'' اپنے اپنے موضوع میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ۱۳۳۱ھ میں آپ نے وفات پائی۔ (تذکرہ علمائے حال ص ۵۱، ۵۰ ونزہۃ الخواطر ص ۷۵ ج ۸)

مولانا مسلک اہل حدیث کے پابند تھے، لیکن مشائخ اور صوفیا کے ساتھ بڑی عقیدت ومحبّت سے پیش آتے تھے اور خود بھی تصوّف میں خاص مقام رکھتے تھے۔

مولانا عبدالقادر گھوسویؒ

مولانا عبدالقادر بن مولانا صاحب علی گھوسوی ضلع اعظم گڈھ کے مشہور عالم اور زمیندار تھے، انھوں نے امامت کا دعویٰ کیا تھا اور ہمیشہ گاڑھے کا عمامہ باندھتے اور گاڑھے کی عبا اور کپڑے پہنتے تھے، اسی لیے ان کی شان میں ڈپٹی نذیر احمد دہلویؒ نے جو اعظم گڈھ میں زمانہ تک مہتمم بندوبست رہے تھے، عربی کا ایک قصیدہ لکھا تھا، جس کا ایک مصرعہ یہ ہے:

تعمّم تقمّصَ وَانتطقَ اَو تَسربَلَ

مولانا عبدالقادر کی یہ خصوصیت تاریخ ہند میں جلی حروف سے لکھی جانے کی مستحق ہے کہ گاندھی جی کی تحریک سے پہلے ہی چرخہ کاتنے اور دیسی کپڑا تیار کرنے کی اسکیم مرتب کی تھی اور عملی طور سے اس کا نفاذ بھی کر دیا تھا، بعض لوگوں سے سننے میں آیا ہے کہ گاندھی جی نے اپنی ایک تقریر میں خود اس کا اعتراف بھی کیا تھا، مگر اس روایت کی اب تک تحقیق نہیں ہوسکی ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ (حیات شبلی ص ۵۶)

مولانا عبدالقادر عمادی سوگھر پوریؒ

مولانا عبدالقادر بن خیر الدین عمادی ۱۱۴۰ھ میں موضع سوگھر پور ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، ابتداءً آپ نے علامہ سیّد محمد عسکری (۱) جونپوری متوفی ۱۱۹۰ھ سے تعلیم حاصل کی پھر یہاں سے پھلواری شریف بہار کا علمی سفر کیا اور وہاں شیخ وحید الحق (۲) بن وجیہہ الحق پھلواروی کی خدمت میں مدتوں تعلیم وتحصیل کا سلسلہ جاری رکھا، یہاں سے تعلیم مکمل کر لینے کے بعد شیخ حقانی امیٹھوی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور انھیں سے جملہ علوم مروجہ کی تحصیل وتکمیل کی اس وقت شیخ حقانی کا قیام قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں تھا، علوم متداولہ سے فراغت کے بعد کلکتہ چلے گئے جہاں وقائع نگاری کی خدمت پر مامور ہوئے، اسی زمانہ میں ایک انگریز عالم سے انگریزی زبان حاصل کی اور اس میں بھی کمال پیدا کر لیا، کلکتہ سے چند سال کے بعد وطن مالوف واپس ہوئے اور شیخ باسط اللہ آبادی کی خدمت میں جا کر بیعت

(۱) ملا محمد عسکری جون پور کے مشہور اساتذہ میں تھے۔ مذہباً شیعہ مسلک کے پابند تھے۔ ذکاوت وذہانت میں ضرب المثل تھے: جملہ علوم وفنون کی کتابیں ازبر تھیں، ساتھ ہی قوت فصاحت میں بھی عدیم المثال تھے، طویل مدت تک درس وافادہ میں مصروف رہ کر ۷۰ برس کی عمر میں ۱۱۹۰ھ میں انتقال کیا۔ (تجلی نور، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۲، تذکرۃ العلماء ص ۷۳ تا ۷۵)

(۲) شیخ وحید الحق بن وجیہہ الحق پھلواروی نے اپنے والد اور ماموں شیخ مبین جعفری سے تعلیم حاصل کی اور ان سے بہت سے لوگوں نے تعلیم پائی، شیخ وحید الحق اپنے وقت کے مشہور اساتذہ میں تھے، علم کے ساتھ زہد وتقویٰ اور حسن اخلاق میں بھی اعلیٰ مقام پر تھے، درس وتدریس میں انہماک کے باوجود متعدد اہم کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ۲۴ر صفر ۱۲۰۱ھ میں آپ کا وصال ہوا، بعض لوگوں نے سن وفات ۱۲۰۰ھ لکھا ہے۔ (نزہۃ ص ۵۲۳ ج ۸)

کی اور سلوک کی راہیں طے کیں۔

مولانا عبدالقادر کا شمار ہندوستان کے مشاہیر علماء میں تھا، آپ فارسی، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ فارسی اور عربی میں شعر بھی کہتے تھے اور مختلف فنون میں کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں المحاکمہ بین العلوم المشرقیہ والمغربیہ، الکیمیاء الحدیثیہ، کتاب العالم والمتعلّم، الدّر الفوائد فی غرر العقائد اپنے اپنے موضوع پر بڑی اہم اور مفید ہیں، اس کے علاوہ اردو میں آپ نے ایک کتاب لغت میں لکھی، اور فن میراث میں ایک منظوم رسالہ تحریر کیا، علم نحو میں بھی ایک منظوم رسالہ آپ کی علمی یادگار ہے، مولانا محمد ابراہیم عمادی ندوی مرحوم نے اپنی تصنیف آثار مشرق میں درج ذیل تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے:

ترجمہ رسالہ مسعودیہ، ترجمہ بوستاں بزبان عربی، رسالہ عروس بزبان عربی، رسالہ کشف الرموز۔

ان کتابوں کے علاوہ آپ کا ایک دیوان بھی ہے جس میں بہت سے خطبے قصیدے اور ابیات درج ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرّہ کے آپ بیحد معتقد تھے۔ اور ان کی شان میں بہت سے قصیدے اور نظمیں لکھیں ۱۲۰۲ھ میں اپنے آبائی وطن سوگھر پور میں وفات پائی۔ (تذکرۃ العلماء ص ۱۱۳ و نزہۃ ص ۲۹۱ ج ۷)

شیخ عبدالقدوس نظام آبادی

شیخ عبدالقدوس عرف شاہ قدن وقطب صدیق، دسویں صدی ہجری کے مشائخ کبار میں سے تھے، آپ کا مستقل قیام نظام آباد (اعظم گڈھ) میں تھا، طریقۂ شطاریہ عشقیہ، ہندوستان میں اس طریقہ کے بانی ومروّج شیخ عبداللہ بن حسام الدین خراسانی متوفی ۸۹۰ھ سے حاصل کیا تھا۔ اس کے بعد شیخ عبداللہ شطّار کے خلیفہ خاص شیخ حافظ معروف بہ "واسطہ کار" کی صحبت وتربیت میں رہ کر درجۂ کمال کو پہونچے اور شیخ حافظ واسطہ کار شطاری نے اپنی خلافت سے سرفراز کیا، یہی شیخ عبدالقدوس عرف قدن شاہ، شیخ علی عاشقاں

سرائے میری کے شیخ ومرشد تھے۔

بحر ذخار سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ عبدالقدوس کے سات بیٹے تھے اور ساتوں عالم وفاضل تھے، افسوس کہ اخلاف کی ناقدردانی اور بے توجہی کی بناء پر اپنے عہد کے "قطب صدیق" اور سلسلۂ شطاریہ کے عظیم مرشد کے احوال وکوائف اس سے زیادہ معلوم نہیں، تنہا شیخ ہی کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوا؛ بلکہ اس قصبہ کے عام بزرگوں کا حال یہی ہے کہ تذکرہ کی کتابوں میں ضمناً کہیں ان کا نام آجاتا ہے اور بس، تاریخ وتذکرہ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہان شرقی ۷۹۶ تا ۸۸۱ھ، اسی طرح لودھیوں اور مغل بادشاہوں کے دور میں نظام آباد جونپور کے ماتحت ایک پرگنہ تھا، اور مسلم دور حکومت میں پرگنہ جات میں قاضی مقرر ہوا کرتے تھے، اس لیے لازمی طور پر نظام آباد میں بھی قاضیوں کا تقرر ہوا ہوگا؛ مگر ان میں سے کسی کا نام بھی آج معلوم نہیں، صرف ایک قاضی ابوالفخر کا نام، شیخ فتح علی قلندر متوفی ۱۱۱۸ھ قلندر پور کی ایک کرامت کے ضمن میں ملتا ہے۔ حالانکہ قاضی صاحب کا خاندان آج بھی نظام آباد میں موجود ہے، اس آخری دور میں اسی خاندان کے ایک رکن رکین قاضی محمد حمید تھے جو عالم وفاضل تھے۔

اسی طرح حضرت شیخ فتح علی قلندر کے تذکرہ میں ہے کہ قلندر صاحب کے دو صاحبزادے شاہ محمد واصل اور شاہ علیم اللہ نے منطق کی مشہور کتاب قطبی اور حاشیہ میر زاہد تک کی تعلیم ملا عبدالقادر نظام آبادی سے حاصل کی تھی، بس نام کے علاوہ ملا عبدالقادر کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے — زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

بہرحال شاہ قدن اور قطب صدیق قصبہ نظام آباد (اعظم گڈھ) ہی کے چشم وچراغ تھے، یہیں ان کی بود وباش رہی اور اسی سرزمین میں آسودۂ خواب ہیں۔

ایک ضروری تنبیہ: شیخ عبدالقدوس جونپوری نام کے ایک بزرگ اور ہیں جو شیخ قطب الدین بینادل کی اولاد سے ہیں، سلسلۂ نسب یہ ہے، شیخ عبدالقدوس قلندر، بن شیخ عبدالسلام قلندر، بن شیخ محمد قلندر، بن شیخ قطب الدین بینادل قلندر۔

بہت سے تذکرہ نویس ان دونوں بزرگوں کو ایک ہی شخصیت باور کرتے ہیں اور اسی بناء پر شیخ عبدالقدوس قلندر جون پوری متوفی ۱۰۵۲ھ کو حضرت علی عاشقاں سرائے میری کے مرشدوں میں شمار کرتے ہیں، ہمارے نزدیک درج ذیل وجوہ کی بناء پر یہ درست نہیں ہے۔

۱- شیخ عبدالقدوس عرف قدن شاہ نظام آبادی سلسلۂ شطاریہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور شیخ عبدالقدوس قلندر جونپوری سلسلۂ قلندریہ کے سربرآوردہ بزرگوں میں سے ہیں۔

۲- کسی تذکرہ نویس نے شیخ عبدالقدوس بن عبدالسلام قلندر جونپوری کی عرفیت ''قدن شاہ'' اور ''قطب صدیق'' ذکر نہیں کی ہے، جبکہ شیخ عبدالقدوس نظام آبادی کی عرفیت ''شاہ قدن'' کا ذکر تقریباً سب ہی کرتے ہیں؛ بلکہ ان کی اس عرفیت کی شہرت درجۂ تواتر کو پہنچی ہوئی ہے۔

۳- بحر ذخار میں ہے کہ شیخ عبدالقدوس نظام آبادی کے سات بیٹے تھے اور ساتوں عالم وفاضل تھے، جبکہ شیخ عبدالقدوس قلندر جونپوری کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی، اصول المقصود ص ۸۳-۸۴ میں ہے کہ:

> ''حضرت شیخ را پسرے نبود، دو دختر بودند یکے بشیخ فیض اللہ کتخدا بود کہ خادم وجانشین آنحضرت بود... ودمی بشیخ قطب الدین ساکن منڈیاہو کتخدا بود اوشاں اولاد اند ودر جونپور سکونت دارند، واز دختر اول اولاد نشد''

شیخ عبدالقدوس قلند جونپوری کے کوئی لڑکا نہیں تھا دو بیٹیاں تھیں: ایک کا نکاح شیخ فیض اللہ سے ہوا تھا جو شیخ کے خادم اور جانشین تھے اور دوسری شیخ قطب الدین ساکن منڈیاہوں (ضلع جون پور) کے نکاح میں تھیں، ان سے اولاد ہوئیں جو جونپور میں رہتی ہیں، اور پہلی بیٹی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

۴- سلسلہ قلندریہ وغیرہ کے تمام تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ شیخ عبدالقدوس قلندر نے اپنے والد شیخ عبدالسلام قلندر جونپوری متوفی ۹۷۶ھ اور ان کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ شیخ عبدالرحمٰن جانباز قلندر لاہر پوری (ضلع سیتاپور) سے ارشاد وسلوک کی تعلیم وتلقین حاصل کی تھی اور ان دونوں بزرگوں سے انھیں خلافت واجازت ملی تھی، ان کے علاوہ شیخ

عبدالقدوس قلندر جونپوری کے کسی اور پیر و مرشد کا ذکر کوئی بھی نہیں کرتا ہے، جبکہ شیخ عبدالقدوس (قدن شاہ) نظام آبادی کے بارے میں ان کے سارے تذکرہ نویس صراحت کرتے ہیں کہ انھوں نے شیخ عبداللہ شطاری خراسانی بانی سلسلۂ شطاریہ متوفی ۸۹۰ھ اور ان کے خلیفہ خاص حافظ واسطہ کار سے سلوک کی تعلیم حاصل کی تھی اور انھیں سے خلافت پائی تھی۔ کسی نے بھی ان کے شیخ و مرشد کی حیثیت سے شیخ عبدالسلام جونپوری اور شیخ عبدالرحمٰن لاہر پوری کا ذکر نہیں کیا ہے۔

۵- شیخ عبدالقدوس قلندر جونپوری کے والد اور اولین شیخ و مرشد شاہ عبدالسلام قلندر جونپوری کی وفات حسب تصریح "نفحات العنبر یہ" ۹۷۶ھ میں ہوئی ہے اور شیخ عبدالرحمٰن لاہر پوری کا بھی ۹۷۶ھ ہی میں انتقال ہوا ہے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ شیخ عبدالقدوس قلندر جونپوریؒ ۹۷۶ھ تک تعلیم و تلقین اور اخذ و طلب کی منزل میں تھے، سجادۂ مشیخت پر اس کے بعد ہی رونق افروز ہوئے ہیں، جبکہ شیخ علی عاشقاں سرائے میری اس سے اکیس یا بائیس سال پہلے ہی ۹۵۰ھ یا ۹۵۵ میں اس دار فانی سے رہ گرائے عالم جاودانی ہو گئے تھے، اس لیے شیخ عبدالقدوس قلندر جونپوری ان کے پیر و مرشد کیسے ہو سکتے ہیں۔

۶- شیخ عبدالقدوس قلندر جون پوری کے بارے میں ان کے تمام تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ ۱۰۵۲ھ میں ایک سو دس سے زائد عمر میں ان کی وفات ہوئی ہے، اس اعتبار سے ان کی پیدائش ۹۴۲ھ کے لگ بھگ ہوتی ہے؛ لہٰذا شیخ علی عاشقاں کی وفات کے وقت ان کی عمر ۱۲-۱۳ سال سے زائد نہیں بنتی ہے، اس لیے شیخ علی عاشقاں ان کے مرید و خلیفہ کیونکر ہوں گے۔

ان مذکورہ وجوہ سے ہمارے نزدیک محقق یہی ہے کہ شیخ عبدالقدوس عرف شاہ قدن نظام آبادی ہی میر علی عاشقاں کے شیخ و مرشد ہیں، جو شیخ عبدالقدوس قلندر سے مقدم ہیں، ہمارے علم کے مطابق دونوں بزرگوں کو ایک سمجھنے کی غلطی سب سے پہلے صاحب بحر ذخار سے ہوئی ہے، چنانچہ وہ شیخ عبدالقدوس قلندر کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

ازینجا قیاس باید کرد کہ مثل شاہ عاشقاں سرائے میری - کہ احوالش بلجہ شطاریہ باید خواست - از و اخذ سلوک خواہد نمود (ورق ۲۱۹ قلمی)

شیخ کی عظمت شان کو یوں سمجھنا چاہیے کہ علی عاشقاں سرائے میری جیسے بزرگ نے ان سے اخذ سلوک کیا ہے۔

پھر مرحوم مولوی نورالدین زیدی ظفرآبادی نے تجلی نور میں بحر ذخار کی یہ بات نقل کردی، چونکہ یہ دونوں کتابیں دیار پورب کے علماء وصوفیا کے حالات میں اہم ترین ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں اس لیے بعد کے تذکرہ نویسوں نے ان پر اعتماد کیا، اس طرح یہ بات چل پڑی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مولانا عبدالقوی مُنڈیارویؒ

مولانا عبدالقوی بن شاہ حبیب اللہ خاں ۱۳۱۰ھ میں اپنے آبائی وطن موضع منڈیار ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم ناظرۂ قرآن حکیم تک گھر پر حاصل کر کے جگدیش پور کے پرائمری اسکول میں داخل ہوئے اور وہیں سے ۱۳۲۶ھ میں درجہ چہارم کا امتحان پاس کیا اس کے بعد علوم دینیہ کی جانب متوجہ ہوئے، اس زمانہ میں مولانا عبدالاحد صاحب ساکن منجیر پٹی مدرسہ قرآنیہ جامع مسجد جونپور سے علیحدہ ہوکر گھر ہی پر درس وتدریس میں مشغول تھے، مولانا عبدالقوی بھی ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوکر فارسی پڑھنے لگے ابھی چند ماہ ہی گذرے تھے کہ مولانا عبدالاحد صاحب کا تقرر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں بحیثیت صدر مدرس کے ہوگیا، اس لیے ان کے ہمراہ ۱۴ر محرم ۱۳۲۷ھ مطابق ۲۵ر جنوری ۱۹۰۹ء میں مولانا عبدالقوی بھی مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہو گئے اور چار برس تک مسلسل مدرسۃ الاصلاح میں رہ کر مولانا محمد مصطفیٰ سکروری اور مولانا عبدالاحد سے فارسی کی تکمیل کی اور ساتھ ہی خوش نویسی کی بھی مشق کی، جمادی الاخریٰ ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۲ر مئی ۱۹۱۳ء کو مولانا عبدالاحد بعض وجوہ سے مدرسۃ الاصلاح سے الگ ہوکر مسجد اٹالہ شہر جونپور کے مدرسہ میں چلے گئے، تو مولانا عبدالقوی بھی ان کے ہمراہ جون پور چلے گئے اور وہیں مولانا عبدالاحد سے مشکوٰۃ وجلالین تک پڑھ کر ۷ر شوال ۱۳۳۵ھ میں دورۂ حدیث کی تحصیل کی غرض سے دیوبند کا سفر کیا، وہاں پہونچنے پر معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند اس وقت

مالٹا میں اسیر ہیں اس لیے وہاں سے مظاہر علوم سہارنپور چلے آئے اور یہیں مولانا خلیل احمد انبیٹھوی سے ۱۳۳۶ھ میں دورۂ حدیث کی تکمیل کر کے سند فراغت حاصل کی۔

مولانا کے والد شاہ حبیب اللہ خاں بڑے عابد وزاہد اور صوفی منش بزرگ تھے، ان کی پاکیزہ زندگی کا اثر مولانا عبدالقوی مرحوم پر بھی پڑا اور دورانِ تعلیم ہی سے تصوف کی جانب طبیعت کا رجحان ہوگیا، چنانچہ مظاہر علوم کے زمانۂ تعلیم میں عیدالاضحیٰ کی تعطیل کے موقع پر حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی خانقاہ تھانہ بھون کا سفر کیا، حسن اتفاق سے اس وقت خانقاہ میں حضرت مولانا عبدالغنی پھولپوری اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن بکھراوی بھی موجود تھے، دونوں حضرات سے ہم وطن ہونے کی وجہ سے مولانا کے بڑے تعلقات تھے، ان حضرات کے مشورہ سے حضرت تھانوی کی خدمت میں بیعت کی درخواست کی جو خلاف توقع شرف قبولیت سے مشرف ہوئی اور آپ حضرت تھانوی کے سلسلے میں داخل ہو گئے، تعلیم مکمل کر لینے کے بعد ۱۳ر شعبان ۱۳۳۶ھ میں دوبارہ تھانہ بھون گئے، اس بار چھ ماہ تک حضرت تھانوی کی خدمت میں رہے اس دوران میں نماز پنجگانہ کی امامت اور مواعظ کے قلمبند کرنے کی خدمت آپ کے ذمہ رہی غرض ۶ ماہ خانقاہ میں قیام کر کے ۱۶ر صفر ۱۳۳۷ھ کو وہاں سے گھر واپس آئے، مولانا طبعی طور سے عزلت پسند واقع ہوئے تھے، اس لیے ہر قسم کے جھمیلوں سے الگ رہ کر ذکر واذکار اور مطالعۂ کتب میں مشغول ہو گئے، پھر حضرت مولانا عبدالغنی پھولپوریؒ کی خواہش پر ان کی خانقاہ کے مدرسہ روضۃ العلوم میں محرم ۱۳۳۹ھ میں تعلیمی وتدریسی سلسلہ شروع کیا، جو معمولی سے وقفہ کے بعد ۱۳۴۴ھ تک جاری رہا، پھر یہاں سے مولانا پھول پوری ہی کے ایماء پر مولانا محمد کبیر رئیس بکھرا کے مدرسہ میں چلے گئے اور ۱۳۵۷ھ تک وہاں بھی تعلیمی خدمات انجام دیں، سن مذکور ہی میں وہاں سے الگ ہو کر گھر چلے آئے اور تقریباً ۵ برس تک گھر ہی پر رہے، بعد ازاں ۱۶ر ذی قعدہ ۱۳۶۲ھ میں مدرسہ روضۃ العلوم کی جانب سے حضرت تھانویؒ کے مواعظ سے تفسیری مباحث کے انتخاب پر مامور ہوئے، چنانچہ مواعظ تفسیریہ کے عنوان سے ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع کیا اس کام کو مکمل کر لینے کے بعد گھر چلے آئے اور آخری زندگی تک گھر ہی پر

عزلت نشیں رہے، مولانا عبدالقوی مرحوم جملہ علوم میں دستگاہ رکھتے تھے بالخصوص فرائض میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

مدرسہ بیت العلوم سرائے میر کی ابتدائے تاسیس سے آخری دم تک مجلس عاملہ کے رکن رہے۔ حضرت مولانا عبدالغنی پھولپوریؒ سے قرب خاص حاصل تھا اور ان کی معیت میں وقت گذارنے کو غنیمت سمجھتے تھے، ایام مرض میں بھی جمعہ کے دن حضرت پھولپوریؒ کی خدمت میں حاضر ہونا ضروری سمجھتے تھے، انتقال سے آٹھ برس پہلے بواسیر کے موذی مرض میں مبتلا ہوگئے تھے، ان کے صاحبزادوں نے بارہا آپریشن کرانے کی فہمائش کی لیکن نماز کے قضا ہونے کے اندیشہ سے کبھی اس کے لیے تیار نہیں ہوئے، طبیعت میں احتیاط بہت زیادہ تھی، اس لیے دوران مرض میں ہمیشہ نماز پنجوقتہ کے لیے تازہ غسل کرتے تھے بالآخر اسی مہلک مرض میں ستہتر (۷۷) برس کی عمر میں ۸ رنومبر ۱۹۶۷ء مطابق ۱۳۸۷ھ کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنے آبائی قبرستان میں پیوستِ خاک ہوئے۔ (از بیاض مولانا مرحوم)

مولانا حافظ عبداللہ مئویؒ

حضرت مولانا حافظ عبداللہ بن عبدالرحیم بن دانیال اپنے وقت کے مشاہیر علماء میں تھے، آپ کے چمنستان علم سے بیشمار علماء وفضلاء نے خوشہ چینی کی اور علمی دنیا میں شہرت ومقبولیت حاصل کی۔

مولانا اپنے مولد ومنشا کے لحاظ سے مئوی اعظمی ہیں، لیکن زندگی کا اکثر حصہ غازی پور میں بسر کیا، اس لیے غازی پوری کی نسبت سے مشہور ہوئے، آپ کے سنہ ولادت میں تذکرہ نگار مختلف ہیں، صاحب تراجم علمائے حدیث ۱۲۶۰ھ لکھتے ہیں اور مولانا محمد اویس نگرامی مصنّف تذکرہ علمائے حال ۱۲۶۸ھ، ان دونوں کے برخلاف علامہ عبدالحیٔ الحسنی کی تحقیق ۱۲۶۱ھ کی ہے۔

مولانا بچپن ہی سے نہایت تیز خاطر، ذہین وفطین واقع ہوئے تھے، ۱۲ربرس کی عمر میں حفظِ قرآن سے فارغ ہوکر اپنے وطن کے ایک عالم مولوی محمد قاسم مئوی سے فارسی اور

عربی کی تعلیم شروع کی، ابھی چند ہی کتابیں پڑھنے پائے تھے کہ ہنگامۂ غدر برپا ہو گیا جس کی لپیٹ میں مئو بھی آ گیا اور یہاں کی شہری زندگی نہایت ابتر ہو گئی اور مولانا کے والدین ترک وطن پر مجبور ہو گئے، چنانچہ اپنے ہونہار فرزند کو لے کر یہ حضرات مئو سے منتقل ہو کر غازی پور چلے آئے اور جب کچھ سکون حاصل ہوا تو مولانا کو چشمۂ رحمت غازی پور میں داخل کر دیا، جہاں آپ نے مولانا فاروق چریا کوٹی اور مولانا رحمت لکھنوی بانیٔ مدرسہ سے درسیات کی اکثر کتابیں پڑھیں پھر یہاں سے جون پور کا رخ کیا اور مدرسہ حنفیہ میں داخلہ لے کر مفتی محمد یوسف فرنگی محلی سے بقیہ نصاب کی تکمیل کی، فنون سے فراغت کے بعد دہلی کا سفر کیا اور مولانا سید نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں حاضر ہو کر دورۂ حدیث پڑھا اور سند فراغت حاصل کی، تکمیل تعلیم کے بعد ۱۲۹۷ھ میں حجاز مقدس کے سفر میں گئے اور وہاں علامہ شوکانی کے تلمیذ رشید شیخ عباسی یمنی سے بھی حدیث کی سند و اجازت حاصل کی، حج سے واپسی کے بعد چشمۂ رحمت غازی پور میں مدرس مقرر ہوئے اور تقریباً سات برس تک مسلسل یہاں تدریسی خدمات انجام دیں، لیکن بعد میں آمین بالجہر اور رفع یدین جیسے فروعی اور غیر اہم مسائل میں ایسے الجھے کہ غازی پور چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا، اور ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں مولانا محمد ابراہیم آروی کی طلب پر مدرسہ احمدیہ آرہ چلے گئے اور وہاں جم کر بیس سال تک درسی خدمات انجام دی، پھر ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۶ء) میں یہاں سے بھی علاحدگی اختیار کر لی اور دلی کو اپنی خدمات کا مرکز بنایا اور آٹھ برس تک یہاں بھی درس و افادہ کا بازار گرم کر کے سیکڑوں طلبہ کو اپنے علمی فیوض سے بہرہ ور کیا، دہلی کے زمانۂ قیام میں درسِ قرآن پر زیادہ توجہ رہی، اس زمانے میں آپ کے ایک قریبی عزیز لکھنؤ میں چند چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر قضاء کر گئے، مولانا ان یتیموں کی نگہداشت کی غرض سے دلی سے لکھنؤ چلے آئے، بالآخر یہیں آپ کا بھی پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا اور چند ہفتہ بیمار رہ کر ۲۱ صفر ۱۳۳۲ھ کو سہ شنبہ کے دن داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور عیش باغ میں دفن ہوئے۔

مولانا عبداللہ جملہ علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے، صدرا، قاضی مبارک اور ہدایہ جیسی اہم اور ادق کتابیں بیسیوں بار پڑھائیں۔ علمی تبحر کے ساتھ زہد و تقویٰ کی صفت سے

بھی متصف تھے، البتہ ترک تقلید میں بڑا غلو رکھتے تھے، جس کی وجہ سے بعض اوقات دشواریوں میں بھی مبتلا ہوجاتے تھے، اسی غلو کی وجہ سے آپ کو غازی پور چھوڑنا پڑا تھا۔

کثرت تدریس کے ساتھ مولانا نے متعدد رسائل بھی تالیف کیے جن کی فہرست یہ ہے:

(۱) ابرار اہل الحدیث والقرآن (۲) المنطق (۳) فصول احمدی (فنِ صرف میں) (۴) النحو (۵) مقدمہ صحیح مسلم عربی (۶) تسہیل الفرائض (۷) رسالہ تحقیق تراویح۔

ان رسائل کے علاوہ اور بھی مختلف موضوعات پر آپ نے کتابیں لکھیں، مگر ان کے طبع ہونے کی نوبت نہ آئی اور اکثر مسودے ضائع ہوگئے۔

مولانا کے تلامذہ کی تعداد بے شمار ہے جن میں سے بعض مشاہیر یہ ہیں: مولانا محمد سعید بنارسی، مولانا شاہ عین الحق پھلواروی، مولانا محمد اسماعیل رسول پوری جونپوری، مولانا عبدالرحمٰن غازی پوری، مولانا وارث حسن شاہ کوڑہ جہان آبادی، مولانا عبدالسلام مبارکپوری، مولانا ابوبکر جون پوری۔

مولانا کا اپنا ذاتی کتب خانہ بھی تھا جس میں حدیث فقہ، تاریخ، تراجم وغیرہ کی بہت اہم اور نادر کتابیں تھی جو آپ کی وفات کے بعد مرکزی دار العلوم بنارس میں منتقل ہوگئیں۔

(تراجم علمائے اہل حدیث ص ۴۵۵ وتذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۱ وتذکرہ علمائے حال ص ۵۲ ونزہہ ج ۸ ص ۲۸۷)

مولانا عبداللہ مئوی رحؒ

شیخ فاضل مولانا حکیم عبداللہ بن لعل محمد مئوی اعظمی ۱۲۵۲ھ میں قصبہ مئو میں پیدا ہوئے، ابتدائی کتابیں شیخ عنایت اللہ واعظ سے پڑھ کر حضرت مولانا سخاوت علی جونپوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مولانا سے بعض کتابیں پڑھیں، چونکہ اسی زمانہ میں مولانا سخاوت علی جون پوری رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ ہجرت کر کے چلے گئے، اس لیے مدرسہ حنفیہ میں داخل ہوگئے اور مولانا عبدالحلیم بن امین اللہ فرنگی محلی سے بقیہ کتابیں پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، ان اساتذہ کے علاوہ آپ نے رسڑا میں مولانا تراب علی لکھنوی سے بھی تعلیم وتحصیل کی۔ اس کے بعد اس وقت کے رواج کے مطابق فن طبابت کی تحصیل شروع

کردی اور مختلف اطباء سے اس فن کو سیکھا جن میں حکیم یعقوب لکھنوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، زمانہ طالب علمی ہی میں حکیم یعقوب کی معیت میں ۱۲۸۴ھ میں حرمین شریفین کا سفر کیا اور حج وزیارت سے بہرہ اندوز ہوئے، اس حج کے علاوہ مولانا نے ۱۲۹۰ھ میں دوسرا حج بھی کیا اور وہاں حضرت شیخ عبدالغنی بن ابوسعید عمری مجددی محدث دہلوی سے علم حدیث کی تحصیل کی اور سند واجازت حاصل کی۔

آپ کا قیام نوانگر ضلع بلیا میں تھا جہاں درس وتدریس کے ساتھ طبابت بھی کرتے تھے، جب عمر کافی ہوگئی اور ضعیفی کے آثار نمایاں ہوگئے تو درس کو موقوف کر کے گھر چلے آئے اور ۱۳۲۱ھ میں انتقال کیا۔ (نزہۃ ص ۲۹۵ ج ۸)

مولانا عبداللہ جیراجپوریؒ

مولانا عبداللہ بن عبید اللہ جیراجپوری اعظمی تیرہویں صدی کے مشاہیر علماء میں سے تھے، ۱۲۶۴ھ میں موضع جیراجپور میں پیدا ہوئے، علوم وفنون کی تحصیل مدرسہ حنفیہ جونپور میں مفتی یوسف بن محمد اصغر فرنگی محلی اور وہاں کے دوسرے اساتذہ سے کی اور حدیث کی تحصیل کے لیے دہلی کا سفر کیا وہاں مولانا سید نذیر حسین محدث کے حلقۂ درس میں شامل ہوکر صحاح ستہ کو سبقاً سبقاً پڑھا اور سند واجازت حاصل کی، اس کے بعد علم طب کی تحصیل کی جانب متوجہ ہوئے اور اس وقت کے مشہور طبیب حکیم محمود بن صادق شریفی سے اس فن کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا، پھر گھر واپس ہوئے اور علماء صلحاء کی طرح تاحیات تعلیم وتدریس میں مشغول رہے، آپ کے تلامیذ میں مولانا سلامت اللہ جیراجپوری، مولوی عبداللہ ندوی اور مولوی حیدر علی بڑی شہرت کے مالک ہوئے، مولانا شبلی نعمانی نے بھی ابتدائی تعلیم ان سے حاصل کی تھی، ۶ رشعبان ۱۳۰۷ھ میں وصال ہوا۔ (تراجم علمائے اہل حدیث ص ۳۸۴ ونزہۃ ص ۲۸۹ ج ۸)

مولانا عبداللہ چاند پارویؒ

مولانا عبداللہ بن ہمت چاند پاروی اعظم گڈھ کے ان علماء میں ہیں جنھیں حضرت

مولانا عبدالحئی فرنگی محلی قدس سرہ سے تلمذ کا شرف حاصل ہے، مولانا چاند پارہ ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی کتابیں مولانا سلامت اللہ جیراجپوری اور مولانا شکر اللہ سبرحدی سے پڑھیں، اس کے بعد حضرت مولانا عبدالحئی لکھنوی فرنگی محلی قدس سرہ کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور مدتوں ان کی صحبت میں رہ کر جملہ علوم وفنون کی تحصیل کی، تعلیم وتحصیل کے بعد تدریسی وتعلیمی مشغلہ اختیار کیا اور زمانہ دراز تک ویلور کے مدرسہ میں طلبۃ العلم کی تعلیم وتربیت میں منہمک رہے، ویلور ہی کے زمانۂ مدرسی میں آپ نے قرآن کریم حفظ کیا اور حج وزیارت سے مشرف ہوئے۔ مولانا اپنے عہد میں ذکاوت، قوت حفظ اور تیزیٔ فہم میں امتیازی شان رکھتے تھے، ۲۹؍ربیع الاوّل ۱۳۲۱ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (نزہہ ص ۲۹۷ ج ۸)

مولانا عبداللہ شائق مئویؒ

مولانا عبداللہ شائق بن محمد اسماعیل بن حاجی عبدالقادر بن عبداللہ مئوی ۱۰؍ذی الحجہ ۱۳۰۹ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد مولانا سلطان احمد مئوی اور مولانا احمد مئوی سے فارسی کی کتابیں پڑھیں اور علوم عربیہ متداولہ کی تحصیل مختلف اساتذہ سے کی جن میں مولانا عبدالرشید کان پوری، مولانا شاہ عین الحق پھلواروی (۱)، مولانا حافظ عبدالمنان (۲)، مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا عبدالعلیم رسول پوری اور مولانا محمد فاروق چریاکوٹی بڑی شہرت ومقبولیت کے حامل ہیں، آخر الذکر دونوں بزرگ حنفی المسلک تھے۔

(۱) مولانا عین الحق بن علی حبیب پھلواروی نے مولانا نعمت اللہ پھلواروی اور مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری سے تعلیم وتحصیل کی، نہایت عبادت گذار اور صالح عالم تھے، لکھنؤ میں فالج کی وجہ سے ۱۳۲۲ھ میں انتقال کیا۔

(۲) مولانا حافظ عبدالمنان ۱۲۶۷ھ میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں بینائی سے محروم ہو گئے، لیکن تعلیم وتعلم میں منہمک رہے اور مولوی برہان الدین ہتاروی وغیرہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کر کے سہارنپور گئے اور وہاں حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی سے علوم وفنون کی تحصیل کی۔ اس کے بعد بھوپال آ کر مولانا عبدالجبار سے بھی بعض کتابیں پڑھیں، پھر یہاں سے دہلی آئے اور مولانا سیدنذیر حسین سے حدیث کی تکمیل کی۔ مولانا سیدنذیر حسین کے تلامذہ میں ان سے زیادہ کسی کے بھی شاگرد نہیں ہوئے، تقریباً پینتیس (۳۵) برس تک صحاح ستہ کا درس دیا، ۱۳۳۴ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (نزہہ ص ۳۱۲، ج ۸)

فراغت کے بعد حافظ عبداللہ غازی پوری کے مشورہ سے مسجد چنیاں والی لاہور کے مدرسہ میں تدریسی مشغلہ کی ابتدا کی، اس مدرسہ میں اکثر طلبہ سن رسیدہ اور دراز قد تھے اور مولانا ابھی نوعمر اور پستہ قد، اس لیے طلبہ کو ان کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنے میں شرم وعار محسوس ہوئی اور برملا کہہ دیا کہ ہم مولانا عبداللہ سے نہیں پڑھیں گے، اس لیے مجبوراً لاہور سے مستعفی ہوکر مدرسہ ہدایت الاسلام ضلع مونگیر چلے آئے، کچھ دنوں یہاں کام کرنے کے بعد ۱۳۳۳ھ میں اپنے آبائی وطن قصبہ مئو کے مدرسہ فیض عام میں استاذ مقرر ہوئے، یہاں تقریباً ۱۳۵۶ھ تک درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے اس مدت میں درس نظامیہ کی ابتدائی کتابوں سے لے کر انتہائی کتابوں تک کا درس دیا اور حدیث کے اسباق بھی پڑھاتے رہے۔

مولانا عبداللہ مسلکاً اہل حدیث تھے، لیکن متشدد اہل حدیثوں کی طرح مقلدین کی تکفیر وتفسیق نہیں کرتے تھے، سیاست میں مولانا کٹر کانگریسی تھے اور خلافت کے دور میں سیاسی مشاغل کی وجہ سے آپ نے درس وتدریس موقوف کر کے پورے طور سے اس میں حصہ لیا اور کارہائے نمایاں انجام دیے۔

مولانا ایک اچھے شاعر بھی تھے اور نظم کے جملہ اصناف پر قادر تھے بالخصوص تاریخ گوئی میں ملکہ حاصل تھا، شائق تخلص رکھتے تھے، ابتداء میں شمشاد لکھنوی سے مشورۂ سخن لیا، ان کی وفات کے بعد اس کی ضرورت نہ رہی اور خود استاذ فن ہو گئے۔

مولانا کی اہم خدمات میں ایک مدرسہ کا قیام ہے، جسے انھوں نے فیض عام سے الگ ہونے کے بعد دار الحدیث کے نام سے ۱۳۷۴ہجری مطابق ۱۹۵۴ء میں قائم کیا اور زندگی کے آخری لمحات تک اس مدرسہ کی تنظیم وترقی میں لگے رہے، چنانچہ آپ کی مساعی جمیلہ سے مدرسہ بہت جلد ترقی کے بام عروج پر پہونچ گیا اور قصبہ کے ممتاز مدرسوں کی فہرست میں شمار ہونے لگا۔ بحمد اللہ یہ مدرسہ آج بھی جاری ہے اور اپنے نہج پر دینی خدمت انجام دے رہا ہے۔

تعلیمی، وتدریسی مصروفیات کی وجہ سے تصنیف وتالیف کا موقع بالکل نہیں ملا، ورنہ

مولانا میں تصنیفی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی، ایک کتاب حضرت مولانا حبیب الرحمٰن محدث اعظمی دامت برکاتہم کی کتاب ''الاعلام المرفوعہ'' کے رد میں ''الآثار المتبوعہ'' تصنیف کی جو طبع ہو کر حلقۂ غیر مقلدین میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی، ایک اور کتاب ''الصلوٰۃ'' کے نام سے بھی تالیف کی مگر وہ طبع نہ ہوسکی۔

مولانا کی وفات ۱۳/ دسمبر ۱۹۰۴ء مطابق ۱۳۹۴ھ میں ہوئی۔ (تراجم علمائے اہلحدیث ص ۴۳۲)

حضرت مولانا عبداللطیف نعمانیؒ

حضرت العلامۃ الحاج مولانا عبداللطیف نعمانی موضع امام گنج (متصل مئو) کے ایک معزز گھرانے میں بتاریخ ۹/ فروری ۱۸۹۸ء مطابق ۱۷/ رمضان ۱۳۱۵ھ میں پیدا ہوئے۔ والد محترم کا نام عبدالحفیظ تھا، جو اپنے وقت کے جید حافظ قرآن تھے، مولانا کے آباء واجداد دراصل تحصیل گھوسی کے باشندہ تھے، جو کئی پشت پہلے یہاں آکر آباد ہو گئے تھے اور اسی کو اپنا مستقل وطن بنالیا تھا، آگے چل کر اس خاندان نے اس قدر علمی وعملی ترقی کی کہ یہاں کی سیادت وقیادت مولانا نعمانی میں سمٹ کر آگئی۔

مولانا نعمانی بچپن میں عام لڑکوں کی طرح لہو ولعب اور کھیل تماشوں سے بڑی حد تک الگ رہے، البتہ کبڈی، بنوٹ اور اکھاڑے کے شوقین ضرور تھے، کسی قدر شعور آجانے کے بعد آپ کو مکتب میں بٹھایا گیا، جہاں آپ نے قواعد بغدادی، پارۂ عم اور قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی، اس وقت اس مکتب میں اس سے آگے کی تعلیم کا کوئی خاص نظم نہ تھا، اس لیے آپ کو مدرسہ دارالعلوم مئو میں داخل کر دیا گیا، اب یہاں باضابطہ آپ نے درس نظامیہ کی تعلیم شروع کردی، اردو فارسی کی منزلوں کو جلد ہی طے کر کے عربی تعلیم میں قدم رکھا، رفقائے درس میں محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا عبدالحیٔ اور مولانا محمد فاروق جیسے اساطینِ علم وفن شامل تھے۔

مولانا نے دارالعلوم مئو میں ۱۹۱۹ء مطابق ۱۳۲۷ھ تک تعلیم حاصل کی اور کتب متوسطات تک یہاں پڑھ کر اپنے رفقائے درس مولانا عبدالحیٔ ومولانا محمد فاروق کے ہمراہ

شوال ۱۳۳۷ھ مطابق جولائی ۱۹۱۹ء میں دار العلوم دیو بند پہونچے، اسی سال چند ہفتے قبل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن محدث اعظمی مدظلہ نے بھی دار العلوم میں داخلہ لیا تھا، مولانا نعمانی نے داخلہ لے کر اسباق شروع کر دیے، اتفاقاً مدرسہ میں فصلی بیماری کی وبا پھوٹ پڑی اور مولانا عبد اللطیف اور ان کے رفقاء مولانا عبد الحئی اور مولانا فاروق تینوں زد میں آگئے اور مجبوراً تینوں کو گھر واپس ہونا پڑا، مولانا نعمانی دیو بند سے روانہ ہو کر ۱۰ رمحرم ۱۳۳۷ھ میں مکان واپس پہونچے اور یہیں تعلیمی سلسلہ جاری رکھا، اس کے بعد شوال ۱۳۳۹ھ میں پھر دیو بند کا قصد کیا اور داخلہ لے کر تعلیم شروع کر دی، مگر اس بار بھی ایک ماہ سے زائد مولانا دیو بند نہ رہ سکے اور بعض حضرات کی ریشہ دوانیوں سے انھیں دیو بند چھوڑنا پڑا، بادل ناخواستہ یہاں سے مینڈھو چلے گئے، لیکن یہاں کی تعلیمی پستی کی وجہ سے دلجمعی حاصل نہ ہو سکی اور پندرہ بیس یوم کے بعد یہاں سے مئو چلے آئے، مینڈھو میں آپ نے جلالین شریف کا کچھ حصہ مولانا عبد الرحمٰن امروہی سے پڑھا اور اس سے پہلے دار العلوم میں جلالین ہی کے چند اسباق حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی (۱) قدس سرہ سے بھی پڑھا تھا۔

غرض مولانا نعمانی دوبارہ پھر ماہ ذیقعدہ ۱۳۳۹ھ میں دار العلوم مئو میں داخل ہوئے اس وقت دار العلوم میں حضرت مولانا کریم بخش سنبھلی تشریف لا چکے تھے اور دار العلوم کی شہرت کا آفتاب نصف النہار میں تھا، مولانا نعمانی ہر طرف سے یکسو ہو کر یہیں جم گئے اور جملہ علوم متداولہ مروجہ کی تحصیل و تکمیل کر کے شعبان ۱۳۴۱ھ میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی اور سند و اجازت سے مشرّف ہوئے، مولانا کی علمی و درسی استعداد اور دیگر خداداد

(۱) حضرت استاذی و استاذ الاساتذہ علامہ مولانا محمد ابراہیم بلیاوی حضرت شیخ الہند کے مخصوص تلامذہ میں تھے، جملہ علوم وفنون بالخصوص معقولات میں اپنے وقت میں فرد تسلیم کیے جاتے تھے، موجودہ اساتذۂ دار العلوم دیو بند و دیگر مدارس اسلامیہ کے اساتذہ کی اکثریت آپ کے شاگرد ہیں، درس حدیث میں خاص امتیاز کے مالک تھے، مدرسہ فتحپوری دہلی، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، مدرسہ ہاٹ ہزاری چاٹگام اور چند ماہ مدرسہ دار العلوم مئو میں صدارت تدریس کے عہدہ پر فائز رہے، آپ کے اساتذہ نے بالآخر آپ کو دار العلوم کے لیے انتخاب فرمایا ۷۷ ۱۳ھ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد آپ دار العلوم کے صدر مدرس، ناظم تعلیمات اور ممبر شوریٰ بنائے گئے اور تادم حیات ان عہدوں پر متمکن رہے۔ ۱۳۸۸ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے مدرسہ کے ذمہ دار حضرات نے مدرسہ میں بحیثیت مدرس ان کے تقرر کا فیصلہ کرلیا، چنانچہ اگلے سال وہ اسی دار العلوم میں مدرس ہو گئے اور پہلے ہی سال سے درسِ نظامیہ کی اعلیٰ کتابیں، مثلاً میبذی، شرح ہدایۃ الحکمت اور میر زاہد رسالہ مع غلام یحییٰ وغیرہ پڑھانے لگے، مولانا منظور احمد نعمانی نے اسی سال مولانا نعمانی سے میبذی وغیرہ پڑھیں، مولانا منظور احمد نعمانی نے اپنے تاثر کا اظہار یوں کیا ہے:۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا نے ان کتابوں کو اس طرح پڑھایا جس طرح منطق وفلسفہ کا کوئی کہنہ مشق ماہر مدرس پڑھاتا۔"

مولانا نعمانی نے ۱۳۴۱ھ سے ۱۳۴۷ھ تک دار العلوم میں تعلیمی وتدریسی خدمت انجام دی اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آ گئے کہ آپ کو دار العلوم چھوڑنا پڑا اور آپ یہاں سے اپنے استاذ حضرت مولانا کریم بخش صاحب کی طلب پر سنبھل ضلع مراد آباد کے ایک مدرسہ میں چلے گئے، یہاں آپ کے قیام کو صرف دو ڈھائی ماہ گذرے تھے کہ مولانا ابوالحسن مئوی کی کوششوں سے مفتاح العلوم کی نشأۃ ثانیہ کی داغ بیل ڈال دی گئی اور آپ کے قدیمی رفیق محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مدظلہ مظہر العلوم بنارس سے مفتاح العلوم آ گئے۔ مولانا اعظمی کے اصرار پر مولانا نعمانی بھی سنبھل سے مستعفی ہو کر مفتاح العلوم چلے آئے، اس وقت مولانا اعظمی صدر مدرس اور مولانا نعمانی نائب صدر منتخب ہوئے ۱۳۶۹ھ میں جب مولانا اعظمی نے اپنی تصنیفی مشغولیتوں کی وجہ سے جن کے لیے یکسوئی درکار تھی، مدرسہ سے علیحدگی اختیار کرلی تو مولانا نعمانی صدارتِ تدریس پر فائز ہوئے، ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء میں مولانا نعمانی یوپی اسمبلی کے ایم ایل اے ہو گئے تو اپنی جگہ پانچ سال کے لیے مولانا محمد ایوب اعظمی کو دے دی اور پھر ۱۳۸۱ھ سے حسب سابق بدستور صدارت تدریس پر آ گئے اور تادمِ آخر اس عہدہ پر متمکن رہے۔

مولانا نعمانی تعلیم وتدریس میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، جس فن کو پڑھاتے تھے ماہر فن معلوم ہوتے تھے، ابتداء میں منطق وفلسفہ سے زیادہ لگاؤ تھا، پھر حدیث وفقہ میں وہ مہارت حاصل کی کہ کوئی کسر باقی نہ رہی، درسِ حدیث کے وقت ایسا معلوم ہوتا کہ علم کا

ایک دریا ہے جو امنڈا چلا آرہا ہے، رواۃ پر فنِ اسماء الرجال کی حیثیت سے بحث کرتے، مناسب مقام پر رواۃ کے حالات پر روشنی ڈالتے، صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے جب کسی صحابی کا ذکر آجاتا ان کی خصوصیت ذکر فرماتے اس کے بعد متن حدیث کا مفہوم اس طرح سمجھاتے کہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتا تھا، تعارض کو اس خوبی سے دور کرتے کہ یقین کرنا پڑتا کہ ان میں کبھی تعارض تھا ہی نہیں، تراکیب نحویہ اور بلاغت کی جانب بھی اشارہ کرتے جاتے، ساتھ ہی فنِ حدیث کی اصطلاحات کی تشریح، صحابی کی احادیثِ مرویہ کی تعداد اور وجہِ تخصص مذاہب ائمہ اربعہ کو بھی واضح کرتے، دیگر علوم وفنون کی اصطلاحات کی تشریح، فِرَقِ باطلہ کے عقائد کی توضیح مع دلائل تراجم ابواب سے احادیث مرویہ کی مطابقت، اگر کوئی حدیث اختلافی مسئلہ سے متعلق آجاتی تو تفہیم حدیث کے بعد اختلاف مذاہب اور ہر ائمہ کے دلائل بالتفصیل بیان کرتے اور سب سے آخر میں مذہب حنفی کو قوی دلائل سے مزین فرماتے، اس وقت ایسا معلوم ہوتا کہ مذہب حنفی احادیث نبوی کے بالکل مطابق ہے۔ مشکل سے مشکل مسائل کا حل ایسے عنوانات سے بیان کرتے کہ سننے والے پر ایک کیفیت سی طاری ہو جاتی، جس سے مولانا کے تبحر علمی اور ہر فن میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔

دورانِ درس میں کبھی کوئی غیر متعلق بات نہیں کرتے اور نہ کبھی تکان دور کرنے کے لیے یا ذہن کو نشیط کرنے کے لیے کوئی لطیفہ، واقعہ یا علمی نکتہ بیان کرتے تھے، یہ مولانا کا خاص طرز تھا جو عام اساتذہ کے طرز سے جداگانہ تھا۔

مولانا نعمانی مناظر اور متکلم بھی تھے، مسلک رضاخانی کے مشہور عالم ومناظر مولوی حشمت علی سے کئی باران کے مناظرے ہوئے اور ہر بار مولوی حشمت علی کو ساکت وخاموش کر کے چھوڑا، علمائے اہلحدیث سے بھی تقریراً وتحریراً مناظرے کیے اور ہر موقع پر غالب رہے، ایک مرتبہ موضع بڑھنی ضلع بستی میں علمائے اہلحدیث سے مناظرہ ہوا، ایک طرف اعیان علمائے اہلحدیث موجود تھے اور احناف کی طرف سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی مدظلہٗ اور مولانا نعمانی مرحوم تھے، دونوں فریق کا اسٹیج آمنے سامنے لگا ہوا تھا، شرائط

مناظرہ پر بحث اور ردوکد ہورہی تھی، مگر کسی بات پر اتفاق نہ ہوتا تھا، کافی وقت اس میں گذر گیا، مولانا نعمانی نے جب یہ حال دیکھا تو کھڑے ہوکر اعلان فرمادیا کہ جتنے شرائط آپ لوگ پیش کرتے ہیں وہ اور اس کے علاوہ جو شرطیں آپ لگانا چاہیں وہ سب ہم کو منظور ہیں، ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں، ہم بلا شرط مناظرہ کے لیے تیار ہیں، مولانا کا یہ اعلان ان کے لیے برق خاطف ثابت ہوا، تمام جماعت اہلحدیث سراسیمہ ہوگئی اور صدائے برنخواست کا مصداق بن کر رہ گئی، مولانا نے وقت متعین کردیا کہ اتنی دیر میں اگر آپ لوگوں نے جواب دیا تو خیر ورنہ ہم اپنی فتح کا اعلان کردیں گے، چنانچہ وقتِ مقررہ گذر گیا اور علمائے اہلحدیث ایک ایک کرکے اسٹیج سے روانہ ہونے لگے، مولانا نے وقت مقررہ گذر جانے کے بعد نہایت شاندار تقریر فرمائی اور اپنی فتح وظفر کا اعلان کردیا۔

خطابت میں بھی آپ کو یدطولیٰ حاصل تھا، اپنے زورِ خطابت سے مخالف مجمع کو رام کرلینا ان کے لیے کچھ مشکل کام نہیں تھا، گھنٹوں تقریر کرنے پر بھی ان کا دماغ تھکن محسوس نہیں کرتا تھا۔

مولانا ایک اچھے مصنف بھی تھے، مولانا ثناء اللہ امرتسری کی کتاب ''فقہ فقیہ'' کے جواب میں ایک ضخیم کتاب تصنیف کی تھی، مگر زیورطبع سے آراستہ نہ ہوسکی اور مدت مدید گذر جانے کی وجہ سے کیڑوں کی نذر ہوگئی، جس کا صدمہ مولانا کو آخر عمر تک رہا، اس کے بعد پھر غالباً مستقل تصنیف کی نوبت نہیں آئی، البتہ مقالہ نگاری میں جم کر حصہ لیا اور رسالہ ''العدل'' گوجرانوالہ میں برابر لکھتے رہے۔

ان جملہ مشاغل کے ساتھ جن کے لیے کامل یکسوئی نہایت ضروری ہے، مولانا نعمانی سیاست کے ہنگامہ خیز اور خاردار میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے، ۱۹۲۳ء سے ہی آپ نے ملکی سیاست میں پورے طور سے حصہ لینا شروع کردیا تھا، ۱۹۴۷ء کی جنگِ آزادی میں آپ صف اوّل کے مجاہدین میں تھے، دورانِ جنگ قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، صوبہ اور ضلع کانگریس کے اہم عہدوں پر آخر عمر تک متمکن رہے، ۱۹۵۷ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر جنرل الیکشن میں یوپی اسمبلی کے ایم، ایل، اے ہوئے، جمعیۃ علماء ہند کے ایک

رکن کی حیثیت سے اس کا کام بھی برابر کرتے تھے۔ ضلع اعظم گڈھ جمعیۃ کے صدر بھی تھے، آپ کی آخری تقریر اسی پلیٹ فارم سے دارالعلوم مئو میں وفات سے ایک روز قبل تنظیم جمعیۃ کے سلسلہ میں ہوئی، ضلع ہینڈلوم کوآپریٹیو سوسائٹی کے صدر تھے اور اخیر عمر تک اس عہدے پر فائز رہے، تین بار میونسپل بورڈ کے چیرمین بھی منتخب ہوئے، تیسری مرتبہ ۱۹۷۱ء میں آپ ایسی حالت میں چیرمین ہوئے کہ بورڈ لاکھوں کا مقروض تھا اور اس کا سنبھالنا مشکل معلوم ہو رہا تھا، آپ نے اپنے حسنِ انتظام سے سترہ ماہ کی قلیل مدت میں نہ صرف بورڈ کو قرض کے بارگراں سے سبکدوش کر دیا؛ بلکہ بورڈ میں چار لاکھ کا اضافہ بھی کر دیا، اپنے دور میں قصبہ کے اندر سمنٹ کی پختہ سڑکیں بنوائیں، نالیاں تعمیر کرائیں اور میونسپل بورڈ کے لیے جدید قسم کی ایک عالیشان بلڈنگ بھی تیار کرا دی۔ مولانا ان مختلف النوع مشاغل میں صبح سے گیارہ بارہ بجے رات تک مصروف رہتے، جس کی ترتیب یوں تھی، صبح سے دس بجے تک تدریسی خدمت انجام دیتے اس کے بعد میونسپلٹی کے دفتر میں پہونچ جاتے مقدمات کی مسل ملاحظہ کرتے اور حکم احکام اپنے ہاتھ سے لکھتے ضروری کاغذات اور ملازمین کی نگرانی اور کارکردگی کا معائنہ کرتے، تقریباً بارہ بجے تک ان امور سے فارغ ہوکر مدرسہ آجاتے اور کھانا کھاکر تھوڑی دیر قیلولہ کرتے، ظہر کی نماز کے بعد پھر درس شروع کر دیتے، درس سے فارغ ہوکر اگر ضرورت سمجھتے میونسپلٹی کے دفتر میں چلے جاتے ورنہ سوسائٹیوں کے معائنہ اور اس کی دیکھ بھال کے لیے اس کے دفتر میں تشریف لے جاتے، مغرب کے بعد پھر درس شروع ہوجاتا جو عشاء تک جاری رہتا، عشاء کے بعد کھانا تناول کرتے اور مطالعۂ کتب میں لگ جاتے جس کا سلسلہ موزونی طبع کے اعتبار سے گھٹتا بڑھتا رہتا تھا۔

مولانا مرحوم اخلاق کے اعتبار سے بھی بہت بلند پایہ تھے۔ عوام وخواص سے یکساں برتاؤ کرتے، غریب اور معمولی آدمیوں کے کسی کام کے لیے میلوں اس کے ساتھ پیدل چلے جاتے، دوست احباب کے مجمع میں انتہائی خاکساری اور تواضع سے پیش آتے، کبھی ترفع وتعلّی سے کام نہیں لیتے تھے، ہمیشہ اپنے کو خادمانہ حیثیت سے پیش کرتے، یہ وصف تفریحی مجلسوں اور کھانے پکانے کی محفلوں میں زیادہ نمایاں نظر آتا تھا، ہمیشہ اپنا کام خود

اپنے ہاتھوں انجام دیتے، تلامذہ اور معتقدین کی خواہش کے باوجود بھی کبھی کسی سے خدمت لینا پسند نہ کرتے تھے۔

مولانا کے ظاہر و باطن میں بالکل یکسانیت تھی، وہ اپنے قلبی جذبات کو چھپانے یا اس کے برخلاف اظہار پر قدرت نہ رکھتے تھے، اگر کسی سے خوش ہیں تو ظاہر و باطن خوش، ناخوش ہیں تو اعلانیہ چہرہ بشرہ سے اس کا اظہار ہو جاتا اور برملا کہہ دیتے تھے۔ جرأت و بیباکی تو گویا گھٹی میں پلائی تھی، پرخطر سے پرخطر مقامات میں اپنی چھڑی گھماتے ہوئے بے تامل پہونچ جاتے اور بڑے بڑے آفیسر اور حاکم کے سامنے حق بات کہنے میں ذرہ برابر بھی ہراس نہ محسوس کرتے تھے، اسی بنا پر آپ شیر مئو کے لقب سے مشہور تھے۔

موت ایک ایسا راستہ ہے جس سے بچ کر نکل جانا ممکن نہیں، دیر سویر ہر انسان کو اس راستے سے گذرنا ہی پڑتا ہے، چنانچہ ۳۰/ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ مطابق ۶/جنوری ۱۹۷۳ء بروز شنبہ علم و عمل کا یہ پیکر بھی عمر عزیز کی ستہترویں (۷۷) منزل طے کر کے اس راہ میں آ ہی گیا اور ساڑھے دس بجے شب میں حیات و موت کی کشمکش میں صرف چند منٹ مبتلا رہ کر مولائے حقیقی سے جاملا۔

''مرکز علم در جنت رسید'' اور ''اللّٰھم اغفرہ'' سے تاریخِ وفات نکلتی ہے۔

ہمارے دیار میں مولانا نعمانی کا نام بڑی عزت واحترام سے لیا جاتا ہے اور ان کی مجاہدانہ زندگی کے سب ہی قدرداں ہیں، ان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جنازہ میں چالیس پچاس ہزار مسلمان شریک تھے اور ظہر سے عصر تک لوگ مٹی دیتے رہے۔

مولانا نعمانی کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، جن کا احصاء بہت دشوار ہے، البتہ ان میں مولانا منظور نعمانی ایڈیٹر الفرقان لکھنؤ، مولانا محمد حسین بہاری استاذ دارالعلوم دیوبند، مولانا عبدالجبار اعظمی استاذ حدیث مفتاح العلوم مئو، مولانا عبدالرشید اعظمی نائب صدر مدرس مفتاح العلوم مئو، مولانا ظفیر احمد مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، مولانا محمد مصطفیٰ مفتاحی نائب قاضی امارت شرعیہ بہار واڑیسہ علمی حلقوں میں بڑی شہرت و ناموری کے مالک ہیں۔ (ماخوذ از تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی)

حضرت مولانا شاہ عبدالمجید مئویؒ

حضرت مولانا شاہ عبدالمجید بن شاہ مولوی کریم بخش بن مولوی محمد قائم بن مولوی شاہ کمال مئوی حنفی تقریباً ۱۲۷۴ھ میں مئو میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم قصبہ کے اساتذہ سے حاصل کی جن میں استاذ الکل حضرت مولانا امام الدین پنجابی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، اس کے بعد مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں مولانا عبدالعلیم رسول پوری، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی اور دیگر اساتذہ سے جملہ علوم وفنون کی تکمیل کی، پھر لکھنؤ جاکر فنِ طبابت کی تحصیل کی اور اس فن کو بھی علیٰ وجہ الاتم حاصل کر کے بلند پایہ طبیب بھی ہو گئے۔

مولانا عبدالمجید ایک علمی اور روحانی خانوادے کے چشم وچراغ تھے، مولانا کے والد ماجد قصبہ کی شاہی مسجد کے امام اور شاہ کمال افغانی خلیفہ شاہ اسحٰق دہلوی قدس اسرارہ کے خلیفہ تھے، آپ کے مریدین ومستفیدین کا حلقہ بہت وسیع تھا، مولانا عبدالحق مہاجر مکی صاحب ''تفسیر اکلیل''، انھیں اعظم گڈھ کی شمعِ ہدایت کہا کرتے تھے۔

شاہ صاحب نے فراغت تعلیم کے بعد علماء وصلحاء کی طرح درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور مسلسل اٹھائیس برس شہر بنارس کی مشہور درسگاہ جامعہ مظہر العلوم میں صدارت تدریس کے عہدہ پر فائز رہے، مولانا کے بنارسی طلبہ میں مفتیٔ شہر حضرت مولانا مفتی ابراہیم صاحب اپنے وقت میں بڑے شہرت ومقبولیت کے مالک ہوئے۔

مظہر العلوم سے الگ ہوجانے کے بعد مشرقی یوپی کی سب سے مشہور درسگاہ دارالعلوم مئو کے ناظم منتخب ہوئے اور عرصۂ دراز تک اس عہدہ پر فائز رہے، آپ کا دورِ نظامت مدرسہ کا دورِ زریں ہے، اسی عہد میں محدّث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، شیر مئو حضرت مولانا عبداللطیف نعمانی جیسے علم کے آفتاب وماہتاب مدرسہ سے فارغ ہو کر نکلے۔

مولانا دارالعلوم کے استحکام وترقی کے لیے ہر وقت سرگرداں رہتے، قرب وجوار اور دور دراز کے اسفار مدرسہ کے لیے کرتے رہتے، حتیٰ کہ کثرت اسفار سے آپ کی صحت بہت گر گئی، مگر مدرسہ سے آپ کو اس قدر محبت تھی کہ اپنے آرام وراحت کا کبھی خیال نہ کیا۔

علمی تبحر کے ساتھ مولانا عبدالمجید صاحب روحانی طریق میں بھی کامل تھے اور اپنے والد ماجد شاہ کریم بخش کے خلیفہ تھے اور سلاسل اربعہ میں بیعت کرتے تھے، اطراف وجوانب کے بیشمار لوگ آپ سے بیعت تھے۔

علمی وروحانی مشاغل کے علاوہ آپ طبابت بھی کرتے تھے اور آپ کا شمار قصبہ کے حاذق اطباء میں ہوتا تھا۔ غرض مولانا علم الابدان اور علم الادیان دونوں میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے اور روحانی وجسمانی دونوں قسم کا معالجہ کرتے تھے۔

ان علمی وعملی کمالات کے ساتھ مولانا کو دنیاوی وجاہت بھی حاصل تھی، حکومتِ انگلشیہ کی طرف سے آپ اعزازی مجسٹریٹ تھے، روزانہ متعدد مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے، قدرت نے فصلِ خصومات کا ایسا ملکہ ودیعت کیا تھا کہ فریقین برضاورغبت آپ کے فیصلے پر سرخم کردیتے تھے۔

اپنے والد ماجد کی طرح آپ بھی تا آخر عمر شاہی مسجد کٹرہ کے امام رہے۔

مولانا نے ستہتر (۷۷) برس کی عمر پاکر ۱۳۵۱ھ میں وفات پائی اور اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔

مولانا کے خلفاء میں آپ کے صاحبزادے مولانا حکیم منیر الدین امام شاہی مسجد خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا منیر الدین صاحب طبابت کے ساتھ سلوک وطریقت میں بھی شہرت کا مقام رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا کے سایہ کو تادیر باقی رکھے۔ (بروایت مولانا منیر الدین)

مولانا عبدالمجید کوٹھیاویؒ

حضرت مولانا سیّد عبدالمجید بن بدر علی بن سید نظر علی بن سیّد تاج الدین بن سیّد مصلح الدین بن شمس الدین بن سید بخارا بن سیّد حبیب بن سیّد مجید بن سید حمید الدین۔ یہ سیّد حمید الدین حضرت موسیٰ کاظم کی اولاد سے ہیں، اسی وجہ سے سیّد کاظمی کی نسبت سے مشہور تھے۔

سیّد حمید الدین ہی ملک عرب سے ہندوستان آئے اور موضع بہاریو پرگنہ سکندر پور ضلع بلیا میں آباد ہوئے، پھر یہاں سے کچھ لوگ موضع کوٹھیا ضلع اعظم گڈھ میں منتقل ہو گئے، اسی

موضع کوٹھیا میں ۱۳۳۶ھ میں مولانا عبدالمجید صاحب کی ولادت ہوئی۔

ابتدائی تعلیم اپنے دیار کے مشہور عالم مولانا علی احمد صاحب کوریا پاری سے حاصل کی اور تکمیل دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ، مولانا سیّد اصغر حسین دیوبندیؒ، مولانا اعزاز علی امروہیؒ اور مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ سے کی، فراغت غالباً ۱۳۵۰ھ میں ہوئی، فراغت کے بعد مدرسہ ناصر العلوم گھوسی میں تدریسی خدمت پر مامور ہوئے اور ایک عرصہ تک وہاں تعلیمی خدمت انجام دی، بعد ازاں یہاں سے علیحدہ ہو کر ۱۳۶۶ھ میں محلہ قاضی پورہ قصبہ گھوسی میں قاسم العلوم کے نام سے خود ایک درس گاہ قائم کی اور تا مدّتِ حیات اس میں درس دیتے رہے، یہ مدرسہ بحمد اللہ اب بھی موجود ہے اور علوم اسلامیہ کی ترویج واشاعت میں اپنی بساط کے مطابق مصروف ہے۔

مولانا عبدالمجید مرحوم یوں تو جملہ علوم میں مہارت رکھتے تھے، لیکن امتیازی فن آپ کا حدیث اور فقہ تھا، افتاء کا کام شروع ہی سے انجام دیتے رہے، کثرت سے فتاویٰ آپ کے پاس آتے تھے جو رجسٹر میں درج بھی ہوتے تھے۔

تدریس کے ساتھ تالیف وتصنیف میں بھی آپ کو دستگاہ حاصل تھی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی سابق مفتیٔ اعظم دارالعلوم دیوبند کی فرمائش پر متعلقات قرآن کے موضوع پر ایک رسالہ "حمائل المرجان والزھر فی فضائل القرآن والسور" کے نام سے مرتب کیا تھا، چنانچہ موصوف اس رسالہ کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں:

احقر عبدالمجید عرض رسا ہے کہ شعبان ۱۳۶۴ھ میں حسنِ اتفاق سے حضرت استاذی مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے وہاں دیوبند میں کئی یوم قیام کی سعادت نصیب ہوئی، حضرت ممدوح نے بر بنائے شفقت ارشاد فرمایا کہ حمائل شریف کے لیے ایک مقدمہ لکھو جو فضائل وآداب واحکام ضروریہ پر مشتمل ہو" الخ ص:۱۔

مولانا نے اپنے استاذ محترم کے حکم کے مطابق یہ مقدمہ مذکورہ بالا عنوان سے تالیف کردیا، خود خاتمۃ الکتاب کے تحت رقمطراز ہیں:

الحمد للہ کہ آج ۳/ جمادی الثانیہ ۶۴ھ کو رسالہ ہذا اختتام کو پہنچا، اللہ تعالیٰ اس کو قبول

فرمائیں اور ناظرین کے لیے مفید اور مؤلف کے لیے سرمایۂ نجات بنادیں ص ۱۳۴۔

پھر آگے لکھتے ہیں:

تکمیل و تبییض کے بعد ایسے قوی موانع پیش آ گئے کہ تقریباً ڈیڑھ سال تک طباعت نہ ہوسکی، پھر رفیق محترم جناب مولوی محمد قاسم کوٹلوی اعظمی مستعد ہوئے، اخراجات میں بشرکت استاذی مفتی مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہ تو طباعت کا کام شروع ہوا، سچ تو یہ ہے کہ یہ انھیں کے حسن سعی واخلاص کی برکت ہے کہ یہ مطبوعہ رسالہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، اللہ تعالیٰ ان کو علوم نافعہ میں مہارت کاملہ نصیب فرماویں اور اپنی نسبت و محبت و حسن عمل و حسنِ خاتمہ سے نوازیں۔

پھر آگے چند سطور کے بعد صراحت کرتے ہیں کہ انھیں (یعنی مولوی منشی دین محمد مالک مطبع آسی پریس گورکھپور) کی حسنِ سعی سے رسالہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، اللہ تعالیٰ موصوف کو عافیت دارین سے نواز کر خاتمہ بالخیر نصیب کریں (ص ۱۳۵)

مولانا مرحوم کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ طبع ہو کر شائع ہو گیا تھا، مگر تلاش بسیار کے باوجود اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہوسکا، البتہ ابھی حال میں ۱۷؍جولائی ۲۰۱۱ء کو عزیز گرامی مولوی فضل الرحمٰن اعظمی متوطن موضع چھانوں اسکالر دارالمصنفین اعظم گڈھ نے اپنے ایک مکتوب کے ذریعہ اطلاع دی کہ ''دارالمصنفین کے مخطوطات میں ایک مخطوطہ بنام ''حمائل المرجان والزهر فی فضائل القرآن السور'' ملا ہے جو مولانا سید عبدالمجید کوٹھیاوی کے قلم سے ہے۔''

۱۲؍نومبر ۲۰۱۱ء مطابق ۱۵؍ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ کو دارالمصنفین میں حاضری ہوئی تو اس مخطوطہ کو خود ملاحظہ کیا، مکمل رسالہ سات ابواب اور ۱۳۲ صفحات پر مشتمل ہے، مولانا کا خط پختہ اور صاف ستھرا ہے، اندازہ یہ ہے کہ طباعت کی مکمل تیاری کے باوجود بھی کسی وجہ سے طباعت کی نوبت نہیں آئی، حالانکہ اس کے بعد مولانا تقریباً آٹھ سال باحیات رہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مولانا مطالعۂ کتب کے بہت شائق تھے، آپ کا اکثر وقت اسی میں گذرتا تھا، مطالعہ

میں حدیث اور فقہ کی کتابیں زیادہ رہتی تھیں، کتاب اٹھالیتے تو نہ کھانے کا خیال آتا نہ پینے کا اور نہ سونے کا جس کا انجام یہ ہوا کہ آپ دق جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے، مگر مطالعہ اور شب بیداری میں فرق نہ آیا، دوست واحباب نے لاکھ کوشش کی کہ آپ مطالعہ نہ کریں، لیکن اس کا ایسا چسکا لگ گیا تھا کہ تمام تدبیریں ناکام ہوگئیں اور آپ بسترِ علالت پر پڑ گئے، جب حالت زیادہ نازک ہوگئی تو حضرت مولانا عبدالغنی پھول پوری قدس سرّہ کی وساطت سے شہر اعظم گڈھ میں ڈاکٹر حفیظ اللہ بکھراوی کی زیر نگرانی علاج شروع ہوا، لیکن مرض علاج کی حد سے آگے بڑھ چکا تھا، بالآخر ۱۳۷۴ھ میں طویل علالت کے بعد اعظم گڈھ ہی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور وہیں قریب کے گورستان میں مدفون ہوئے۔ اسی قبرستان میں بعد میں آپ کے معالج ڈاکٹر حفیظ اللہ مرحوم اور ڈاکٹر عبدالقادر خاں خلیفہ حضرت پھولپوری بھی دفن ہوئے، مولانا مرحوم نہایت متقی متورع اور عابد وزاہد عالم تھے، درس ومطالعہ سے جو وقت بچتا وہ عبادت وریاضت میں صرف کرتے تھے، حضرت تھانویؒ سے بیعت وارادت کا تعلق تھا اور ان کے مجاز صحبت بھی تھے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری قدِّس سرُّہٗ آپ سے بیحد محبت کرتے تھے، حضرت پھولپوریؒ کی اس محبت وشفقت کا انھیں بھی بڑا خیال رہتا تھا اور جب تک سفر کے قابل رہے ہمیشہ مہینے میں دو تین بار پھولپور حضرت کی خدمت میں حاضر ہونا ضروری سمجھتے رہے، لیکن جب مرض نے شدت اختیار کرلی اور آپ سفر سے معذور ہو گئے تو یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکے، اس زمانہ میں حضرت پھول پوری خود مہینے میں کم از کم دو تین بار ان کے یہاں ضرور آتے تھے۔

اڑتیس (۳۸) سال کی قلیل مدت میں مولانا نے علمی میدان میں جو گرانقدر خدمات انجام دیں ان کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ اگر انھیں طویل عمر ملتی تو ہندوستان کے مشاہیر علماء میں آپ کا شمار ہوتا۔

پھول تو کچھ دن بہار جاں فزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

مولانا کے تلامذہ میں مولانا وقار احمد گھوسویؒ، مولانا وصیۃ اللہ گھوسوی اور مولانا عبدالمجید گھوسوی بطور خاص قابل ذکر ہیں، آخر الذکر اپنے استاذ کے پاس جا چکے ہیں۔

مولانا عبدالودود جیراج پوریؒ

مولانا مفتی عبدالودود بن عبدالغفور بن سخاوت علی جیراج پوری بڑے صالح، نیک نفس اور متقی عالم تھے، ابتدائی تعلیم مقامی علماء سے حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا اور وہیں شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ بندوی اعظمی اور دوسرے اساتذہ سے علوم متداولہ کی تکمیل کی، فراغت کے بعد آپ کی علمی استعداد کے پیش نظر اہل ندوہ نے درس و تدریس کے لیے ان کا تقرر کرلیا، چند سال یہاں تدریسی خدمت انجام دے کر قاضی و مفتی کی حیثیت سے پارہ چنار چلے گئے، یہاں کے بعد مدرسہ عالیہ رام پور میں بھی تعلیمی و تدریسی خدمات انجام دیں، مولانا عبدالودود کو تفہیم مطالب میں خاص ملکہ حاصل تھا، ادق سے ادق تر مسائل کی تقریر ایسے سہل اور قریب الفہم عنوان سے کرتے تھے کہ طلبہ کو اندازہ تک نہ ہوتا تھا کہ یہ مشکل مقام تھا، ماہ ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ میں آپ نے انتقال کیا۔

(نزہہ ص ۳۱۵ ج ۸)

مولانا عبید الرحمٰن مظاہری مبارک پوریؒ

مولانا عبید الرحمٰن بن مولانا عبدالسلام بن شیخ خان محمد بن شیخ امان اللہ بن شیخ حسام الدین، مولانا عبدالسلام مصنف سیرۃ البخاری کے صاحبزادے تھے، اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر اور مقامی مدرسہ میں حاصل کی اس کے بعد مدرسہ فیض عام مئو میں تین سال تک پڑھا، آخر میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں جملہ علوم و فنون کی تکمیل کر کے ۱۳۵۶ھ میں سند فراغت حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں مزید دو سال تعلیم پائی، فنون کی کتابیں مولانا سکندر علی اور مولانا شریف اللہ سے پڑھیں اور حدیث و تفسیر

مولانا احمد اللہ پرتاب گڈھی (۱) سے حاصل کی، فراغت کے بعد مدرس رحمانیہ ہی میں مدرس ہوگئے، نہایت خوش خلق، شریف النفس اور سلیم الطبع عالم تھے، ساتھ ہی اردو کے اچھے شاعر اور مضمون نگار تھے ان سے علمی کاموں کے سلسلے میں بڑی توقعات تھیں مگر افسوس کہ عین شباب میں سل اور دق میں مبتلا ہوکر بزمانۂ ملازمت مدرسہ رحمانیہ اپنے وطن مبارکپور ضلع اعظم گڈھ میں ۱۰/ ذوالحجہ ۱۳۶۴ھ کوانتقال کرگئے۔

(تراجم علمائے اہلحدیث ص ۴۰۸ وتذکرہ علمائے مبارکپور ص ۲۷۶)

مولانا عصمت اللہ بختاور گنجیؒ

مولانا عصمت اللہ بن شیخ غلام حسین ۱۲۸۸ھ میں بختاور گنج ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے چچا مولوی محمد منیر اور ان کے صاحبزادے مولوی محمد ظہیر سے پائی، علوم عربیہ مروجہ کی تحصیل مختلف اساتذہ سے کی جن میں مولانا محمد اسحاق بجنوری، مولانا عبدالاحد الہ آبادی، مولانا احمد حسن کان پوری خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، آخرالذکر ہی سے تفسیر وحدیث کی تکمیل کی اور سند فراغت لی۔

یہاں سے فراغت کے بعد حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کی خدمت میں باریاب ہوکران سے بھی صحاح ستہ، حصن حصین، حدیث مسلسل بالاولیۃ والمصافحہ اور دلائل الخیرات کی سند واجازت حاصل کی، تعلیم وتحصیل سے مکمل فراغت کے بعد علماء وصلحاء کے طریقہ پر درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا اور بہت سے مدارس میں تعلیمی خدمات انجام دیں، بالخصوص مدرسہ احمدیہ آرہ میں طویل عرصہ تک مسند تدریس پر متمکن رہے اور ایک کثیر جماعت نے آپ سے اخذ فیض کیا، تاریخ وفات اور مزید حالات دستیاب نہ ہوسکے۔

(تذکرہ علمائے حال ص ۷۵)

---

(۱) مولانا احمد اللہ بن امیر اللہ پرتاب گڈھی مشاہیر علمائے اہل حدیث میں ہیں، آپ نے مولانا سید محمد امین نصیر آبادی، مولانا ہدایت اللہ خاں رام پوری، مولانا سلامت اللہ جیراجپوری اور مولانا محمد بشیر سہسوانی وغیرہ سے تعلیم حاصل کی، آپ نے پوری زندگی درس وافادہ میں بسر کردی، تقریباً بیس سال مدرسہ علی جان دہلی میں درس دیا، اس کے بعد مدرسہ رحمانیہ میں مدرس ہوئے اور یہیں تاحیات تفسیر وحدیث پڑھاتے رہے۔

مولانا عطاءُ اللہ گھوسویؒ

مولانا عطاء اللہ بن قاضی حبیب اللہ گھوسوی ہندوستان کے مشاہیر علماء میں شمار ہوتے ہیں، آپ کی ولادت قصبہ گھوسی ضلع اعظم گڈھ میں ہوئی۔ ملا محمود جونپوری (۱) اور اس وقت کے دوسرے اساتذہ سے تحصیل وتکمیل کی، فقہ، اصولِ فقہ اور کلام میں ممتاز صلاحیت کے مالک تھے، سلوک واحسان کی تعلیم شیخ عبدالقدوس قلندر جون پوری سے پائی تھی، نہایت دیندار اور عابد وزاہد عالم تھے۔ شیخ غلام نقش بند گھوسوی لکھنوی آپ ہی کے فرزند ہیں، آخر عمر میں گھوسی سے ترک سکونت کر کے لکھنؤ میں رہنے لگے تھے، وہیں ۵ ربیع الثانی ۱۰۶۳ھ میں آپ کی وفات ہوئی، آپ کے شاگردوں میں میر محمد شفیع دہلوی علم وفضل اور شہرت ومقبولیت کے لحاظ سے اپنے عہد میں اپنی مثال آپ تھے۔ (نزہۃ ص ۲۷۴ ج ۵)

مولانا شاہ علی احمد بھیرویؒ

مولانا شاہ علی احمد بن نعمت اللہ بن اطہر بن محمد واجد عمری بھیروی، شیخ ابواسحاق بھیروی کے نواسے ہیں، ۱۲۳۹ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، اپنے والد شیخ نعمت اللہ، شیخ محمد سلیم مچھلی شہری (۲) اور مولانا احمد علی چریا کوٹی سے تحصیل وتکمیل کی، فراغتِ تعلیم کے بعد

---

(۱) ملا محمود بن محمد جون پوری ولید پور ضلع اعظم گڈھ کے شیوخ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ۹۹۳ھ میں پیدا ہوئے، تعلیم وتربیت استاذ الملک ملا محمد افضل جونپوری کے زیر سایہ تکمیل کو پہونچی، نہایت ذہین وطباع واقع ہوئے تھے، صرف سترہ سال کی عمر میں جملہ علوم وفنون میں مہارت تامہ حاصل کرلی اور بہت سے اپنے پیش رووں سے بھی آگے نکل گئے، بالخصوص فلسفہ میں ایسا کمال پیدا کیا کہ متقدمین میں بھی ان کے ہم پایہ کم نظر آتے ہیں، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں شمس بازغہ اور فرائد محمودیہ بہت مشہور اور اپنے فن میں نہایت جامع ہیں، ۱۰۶۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی، مزار محلہ چاچک پور شہر جون پور میں ہے۔ (تجلی نور ص ۴۹، معارف ماہ جون وجولائی ۱۹۳۰ء)

(۲) مولانا محمد سلیم بن محمد عطاء جعفری مچھلی شہری کی ولادت ۱۲۲۳ھ میں قصبہ مچھلی شہر جون پور میں ہوئی، ابتدائی تعلیم مفتی علی کبیر مچھلی شہری سے پائی اور اکثر کتب درسیہ مولانا محمد شکور مچھلی شہری سے پڑھیں، تکمیل کے بعد منصب قضاء پر مامور ہوئے اور ترقی کر کے صدر الصدور کے عہدہ تک پہونچے، یکم جمادی الاولی ۱۲۶۳ ہجری میں چوالیس برس کی عمر پاکر شہر اعظم گڈھ میں فوت ہوئے۔ (نزہۃ ص ۴۴۲ ج ۷)

اپنے نانا شیخ ابو اسحاق بھیروی کی جگہ سجادۂ مشیخت پر بیٹھے۔

مولانا عزیمت وتقویٰ میں اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے، آپ قائم اللیل وصائم النہار بزرگ تھے، یادِ مالک میں ہر دم رطب اللسان رہتے تھے، ان کی مجلس ذکر وتسبیح سے گونجتی رہتی تھی، کسی کی غیبت کا زبان پر آجانا تو بڑی بات ہے اس کے سننے کا بھی تحمل نہیں تھا۔

مولانا محمد فاروق چریا کوٹی نے مولانا رحمان علی ناروی کے استفسار پر شاہ صاحب کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''میں تقریباً تیس برس کے طویل عرصہ سے مولانا کے یہاں آمد ورفت رکھتا ہوں، لیکن آج تک کبھی بھی ایسی بات ان کی زبان سے نہیں سنی جو کسی کی مذمت یا اذیت کا سبب بنے اور نہ کبھی ان کی مجلس کو ذکر الٰہی سے خالی پایا۔

تقریباً نصف صدی تک ارشاد وتلقین کی اہم خدمت انجام دے کر تہتر برس کی عمر میں ۱۶ رصفر ۱۳۱۷ھ کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ (تذکرہ علمائے ہند ص ۴۳ اونزہۃ ص ۷۲ ج ۸)

حضرت مولانا علی احمد کوئریا پاری سرائے میری

حضرت مولانا علی احمد کوئریا پاری، سرائے میری علمائے اعظم گڈھ میں علمی تبحر اور وسعتِ معلومات کے لحاظ سے اپنے معاصرین میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔

کوئریا پار تحصیل گھوسی ضلع اعظم گڈھ میں شرفاء شیوخ کی ایک قدیم بستی ہے، جس کے ایک سرے پر کوڑیا شاہ نامی ایک بزرگ کا نہایت پرانا مزار تھا، جس کے آثار آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے تک موجود تھے، کہتے ہیں کہ انھیں بزرگ کی رعایت سے اس قریہ کا نام کوڑیا پار پڑا۔

مولانا احمد علی مرحوم کی ولادت ۱۳۱۳ھ میں ہوئی، والد ماجد نے تاریخی نام سراج الحق تجویز کیا۔ نسباً آپ شیخ فاروقی ہیں، سلسلہ نسب یہ ہے:

مولانا علی احمد بن محمد رضا بن ظہور احمد بن محمد عاشق علی بن امام الدین بن محمد قائم بن

تاج الدین بن علاؤالدین بن سراج الدین بن امیر الدین بن عبدالرحمٰن بن محمد اعظم خاں بن جمال الدین بن نظام الدین بن بایزید بن حبیب اللہ بن خلیل اللہ بن شیخ محمد بن عبدالرحمٰن بن برہان الدین بن خواجہ شمس الدین بن امیر حسن بن حضرت عبداللہؓ بن امیر المومنین عمرؓ بن الخطاب رضی اللہ عنہم۔ (بیاض خاص قلمی ص ۲۸۸ بخط مولانا و خاندانی شجرہ قلمی ص ۲۰ تا ۳۳)

مولانا کے آباء واجداد دس گیارہ پشت سے کوریا پار میں بود و باش رکھتے ہیں، ان کے مورثِ اعلیٰ شیخ محمد اعظم خاں ہیں جو اس پرگنہ میں کسی معمولی عہدہ پر مامور تھے، ان کے چار لڑکے ہوئے، حبیب اللہ خاں، اسماعیل خاں، دریا خاں، عبدالرحمان خاں۔

انھیں عبدالرحمٰن خاں کی نسل سے مولانا علی احمد مرحوم تھے۔

آپ نے اردو فارسی کی تعلیم اپنے والد شیخ محمد رضاء سے حاصل کی، اس کے بعد مولانا ابوالحسن مئوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عربی کی تعلیم شروع کی، مولانا ابوالحسن مرحوم نے ان کی ذہانت وفطانت کو دیکھ کر خصوصی توجہ دی اور متوسّطات تک پڑھا کر دیوبند بھیج دیا جہاں آپ نے مولانا انور شاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا غلام رسول خاں ہزارویؒ وغیرہ سے علوم وفنون کی تکمیل کر کے حضرت شاہ صاحب اور دیگر اساتذۂ دارالعلوم سے دورۂ حدیث پڑھ کر شعبان ۱۳۳۵ھ میں سند فراغت حاصل کی۔ تکمیل علوم سے فراغت کے بعد اصلاحِ نفس کی غرض سے تھانہ بھون پہونچے، جو حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ کی وجہ سے مرکز رشد وہدایت بنا ہوا تھا، یہاں آپ نے تقریباً ایک سال قیام کیا اور ذکر واذکار وروحانی مشاغل کے ساتھ حضرت تھانوی قدس سرہ کے مواعظ قلم بند کرنے کی خدمت بھی انجام دیتے رہے، چنانچہ اس دور کے بیشتر مواعظ آپ ہی کے ضبط کردہ ہیں۔

ایک برس گذر جانے پر حضرت شیخ سے اجازت لے کر وطن مالوف واپس ہوئے اور ضلع کے مرکزی مدرسہ جامعہ احیاء العلوم مبارک پور میں تعلیمی وتدریسی سلسلہ کا آغاز کیا اور ساتھ ہی قصبہ کے مشہور طبیب مولانا حکیم الٰہی بخش مبارکپوری سے فن طبابت کی تحصیل بھی کرتے رہے، تا آنکہ دو سال میں اس فن میں بھی کامل دستگاہ حاصل کر لی۔

احیاء العلوم کے زمانۂ تدریس میں آپ کی شہرت ومقبولیت پورے ضلع میں عام ہوگئی

اور مدارس کے ارباب انتظام کی نگاہیں آپ پر پڑنے لگیں، چنانچہ مولوی عبد الغفار گھوسوی جن سے مولانا کے گھریلو تعلقات نہایت گہرے تھے، انھوں نے آپ سے اپنے مدرسہ ناصر العلوم میں آنے پر اصرار کیا، آپ بر بنائے تعلق ومراسم ان کی طلب کو رد نہ کر سکے اور مبارک پور سے گھوسی چلے آئے، مولانا نے یہاں آکر مدرسہ ناصر العلوم کو خوب ترقی دی، حلقۂ درس میں جب وسعت ہوگئی تو ضلع کے نامور عالم مولانا بشیر احمد غالب پوری کو بھی یہیں بلا لیا جو اس وقت مدرسہ معین الغرباء ناصری گنج میں مصروف درس تھے، دونوں حضرات علوم وفنون میں ماہر اور نہایت مستعد تھے اس لیے شائقین علوم دینیہ کا خوب رجوع ہوا اور طلبہ کی کثیر تعداد نے اس مدرسہ سے استفادہ کیا۔

ایک عرصہ تک یہاں تعلیمی خدمت انجام دے کر یکم ربیع الاوّل ۱۳۴۹ھ میں بعض وجوہ سے یہاں سے علیحدہ ہوکر مطلع العلوم بنارس میں شیخ الحدیث ہوکر چلے آئے، لیکن یہاں مولانا کا قیام دو سال سے زیادہ نہ ہوسکا ۷/شوال ۱۳۵۱ھ میں یہاں سے الگ ہوگئے، مختلف مدارس کے تلخ تجربے کی بنا پر اب آپ کا دل مدرسی سے سرد پڑ گیا، اس لیے اس سلسلہ کو منقطع کر کے شہر اعظم گڈھ میں مطب جاری کر دیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی اتنی زیادہ شہرت ہوگئی کہ شہر کے علاوہ دور دراز مقامات سے بھی مریض آنے لگے، مولانا گرد وپیش سے بے نیاز ہوکر اپنے اس مشغلہ میں منہمک تھے کہ ایک رات کو ہادئ دوراں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ بہ نفس نفیس غریب خانہ میں موجود ہیں اور واپسی پر نعلین مبارک کو گھر ہی چھوڑ گئے ہیں، مولانا نے اس متبرک خواب کو اپنے مرشد حضرت تھانوی کی خدمت میں لکھا اور تعبیر چاہی، حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے جواب میں لکھا کہ آپ اپنے موجودہ مشغلہ کو چھوڑ کر سابق شغل یعنی تعلیم وتعلّم میں لگ جایئے، مولانا نے اسی وقت مطب کو بند کر دینے کا فیصلہ کر لیا، احباب واقارب نے ہر چند اس کی مخالفت کی، لیکن انھیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ میں صبح سویرے قال اللہ وقال الرسول کے بجائے قارورہ دیکھنا پسند نہیں کرتا، اگرچہ مالی نفع کچھ بھی ہو۔

مطب بند کر کے مدرسہ ہاشمیہ شہر بمبئی میں صدر مدرس ہوکر چلے گئے کچھ دنوں وہاں

رہنے کے بعد معیار تعلیم کی پستی اور طلبہ کی کمی کی وجہ سے علیحدہ ہو کر گجرات کی مشہور درس گاہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں منتقل ہو گئے، اس وقت جامعہ کے شیخ الحدیث رئیس المفسرین علامہ شبیر احمد عثمانی تھے، چونکہ علامہ عثمانی مولانا کے استاذ اور آپ کی صلاحیتوں سے پورے واقف تھے، اس لیے انھیں آپ پر بڑا اعتماد تھا، جب کسی وجہ سے خود درس نہ دیتے تو طلبہ کو مولانا کے پاس بھیج دیتے کہ ''جاؤ مولوی علی احمد سے پڑھ لو''

ڈابھیل کے زمانۂ قیام میں مولانا مرحوم نے مسلم شریف کی کتاب الایمان کی عربی میں مبسوط شرح بھی لکھی، جسے علامہ عثمانی مرحوم نے ملاحظہ کرنے کے بعد بہت پسند کیا تھا، افسوس کہ ابھی تک یہ گرانقدر علمی خدمت منظر عام پر نہ آسکی۔

مولانا علی احمد مرحوم ڈابھیل ہی میں مصروف درس وتدریس تھے کہ ضلع کے نامور عالم اور مشہور مصلح حضرت مولانا شاہ عبد الغنی پھولپوریؒ نے آپ کو اپنے مدرسہ بیت العلوم سرائے میر میں استاذِ حدیث وفقہ کی حیثیت سے آنے کی دعوت دی، ان کی دعوت پر ۱۶/ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ کو سرائے میر چلے آئے، لیکن چار سال سے زیادہ یہاں بھی آپ ٹھہر نہ سکے، اور مولانا وقار احمد گھوسویؒ کے بیحد اصرار پر (جن سے آپ کے گھریلو تعلقات اور نہایت گہرے مراسم تھے) مجبوراً بیت العلوم سے الگ ہو کر پھر ناصر العلوم گھوسی میں صدر مدرس ہو کر چلے گئے یہاں دو سال کام کرنے کے بعد انجمن اسلامیہ گورکھپور کے مدرسہ میں آگئے، پھر وہاں سے ''مدرستہ الاصلاح'' سرائے میر میں شیخ الحدیث ہو کر آئے، مگر افسوس کہ یہاں بھی چند سال سے زیادہ نہ رہ سکے، کیونکہ اسی زمانہ میں اس دیار میں مودودیت کا چرچا شروع ہو گیا تھا، جس کی لپیٹ میں مدرستہ الاصلاح بھی بری طرح سے آگیا تھا، الحاصل یہاں سے مستعفی ہو کر انوار العلوم مئو ائمہ ضلع الہ آباد میں چند سال رہے اور جب مدرستہ الاصلاح کی کسی حد تک تطہیر ہو گئی تو پھر یہیں آگئے اور بالآخر یہیں کے زمانہ تدریس میں ۲۸/ذی الحجہ ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۳/جون ۱۹۶۱ء یوم سہ شنبہ کو عصر کے وقت حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے اپنے ذاتی مکان واقع سرائے میر نزد روضۂ علی عاشقان میں داعئ اجل کو لبیک کہا دوسرے دن بعد نماز ظہر مدرسہ بیت العلوم کے متصل مدفون ہوئے۔

مولانا علی احمد مرحوم تمام علوم مروجہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے بالخصوص حدیث وفقہ میں تبحر کا درجہ حاصل تھا، درسی تقریر نہایت صاف، مربوط اور سلجھی ہوئی فرماتے تھے، آپ کے درس کی ایک خاص چیز یہ تھی کہ مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات کی توضیح اس طرح کرتے تھے کہ سب اصطلاحات باہم مربوط معلوم ہونے لگتی تھیں جس سے طلبہ کو بہت نفع ہوتا تھا۔

علوم وفنون میں کامل مہارت کے ساتھ تاریخ گوئی اور شعر وادب میں بھی آپ کو ملکہ حاصل تھا جس پر آپ کی قلمی بیاض شاہد ہے جس میں آپ نے اپنے کہے ہوئے تاریخی قطعات، غزلیں، قصیدے اور سہرے سیکڑوں کی تعداد میں درج کیے ہیں۔

کلام کا نمونہ یہ ہے:

جو قطرہ مل گیا دریا سے پھر دریا نہ ہو جائے ــــ جو دریا جوش سے ابلا کہیں قطرہ نہ ہو جائے
ہمارا دل سدا زندہ رہے عشقِ الٰہی سے ــــ پڑا ہے ساتھ رندوں کا کہیں مردہ نہ ہو جائے

امید وصل زیست میں جب ہو چکی فنا ــــ جینا عبث ہے عاشق بیزار کے لیے
مچھلی سے پوچھئے لب دریا سے ہو کے دور ــــ کیسی تڑپ ہے چشمۂ انبار کے لیے

سہرا کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

مرحبا صل علیٰ کیا ہے سُہانا ہے سہرا ــــ ہم عزیزانِ وطن گائیں سہانا سہرا
قدر عنا کے محاسن کی حفاظت کے لیے ــــ بن گیا شکل قبا اور دوشالا سہرا
گرمیٔ رخ سے نکلا جو پسینہ رخ پر ــــ رنگ وبو چڑھ کے ہوا اور دوبالا سہرا

مولانا مرحوم نے تقریباً چالیس بیالیس سال تک علوم وفنون کی خدمت انجام دی، اس مدت میں آپ کے فیضِ تعلیم نے علماء وفضلاء کی کثیر جماعت تیار کی جن میں مندرجہ ذیل حضرات نے علمی دنیا میں بڑی شہرت ومقبولیت حاصل کی:

مولانا محمد یٰسین استاذ حدیث ومفتی جامعہ احیاء العلوم مبارکپور، مولانا عبدالحق جگدیش پوری شیخ الحدیث دار العلوم مئو، مولانا افتخار احمد جگدیش پوری نائب ناظم مدرسہ بیت العلوم سرائے میر، مولانا شمس الحق گجراوی، مولانا عبدالمجید کوٹھیاوی، مولانا حکیم وجیہ اللہ

گورکھپوری، مولانا فضل الرحمٰن بہاری وغیرہ۔

مولانا جس طرح تعلیم وتدریس میں کامل مہارت رکھتے تھے اسی طرح ایک کامیاب مصنف بھی تھے، جس پر آپ کی تصنیفات شاہد ہیں، لیکن زندگی کے نامساعد حالات وواقعات نے آپ کو اس طرح پریشان رکھا کہ آپ پوری طرح سے اس طرف توجہ نہ کرسکے، آپ کی تصنیفات یہ ہیں:

(۱) شرح کتاب الایمان صحیح مسلم، بڑی تقطیع میں تقریباً چارسو صفحات پر یہ شرح مکمل ہوئی ہے، اہل علم جانتے ہیں کہ صحیح مسلم کا جزء کتاب الایمان کتنا اہم ہے کہ ماہر اور کہنہ مشق اساتذہ بھی بغیر مکمل تیاری کے پڑھانے سے عاجز ہوجاتے ہیں، مولانا نے اس کے تمام اہم اور مشکل مباحث پر سیر حاصل بحث کی اور تمام مشکلات کو حل کردیا ہے، یہ کتاب ابھی تک غیر مطبوع ہے اور مولانا کے چھوٹے صاحبزادے مولانا انیس احمد فاروقی کی ملکیت میں ہے۔

(۲) قانونِ وراثت: ریاست حیدرآباد کی جانب سے مولانا سید سلیمان ندویؒ کو قانونِ وراثت کی ترتیب کا کام سپرد ہوا تھا، چونکہ مولانا کا یہ فن نہیں تھا اس لیے اسے مولانا علی احمدؒ کے حوالہ کردیا، مولانا نے اسے قانونی دفعات کے طرز پر بڑے شرح وبسط سے تحریر کیا، مسودہ علماء کے ایک بورڈ کے سامنے پیش ہوا، بورڈ کے جملہ اراکین نے اسے بہت پسند کیا، مولانا کے بڑے صاحبزادے حافظ شفاعت صاحب سے معلوم ہوا کہ اس اہم علمی خدمت پر مولانا کو ریاست کی طرف سے انعام بھی ملا تھا۔

(۳) رسالۃ التوسّل قلمی: مسئلہ توسّل پر ایک غیر مقلد کے ردّ میں یہ رسالہ سپرد قلم کیا اور قرآن، حدیث اور فقہ کی عبارتوں سے ثابت کیا کہ اس مسئلہ میں علمائے دیوبند ہی حق پر ہیں تقریباً چالیس صفحات پر یہ رسالہ مشتمل ہے اور اپنے موضوع پر جامع ہے۔

قاضی علی اکبر چریاکوٹیؒ

مولانا قاضی علی اکبر بن قاضی عطاء رسول بن قاضی غلام مخدوم عباسی ذہانت وفطانت میں اس دیار کے مشہور علماء میں تھے، آپ کی ولادت ۱۲۲۰ھ میں قصبہ

چریا کوٹ میں ہوئی، مولانا رحمان علی ناروی تذکرہ علمائے ہند میں قاضی علی اکبر کی ذہانت وطباعی کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"در جودت ذہن وقوت حافظہ ایں آیتے بود از آیات الٰہی وموجے بود از بحر نامتناہی"

قاضی صاحب کے والد مولانا عطاء رسول ایک متبحر عالم تھے بالخصوص فقہ اور فرائض میں قابلِ ذکر صلاحیت رکھتے تھے، لیکن ملازمت کی وجہ سے اپنے ہونہار فرزند کی تعلیم کا معقول انتظام نہ کر سکے، اس لیے ان کی تعلیم شرحِ جامی سے آگے نہ بڑھ سکی، فارسی کی تعلیم محض گلستاں تک حاصل کی مگر قوت مطالعہ کے زور سے فارسی کی جملہ متداولہ کتابوں کے مضامین خود حل کر لیے، اس کے بعد عربی کی جانب توجہ کی اور تھوڑی سی مدت میں نحو وصرف کے قواعد پر پورا عبور پیدا کر لیا، کافیہ جیسی اہم اور ادق کتاب کو ایک رات میں اول سے آخر تک مطالعہ سے حل کر لیا، اس کے بعد مولانا احمد علی چریا کوٹی کی خدمت میں شرح جامی کے چالیس اسباق پڑھے اور بقیہ کتاب خود ہی حل کر لی، اسی طرح سے منطق وفلسفہ اور کلام کے کچھ اسباق مختلف جگہوں سے پڑھا، اس قلتِ تعلیم کے باوجود صدرا اور شرح مواقف جیسی اہم کتابوں کے مضامین برجستہ بیان کرتے تھے، قوت حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جس کتاب کو ایک نظر دیکھ لیتے ہمیشہ کے لیے ازبر ہو جاتی تھی، ایک مرتبہ مولانا محمد شکور مچھلی شہری سے جو اس وقت کے نامور عالم تھے ایک کلامی مسئلہ میں قاضی صاحب سے مباحثہ ہو گیا اور سلسلہ بحث ایک ہفتہ تک جاری رہا، بالآخر مولانا محمد شکورؒ (۱) نے قاضی صاحب کے تبحر اور طرز استدلال کو اس قدر پسند فرمایا کہ تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بایں ہمہ قدرت نے دنیاوی وجاہت اور عزت وثروت سے بھی حصہ وافر عطا کیا تھا، غدر کے زمانہ میں قاضی صاحب نے

(۱) مولانا محمد شکور بن امانت علی جعفری مچھلی شہری ۱۲۱۱ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے نانا شیخ علی محمد سے حاصل کر کے دہلی گئے اور وہاں علامہ رشید الدین خاں دہلوی، شیخ عبدالحئی بڈھانوی، شاہ رفیع الدین دہلوی اور حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس اسرارہم سے جملہ علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل کی۔ فراغت کے بعد منصب قضا پر فائز ہوئے اور ساتھ ہی تعلیم وتدریس کا بھی سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۲۶۰ھ میں صدر الصدور کے عہدے سے ریٹائر ہو کر گوشہ نشین ہو گئے تھے، آپ سے اس دیار میں بہت فیض پہونچا آپ کی تصانیف میں شرح مقامات الہندیہ، شرح ابحاث الفرائد شرح کنز الدقائق بہت مشہور ہیں، نواسی برس کی عمر میں ۲۹ رشوال ۱۳۰۰ ہجری میں آپ کی وفات ہوئی۔ (تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۲ ونزہۃ ص ۴۴۴)

انگریزی حکومت کا ساتھ دیا تھا جس کے صلہ میں وظیفہ کے ساتھ انعام اور بندوق رکھنے کا اعزازی اجازت نامہ بھی ملا تھا، لیکن قاضی صاحب دنیاوی عزت وجاہ کے مقابلے میں فضیلت وکمال کے دلدادہ رہے، اور ان عارضی جاہ ومناصب کو کبھی درخور اعتناء نہیں سمجھا، چنانچہ اپنے دونوں صاحبزادگان حکیم وقت مولانا عنایت رسول ومولانا محمد فاروق کو ہمیشہ اکتساب کمال کی جانب متوجہ کرتے رہتے تھے، جس کا خاطر خواہ اثر بھی ہوا کہ دونوں صاحبزادے اپنے وقت میں علم کے آفتاب وماہتاب بن کر ہندوستان کے افق پر چمکے۔

قاضی صاحب نے دو رسالے تصنیف کیے: ایک مزعوماتِ باطلہ مسئلہ جذب وانجذاب کی تردید میں تھا اور دوسرا شیعوں کے بعض اعتراضات کے جواب میں۔ بالآخر ۶۲ برس کی عمر پاکر ۱۲۸۳ھ میں راہئ ملکِ عدم ہوئے۔ اور اپنے آبائی مقبرہ چریاکوٹ میں پیوست خاک ہوئے۔ (تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴۲ و ص ۱۴۳)

مولانا علی حسن چھانوی

مولانا حافظ علی حسن بن مولوی دین علی کا آبائی وطن ضلع اعظم گڈھ کا معروف قریہ موضع چھانوں ہے جس کو اپنے عہد کے بافیض عالم وفاضل اور عظیم شیخ ومربی حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری قدس سرہ کا مسقط راس ہونے کا فخر حاصل ہے۔

مولانا علی حسن رحمہ اللہ نے حفظ قرآن اور اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم کہاں اور کن اساتذہ سے حاصل کی افسوس کہ معلوم نہیں ہوسکا، اور موجودہ وقت میں ان تفصیلات کے معلوم ہونے کا بظاہر کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے۔ بس مولانا مرحوم کے صاحبزادہ حافظ محمد اختر اور موضع چھانوں کے بعض دیگر معمر لوگوں سے معلوم ہوا کہ مولانا مرحوم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے فارغ تھے، اندازہ یہ ہے کہ یہ زمانہ حضرت مولانا خلیل احمد انبیٹھوی مہاجر مدنی صاحب بذل المجہود شرح سنن ابی داؤد کی صدارت تدریس کا ہوگا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا مرحوم نے علماء وصلحاء کے طریقہ کے مطابق پوری زندگی درس وافادہ میں گذار دی، غالباً ابتدائی دور میں ''برما میں بھی تدریسی خدمت انجام دی

ہے۔ اسی طرح اپنے دیار کی دو مشہور درسگاہیں مدرسہ بیت العلوم سرائے میر، اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں بھی طویل عرصہ تک فارسی وغیرہ کا درس دیا، مدرسہ بیت العلوم کی تدریس کے زمانہ میں مدرسہ کے بانی وناظم حضرت مولانا شاہ عبدالغنی قدس سرہ نے ان کی سلامتیٔ طبع اور زہد وتقویٰ کو دیکھ کر انھیں ''مولوی فرشتہ'' کا لقب دیا تھا پھر یہ لقب مدرسہ میں اس قدر مشہور ہوا کہ ہر چھوٹا بڑا مولانا کو مولوی فرشتہ ہی کہتا تھا، اور واقعی یہ اپنی صفات اور حسنات وبرکات کے لحاظ سے فرشتہ ہی تھے، بیت العلوم میں تدریس کے زمانہ میں ظہر وعصر کی امامت بھی ان ہی کے ذمہ تھی۔

آخر عمر میں صحت نے جواب دے دیا تھا، اس لیے گھر پر ہی رہنے لگتے تھے، مگر اس زمانہ میں درس کا سلسلہ بند نہیں کیا، گاؤں کے مکتب میں جو اس وقت وہاں کی جامع مسجد میں تھا گاؤں اور اطراف کے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے، اسی زمانہ میں راقم الحروف نے بھی تقریباً سات آٹھ ماہ مولانا مرحوم کی خدمت میں رہ کر فارسی کی ابتدائی کتابیں ان سے پڑھیں۔

مولانا میرے والد بزرگوار کے سگے ماموں تھے، میں نے جب مکتب میں درجہ پنجم تک تعلیم مکمل کرلی تو والد صاحب نے مجھے ان کے حوالہ کردیا، چنانچہ میں نے آمدنامہ، فارسی کی پہلی مکمل، فارسی کی دوسری تقریباً نصف اور گلزار دبستاں کے دونوں حصے مولانا ہی سے پڑھے ساتھ اردو املا جس پر مولانا بہت زور دیتے تھے، اور ایک اردو کی کتاب جس کا نام یاد نہیں رہا مولانا نے اپنے ذاتی کتب خانہ سے اسے نکال کر دیا تھا، اور یہ ہدایت فرمائی تھی کہ اس کتاب کے چار پانچ ورق روزانہ مجھے پڑھ کر سنایا کرو بس اتنا یاد ہے کہ وہ کتاب علماء صوفیاء کے واقعات کے موضوع پر تھی۔

مجھے مولانا کی خدمت میں آئے ابھی ساٹ آٹھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ ان کی طبیعت سخت خراب ہوگئی کچھ دن تک تو اس حالت میں بھی مسجد آتے رہے، لیکن جب اس کی سکت بھی نہ رہی تو پھر آنا بند کردیا، چونکہ مولانا ہی تنہا مدرس تھے اس لیے مکتب بند ہوگیا، چنانچہ میں بھی چھانوں سے یہ سوچ کر گھر آگیا کہ مولانا کی طبیعت بحال ہوجانے پر آجاؤں گا، لیکن مرض میں تخفیف کی بجائے شدت ہی بڑھتی گئی اور تقریباً ایک ماہ صاحب فراش رہ کر یہ

فرشتہ صفت انسان دنیائے دنی کو چھوڑ کر فرشتوں کے دیس سدھار گیا، اس لئے ناچار چھانوں میں میری تعلیم کا سلسلہ بند ہو گیا۔

"آں قدح بشکست وآں ساقی نماند"

وفات کا یہ حادثہ ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۲ء میں پیش آیا۔

مولانا مرحوم خاموش طبع اور کم آمیز تھے، میں نے اس آٹھ ماہ کی مدت میں انھیں بیٹھک و چوپال میں لوگوں سے گپ شپ کرتے کبھی نہیں دیکھا، مدرسہ کے اوقات میں بچوں کو پڑھانے میں مصروف رہتے، چھٹی ہوتی تو گھر آجاتے اور گھر بھی عموماً اپنے کمرہ میں تنہا ہی تلاوت یا کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہتے، اذان سنتے ہی مسجد پہنچ جاتے، پنج وقتہ نمازوں کی امامت مولانا ہی انجام دیتے تھے، نماز سے فارغ ہو کر سیدھے گھر آجاتے یہی ہمیشہ کا معمول تھا، شرعی احکام ومسائل میں کسی کی رورعایت برداشت نہیں تھی، عزیز واقارب کے یہاں دو، تین ماہ کے فصل کے ساتھ بغرض ملاقات و پرشش احوال جانے کا معمول تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے یہاں سال میں تین چار مرتبہ ضرور تشریف لاتے تھے، عام طور پر قبیل عصر پہنچ جاتے رات کو قیام کرتے اور صبح کے ناشتہ کے بعد گھر واپس چلے جاتے۔

چونکہ مزاج میں رابطہ کے مقابلہ میں ضابطہ کی پاسداری زیادہ تھی، اس پر مستزاد کم آمیزی اس لئے ایک حد تک وہ گم نام ہی سے رہے ورنہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے ایک جامع کمالات عالم تھے۔

شیخ میر علی عاشقان سرائے میریؒ

حضرت میر سیّد علی، بن قوام، بن سعید، بن محفوظ، بن حسین، بن عبدالمجید، بن نعمان، بن حمزہ، بن حسین، بن ابی اکبر، بن عمر، بن احمد حسینی سوانی سرائے میری اپنے مقام ومرتبہ کے اعتبار سے اولیاء کبار ومشائخ عظام میں شمار کیے جاتے ہیں، ہندوستان، اور بیرون ہند کے بہت سارے تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر کیا ہے۔

میر صاحب کے آباء واجداد ترمذ اور لاہور ہوتے ہوئے پہلے سرہند کے قریب مقام سوانہ میں آباد ہوئے، حسب تصریح صاحب اخبار الاصفیاء میر صاحب کی پیدائش سوانہ ہی میں ہوئی، تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔

آپ کے والد شیخ قوام الدین سوانہ کے مشہور اصحاب علم وفضل میں سے تھے، اپنے والد شیخ سعید بن محفوظ سے علوم کی تحصیل کی تھی اور انھیں سے طریقت وسلوک کی بھی تعلیم وتلقین پائی جو شیخ صدرالدین راجو قتال متوفی ۸۲۷ھ اور شیخ بدیع الدین مدار مکن پوری کے خلیفہ تھے۔

صاحب بحر ذخّار میر علی عاشقان کے لڑکے شیخ نظر علی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ میر صاحب کے والد شیخ قوام الدین چکلہ مرادآباد کے ناظم تھے، وہیں کسی جنگ میں شہید ہوگئے اور موضع بھوانی پور میں سوت ندی کے کنارے دفن ہوئے، مقام مزار سنبھل سے تین کوس کے فاصلہ پر ہے۔

والد کی شہادت کے بعد میر صاحب مع اپنی اہلیہ کے وہاں سے منتقل ہوکر اپنے چچا وخسر سید محمد خاں سوانی کے پاس جون پور آگئے جو اس وقت وہاں کے حاکم تھے اور شہر کے باہر ایک چھوٹا سا مکان یا حجرہ بنا کر وہیں مقیم ہوگئے۔ (بحر ذخار قلمی ص ۳۶ نسخہ دائرہ فخاء محمدی الہ آباد)

دیار پورب میں آنے کے بعد میر صاحب سب سے پہلے شیخ شہاب الدین (۱) حسینی جون پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے پاس رہ کر طریقۂ سہروردیہ حاصل کیا اور خرقہ خلافت پہنا۔ (رسالہ عاشقیہ)

اس کے بعد شیخ قاضن بہاری کی خدمت میں پہنچے۔ شیخ قاضن (۲) نے بڑھ کر

---

(۱) شیخ شہاب الدین سہروردی جونپوری دسویں صدی کے جونپوری علماء ومشائخ میں بڑے مقام ومرتبہ کے بزرگ ہیں، روحانی تعلیم شیخ برہان الدین حسنی تلمیذ شیخ صدرالدین اچی سے حاصل کی تھی۔

(۲) شیخ محمد علاؤالدین بن قاضی عالم المعروف بہ قاضن ترہٹ بہار کے رہنے والے تھے اور منیر کے قاضی تھے، ظاہری وباطنی دونوں علوم میں ید طولیٰ رکھتے تھے آپ کو طریقت کے تمام مروجہ طرق وسلاسل کے اکابر سے نسبت حاصل تھی، لیکن طریقۂ شطاریہ کا رنگ آپ پر اس قدر غالب تھا کہ شطاری کی نسبت سے مشہور ہوئے، آپ کے اکمل ترین خلفاء میں میر صاحب اور آپ کے صاحبزادے شیخ ابوالفتح ہدایت اللہ شطاری شامل ہیں۔ انتصاح عن ذکر اہل الصلاح میں ہے کہ آپ نے ۳ر صفر ۸۹۲ ہجری کو وفات پائی۔

استقبال کیا اور فرمایا کہ میں تمہارا منتظر تھا، شیخ قاضن نے بیعت کر کے کچھ اوراد واذکار کی تلقین کی جس سے میر صاحب کے اندر سوز دروں کی کیفیت پیدا ہوگئی، یہ کیفیت دھیرے دھیرے تیز ہوتی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ آپ بیتابی میں ادھر ادھر چکر کاٹتے اور کہتے کہ ہے کوئی جو قاضن کی لگائی آگ بجھادے، اسی عالم اضطراب میں آپ کا گزر شیخ بہاء الدین چشتی جون پوری (۱) کے یہاں ہوا، انھوں نے ایسی روحانی غذادی جس سے یہ آگ دب گئی اور معرفت الٰہی کے مقامات آپ پر منکشف ہوگئے، اپنے وقت کے ان مشائخ کبار سے تعلیم وتلقین کے ساتھ میر صاحب نے اس عہد کے سلسلۂ شطاریہ کے معروف ومشہور شیخ ومرشد شیخ عبدالقدوس عرف قدن شاہ نظام آبادی سے بھی بھرپور کسب فیض کیا، صاحب بحر ذخار لکھتے ہیں کہ میر صاحب جب شیخ قدن کی خدمت میں پہنچے تو شیخ نے ان کی ارادت وعقیدت کا امتحان یوں لیا کہ انھیں حکم دیا کہ فلاں غار (گڈھے) کو جا کر مٹی سے بھرو، میر صاحب نے حکم کی تعمیل کی اور شیخ کے فرمودہ کام کو مکمل کر کے خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ''فرمودہ بجا آوردم'' شیخ ان سے بہت خوش ہوئے، اور اس دن فجر کی نماز میں انھیں امام بنایا، شیخ قدن قدس سرہ کے سات عالم فاضل بیٹے تھے، اتفاق سے اس دن کوئی فجر کی جماعت میں شریک نہ ہوسکا، شیخ نے اس پر فرمایا ''قدن کے ساتھ پوت نپتا، علی سب نعمت لٹا''۔

بہر حال شیخ قدن نظام آبادی کی خدمت میں رہ کر ان سے بھی سلسلۂ شطاریہ کے اذکار ووظائف کی تحصیل کر کے خلافت سے سرفراز ہوئے۔

(۱) شیخ بہاؤالدین عمری جون پوری کی ولادت اور نشوونما جون پور میں ہوئی، علوم شرعیہ کی تحصیل وتکمیل شیخ محمد بن عیسیٰ تاج جونپوری سے کی اور علوم باطنی راجہ سید حامد شاہ مانک پوری چشتی سے حاصل کر کے ان کے خلیفہ ہوئے، شیخ بہاء الدین آخر عمر میں حرمین شریفین چلے گئے تھے اور تیس سال تک مکہ مکرمہ میں جبل ''ابوقبیس'' کے اوپر ایک خلوۃ میں مقیم رہے، ہر نماز کے وقت حرم شریف میں نماز با جماعت ادا کرتے تھے، اس وقت ان کی عمر سو سال (۱۰۰) سے زائد ہو چکی تھی، اسی دوران قیام میں وہاں کے علماء سے احادیث کی سند عالی حاصل کی اور شیخ کمال الدین اسماعیل شیروانی سے جو خواجہ عبیداللہ احرار کے فیض یافتہ تھے طریقۂ نقشبندیہ حاصل کیا اور ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہے، ۱۴؍جمادی الاخری یا ۲۶؍رمضان ۹۱۱ھ میں انتقال فرمایا۔

صاحب بحر ذخار میر صاحب کے صاحبزدے سید نظر علی کے حوالہ سے یہ بھی لکھتے ہیں کہ در سلسلۂ قادریہ مرید پدر خود سید قوام الدین سوانی است بدیں وسائط سید قوام الدین وے از پدر خود سید سعید حاجی الحرمین، وے از سید صدر الدین راجو قتال، وے از مخدوم جہانیاں، وے از مخدوم رکن الدین ابوالفتح و وے از پدر خود صدر الدین عارف و وے از پدر خود شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی۔

میر صاحب سلسلۂ قادریہ میں اپنے والد سید قوام الدین سے بیعت تھے، وہ اپنے والد سید سعید حاجی حرمین سے فیض یافتہ تھے اور وہ سید صدر الدین راجو قتال سے اور راجو قتال، مخدوم جہانیاں سے اور وہ شیخ ابوالفتح رکن الدین ملتانی سے اور وہ اپنے والد شیخ صدر الدین عارف سے اور وہ اپنے والد شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے خلیفہ تھے اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ میر صاحب دیار پورب کے دسویں صدی کے تمام مروجہ طرق وسلاسل کے مشائخ سے فیضیاب ہوئے، اس لیے ان کے سوانح نگار ان کی سب نسبتیں شطاری، چشتی، نقشبندی اور سہروردی وغیرہ بیان کرتے ہیں، البتہ ان جملہ نسبتوں میں آپ پر غلبہ طریقۂ شطاریہ عشقیہ کا تھا۔

تحصیل وتکمیل کے بعد میر صاحب نے اپنی روحانی سرگرمیوں کے لیے اس علاقہ کو منتخب کیا جو اس وقت اعظم گڈھ کے قلب میں واقع ہے، چنانچہ آپ جونپور سے منتقل ہوکر موضع کھریواں کو اپنی جائے سکونت بنایا، پھر اس سے کچھ فاصلے پر جنوب ومشرق کی جانب مرتضیٰ آباد کے نام سے ایک موضع آباد کیا اور وہیں مع اہل وعیال کے سکونت پذیر ہوگئے، یہی مرتضیٰ آباد بعد میں آپ کی نسبت سے سرائے میر کے نام سے مشہور ہوگیا۔

میر صاحبؒ نے علوم ظاہر وباطن میں کمال حاصل کر لینے کے بعد علوم ظاہری کی تعلیم وتدریس کے بجائے علوم روحانی کی تلقین وترویج اور رشد وہدایت خلق کو اپنا مشغلۂ حیات بنایا اور پوری زندگی اسی میں بسر کی اور اس کا معیار علوم شرعیہ کو بنایا، اور عام حالات میں پیروی سنت واتباع شریعت کی راہ سے باہر قدم نہیں نکالا۔

میر صاحبؒ کی زندگی دین ودنیا دونوں کے امتزاج کا نمونہ تھی، آپ کا کاشانہ ایک

طرف دنیاوی جاہ وجلال کا منظر پیش کرتا تھا، حشم وخدم تھے، صبح وشام نوبت بجتی تھی، حرم سرا میں چار بیویاں تھیں، فتوحات اور نذرانے کا سلسلہ جاری تھا جو خدام ومتوسلین اور مستورات پر خرچ ہوتا تھا، دوسری طرف اہلِ عرفان ویقین کے لیے زاویہ اور خانقاہ تھی جس میں طالبین ومسترشدین غمِ روزگار اور فکر معاش سے یکسو ہوکر تزکیۂ نفس اور یاد خدا میں منہمک رہا کرتے تھے، خود میر صاحبؒ کا یہ حال تھا کہ آپ کے صحو پر سکر غالب تھا، اکثر اوقات جذب وکیف اور سکر وحال کی کیفیت طاری رہا کرتی تھی، مگر اپنے متوسلین کی ہر ذمہ داری پوری فرماتے تھے اور وجد وحال سے اس میں خلل نہ پڑتا تھا۔

میر صاحبؒ نے کبھی اربابِ دنیا کے آستانے پر نہ حاضری دی اور نہ دست سوال دراز کیا، آپ نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ وہ دنیا میں کسی سے سوال نہ کریں گے، چنانچہ چالیس سال سے زائد مدت تک اس پر اس طرح قائم رہے کہ اپنے کسی ملازم کو بھی کسی کام کا حکم نہیں دیا، حتی کہ پیاس کی شدت میں ان سے پانی بھی نہ مانگتے تھے۔

لباس میں میر صاحب کسی خاص وضع کے پابند نہ تھے، بلکہ جلال وجمال کی کیفیات کے مطابق مختلف قسم کے کپڑے زیب تن فرماتے تھے، اگر فقر ودرویشی کی کیفیت ہوتی تو جبہ ودستار کے جمال میں نظر آتے اور اگر استغنا وبے نیازی کی حالت ہوتی تو فوجی اور سپاہیانہ لباس کے جلال میں دکھائی دیتے۔

خدمتِ خلق مشائخ عظام کا خاص شعار ہے اور وہ افضل الاشتغال خدمت الناس کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں، میر صاحبؒ کا عمل بھی اسی پر تھا، اپنے طالبین اور مسترشدین کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے، فجر کے بعد سے اشراق تک اور عصر سے مغرب تک مخصوص کیفیت رہتی تھی اس لیے ان اوقات میں کسی سے نہیں ملتے تھے، ان کے علاوہ پورا دن خدمت خلق میں صرف کرتے تھے۔

شیخ عارف علی نے رسالہ عاشقیہ میں میر صاحبؒ کی وفات کے تذکرہ میں تحریر کیا ہے کہ وفات سے چند روز قبل مرتضیٰ آباد (سرائے میر) سے جون پور تشریف لے گئے اور وہاں کے تمام مشائخ سے آخری ملاقات کی اور فرمایا کہ کل آخر شب میں میری وفات ہونے والی

ہے، بعدازاں جون پور سے سرائے میر واپس تشریف لائے، آپ کے ہمراہ جون پور سے بہت سے اکابر بھی آئے اور بقیہ لوگ دوسرے دن صبح کو سرائے میر پہونچے، پنجم ماہ صفر کو تمام احباب ومتوسلین کو بلاکر یہ شعران کے سامنے پڑھا۔

گر قدم رنجہ کند یار پر سیدنِ ما　　خوش طبیبے ست بیا تاہمہ بیمار شویم

معتقدین میں سے بعض حضرات نے اس موقع پر عرض کیا کہ آپ کی قبر کیسی بنائی جائے تو اس کے جواب میں یہ شعر پڑھا۔

صورتِ قبرم زبعد مرگ ویراں خوشتر ست　　دردمندے ہم چو من باخاک یکساں خوشتر ست

اس بیت کے پڑھنے کے بعد ذکر جہر میں مشغول ہو گئے اور جب دو گھڑی رات باقی رہ گئی تو عین حالتِ ذکر میں پیغام دوست آپہونچا اور رشد وہدایت کا یہ مہر درخشاں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا، یہ حادثہ ۶ رصفر ۹۵۵ ہجری میں پیش آیا۔ ''شاہِ عاشقاں'' سے تاریخِ وفات نکلتی ہے، بعض تذکرہ نگاروں نے ۹۵۵ھ کے بجائے تاریخ وفات ۹۵۰ تحریر کی ہے۔

آپ نے اپنی پوری زندگی ارشاد وتلقین میں بسر کی اور ہندوستان کے دیگر بڑے مشائخ کی طرح دیار پورب میں بڑا کام کیا اور بقول صاحب مشکوۃ النبوۃ:

''از وے مردم بسیار ارشاد یافتند''

ان مردم بسیار میں شیخ مبارک محمدی ماہلی متوفی ۹۳۸ ہجری، شیخ حبیب اللہ عثمانی گھوسوی، شیخ عبدالصمد سرہندی، شیخ مبارک جھنجھانوی، قاضی منجھلہ جونپوری، شیخ منجھن کمال پوری خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

میر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دیگر نعمتوں کے ساتھ اولاد صالح کی نعمت سے بھی ہم کنار کیا تھا، چنانچہ صاحب بحر ذخار نے ان کے ایک صاحبزادے شیخ نظر علی کا ذکر کیا ہے۔

بارہویں صدی ہجری تک میر صاحب کے خاندان میں علم اور دین کا چرچا رہا، بعد میں یہ روحانی خانوادہ نوابان اودھ کے زیر اثر شیعہ ہو گیا اور بتدریج اس طرح مائل بزوال ہوا کہ ماضی کی عظمتوں کا اب کوئی نام ونشان بھی موجود نہیں ہے۔ (رہے باقی نام اللہ کا)

(میر صاحبؒ کے تفصیلی حالات کے لیے رسالہ عاشقیہ قلمی مملوکہ مولانا نجم الدین اصلاحی،

بحر ذخار قلمی، اخبار الاخیار ص ۲۲۲، سفینۃ الاولیاء ص ۱۹۰، گلزار ابرار، نزہۃ الخواطر ص ۲۴۴ ج ۴، خلاصۃ الاثر ص ۴۶۸ ج ۱، ماہنامہ معارف ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۶۹ء کا مطالعہ کیا جائے۔)

قاضی علی عباس چریا کوٹیؒ

شیخ فاضل مولانا علی عباس بن شیخ امام علی بن شیخ غلام حسین بن شیخ سعد اللہ عباسی چریا کوٹی اپنے وقت کے افاضل علماء میں شمار ہوتے تھے، آپ کی ولادت ۱۲۳۱ ہجری کے حدود میں ہوئی، اپنے چچا مولانا احمد علی چریا کوٹیؒ اور مولانا ابو الحسن (۱) منطقیؒ سے علوم وفنون کی تحصیل کی، کتب متوسطہ میر زاہد، قطبی وغیرہ کی تعلیم وتحصیل کے زمانہ میں آپ کے اندر اتنی صلاحیت ولیاقت پیدا ہوگئی تھی کہ منطق وفلسفہ اور دیگر دوسرے فنون کے اہم سے اہم تر مسائل کو شروح وحواشی کے ذریعہ استاذ کی رہنمائی کے بغیر پورے طور سے حل کرلیا کرتے تھے، اس لیے درس کو موقوف کرکے از خود مطالعہ کتب میں مصروف ہوگئے، علمائے متقدمین ومتاخرین کی جس قدر تصنیفات بھی دستیاب ہوسکیں سب دیکھ ڈالیں، کتب مشہورہ میں ایسی کتاب مشکل ہی سے ہوگی جو مولانا علی عباس کی نظر سے نہ گذری ہو۔ قدرت نے قاضی صاحب کو حفظ کی دولت سے بھی حصہ وافر عطا کیا تھا، اس لیے کتب درسیہ وغیر درسیہ کے اکثر اہم مسائل ذہن کی گرفت میں آگئے، چنانچہ درس نظامیہ کی اکثر کتابیں حواشی وشروح کی جانب مراجعت کیے بغیر نہایت تحقیق وتدقیق سے پڑھایا کرتے تھے۔

درس متداولہ کے مسائل پر پوری طرح عبور حاصل ہوجانے کے بعد ادب وانشاء اور لغت عربی کی جانب متوجہ ہوئے اور تھوڑی ہی مدت میں اس فن میں بھی اتنی مہارت پیدا کرلی کہ عربی میں نظم ونثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہوگئی، فن تاریخ وسیر میں بھی انھیں درجۂ اختصاص حاصل تھا۔

---

(۱) مولانا ابو الحسن بن قاضی شاکر منطقی مشہور علماء میں تھے، ایک سو تیس سال سے زائد زندہ رہے، نحو وصرف اور منطق میں امامت کی شان رکھتے تھے، بے شمار طلبہ نے ان سے اخذ علم کیا۔ ۱۲۹۳ ہجری میں بھبوا ضلع پٹنہ میں آپ کا انتقال ہوا۔ (نزہہ ص ۱۲ ج ۷)

علوم وفنون میں تبحر حاصل ہو جانے کے بعد حیدرآباد کا رخ کیا اور امرائے سلطنت کی شان میں نہایت شاندار قصائد اور مدحیہ اشعار لکھ کر پیش کیے، لیکن خاطر خواہ پذیرائی نہ ہوئی اس لیے بد دل ہو کر وہاں سے بھوپال چلے آئے، یہاں نواب سکندر بیگم والیہ ریاست نے آپ کا بڑا اعزاز و اکرام کیا اور اپنے جود و سخا سے خوب نوازا، چونکہ مولانا علی عباس کی طبیعت میں مناظرہ ومباحثہ کا غلبہ تھا، اس لیے اراکین ریاست سے نباہ نہ ہو سکا اور چند سال سے زیادہ یہاں نہ رہ سکے اور مکان واپس چلے آئے۔ کچھ دنوں تک گھر ہی پر درس وافادہ میں مصروف رہے رفتہ رفتہ آپ کے تبحر علمی کا آوازہ بلند ہوا اور نواب حیدرآباد تک آپ کی مہارت علمی کی تعریف پہونچی تو نواب صاحب نے ازراہ قدردانی نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ انھیں حیدرآباد آنے کی دعوت دی اور ان کے شایان شان اہم عہدہ پر فائز کیا، چنانچہ ایک مدت تک اس عہدہ پر متمکن رہے، بعد میں دوسو روپے ماہانہ وظیفہ پر عہدہ سے الگ ہو کر گھر چلے آئے، اور ماہ ذی الحجہ ۱۳۰۲ ہجری کی آخری تاریخوں میں وفات پائی اور حسب ذیل کتابیں یادگار چھوڑیں۔

نبراس الفطانۃ، خلاصۃ الصرف، ابحاث الصرف، رقیۃ النجات، حل الکافیہ، الایجاد فی الارشاد، میزان الاوزان، وسواس الخناس، الہلالیہ، مجموعۂ مکاتب۔

مولانا علی عباس فن منطق میں اپنے عہد کے امام تھے، قضیہ شرطیہ کی مشہورہ تقسیم متصلہ ومنفصلہ پر ایک جدید قسم کا اضافہ کیا تھا اور اس کا نام قضیہ عباسیہ رکھا تھا، اس کے علاوہ منطق وفلسفہ کے اصول وقوانین پر آپ نے بڑے اہم اور وقیع اعتراضات بھی کیے۔

(تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴۴ و نزہہ ص ۳۳۰ ج ۷)

قاضی عنایت اللہ عباسی چریاکوٹیؒ

مولانا قاضی عنایت اللہ بن مولانا کمال الدین عباسی معقولات ومنقولات میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے، علوم عقلیہ وعلوم نقلیہ دینیہ میں متبحر ہونے کی بنا پر سلطنت میں بلند مراتب تک پہونچے، فصاحت بیان اور طلاقتِ لسان میں نادرۂ روزگار تھے، فضل وکمال کی

کثرت کے ساتھ دنیاوی وجاہت بھی حاصل تھی، ابتداءً گجرات کے قاضی مقرر ہوئے، پھر ترقی کرتے کرتے صوبے داری کے منصب تک پہونچے، حکومت دہلی نے خان نصیر الدین کے خطاب سے نوازا تھا، بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں تذکرۃ السیر اپنے موضوع پر نہایت حاوی اور جامع تھی افسوس کہ آپ کے تفصیلی حالات اور تصانیف کسی کا پتہ نہ چل سکا۔ (یادداشت چریاکوٹ ص ۸۲)

مولانا عنایت اللہ مئویؒ

شیخ فاضل مولانا عنایت اللہ بن باب اللہ مئوی علمائے اعظم گڈھ میں بڑی شہرت کے حامل تھے، ۱۲۹٦ ہجری میں قصبہ مئو میں آپ کی ولادت ہوئی، ابتدائی کتابیں مئو ہی میں وہاں کے اساتذہ سے پڑھیں، اس کے بعد لکھنؤ کا علمی سفر کیا اور وہاں بھی مختلف اساتذہ سے علوم وفنون کی تحصیل کی، علوم متداولہ سے فراغت کے بعد، فن طب کی تعلیم وتحصیل کی فراغت کے بعد ضلع کی مشہور درس گاہ ناصر العلوم گھوسی میں درس وتدریس کی خدمت پر مامور ہوئے اور طویل عرصہ تک اس مدرسہ میں تعلیمی وتدریسی خدمت انجام دی، ماہ ربیع الاوّل ۱۳۸۰ ہجری میں آپ کا وصال ہوا۔

مولانا عنایت رسول عباسی چریاکوٹیؒ

العلامۃ الفہامہ مولانا عنایت رسول بن قاضی علی اکبر بن قاضی عطا رسول عباسی چریاکوٹی اپنے عہد کے مشاہیر علماء میں سے تھے، معقول ومنقول اور ریاضی ہر قسم کے علوم سے مالامال تھے۔

مولانا عبدالحیٔ حسنیؒ نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں:

"لم یکن له نظیر فی الفنون الریاضیة وفی معرفة اللغة العبرانیة"

مولانا کی ولادت ۱۲۴۴ ہجری میں ضلع اعظم گڈھ کے مشہور علمی قصبہ چریاکوٹ میں ہوئی، صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں کافیہ تک اپنے والد قاضی علی اکبر المتوفی ۱۲۸۳ ہجری

سے پڑھیں، علوم معقول وریاضی وحساب وہیئت مولانا احمد علی چریاکوٹی سے اور علوم منقول ملا فضل رسول بدایونی المتوفی ۱۲۸۹ھ (۱) سے جو دو واسطوں سے ملا بحر العلوم کے شاگرد تھے حاصل کیا اور حدیث مولانا حیدر علیؒ رام پوری شاگرد حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ سے ٹونک جاکر پڑھی، واپس آکر عبرانی پڑھنے کا شوق ہوا تو کلکتہ جاکر یہودیوں سے عبرانی پڑھی اور توراۃ، انجیل، زبور اور دوسرے صحائفِ بنی اسرائیل پر پورا عبور حاصل کرلیا، عبرانی زبان میں کامل مہارت حاصل ہوجانے کے بعد ۱۲۷۱ھ میں گھر واپس ہوئے اور درس وتدریس میں مشغول ہوگئے، مولانا عنایت رسول طلبہ کی کثرت کو پسند نہیں کرتے تھے؛ بلکہ چند محنتی اور ذہین طلبہ کے پڑھانے پر اکتفا کرتے تھے، استغناء اور عزلت پسندی کے باوجود آپ کے تبحر علمی کا غلغلہ پورے ہندوستان میں بلند ہوگیا۔ سرسید احمد خاں نے بنارس وغازی پور کے قیام کے زمانہ میں مولانا سے استفادہ کیا اور توراۃ، انجیل اور زبور وغیرہ کے مباحث کے حل کرنے میں ان سے پوری مدد لی اور بعض بعض مسائل پر ان سے رسالے لکھوائے، سرسیّد کے مطبوعہ خطوط میں مولانا عنایت رسول کے نام بھی چند خط ہیں۔

مولانا عنایت رسول بعض مسائل دینیہ میں اپنی خاص رائے رکھتے تھے جو جمہور علمائے احناف سے الگ تھی، مثلاً (۱) نکاح صغیرہ کو ولی کی اجازت سے بھی صحیح نہیں سمجھتے تھے، (۲) خمر کو مطلقاً حرام کہتے تھے خواہ وہ انگور کی ہو یا جو یا کسی اور شے کی۔ (۳) عصمت انبیاء کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اس سے مطلق عصمت نہیں مراد ہے بلکہ ''عصمت فی فہم الوحی'' مراد ہے۔ (۴) معراج کے سلسلے میں ان کی رائے یہ تھی کہ بیت المقدس تک تو معراج جسمانی ہوئی ہے بعد ازاں روحانی۔ (۵) شطرنج کے کھیل کو جائز سمجھتے تھے، (۶) توراۃ میں تحریفِ لفظی کے قائل نہیں تھے؛ بلکہ کہتے تھے کہ صرف تحریف معنوی ہوئی ہے۔

یکم ماہ شوال ۱۳۲۰ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

---

(۱) مولانا فضل رسول بن عبدالحمید عثمانی بدایونی ۱۲۱۳ہجری میں پیدا ہوئے، مولانا نور بن انوار فرنگی محلی سے تحصیل علوم وفنون کی۔ دھول پور و بنارس میں ان کا مطب مدتوں مرجع عوام رہ چکا ہے۔ حج کے موقع پر شیخ عبداللہ سراج مکی اور شیخ عابد سندھی سے حدیث کی اجازت وسند لی، بدعت کی طرف مائل تھے اور ہمیشہ علمائے حق سے بحث ومناظرہ کے لیے تیار رہتے تھے، متعدد کتابیں بھی لکھیں، ۳/جمادی الاخریٰ ۱۲۸۹ھ میں انتقال کیا۔ (نزہہ ص ۳۷۷ ج ۸)

آپ کے تلامذہ میں آپ کے برادر خورد مولانا محمد فاروق چریا کوٹی استاذ علامہ شبلی مرحوم بڑی اہمیت وخصوصیت کے حامل ہیں۔

مولانا کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابوں کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے:

(۱) بُشریٰ (دوجلدوں میں): مولانا عنایت رسول کی یہ نہایت اہم اور وقیع تصنیف ہے اس میں آپ نے کتب سماویہ سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی جملہ صفات کونقل کیا ہے، شروع میں نبوت کے سلسلے میں ایک عجیب وغریب مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں بڑے اہم مضامین بیان کیے ہیں۔

(۲) المقولات العضدیہ: فن ہندسہ میں یہ کتاب تین جلدوں میں ہے، مولانا نے اقلیدس کے مشہور مقالوں میں اپنی ذہانت ومہارت سے تین کا اضافہ فرمایا ہے۔

(۳) کتاب الجبر والمقابلہ (۴) کتاب الحساب (۵) نورالانظار فی علم الابصار (۶) الفصول العضدیہ: فن قرأت میں (۷) میزن الکافی: فن تصریف میں (۸) بدایۃ الصرف: فارسی کی گردان میں (۹) اعجاز القرآن (۱۰) مسائلِ رضاعت (۱۱) قواعد زبان عبرانی (۱۲) علم کلام (۱۳) صرف عربی (۱۴) شہادت نامہ امام حسینؓ (۱۵) امہات المومنین (۱۶) الملاہی (۱۷) رسالہ نیچر۔

(تذکرہ علمائے ہندص ۱۵۲ونزہۃ الخواطرص ۳۳۶ج ۸وتذکرہ علمائے حال ص ۶۱وحیات شبلی ص ۷۲)

=================

﴿غ﴾

مولانا غلام علی چریا کوٹی

مولانا غلام علی بن شیخ نجابت اللہ عباسی چریا کوٹی اوائلِ عمر میں علوم وفنون کے بجائے فن سپہ گری کے شوقین تھے اور اس فن میں کامل مہارت پیدا کر کے زمرۂ لشکریاں کے سرتاج بن گئے تھے، ایک دن مولانا غلام علی کے بزرگوں میں سے کسی نے حسرت وافسوس کے انداز میں فرمایا:

"اے کاش! در خاندانِ ما کسے بودے کہ بجائے فن تیغ وتبر سرمایۂ علم وہنر بدست آوردے وبجائے دشنہ وسپر کتب احادیث وخبر کردے۔"

اس جملے نے مولانا کی غیرت وحمیت میں ایک ہیجان برپا کردیا، اسی وقت حصول علم کی نیت سے گھر سے نکل پڑے اور دہلی پہونچ کر حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی (۱) قدس سرہ کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے تا آنکہ فارغ التحصیل ہوکر وہاں سے رخصت ہوئے اور وطن میں آکر درس وتدریس میں مشغول ہوگئے، آپ کا طرز تعلیم نہایت اچھوتا تھا، اہم سے اہم مسائل کو طلبہ کے ذہن میں اس طرح اتار دیتے تھے کہ سمجھنے والا خیال کرتا تھا کہ یہ اہم مقام تھا ہی نہیں۔

ان خوبیوں کے علاوہ، حسنِ اخلاق، حسنِ معاشرت سے بھی مزین تھے۔

۱۲۴۸ ہجری میں آپ کا انتقال ہوا۔

صرف ونحو کے مسائل میں کچھ نعز وپہیلیاں مرتب کی تھیں مگر اب وہ نایاب ہیں۔

(تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۵ و نزہۃ الخواطر ص ۳۵۸ ج ۷)

شیخ غلام فرید محمد آبادیؒ

شیخ غلام فرید بن شیخ سعد اللہ بن شیخ غلام محی الدین محمد آبادیؒ اپنے عہد کے علمائے کبار اور مشائخ عظام میں تھے، فقہ اور حدیث میں امتیازی صلاحیت کے مالک تھے، دس برس کی عمر میں جون پور چلے گئے تھے اور ایک عرصہ تک وہاں قیام کرکے مختلف اساتذہ سے تحصیل علم وکسب فضیلت میں مشغول رہے پھر یہاں سے لکھنؤ کا سفر کیا اور مولانا نظام الدین

(۱) حضرت شاہ عبدالعزیز بن مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی ۲۵ رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۷ شوال ۱۲۳۹ھ میں وفات پاگئے، آپ نے اپنے والد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ سے اکثر تعلیم پائی تھی، والد ماجد کی وفات کے بعد بعض کتابیں شیخ نور اللہ، شیخ محمد امین اور شیخ محمد عاشق پھلتی سے پڑھیں، علوم دینیہ کے علاوہ تیراندازی، شہ سواری اور فن موسیقی میں بھی آپ کو مہارت حاصل تھی، پندرہ برس کی عمر سے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا تھا جو زندگی کے آخری لمحے تک جاری رہا، ہندوستان میں علم حدیث کی نشر واشاعت میں آپ کے ہمسر کم ہی ملیں گے، آپ سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا۔

فرنگی محلی لکھنوی کے حلقۂ درس میں شامل ہوکر مدت دراز تک علوم ظاہر و باطن کی تحصیل کرتے رہے، فراغت تعلیم کے بعد مولانا فرنگی محلی نے سند فضیلت کے ساتھ خرقۂ خلافت بھی عنایت فرمایا۔

شیخ غلام فرید اپنے استاذ و مرشد سے رخصت ہوکر وطن مالوف واپس آئے اور درس وتدریس کا شغل اختیار کیا، آپ کے درس سے دیار و امصار کے طلبہ کو بڑا فیض پہونچا، درس وتدریس سے فراغت کے بعد ذکر و شغل میں لگ جاتے، عموماً روزے سے رہتے تھے، بلا ضرورتِ شدید حجرہ سے باہر نہیں نکلتے تھے آپ کی مجلس میں قرآن وحدیث یا بزرگان دین کی باتوں کے علاوہ کوئی دوسری بات کسی کو کرنے کی اجازت نہ تھی۔

اپنے وطن محمد آباد گوہنہ میں انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے، مزار پختہ محلہ شیخ واڑہ میں اب بھی موجود ہے اور مرجعِ خلائق ہے، تاریخ وفات معلوم نہ ہوسکی، چونکہ آپ کے استاذ شیخ نظام الدین فرنگی محلی (۱) کی وفات ۱۱۶۱ ہجری میں ہوئی ہے، اس لیے قیاس یہ کہتا ہے کہ شاگرد کی وفات ان کے بعد ہوئی ہوگی، اس لحاظ سے آپ کی وفات بارہویں صدی کے آخر یا تیرہویں صدی کی ابتدا میں ہوسکتی ہے۔ (تجلی نور ص ۹۶، بحر ذخار و مظہر الاحدیہ ص ۱۶۶)

قاضی غلام مخدوم چریا کوٹی

مولانا قاضی غلام مخدوم بن قاضی عبدالصمد عباسی چریا کوٹی فہم و ذکاوت میں نادرۂ روزگار تھے، علوم عقلیہ ونقلیہ میں ماہر ہونے کے ساتھ زبان سنسکرت میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، شعر و سخن میں بھی اپنے دور و دیار میں شہرت رکھتے تھے، ایک دیوان فارسی میں مرتب

(۱) مولانا نظام الدین بن ملا قطب الدین سہالوی فرنگی محلی نے اپنے والد کے علاوہ حافظ امان اللہ بنارسی، ملا قطب الدین شمس آبادی سے تعلیم حاصل کی اور تکمیل شیخ غلام نقشبند گھوسوی سے کی، علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی سے بھی آراستہ تھے، شیخ عبدالرزاق بانسوی سے آپ کو خلافت واجازت حاصل تھی، آپ ہی درسِ نظامیہ کے مرتب ہیں جو تقریباً ڈھائی سو برس سے ہندوستانی مدارس میں رائج ومتداول ہے، ۹ رجمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ ہجری میں آپ کی وفات ہوئی۔ آپ کے تفصیلی حالات کے لیے مآثر الکرام ص ۲۳۰، سبحۃ المرجان ص ۹۴، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۲، رسالہ بحر العلوم مطبوعہ مدراس اور تذکرہ احوال علمائے فرنگی محلی کا مطالعہ کیا جائے۔

کیا تھا، مگر آخر عمر میں خود ہی ضائع کر دیا، اس لیے آپ کے کلام کا اکثر حصہ ناپید ہو گیا، البتہ جو اشعار لوگوں کے سینے میں محفوظ رہ گئے تھے وہی باقی رہے، نمونۂ کلام یہ ہے ؎

بباغ دہر نہ گل ماند و نے سمن باقی است　　زعندلیب پری چند در چمن باقی است

دلم بسوخت، تنم سوخت و استخواں ہم سوخت　　تمام سوختم و ذوقِ سوختن باقی است

زفیض جانِ مکرم خوشم نیم محتاج　　درونِ سینہ و لے حسرتِ وطن باقی است

قاضی غلام مخدوم اپنے والد ماجد قاضی عبد الصمد عباسی کے بعد عہدۂ قضا پر فائز ہوئے اس عہدہ پر متمکن رہتے ہوئے درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور پچاس برس کی عمر میں ۱۲۰۵ ہجری میں وفات پائی، اس اعتبار سے قاضی غلام مخدوم کی ولادت ۱۱۵۵ ہجری میں ہوئی۔ (تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۷ و نزہۃ الخواطر ص ۳۶۱ ج ۷)

شیخ غلام نقشبند گھوسویؒ

شیخ غلام نقشبند بن شیخ عطاء اللہ بن شیخ قاضی حبیب اللہ بن شیخ احمد بن شیخ ضیاء الدین بن شیخ یحییٰ بن شیخ شرف الدین بن شیخ نصیر الدین بن مفتی حسین عثمانی اصفہانی گھوسوی علوم دینیہ کے علاوہ علوم عقلیہ، ادبیہ، نحو، لغت، اشعار عرب اور ایامِ عرب میں اپنے دور و دیار کے سب سے بڑے عالم مانے جاتے تھے، اپنے آبائی وطن قصبہ گھوسی میں ۹؍ ذی الحجہ ۱۰۵۱ ہجری میں پیدا ہوئے، والد ماجد کے انتقال کے بعد اپنے والد کے شاگرد رشید میر محمد شفیع دہلوی سے جملہ علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کی اور بطور یمن و برکت والد ماجد کے استاذ شیخ پیر محمد بھیروی لکھنوی سے پڑھ کر ۱۰۷۲ ہجری میں سند فراغت حاصل کی۔

شیخ غلام نقشبند جامع علم و عرفان تھے، علوم شریعت کی طرح علوم طریقت میں بھی آپ کو درجۂ کمال حاصل تھا، ۱۰۷۲ ہجری میں تحصیل و تعلیم سے فارغ ہوئے، فراغتِ تعلیم کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا ۱۰۸۹ھ میں شیخ پیر محمد کی وفات کے بعد ان کے جانشیں ہوئے اور تدریس کے ساتھ تہذیب اخلاق تزکیۂ باطن جیسی اہم خدمت بھی انجام دینے لگے، ان مشاغل کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی قائم تھا، ۱۱۲۶ ہجری میں

آپ کی وفات ہوئی، اس طرح تقریباً نصف صدی تک شیخ غلام نقشبند گھوسوی نے علمی دینی اور روحانی خدمات انجام دیں۔

آپ کے تلامذہ کی فہرست میں آسمان علم کے آفتاب و ماہتاب یعنی ملّا نظام الدین لکھنوی مرتب درس نظامیہ اور میر عبدالجلیل بلگرامی کے علاوہ سیّد فرید الدین بلگرامی، سید قادری بلگرامی، مفتی شرف الدین اعظمی لکھنوی جیسے اساطین علم وفن ہیں۔

شیخ غلام نقشبند قدس سرہ کو قرآن سے خاص شغف تھا، اس لیے بالخصوص قرآن پر آپ نے زیادہ کام کیا، آپ کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کا ذکر تراجم وتذکرہ میں ملتا ہے۔

(۱) انوار القرآن (تفسیر ربع قرآن) (۲) فرقان الانوار (تفسیر سورۂ اعراف) (۳) تفسیر سورۂ طٰہٰ (۴) تفسیر سورہ محمد (۵) تفسیر سورۂ یوسف (۶) تفسیر سورۂ الرحمٰن (۷) تفسیر سورہ عم (۸) تفسیر سورۂ کوثر (۹) تفسیر سورۂ اخلاص (۱۰) تفسیر آیت اللہ نور السمٰوات... (۱۱) تفسیر آیت انا عرضنا الامانۃ... (۱۲) تفسیر آیت فحسبتم... (۱۳) تفسیر آیت لاتقولن لشئ... (۱۴) تفسیر آیت کلوا واشربوا (۱۵) لامیہ عرشیہ (مسئلۂ وحدۃ الوجود پر) (۱۶) شرح قصیدہ خزرجیہ (علم العروض)۔

تفصیل کے لیے دیکھیے معارف اعظم گڈھ شمارہ ماہ جنوری ۱۹۷۴ء۔

(نزہۃ الخواطر ص ۱۰۵ ج ۶، مآثر الکرام ص ۲۱۶، سبحۃ المرجان ص ۷۸، تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۵)

ف

مولانا فتح اللہ مہواروی ؒ

موضع مہوارہ، قصبہ سرائے میر سے بجانب مغرب تقریباً پانچ، چھ میل کے فاصلے پر ایک مشہور گاؤں ہے۔ مولانا فتح اللہ اسی بستی کے ایک قابل قدر سپوت تھے، جو ضلع اعظم گڈھ کے مشہور عالم مولانا سلامت اللہ کے تلمیذ رشید اور ان کے صاحبزادے مولانا حافظ اسلم جیراج پوری کے مخصوص اساتذہ میں سے تھے، مولانا اسلم صاحب اپنے مقالہ ''میری طالب علمی'' نوشتہ ۱۹۳۷ء میں لکھتے ہیں:

''مولوی فتح اللہ صاحب موضع مہوارہ ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے تھے، انھوں نے والد صاحب سے اس زمانہ میں پڑھا جبکہ وہ بنارس میں درس دیتے تھے، والد صاحب نے اپنی (ریاست بھوپال میں) مہتممی کے زمانہ میں مدرسہ سلیمانیہ (بھوپال) میں عربی کے مدرس دوم کی جگہ پر ان کو بلا لیا تھا، پڑھانے سے عشق تھا، کبھی چھٹی نہیں لیتے تھے، اور ہمیشہ وقت سے پہلے مدرسہ میں پہنچ جاتے تھے، مدرس اوّل مولوی مظہر حسین صاحب کہ وہ بھی مہوارہ کے متصل موضع بھاروں کے رہنے والے تھے، جب بھوپال رباط کے منتظم بنا کر مکہ معظمہ بھیج دیئے گئے، اس وقت ان کی جگہ مولوی فتح اللہ صاحب کو ملی، یہ مدرسہ سلیمانیہ کے مہتمم بھی ہو گئے تھے، پھر پنشن لے لی سال گذشتہ یعنی ۱۹۳۶ء (مطابق ۱۳۵۵ھ) مارچ کے مہینہ میں تقریباً بیاسی سال کی عمر میں اپنے وطن میں انتقال کیا۔

ان کے کوئی اولاد نہیں تھی، اہلیہ کے انتقال کے بعد مولوی صاحب نے پھر نکاح نہیں کیا، تنہا ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے، نہایت باوضع پابند اوقات نہ کبھی تہجد ناغہ ہوئی نہ جماعت، الا ماشاء اللہ، لباس اور غذا میں سادگی کا بہت لحاظ رکھتے تھے، آخر میں دو حج بھی کیے تھے، عام طور پر لوگ بالخصوص اہل محلہ ان کو قطب سمجھتے تھے، میں نے جب سے ان سے پڑھنا شروع کیا اس وقت سے میرے اوپر ان کی شفقت برابر بڑھتی گئی وہ مجھ کو بمنزلہ فرزند گنتے تھے اور پدرانہ محبت رکھتے تھے۔

لطیفہ: مولوی صاحب نے ایک دن ظلمات اور آبِ حیات کے قصہ میں فرمایا کہ اس کی حقیقت بھی کچھ سمجھے! ظلمات سے مراد سیاہ حروف ہیں اور آبِ حیات سے معانی، جو شخص عبارت سے معنی مطلب نکال لیتا ہے وہ گویا ''خضر'' ہے کہ ظلمات میں سے آبِ حیات لاتا ہے، یہ قدرت صرف مطالعہ کی قوت بڑھانے سے حاصل ہوتی ہے، جو شخص ہر قدم پر استاذ کا محتاج ہے وہ اس سے محروم ہے، جیسے سکندر، کہ خضر کی رہنمائی سے بھی آبِ حیات اس کو نصیب نہ ہو سکا۔ (نوادرات ص ۳۶۸-۳۶۹)

☆ ☆ ☆

شاہ فتح علی قلندر قلندر پوریؒ

حضرت شاہ فتح علی قلندر قدس سرہ حضرت قطب بینائے دل جونپوری (۱) متوفی ۹۲۵ ہجری کی اولاد میں سے تھے، شجرۂ نسب یہ ہے: شاہ فتح علی قلندر بن شاہ حسین قلندر بن شاہ مظفر قلندر بن شاہ ملک قلندر بن شاہ محمود قلندر بن قطب الدین بینائے دل قلندر۔

جذب اور شوریدہ سری میں خاص طور سے ممتاز تھے، شیخ مجتبیٰ قلندر معروف بہ شیخ مجا قلندر لاہر پوری متوفی ۱۰۹۲ھ کے خلیفۂ باختصاص تھے، اپنے چچیرے دادا شیخ عبدالقدوس (۲) بن عبدالسلام جونپوری متوفی ۱۰۵۲ھ سے بھی بطور خاص اکتساب فیض کیا تھا۔ شیخ فتح علی قلندر کے والد شاہ حسین ایک گاؤں میں رہتے تھے اس لیے بیٹے کو اپنے چچیرے تایا شیخ عبدالقدوس کی خدمت میں جونپور بھیج دیا تھا، شیخ فتح علی کی تمام تر تعلیم و تربیت شیخ عبدالقدوس ہی کے سایۂ عاطفت میں ہوئی اور انھیں کے حکم سے شیخ مجا قلندر لاہر پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔

ابتداء میں شوریدہ سری و بادیہ پیمائی کی کیفیت آپ پر غالب رہی، کسی جگہ چین واطمینان نہ ہوتا قریہ قریہ، شہر شہر گھومتے رہتے، اسی حالت میں ایک مرتبہ دہلی پہونچ گئے، جہاں آپ کی ملاقات داراشکوہ سے ہوگئی، دارشکوہ صوفیانہ مزاج رکھتا تھا، شیخ فتح علی قلندر

---

(۱) شیخ قطب الدین بینائے دل ۷۷۶ ہجری میں پیدا ہوئے، آپ دیارِ شرق کے مشہور مشائخ میں ہیں، متعدد سلسلوں سے آپ کو خلافت حاصل تھی بالخصوص سلسلۂ قلندریہ کے تو امام مانے جاتے ہیں، آپ کا قیام جونپور میں تھا، یہاں ۹۲۰ ہجری میں ایک سو چوالیس برس کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی، تفصیل کے لیے دیکھیے، تجلی نور سنگرف دوم، الانتصاح عن ذکر اہل الصلاح و گنج ارشدی ونزہۃ الخواطر جلد چہارم وغیرہ۔

(۲) شیخ عبدالقدوس بن عبدالسلام (علّن) جونپوری ۹۴۲ ہجری میں پیدا ہوئے، اپنے والد شیخ عبدالسلام کے علاوہ شیخ عبدالرحمٰن جانباز لاہر پوری سے ان کو خلافت ملی تھی، زہد و تقویٰ اور استغناء میں خاص امتیاز رکھتے تھے، بڑے بڑے علماء وفضلاء ان سے منسلک تھے، ۱۰۵۲ھ میں بعمر ایک سو دس سے زائد جونپور میں وفات ہوئی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے گنج ارشدی قلمی ص ۱۲۴ (مملوکہ خانقاہ رشیدیہ جون پور) تجلی نور ص ۲۸، بحر ذخار ورق ۲۱۹ قلمی (مملوکہ دائرہ شاہ محمدی الہ آباد) تذکرۃ المتقین ص ۱۲۳ ج ۲، اور نزہہ جلد ۵)

سے اس نے تصوف کے موضوع پر گفتگو کی، شیخ نے بڑی حسن وخوبی کے ساتھ اس موضوع پر تقریر کی جسے داراشکوہ نے بیحد پسند کیا اور اسی تاریخ سے شیخ کا معتقد ہو گیا۔

کیفیت جذب کے زائل ہو جانے کے بعد کچھ دنوں تک آپ نے موضع سونگر ضلع جونپور میں اقامت اختیار کی، اس کے بعد پرگنہ نظام آباد ضلع اعظم گڈھ میں قصبہ محمد پور سے جنوب مغرب تقریباً تین چار میل کے فاصلے پر ایک بستی قلندر پور کے نام سے آباد کی اور وہیں مستقل طور سے اقامت گزیں ہو گئے۔ شاہزادہ داراشکوہ نے آپ کے لیے ایک خانقاہ اور مسجد بنوادی تھی، آپ اسی خانقاہ میں رہتے تھے۔ اس دیار میں آپ سے بڑا فیض ہوا، چار ہزار سے زائد صاحب تصرفات وکرامات ان کے مرید تھے، سلسلۂ قلندریہ کا ان سے جس قدر فروغ ہوا وہ کسی اور سے نہیں ہوا، خلفاء میں شیخ آصف شاہ ساکن کٹرہ مانک پور متوفی ۱۱۴۲ھ، قاضی عبدالرحمٰن عارف شریحی ساکن موضع کمال پور مکنی، شاہ ابومحمد ساکن وندوہ، میر غلام حسن حسینی عرف سید بہاون، سید ظہیرالدین محمد حسینی، محمد عرب حسینی، میر ابراہیم حسینی، سید محمد مکی حسینی ساکنان سرائے میر اعظم گڈھ، حضرت شاہ الہدیہ احمد قلندر لاہرپوری، حضرت شاہ محمد عوض حسینی داماد شاہ سیف اللہ چریا کوٹی، شاہ بہاء الحق خیرآبادی، شاہ فیض اللہ سرائے میری، شاہ محمد فاضل ساکن نردہ ضلع اعظم گڈ وغیرہ کے ناموں کی صراحت فصول مسعودیہ میں ہے۔

شیخ نے ۲۲/ماہ شعبان ۱۱۱۸ ہجری میں قلندر پور میں وفات پائی اور اپنی مسجد کے صحن میں دفن ہوئے، تاریخِ وفات اس عبارت سے نکلتی ہے "دَخَلَ الْجَنَّۃَ یَاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِی"

شاہ فتح علی کے چار بیٹے تھے: شاہ بہاء اللہ، شاہ پیر محمد معروف بہ شاہ میرک، شاہ محمد واصل، شاہ علیم اللہ، بڑے صاحبزادے شاہ بہاء اللہ والد ماجد کے ساتھ شیخ مجا لاہرپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور انھیں سے خلافت پائی۔ بقیہ تینوں صاحبزادے والد ماجد سے بیعت وخلافت کا شرف رکھتے ہیں، چاروں صاحبزادوں کی قبریں شیخ ہی کے قبر کے پاس ہے۔

آپ کے بعد آپ کی اولاد قلندر پور ہی میں مقیم رہی اور اس دیار میں دینی و روحانی خدمات انجام دیتی رہی، لیکن نوابانِ اودھ کے زمانۂ اقتدار میں اپنی جاگیر کے تحفظ میں دوسرے امراء و علماء کی اولادوں کی طرح ان لوگوں نے بھی مذہب تشیع اختیار کرلیا۔

(بحر ذخار قلمی ص ۲۲۳ و تجلی نور شنگرف اوّل ص ۶۹ و فصول مسعودیہ ص ۶۷-۶۸)

مولانا فضلُ الرحمٰن کوریاپاریؒ

مولانا فضل الرحمٰن بن مولانا محمد اصغر بن شیخ محمد اکرام بن شیخ پیغمبر علی فاروقی کوریاپاری اپنے زہد و تقویٰ کے لحاظ سے سلف صالحین کے نمونہ تھے، آپ مولوی عزیز الرحمٰن فاروقی سابق مدرس شبلی ہائی اسکول اعظم گڈھ کے بڑے بھائی تھے۔

بچپن ہی سے صوم و صلوٰۃ کی غیر معمولی پابندی کی وجہ سے گھر میں شاہ صاحب کے لقب سے مشہور ہو گئے جو آخر میں حرف بحرف صادق ہوا۔

ابتداء میں ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کر کے کان پور گورنمنٹ اسکول میں استاذ مقرر ہوئے تھے، اسی زمانہ (۱۹۲۰ء مطابق ۱۳۳۹ھ) میں انھوں نے مدرسہ الٰہیات کانپور میں عربی کی تحصیل شروع کر دی اور دو سال کی قلیل مدت میں فنون کی تعلیم مکمل کر لی، یہاں کے اساتذہ میں مولانا آزاد سبحانی، مولانا غلام یحییٰ (مولانا اسحاق علمی مدیر سیاست کے والد) اور مولانا وصی علی ملیح آبادی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، فنون کی تکمیل کر کے دورۂ حدیث پڑھنے کے لیے ۱۹۲۳ء مطابق ۱۳۴۲ھ میں دارالعلوم دیوبند پہونچے اور مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کر کے دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت لی، اس کے علاوہ اردو، فارسی کے اعلیٰ سرکاری امتحانات بھی پاس کرتے رہے۔

تحصیل علم سے فراغت کے بعد شبلی اسکول اعظم گڈھ میں مدرس ہوئے پھر یہاں سے ۱۹۲۶ء مطابق ۱۳۴۵ھ میں گورنمنٹ اسکول ہمیر پور میں عربی و فارسی کے استاذ مقرر ہوئے، یہاں کی آب و ہوا انھیں راس نہ آئی اس لیے یہاں سے تبادلہ کرا کے دیوریا کے اسکول میں چلے آئے، یہاں تقریباً چودہ سال تک تدریسی خدمت انجام دی، دیوریا کے

زمانۂ قیام میں مولانا نے اپنے جیب خاص سے ایک مسجد تعمیر کرائی اور ساتھ ہی ایک مدرسہ بھی ''مدرسہ قرآنیہ'' کے نام سے جاری کیا، مسجد و مدرسہ کے مصارف کے لیے دو قطعہ مکان خرید کر ان پر وقف کیا، الحمد للہ مسجد و مدرسہ دونوں آباد ہیں، دیوریا سے ترقی کر کے لکچرر ہو کر فیض آباد میں آپ کا تبادلہ ہوا، یہاں بھی تقریباً چودہ برس تعلیم کا سلسلہ جاری رہا، آخر میں یہیں سے ریٹائر ہو کر گھر آئے، مولانا نے دو حج بھی کئے تھے، ایک ۱۹۴۱ء میں اور دوسرا ۱۹۵۶ء میں۔

مولانا دینی معاملات میں بہت محتاط تھے، بنک میں روپیہ کبھی جمع نہیں کیا، پراوڈنٹ فنڈ کبھی نہیں کٹوایا، مشکوک مال سے بھی پورا پورا اجتناب کرتے تھے، اس معاملہ میں اس درجہ اہتمام تھا اگر کبھی سفر میں یا رشتہ داری میں جاتے تو جنس ساتھ لے جاتے اور اپنے ہاتھ سے پکا کر کھاتے، آخر میں آپ کی صحت خراب رہنے لگی تھی، گھر کے بڑے بوڑھوں کے شدید اصرار پر اعظم گڈھ علاج کے لیے آئے، یہیں ۹ رمئی ۱۹۶۵ء میں آپ کی وفات ہوئی، میت یہاں سے کوریا پار لائی گئی جہاں اپنے والدین کے پہلو میں دفن ہوئے۔

(قصص الجمیل فی سوانح الخلیل ص ۳۲ تا ص ۳۴)

حضرت شاہ فضل علی نزدویؒ

شیخ شاہ فضل علی بن شیخ محمد علی قرشی موضع نزدہ پرگنہ نظام آباد کے باشندہ تھے، موضع نزدہ، قصبہ سرائے میر ضلع اعظم گڈھ سے جانب شمال مشرق تقریباً پانچ چھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، ''فصول مسعودیہ'' مصنفہ شاہ مسعود علی قلندر الہ آبادی متوفی ۱۲۲۱ھ میں شیخ فضل علی کے تذکرہ کا عنوان درج ذیل وقیع القاب میں ہے جس سے موصوف کے مقام و مرتبہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

''بیان احوال منبع علوم روحانی، مجمع فیوض سبحانی، جامع علوم شریعت و طریقت، سراج معرفت و حقیقت، مقبول لم یزلی مولوی معنوی شاہ فضل علی ابن شیخ محمد علی قریشی النسب متوطن آستانہ نزدہ پرگنہ نظام آباد سرکار جونپور ص ۱۱۹۔''

علاوہ ازیں شیخ باسط علی رحمہ اللہ کے خلفاء کے ذکر میں شیخ باسط کے دو بھائیوں اور ایک برادر زادہ کے بعد سب سے پہلے آپ ہی کا نام ہے، اس ترتیب سے بھی شیخ موصوف کے بلندیٔ مرتبہ کا پتہ چلتا ہے۔

شاہ فضل علی رحمہ اللہ نے علوم وفنون سے احسن طریقہ پر فراغت کے بعد درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا، زمانہ تدریس میں درسی کتابوں کے علاوہ تصوف کی کتابوں کا بھی مطالعہ کرتے رہتے تھے، اس طرح تصوف سے ایک گونہ تعلق ابتداء ہی سے ہو گیا تھا، اس زمانہ میں اکثر مخدوم شیخ علی عاشقاں کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوتے رہتے، جو تصوف کی طرف میلان کا مزید ذریعہ بنا، حسن اتفاق سے اسی دور میں شیخ محمد کامل خلف رشید شیخ فتح علی قلندر نے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے شاہ فضل علی کو طلب کیا، چونکہ شاہ صاحب کا شیخ فضل علی سے دوستانہ تعلق تھا اس لیے قدیم ربط وتعلق کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے، وہ اپنے آستانہ نردہ سے منتقل ہوکر قلندر پور شیخ فتح علی کی خانقاہ میں آگئے، جہاں شیخ محمد کامل اوران کے بھائیوں کے بچوں کی تعلیم وتربیت کے ساتھ ذکرواذکار کا سلسلہ بھی جاری رہا، اس دوران شیخ محمد کامل کے ذریعہ انھیں شیخ باسط علی قلندر مقیم (مگڈھ) الہ آباد متوفی ۱۱۹۶ھ کے احوال وکوائف کی اطلاع ملی، چنانچہ ایک منامی اشارہ پر شیخ محمد کامل سے اجازت لے کر شیخ باسط علی قلندر کی خدمت میں چلے گئے، اور طویل عرصہ تک انھیں کی خدمت میں رہ کر اذکار وافکار اور مراقبات کی تعلیم حاصل کی اور شیخ سے اجازت وخلافت کے بعد وطن مالوف واپس آئے، اور ہر علائق سے یکسو ہوکر ذکر وفکر میں مشغول ہوگئے، کچھ عرصہ کے بعد جذب وسکر کا اس قدر غلبہ ہوا کہ گھر بار کو چھوڑ کر سفر وسیاحت میں نکل پڑے، پھر پتہ نہیں چلا کہ کہاں گئے اور کس حال میں رہے۔

شیخ فضل علیؒ نے اپنے شیخ شاہ باسط علی متوفی ۱۱۹۶ھ کے آستانہ پر قیام کے زمانہ میں حسب ذیل کتابیں تصنیف کیں:

مناقب الاصفیاء، رسالہ کلمات الاسرار، خلاصۃ المعارف، رسالہ بیعت رضواں، رسالہ در بیان مسئلہ جبر واختیار، رسالہ اقسام الاولیاء، رسالہ کشف الرموز (اصطلاحات صوفیہ

کی تعریف میں) وغیرہ۔

ان تصانیف میں اوّل الذکر ''مناقب الاصفیاء'' سلسلہ قلندریہ کے متأخرین بزرگوں کا اہم ترین ماخذ ہے، اس کی تصنیف کے بعد اس موضوع پر جو کتابیں تالیف کی گئی ہیں مثلاً اصول المقصود، انتصاح عن ذکر اہل الصلاح، فصول مسعودیہ وغیرہ میں اس کے جا بجا حوالے ملتے ہیں، اور اکثر مقامات میں لکھا گیا ہے کہ تفصیل کے لیے مناقب الاصفیاء کا مطالعہ کیا جائے، جس سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ کتاب شیخ موصوف کی دیگر کتابوں کی طرح نایاب ہے، ممکن ہے کہ خانقاہ کاظمیہ کاکوری میں اس کا کوئی نسخہ موجود ہو، ''واللہ اعلم عنداللہ''

شیخ فضل علی مرحوم کے خواجہ تاش اور پیر بھائی مولانا عبدالقادر عمادی سوگھر پوری کی وفات ۱۲۰۲ھ میں ہوئی ہے، قرین قیاس ہے کہ اسی کے لگ بھگ ان کی بھی وفات ہوئی ہوگی۔ (فصول مسعودیہ ص۱۱۹ تا ۱۲۵)

موضع نزدہ ہی کے ایک اور بزرگ شیخ محمد فاضل ہیں جو شاہ فضل علی سے کچھ مقدم تھے، انھیں شاہ فتح علی قلندر متوفی ۱۱۱۸ھ سے خلافت واجازت حاصل تھی۔ شیخ فتح علی قلندر سے خلافت کی تصریح کے علاوہ ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ لعل اللہ یحدث بعد ذلك امرا.

حضرت شیخ فیض اللہ سہروردیؒ

حضرت سید ابوالفتح رکن الدین فیض اللہ سہروردی متولد ۹۲۵ھ سید مخدوم اسدالدین آفتاب ہند ظفر آبادی کی اولاد میں سے تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: سید ابوالفتح رکن الدین فیض اللہ، بن شیخ ابوالنجیب محمد شمس الدین، بن ابواحمد محمد اسماعیل، بن محمد غیاث الدین درویش، بن ضیاء الدین محمد، بن نظام الدین، بن قطب الدین، بن نورالدین، بن مخدوم سید اسدالدین آفتاب ہند ظفر آبادی۔

شیخ فیض اللہ کی شخصیت میں بچپن ہی سے شرافت ونجابت کے آثار نمایاں تھے، گویا

یہ مادرزاد ولی تھے، بارہ سال کی عمر میں حافظ قرآن ہو گئے تھے، اور اٹھارہ برس کی عمر میں علوم ظاہری، نحو، صرف، ادب، فقہ، تفسیر، حدیث وغیرہ علوم کی تحصیل مکمل کر لی تھی، بعد ازاں عبادت وریاضت اور مجاہدۂ نفس کی جانب متوجہ ہوئے، تو اس میں بھی کمال پیدا کر لیا۔ اپنے والدِ ماجد شیخ سید ابو النجیب محمد شمس الدین سے بیعت تھے، ریاضت ومجاہدہ کی کیفیت یہ تھی کہ بارہ سال تک مسجد کے حجرہ میں خلوت نشیں رہے، خدائے رب العزت نے ان کی ذات ایسی بابرکت بنائی تھی کہ سیکڑوں لوگ ان کی تعلیم وتربیت سے مقام قرب تک پہنچے، اپنے وقت کے مشہور وبافیض شیخ ومرشد شیخ تاج الدین جھوسی الہ آبادی ان کے اجلّ خلفاء میں سے تھے، اپنی سکونت گاہ موضع سرسانواں ضلع اعظم گڈھ میں ۱۳؍ربیع الاوّل ۱۰۵۵ھ میں بعمر ایک سو تیس سال اس دار فانی سے راہیٔ ملک بقا ہو گئے۔ (چراغ نور ص ۶۴-۶۵)

موضع سرسانواں، فی الحال سرسینہ کے نام سے معروف ہے، محمد پور سے جو سڑک شہر اعظم گڈھ کو جاتی ہے اسی سڑک کے قریب محمد پور سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر جانب شمال یہ موضع واقع ہے، اسی موضع سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر جانب مغرب فیض اللہ پور نام سے ایک گاؤں ہے جو غالباً شیخ رکن الدین فیض اللہ ہی کے نام پر آباد ہوا ہے، مگر اس وقت اس گاؤں میں ایک مسلمان کا بھی گھر نہیں ہے۔

مولانا فیض اللہ مئویؒ

استاذ الاساتذہ علامہ فیض اللہ مئوی اپنے وقت کے مشاہیر اصحاب درس میں تھے، آپ کی ولادت ضلع اعظم گڈھ کے مشہور مردم خیز قصبہ مئو میں ہوئی، سنِ تمیز کو پہونچے تو جونپور کا علمی سفر کیا اور حضرت مولانا سخاوت علی جونپوری متوفی ۱۲۷۴ھ کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر جملہ علوم مروجہ کی تحصیل وتکمیل کی، البتہ ۱۲۶۲ھ میں جب مولانا سخاوت علی اپنے ماموں مفتی محمد غوث کے ہمراہ سفر حج میں چلے گئے تو چند مہینوں کے لیے مولانا عبد الحلیم لکھنوی فرنگی محلی سے بھی پڑھا، جو ان دنوں نواب باندہ ذو الفقار بہادر مرحوم کے مدرسہ میں تعلیمی خدمات انجام دے رہے تھے۔

مولانا فیض اللہ نہایت ذہین اور تیز فہم تھے، اس لیے مولانا سخاوت علی قدس سرّہ ان کے ساتھ بیحد شفقت ومحبت کا معاملہ فرماتے تھے، علوم ظاہری کے بعد اپنے استاذ بھائی حضرت سید خواجہ احمد بن محمد یٰسین نصیرآبادی سے بیعت ہوگئے اور ذکر وشغل سیکھا، اس کے بعد قصبہ مئو میں درس وتدریس کا مشغلہ شروع کیا، لیکن جب علامہ شبلی نعمانی کے والد شیخ حبیب اللہ اور شہر اعظم گڈھ کے دوسرے صاحب استطاعت اصحاب نے مل کر شہر میں علوم عربیہ کا ایک مدرسہ قائم کیا تو مولانا فیض اللہ مئو سے اعظم گڈھ چلے آئے اور اس مدرسہ کے مدرس اوّل مقرر ہوئے، اسی زمانہ میں علامہ شبلی نے مولانا فیض اللہ سے عربی کی کچھ کتابیں پڑھی تھیں، اعظم گڈھ کے مدرسہ کے علاوہ علی گنج، سیوان اور داناپور پٹنہ کے مدرسوں میں بھی آپ نے تعلیمی وتدریسی خدمت انجام دی، آخر عمر میں تدریسی مشاغل میں تخفیف کر کے داناپور میں طبابت کرنے لگے تھے اور وہیں ۱۳/ربیع الاوّل ۱۳۱۶ھ میں فوت ہوئے، آپ کے تلامذہ کی تعداد بہت کثیر ہے، ان میں شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی، مولانا حسام الدین مئوی، مولانا عبدالقادر مئوی، مولانا عبدالغفور داناپوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں، جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں خوب شہرت وعظمت پائی، آخر الذکر شاگرد نے مولانا فیض اللہ کی سوانح عمری قلمبند کی تھی مگر وہ اب تک طبع نہ ہوسکی۔

(نزہۃ الخواطر ص ۳۶۹ ج ۸ وتراجم علمائے اہل حدیث ص ۴۱۷ وحیات شبلی ص ۷۲)

==================

﴿ق﴾

مولانا قائم علی عباسیؒ

مولانا قائم علی بن رعب علی ۷/ذی الحجہ یوم ۱۲۷۱ھ کو اپنے آبائی وطن مئوناتھ بھنجن میں پیدا ہوئے، شیخ رکن الدین یک لکھی سمرقندی ثم ظفرآبادی کی اولاد میں سے ہیں جو نسلاً عباسی ہاشمی تھے، سلسلہ نسب خود مولانا قائم علی نے یہ تحریر کیا ہے۔

مولانا قائم علی، بن رعب علی، بن شیخ طاہر علی، بن مولوی معشوق علی، بن قاضی غلام

معین الدین، بن قاضی غلام محی الدین، بن مولانا قاضی محمد یوسف، بن قاضی بڑے، بن قاضی حسن، بن مولانا خواجہ مخدوم عباسی ہاشمی متوفی بن خواجہ رکن الدین یک لکھی سمرقندی، بن خواجہ حسام الدین، بن خواجہ تاج الدین، بن خواجہ کریم الدین، بن خواجہ صدر الدین، بن خواجہ ضیاء الدین، بن خواجہ محمود، بن خواجہ مسعود، بن خواجہ عبدالفتاح، بن خواجہ عبدالہادی، بن خواجہ عبدالرحمٰن، بن خواجہ عبدالرحیم، بن خواجہ عبدالرزاق، بن موسیٰ، بن علی بن حضرت عباس عمّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (ذاہب السیات ج ص ۱، مطبوعہ ''سید المطابع بنارس ۱۳۱۶ھ تصنیف مولانا قائم علی)(۱)

۱۲۷۶ھ میں بعمر پانچ سال مکتب میں تعلیم کا آغاز کیا، سات برس کی عمر میں قرآن مجید اور اسی کے ساتھ فارسی کی ابتدائی کتابیں مثلاً ''کریما، مامقیما'' مکمل کرلیں، ۱۲۷۹ھ میں جبکہ مولانا صرف آٹھ سال کے تھے ان کے والد ماجد کا انتقال ہوگیا، اور والدہ ماجدہ کے علاوہ ان کی پرورش اور نگہداشت کرنے والا کوئی نہیں تھا، گھر میں کتابوں کے دفاتر، اور

---

(۱) مولانا قائم علی رحمہ اللہ نے نسب نامہ یوں ہی تحریر کیا ہے، لیکن اس میں شیخ رکن الدین یک لکھی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے درمیان متعدد نام چھوٹ گئے ہیں، کیونکہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے ابن خلدون کے حوالہ سے انساب کی تحقیق کے بارے میں یہ قاعدہ نقل کیا ہے کہ جس سلسلۂ نسب کی تحقیق مطلوب ہو تو یہ دیکھا جائے کہ اس سلسلہ کے پہلے اور آخر شخص کے سن وفات میں کتنا فاصلہ ہے، پھر اس فاصلہ کی ہر ایک صدی (سو سال) میں تین اشخاص رکھے جائیں، اس حساب سے اگر نسب میں مذکور پہلے شخص کی معروف سن وفات سے مطابقت ہوجائے تو نسب نامہ درست ہوگا ورنہ نہیں، حافظ عسقلانیؒ کا بیان ہے کہ ہم نے اس قاعدہ کے مطابق بہت سے معروف شجرہ نسب کی تحقیق کی تو اس میں بعض درست ثابت ہوئے اور بعض نہیں۔

چنانچہ شیخ رکن الدین یک لکھی سمرقندی متوفی ۸۲۰ھ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ متوفی ۳۲ھ کے درمیان آٹھ صدیوں کا فاصلہ ہے، تو اس قاعدہ کے مطابق شیخ رکن الدین اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سلسلۂ نسب میں چوبیس افراد ہونے چاہئیں، جبکہ مذکورہ نسب میں سولہ افراد ہی ہیں اور مولانا قائم علی کے والد ماجد متوفی ۱۲۷۹ھ اور شیخ رکن الدین یک لکھی متوفی ۸۲۰ھ کے درمیان چار صدیوں کا فاصلہ ہے، تو اس قاعدہ کے مطابق شیخ رعب علی اور شیخ رکن الدین کے درمیان آٹھ اشخاص ہونے چاہئیں اور مذکورہ نسب نامہ میں آٹھ افراد ہی ہیں، لہٰذا شیخ رعب علی سے شیخ رکن الدین تک تو شجرۂ نسب صحیح ہے اور شیخ رکن الدین سے آگے کا شجرہ درست نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (اس قاعدہ کو دیکھنے کے لئے ذیل تذکرۃ الحفاظ للذہبی ترجمہ مولف ذیل اوّل صب)

تھوڑی سی زمین کے جوان کے والد نے چھوڑی تھی کچھ نہیں تھا، اسی بے سروسامانی اور کسمپرسی کی حالت میں تعلیمی سلسلہ جاری رکھا، قصبہ مئو اور اس کے گردونواح جیسے رسڑا، شہر اعظم گڈھ، مرزاپور وغیرہ مقامات میں وہاں کے علما وفضلا سے کسب فیض کیا تا آنکہ اس وقت کے مروجہ نصاب کی تعلیم مکمل کر کے حدیث پاک کی تحصیل شروع کی، اور مولانا ابوالخیر معین الدین بن شاہ خیرات علی مشہدی کڑوی (۱) اور مولانا آل احمد محدث بن محمد امام جعفری پھلواروی مہاجر مدنی سے اصول ستہ پڑھ کر ۱۲۹۱ھ میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ (۲) بعد ازاں قاضی محمد بن عبدالعزیز مچھلی شہری متوفی ۱۳۲۰ھ سے مسلسل بالاولیات، بلوغ المرام، چہل حدیث وغیرہ کتب حدیث کی اجازت حاصل کی۔ مولانا نے اپنے اساتذہ میں سے صرف مذکورہ بالا انھیں تین بزرگوں کے نام کی صراحت کی ہے۔

تعلیم وتدریس سے فراغت کے بعد عام علماء کی روش کے مطابق درس کا سلسلہ شروع کیا، مولانا نے کن مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں اس کی تفصیل بھی نہیں ذکر کی ہے اس سلسلے میں بس اتنا لکھا ہے کہ ”در مدارس اسلامی وسرکاری تعلقے خاص وارتباطے اختصاص

(۱) مولانا آل احمد بن محمد امام بن نعمت اللہ بن مجیب اللہ جعفری پھلواروی ثم مہاجر مدنی، اپنے عہد کے محدث کبیر تھے، ان کی ولادت اور نشوونما موضع پھلواری ضلع پٹنہ بہار میں ہوئی، ایام جوانی ہی میں حرمین شریفین چلے گئے تھے اور حج وزیارت کے بعد مدینہ منورہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے وہیں حدیث وفقہ کی تعلیم شیخ محمد بن یحییٰ البجیلی مغربی سے حاصل کی، شیخ آل احمد کو ان کے علاوہ حصن حصین کی اجازت شیخ محمد اکرم لاہوری سے حاصل تھی۔ ۱۶ر شعبان ۱۲۹۶ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی (نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴)

شیخ آل احمد مدینہ منورہ کے قیام کے زمانہ میں دوبار ہندوستان تشریف لائے اور دونوں مرتبہ ایک اچھے عرصے تک یہاں قیام کیا اسی دوران ہندوستان کے بہت سے علماء نے ان سے حدیث پڑھ کر سند واجازت لی انھیں علماء میں سے ایک مولانا قائم علی عباسی متوفی بھی ہیں۔

(۲) مولانا شاہ معین الدین بن شاہ خیرات علی کا آبائی وطن کڑا مانک پور تھا، لیکن احمد آباد نارہ کی مشہور خانقاہ کے سجادہ نشین تھے اس لئے نارہ کو وطن بنا لیا تھا، مولانا مرزا حسن علی محدث لکھنوی، مولانا رخصتی ظہور اللہ فرنگی محلی وغیرہ سے علوم کی تحصیل کی تھی، جملہ عقلی ونقلی میں دستگاہ رکھتے تھے بالخصوص فن ریاضی میں تو شہرۂ آفاق تھے، حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف تھے، اس مبارک سفر کے موقع پر وہاں کے علماء ومحدثین سے حدیث پاک کی سند واجازت بھی حاصل کی تھی ۳ر ربیع الاول ۱۳۰۴ھ کو احمد آباد نارہ میں فوت ہوئے۔ (تذکرہ علمائے ہند مولفہ مولانا رحمان علی ص ۲۲۹)

اختیار نمودیم و مدتے قیام پزیر بودیم، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو مدارس کی ملازمت سے کچھ بے اطمینانی رہی اس لئے اس مشغلہ کو موقوف کر دیا۔

ان مدارس سے الگ ہو جانے کے بعد خود ایک مدرسہ بنام مدرسہ اسلامیہ عباسیہ قاضی پور ضلع سارن بہار میں قائم کیا، اور خود اللہ کا نام لے کر کتب دینیہ کے مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں لگ گئے، اسی کے ساتھ کتب حدیث و تفسیر کا لوجہ اللہ گھر پر درس بھی دیتے تھے، البتہ گذر اوقات کے لیے روزانہ دو چار گھنٹے مطب میں بیٹھتے تھے، مولانا کثیر المطالعہ تھے خود لکھتے ہیں:

اکنوں کہ عبور و عشور بر دواوین اسلام، مصنفات و مولفات فضلاء اعلام کی شمارش تقریباً چہار پنج صد است وست بہم داد، اسی کثرت مطالعہ کے ثمرہ و نتیجہ میں ان کے قلم سے مختلف موضوعات پر پچاس سے زیادہ رسائل و کتب منصۂ شہود پر آئیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:
و تالیفات فقیر از صغیر و کبیر در علوم رسمیہ صرف، ونحو، ومنطق، وفلسفہ، وطب، وفقہ وغیر ذلک بقلم آمدہ مجموعہ آن زیادہ بر پنجاہ رسائل است۔

ان پچاس سے زائد کتابوں میں سے چند یہ ہیں:

(۱) اقامۃ الحجۃ فی ابطال مجلس مخصوصہ (۲) اقوال الصالین فی کیف اجتہاد المقلدین، (۳) اقامۃ الحجۃ علی ان صلوٰۃ التراویح لیس ببدعۃ، (۴) الشمس المنیر ہ یہود و نصاریٰ وغیرہ کو ابتداء بالسلام اوران کے ساتھ کھانے پینے وغیرہ کے احکام و مسائل میں (۵) نکتۂ لطیفہ در تقویت تقویۃ الایمان (۶) احکام المصافحہ مصافحہ اور معانقہ کے احکام میں (۷) الوسیلۃ الوسائل فی معرفۃ الاوائل (۸) زبدۃ الوسائل فی معرفۃ الاوائل (۹) التعلیقات الوسائل فیما یتعلق بالاوائل، یہ تینوں رسائل عربی میں ہیں، اور ہر شئ کی اولیات کے بیان میں ہیں (۱۰) خوافص علی الروافض، شیعوں کے رد میں ہے، اس رسالہ کے بارے میں مولانا خود لکھتے ہیں رسالہ ایست دلپذیر در معنی خود بے نظیر اسم با مسمّٰی وغیرہ۔

مولانا کے جد اعلیٰ جو ظفر آباد سے ترک سکونت کر کے مئو میں آبسے تھے وہ خواجہ مخدوم عباسی بن شیخ رکن الدین یک لکھی ہیں، سلاطین شرقیہ کے زمانہ میں خواجہ مخدوم پرگنہ

مئو کے منصب قضا پر فائز ہوئے تھے، اسی تقریب سے مئو کو وطن بنالیا تھا، بعد میں یہ قضا کا منصب عہد بعہد سلسلہ وار ان کے خاندان میں قاضی غلام معین الدین تک قائم رہا، ان کے بعد مولوی معشوق علی، پھر ان کے صاحبزادے شیخ طاہر علی، اور طاہر علی کے لڑکے رعب علی مولانا کے والد بزرگوار نہ جانے کن وجوہ سے اس اعزاز سے محروم رہے۔ بالآخر ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۲ء کو حاکم پرگنہ سید ضامن علی کی مساعی سے برطانوی حکومت کی طرف سے مولانا موصوف کو پرگنہ مئو کا عہد قضا سپرد ہوا، اس طرح سے خاندان کی قدیمی عزت ووجاہت پھر گھر میں لوٹ آئی۔

مولانا قائم علی عباسی رحمہ اللہ سے متعلق یہ جملہ معلومات خود انھیں کے ایک مضمون سے ماخوذ ہے جسے مولانا نے ۲۹/رمضان یوم دوشنبہ ۱۳۱۵ھ کو لکھا تھا۔ چنانچہ اس سوانحی تحریر کے آخر میں لکھتے ہیں ''المرقوم ۲۹/رمضان یوم دوشنبہ ۱۳۱۵ھ'' پھر یہ تحریر ان کی مؤلفہ کتاب ''ذاہب السیئات'' کے آخر میں ۱۳۱۷ھ میں شائع ہوئی۔

محدث جلیل ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی قدس سرہ کی ایک یادداشت سے معلوم ہوا کہ مولانا قاضی قائم علی عباسی مرحوم کی وفات ۱۳۴۲ھ میں ہوئی۔

مولوی قمر الدین املویؒ

مولوی قمر الدین بن شیخ علیم اللہ بن شیخ حسن علی املوی کے والد شیخ علیم اللہ انسپکٹر پولیس اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی قدس سرہ سے بیعت تھے، شریف الطبع اور نیک آدمی تھے۔

مولوی قمر الدین املوی نے اولاً مولانا عبدالعلیم رسول پوری سے نحو وصرف کی تعلیم حاصل کی، بعد میں دارالعلوم ندوہ میں داخل ہوکر سندِ فراغت حاصل کی، مولانا سیّد سلیمان ندویؒ کے معاصر تھے، بڑے ذہین وطباع عالم تھے، افسوس کہ جوانی ہی میں انتقال کر گئے۔ (تذکرہ علمائے مبارک پور ص ۲۳۲)

☆ ☆ ☆

مولانا قمر الزماں مئوی رحؒ

مولانا قمر الزماں بن محمد ادریس دار العلوم مئو ضلع اعظم گڈھ کے موجودہ نائب ناظم مولانا بدیع الزماں کے بڑے بھائی تھے اور اپنے وقت کے باصلاحیت علماء میں شمار ہوتے تھے، ۱۳۲۳ھ میں محلہ رسول پورہ قصبہ مئو میں آپ کی ولادت ہوئی، مکتبی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد دار العلوم مئو میں داخل ہوئے اور گیارہ برس کی مسلسل جدوجہد کے بعد ۱۳۴۴ھ میں فارغ التحصیل ہو گئے، ایک سال کے علاوہ ان کی تعلیم و تحصیل کی زندگی کل کی کل دار العلوم مئو ہی میں گذری، آپ کے اساتذہ میں تو اس وقت کے دار العلوم کے سبھی مدرسین ہیں، لیکن ان میں محدّث عصر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور مولانا کریم بخش سنبھلی بڑی اہمیت وشہرت کے مالک ہیں، انھیں حضرات سے مولانا نے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔

چونکہ ذہانت وفطانت کے اعتبار سے اپنے رفقاء میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے اس لیے فارغ ہونے کے بعد ارباب دار العلوم نے انھیں تدریسی خدمت کے لیے منتخب کرلیا، چنانچہ ۱۳۴۵ھ سے باقاعدہ اسی دار العلوم میں آپ مدرس ہو گئے اور زندگی کے آخری ایام تک اس علمی خدمت کو انجام دیتے رہے۔ یوں تو مولانا ہر فن میں کامل الاستعداد تھے، لیکن منطق وفلسفہ میں یکتائے زمانہ تھے، اسی لیے ہمیشہ معقولات کی اعلیٰ اور اہم کتابیں آپ ہی کے زیر درس رہتی تھیں۔

تعلیم کے ساتھ طلباء کی تربیت کا خاص اہتمام فرماتے تھے، جو تلامذہ کسی دوسرے ادارے میں چلے جاتے تھے انھیں بھی خطوط کے ذریعہ اساتذہ کے ادب واحترام اور مطالعہ کتب کی ہدایت کرتے رہتے تھے، ساتھ ہی آپس میں اتفاق واتحاد کے ساتھ رہنے کی تاکید کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ۱۳۶۰ھ میں جب آپ کے شاگرد رشید مولانا شیخ محمد مئوی رحؒ اور مولوی احمد اللہ وعبد الستار صاحبان دار العلوم دیوبند میں پڑھنے کے لیے گئے تو انھیں ایک خط لکھتے ہیں:

"آپ تینوں حضرات سے گذارش ہے کہ جس قدر وقت خرچ کرسکیں، اسباق اور تکرار اور مطالعہ میں خرچ کریں، فضول وقت ضائع نہ کریں یہ وقت پھر ہاتھ آنے کا نہیں خوب کوشش سے علم حاصل کرنے میں لگے رہیں، کسی سوسائٹی میں شریک نہ ہوں اور آپس میں کم از کم خوب میل محبت سے رہیں، ایک دوسرے کی حمایت اور ہمدردی لازمی چیز ہے۔" (مکتوب ۲۸ر شوال ۱۳۶۰ھ)

مولانا قمرالزماں صاحب مرحوم علمی صلاحیت کے ساتھ عملی میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے، اگر عمر نے وفا کی ہوتی تو آج اپنے دیار کے مشاہیر علماء میں سے ہوتے، لیکن افسوس کہ ۳۹ برس کی قلیل عمر میں ۱۳۶۲ھ آپ کا انتقال ہوگیا، آپ کے تلامذہ میں مولانا شیخ محمد مئوی، مولانا منظور احمد بہرائچی، مولانا عبداللطیف بہاری، مولانا احمد اللہ مئوی نے علمی دنیا میں خوب شہرت و مقبولیت پائی۔

=============

ک

مولانا کرامت اللہ چریاکوٹیؒ

مولانا کرامت اللہ بن شیخ احمد ملیح عباسی چریاکوٹی اپنے دور و دیار کے علماء کبار میں تھے علوم معقول و منقول میں انھیں کامل دسترس حاصل تھی، بچپن ہی میں سایہ پدری سے محروم ہوگئے تھے، لیکن علم کے شائق تھے اس لیے یتیمی و ناداری کا خیال کیے بغیر کمسنی ہی میں جون پور چلے گئے اور وہاں ملا محمد عسکری جونپوری متوفی ۱۱۹۰ھ سے چند کتابیں پڑھ کر اس وقت کے مشہور معقولی عالم ملا احمد اللہ سندیلوی کی خدمت میں پہونچے، مولانا کرامت اللہ بڑے ذہین تھے اس لیے فاضل استاذ نے خصوصی توجہ اور شفقت و محبت سے تعلیم دی اور جب مولانا نے تعلیم مکمل کرلی تو اپنے لائق شاگرد کی عبقریت علمی کو ظاہر کرنے کی غرض سے ملا احمد اللہ نے جلسۂ دستار بندی کا نظم کیا جس میں دیار و امصار کے تقریباً تین سو علماء و طلبہ نے شرکت کی اور حاضرین میں سے اکثر نے مولانا کرامت اللہ سے مختلف علوم و فنون

کے مسائل پر مباحثہ ومذاکرہ کیا، مولانا نے ہر مسئلے پر سیر حاصل بحث کی، جسے دیکھ کر تمام حاضرین ان کی حاضر دماغی اور تبحر علمی پر عش عش کرنے لگے۔

فراغتِ تعلیم کے بعد چند مہینے طلب معاش کے سلسلے میں مولانا نے لکھنؤ قیام کیا، وہاں کے ایک رئیس نے ان کی علمی صلاحیت دیکھ کر ازراہ قدردانی ایک قطعہ اراضی بطور جاگیر کے دے دی، جس کی سالانہ آمدنی دو ہزار روپے تھی، اب مولانا کرامت اللہ معاش کی طرف سے بالکل مطمئن ہو چکے تھے اس لیے گھر آکر اطمینان کے ساتھ درس وتدریس میں مصروف ہو گئے، قدرت نے علم وفضل کے ساتھ دنیوی وجاہت سے بھی حصہ وافر عطا کیا تھا، چنانچہ آخر عمر تک نہایت عزت ووقار کے ساتھ علوم وفنون کی خدمت کرتے رہے اور اسی شغل میں مصروف رہتے ہوئے تقریباً سو برس کی عمر پا کر ۱۲۵۱ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

(تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷ و نزہۃ الخواطر ص ۳۹۷ ج ۷)

==============

﴿۴﴾

شیخ مبارک چشتی سکندر پوریؒ

شیخ مبارک چشتی کا اصل وطن ملک عدن تھا، ۹۰۰ھ میں ہندوستان وارد ہوئے اور سکندر پور ضلع اعظم گڈھ کو اپنی روحانی سرگرمیوں کا مرکز بنایا، آپ اولیائے کاملین میں سے تھے اور سلسلۂ چشتیہ کے اہم مشائخ میں آپ کا شمار ہوتا تھا، بادشاہ وقت نے بطور مدد معاش اور خانقاہ کے اخراجات کے لیے سکندر پور اور اس سے ملحق بہت سے گاؤں آپ کو دیا تھا، ہزاروں لوگوں نے آپ سے باطنی فیوض حاصل کیے ۱۰۱۶ھ میں آپ کا وصال ہوا، سکندر پور میں آسودۂ خاک ہیں، مزار پر انوار بھی مرجع خلائق ہے، کسی نے یہ تاریخ رحلت لکھی ہے۔

بزرگے در سکندر پور مشہور — قناعت پیشہ و در فقر مسرور
اگر سال وفاتش را بجویند — مبارک رفت از دنیا بگویند

شیخ تاج محمد آپ کے فرزند بھی بڑے صاحب علم وکمال تھے ۱۰۴۷ھ میں ان کی وفات ہوئی اپنے والد کے متصل مدفون ہوئے۔ (برکات اولیاء مصنفہ امام الدین گلشن آبادی ص ۹۳)

اس سے زیادہ ان کے حالات معلوم نہیں۔

شیخ مبارک محمدی خیر الدین پوری ماہلیؒ

شیخ مبارک بن شیخ خیر الدین محمدی ماہلی شیخ صدر الدین قریشی ظفر آبادی کی اولاد سے ہیں ان کے والد شیخ خیر الدین ظفر آباد سے ترک وطن کر کے پرگنہ ماہل میں چلے آئے تھے اور اس کے قریب اپنے نام پر خیر الدین پور گاؤں آباد کر کے باپ بیٹے یہیں رہنے لگے تھے، موضع خیر الدین پور کوہنڈہ سے جانب شمال مغرب تقریباً دو ڈھائی میل کے فاصلہ پر واقع ہے، بستی سے باہر قریب ہی قدیم عمارت کے تھوڑے بہت نشانات اور پرانی پختہ ٹوٹی پھوٹی قبریں آج سے تیس بتیس سال پہلے تک موجود تھیں۔ شیخ مبارک نے بعض کتابیں اپنے والد سے پڑھیں پھر جونپور جا کر وہاں کے اساتذہ وشیوخ سے تحصیل وتکمیل کی۔

اوائل عمر میں شیخ مبارک دیسی شراب (جسے عوام تاڑی کہتے ہیں) کے عادی ہو گئے تھے اور برملا دعویٰ کرتے تھے کہ: "کسے از روئے بحث علم شراب دیار ما حرام گرداند"

ان کے والد شیخ خیر الدین نے حضرت میر علی عاشقاں سرائے میریؒ متوفی ۹۵۰ھ کی خدمت میں دعا کی درخواست کی کہ ان سے یہ بُری لت چھوٹ جائے، بالآخر اللہ تعالیٰ نے توبہ کی توفیق سے نوازا اور تائب ہو کر میر علی عاشقاں کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے اور ایک دن خلافت ومشیخت کے بلند مرتبہ سے سرفراز ہوئے۔ میر علی عاشقاں شیخ مبارک کا غایت درجہ احترام ولحاظ کرتے تھے، چنانچہ رسالۂ عاشقیہ میں ہے کہ: میر علی عاشقاں حالتِ جذب میں اکثر سرخ لباس زیب تن فرمالیا کرتے تھے، لیکن جس وقت شیخ مبارک حاضر ہوتے تو فرماتے:

"شیخ ما می آید واو بر شرعِ محمدی ثابت قدم است، حضورِ او لباس نامشروع نباید پوشید"

اور فوراً مجلس سے اٹھ کر لباس تبدیل فرماتے، پھر مجلس میں آ کر خاموش بیٹھ جاتے۔

رسالۂ عاشقیہ میں یہ بھی ہے کہ شیخ مبارک کو محمدی کا خطاب میر علی عاشقاں نے نبی کریم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اشارہ پر دیا تھا۔ ان کی شان میں علی عاشقاںؒ اکثر فرمایا کرتے تھے:

"شیخنا اہلِ طریقت و ہم اہل شریعت است۔"

میر صاحب کے حکم سے آخر میں شیخ مبارک جون پور منتقل ہو گئے تھے اور وہیں محلہ سپاہ میں خانقاہ تعمیر کی اور علائق دنیا سے یکسو ہو کر زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں پوری زندگی گذار دی، آپ کی ذات سے ایک کثیر جماعت نے فیض اٹھایا، تجلی نور میں ہے کہ شیخ مبارک نے ارشاد و تلقین اور باطنی اشغال کے ساتھ تعلیم و تدریس اور ظاہری علوم کا مشغلہ بھی جاری رکھا ان کی خانقاہ علمی درس گاہ اور روحانی تربیت گاہ دونوں تھی۔ ۱۴ رشوال ۹۸۳ھ میں فوت ہوئے اور اپنی خانقاہ کے متصل دفن ہوئے، زمانہ کے دستبرد سے اب نہ تو خانقاہ ہی کا نشان باقی ہے اور نہ مزار کا۔

بعد از وفات تربت ما درز میں مجو　　　　در سینہائے محرم عارف مزار ما است

مولانا محمد درویش نونہروی جون پوریؒ آپ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، شیخ مبارک نے اپنی صاحبزادی کا عقد ان سے کر دیا تھا اس لیے نونہرہ ضلع غازی پور سے ترک وطن کر کے جون پور ہی میں رہ پڑے تھے، انھوں نے بھی اپنے استاذ و شیخ کی طرح پوری زندگی ارشاد و تلقین اور درس و تدریس میں گزار دی۔

(رسالۂ عاشقیہ قلمی ص ۴۳ و مظہر الاحدیہ ص ۱۸۶ و نزہۃ ص ۲۷۸ ج ۴)

مولانا مجتبیٰ عباسی چریا کوٹی

مولانا مجتبیٰ عباسی چریا کوٹی کے والد ماجد کا اسم گرامی مفتی محمد یحییٰ عباسی ہے، ان کی پیدائش گیارہویں صدی کے نصف اوّل میں چریا کوٹ میں ہوئی، آغاز شباب ہی میں فضل و کمال کے بلند مرتبہ پر پہونچ گئے تھے، آپ کے علمی تبحر اور جلالت شان کی خبر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر متوفی ۱۱۱۸ھ کو پہونچی تو عزت و احترام کے ساتھ طلب فرمایا اور میر سامانی کے منصب پر مقرر کر دیا، پھر کچھ دنوں کے بعد شاہزادہ معظم کی اتالیقی سے سرفراز کیا، روزینہ کے علاوہ ایک لاکھ روپے منافع کی معافی بھی شاہ آباد ترہٹ میں عطا ہوئی، مولانا

مجتبیٰ نے بڑے عزت ووقار کے ساتھ زندگی بسر کی ہمیشہ تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دیتے رہے، تصانیف میں ایک رسالہ سیف مسلول (فرقۂ اثناعشریہ کے بعض اعتراضات کے جواب میں) اور رسالہ رضوانی معروف بہ میراث نامہ اور نسخۂ تعلیقات (علم حکمت) آپ کی یادگار ہیں۔ (اسلام اور عصر جدید جولائی ۱۹۷۲ء)

شیخ محمد عباسی چریا کوٹیؒ

شیخ فاضل مولانا محمد بن عاشق محی الدین بن مخدوم زادہ ابوالجلال اسماعیل عباسی کبار فقہائے احناف میں شمار ہوتے ہیں، آپ کی نشو ونما چریا کوٹ میں ہوئی اور یہیں کے اساتذہ سے تعلیم وتحصیل کی فراغتِ تعلیم کے بعد اپنے آباء واجداد کے طریق پر تعلیمی وتدریسی مشغلہ اختیار کیا اور چریا کوٹ میں علومِ عربیہ کی ایک عظیم درس گاہ قائم کی، پوری عمر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں گذار دی، بے شمار طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا، متعدد کتابیں بھی لکھیں جن میں تفسیر محمدی، الجواہر العربیہ فی فنون الادبیہ، الکوکب الدری (میراث میں) اور حاشیۂ تلویح (اصول فقہ) کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے۔ آپ کی وفات ۹۷۲ھ میں ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر ص ۳۰۲ ج ۴ و اسلام اور عصر جدید ماہ جولائی ۱۹۷۳ء)

مولوی محمد خاں چھتے پوریؒ

چھتے پور موضع بکھرا سے جانب مشرق تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی ہے، مولوی محمد خاں اسی بستی میں پیدا ہوئے، ابتداءً مکتب کی تعلیم مکمل کر کے تعلیمی سلسلہ ختم کر دیا اور حصول معاش کی غرض سے اپنے بڑے بھائی کے ہمراہ برما چلے گئے۔

مزاج میں خیر وصلاح بچپن ہی سے تھا اس لیے علماء سے تعلق کے ساتھ اردو کی دینی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے، اثنائے مطالعہ میں انھیں کوئی دعا ملی جس کے فضائل کے سلسلے میں مصنف نے لکھا تھا کہ اس دعا کو پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے جس مقصد کو بھی طلب کیا جائے انشاء اللہ وہ حاصل ہو جائے گا۔ مولوی صاحب نے اسی وقت اس دعا کو پڑھ کر یہ دعا کی کہ اے اللہ مجھے علم دین کی دولت سے بہرہ مند بنا و نیز میرا خاتمہ ایمان پر کیجیے۔ دعا

مقبول ہوگئی جس کا اثر یوں ظاہر ہوا کہ اب کاروبار کی جانب سے دل ہٹ کر تعلیم کی جانب ہوگیا، اور برما کی زندگی جہاں ہر طرح کا اطمینان وسکون حاصل تھا ان پر بار ہوگئی اس لیے اپنے بڑے بھائی سے اجازت لے کر گھر چلے آئے اور اپنے جوار کے مشہور عالم وشیخ حضرت مولانا عبدالرحمٰن بکھراوی سے عربی وفارسی کی تحصیل شروع کردی اور محنت وجانفشانی کے ساتھ چند سال میں مختصر المعانی، شرح جامی، اور شرح وقایہ وغیرہ کو پڑھ لیا اسی اثناء میں مولانا بکھراوی مرض وفات میں مبتلا ہوگئے اور ضعف ونقاہت کی وجہ سے تدریسی کام بالکل بند کردیا، اس لیے مولوی محمد صاحب وہاں سے پھولپور حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری کے مدرسے میں چلے آئے اور تقریباً دو سال حضرت پھولپوری کی خدمت میں رہ کر، مشکوٰۃ، جلالین وغیرہ منتہی کتابوں کو پڑھا۔ چونکہ حضرت پھولپوری کے یہاں رہنے اور کھانے کا کوئی نظم نہیں تھا اس لیے اس دو سال کی مدت میں مولوی محمد صاحب کا قیام راقم کے وطن جگدیش پور میں شیخ عبدالمجید مرحوم کے یہاں رہا، مولوی صاحب کے دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ مولوی صاحب پڑھنے میں بڑی محنت کرتے تھے، گاؤں کی جامع مسجد میں ۲، ۲ بجے رات تک کتابوں کے مطالعہ میں مستغرق رہتے، اسی طرح فجر بعد بھی ناشتہ تیار ہونے تک لوگوں کے ساتھ گپ شپ کرنے کے بجائے کتابیں ہی دیکھتے رہتے تھے۔

غرض مشکوٰۃ وغیرہ مکمل کرکے سہارنپور تشریف لے گئے اور ایک سال تک مظاہر علوم میں رہ کر حضرت مولانا خلیل احمد (۱) محدث سہارنپوری سے دورۂ حدیث پڑھ کر ۱۳۳۴ھ

(۱) حضرت اقدس مولانا الحاج الشاہ خلیل احمد بن شاہ مجید علی بن شاہ احمد علی انبہٹہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے، کلام مجید اور فارسی وعربی کی ابتدائی تعلیم قصبہ انبہٹہ اور نانوتہ میں حاصل کی، میزان الصرف، صرف میر، پنج گنج وغیرہ گوالیار میں پڑھا ۱۲۸۳ھ میں جب دارالعلوم دیوبند قائم ہوا تو آپ اس میں داخل ہوگئے، لیکن آب وہوا موافق نہ آنے کی وجہ سے چھ ماہ بعد سہارنپور مظاہر علوم میں چلے آئے اور یہیں جملہ علوم وفنون پڑھ کر انیس سال کی عمر میں فارغ ہوگئے۔ فراغت ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء میں ہوئی بعد ازاں علوم ادبیہ کی تکمیل کے لیے حضرت مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی خدمت میں کچھ دنوں رہے، آپ نے منگلور، بھوپال، بھاولپور بریلی اور دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمت انجام دینے کے بعد اپنے پیر مرشد حضرت گنگوہی کے حکم سے مظاہر میں تدریسی وتعلیمی سلسلہ شروع کیا جو کامل اکتیس سال تک جاری رہا، بعد ازاں ۱۳۴۴ھ میں ہجرت کرکے مدینہ منورہ چلے گئے اور تقریباً دو سال وہاں قیام فرماکر پندرہ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ چہارشنبہ کو مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے تذکرۃ الخلیل)

میں فاتحۂ فراغ پڑھی۔ فراغت کے بعد اپنے کاروبار کے سلسلے میں پھر برما چلے گئے۔ ۱۳۴۹ھ میں جب حضرت پھولپوری قدس سرہ نے مدرسہ بیت العلوم سرائے میر کی بنیاد رکھی تو انھیں مدرسہ میں بلالیا۔ مولوی صاحب نے مدرسہ کی تعمیر وترقی میں بڑی نمایاں خدمات انجام دیں، دن کو طلبہ کو اسباق پڑھاتے اور رات میں مدرسہ کی تنظیم کے سلسلے میں قرب وجوار کی بستیوں کا دورہ کرتے، اس طرح سے انتھک محنت وکاوش سے مدرسہ کو دیار میں روشناس کردیا، آخر میں اپنی نجی ضرورتوں کے تحت مدرسہ سے مجبوراً الگ ہوکر مانی کلاں جونپور کے مدرسہ میں چلے گئے، مگر وہاں کی آب وہوا آپ کو راس نہ آئی اور بیمار ہوکر گھر چلے آئے بالآخر گھر ہی پر ۱۳۵۳ھ میں انتقال کیا۔ (از مولانا عبدالقیوم صاحب ودیگر حضرات)

مولانا محمد احسن چریا کوٹیؒ

مولانا محمد احسن عباسی چریاکوٹی کی ذات گرامی اپنے وقت میں ذہانت وفطانت میں نادرۂ روزگار تھی، قوت حافظہ اتنا قوی تھا کہ جس کتاب کو دیکھتے اس کی عبارت تک ذہن نشین ہوجاتی تھی، انھوں نے ملا نظام الدین فرنگی محلی متوفی ۱۱۶۱ ہجری سے علوم متداولہ کی تحصیل وتکمیل کی تھی، زمانۂ تحصیل میں کبھی استاذ کے سامنے کتاب کھول کر نہیں پڑھا، تمام کتابیں زبانی پڑھتے تھے، عبارت کے ساتھ مضامین کی تقریر بھی کرتے جاتے تھے اس لیے دیکھنے اور سننے والے یہ سمجھتے تھے کہ یہ پڑھی ہوئی کتابیں دہرا رہے ہیں، حالانکہ بات یہ نہ تھی بلکہ مولانا اپنی ذہانت وذکاوت سے مطالعہ ہی کے وقت تمام مباحث کو حل کرلیا کرتے تھے، مولانا کی اس تیزئ خاطر کے بارے میں مولانا رحمٰن علی متوفی ۱۳۰۵ھ نے تذکرہ علمائے ہند میں ایک لطیفہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ملا حسن (۱) شارحِ سلّم العلوم نے مولانا محمد احسن کو

(۱) ملا حسن بن قاضی غلام مصطفیٰ بن اسعد بن قطب الدین سہالویؒ نے علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل ملا کمال الدین فتحپوری اور ملا نظام الدین فرنگی محلی سے کی تھی، آپ کے تبحر کا یہ عالم تھا کہ اگر ملا حسن، ابن سینا سے معقولات میں مقابلہ کرتے تو ان پر غالب آجاتے، عرصۂ دراز تک فرنگی محل لکھنؤ میں تدریس وتالیف کا سلسلہ جاری رکھا، لیکن بعد میں ایک مذہبی مناقشہ کی وجہ سے ترک وطن پر مجبور ہوئے اور پوشیدہ طور پر دلی چلے گئے، پھر یہاں سے ضابطہ خاں بن نجیب الدولہ کی دعوت پر ان کے پاس چلے گئے اور اپنے استاذ شیخ کمال الدین کی جگہ پر دارانگر (متصل نجیب آباد) کے مدرسہ میں مدرس مقرر ہوئے، آخر عمر میں رامپور چلے آئے تھے، یہیں ۳؍صفر ۱۲۰۹ ہجری میں وفات پائی۔ (تذکرہ علمائے ہند وظفر المحصلین ص ۳۲۵ تا ص ۳۲۷)

عادت کے مطابق کتاب بند کیے استاذ کے سامنے پڑھتے ہوئے دیکھ کر کہا:

"از تو غبی ترکیست کہ کتاب خواندہ می خوانی" (تم سے بڑھ کر کند ذہن کون ہوگا کہ پڑھی ہوئی کتاب پھر سے پڑھ رہے ہو)

مولانا نے برجستہ جواب دیا کہ آپ! کیونکہ مجھے اپنے جہل کا علم ہے اس لیے اس کی اصلاح کی فکر میں ہوں اور آپ کو تو اس کی بھی خبر نہیں، نتیجہ یہ ہوگا کہ زندگی بھر نادانی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گھرے رہیں گے، یہ جواب سنتے ہی ملا حسن خاموش ہو گئے۔

تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد مولانا نے دارالسلطنت دہلی کا سفر کیا اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر تھوڑے ہی دنوں میں اپنے معاصرین سے بہت آگے نکل گئے اور حکومت میں خاص اثر ورسوخ پیدا کرلیا، مولانا کی یہ پیش قدمی معاصرین کو بہت کھٹکی، بالآخر انھیں کھانے میں زہر دے دیا گیا، جو سم قاتل تھا اس لیے مولانا جانبر نہ ہو سکے، اہل تذکرہ لکھتے ہیں کہ مولانا محمد احسن جس وقت زہر کے اثر سے حیات وموت کی کشاکش میں مبتلا تھے، عین اسی حالت میں آپ کے گھر سے ایک خط آیا، مرحوم نے خط کو دیکھا اور اس کے جواب میں یہ شعر پڑھا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

از حیاتم رمقے بود کہ یادم کردی! بہر تشخیص نفس آئینہ شد نامہ تو!!

(تذکرہ علماء ہند ص ۶۷ اونزہہ ص ۲۶۸ ج ۸)

مولانا حکیم محمد احمد لہراویؒ

حضرت مولانا حکیم محمد احمد لہراوی کا قدیم نام بخشیش احمد ہے عوام میں اسی نام سے مشہور تھے، مگر وہ خود اپنا نام محمد احمد لکھتے تھے، ان کی پیدائش لہرا میں تیرہویں صدی کے نصف آخر میں ہوئی، ابتدائی حالات معلوم نہ ہو سکے۔ اہل حدیث مسلک کے مشہور علماء میں تھے، زہد وتقویٰ، سادگی، علم وفضل میں سلف صالحین کا نمونہ تھے، تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ کسی سفر میں کسی مسافر کا لوٹا بھولے سے لیتے آئے یا وہ خود بھول گیا اور لقطہ کے طور پر اسے اپنے ساتھ رکھ لیا، ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ "تقریباً بیس سال سے وہ لوٹا

گھر میں رکھا ہوا ہے، والد صاحب فرماتے تھے کہ ہوسکتا ہے کہ اس کا مالک تلاش کرتے کرتے آجائے تو اسے دے دیا جائے گا۔"

مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں تدریسی خدمت انجام دیتے تھے اور طالب علموں کی دینی تربیت پر خاص نظر رکھتے تھے، ان کے ساتھ بڑی شفقت ومحبت سے پیش آتے تھے، علم نحو وصرف پر چند رسالے بھی تصنیف کیے، جن میں الطریقۃ المرضیہ عربی زبان میں اور جامع النحو اردو میں ہیں۔

آخر عمر میں قوت سماع سے بڑی حد تک محروم ہو چکے تھے۔ آلہ مکبّر الصوت ہر وقت ہاتھ میں لیے رہتے تھے اور دوسروں کی بات سنتے وقت اسے کانوں پر رکھ لیا کرتے تھے۔

تقریباً اسّی سال کی عمر میں مدرستہ الاصلاح سرائے میر کے قریب راجہ پور سکرور نامی گاؤں میں ۱۵ر شوال المکرّم ۱۳۶۸ ہجری میں انتقال فرمایا۔

(تذکرہ علمائے مبارک پور ص ۲۱۱ ومعارف شمارہ دسمبر ۱۹۷۵ء)

مولانا محمد ادریس پھول پوریؒ

مولانا محمد ادریس بڑے باصلاحیت اور جید الاستعداد عالم تھے، آپ موضع ٹیونگا کے رہنے والے تھے، جو قصبہ پھول پور کے ریلوے اسٹیشن سے جانب شمال تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ حضرت مولانا شاہ عبد الغنی پھول پوری سے آپ کے بڑے گہرے مراسم تھے، آپ کی علمی یادگار میں دو مطبوعہ کتابیں ہیں، ایک تفسیر سورۂ یوسف اور دوسری مجموعہ دعائے ماثورہ۔ آپ کا ذاتی کتب خانہ بھی تھا، جسے ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے صاحبزادہ نے مولانا عبد الحلیم فیض آبادی ناظم مدرسہ ریاض العلوم گورینی جون پور کو دے دیا۔ تفصیلی حالات معلوم نہ ہوسکے۔

مولانا محمد اسحاق کوپا گنجیؒ

مولانا محمد اسحاق بن ضیاء الدین بن شیخ بچن باختلاف روایت ۱۲۷۲ ہجری یا

۱۲۷۶ ہجری میں قصبہ کوپاگنج ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی مکتبی تعلیم گھر ہی پر مکمل کر کے چشمہ رُحمت غازی پور میں داخلہ لیا اور وہاں کے اساتذہ بالخصوص مولانا حافظ عبداللہ غازی پور سے علوم وفنون کی تکمیل کی پھر حدیث کی تحصیل کی غرض سے دہلی کا سفر کیا اور مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے حلقۂ درس میں شامل ہوکر حدیث کی کتابیں پڑھیں اور ۱۲۹۶ھ میں فارغ التحصیل ہوکر وطن واپس ہوئے، فراغت کے بعد ایک عرصہ تک مدرسہ چشمہ رُحمت میں تعلیمی خدمات انجام دیں پھر اہل وطن کی خواہش پر یہاں سے علیحدہ ہوکر مقامی مدرسہ مصباح العلوم کوپاگنج میں مدرس ہوئے، ابتدائی نحو وصرف کی تعلیم میں انھیں بڑا ملکہ حاصل تھا، جس طالب علم کو پڑھا دیا اسے صیغوں کی معرفت اور عبارت کی صحت پر پوری قدرت حاصل ہوگئی۔ مولانا اسلام الحق کوپاگنجی استاذ دارالعلوم دیوبند نے مصباح العلوم ہی میں آپ سے میزان سے ہدایۃ النحو تک کی تعلیم حاصل کی تھی، مولانا ان کے طریقۂ درس کی بہت تعریف کرتے تھے۔

مصباح العلوم سے علیحدگی کے بعد محلہ اورنگ آباد قصبہ مئو میں تعلیمی وتدریسی سلسلہ شروع کیا۔ آپ کے درس سے اہل مئو کو بڑا فیض پہونچا اور کثیر جماعت نے آپ سے استفادہ کیا، جن میں مولوی محمد صابرؒ والدِ ماجد محدّث عصر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا ابوالقاسم مئوی، مولانا محمد ایوب، مفتی خلیل احمد، مولانا فیض اللہ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

غرض مولانا محمد اسحاق نے علماء وصلحاء کے طرز پر پوری زندگی تعلیم وتدریس میں گذار کر انہتر (۶۹) برس کی عمر میں کوپاگنج میں وفات پائی اور اپنے آبائی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

مولانا محمد اسلم بندویؒ

مولانا محمد اسلم بندویؒ اس دیار کے علماء احناف میں علم وحکمت وفلسفہ میں امتیازی شان کے مالک تھے، اپنے دور میں علومِ عقلیہ کے امام مانے جاتے تھے۔

حضرت مولانا بحر العلوم عبد العلی (۱) فرنگی محلی متوفی ۱۲۲۵ ہجری کے ارشد تلامذہ میں تھے، مولانا موصوف کے علاوہ دیگر اساتذہ سے بھی اخذ فیض کیا تھا۔

مولانا محمد اسلمؒ نے علامہ ابوعلی القوشجی کے رسالہ المعروف بہ رسالہ قوشجیہ کی ایک مختصر شرح ۱۲۰۵ ہجری میں تصنیف کی تھی۔ (نزہۃ الخواطر ص ۲۶ ج ۷)

مولانا حافظ محمد اسلم جیراج پوریؒ

مولانا محمد اسلم بن مولانا سلامت اللہ جیراج پوری اپنے آبائی وطن جیراج پور ضلع اعظم گڈھ میں ۷ رربیع الاوّل ۱۲۹۹ ہجری کو جمعہ کے دن پیدا ہوئے، خاندانی روایت کے مطابق پانچ برس کی عمر میں انھیں مکتب میں بٹھایا گیا، چونکہ ان کے والد مولانا سلامت اللہ مرحوم کا قیام مستقل طور سے بھوپال میں تھا اس لیے وہیں ۱۳۰۵ھ میں حافظ سید مظہر حسین کی نگرانی میں قرآن حکیم حفظ کیا، دوسال میں حفظِ قرآن سے فراغت کے بعد فارسی شروع کی اور مختصر سی مدت میں گلستاں اور بوستاں دونوں کتابیں پوری یاد کرلیں، فارسی قواعد کو استاد نے لکھ کر یاد کرایا، اس نوشتہ کو ''قواعد اسلمیہ'' کے نام سے اسی زمانہ میں مولانا نے شائع کرایا، فارسی کی دیگر درسی کتابوں کی تحصیل مولانا فتح اللہ سے کی، اس کے بعد ریاضی کی تعلیم شروع کی اور اس کی تعلیم کے لیے بھوپال کے مشہور ریاضی داں مولوی شاہ محمد مقرر ہوئے، کچھ دنوں کے بعد ان کی جگہ مولوی محمد اکبر خاں مدرس مدرسہ جہانگیری نے لے لی اور دوسال

(۱) ملا بحر العلوم عبد العلی فرنگی محلی بن ملا نظام الدین ۱۱۴۴ ہجری میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، اپنے والد اور ملا کمال الدین سہالویؒ سے تعلیم وتحصیل مکمل کر کے سترہ برس کی عمر میں فارغ ہوگئے، فراغت کے بعد مسند تدریس پر بیٹھے اور لکھنؤ میں کچھ دنوں تک درس دیا پھر رحمت خاں شہید روہیلکھنڈی کی طلب پر شاہجہاں پور کے مدرسہ میں چلے گئے، ۱۱۸۸ھ کی جنگ میں جب رحمت خاں شہید ہوگئے تو ملا بحر العلوم یہاں سے رام پور نواب فیض اللہ کے مدرسہ میں چلے آئے پھر یہاں سے بوہر ضلع بردوان کے مدرسہ میں تدریسی خدمات انجام دیں اور ۱۳۰۵ھ میں بوہر سے مدراس چلے گئے جہاں آخر عمر تک تدریسی وتعلیمی خدمات میں مشغول رہے، مدراس ہی کے زمانہ تدریس میں نواب محمد علی نے انھیں بحر العلوم کا خطاب دیا تھا جو بعد میں زبان زد خلائق ہوگیا۔ ۱۲ ررجب ۱۲۲۵ ہجری کو اکیاسی (۸۱) برس کی عمر میں وفات پائی اور مسجد والا جاہی کے صحن کے متصل احاطہ میں مدفون ہوئے۔ (بحر العلوم ص ۱۴ تا ۲۸)

کی قلیل مدت میں فارسی کے علاوہ حساب، اقلیدس، مساحت اور جبر ومقابلہ کی تعلیم مکمل کر کے انگریزی پڑھنے کا سلسلہ شروع کیا، ان علوم کی تحصیل کے بعد عربی کی تعلیم شروع کی، صرف ونحو کی تحصیل بھوپال کے مختلف اساتذہ سے کی، فقہ واصولِ فقہ مولوی فتح اللہ سے پڑھا، منطق، فلسفہ، ادب، حدیث اور تفسیر کی تعلیم اپنے والد مولانا سلامت اللہ سے پائی۔ حدیث میں اوّلاً کتاب التوحید وکتاب الایمان مصنفہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کو سبقاً سبقاً پڑھا، پھر بلوغ المرام اور موطا امام مالک کی تحصیل کی اور سب سے آخر میں بخاری اور مسلم کو پڑھا، تفسیر میں متداول تفسیروں کے بجائے علامہ مہائمیؒ کی تبصیر الرحمان پڑھی، غرضیکہ بیس سال کی عمر میں جملہ علوم مروجہ کی تعلیم مکمل کر کے ۱۳۱۹ ہجری میں فاتحۂ فراغ پڑھی۔

جس زمانہ میں مولانا بھوپال میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، یہ شاہجہاں بیگم کی حکومت کا زریں عہد تھا، جن کی دینداری، علمی قدردانی اور بے نظیر فیاضی کی بدولت شہر میں اسلامی شان اور خوش حالی نمایاں تھی اور علم ودین کا چرچا عام تھا، یہ زمانہ اسلامی ہند میں اس اعتبار سے بھی نہایت اہم ہے کہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اسی عہد میں اپنی تصنیفات اور عطیات کے ذریعہ تحریک غیر مقلدیت کو حیات تازہ عطا کر دی تھی۔

تعلیمی سلسلہ مکمل کر لینے کے بعد لاہور کے ایک اخبار میں عربی کے ترجمہ نگار کی حیثیت سے کام شروع کیا، وہاں دو سال رہ کر علی گڈھ کالج میں چلے آئے اور ایک عرصہ تک وہاں عربی وفارسی کے استاذ کی حیثیت سے تعلیمی خدمات انجام دیں، پھر تک موالات کی تحریک کے موقع پر مولانا محمد علی مرحوم کی ترغیب سے علی گڈھ کالج سے الگ ہو کر جامعہ ملیہ سے منسلک ہو گئے اور زندگی کے آخری لمحہ تک جامعہ سے متعلق رہے، جامعہ کی تعمیر وترقی میں جہاں مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ کی کوششوں کا دخل ہے وہیں اس کے پروان چڑھانے میں مولانا اسلم کا بھی ہاتھ ہے، جس کا اعتراف ارباب جامعہ کو بھی ہے۔

حافظ اسلم جیراج پوریؒ مختلف النوع صلاحیتوں کے مالک تھے وہ ایک نامور مورخ، صاحب طرز ادیب، خوش فکر شاعر اور ماہرِ فن عالم تھے، ان کی تصنیفات کی فہرست بڑی

طویل ہے، جن میں مندرجہ ذیل کتابیں نہایت اہم ہیں:

(۱) تاریخ القرآن (۲) حیاتِ حافظ شیرازیؒ (۳) حیاتِ جامیؒ (۴) الوراثۃ فی الاسلام اس رسالہ میں مولانا نے وراثت کے بعض مسائل مثلاً عول، حجب وغیرہ کا انکار کیا ہے، جس کے جواب میں ترکی کے مشہور عالم موسیٰ جاراللہ نے صحیفۃ الفرائض کے نام سے ایک رسالہ لکھا اور اس میں ان کے جملہ دلائل کا تشفی بخش جواب دیا ہے (۵) ارکانِ اسلام (۶) عقائد اسلام یہ دونوں کتابیں عرصہ تک علی گڈھ میں دینیات کے نصاب میں داخل رہیں (۷) تاریخ الامت سات جلدوں میں، مولانا کی یہ نہایت اہم تصنیف ہے اور بہت مقبول ہے (۸) نوادرات، یہ مولانا کے علمی مقالات کا مجموعہ ہے (۹) جواہر علمیہ، یہ ان کے شعری کلام کا مجموعہ ہے جو جامعہ ملیہ سے شائع ہوا (۱۰) سیرت فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہ) (۱۱) تعلیماتِ قرآن۔

حافظ اسلم مرحوم کی شخصیت ردعمل کی عجیب وغریب مثال ہے، مولانا کی تعلیم وتربیت علمائے اہلحدیث کے زیرنگرانی ہوئی، خود ان کے والد ماجد تحریک اہلحدیث کے زبردست داعی تھے، لیکن یہ خود زندگی بھر اس خیال کی اشاعت کرتے رہے کہ احادیث دین نہیں ہیں، بلکہ تاریخ دین ہیں، قرآن کریم اسلام کی مستقل اور مکمل کتاب ہے اس کے علاوہ دین میں کسی کی حجیت ثابت نہیں۔ چنانچہ یہ خود لکھتے ہیں کہ ''قرآن ہدایت کے لیے کافی ہے اور احادیث دین نہیں بلکہ تاریخ دین ہیں، میں اہل قرآن کے فرقہ میں بھی داخل نہیں کیونکہ میں اسوۂ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یقینی مانتا ہوں بخلاف اہلِ قرآن کے جو عمل متواتر کے قائل نہیں۔

اس خیال کا نتیجہ ظاہر ہے کہ حدیث حجتِ شرعی نہیں اور یہ بھی مسلّم ہے کہ اہلِ قرآن کے علاوہ اسلام کے تمام فرقے کسی نہ کسی صورت میں حجیتِ حدیث کے قائل ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تبیین وتفسیر کے بغیر قرآن مجید پر صحیح اور مکمل طور پر عمل ممکن نہیں، اس لیے ایک مسلمان کو مسلمان رہتے ہوئے حدیث کی حجیت کے بغیر چارہ نہیں۔

مولانا کی وفات جامعہ ملیہ ہی میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔ (ماخوذ از ''نوادرات'')

مولانا حکیم محمد اصغر فاروقی کوریاپاریؒ

کوریاپار تحصیل گھوسی ضلع اعظم گڈھ میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، مشہور ہے کہ ایک بزرگ جن کا نام کوڑیا شاہ ہے اس کے آباد ہونے سے پہلے یہاں رہتے تھے، انھیں کے نام پر اس موضع کا نام کوریاپار پڑا، اسی گاؤں میں مولانا محمد اصغر بن شیخ محمد اکرام بن شیخ پیغمبر علی فاروقی ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے، فارسی اور عربی کی تعلیم مدرسہ احمدیہ آرہ میں مولانا عبداللہ غازی پوری سے حاصل کی، ان کے علاوہ مولانا حفیظ اللہ بندوی سے بھی کسب فیض کیا تھا، چونکہ یہ دونوں حضرات اہلِ حدیث مسلک کے پیرو تھے اس لیے ابتداء میں مولانا محمد اصغر پر بھی یہی رنگ غالب رہا اور نمازوں میں قرأت خلف الامام اور آمین بالجہر جیسے مسئلوں میں انھیں حضرات کی اتباع کرتے تھے، لیکن بعد میں جب حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سے تعلق ہوگیا تو یہ اثر ختم ہوگیا۔

مولانا محمد اصغر عالم فاضل ہونے کے ساتھ بلند پایہ طبیب بھی تھے، نسخے نہایت سستے لکھتے تھے، اللہ نے دستِ شفاء سے نوازا تھا، اس لیے دور دور سے لوگ آپ سے علاج کرانے کے لیے آتے تھے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد گورنمنٹ نارمل اسکول گورکھپور میں (جو اب جے، ٹی، سی، گورنمنٹ کالج ہوگیا ہے) ملازمت کرلی تھی اور مسلسل بیس برس تک اسی اسکول میں تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دے کر ۱۵ر جنوری ۱۹۲۵ء میں پنشن لے لی، گورکھپور کے عوام اور محکمہ تعلیم کے افسران مولانا کا نہایت ادب واحترام کرتے تھے، اس لیے درمیان میں تبادلہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔

پنشن پانے کے بعد گھر ہی پر رہنے لگے تھے، گاؤں کے عوام نے آپ کو گرام سبھا کا سرپنچ منتخب کرلیا تھا، اس عہدے پر بھی بیسوں برس قائم رہے اور کبھی کسی کو ان سے شکایت نہ ہوئی۔

مولانا گو باقاعدہ شاعر تو نہیں تھے، لیکن طبیعت موزوں پائی تھی، زمانے کی تہذیب

کے مطابق کبھی کبھی شعر کہتے تھے، ان کی ایک طویل مناجات جو مثنوی مولانا روم کی بحر میں ہے اب بھی موجود ہے، چند اشعار نمونۃً پیش ہیں:

اے خدا، اے بیکسوں کے چارہ ساز — ہم ترے بندے ہیں تو بندہ نواز
اے ارسطو اور فلاطوں کے حکیم — تو ہے شافی اور ہم سب ہیں سقیم
اے غریبوں عاجزوں کے دستگاہ — حاکموں کے حاکم و شاہوں کے شاہ
دل مرا پُرنور تھا مانندِ ماہ — ہائے عصیاں نے کیا اس کو تباہ
مجھ میں نفسانی مرض ہیں بے شمار — جانتا تو خوب ہے پروردگار

مولانا اصغر فاروقی نہایت عابد زاہد متقی اور پرہیزگار عالم تھے، حضرت تھانویؒ سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے، ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری سے متعلق ہو گئے تھے۔

مرضِ اسہال میں ۱۴رشعبان ۱۳۶۵ ہجری مطابق ۱۷رجنوری ۱۹۴۶ء کو آپ کا انتقال ہوا۔ (قصص الجمیل فی سوانح الخلیل ص ۱۴ تا ۱۸ و شعر غیر شعر اور نثر ص ۱۰)

مولوی محمد اصغر مبارکپوریؒ

مولوی حکیم محمد اصغر بن شیخ قاری محمد علی بن حافظ عبدالرحیم بن حاجی بہادر مبارک پوری مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری کے برادر زادہ اور تلمیذ رشید تھے، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر کے مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا محمد محمود معروفی سے پڑھا، اس کے بعد اپنے چچا مولانا عبدالرحمٰن محدّث کے ساتھ رہے اور مختلف مقامات و مدارس میں ان سے پڑھتے رہے، فراغت کے بعد مدرسہ دار التعلیم مبارک پور میں اردو فارسی اور عربی کے مدرس ہوئے اور پوری زندگی اس سے وابستہ رہے معمولی تنخواہ پر صبر و قناعت کے ساتھ زندگی بسر کی، طب و حکمت سے بھی واقف تھے، بہترین جلد ساز بھی تھے، یہ فن انھوں نے قیام کلکتہ کے دوران سیکھا تھا۔

۱۳۴۶ ہجری میں انتقال کیا اور آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔

(تذکرہ علمائے مبارکپور ص ۲۸۶)

مولانا محمد اعظم چریا کوٹیؒ

مولانا محمد اعظم عباسی چریا کوٹی کی ولادت ۱۲۶۶ ہجری میں ہوئی، ابتدائی کتابیں مولوی دالدار علی سے گھر ہی پر پڑھیں، اس کے بعد اپنے چچا مولانا عنایت رسول ومولانا محمد فاروق اور مولانا علی عباس سے دیگر علوم وفنون کی تعلیم پائی۔ مولانا علی عباس کے ہمراہ حیدرآباد بھی گئے جہاں وہ بسلسلہ ملازمت رہتے تھے، قیام حیدرآباد کے زمانہ میں مولانا علی عباس سے علم ادب کی تحصیل کی پھر یہاں سے دلی چلے آئے اور مولانا سید نذیر حسین دہلویؒ متوفی ۱۳۲۰ھ سے حدیث کی تعلیم حاصل کی، تحصیل حدیث سے فراغت کے بعد رامپور آئے اور یہاں کے اساتذہ سے حکمت وفلسفہ کی کتابیں پڑھیں، بعد ازاں لکھنؤ آکر حکیم علی حسین لکھنوی سے فنّ طب حاصل کیا۔

جملہ علوم عقلیہ ونقلیہ میں کامل دستگاہ حاصل ہوجانے کے بعد بغرض تحصیل معاش حیدرآباد کا سفر کیا، جہاں پہلے سے آپ کے چچا مولانا علی عباس ملازم تھے، یہاں آنے کے بعد حکومتِ حیدرآباد میں ملازمت مل گئی اور طویل عرصہ تک اس خدمت پر مامور رہ کر آخر میں پنشن کے ساتھ ریٹائر ہوئے اور چھیاچھٹ (۶۶) برس کی عمر میں ۱۴؍محرم ۱۳۳۲ھ میں انتقال کیا۔

آپ نے حسبِ ذیل دینی وعلمی تصانیف یادگار چھوڑیں۔

(۱) رسالۃ فی المیراث (۲) رسالۃ فی العروض (۳) رسالۃ فی التصریف (۴) رسالۃ فی النحو (۵) کتابُ الحیوان (۶) لغت۔ (تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۱ ونزہۃ ص ۴۰۹ ج ۸)

مولانا محمد امان اللہ مئویؒ

استاذ العلماء حضرت مولانا محمد امان اللہ بن حاجی عبدالغنی ۱۲۶۴ھ مطابق ۱۸۴۴ء میں محلّہ دکھن ٹولہ مہارانی قصبہ مئو ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے۔

مولانا کھاتے پیتے گھرانے کے چشم وچراغ تھے، ان کے والد حاجی عبدالغنی مرحوم

شکر سازی کا کارخانہ چلانے کے ساتھ غلے کا تھوک بیوپار بھی کرتے تھے، کھیتی باڑی بھی اچھی خاصی تھی، گھر میں فارغ البالی ہونے کی وجہ سے یہ ہر فکر سے آزاد ہوکر ہمہ تن تحصیل علوم میں منہمک ہوگئے، کلام پاک اور مکتبی تعلیم مکمل کرلینے کے بعد فارسی کی جملہ کتب مروجہ میاں رمضان علی صاحب سے پڑھیں جو اس زمانہ میں مشہور فارسی داں تھے۔ تکمیل فارسی کے بعد ملا حسام الدین مئوی سے عربی کا آغاز کیا اور شرح جامی، شرح وقایہ، نورالانوار اور قطبی وغیرہ تک کی تعلیم انھیں سے حاصل کی۔ رفقائے درس میں مولانا سلطان احمد بانی دارالعلوم مئو، مولانا عبدالمجید امام جامع شاہی مسجد اور مولانا محمد علی مئوی وغیرہ تھے، اس زمانہ میں دیار پورب میں مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور، مولانا محمد فاروق چریا کوٹی، مولانا حافظ عبداللہ مئوی غازی پوری اور مولانا شمشاد لکھنوی غازی پوری کی علمی سرگرمیوں کی بدولت بڑی شہرت کا حامل تھا۔ چنانچہ مولانا امان اللہ مرحوم اپنے رفقاء کے ہمراہ اس چشمہ علوم سے سیراب ہونے کی غرض سے غازی پور چلے آئے اور مذکورہ ہرسہ بزرگوں سے ہدایہ اولین وآخرین، مختصر المعانی، سُلّم، ملا جلال، شمس بازغہ تا صدرا، سراجی، جلالین، مشکوٰۃ اور موطا امام مالک وغیرہ کی تحصیل کی پھر یہاں سے مولانا ابوالحسنات عبدالحئی فرنگی محلیؒ کی شہرت کمال انھیں لکھنؤ لے آئی، لکھنؤ کا یہ سفر آج کی طرح سے آسانی سے نہیں طے ہوگیا تھا؛ بلکہ مئو سے فیض آباد تک اونٹ گاڑی سے جانا ہوا پھر وہاں سے بذریعہ ٹرین لکھنؤ پہونچے اور کئی سال تک مولانا فرنگی محلی کی خدمت میں رہ کر جملہ فنون کو حاصل کرکے دورۂ حدیث پڑھا اور ساتھ ہی حکیم بنا لکھنوی سے جو اپنے وقت کے مشاہیر اطباء میں تھے، فن طبابت کی بھی تکمیل کی فراغت تعلیم کے بعد لکھنؤ ہی میں مولانا فتح محمد تائب صاحبِ خلاصۃ التفاسیر کے مدرسہ میں مدرس مقرر ہوگئے۔ اور تقریباً سات سال تک اسی مدرسہ میں تعلیمی وتدریسی خدمت انجام دی، بعد ازاں اپنے استاذ حضرت مولانا عبدالحئی کے حکم سے نواب عبدالستار کے یہاں مٹیابرج کلکتہ چلے گئے اور وہاں اٹھارہ سال تک مدرسی کے فرائض انجام دیے؛ چونکہ بنگال کی آب وہوا مولانا کے مزاج کے موافق نہیں پڑرہی تھی، اس لیے مجبوراً وہاں سے الگ ہوکر مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں چلے آئے اور مسلسل ۳۵ سال تک یہاں صدارت تدریس

کے منصب پر فائز رہ کر بوجہ ضعف پیری مدرسہ کو خیر باد کہا، اور گھر چلے آئے، چونکہ پوری زندگی پڑھنے پڑھانے میں گذری تھی، اس لیے گھر بیکار نہ بیٹھ سکے اور مقامی مدرسہ جامعہ مفتاح العلوم میں چند اسباق پڑھانے لگے؛ لیکن وقت موعود قریب آچکا تھا اس لیے یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا، انجام کار آپ پر فالج کا شدید حملہ ہوا جس کے صدمہ سے ایک ہفتہ بیہوش رہ کر ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۲۹ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مولانا امان اللہ مرحوم نے تقریباً ۶۲ سال تک مختلف اداروں میں علمی خدمات انجام دیں اس طویل مدت میں کتنے طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، البتہ ان میں مشاہیر یہ ہیں:

مولانا حکیم محمد عمر مئوی، مولانا حبیب اللہ مئوی مجاز حضرت تھانوی، مولانا عبد الغفار عراقی مئوی، مولانا محمد صابر مئوی، مولانا مفتی محمد ابراہیم بنارسی، مولانا عبد الحمید ملی بنارسی، مولانا محمد اسحاق بنارسی، مولانا عزیز الحق کوثر بنارسی، مولانا محمد ایوب مئوی شیخ الحدیث مدرسہ ڈابھیل مولانا حکیم سعد اللہ مئوی، مولانا محمد امین ادروی۔ (از منشی ظہیر الدین صاحبزادہ مولانا مرحوم)

مولانا حکیم محمد بشیر رحمانی مبارک پوریؒ

مولانا حکیم محمد بشیر بن عبد المجید بن حافظ عبد الرحمٰن بن عبد الوہاب مبارک پوری نے اپنے حالات مولوی ابویحییٰ امام خاں نوشہروی مولف تراجم علمائے اہلحدیث کے استفسار پر یہ تحریر کیے ہیں:

"۱۵/اکتوبر ۱۹۰۴ء بروز چہار شنبہ مطابق ۹/شعبان ۱۳۲۲ ہجری کو قصبہ مبارکپور ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوا، کلام مجید، اردو، فارسی، حساب وغیرہ مدرسہ دار التعلیم مبارکپور میں پڑھا، کتب علوم آلیہ عربیہ اور بعض کتب حدیث حضرت مولانا ابو العلی عبد الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ محدث مبارک پوری سے پڑھیں، زاں بعد بایماء حضرت مولانا مرحوم ۱۳۴۱ ہجری میں بغرض تکمیل درس نظامیہ مدرسہ دار الحدیث رحمانیہ دہلی میں داخل ہوا اور کتب اصول حدیث، اصول فقہ اور فقہ حضرت مولانا عبد الغفور

صاحب بندوی اعظمی سے اور کتب ادب، عروض اور ترجمتین حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب مرحوم نگرنہسوی سے اور اکثر کتب منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت وغیرہ حضرت مولانا غلام یحییٰ صاحب مدرس الحال مدرسہ الٰہیات کانپور سے اور بعض کتب بلاغت، مناظرہ، اقلیدس حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب آروی سے اور بعض متفرقات دوسرے اساتذہ سے جیسے مولانا احمد صاحب مئوی و مولانا ابوطاہر صاحب بہاری مرحوم و مولانا عبدالوہاب صاحب آروی وغیرہم سے پڑھیں، الحمدللہ مدرسہ کے تمام امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتا رہا۔

۷رشعبان ۱۳۴۵ھ کو مدرسہ سے علاوہ جُبّہ و دستار اور نقدی انعام کے سندِ تکمیل عنایت فرمائی گئی اور شیخ الحدیث نے اپنا اجازہ مرحمت فرمایا، بانیٔ مدرسہ رحمانیہ جناب شیخ حاجی عطاء الرحمٰن صاحب رئیس اعظم دہلی نے اپنے مدرسہ میں میری ملازمت کے لیے متعدد مرتبہ اپنا خیال ظاہر فرمایا، مگر تحصیل طب کے ارادے نے مجھے انکار کرنے پر مجبور کر دیا، ازاں بعد اسی سال تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں طب پڑھنے کے لیے داخل ہوا، علاوہ طب و سرجری کے سائنس بھی معتدبہ حاصل کیا، میرے اساتذہ میں حکیم عبدالحفیظ صاحب مرحوم اور ان کے خلف جناب حکیم حافظ عبدالمجید صاحب اور جناب حکیم عبداللطیف صاحب وائس پرنسپل طبیہ کالج علی گڑھ اور جناب شفاء الملک حکیم و ڈاکٹر عبدالحمید خاں صاحب اور جناب حکیم عبدالحلیمؒ صاحب خلف الرشید جناب حکیم عبدالعزیز صاحب و جناب تربینی پرشاد صاحب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور ۱۳۴۸ہجری میں کالج مذکور سے سرٹیفکٹ حاصل کیا اور اپنے وطن میں کامیاب مطب کرتا رہا، اہلِ مئو کے اصرار سے کچھ دنوں تک مدرسہ عالیہ مئو میں بھی پڑھایا، بایماء حضرت مولانا مبارکپوری مرحوم ۱۳۵۳ھ سے سیدنا و مولانا سید نذیر حسین میاں صاحب رحمہ اللہ محدث دہلوی کے مدرسہ واقع پھاٹک حبش خاں دہلی میں پڑھا رہا ہوں۔'' (انتہیٰ)

اس کے بعد شوال ۱۳۵۶ہجری سے دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں آئے اور پھر یہاں

سے ۱۳۷۱ھ میں وطن چلے آئے اور یہیں مطب جاری کر کے کئی سال تک خلقِ خدا کی خدمت کی، آخر میں سیونی (مدھیہ پردیش) میں مدرس ہوئے اور کئی سال تک تعلیمی و دینی خدمات انجام دیں اور ۳؍مئی ۱۹۶۸ء مطابق یکم صفر ۱۳۸۸ ہجری بروز سہ شنبہ نو بجے شب میں انتقال کیا اور مبارک پور کے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔

(تراجم علمائے اہلِ حدیث ص ۱۴۰ ج او تذکرہ علمائے مبارکپور ص ۲۷۹)

مولانا محمد تقی اعظم گڈھیؒ

مولانا محمد تقی اعظم گڈھی تلمیذ حضرت مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی بڑے باصلاحیت اور جید الاستعداد عالم تھے، ایک عرصہ تک ویلور کے مدرسہ میں مسندِ تدریس پر فائز رہے۔ اس کے علاوہ مولانا محمد تقی صاحب کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ (سراپائے غم ص ۸۵)

مولانا محمد حنیف رہبر شکری مبارکپوریؒ

مولانا محمد حنیف بن حافظ عبدالرحیم شکری، مولانا شکر اللہ صاحب کے خواہر زادے تھے، چونکہ مولانا کی کوئی اولاد زندہ نہیں رہ گئی تھی، اس لیے ان کو اپنے یہاں رکھ کر ان کی تعلیم و تربیت کی اور بڑی محبت و شفقت سے پالا پوسا، اس لیے مرحوم اپنی نسبت شکری کرتے تھے۔

ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا نعمت اللہ صاحب اور مولانا شکر اللہ صاحب وغیرہ سے حاصل کی، اس کے بعد شوال ۱۳۵۰ ہجری میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، پھر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، مگر بیماری کی وجہ سے وہاں تکمیل نہ کر سکے اور مدرسہ مفتاح العلوم مئو میں دورۂ حدیث پڑھا اور یہیں سے فارغ ہوئے، بڑے ذہین و طبّاع اور لطیف المزاج تھے، اردو کے نہایت اچھے شاعر تھے، غزلیں خوب کہتے تھے، ابتداء میں حسرت موہانی سے خط و کتابت کے ذریعہ کچھ مشورۂ سخن لیا تھا، مضمون نگار بھی بہت اچھے تھے، ان کے اشعار و مضامین مختلف اخبارات و رسائل میں چھپتے تھے، اگر عمر نے اور وفا کی ہوتی تو وہ

مبارک پور کے علماء و مصنفین میں نمایاں مقام کے مالک ہوتے، بڑے عزم وحوصلہ کے مالک تھے، دوست واحباب کی مجلس میں چراغِ محفل ہوتے، مولانا شکر اللہ کو ان سے بڑی توقعات تھیں، مگر افسوس کہ عین جوانی میں دق کے مرض میں مبتلا ہوکر ۱۳۵۷ ہجری میں انتقال کر گئے، "المغفور" سے تاریخِ وفات نکلتی ہے۔

مقامع الحدید بجواب مصباح الجدید ان کی مشہور تصنیف ہے، بڑے دلچسپ انداز میں لکھا ہے، یہ کتاب دو مرتبہ چھپ چکی ہے، ان کے اشعار کو جمع کیا جائے تو مبارک پور کے ادبی وشعری سرمایہ میں گرانقدر اضافہ ہوسکتا ہے۔ (تذکرہ علمائے مبارک پور ص ۲۸۰و۲۸۱)

مولانا مفتی محمد خلیل برونوی

شیخ مفتی محمد خلیل بن شمس الدین صدیقی برنوی (برونہ تھانہ برواضلع اعظم گڈھ سے شمال مشرق تقریباً چھ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے) نے علوم وفنون کی تحصیل اپنے والد ماجد سے کی، اور سلوک وطریقت کو اپنے والد کے بھانجے شیخ محمد رشید بن مصطفیٰ عثمانی سے اخذ کیا، بعد ازاں اپنے بھائی شیخ مفتی محمد صادق کی جگہ منصب افتاء پر فائز ہوئے اور تامدت حیات اس ذمہ داری کو انجام دیتے رہے، مفتی صاحب موصوف ایک عالم باعمل تھے، پوری زندگی درس وافادہ میں بسر کی، طلبۂ علوم کی ایک کثیر جماعت ان سے مستفید ہوئی۔ یوم جمعرات ۲۹رذی الحجہ ۱۰۷۹ھ میں وفات پائی اور اپنے بھائی مفتی محمد صادق کے مقبرہ میں دفن ہوئے۔ (گنج ارشدی بحوالہ نزہۃ الخواطرج ۵ ص ۳۹۷)

مولانا دیوان محمد رشید برونوی (جون پوری)

اعظم گڈھ اگرچہ نسبتاً ایک نئی آبادی ہے، مگر اس کے اکثر مردم خیز قصبات وقریات قدیم ہیں اور پہلے وہ جون پور میں شمار ہوتے تھے، اس لیے موجودہ اعظم گڈھ کے اگلے مشاہیر جون پوری مشہور ہوئے، انہی علاقہ اعظم گڈھ کے جون پوری مشہور باکمالوں میں فرید العصر، وحید الدہر، استاذ العلماء، صاحب الرشاد الشیخ ابوالبرکات دیوان محمد رشید عثمانی

برونوی کی ذات گرامی بھی ہے۔

دیوان محمد رشید بن شیخ مصطفیٰ جمال ۱۰/ذی قعدہ ۱۰۰۰ھ کو موضع برونہ میں پیدا ہوئے، ''برونہ'' تھانہ بروا ضلع اعظم گڈھ سے شمال مشرق چھ کلومیٹر اور مارٹین گنج سے جنوب مغرب آٹھ کلومیر پر واقع ہے، سلسلۂ نسب باختلاف روایت اٹھارہویں یا بیسویں پشت میں شیخ سری سقطی عثمانی سے مل جاتا ہے، دیوان صاحب کی بارہویں پشت میں ایک بزرگ شیخ بخشی رومی نامی ہیں، ان کے اجداد میں سے کسی نے عرب سے ہجرت کر کے کلدہ میں سکونت اختیار کر لی تھی، کلدہ ملک روم کا ایک مشہور مقام ہے اسی مناسبت سے شیخ بخشی کو رومی کہا جاتا ہے۔ یہ شیخ رومی ہندوستان وارد ہوئے اور سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیاء کے دامن سے وابستہ ہو گئے، پھر شیخ کے ایماء پر موضع سکلائی پرگنہ امیٹھی ضلع بارہ بنکی میں خلق خدا کی اصلاح وہدایت کی غرض سے مقیم ہو گئے، سلطان المشائخ کے علاوہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی سے بھی انھیں خلافت حاصل تھی، شیخ رومی کی وفات سکلائی ہی میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے، دیوان صاحب کے والد بزرگوار شیخ مصطفیٰ جمال سکلائی ہی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی، بڑے ہوئے تو شوق تحصیل علم میں جون پور آئے، اور یہیں کے علماء ومشائخ سے علوم ظاہر وباطن کی تکمیل کی، تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد شیخ نور الدین بن عبد القادر برونوی کی صاحبزادی سے عقد نکاح ہوا، جو برونہ کی وطنیت کا سبب بنا، برونہ ہی میں ان کے تینوں صاحبزادے: شیخ محمد سعید، شیخ محمد رشید (صاحب الترجمہ) اور شیخ محمد ولید پیدا ہوئے اور اسی موضع میں ان کی زوجۂ محترمہ کی وفات ہوئی جو وہیں آسودۂ خواب ہیں، ان کی قبر آج بھی موجود ہے اور ''پھول بی بی'' کا مزار سے مشہور ہے۔

دیوان صاحب کے اساتذہ کی فہرست بڑی طویل ہے۔ ان کثیر اساتذہ میں ان کے علمی جوہر کو نکھارنے میں سب سے زیادہ ہاتھ خود ان کے حقیقی ماموں علامۂ عصر مفتی شمس الدین برونوی اور استاذ الملک شیخ محمد افضل جون پوری کا ہے، دیوان صاحب نے ان دونوں سے کسب فیض زیادہ کیا ہے اور اکثر کتابیں انہی سے پڑھی ہیں، اس وقت کے رائج علوم کی تحصیل وتکمیل کے بعد بھی شوق طلب کو سیری نہیں ہوئی اور عہد شباب کے گذر جانے

کے بعد ساٹھ سال کی عمر میں کمر ہمت کسی اور قدوۃ المحدثین شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۱ھ کے فرزند وشاگرد شیخ نورالحق محدث دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشکوٰۃ المصابیح وصحیح بخاری پڑھ کر اجازت حاصل کی، شیخ نورالحق نے فراغت کے بعد جو سند عطا کی ہے اس کے لفظ لفظ سے دیوان محمد رشید کی علمی جلالتِ شان نمایاں ہے، سند اجازت درج ذیل ہے:

"ان الشیخ الاجل الا وحد الافضل، جامع الکمالات الالوهیة، المتوجه إلی الله، خلیفة قدوة المتورعین الشیخ طیّب بن معین، طلب منی الاجازة بسنن اهل الحدیث، وحفظاً لسند السلسلة الشریفة، مع انی لست باهلها وکان الاعتذار احریٰ والیق من الاجازة ولکن لما کان امتثال امره واجباً علیّ وکان اجری هذا الطریق مما اوصیٰ به الشیوخ اجبت مسئوله واجزت، رفعه الله"

اس کے ذیل میں دیوان صاحب نے یہ عبارت اپنے قلم سے درج کی ہے:

وانا العبد الاحقر المفتقر إلی الله الوحید المدعو بین الناس بمحمد رشید بن مصطفٰی الجونپوری موطناً، والعثمانی نسباً والچشتی ارادةً، والقادری والقلندری والشطاری مشرباً، المرجو من الشیخ الاوحد ان لا ینسانی من صالح دعائه لعل الله یرزقنی صلاحاً، وکان ذلك فی ذی قعده سنة ستین والف من الهجرة النبویة. (گنج ارشدی ورق ۱۳۴)

تعلیم سے فراغت کے بعد دیوان صاحب نے مجلس درس وافادہ آراستہ کی، بیشمار طلبۂ علوم ان کے علمی فیوض سے مستفید ہوئے، طلبہ کے ساتھ انتہائی شفقت ومحبت کا معاملہ کرتے تھے، ان کی توقیر وتکریم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونے دیتے تھے، اس کا اندازہ یوں ہوتا ہے کہ وفات کے وقت یہ وصیت کی کہ جس پتھر پر طلبہ جوتیاں اتارتے تھے اس کو میری قبر میں بطور تختہ کے رکھ دیا جائے۔ (گنج ارشدی ج۱ ص ۱۳۴)

ان کے درس وافادہ کو علماء ومشائخ بڑی قدر اور اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور اس

کو قائم رکھنے کی تاکید کرتے رہتے تھے، چنانچہ ان کے شیخ طریقت شاہ طیب بناری اپنے ایک مکتوب میں انھیں لکھتے ہیں:

"ہموارہ بدرس وتدریس بودہ برضاے رحمت چشم دارندکہ حق تعالیٰ رادر روز شبے ہزار نعمت است کہ برخلق نازل شود تسع مایہ وتسع وتسعون للعلماء والمتعلمین وواحدۃ لجمیع الخلق، وذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء" (گنج ارشدی ج ا ص ۱۳۸)

ایک دوسرے مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں:

"بندہ می خواہدکہ از برائے شما فرمان بوساطت نواب از بادشاہ طلب نمایدکہ شما دریں بنارس استقامت نمودہ درس وتدریس فرمائیدکہ دریں کانِ کفر رواج اسلام نمود" (گنج ارشدی ج ا ص ۱۲۸)

دیوان صاحب طلبہ ومریدین سے خدمت لینا پسند نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ ان کے تلمیذ خاص ومرید شیخ میاں اسماعیل برونوی نے شکایت آمیز لہجہ میں عرض کیا دیوان جیوتو خدمت کا موقع ہی نہیں دیتے، تو ان کے جواب میں فرمایا: میرے استاذ شیخ محمد افضل بھی خدمت لینا پسند نہیں کرتے تھے۔ مجھے بھی یہی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ضرورت خود پوری کرلیا کروں، پھر فرمایا "تا کار بدست خودتواں کرد دیگرے گفتن خوب نیست، درصحبت یار شاطر باید نہ بار خاطر" (گنج ارشدی ج ا ص ۱۲۸)

ان کے اکثر تلامذہ علوم ظاہر کے ساتھ علوم باطنی میں بھی انہی سے استفادہ کرتے تھے، اوران میں بہت سے خلعت خلافت سے بھی مشرف ہوئے۔

دیوان صاحب جس طرح علوم وفنون میں شہرۂ آفاق تھے، سلوک وطریقت میں بھی یکتائے روزگار تھے، نو برس کی عمر میں اپنے والد ماجد شیخ مصطفیٰ سے بیعت ہوگئے تھے، پھر تکمیل علوم کے بعد اس کی جانب پورے طور پر متوجہ ہوئے اور شیخ طیب بناری کی خدمت میں اس ارادہ سے پہنچے کہ سارے علائق ترک کرکے ان کے در پر پڑا رہوں گا، مگر شیخ طیب نے بیعت کرنے کے بعد یہ کہہ کرانھیں جون پور واپس کردیا کہ "بجائے وظیفہ صبح درس طلبہ دادند ایں ہم عبادت است" (مناقب العارفین)

شیخ کے اس حکم پر جون پور واپس آ کر درس وتدریس میں مشغول ہو گئے، البتہ وقتاً فوقتاً شیخ کی خدمت میں منڈواڈیہہ بنارس جاتے رہتے تھے، پھر رمضان کی تعطیل کے موقع پر پورا رمضان ان کی خدمت میں گذارنے کے ارادہ سے پہنچے، شیخ نے عشرۂ اخیر کے اعتکاف کا حکم دیا، اور عین عید کے دن ۱۰۴۰ھ میں اپنی خلافت سے سرفراز کیا، شیخ طیب بنارسی کے علاوہ دیوان صاحب کو سلسلۂ سہروردیہ میں شیخ تاج الدین جھوسوی الہ آبادی سے اور سلسلۂ قادریہ میں شیخ شمس الدین کالپی سے اور سلسلۂ قلندریہ میں شیخ عبدالقدوس نبیرۂ شیخ قطب بنیائے دل سے اور سلسلہ قادریہ چشتیہ میں شاہ راجی سید احمد مانک پوری سے بھی اجازت وخلافت حاصل تھی۔

دیوان محمد رشید رحمہ اللہ جہاں ایک ماہر عالم وفاضل اور بلند پایہ شیخ طریقت تھے وہیں ایک صاحب دیوان شاعر بھی تھے اور شمسی تخلص کرتے تھے، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

گرد شو گرد تا گرد نہ گردی در راہ — کے بدانی کہ دریں راہ سوارے باشد

اپنے والد ماجد کے جائے مدفن کے بارے میں کہتے ہیں:

چوں یار بہ بنگالہ کند مسکن وماویٰ — شمسی بد بدخساں نہ رود لعل بہ بنگ است

غزل کے چند اشعار:

ہر نگاہے اودعائے دیگر است — پیچش زلفش بلائے دیگر است
من بیکدم سیر عالم می کنم — روح را دستے وپائے دیگر است
بر بدن صد زخم خنجر گر زنی — گے بمیرم جاں بجائے دیگر است
از دل شمسی دمے تمکیں مجوے — ہر دمش چوں ہُو ہوائے دیگر است

دیوان صاحب کو تصنیف وتالیف میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، سرعتِ تالیف میں تو اپنے عہد میں بے نظیر وبے مثال تھے، جس کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ تعلیم سے فراغت کے بعد ایک بار بغرض ملاقات اپنے خاص استاذ، استاذ الملک شیخ محمد افضل کی خدمت میں گئے، اس وقت استاذ الملک شریفیہ (جو فن مناظرہ کا اہم متن ہے) کا درس دے رہے تھے، درس سے فارغ ہوجانے کے بعد دیوان صاحب سے فرمایا کہ ”متنِ

خوب است اگر کسے شرح ایں نوسید خوب است"

وہ اپنے استاذ کے اشارہ کو سمجھ گئے، چنانچہ ایک ہفتہ کے بعد جب پھر استاذ الملک کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس کی شرح استاذ عالی مقام کی خدمت میں پیش کردی، استاذ عالی قدر نے بعد از مطالعہ اسے بیحد پسند کیا اور انھیں اپنی داد و تحسین سے نوازا، یہی وہ شرح ہے جو "رشیدیہ" کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے، اور اس خاکسار کے زمانۂ طالب علمی تک نصاب درس میں داخل تھی، بعد کے علماء نے اس کی متعدد شرحیں لکھی ہیں۔

رشیدیہ کے علاوہ ان کی دوسری تصنیف تذکرۃ النحو ہے، یہ مبادیات نحو میں ایک مختصر سا رسالہ ہے، جس کو انھوں نے اپنے منجھلے صاحبزادے شیخ ارشد کے لیے لکھا تھا، یہ رسالہ آج کل "خلاصہ" کے نام سے نحو میر کے آخر میں شائع ہوتا ہے۔ تقریباً دو صفحے میں نحو کے جملہ عوامل بڑے دل نشیں انداز میں بیان کردیا ہے، ان دو مطبوعہ تصانیف کے علاوہ درج ذیل کتابیں بھی انھوں نے تصنیف کیں مگر وہ طبع نہیں ہوسکیں، ان میں اکثر غالباً معدوم ہوچکی ہیں۔

(۳) ترجمۂ معینیہ: یہ تذکرہ النحو کی چار ورقی شرح ہے خانقاہ رشیدیہ میں آج سے تقریباً تیس، پینتیس سال پہلے اس کا قلمی نسخہ دیکھا تھا، (۴) ہدایۃ النحو، (۵) شرح ہدایۃ الحکمۃ، (۶) شرح اسرار المخلوقات، (۷) زاد السالکین، (۸) مقصود الطالبین، (۹) حاشیہ شرح عضدی، (۱۰) حاشیہ کافیہ ابن حاجب، (۱۱) دیوان شمسی، اسی زمانہ میں اس کی زیارت سے بھی مستفید ہوا تھا، (۱۲) مکتوبات، اس ضخیم مجموعہ مکاتیب سے تقریباً پچیس تیس مکتوبات کا ایک انتخاب خانقاہ رشیدیہ کے اہتمام سے شائع ہوا تھا، اس کا ایک نسخہ ہمارے کتب خانہ میں موجود ہے۔

شعبان ۱۰۸۳ھ کی آخری تاریخوں میں دیوان صاحب کو بخار آنا شروع ہوا، علاج معالجہ کے باوجود حالت دن بدن نازک ہوتی ہی گئی، لیکن معمولات میں فرق نہیں آیا تھا، نماز باجماعت ادا کرتے رہے، مگر رمضان کی آٹھویں تاریخ کو نقاہت بے حد بڑھ گئی، تیمم کرکے بستر ہی پر نماز پڑھی، رات کو حالت زیادہ بگڑ گئی، لیکن نصف شب کے بعد کچھ افاقہ ہوا تو تیمم کرکے تہجد میں مشغول ہوگئے، اس سے فارغ ہوئے تو ذکر بالجہر شروع کردی، آواز

اتنی بلند تھی کہ باہر والوں کو سنائی دیتی تھی، ذکر پورا کرنے کے بعد فجر کے لیے تحریمہ باندھنا چاہا تو بتایا گیا کہ ابھی وقت نہیں ہوا ہے، فرمایا میاں ہو گیا ہے اور لیٹ گئے، صبح صادق کے قریب اٹھے، تیمم کیا، لیکن ضعف اس قدر زیادہ تھا کہ تیمم میں بھی دقت ہوئی، کسی طرح تیمم کیا اور لیٹ گئے، لوگ نماز پڑھنے چلے گئے، انھوں نے بھی نماز شروع کر دی، دوسری رکعت کے سجدہ میں تھے کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر کے اپنے مقام اعلیٰ علیین میں پہنچ گئی۔

مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے میر کیا دیوانے نے موت پائی ہے

یہ سانحہ ۹ ررمضان المبارک ۱۰۸۳ھ یوم جمعہ کو پیش آیا، آپ کے تلمیذ خاص اور خلیفۂ اجل شیخ محمد ماہ دیوگامی نے نماز جنازہ پڑھائی اور اس گنجینۂ علوم ومعارف، اور مخزن رشد وہدایت کو رشید آباد میں ہمیشہ کے لیے سپرد خاک کر دیا گیا۔ رشید آباد جون پور ریلوے اسٹیشن سے جانب مشرق تقریباً ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ہے، وہیں ایک حظیرہ میں حضرت دیوان محمد رشید اور ان کے خاندان کے لوگوں کی قبریں ہیں، اسی مناسبت سے اس مقام کا نام رشید آباد پڑ گیا۔

حضرت دیوان صاحب قناعت واستغناء کے پیکر تھے، امراء وسلاطین کے دربار میں حاضری سے ہمیشہ مجتنب رہے۔ چنانچہ نواب سعد اللہ خاں جب شاہجہاں کی وزارت سے مستعفی ہوئے تو بادشاہ نے کہا اپنا جانشین تجویز کر دو، انھوں نے دیوان صاحب کا نام نامی پیش کیا، شاہجہاں نے ایک درباری حاجی محمد سعید نامی کے ذریعہ دو ہزار روپے زاد راہ کے لیے اور ایک مکتوب دیوان صاحب کے نام بھیجا جس میں ملاقات کے اشتیاق کو ظاہر کیا تھا، اور ایک دوسرا فرمان حاکم جون پور مرزا اکرم کے نام جاری کیا کہ جس طرح ہو سکے دیوان صاحب کو آمادہ کر کے میرے پاس روانہ کر دو، لیکن سختی اور زبردستی نہ کرنا، دیوان صاحب کسی طرح بھی شاہجہاں کے دربار میں جانے پر راضی نہیں ہوئے، اور وہ دو ہزار کی رقم بھی واپس کر دی۔ (گنج ارشدی ج ا ص ۳۰۲ ونزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۷۶ وغیرہ)

• سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر عمل کا بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے، جملہ امراض میں بالعموم شہد اور کلونجی استعمال کرتے اور شفایاب ہوتے، ایک مرتبہ بخار آیا ان

کے رفیق درس اور یار غار ملا محمود جھیروی (جون پوری) متوفی ۱۰۶۲ھ نے علاج کیا، مگر صحت نہیں ہوئی، تو حسب معمول شہد اور کلونجی استعمال کیا، بخار اتر گیا، ملا محمود نے بانداز تعجب کہا کہ ''دوائے گرم در تپ صفراوی چگونہ مفید شد'' دیوان صاحب نے فرمایا: ''شمارا بر قول حکماء اعتماد است، و مرا بر قول خدا و رسول'' (گنج ارشدی ج ا ص ۱۴۰)

وضو بڑے اہتمام و احتیاط سے کرتے تھے، اکثر فرماتے تھے:

''کسے بجمعیت خاطر با حتیاط وضو کند نماز او بجمعیت میسر آید، و چوں در وضو احتیاط نمی کند در نماز تفرقۂ خاطر آید'' (گنج ارشدی ورق ۱۴۰)

مائے مستعمل اگر کپڑے پر لگ جاتا تو اسے دھلتے اور فرماتے کہ ''ہر چند موافق فتویٰ آب آں طاہر است، اما تقویٰ شستن رامی خواہد'' (گنج ارشدی ج ا ص ۱۳۷، و تجلی نور ج ا ص ۱۷)

زہد و بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ پختہ تعمیر پسند نہیں تھی، اگر کسی کو مضبوط و مستحکم عمارت بناتے ہوئے دیکھتے تو فرماتے یہ کیا بے خبری ہے کہ شئ فانی کو باقی رکھنے کی کوشش میں لگا ہے۔

وفات کے وقت وصیت کی تھی کہ کفن میں عمامہ زیادہ نہ کیا جائے، اور نہ ایصال ثواب کے لیے گوشت وغیرہ بصورت دعوت پکایا جائے اور نہ تین دن سے زیادہ میرا سوگ منایا جائے اور نہ قبر پختہ کی جائے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۷۷)

دیوان صاحب کو مبدأ فیاض نے دیگر نعمتوں کے ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی نوازا تھا، ان کے کل نو بچے پیدا ہوئے جن میں تین بچیاں اور دو لڑکے ایام رضاعت ہی میں فرط آخرت بن گئے، چار صاحبزادے زندہ رہے اور اپنے باپ کے سچے جانشین ہوئے: (۱) شیخ محمد حمید متوفی ۱۰۸۶ھ، (۲) شیخ محمد ارشد، (۳) شیخ غلام معین الدین متوفی ۱۱۲۰ھ (۴) شیخ غلام قطب الدین متوفی ۱۱۴۷ھ۔ ان میں سب سے زیادہ صاحب فضل و کمال شیخ ارشد تھے، تمام تذکرہ نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ خاندان رشیدیہ میں شیخ ارشد کا مقام سب سے بلند ہے۔ ۲۴ رجمادی الاخری ۱۱۱۳ھ کی شب میں کلمہ توحید کا ورد کرتے ہوئے جاں بحق ہوئے، ان کی دوسری شادی شاہ دیوان صاحب کے تلمیذ و خلیفہ شیخ عبداللطیف بن

عبدالہادی مٹھن پوری کی دختر سے ہوئی تھی، مٹھن پور قصبہ نظام آباد کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ شیخ دیوان محمد رشید قدس سرہ کے خلفاء ومجازین کی تعداد تقریباً چالیس ہے، ان میں مشاہیر یہ ہیں:

(۱) شیخ ارشد بن شیخ دیوان محمد رشید، (۲) میر سید قیام الدین یہ تحصیل سگڑی ضلع اعظم گڈھ کے باشندہ تھے، آخر میں گورکھپور میں مقیم ہو گئے تھے اس لیے گورکھپوری سے مشہور ہیں، (۳) میر سید جعفر پٹنوی خلفاء دیوان صاحب میں ان کا مقام ومرتبہ سب سے بلند ہے، دیوان صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ مجھے جعفر کے طفیل بخش دیں گے، (۴) شیخ نورالدین مداری متوفی ۱۰۹۰ھ یہ دیوان صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، (۵) ملا محمد ماہ دیوگامی، (۶) شیخ عبدالشکور منیری یہ خیرالدین پور ضلع اعظم گڈھ کے اصل باشندہ تھے، (۷) شیخ نصرت جمال ملتانی جامع گنج ارشدی ملفوظات دیوان صاحب، (۸) شیخ محی الدین متوکل جون پوری، (۹) شیخ قاضی مودود جون پوری (۱۰) شیخ آیت اللہ جون پوری متوفی ۱۰۷۷ھ ''تلک عشرہ کاملہ''۔

مولانا محمد سعید بندویؒ

مولانا محمد سعید بن مولانا محمد مرتضیٰ بن شیخ محمد قاسم بندوی اس دیار کے علماء میں اپنے علمی تبحر اور پُروقار شخصیت کے اعتبار سے امتیازی شان کے مالک تھے، مولانا نے تکمیل دارالعلوم ندوہ میں کی تھی، علوم مروجہ سے فراغت کے بعد علومِ عقلیہ میں تخصص کی غرض سے شمسُ العلماء مولانا حفیظ اللہ کی خدمت میں ڈھاکہ یونیورسٹی پہونچے اور ایک سال وہاں رہ کر منطق وفلسفہ کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں، تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد ۶ر نومبر ۱۹۱۹ء مطابق ۱۳۳۸ ہجری میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں استاذ مقرر ہوئے اور منتہی طلبہ کے قرآن وحدیث کا درس آپ سے متعلق ہوا، اس خدمت کو نہایت کامیابی کے ساتھ ستائیس (۲۷) سال انجام دے کر تقریباً پچاس سال کی عمر میں ندوہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

مولانا محمد سعید مرحوم یوں تو تمام علوم مروجہ میں دستگاہ رکھتے تھے، لیکن حدیث، تفسیر اور فقہ میں انھیں کامل تبحر حاصل تھا، بالخصوص علامہ فراہیؒ کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں یہ اپنے معاصرین میں سب پر سبقت رکھتے تھے، علمی کمال کے ساتھ مولانا نہایت متقی اور خدا ترس بھی تھے، مولانا محمد علی مونگیری سے بیعت وارادت رکھتے تھے۔

علمائے دیوبند سے انھیں والہانہ عقیدت ومحبت تھی ان کا نام نہایت عزت واحترام سے لیتے تھے اوران کے کارناموں کو اکثر بیان کرتے رہتے تھے۔

یوں تو مولانا کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، مگر ان میں مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا نجم الدین اصلاحی، مولانا ابواللیث ندوی وغیرہ نے علمی دنیا میں بڑی شہرت پائی۔

مولانا محمد سعید منگرانویؒ

مولانا شاہ محمد سعید خان بن حافظ عبدالستار بن خدا بخش خاں ۲۶ رمضان ۱۳۲۵ھ مطابق نومبر ۱۹۰۷ء کو اپنے ننھیال موضع چھتے پور ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، والد کے انتقال کے بعد اپنے برادر خورد مولوی محمد مسعود خاں ایم، ایل، اے کو لے کر پدری وطن موضع نوناری سے ترکِ سکونت کر کے اپنی سسرال منگرانواں ضلع اعظم گڈھ میں رہنے لگے تھے۔

ابتدائی تعلیم اور حفظِ قرآن کی تکمیل نوناری ہی میں کی، اس کے بعد ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۸ء سے عربی وفارسی کی تحصیل کا سلسلہ شروع کیا اس وقت نوناری کے متصل موضع بکھرا میں حضرت مولانا عبدالرحمٰن بکھراوی خلیفہ حضرت تھانوی کا مدرسہ قرب وجوار کے طلبہ کے لیے مرجع بنا ہوا تھا، مولوی سعید صاحب بھی اسی مدرسہ میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے پڑھنے لگے، لیکن جب ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء مولانا بکھراوی کا انتقال ہوگیا اور یہاں کی علمی محفل اجڑ گئی تو مولانا محمد سعید صاحبؒ نے کان پور کے مدرسہ ضیاء العلوم میں داخلہ لے لیا اور وہیں سے ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں عالم کا امتحان پاس کیا پھر یہاں سے ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۶ء میں مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور چلے آئے اور فاضل کا امتحان

دے کر یہاں سے مدرسہ محمدیہ الٰہ آباد میں داخل ہوئے اور یہیں سے حدیث وغیرہ پڑھ کر ۲۷ برس کی عمر میں علوم دینیہ سے فراغت حاصل کی۔

اس کے بعد ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء میں میٹریکولیشن کا اور ۱۹۳۶ء میں طب کا امتحان پاس کیا، دینی تعلیم سے فارغ ہوکر ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۸ء میں مدرسہ محمدیہ میں تدریسی خدمت پر مامور ہوگئے تھے، اسی زمانہ میں ان کی ملاقات اعظم گڈھ کے مشہور مرشد صوفی حافظ حامد حسن علوی سے ہوگئی اور یہ حافظ صاحب سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپریل ۱۹۲۸ء مطابق ۱۳۵۷ھ میں ان سے بیعت کرلی اور دو سال کی قلیل مدت میں خلافت واجازت سے مشرف ہوئے، بیعت کے بعد تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے منگراواں چلے آئے اور دو برس تک گھر ہی پر رہے، پھر ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۱ء میں دوبارہ تدریسی سلسلہ شروع کیا اور شبلی نیشنل ہائی اسکول اعظم گڈھ میں عربی کے ٹیچر کی حیثیت سے پڑھانے لگے ۲۸ برس مسلسل شبلی ہائی اسکول میں تدریسی خدمت انجام دے کر ۱۹۶۹ء مطابق ۱۳۸۹ھ میں ریٹائر ہوئے۔

شبلی اسکول کی مدرسی کے زمانہ ہی سے بیعت لینے کا سلسلہ شروع کردیا تھا اور جب ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۵۹ء میں ان کے شیخ ومرشد حافظ حامد حسن علوی کا انتقال ہوگیا تو اس میں انہماک بہت بڑھ گیا، چنانچہ گرمیوں کی تعطیل میں تبلیغی دورے پر جاتے اور مریدین ومعتقدین کی طلب پر دور دراز مقامات کے سفر کرتے، اسکول سے الگ ہونے کے بعد تو سال کے اکثر ایام باہر دورے ہی میں گذرتے تھے، آخر میں ضعف پیری کی وجہ سے سفر کرنا چھوڑ دیا تھا اور ۱۹۷۳ء مطابق ۱۳۹۳ھ سے مستقل طور سے اعظم گڈھ میں رہنے لگے تھے۔

مولانا نے پانچ مرتبہ حج بھی کیا، پہلی بار ۱۹۵۱ء میں دوسری مرتبہ ۱۹۶۱ء میں اور تیسری، چوتھی اور پانچویں بار علی الترتیب ۱۹۶۷ء، ۱۹۷۱ء، اور ۱۹۷۲ء میں، آخری سفر حج میں بصرہ، نجف اشرف، کربلائے معلّٰی اور بغداد وغیرہ بھی گئے تھے، تبلیغی دوروں کے سلسلہ میں کلکتہ، دہلی، بمبئی، ٹاٹانگر جمشید پور، گیا، استھماوان، بیربھوم اور پٹنہ کے علاوہ بنگال،

آسام، بہار، اڑیسہ اور یوپی کے اکثر قصبات ومواضعات میں برابر جاتے تھے، جہاں پہونچتے مریدین ومعتقدین کا مجمع لگ جاتا، اسی طرح گھر پر بھی ارادت مندوں کا اجتماع رہتا تھا۔

مولانا کے مریدین ومتوسلین کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے، جن میں بہت سے حضرات تعلیم مکمل کر کے خلافت واجازت بھی حاصل کر چکے ہیں جن میں مولانا آزاد رسول صاحب جامعہ پرائمری سیکشن جامعہ نگر دہلی، مولانا عبدالحکیم ناظم مدرسہ فیض العلوم بخش پور اعظم گڈھ صاحبزادۂ محترم جناب عضدالدین خاں لکچرار مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور جناب اسرارالحق بی اے بی ایڈ نمایاں مقام رکھتے ہیں، آخر الذکر مولانا کے نواسہ ہیں اور یہی بروقت مولانا کے جانشین ہیں۔ (اب یہ بھی نانا کے پاس دار آخرت میں جا چکے ہیں)

مولانا کی علمی یادگار میں سوانح حیات الحاج الحافظ حامد حسن العلوی اور شجرۂ مبارکہ ہے، یہ دونوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور مولانا کے سلسلے میں مقبول ہیں۔

اٹھتر (۷۸) برس عمر پا کر ۳۰/جنوری ۱۹۷۶ء مطابق ۱۲۹۶ھ کو بوقت ۴/بجے شام اچانک حرکتِ قلب بند ہوگئی، میت مریدین کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ بذریعہ ٹرک رات ہی کو منگراواں لائی گئی، جہاں دوسرے دن تدفین عمل میں آئی۔ مزار کے پاس ہی ایک مسجد کی بنیاد پڑ گئی ہے اور تعمیر کا کام شروع ہو چکا ہے۔ سنا ہے کہ مسجد کے مکمل ہو جانے کے بعد مزار پر قبہ کی تعمیر کا کام شروع ہوگا۔

سرِدست مسجد اور مزار پر قبہ کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے۔ مزار گاؤں سے باہر لب سڑک واقع ہے۔

مولوی محمد سلیم فراہیؒ

مولانا محمد سلیم، علامہ شبلی نعمانیؒ کے ماموں اور مولانا حمید الدین فراہیؒ صاحب تفسیر نظام القرآن کے حقیقی چچا تھے، جو پھریہا ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے اور مفتی محمد یوسف فرنگی محلی متوفی ۱۲۸۶ھ، قاضی شیخ محمد مچھلی شہری متوفی ۱۳۳۰ھ اور مولانا عبداللہ غازی پوری

کے شاگرد تھے، پورے غیر مقلد تھے۔ اس لیے مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری جب کبھی اس دیار میں آتے تو انھیں کے یہاں قیام کرتے تھے۔

علوم عربیہ کی تکمیل کے بعد وکالت کا امتحان پاس کیا تھا اور اعظم گڈھ میں پریکٹس کرتے تھے، لیکن بعد میں وکالت ترک کر کے گھر ہی پر رہنے لگے تھے، اس دیار میں آپ کا ذاتی کتب خانہ نہایت شاندار تھا، مطالعۂ کتب کے بہت شوقین تھے، عموماً تفسیر اور حدیث کی کتابیں مطالعہ میں رہتی تھیں۔

حدیث "إذا وقع الطاعون فی أرض وانتم فیها فلا تخرجوا فرارًا منها" میں "ارض" سے عام شرّاح حدیث کے برخلاف "اقلیم" مراد لیتے تھے اور اس پر انھیں بیحد اصرار بھی تھا، اس موضوع پر بحث کے لیے ہر وقت آمادہ رہتے تھے، حتیٰ کہ مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری نے اس مسئلہ کی تردید میں ایک رسالہ خیر الماعون لکھا جس کے جواب میں مولوی محمد سلیم صاحب نے بھی ایک رسالہ لکھا اور اسے اپنے نام کے بجائے مولوی محمد عبداللہ مئوی کے نام سے شائع کیا۔

۱۳۲۴ھ میں آپ کی وفات ہوئی، تاریخ وفات "انه فی الآخرة لمن الصالحین" ہے۔ (تراجم علمائے اہل حدیث ص ۲۸۹، وحیات شبلی ص ۱۰۰)

حضرت مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادیؒ

حضرت مولانا حکیم محمد شریف بن شیخ خدا بخش بن شیخ فتح قلندر بن شیخ حسین علی بن شیخ غلام نبی صدیقی مصطفیٰ آبادی علمائے اعظم گڈھ کے طبقۂ مصنفین میں جامع المعقولات والمنقولات عالم تھے، ان کا وطن مصطفیٰ آباد سوادِ مبارک پور میں بجانب شمال مغرب ایک میل پر واقع ہے، مولانا کے دادا شیخ فتح قلندر اپنے زمانہ کے بڑے رعب داب کے رئیس و زمیندار تھے ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے خلاف تحریک آزادی میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، ان کے والد شیخ خدا بخش بھی بڑے مشہور زمیندار اور رئیس تھے۔

مولانا کی ولادت بارہویں صدی کے نصف آخر میں ہوئی، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل

کی، اس کے بعد مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری کی خدمت میں رہ کر شرح جامی تک پڑھا، اس کے بعد گھر والوں کی اطلاع کے بغیر مدرسہ حنفیہ جون پور چلے گئے جہاں علامہ ہدایت اللہ خاں صاحب مرجع بنے ہوئے تھے، وہاں مولانا ہدایت اللہ اور دیگر اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، اس کے بعد مولانا محی اللہ صاحب (دریبہ پان الٰہ آباد) کی خدمت میں کچھ دنوں پڑھا، پھر وہاں سے ٹونک جاکر مولانا ابوالبرکات احمد(۱) ٹونکی متوفی ۱۳۴۷ھ سے جملہ معقولات ومنقولات اور طب وحکمت کی تکمیل کی، ٹونک ہی کے زمانۂ قیام میں مولانا مناظر احسن گیلانی متوفی ۱۳۷۵ھ سے مولانا کی شناسائی ہوئی اور آخر عمر تک یہ دوستی قائم رہی، تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد شمس الہدیٰ کالج پٹنہ میں صدر مدرس مقرر ہوئے، اسی زمانہ میں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے سجادہ نشین حضرت مولانا شاہ بدرالدین سے بیعت ہوئے، شمس الہدیٰ کے بعد مدرسہ مصباح العلوم الٰہ آباد میں تدریسی خدمات انجام دیں، یہاں تقریباً ۲۰ برس تک آپ کا فیض علم جاری رہا، اسی دوران میں تحریک خلافت میں شامل ہوکر مدرسہ کو ملنے والی سرکاری رقم بند کردی، مدرسہ سخت مالی دشواری میں مبتلا ہوگیا، مگر مولانا اپنے موقف پر اڑے رہے اور تعلیم کے ساتھ مدرسہ کا نظم بھی سنبھالتے رہے اور اس طرح محنت وکوشش کی کہ جب مدرسہ کے قدیم ناظم مولانا محی الدین نواسہ مولانا فخرالدین الٰہ آبادی کو مدرسہ حوالے کیا تو اخراجات سے زیادہ رقم موجود تھی۔

مصباح العلوم سے علیحدگی کے بعد مولانا نے مختلف مدارس میں درس دیا، چنانچہ کچھ دنوں مدرسہ مظہر العلوم بنارس اور وطن میں رہے، اس کے بعد دارالعلوم معینیہ اجمیر شریف چلے گئے، یہاں مولانا کے خلاف یہ فتنہ اٹھا کہ وہ صدر مدرسی کے لائق نہیں ہیں، طلبہ سے

(۱) مولانا ابوالبرکات احمد ٹونکیؒ ۱۲۷۹ھ میں ٹونک میں پیدا ہوئے اور ۱۳۴۰ھ میں وفات پائی، علوم وفنون کی تحصیل اپنے والد شیخ دائم کے علاوہ محمد حسن خاں العسکری، علامہ عبدالحق خیرآبادی اور مولانا محمد ایوب پھلتی سے کی، مولانا ایوب ہی سے حدیث پڑھ کر فراغت پائی، مولانا کا شمار متبحر علماء میں ہوتا ہے، بالخصوص معقولات میں اپنے وقت کے امام مانے جاتے تھے اور دور دراز مقامات سے آ آ کر طلباء آپ کے درس میں شرکت کرتے تھے، مولانا مطالعۂ کتب کے عاشق تھے، سفر وحضر ہر جگہ مطالعہ کا اہتمام فرماتے تھے حتیٰ کہ جس دن وفات ہوئی اس دن بھی مطالعہ کا ناغہ نہیں ہوا، آپ تا دمِ آخر مطالعہ کتب، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں لگے رہے۔ (نزہہ ج ۸ ص ۹۱)

درس میں اعتراضات کرائے جانے لگے اور کہا جانے لگا کہ مولانا منطق وفلسفہ میں ماہر ہیں، مگر حدیث وفقہ میں ان کو درک نہیں، چونکہ یہ مدرسہ حیدرآباد کی مالی امداد سے چلتا تھا اس لیے مولانا کی شکایت حیدرآباد تک پہونچائی گئی، وہاں سے تحقیقات کے لیے ایک ذمہ دار عالم آئے اور مولانا کے درس میں شریک ہوکر طلبہ کے اعتراضات اور مولانا کے جوابات کا منظر دیکھنے کے بعد مولانا سے کہا کہ آپ اطمینان سے پڑھائیں، اب آپ کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا، یہ عالم حیدرآباد سے مولانا گیلانی کے مشورے سے بھیجے گئے تھے۔

مولانا محمد شریف صاحب منطق وفلسفہ میں یکتائے زمانہ ہونے کے ساتھ عربی ادب کا نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے جس پر ان کی عربی کی تصنیفات گواہ ہیں۔

آخر عمر میں اوراد ووظائف سے شغف بہت بڑھ گیا تھا، خانقاہ مجیبیہ کی نسبت عملی طور سے ظاہر ہوگئی تھی، ان اوصاف کے ساتھ مولانا اخلاق وشرافت کے پیکر تھے، نہایت ملنسار، مشفق اور بامروت بزرگ تھے۔

مولانا نے ذوالحجہ ۱۳۷۲ھ مطابق ۲۵/ جولائی ۱۹۵۲ء کو فجر کے وقت جھوائی ٹولہ لکھنؤ میں وفات پائی جہاں ان کے داماد ڈاکٹر محمد یوسف مقیم تھے اور خنجر کے تکیہ میں دفن کیے گئے۔

مولانا محمد شریفؒ کی مطبوعہ تصانیف یہ ہیں:

(۱) الافاضۃ القدسیہ فی المباحثۃ الحکمیہ: عربی زبان میں حکمت وفلسفہ کی اہم کتاب ہے جسے ۱۳۶۳ھ میں قیام الہ آباد کے زمانہ میں تصنیف کیا تھا، یہ کتاب عالم فاضل کے سرکاری نصاب میں مدتوں شامل رہی۔

(۲) نسیم الکلام فی تائید شریعۃ خیر الانام: یہ کتاب علم کلام میں عربی زبان میں ہے اور اپنے موضوع پر جامع ہے، مدتوں یہ کتاب بھی داخل درس رہ چکی ہے۔

(۳) جواہر الحکم فی شرح السلم: منطق کی مشہور کتاب سلم کی شرح حاشیہ کے طرز پر عربی زبان میں ہے۔

(۴) رموزِ حکمت: یہ کتاب اردو زبان میں فلسفہ وحکمت میں ہے۔

(۵) سوال وجواب نورالانوار: اصول فقہ کی مشہور کتاب نورالانوار کے مشکل مقامات کا بہترین حل ہے، یہ کتاب بھی عربی میں ہے۔

(۶) سوال وجواب قطبی ومیر قطبی: منطق کی مشہور کتاب شرح شمسیہ اور اس کے حاشیہ میر سید شریف جرجانی کے مشکل مقامات کا سوال وجواب کی صورت میں آسان حل عربی میں۔

غیر مطبوعہ تصانیف میں حاشیہ تفسیر بیضاوی کا پتہ چل سکا ہے۔

(تذکرہ علمائے مبارک پور ص ۱۹۲ تا ۱۹۸)

مولانا محمد شعیب رسول پوریؒ

مولانا حکیم مفتی محمد شعیب بن مولانا عبدالعلیم بن شیخ باب اللہ رسول پوری اعظمی ۱۳۰۹ھ میں رسول پور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی نحو وصرف کی ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور گئے جہاں اپنے والد ماجد مولانا عبدالعلیم رسولپوری، مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی، مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی اور مولانا محمد اسماعیل صاحب سے اکثر کتب درسیہ پڑھیں، اس کے بعد مدرسہ عالیہ رامپور میں مولانا عبدالحق خیرآبادی سے فلسفہ، منطق، ریاضی، فقہ اور اصولِ فقہ، مولانا محمد طیب عرب مکی سے تفسیر، ادب اور بلاغت، مولانا منور علی محدث رامپوری سے فقہ، اصول فقہ اور حدیث مولانا حافظ وزیر احمد رامپوری سے بقیہ کتب ادب ومعانی وبیان کی تعلیم حاصل کی اور سند فراغ پائی۔

اس وقت ان کے والد مدرسہ چشمہ رحمت کے مدرس اعلیٰ اور شہر کے مفتی اعظم تھے، مولانا محمد شعیب مرحوم بھی اسی درس گاہ سے منسلک ہوکر تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دینے لگے، یہاں تک کہ ۱۳۴۰ھ میں ان کے والد غازی پور اور بنارس کے درمیان ریل کے حادثے میں شہید ہوگئے تو بیٹے نے باپ کی جگہ سنبھالی ۱۳۵۸ھ تک مدرسہ کے پرنسپل صدر مدرس اور شہر کے مفتی اعظم رہے، اس مدت میں ہزاروں طلبہ نے ان سے فیض پایا

اوران کی محفل درس سے سیکڑوں علماء وفضلاء پیدا ہوئے جن میں مفتی عبدالقادر فرنگی محلی، مولانا عبیداللہ بلیاوی (رئیس تبلیغی جماعت) مولانا جمیل احمد رحمتی، مولانا حافظ شمس الہدیٰ رحمتی، مولانا شیخ محمد رحمتی غازی پوری، خاموش غازی پوری جیسے مشاہیر علم وفن شامل ہیں۔

فقہ حنفی اور افتاء میں تبحر اپنے والد سے وراثت میں پایا تھا، فقہی جزئیات پر نظر بڑی وسیع تھی، ہر علم وفن کی کتابیں پڑھاتے تھے، مدرسہ کے علاوہ اپنی قیام گاہ پر صبح وشام طلبہ کو حدیث اور تفسیر کا درس دیتے رہتے تھے، مولانا محمد شعیب صاحب کو اپنے علم پر بڑا ناز تھا، مگر کسی کے سامنے اپنی بڑائی نہیں ظاہر کرتے تھے، بڑے اچھے واعظ بھی تھے، ان کا وعظ سلف صالحین کے انداز کا ہوتا تھا، ادبیت ولفاظی کے تکلفات سے دور رہ کر سیدھا سادہ وعظ فرماتے تھے، طب وحکمت ان کے گھر کا فن تھا، طبابت بھی کرتے تھے، عموماً صبح کو مریضوں کو دیکھتے تھے، وضعداری، سادگی اور تواضع میں اپنے خاندان میں سب سے نرالے تھے۔

مولانا کی کسی مستقل تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، البتہ فتاویٰ کئی ہزار کی تعداد میں لکھے ہیں، اگر ان کو مرتب کر کے شائع کیا جائے تو کئی جلدوں میں فقہی معلومات کا بیش بہا اور مستند ذخیرہ بن سکتا ہے، آخر زمانہ میں غازی پور میں زیادہ رہنے لگے تھے، گھر آتے تو مدرسہ کی ضروریات سے جلد ہی واپس چلے جاتے تھے، آخری بار شروع شعبان ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۹۶۵ء کو گھر آئے تو چند دن بال بچوں میں رہ کر واپس ہونے کا ارادہ کر رہے تھے، جس دن صبح کو غازی پور جانے والے تھے دو چار دست آئے اور یکشنبہ ۱۸ / شعبان ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۲ / دسمبر ۱۹۶۵ء کو دس بجے دن میں انتقال فرما گئے اور اسی دن آبائی قبرستان میں اپنے چچا مولانا احمد حسین صاحب کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ (تذکرہ علمائے مبارک پور ص ۲۵۴ تا ۲۵۷)

حضرت مولانا محمد شفیع بانیٔ مدرستہ الاصلاح

حضرت مولانا محمد شفیع ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں ''سیدھا سلطان پور'' میں پیدا ہوئے، جو قصبہ سرائے میر سے چار میل کے فاصلہ پر شمال مشرق میں واقع ہے۔ آپ کا تاریخی نام ابوالبرکات محمد شفیع خاں ہے، اس حساب سے سنہ ولادت ۱۸۶۶ء مطابق

۱۲۸۳ھ ہے آپ کے والد کا نام کریم بخش خاں تھا، بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو آپ کے حقیقی چچا حافظ قادر بخش اور حافظ فضل کریم نے آپ کی پرورش و پرداخت کی، مولانا محمد شفیع کے خاندان میں دینی تعلیم بھی تھی اور دینداری بھی، اور نہ صرف یہ کہ کھاتا پیتا خاندان تھا؛ بلکہ اپنی پرہیزگاری اور پابندیٔ شریعت کی بنا پر اطراف و دیار میں ایک ممتاز خاندان شمار کیا جاتا تھا۔

سات برس کے ہوئے تو آپ کے چچا حافظ قادر بخش صاحب ان کو دانا پور پٹنہ لے گئے جہاں وہ مدت سے تعلیمی خدمات پر مامور تھے وہ پورے شہر دانا پور میں اپنی شرافت اور بزرگی کی بنا پر نہایت احترام وعزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، ان کی فیاضی، بے لوثی اور خشیت وتقویٰ کے سبھی معترف تھے اور احتراماً نام کے بجائے تمام لوگ بڑے حافظ صاحب سے آپ کو مخاطب کرتے تھے۔

حافظ قادر بخش نے ہونہار بھتیجے کی تعلیم وتربیت پر خصوصیت کے ساتھ توجہ کی، پہلے قرآن حفظ کرایا، اردو اور فارسی کی تعلیم دی، پھر شہر دانا پور میں ناریل گھاٹ کے مدرسہ میں داخل کردیا، یہ مدرسہ اس زمانے میں اہلحدیثوں کا ممتاز مدرسہ سمجھا جاتا تھا، بہار کے جید علماء اور صادق پور کی بعض اہم شخصیتیں اس میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہی تھیں اور صدارتِ تدریس کے منصب پر مولانا فیض اللہ مئوی تلمیذ مولانا سخاوت علی جونپوری جلوہ افروز تھے۔ مولانا فیض اللہ صاحب مولانا محمد شفیع کی ذہانت وفطانت اور فطری صلاح وتقویٰ سے بہت متاثّر تھے اس لیے بہت زیادہ شفقت فرماتے۔

مولانا محمد شفیع صاحب نے عربی ادب، معقولات اور منقولات کی مکمل تعلیم مدرسہ دارالحدیث ناریل گھاٹ دانا پور ہی میں پائی، رفقائے درس میں مولانا ابوالحسنات عبدالغفور دانا پوری اور مولانا ابوالمکارم محمد علی مئوی تھے، ان دونوں کے مولانا سے نہایت مخلصانہ تعلقات تھے، مولانا عبدالغفور کی بعض تالیفات پر آپ نے حواشی بھی لکھے۔

۱۳۰۶ مطابق ۱۸۸۹ء میں تعلیم سے فراغت حاصل کی اس موقع پر مولانا فیض اللہ نے جو سند فضیلت عنایت فرمائی اس سے مولانا کی صلاحیت وقابلیت کا پتہ چلتا ہے، سند کے

تحریری الفاظ یہ ہیں:

الحمد للہ رب العالمین والصّلوٰۃ والسلام علیٰ خیر خلقہٖ محمد واٰلہٖ وصحبہ اجمعین اما بعد فان العالم الفهامة والخبر العلامة حافظ القرآن المولوی اباالبرکات محمد شفیع خان سلمه المنان من آفات الزمان قرأ علیّ الکتب الدرسیه باسرها معقولها ومنقولها واتقن العلوم کلها فروعها واصولها وکتب الاحادیث النبویة اکثرها کصحیح البخاری الجامع والصحیح للمسلم والسنن لابی داؤد والجامع للترمذی، والمؤطا للامام مالک، ومشکوة المصابیح، فاجزته لجمیع مرویاتی وانا العبد الفقیر الی اللہ محمد فیض اللہ الولی اللّٰهی المحمدی کما اجازنی القطب العارفین زبدة الفقهاء والمحدثین مولانا سخاوت علی الجونفوری المحمدی قدس سره وهو قد حصل الاجازة والقراءة من المحقق النبیل والفاضل الجلیل مولانا محمّد اسماعیل الشهید وهو قد حصل القرأة والاجازة من شیخ الهند شاه عبدالعزیز الدهلوی ومن مولانا احمد اللہ بن دلیل اللہ الانامی وهو قد حصل القرأة والاجازة من الشاه محمد اسحاق المحدث الدهلوی قدس سره فیرویٰ بشرط مراجعة الشروح والمطالعة الکتب والتدبر فی معانیه والتفکر فی کل مایلیق به التفکر من مبانیهٖ وصلی اللہ علیٰ خیر خلقهٖ محمد واٰله وصحبه اکمل الصلوات۔ کتب فی ۱۳۰۶ھ

محمّد فیض اللہ

اس کے علاوہ ایک اور سند سنن نسائی کی بھی دی جس میں امام نسائی تک سلسلۂ تلمذ کی فہرست دی گئی ہے۔

اس زمانے میں دہلی کے اندر میاں صاحب سید نذیر حسین محدث دہلوی کے درس حدیث کی بڑی شہرت تھی، چنانچہ دہلی جا کر میاں صاحب سے بھی حدیث کے چند اسباق پڑھے اور سند واجازت حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں تک ناریل گھاٹ داناپور کے مدرسہ دارالحدیث میں تعلیم دی پھر اپنے وطن چلے آئے، پہلے اپنے آبائی وطن سیدھا سلطان پور میں تدریسی سلسلہ شروع کیا، پھر بڈہریا اور ہمئی پور میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔

آپ سے جن ممتاز لوگوں نے تعلیم پائی ان میں مولانا عبدالاحد ساکن منجیر پٹی، مولانا زین العابدین ساکن سیدھا، علامہ اقبال سہیل، صوفی عبدالمجید خاں ساکن بڈہریا، مولانا قمرالدین ہمئی پوری ثم دربھنگوی، مفتی محمد ہاشم بہاری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ابتدائے جوانی میں شعروشاعری سے بھی دلچسپی تھی، دانپور میں ابوالعلائی سلسلہ کے ایک بزرگ شاہ کبیر داناپوری تھے، بغرض مشورۂ سخن ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، کلام دیکھ کر انھوں نے حوصلہ افزائی فرمائی اور ایک مشاعرہ میں اصرار کر کے مولانا سے غزل بھی پڑھوائی، مولانا محمد شفیع مرحوم کا خود بیان ہے کہ حاضرین مجلس نے داد دی، منہ در منہ مبالغہ آمیز تعریف وتحسین سے بجائے اس کے کہ میری حوصلہ افزائی ہوتی، سخت شرمندگی ہوئی، حدیث کے اثرات اور اس کی تعلیم سے جو مزاج بن گیا تھا سخت تنبہ ہوا کہ یہ شیطان کا بڑا فریب ہے، ایسی مجلسوں سے احتراز ہی بہتر ہے، چنانچہ اس کے بعد پھر کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی۔

چونکہ مولانا کی تربیت دینی ماحول میں ہوئی تھی، اس لیے تعلیم سے فراغت کے بعد، اصلاحِ باطن، تزکیۂ نفس اور نسبت مع اللہ پیدا کرنے کی طرف دھیان ہوا اور اس دور کے مشہور صاحب دل بزرگ حضرت چاندشاہ ٹانڈوی سے بیعت ہو گئے۔ حضرت چاندشاہ اصطلاحی اور عرفی طور پر باقاعدہ عالم تو نہ تھے، لیکن ان سے سیکڑوں عالم اور بندگان خدا نے باطنی تربیت حاصل کی، ان کی خانقاہ انتہائی سادہ ہوتے ہوئے بھی تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفس کی بے مثال درس گاہ مانی جاتی تھی، مولانا محمد شفیع نے اسی خانقاہ سے روحانی فیض

حاصل کیا، حضرت چاند شاہ مولانا کے متعلق فرماتے تھے کہ ایسا جوانِ صالح کم نظر آیا جو دولت علم کے ساتھ گداز قلب کی غیر معمولی کیفیت بھی رکھتا ہو۔ اسی خصوصیت کی بنا پر شاہ صاحبؒ نے اپنے پوتوں میں سے مولانا نورالحسن اور مولانا فخرالحسن کی بسم اللہ مولانا محمد شفیع ہی سے کرائی۔

مولانا محمد شفیع صاحب کا اعمال واشغال کی جانب انہماک بڑھنے لگا تو اپنی خاص مجلس میں مولانا کو مخاطب کر کے اپنے پوربی لہجے میں فرمایا:

''بھیا شفیع! صفیانہ بکھیڑوں میں زیادہ مت پڑو جتنا کرتے ہو اس سے زیادہ کی آپ کو ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ آپ سے دوسرے طرز کا کام لینے والا ہے، آپ کے ذریعہ مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح ہوگی اور علم دین کا ایسا سرچشمہ پیدا ہوگا جس کا فیضان دور دور تک پہونچے گا۔ چنانچہ حضرت چاند شاہ کی بشارت انجمن اصلاح المسلمین اور مدرسۃ الاصلاح کی شکل میں ظاہر ہوئی، حضرت چاند شاہ المتوفی ۱۳۱۷ھ کی وفات کے بعد مولانا نے حضرت مولانا سیّد محمد امین نصیر آبادی المتوفی ۱۳۴۹ھ کی جانب رجوع کیا اور حضرت سیّد صاحبؒ سے آپ کو خلافت واجازت بھی حاصل ہوئی، حضرت سیّد صاحبؒ بڑے جلالی اور باکمال بزرگ تھے، دعوت وارشاد کے ساتھ ازالۂ بدعات میں بیحد متشدد تھے، ان سے جب مولانا محمد شفیع کو قربت اور روحانی ارتباط حاصل ہوا تو اصلاحِ دینی کا جذبہ اور بھی ابھر گیا، اس سے پہلے بھی وہ معاشرتی اصلاح کے لیے وعظ کہا کرتے تھے، مگر اب ان میں اور بھی تازگی آ گئی اور حضرت سیّد صاحب کی اتباع میں انسداد شرک وبدعات اور رسومات کے مٹانے کی فکر دامن گیر ہوئی، اعظم گڈھ کے دیہاتوں میں نوابانِ اودھ کے اثر سے سنی مسلمانوں میں تعزیہ داری کی بدعت جاری ہو گئی تھی، مولانا نے اس کے ختم کرنے کا منصوبہ بنایا، اس کے لیے گاؤں گاؤں کا دورہ کیا اور وہاں کے سربرآوردہ لوگوں سے مل کر دھیرے دھیرے بہت سی بستیوں سے اس بدعت کا خاتمہ کرادیا۔

اس وقت مسلمانوں کی ہر برادری میں جہالت اور غیر قوموں کے میل جول سے بہت سی غلط رسمیں رواج پا گئی تھیں، بالخصوص شادی بیاہ کے سلسلے میں حد درجہ اسرافِ بیجا سے کام

لیا جاتا تھا، بڑی تعداد میں بارات لے جاتے، گانے بجانے کا اہتمام ہوتا، نام ونمود کے لیے کپڑے اور زیور میں بڑی بڑی رقمیں خرچ کی جاتیں، جہیز اور ولیمہ میں شہرت طلبی کی غرض سے اپنی حیثیت سے زیادہ روپے صرف کیے جاتے، مولانا محمد شفیع نے وقت کی ضرورت کو سمجھا اور اس پر اپنے وعظ کے ذریعہ قوم کو توجہ دلائی بالآخر اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ دیار کے دیندار، باا ثر لوگوں میں بیداری پیدا ہوئی اور انھوں نے مولانا سے عرض کیا کہ اس کام کو باہم مل کر منظم طور سے انجام دیا جائے، چنانچہ اس سلسلے کی پہلی مجلس مولانا کے گھر پر منعقد ہوئی، اس تنظیم کی جو سب سے قدیم کارروائی دستیاب ہوئی ہے اس میں تحریر ہے:

”امابعد: بغرض اصلاح معاشرت بکوشش چند بزرگاں و مولوی محمد شفیع خاں ساکن سیدھا، بماہ ذی الحجہ ۱۳۲۱ھ (مطابق ۱۹۰۲ء) سیدھا ان کے مکان پر چند خیر خواہانِ قوم مجتمع ہوئے، آپس میں اصلاحِ قوم کے متعلق صلاح ومشورہ ہوا کہ لوگوں کو اس کی فہمائش بذریعہ وعظ وتقریر کی جائے اور اس کا نام انجمن اصلاحِ معاشرت رکھا جائے، مولوی محمد شفیع صاحب اس کے ناظم قرار دیے جائیں کہ وہ ایک اعلان جاری کریں تاکہ لوگوں کو انجمن ہذا سے اطلاع حاصل ہو، چنانچہ حسب رائے انجمن اب تک برابر جلسے ہوتے رہے ہیں، البتہ بوجہ طاعون بعض ماہ میں جلسہ ملتوی رہا، اب تک کل بارہ جلسے مختلف مواضع میں بایں تفصیل ہوئے، سیدھا، مرزاپور، سرائے میر، سکرور، نیادج، بڈھریا، نظام آباد، سہریا، مسلم پٹی، سیدھا باردوم، منجیرپٹی، نیاوج باردوم۔“

اس انجمن کے لیے جو دستور بنایا گیا تھا اس میں گیارہ دفعات تھیں، جن میں بارات ، زیور کی تحدید کی گئی تھی، اور کم سے کم مہر بالخصوص مہر فاطمی کو اختیار کرنے پر زور دیا گیا تھا، دعوتِ ولیمہ حسب حیثیت دینے کی تلقین ہے اور اسراف وخرافات سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

اس کے آخر میں ٹانڈے اور اس کے اطراف کے تین بزرگ محمد شاہؒ، قدرت اللہ شاہ اور مولانا محمد اسماعیل کے دستخط ہیں، اس کے بعد ممبران انجمن اور شرکاء جلسہ کے دستخط ہیں جو

ہر گاؤں کے سر برآوردہ اور قومی وملی امور میں دلچسپی رکھنے والوں میں تھے، چونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لیے اسے نظر انداز کردگیا ہے، جن مواضعات میں اس انجمن کی تنظیم قائم کی گئی ان کے نام یہ ہیں:

سیدھا، مرزاپور، نیاوَج، کجراکول مُسلم پٹی، ابڈیہا، منجیر پٹی، بینا پارہ، سکرور، حسن پور، سرائے میر، طوئی، کوڑیا، کھریواں، منڈیار، برئی پور، ہمیٔ پور، جگدیش پور، بکھرا، سرواں، اساڑھا، سُرہی، کرولی، نظام آباد، سہریا، گھوری پور، پھریہا، رواں، پرسہا، بڈہریا، سنجر پور، کھنڈواری، چھاؤں، دریاپور لہبی، اسحاق پور، بخش پور گہنی۔

بعد میں اس انجمن نے اپنے دائرۂ کار کواور وسیع کیا تو دینی واخلاقی اصلاح کواس کے مقاصد میں شامل کیا گیا، اس کا نام اصلاحِ معاشرت سے بدل کرانجمن اصلاح المسلمین رکھا گیا، انجمن اصلاح المسلمین نے بڑے پیمانے پر نہایت شاندار جلسوں کا اہتمام کیا، اس کے جلسوں میں ہندوستان کے مشاہیر علماء تشریف لاتے، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا عبدالحق حقانیؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا عبدالشکور لکھنویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا ابوبکر شیث فاروقی جونپوری، مولانا سید امین نصیر آبادی، مولانا فیض الحسن میرٹھی اور علامہ شبلی نعمانی نے اس کے جلسوں میں قوم سے خطاب کیا۔

انجمن کے قیام نے اس علاقہ کے مسلمانوں میں معاشرتی اصلاح کے ساتھ دینی تعلیم کا جذبہ بھی پیدا کیااور ایک معیاری درس گاہ کے لیے فضا ہموار ہوگئی، اس وقت تک اس دیار میں جو علماء باہر سے پڑھ کر آئے تھے وہ انفرادی طور پر عربی کی کتابیں پڑھاتے تھے، علوم دینیہ کی منتہی تعلیم کے لیے بہت دور دراز کا سفر کرنا پڑتا تھا، اس لیے انجمن اصلاح المسلمین کے کارکنوں نے یہ محسوس کیا کہ جب تک دینی تعلیم کا پورے طور سے بندوبست نہ کیا جائے گا صحیح اسلامی زندگی پیدا نہ ہوگی اور نہ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی سدھرے گی اس لیے انجمن کے ناظم اور روح رواں مولانا محمد شفیع نے قصبہ سرائے میر کے قریب ایک چٹیل میدان میں ایک درس گاہ کا سنگِ بنیاد رکھ دیا اور اصلاح المسلمین کی مناسبت سے اس کا نام مدرسۃ الاصلاح تجویز کیا، سنگِ بنیاد کی تقریب میں حضرت مولانا سیّد اصغر حسین محدث

دیوبندی کو بھی دعوت دی گئی اور انھیں کے مبارک ہاتھوں مدرسہ کا افتتاح عمل میں آیا۔

مدرسہ کے لیے شروع میں جھونپڑے بنائے گئے اولین استاذ ایک نیک سیرت بزرگ حافظ عبدالحیؒ سرائے میری مقرر ہوئے، اسی زمانہ میں مولانا محمد شفیع صاحب کے شاگرد مولانا عبدالاحد ساکن منجیر پٹی جو مدرسہ قرآنیہ بڑی مسجد میں درس دیا کرتے تھے وہاں سے علیحدہ ہو کر اپنے گاؤں آگئے تھے اور ان کے ساتھ کچھ طلبہ بھی آئے تھے جن کو وہ اپنے گھر ہی پر پڑھاتے تھے، مولانا محمد شفیع نے موقع غنیمت سمجھ کر انھیں مدرسہ میں بلالیا، تھوڑے دنوں تک ان طلبہ کے وظائف منجیر پٹی ہی میں رہے پھر جب مدرسہ میں عمارت تعمیر ہوگئی تو باقاعدہ وہ مدرسہ کے دارالاقامہ میں آگئے، مولانا عبدالغنی پھولپوریؒ، مولانا محمد شبلی ننداویؒ نے اپنی اپنی خدمات پیش کیں، حکیم محمد احمد لہراویؒ، مولانا عبدالغفور جیراج پوری اور مولانا عبدالرحمٰن بہاری بھی مدرس ہو کر آگئے تو منتہی درجوں تک تعلیم ہونے لگی اور بخاری شریف کا افتتاح بھی مولانا سید اصغر حسین محدث دیوبندیؒ ہی نے کرایا، مولانا اس وقت مسجد اٹالہ شہر جون پور میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔

مولانا فیض الحسن میرٹھیؒ کی خدمات حاصل کی گئیں جو ایک بہترین مقرر اور واعظ تھے، انھوں نے مولانا محمد شفیع صاحبؒ کے ساتھ فراہمیٔ مالیات میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔

مولانا شبلی نعمانیؒ انجمن اصلاح المسلمین کے جلسوں میں شرکت کر چکے تھے، انھوں نے کارکنوں کی سرگرمیوں کا قریب سے مطالعہ کیا تھا، جب انھوں نے ندوۃ العلماء میں عربی نصاب کی تحریک اٹھائی تو مدرسہ والوں کو بھی اس کی ترغیب دلائی مولانا محمد شفیع نے ان کی تحریک کو بنظر استحسان دیکھا اور ان سے استدعاء کی کہ انھیں خطوط پر مدرسہ کا بھی نصاب بنادیں اس وقت کے بعض اساتذہ نے اسے پسند نہیں کیا، لیکن اکثر لوگوں نے اس پر آمادگی ظاہر کی، غرضیکہ اس سلسلے میں مولانا شبلی نعمانی کا دخل درآمد مدرسۃ الاصلاح میں شروع ہوا پھر کچھ دنوں کے بعد وہ مستقل سرپرست بنادیے گئے۔

سیّد سلیمان ندوی مرحوم حیاتِ شبلی میں لکھتے ہیں ”مدرسہ کی تحریک اور بنیاد تک میں مولانا کا ہاتھ نہ تھا، لیکن جونہی اس نے برگ و بار پیدا کیا برادری کی ایک نیک تحریک کے

خیال سے مولانا نے اس کی سرپرستی قبول کرلی۔'' (۱۸۶)

علامہ شبلیؒ ندوۃ العلماء میں جس قسم کی تعلیمی اصلاح کے لیے کوشاں تھے اس کے لیے انھیں مدرستہ الاصلاح کی فضا زیادہ سازگار معلوم ہوئی، چنانچہ ۱۹۱۳ء مطابق ۱۳۳۲ھ میں ندوہ سے الگ ہونے کے بعد اپنے شاگرد مولانا مسعود علی ندوی کو لکھتے ہیں: دارالمصنفین درجۂ تکمیل، سرائے میر ابتدائی پورا جامعہ اسلامیہ کا مصالحہ تیار ہے کام کرنے کی ضرورت ہے، سرائے میر والے چند بار آئے وہ تمہارے بہت آرزومند ہیں، وہاں کے موجودہ عملی ناظم اور بانیٔ مدرسہ مولوی محمد شفیع صاحبؒ کی خواہش ہے کہ تم ناظم یا نائب ناظم بن جاؤ اور وہ واعظ بن کر قصبات کا دورہ کرتے رہیں تاکہ مالی حالت کی طرف سے اطمینان ہوجائے، وہ کہتے ہیں کہ مجھے نظم ونسق نہیں آتا۔ (مکاتیب شبلی خط۲۹)

علامہ شبلیؒ کی ایک ہی سال بعد میں وفات ہوگئی، مولوی مسعود علی صاحبؒ انتظامی معاملات میں اچھا تجربہ رکھتے تھے اس لیے علامہ شبلیؒ کی وفات کے بعد جب وہ دارالمصنفین آئے تو ۱۹۱۵ء میں مدرستہ الاصلاح کی انتظامی نگرانی بھی ان کے سپرد کی گئی اور چند سال وہ مولانا محمد شفیع کے معاون رہے، اسی زمانے میں مولانا شبلی متکلم بھوری، مولانا سعید احمد ندوی بندوی، مولانا عبدالصمد ندوی متوطن راجہ پور سکرور اور مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کی خدمات حاصل کی گئیں، مذکورہ بالا اساتذہ کی آمد سے مدرسہ کے تعلیمی معیار اور ادبی دلچسپیوں میں اضافہ ہوا اور ملک کی ممتاز درس گاہوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔

حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں مولانا حمید الدین فراہی حیدرآباد سے مستعفی ہوکر اپنے مکان پھر یہاں آگئے تو مولانا محمد شفیع نے اس موقع کو بہت غنیمت سمجھا اور مولانا کے مکان پھریہا جاکر ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے فکر وعمل کی جولانگاہ مدرستہ الاصلاح کو بنائیں، چنانچہ مولانا فراہی ۱۹۱۹ء میں باقاعدہ مدرسہ میں تشریف لائے اور انھیں مدرسہ کا ناظم بنادیا گیا اور مولانا محمد شفیع ان کے نائب بن کر مدرسہ کی خدمت کرنے لگے، یہ مولانا محمد شفیع کا مدرسہ کے حق میں انتہائی خلوص تھا کہ اپنی جگہ پر اپنے سے بڑے اور تجربہ کار عالم کو لائے تاکہ مدرسہ ترقی کرے اور اس کا دوسرے مدارس کے مقابلے میں ایک ممتاز

مقام ہو جائے۔

مولانا فراہیؒ قرآن حکیم کے زبردست عالم تھے، قرآن میں نظم وترتیب ان کا خاص موضوع تھا، انھوں نے یہی ذوق مدرسہ کے طلبہ واساتذہ میں پیدا کرنے کی کوشش کی، مدرسہ کے فارغ لوگوں میں مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا نجم الدین اصلاحی اور مولانا اختر احسن اصلاحی وغیرہ نے بڑی حد تک ان کے اثرات قبول کیے اور اسی نہج پر انھوں نے قرآنی خدمت کی طرح ڈالی، مولانا فراہی اپنی تمام علمی متاع اور قرآنی تحقیقات اس ادارہ کو حوالہ کر کے ۱۹۲۰ء میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

مولانا فراہی کے بعد ان کے بھائی حاجی رشید الدین فراہی نے مدرسہ کی نظامت سنبھالی، مولانا محمد شفیع اس وقت کافی کمزور اور ضعیف ہو گئے تھے، لیکن اس حالت میں بھی ان کے معاون اور نائب کی حیثیت سے برقرار رہے۔

حاجی رشید الدینؒ کے دور نظامت ۱۹۳۸ء میں جب ایک شاندار عمارت ''دارالحمید'' کے نام سے تعمیر ہوئی تو اس کا سنگ بنیاد بھی مولانا محمد شفیع کے مبارک ہاتھوں سے رکھوایا گیا اس موقع پر رسالہ ''الاصلاح'' کے شمارہ میں مولانا امین احسن اصلاحی نے شذرات میں لکھا ہے۔

> ''یہ مبارک تقریب بانیٔ مدرسۃ الاصلاح مولانا محمد شفیع صاحبؒ کے ہاتھوں انجام پائی، مولانا پیری اور ضعف بصارت کی وجہ سے ایک عرصہ سے خانہ نشین ہو چکے ہیں اور معمولی نقل وحرکت سے بھی عاجز، لیکن سب کے اتفاق سے آخری رائے یہی قرار پائی کہ یہ کام انھیں کے ہاتھوں انجام پائے، چنانچہ مولانا کو اس کے لیے مدرسہ میں لایا گیا جمعہ کی نماز کے بعد اساتذہ وطلبہ ان کو ایک کرسی پر بٹھا کر ان کے پاس لے گئے، انھوں نے پہلی اینٹ اس حالت میں رکھی کہ آنکھیں اشکبار تھیں، زبان مشغول دعا، ہاتھ کانپ رہے تھے اس کے بعد دیر تک ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی، طلبہ واساتذہ نے آمین کہی۔''

پھر اسی مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

مولانا ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے آج سے بیس سال پہلے سرائے میر کے اس چٹیل میدان میں ایک چھوٹے سے جھونپڑے کے لیے تنکے فراہم کیے تھے اور آج انھیں کا ہاتھ تھا جو اس میدان کی پھیلی ہوئی وسیع عمارتوں کے اندر ایک نئی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھنا چاہتا تھا وہ ایک فتح مند سپہ سالار کی طرح اپنی کامیابیوں کی اس نئی منزل میں پہنچ کر زیادہ سے زیادہ خوش ہو سکتے تھے کہ ان کی زندگی کے ساتھ ان کی قوم کی تعلیمی خدمتوں کی ایک وسیع تاریخ وابستہ ہو رہی تھی اور ان کا اخلاص ان کے پروردگار کے یہاں اس قدر مقبول ہوا کہ ارباب علم وفن کی ایک بڑی جماعت کو ان کی کرسی اٹھانے میں عزت محسوس ہو رہی ہے، لیکن انکی آنکھوں میں فتح مندی کی تمکنت کی جگہ جذبہ شکر وسپاس کے آنسو جھلک رہے تھے۔"

بالآخر قوم کا یہ مصلح ومعلم اپنی عمر طبعی میں پہونچ کر فالج کے عارضہ میں مبتلا ہو کر اپریل ۱۹۴۵ء مطابق ۱۳۶۵ھ میں اپنے مکان سیدھا سلطان پور میں رہ گرائے عالم جاودانی ہو گیا اور اپنے آبائی باغ میں سپرد خاک ہوا۔

مولانا محمد شفیع نے تصنیفات نہیں چھوڑیں دانا پور کے دورانِ قیام میں اپنے دوست مولانا عبدالغفور دانا پوری کی بعض کتابوں پر حاشئے لکھے، مولانا سخاوت علی کے انتخاب کردہ حدیث کے مجموعہ "القویم فی احادیث النبی الکریم" کی شرح لکھی اور ایک کتاب "تذکرۂ ایمانیہ" کے نام سے تصنیف کی، لیکن وہ تمام مسودات ضائع ہو گئے اور اب ان کا پتہ نہیں چلتا۔ ان کی سب سے بڑی یادگار مدرستہ الاصلاح ہے اور یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

مولانا مرحوم پاکیزہ صورت بھی تھے اور پاکیزہ سیرت بھی، فطری طور پر نہایت نرم دل، حلیم الطبع اور سادہ مزاج تھے دین ودنیا کے ہر کام میں اتباع سنت کا لحاظ رکھتے تھے، وضع قطع اور رہن سہن قدیم علماء اور بزرگوں کی روش پر تھی، عام طور سے لباس سادہ کرتہ پائجامہ اور گول ٹوپی پہنا کرتے، البتہ عیدین اور جلسوں کے موقع پر عمامہ اور چغہ بھی زیب تن کرتے، ان کی شخصیت میں خاص کشش اور محبوبیت تھی، ایک بات وہ خود بیان

فرمایا کرتے تھے کہ میری تربیت چچا نے ایسے طریقہ پر کی کہ آٹھ برس کی عمر سے نماز باجماعت کی عادت پڑی تو اب تک قائم ہے، ابتدائے عمر سے فرائض وواجبات، سنن ونوافل اور اوراد ووظائف کی جو پابندی اختیار کی تو بحمد اللہ ان میں فرق نہ آیا۔

قرآن پڑھتے تو اس میں سوز وگداز کی کیفیت ظاہر ہوتی، اکثر نماز کی امامت کرتے اور قرأت کرتے تو معلوم ہوتا کہ خاص کیفیت طاری ہے۔

مولانا حمید الدین فراہیؒ فرماتے تھے کہ مولانا قرآن پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا نزول ہو رہا ہے، اپنی مجلسوں میں شعراء کا کلام اکثر پڑھا کرتے، فارسی ادب کا ذوق نہایت ستھرا تھا، سعدیؒ، عطارؒ، نظامیؒ اور مولانا رومؒ کے کلام سے بڑا انس تھا، اردو کے شعراء میں خواجہ میر درد، حضرت نیاز بریلوی، غلام امام شہید، حالی، اکبر اور مولانا شبلی کے اشعار پسند کرتے اور پڑھتے تھے، مسدسِ حالیؔ اور شہیدؔ کے اشعار تو اپنے وعظ میں بھی لطف لے لے کر سناتے۔ مولانا شبلی نے ایک مرتبہ فرمایا کہ مولوی صاحب نے تعلیم تو اہل حدیثوں کے یہاں پائی ہے، لیکن ان کا ادبی ذوق ان سے بالکل الگ ہے، مولانا نے اپنے پیچھے پانچ صاحبزادے اور دو لڑکیاں چھوڑیں، صاحبزادوں کے نام بالترتیب یہ ہیں: مولانا فیض الرحمٰن اصلاحی، مولانا عزیز الرحمٰن اصلاحی سابق مدیر ''کونین'' گھورکھپور، حافظ حبیب الرحمٰن ناظم مدرستہ الحفاظ کلکتہ، مولانا عبد الرحمٰن پرواز اصلاحی استاذ عربی سیلر ہائی اسکول بمبئی، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی ایم اے پی ایچ ڈی، ریڈر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، آخر الذکر دونوں حضرات کئی کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی دنیا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، خصوصاً ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کا شمار اردو کے عظیم نقادوں میں ہے۔

(معلومات از مولانا عبد الرحمٰن پرواز خلف رشید مولانا محمد شفیع صاحب)

مولانا محمد صابر مئویؒ

مولانا ابو الحسن محمد صابر بن حافظ محمد اسمٰعیل بن شیخ بدھو مئوی حنفی ۱۸۶۶ء کے حدود میں ضلع اعظم گڈھ کے مشہور علمی وصنعتی قصبہ مئو میں پیدا ہوئے، ابتداء سے کتب متوسطات تک

مولانا سلطان احمد بانئ مدرسہ دارالعلوم مئو اور دیگر اساتذہ سے پڑھا، اس کے بعد کانپور جا کر مولانا احمد حسن کانپوریؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر بقیہ کتب فنون کی تحصیل و تکمیل کی۔

تعلیمی سلسلہ کے مکمل ہو جانے کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ شروع کیا، مدرسہ دارالعلوم مئو میں استاذ مقرر ہوئے اور عرصۂ دراز تک اس مدرسہ میں تدریسی خدمات انجام دیں، یہاں سے علیحدگی کے بعد کچھ دنوں مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں بھی مدرس رہے، اس دیار میں بے شمار طلبہ نے مولانا محمد صابر سے فیض پایا، مولانا حبیب الرحمٰن محدث مئوی اور مولانا عبداللطیف نعمانی جیسے اساطینِ علم وفن آپ کے تلامذہ کی فہرست میں شامل ہیں، تعلیم وتدریس میں مولانا محمد صابر کا ایک خاص انداز تھا، طلبہ کی تعلیم و تربیت میں کسی قسم کی رعایت آپ پسند نہ کرتے تھے، درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف میں بھی آپ کو مہارت حاصل تھی، تصانیف میں ''نظام الفوائد'' فارسی کے قواعد میں دو جلدوں میں ہے، اس پر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بڑی شاندار تقریظ لکھی ہے، اس کتاب میں فارسی قواعد کو بڑے آسان اور سہل طریقے میں مثالوں کے ساتھ سمجھایا گیا ہے۔ فارسی کے ابتدائی طلبہ کے لیے یہ کتاب بہت ہی مفید ہے۔

شرحِ مقامات: یہ کتاب مقامات حریری کی عبارتوں کی تشریح و توضیح میں لکھی گئی ہے۔

یکم نومبر ۱۹۴۹ء میں آپ نے انتقال فرمایا اور آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔

حضرت مولانا محمد صابر بن عنایت اللہ مئویؒ

حضرت مولانا محمد صابر بن عنایت اللہ بن خوشحال والد ماجد محدثِ عصر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی مدظلہ العالی علماء مئو میں اپنے زہد و تقویٰ اور اخلاق و خصائل کے اعتبار سے نمایاں مقام کے مالک تھے، محدث اعظمی اپنی یادداشت وفیات الاعیان میں لکھتے ہیں:

''پدر بزرگوار ولی نعمت ایں فقیر عالم باسند و تلمیذ مولانا عبدالغفار و اخویہ و در طریق چشتیہ مرید حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ بغایت متشرع و متقی و زاہد و تہجد گذار و مہماں نواز و بے نفس و خوش اخلاق بودند و کان اوّاباً تلاءً للقرآن'' الخ

میرے والد محترم مستند عالم تھے مولانا عبد الغفار اور ان کے دونوں بھائیوں کے شاگرد تھے، سلسلہ چشتیہ میں حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے مرید تھے، انتہائی پابند شرع، پرہیزگار، عابد و زاہد، مہمان نواز، متواضع اور خوش اخلاق تھے یاد خداوندی میں آہ و بکاء کرنے والے اور کثرت سے قرآن کی تلاوت کرنے والے تھے۔

مولانا محمد صابر مرحوم نے علوم وفنون کی تحصیل حضرت مولانا عبد الغفار عراقی اور ان کے برادر خورد مولانا ابوالحسن عراقی سے مدرسہ احاطہ مولانا شاہ محمد عمر میں کی اور ۱۳۲۹ھ میں حضرت مولانا عبد الغفار کے سامنے صحیح بخاری پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، فراغت کے بعد علماء وصلحاء کے طریقہ کے مطابق علوم دینیہ کی اشاعت وترویج میں لگ گئے اور تقریباً ۳۶ سال تک اپنے محلے کی مسجد میں بڑی عمر والوں کو فارسی اور دینیات کی تعلیم دیتے رہے، اس طویل مدت میں ایک کثیر جماعت نے آپ سے استفادہ کیا۔

مولانا ابوالحسن عراقی مرحوم کے دور نظامت میں مدرسہ مفتاح العلوم مئو کے نائب ناظم بھی رہے، ان گوناگوں علمی ودینی خدمتوں کے ساتھ احسان وسلوک میں بھی بلند مقام پر فائز تھے، ان کے شیخ ومرشد حضرت تھانویؒ انھیں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کے ساتھ بڑا حسن ظن رکھتے تھے جس کا اندازہ حضرت محدث اعظمی کی اس روایت سے ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ والد ماجد نے ان کے ذریعہ ایک رومال حضرت تھانویؒ کی خدمت میں بھیجا، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن دامت برکاتہم نے حضرت تھانویؒ سے عرض کیا کہ والد صاحب نے یہ ہدیہ میں پیش کیا ہے تو حضرت تھانویؒ نے اس کو سر پر رکھ کر فرمایا، یہ آپ کے والد صاحب کا ہدیہ نہیں تبرک ہے۔

مولانا مرحوم کی اس خصوصیت کا تذکرہ اہل مئو آج بھی عام طور سے کرتے ہیں کہ ابتداء بالسلام کی سنت پر مولانا اس شدت کے ساتھ عمل پیرا تھے کہ باوجود کوشش کے کوئی ان سے سلام میں سبقت نہیں کر پاتا تھا۔

تہتر برس کی عمر میں ۱۱رذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو شنبہ کے دن آپ کا وصال ہوا۔

(از افادات مولانا حبیب الرحمٰن محدث اعظمی)

مولانا مفتی محمد صادق برونوی

شیخ مفتی محمد صادق بن شمس الدین صدیقی حنفی برونوی، اپنے عہد کے علمائے کبار میں سے تھے، بعض کتب درسیہ اپنے والد شیخ شمس الدین سے پڑھ کر بقیہ ساری کتابوں کی تحصیل علامہ ملا محمود عمری بھیروی (جون پوری) سے کی، بحث و تحقیق میں اس قدر جہد و سعی کی کہ جملہ علوم میں ماہر اور مسند درس و افتاء کے قابل ہو گئے، اور اپنے والد مرحوم کی جگہ پر مفتی مقرر ہوئے۔

مفتی محمد صادق رحمہ اللہ بڑے متقی، پرہیز گار، قناعت پسند اور نہایت متدین بزرگ تھے، کثرت عبادت اور درس افادہ میں اس درجہ انہماک تھا کہ مسجد و مدرسہ کے علاوہ کہیں نہیں جاتے تھے، ان کے والد کے تلمیذ خاص شیخ رکن الدین بحری آبادی جو شائستہ خاں کے ندیموں میں سے تھے ایک طویل عرصہ کے بعد ان کے یہاں آئے اور بطور ہدیہ کے ایک کشمیری شال انھیں پیش کی، مفتی محمد صادق مرحوم نے اسے قبول نہیں کیا اور فرمایا

ع من دلق را با طلس شاہاں نمی خرم

غایت تقوی اور شدت احتیاط کی بناء پر اپنے استاذ ملا محمود کی اقتداء میں نماز نہیں پڑھتے تھے، کیوں کہ فن فلسفہ میں ان کا انہماک زیادہ تھا۔

منقول ہے کہ ان کے شہر کے امیر نواب اللہ وردی خاں نے انھیں ایک ایسے حکمنامہ پر جو خلاف شرع تھا افتاء کی مہر لگانے کا حکم دیا، تو انھوں نے منع کر دیا، بعد میں بغرض سیر و تفریح اللہ وردی خاں نے اپنے ساتھ انھیں کشتی پر سوار کیا، اور جب کشتی بیچ دریا میں پہنچ گئی تو انھیں مہر لگانے پر مجبور کیا، بوجہ مجبوری مہر اس کے حوالہ کر دی، اس نے مہر ثبت کرنے کی اپنی جیسی ہر کوشش کر ڈالی مگر اس حکمنامہ پر مہر کا نشان نہیں پڑا، تو اسے اپنے کیئے پر شرمندگی ہوئی اور ان کے ورع و تقویٰ کا معترف ہو گیا۔ ۴/ ذی الحجہ ۱۰۶۸ھ کو خدائے رحمان و رحیم کی رحمت کے آغوش میں پہنچ گئے۔ (گنج ارشدی بحوالہ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۴۰۸)

☆ ☆ ☆

مولوی محمد صدّیق چتارویؒ

مولوی محمد صدّیق بن محمد اشرف ۱۲۹۰ھ میں موضع چتارہ ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، فارسی کے نصاب کی تحصیل وتکمیل اپنے والد مولوی محمد اشرف سے کی جو اس دیار میں فارسی کے ماہر اساتذہ میں تھے، عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے بڑے بھائی مولانا محمد عثمان چتاروی سے پڑھیں اس کے بعد رام پور مدرسہ عالیہ میں داخل ہوکر وہاں کے اساتذہ سے علوم مروجہ کی تکمیل کی، فراغت کے بعد اپنے بڑے بھائی مولانا محمد عثمان کے اہتمام میں لکھنؤ سے اخبار ''آئینہ'' جاری کیا۔

مزید حالات وسنہ وفات دستیاب نہ ہوسکے۔ (تذکرہ علمائے حال ص ۸۱)

مولانا محمد صدّیق برئی پوریؒ

حضرت مولانا محمد صدیق بن شیخ منشی قائم علی بن شیخ بخش علی بن شیخ اگھادن برئی پوری اعظمی کے آباء واجداد دراصل بسہی اقبال پور تحصیل لال گنج ضلع اعظم گڈھ کے باشندہ تھے، آپ کے جدّ اعلیٰ شیخ اگھاون نے بسہی سے ترکِ وطن کر کے پورہ نورم (بیسہ) تحصیل پھولپور میں رہنے لگے تھے، بعد میں ان کے لڑکے شیخ بخش علی نے بیسہ سے منتقل ہوکر برئی پور میں بود وباش اختیار کرلی یہیں ۱۸۹۱ء (۱۳۰۹ھ) میں مولانا محمد صدیق صاحب کی پیدائش ہوئی، ابتدائی تعلیم گھر ہی پر مولوی باقر علی ساکن بھدنٹھی سے حاصل کی، قرآن شریف اور اردو کی تعلیم مکمل کرلینے کے بعد مدرسہ حنفیہ جونپور میں وہاں کے استاذ حفظ جناب حافظ قدرت اللہ یونس پوری جونپوری سے حفظ شروع کیا، حفظ مکمل کرلینے کے بعد فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد مولانا ہدایت اللہ خاں رام پوری سے نحو، صرف، منطق اور فلسفہ وغیرہ کی تعلیم شرح جامی تک حاصل کی۔

اس زمانہ میں مولانا ماجد علی مانوی، جونپوریؒ متوفی ۱۳۵۲ھ کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، مولانا کی تعلیمی وتدریسی مہارت کی دھوم مچی ہوئی تھی اور دور

دراز مقامات سے شائقین علم کھنچ کھنچ کر آپ کے حلقۂ درس میں شامل ہو رہے تھے، چنانچہ مولانا محمد صدیق صاحب بھی ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ مولانا محمد صدیق صاحب قدس سرہ ذہین وفطین ہونے کے ساتھ نہایت صالح اور اطاعت شعار تھے اس لئے مولانا ماجد علی ان پر بڑی شفقت وعنایت فرماتے تھے اور ہمیشہ سفر وحضر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے، غرض شرح جامی سے لے کر آخر تک جملہ علوم مروجہ متداولہ کی تحصیل مولانا ماجد علی مرحوم سے کی اور 1918ء مطابق ۱۳۳۷ھ میں فاتحۂ فراغ پڑھ کر سند حاصل کی، اس وقت مولانا ماجد علی صاحب میڈھو ضلع بلند شہر کے مدرسہ میں تعلیمی خدمات انجام دے رہے تھے۔

فراغت کے بعد نواب مکرم علی رئیس کٹک کے مدرسہ میں آپ استاذ مقرر ہوئے اور تقریباً دو سال یہاں رہ کر ۱۹۲۱ء مطابق ۱۳۳۷ھ میں علیحدگی اختیار کر لی، نواب مکرم علی آپ کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور آپ کی علمی لیاقت وصلاحیت کے بڑے مداح تھے، انھوں نے ہر چند کوشش کی کہ مولانا یہاں سے الگ نہ ہوں، مگر مولانا کسی طرح یہاں رہنے پر راضی نہ ہوئے، کٹک کے مدرسہ سے الگ ہو کر مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور ضلع اعظم گڈھ میں صدر مدرس ہو کر آئے اس وقت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری الہ آبادی احیاء العلوم میں مدرس دوم تھے۔ مولانا محمد صدیق صاحبؒ اور مولانا فتحپوریؒ کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے، اس زمانہ میں مولانا فتحپوری کئی بار مولانا صدیق صاحب کے گھر بھی آئے تھے۔ مدرسہ احیاء العلوم میں چھ سال تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دے کر ۱۹۲۷ء = ۱۳۴۶ھ میں یہاں سے بھی مستعفی ہو گئے۔

مولانا کا ایک عرصہ سے یہ خیال تھا کہ تحصیل سگڑی میں کسی مناسب جگہ ایک دینی درس گاہ قائم کی جائے تاکہ وہاں کے مسلمانوں میں دینی تعلیم کی اشاعت اور رواج ہو کیونکہ اس تحصیل میں کوئی دینی تعلیم گاہ نہیں تھی اور یہاں کے مسلمانوں کی دینی حالت نہایت خستہ وناگفتہ بہ تھی، چنانچہ جب مولانا کے مخصوص شاگرد مولوی عبدالحکیم صاحب نے درس نظامیہ کی تکمیل کر لی تو آپ کو ابتدائی تعلیم کے لیے ایک مناسب مدرس خود اپنا تیار کیا ہوا مل گیا،

آپ نے اپنے تخیل کو عملی جامہ پہنانے کی سعی وکوشش شروع کردی، قصبہ جیّن پور تحصیل سگڑی کو اس کے لیے منتخب کیا اور وہاں کے باشندوں سے صلاح ومشورہ کر کے قصبہ کی جامع مسجد (متصل تھانہ) میں جامع العلوم کے نام سے ایک مدرسہ کی داغ بیل ڈال دی اور مولوی عبدالحکیم کو اس کا مدرس مقرر کردیا چھ ماہ کے بعد خود بھی مدرسہ احیاء العلوم سے مستعفی ہوکر آگئے، آپ کے ہمراہ آپ کے برادر خورد جناب حافظ محمد ایوب، مولانا مفتی نظام الدین مفتی دارالعلوم دیوبند، مولی ممتاز احمد گورکھپوری اور مولوی نعیم ساکن ڈھکوا ضلع اعظم گڈھ بھی احیاءالعلوم سے یہیں آگئے، مولانا کے آنے کے بعد باقاعدہ عربی کی تعلیم کا آغاز ہوا، مولانا محمد صدیق صاحب مدرسہ کے اوّل استاذ اور ناظم تھے اور مذکورہ حضرات پہلے طالب علم، مولانا کے اخلاص اور کوششوں سے مدرسہ نے بہت جلد ترقی کرلی اور ضلع کے اہم مدارس میں اس کا بھی شمار ہونے لگا اور دور ونزدیک کے بے شمار طلبہ نے اس سے فیض پایا، مولانا مرحوم زندگی کی آخری سانس تک مدرسہ سے وابستہ رہے اور بغیر تنخواہ کے لوجہ اللہ اس کی خدمت کرتے رہے، گذراوقات کے لیے سرمہ بنا کر فروخت کرتے تھے، مہینہ کے اختتام پر خرچ سے جو کچھ باقی بچ جاتا تھا اس سے مدرسہ کے طلبہ کی دعوت کرتے، اس طرح سے سرمہ کی تجارت سے جو آمدنی ہوتی تھی اسے ماہ بماہ اپنی ذات اور مدرسہ پر خرچ کردیتے تھے، ایک پیسہ بھی پس انداز نہیں کرتے تھے، مولانا کو دینی تعلیم کی اشاعت کا بہت جذبہ تھا، چنانچہ جامع العلوم جیّن پور کے بعد ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۲۹ء میں اپنے دیار میں دو مکاتب جاری کیے: ایک آبائی وطن برئی پور میں جو الحمدللہ اب تک جاری ہے اور آپ کے تلمیذ وبرادر جناب مولوی حافظ محمد ایوب صاحب کی نگرانی میں اس دیار کے مسلمان بچوں کی دینی ومذہبی تعلیم وتربیت کی اہم خدمت انجام دے رہا ہے، دوسرا موضع بھاٹن پارہ تحصیل پھول پور میں جو مولانا کی وفات کے بعد اپنے بانی کی طرح مرحوم ہوگیا۔ مولانا محمد صدیق مرحوم جس طرح علوم ظاہری میں مہارت تامہ رکھتے تھے اسی طرح علوم باطنی میں بھی انھیں دستگاہ حاصل تھی اس وقت کے مشہور مرشد حضرت مولانا بشارت کریم نقشبندی متوطن گڑھل شریف ضلع مظفرپور صوبہ بہار سے ۱۹۲۴ء مطابق ۱۳۴۳ھ میں بیعت کی تھی اور تعلیم وتدریس

کے بعد سارا وقت اوراد و وظائف میں صرف کرتے تھے، علائق دنیوی سے آپ کو کوئی سروکار نہیں تھا، عبادت و ریاضت میں اپنے دیار کے مشائخ وصوفیاء میں آپ امتیازی شان رکھتے تھے، کشف و کرامات میں تو اس وقت ضلع اعظم گڈھ میں آپ کے مقابلہ میں کوئی نہیں تھا، قرآن کی تلاوت کے وقت آپ پر اس طرح گریہ طاری ہوجاتا تھا کہ دیکھنے والے کو ترس آنے لگتا تھا، ایک مرتبہ مغرب کی نماز کی امامت کررہے تھے سورۂ والتین کی قرأت کررہے تھے اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ ٥ پر پہونچے تو فرط گریہ سے چیخ نکل گئی اور بیہوش ہوکر مسجد کے فرش پر مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگے، نمازیوں نے جلدی سے نیت توڑ کر پکڑا، کافی دیر کے بعد مولانا کو سکون ہوا۔ اس طرح کے حالات آخر عمر میں کثرت سے پیش آنے لگے تھے اس لیے آپ نے امامت کرنا چھوڑ دی تھی۔

مولانا بچپن سے زکام ونزلہ کے مریض تھے، آخر عمر میں جب تصوف کی جانب میلان بہت بڑھ گیا، عبادت و ریاضت میں آپ نے بہت زیادہ اضافہ کردیا تو کمزوری کی وجہ سے مرض نے شدت اختیار کرلی، ساتھ ہی اسہال کی بھی شکایت ہوگئی، اس لیے آپ مدرسہ سے گھر چلے آئے، دوا علاج ہوتا رہا مگر مرض میں تخفیف کے بجائے شدت بڑھتی ہی گئی بالآخر ۳ر فروری ۱۹۲۲ء مطابق ۱۳۵۲ھ کو ۴۲ برس کی عمر میں آپ کا انتقال ہوگیا، وفات سے پہلے مولانا نے وصیت کی تھی کہ ''میری نماز جنازہ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری صاحبؒ پڑھائیں گے، چنانچہ مولانا کے یہاں پھولپور آدمی بھیجا گیا، لیکن وہاں جاکر معلوم ہوا کہ مولانا گھر پر نہیں ہیں لکھنؤ گئے ہیں، اب مولانا پھولپوری کی شرکتِ جنازہ کی کوئی صورت نہیں تھی اس لیے مجبوراً غسل وغیرہ دے کر جنازہ اٹھانے کی تیاری ہو رہی تھی کہ مولانا پھولپوریؒ بے شان وگمان اچانک آگئے، مولانا کو دیکھ کر لوگ حیران ہوگئے اور حضرت مولانا محمد صدیق صاحب کی اس آخری کرامت پر سب کے سب متحیر ہوکر رہ گئے۔

مولانا مرحوم کے برادر خرد حافظ محمد ایوب صاحب نے راقم سے بیان کیا کہ حضرت پھولپوریؒ نے اپنے یہاں آنے کا واقعہ یوں بتایا کہ میں ایک ہفتہ سے لکھنؤ میں مقیم تھا، لیکن ادھر دو تین دن سے مجھ پر انتہائی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت طاری ہوگئی، کسی طرح

لکھنؤ میں جی لگتا ہی نہیں تھا آخر مجبور ہو کر میں لکھنؤ سے روانہ ہو گیا اور جب دیدار گنج اسٹیشن پر پہونچا تو وہاں معلوم ہوا کہ آج مولانا محمد صدیق صاحبؒ کا انتقال ہو گیا ہے، چنانچہ وہیں ریل سے اتر گیا اور سیدھے پیدل برئی پور چلا آیا۔

غرض وصیت کے مطابق حضرت پھولپوریؒ نے نماز جنازہ پڑھائی، تدفین کے بعد مولانا نے فرمایا کہ ”ایسی نورانی قبر آج تک میں نے کسی کی نہیں دیکھی، میں نہیں سمجھتا تھا کہ مولوی صدیق صاحبؒ اس درجہ کے آدمی ہیں۔“

مولانا مرحوم نے وفات سے چند روز قبل کئی بار فرمایا کہ ”دریا امنڈ رہا ہے مگر افسوس کہ کوئی سیراب ہونے والا نہیں۔“

مولانا کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے جن میں حضرت مولانا مفتی نظام الدین مفتیٔ دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا عبدالجبار شیخ الحدیث مدرسہ قاسمیہ شاہی مسجد مرادآباد، مولانا عبدالستار شیخ الحدیث دارالعلوم ندوہ، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری، مولوی عبدالحکیم ناظم مدرسہ جامع العلوم جین پور، مولانا احمد علی بہادر گنجی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اور اس دور میں علمی حلقے میں شہرت کے مالک ہیں۔

حضرت مولانا محمد طاہر معروفیؒ

حضرت حاجی حکیم مولانا محمد طاہر بن شیخ پیر محمد ۱۲۷۴ھ میں پورہ معروف میں پیدا ہوئے، پورہ معروف مئو سے پانچ میل کے فاصلے پر شمال مغرب ٹونس ندی کے شمالی کنارے پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ مولانا نے ابتدائی تعلیم مقامی اساتذہ سے حاصل کی اس کے بعد جون پور جا کر ہادیٔ بنگال حضرت مولانا کرامت علیؒ متوفی ۱۲۹۰ھ سے حفظ و قراءت کی تکمیل کی اور ساتھ ہی مولانا کرامت علی سے فن کتابت و خطاطی اور بنوٹ بھی سیکھا، مولانا کرامت علی فن خطاطی اور بنوٹ میں یگانۂ روزگار تھے، چنانچہ آگے چل کر شاگرد رشید بھی ان فنون میں نادرۂ روزگار ہو کر اطراف و جوانب میں مشہور رہوا، ان فنون میں مہارت حاصل کر لینے کے بعد عربی تعلیم کی جانب متوجہ ہوئے اور اس وقت کے شہرۂ آفاق عالم حضرت مولانا

سخاوت علی جون پوریؒ متوفی ۱۲۷۴ھ سے فنونِ متداولہ کی تعلیم و تحصیل کی۔ حضرت مولانا سخاوت علیؒ آپ کی خداداد صلاحیتوں کو دیکھ کر بڑے اہتمام اور محبت وشفقت سے پڑھاتے تھے، مولانا نے یہیں درسِ نظامیہ کے اکثر حصہ کی تحصیل کی اور بقیہ کتابیں مدرسہ غفاریہ رسڑا ضلع بلیا میں مولانا تراب علی لکھنوی متوفی ۱۲۸۱ھ سے پڑھ کر فاتحۂ فراغ پڑھی۔

تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد ۱۲۵۸ھ میں حرمین شریفین کا مقدس سفر فرمایا اور دو سال دیارِ پاک میں رہ کر علمی و روحانی فیوض سے دامن مراد بھر کر جمادی الاولیٰ ۱۲۶۰ھ میں وطن مالوف مراجعت فرمائی، اسی مبارک سفر میں انھوں نے حضرت مولانا شاہ اسحاق (۱) مہاجر مکّی سے حدیث کی تحصیل کی اور سند واجازت حاصل کی حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر مولانا کو جو سند عنایت فرمائی تھی اس کی نقل یہ ہے:

"بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین والصلوة علیٰ سید المرسلین محمد وآلہٖ وصحبہ اجمعین. اما بعد فیقول خادم علماء الاٰفاق محمد اسحاق عفی اللّٰہ عنہ وتجاوز عن السیأت ان المولوی محمد طاہر طہرہ اللّٰہ فی الباطن والظاہر قد قرء علیّ الاحادیث النبویہ علیٰ صاحبہا الف الف تحیة وصلوٰة زکیة فعلیہ ان یشغل بقرأة علم الاحادیث وتعلیمہ بشروطہ المعتبرة عند اہلہ واوصی لہ بتقویٰ اللّٰہ وسنة رسول اللّٰہ وان یداوم علیٰ طاعة اللّٰہ وذکرہ فی الخلوات والجلوات وان یجتنب عن

(۱) حضرت مولانا شاہ اسحاق بن محمد افضل محدث دہلوی نواسہ حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ کی ولادت ۸ / ذی الحجہ ۱۱۹۷ھ یا ۱۱۹۶ھ میں دہلی میں ہوئی، ابتدائی نحو وصرف کافیہ تک کی تعلیم مولانا عبدالحیٔ بڈھانوی سے حاصل کی اور بقیہ جملہ علوم کی تحصیل حضرت شاہ عبدالقادر مفسر دہلوی سے پائی تھی اور حدیث کی سند واجازت شاہ عبدالعزیز سے حاصل کی شاہ صاحبؒ انھیں اپنے لڑکے کی طرح مانتے تھے، چنانچہ شاہ صاحب کی جملہ جائداد کے مالک آپ ہی ہوئے اور ان کے جانشین کی حیثیت سے مسند درس وافادہ پر بیٹھے، آخر میں ۱۲۵۸ھ میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کر لی تھی، وہیں ۲۷ / رجب ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی اور حضرت سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے جوار میں دفن ہوئے، آپ کا فیض ہندوستان میں اس قدر عام ہوا کہ آپ کے سلسلے کے علاوہ کوئی اور سلسلۂ سند باقی ہی نہ رہا۔ ذالک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء۔

المعاصی والبدعات وأخر دعوانا عن الحمد للہ ربّ العالمین.

حررہ الثانی من شھر جمادیٰ الاولیٰ سنۃ ستین بعد الالف والمأتین.

زیارت حرمین سے واپسی کے بعد اپنے آبائی وطن کو اپنی دینی وعلمی خدمات کا مرکز بنایا اور تقریباً نصف صدی تک یہاں کلام اللہ کی تعلیم واشاعت میں سرگرم عمل رہے، ساتھ ہی اہل بستی کی عمومی اصلاح کی غرض سے ہر جمعہ کو وعظ فرماتے جس میں بدعات اور غلط رسم ورواج کی موثر انداز میں خرابیاں بیان کرتے، چنانچہ آپ کے اصلاحی وعظموں کا یہ اثر ہوا کہ پورہ معروف میں اب تک بدعات کا نام ونشان نہیں ہے۔

مولانا کو قرآن حکیم سے اس درجہ شغف تھا کہ طلبہ کو قرآن خود پڑھاتے تھے، روزانہ دس گیارہ پارے کی تلاوت کرتے اس کے علاوہ ایک پارہ کی روزانہ کتابت کرتے تھے۔ مولانا فن کتابت میں ید طولیٰ رکھتے تھے آپ کے دستِ خاص کے لکھے ہوئے قرآن حکیم کے چند نسخے اور بخاری، مسلم، موطا امامِ مالک، الجامع الصغیر، مشکوٰۃ، مُسند امام اعظم، مجالس الابرار، حصن حصین، مواہب الحکم کے ایک ایک نسخے اب بھی موجود ہیں، سہ رنگ وہفت رنگ کے بیل بوٹے بھی بہت خوب بناتے تھے، جو آج بھی اسی چمک دمک کے ساتھ آپ کی کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

مولانا علم ظاہر کے ساتھ سلوک وطریقت میں بھی اعلیٰ مقام پر فائز تھے اور حضرت مولانا کرامت علی جونپوری کے مجاز تھے، راتوں کو بہت کم سوتے تھے رات کے پچھلے پہر بستر سے الگ ہوجاتے اور نماز تہجد کے بعد قرآن کریم کی تلاوت میں منہمک ہوجاتے، دس پارے کی تلاوت نہایت انشراح وانبساط سے کرتے بعد ازاں نماز فجر باجماعت ادا فرماتے پھر اوراد ووظائف میں مشغول ہوجاتے، چونکہ آپ ایک ماہر طبیب بھی تھے اس لیے وظائف سے فارغ ہوکر مریضوں کو دیکھتے اور نسخہ لکھتے، غریب اور نادار مریضوں کو دوائیں مفت دیتے تھے، ان جملہ امور کے بعد زائرین ومتوسلین سے ملتے اور ان کی ضروریات پوری کرتے تھے۔

مولانا ان علمی و روحانی کمال کے علاوہ جسمانی طاقت میں بھی نادرۂ روزگار تھے اور اس سلسلے میں ان کے ایسے ایسے واقعات مشہور ہیں جن کو لوگ بمشکل باور کریں گے، پہلوان ہونے کی بنا پر روزانہ ورزش کا بھی معمول تھا جس میں پچاس سیر کی پتھر کی سل، بیس سیر کا مگدر اور آٹھ سیر وزن کا یزم گھماتے تھے، یہ سامان آپ کی یادگار میں ابھی موجود ہیں، مولانا محمد عثمان معروفی مولف حیاتِ طاہر نے حیات طاہر کی تالیف کے زمانے میں ان سامانوں کو وزن کرایا تھا۔

مولانا محمد طاہر مرحوم مقامی اصلاح کے ساتھ حسب موقع اطراف وجوانب کا دورہ بھی اصلاح وتربیت کے سلسلے میں فرماتے تھے جس سے خلقِ خدا کا بہت نفع ہوتا تھا۔ ۷۳ سال کی عمر میں ۲۴/ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ کو آپ کا وصال ہوا۔ اسی دن اپنے آبائی مقبرہ متصل محلّہ بلوہ میں بجانب مشرق املی کے درخت کے زیر سایہ دفن کیے گئے، آپ کا جنازہ جنازۂ مشہودہ تھا، پورہ معروف میں شاید ہی کسی میت کے جنازے میں اتنا بڑا اجتماع ہوا ہو۔ مرورِ ایام کی وجہ سے قبر کا نشان اب موجود نہیں ہے۔ مولانا کے تفصیلی حالات کے لیے حیات طاہر کا مطالعہ کیا جائے۔

مولانا کا سن پیدائش اظہر حسن، مدت عمر حبیب الواحد اور سال وفات حافظ محمد طاہر
۱۲۲۴ ۷۲ ۱۲۹۶
کے مادوں سے برآمد ہوتا ہے۔

مولوی محمد طفیل املویؒ

مولوی حاجی محمد طفیل املو میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مقامی طور سے حاصل کی اس کے بعد مولانا عبدالعلیم رسول پوری کی خدمت میں آکر پڑھنے لگے، پھر یہاں سے مدرسہ حنفیہ جون پور چلے گئے اور وہاں مولانا ہدایت اللہ خاں رامپوری سے پڑھا، بعد ازاں مدرسہ چشمۂ رحمت میں جا کر مولانا عبدالعلیم اور مولانا محمد فاروق چریاکوٹی وغیرہ سے پڑھا اور یہاں سے نکل کر مدرسہ عالیہ رامپور میں داخل ہوئے، جہاں مولانا عبدالحق خیر آبادی، مولانا

منور علی رام پوری، مولانا محمد طیب عرب مکی، مولانا وزیر احمد رامپوری اور دیگر اساتذہ سے علوم عقلیہ ونقلیہ کی تکمیل کی، فراغت کے بعد خیر آباد ضلع سیتاپور کے کسی مدرسہ میں مدرس ہوئے اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول چھپرا (بہار) میں ہیڈ مولوی ہوئے مگر دوسال کے بعد وہاں سے علیحدہ ہوکر بمبئی چلے گئے اور مدرسہ کلوجعفر میں تعلیم دینے لگے پھر مدرسہ ہاشمیہ میں مدرس ہوئے، اسی دوران حج وزیارت سے مشرف ہوئے واپسی پر پانچ برس وطن میں رہے پھر بمبئی آکر مدرسہ رحیمیہ میں پڑھانے لگے یہاں تک کہ بمبئی ہی میں ۴/اگست ۱۹۵۸ء میں انتقال کیا اور یہیں دفن کیے گئے۔

مولوی طفیل مرحوم کے مزاج پر معقولات کا غلبہ تھا اس لیے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، خیر آبادیت کی حرارت بڑھاپے تک باقی تھی، سادگی اور بے تکلفی میں بہت آگے تھے۔ (تذکرہ علمائے مبارک پور ص ۲۷۲ ص ۲۷۳)

مولانا محمد ظہیر گھوسویؒ

مولانا حافظ محمد ظہیر بن حافظ محمد ایوب کی ولادت قصبہ گھوسی ضلع اعظم گڈھ کے محلّہ مداپور میں ہوئی، حفظِ قرآن اور اردو کی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی، فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے چچا مولوی محمد اسحاق سے پڑھیں پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنے بڑے بھائی مولانا محمد عمر گھوسوی کے ہمراہ مختلف علمی مراکز کی خاک چھانی اور آخر میں دیار پورب کے مشہور محدث اور معقولی عالم حضرت مولانا ماجد علی جونپوری کی خدمت میں پہونچے اور فقہ، حدیث، تفسیر، منطق فلسفہ وغیرہ کی مروجہ کتابیں پڑھ کر ۱۳۲۲ھ میں سند فراغت حاصل کی، مولانا ماجد علی قدس سرہ نے اس موقع پر انھیں جو سند عنایت فرمائی تھی اس سے مولانا کی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے، سند کے الفاظ یہ ہیں:

"اما بعد فیقول العبد المفتقر الیٰ رحمة ربه الولی المدعو بماجد علی الحنفی مذهبا والمانی الکلانی الجونفوری مولدا وموطنا تجاوز اللّٰہ عن ذنوبه واثامه وعفی عن سیأته واجرامه ورضی عنه

وعن مشائخه الكرام يوم الحساب والقيام ان اللبيب الاريب احب الاخلال الرضى الخلال الزكى الخصال الفاضل الامثل العالم الافضل حاز قصب السبق فى مضار الذكاوة وغاص على غرر الفرائد فى بحار الفطانة له فطرة سليمة وفطنة مستقيمة وقريحة نقاوة وطبيعة وقادة وراية رايعة وفطانة بارعة ذوفهم صائب وذهن ثاقب المولوى محمد ظهير ابن الحافظ محمّد ايوب متوطن القرية المعروفة بالكهوشى صانه اللّٰه الخبير والبصير عن الشرير والضرير وقد قرأ علىّ وسمع منى كثيراً من الكتب الدائرة فى درس العلماء الاعلام والمشائخ الكرام فمن التفسير البيضاوى ومن الحديث الصّحيح البخارى والجامع المسند للترمذى والسنن لابى داود والسنن للنسائى والسنن لابن ماجة القزوينى رضى اللّٰه تعالٰى عنهم اجمعين وافاض علينا من بركاتهم وجمعنا معهم يوم الدين بفضله العميم وكرمه العظيم ومن الفقه الهداية ومن الكلام حاشية شرح المواقف من فن الامور العامة للسيّد الزاهد الهروى ومن المنطق شرح تصورات السلم للقاضى مبارك وشرح تصورات السلم لمولانا محمد حسن وشرح تصديقات السلم للفاضل حمد الله والحواشى الزاهدية على الرسالة القطبيه مع حاشيته لمولانا غلام يحيى ومولانا بحرالعلوم وحواشى الزاهدية على شرح التهذيب الجلالى مع حاشيــة مولانا بحــرالعلوم ومن الفلسفة شرح هداية الحكمة للميبذى وشرح هداية الحكمة... والشمس البازغة وشرح هداية الحكمة للصدر الشيرازى وطلب منى الاجازة فانا اجيزه لتعليم الكتب وتدريسها ودروس الاحاديث

وترویجها بشرط الضبط والاتقان فی الالفاظ والمعانی الخ.

تکمیل تعلیم کے بعد درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور کچھ دنوں تک دارالعلوم مئو ضلع اعظم گڈھ میں مدرس رہے، پھر انجمن اسلامیہ گورکھپور میں مدرس دوم کی حیثیت سے تقرر ہوا، کچھ دنوں کے بعد ترقی کر کے مدرس اوّل کے منصب پر فائز ہوئے، گورکھپور میں ۲۵ برس سے زائد عرصہ تک آپ نے تعلیمی خدمت انجام دی، لیکن آخر میں آپ کا دماغی توازن بگڑ گیا تو آپ اس خدمت سے علیحدہ ہو کر گھر چلے آئے، انجمن کی انتظامیہ نے آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر دس روپیہ ماہانہ بطور وظیفہ دینا طے کیا، جو تا حیات آپ کو ملتا رہا، اس زمانہ میں مولانا مستقل اپنے گھر میں عزلت نشین رہے اور اپنا بیشتر وقت تلاوت قرآن اور عبادت وریاضت میں بسر کرتے، دماغی توازن خراب ہوتا تو پوری پوری رات محبتِ رسول میں ڈوبے ہوئے اشعار اور مناجات بآواز بلند پڑھتے اور گھر سے باہر نکل کر دیوانہ وارگشت کرتے ایسی حالت میں کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ قریب جائے، شورش کی اس کیفیت میں بھی اپنے بڑے بھائی مولانا محمد عمر کا بہت لحاظ وادب کرتے تھے۔

شوریدگی کی اس حالت میں کبھی کبھی راستہ چلتے ہوئے لوگوں پر لاٹھی چلادیتے، لیکن لوگ برا نہ مانتے بلکہ فخر سے کہتے تھے کہ آج میاں بابا نے مجھے مارا ہے۔

مولانا علمائے دیوبند کے بہت مدّاح تھے اور اکثر ان کے واقعات بیان کرتے رہتے تھے، ایک مرتبہ اپنے چھوٹے صاحبزادے جناب مولوی نجم الدین ایم اے کے پوچھنے پر کہ "آپ کس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔" فرمایا: "میں جمعیۃ العلماء کا خادم ہوں۔"

مولانا جملہ علوم میں تبحر کا درجہ رکھتے تھے اور جب تک دماغی کیفیت درست رہی بڑی شان سے تدریسی خدمات انجام دیں۔ حضرت مولانا قاری ریاست علیؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم مئو نے ایک مرتبہ آپ کی علمی صلاحیتوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ "جہاں تک علمی استعداد اور صلاحیت تدریس کا تعلق ہے اس میں مولانا اپنے بڑے بھائی مولانا محمد عمر سے بہتر تھے۔

علومِ ظاہری کے ساتھ مولانا کو علم تصوف میں کامل دستگاہ حاصل تھی اور شاہ ابوالخیر دہلوی کے صاحبزادے مولانا شاہ بلال حسن فاروقی سے خلافت واجازت حاصل تھی، لیکن دوسروں کو بیعت کرنے سے کتراتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کی اہلیہ نے عرض بھی کیا کہ "جب آپ کو اجازت حاصل ہے تو مرید کیوں نہیں کرتے۔" فرمایا کہ "مرید کرنا ایک ذمّے داری کی بات ہے اس سے روٹی کمانا نہیں ہے۔"

مولانا جب مرض وفات میں مبتلا ہوئے تو اہلیہ صاحبہ نے دریافت کیا کہ آپ کو کہاں دفن کیا جائے گا، ہنس کر فرمایا کہ "ابھی تو میں زندہ ہوں۔" دوبارہ پوچھنے پر کہا کہ تکیہ پر والد کے پائتیں چنانچہ وصیت کے مطابق آپ کو اسی جگہ دفن کیا گیا۔ آپ کی وفات جمعرات کی شب ۱۱ر جولائی ۱۹۷۳ء مطابق ۱۳۹۴ھ میں ہوئی۔

(معلومات از مولوی نجم الدین ایم، اے، صاحبزادہ مولانا مرحوم)

مولانا محمد عثمان چتارویؒ

مولانا محمد عثمان بن محمد اشرف چتاروی ۱۲۸۳ھ میں موضع چتارہ تحصیل پھول پور ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، فارسی کی تعلیم اپنے والد صاحب سے حاصل کی، عربی کی چند کتابیں مولوی محمد سلیم سمروی اور مولوی راحت علی خاں جون پوری سے پڑھیں اس کے بعد حضرت مولانا عبدالحئیؒ فرنگی محلی قدس سرہ کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور تقریباً پانچ چھ برس مولانا کی خدمت میں رہ کر درس نظامیہ کی تکمیل کر کے سندِ فراغت حاصل کی، درسِ نظامی کی تحصیل کے بعد اس وقت کے رواج کے مطابق طب کی تحصیل شروع کی اور حکیم عبدالعزیز دریابادی و حکیم سید محمد موہانیؒ سے اس فن کو بھی مکمل طور سے حاصل کر لیا، تعلیم و تحصیل کے بعد درس وتدریس وتصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کیا، مولانا محمد عثمان صاحب کامیاب مدرّس ہونے کے ساتھ اچھے مصنف بھی تھے۔ مندرج کتابیں آپ کی علمی یادگار ہیں۔

مثنوی شیون کدہ، تخریج الجواہر العبقریہ، ترجمہ کتاب ارسطاطالیس، الصواعق المشتعلہ علی تنبیہ الجہلہ، جاموس النوامیس۔

آپ کے تلامذہ میں مولانا عبدالاوّل جونپوری، مولوی محمد یٰسین چتاروی، مولوی محمد صدیق چتاروی، اپنے اپنے دور کے بڑی شہرت ومقبولیت کے مالک تھے۔

مزید حالات اور سنِ وفات کا علم نہ ہوسکا۔ (نزہۃ ص ۳۱۹ ج ۸ وتذکرہ علمائے حال ص ۸۲)

مولانا محمد عثمان کہنڈویؒ

مولانا محمد عثمان کہنڈوی اعظمی تلمیذ حضرت مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی مولانا کے تلامذہ میں اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے ممتاز مقام کے مالک تھے، کاکوری اور لکھنؤ کے مدارس میں عرصۂ دراز تک تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دیں، کنز البرکات میں مولانا عبدالحیٔ مرحوم کے تلامذہ میں آپ کا نام نامی بھی موجود ہے، افسوس کہ تلاش وجستجو کے باوجود تفصیلی حالات معلوم نہ ہوسکے۔

حضرت مولانا محمد عثمان خاں فتحپوریؒ

حضرت مولانا محمد عثمان بن محمد شریف خاں علمائے اعظم گڈھ کے زمرہ میں جامع المعقولات والمنقولات عالم تھے، ان کا آبائی وطن فتحپور تال نرجا ہے جو قصبہ گھوسی سے جانب جنوب پانچ میل پر واقع ہے۔

مولانا جس خاندان کے چشم وچراغ تھے وہ ایک اودے بنسی راجپوت خاندان سے متعلق ہے جو راجپوتانہ سے اسلامی حملہ کے وقت فرار ہوکر اس دیار میں آکر آباد ہوگیا تھا۔ شجرۂ نسب یہ ہے:

مولانا محمد عثمان بن محمد شریف خاں بن حافظ تونگر خاں بن قادر بخش خاں بن غلامن خاں بن شہاب خاں بن عنایت اللہ خاں بن چھتن خاں بن پہاڑ خاں بن سیف خاں بن فیروز خاں بن ملک فتح خاں (انھیں فتح خاں کے نام پر اس موضع کا نام فتح پور پڑا) بن ملک مبارک خاں بن ملک اودھرن خاں بن کنور سنگھ۔ یہی کنور سنگھ بن آرمی سنگھ آج سے پانچ سو باسٹھ سال پیشتر ماہ شعبان ۸۲۴ھ میں شاہ جون پور ابراہیم شاہ شرقی کے دربار میں مشرف

باسلام ہوئے اور کنور سنگھ کے بجائے ملک دین داران کا اسلامی نام قرار پایا۔

آرمی سنگھ کے بقیہ لڑکے سرجو سنگھ، گنج سنگھ اور گنگا سنگھ بدستور اپنے مذہب پر قائم رہے، جن کی اولاد بریوجھی سلیم پور، بیوا، بارہ اور بھنڈیرا وغیرہ مواضعات میں اب تک آباد ہیں۔

مولانا محمد عثمان خاں کی ولادت ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں ہوئی، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اس کے بعد جون پور جاکر حافظ محمد جعفر کی خدمت میں حفظ قرآن کیا، اس کے بعد تعلیمی سلسلہ منقطع کرکے خاندانی روایت کے مطابق فیض آباد پولیس میں بھرتی ہوگئے، حسنِ اتفاق سے وہاں اس ستھن کے ایک مشہور بزرگ شاہ عبداللطیف نامی سے ملاقات ہوگئی، انھوں نے مولانا کو دیکھتے ہی فرمایا کہ تمہاری پیشانی پر نورِ علم چمک رہا ہے، شاہ عبداللطیف کے اس جملہ نے مولانا کی زندگی میں انقلاب پیدا کردیا، ملازمت سے دل سرد پڑگیا فوج سے مستعفی ہوکر تحصیل علم کی غرض سے کان پور چلے گئے اور جامع العلوم کانپور میں داخلہ لے لیا، جہاں اس وقت مولانا محمد اسحاق بردوانی، مولانا محمد رشید کانپوری (۱) اور مفتی سید مقبول حسین (۲) وغیرہ تدریسی خدمت پر مامور تھے، مولانا عثمان نے انھیں اساتذہ سے متوسطات تک تعلیم حاصل کی اور منتہی تعلیم کے لیے اپنے اساتذہ کے مشورہ سے دیوبند

---

(۱) مولانا محمد رشید بن مولانا عبدالغفار کان پوری، حضرت تھانویؒ کے شاگرد رشید، ۱۸ سال کی عمر میں جامع العلوم سے فارغ ہوئے، حضرت شیخ الہند نے امتحان لیا، ۱۵ر جمادی الثانی ۱۳۱۱ھ میں ان کی دستار بندی ہوئی، بعد فراغت مدرسہ جامع العلوم میں مدرس دوم اور مفتی مقرر ہوئے، عرصہ کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرس ہوکر چلے گئے۔ ۳ر شوال ۱۳۳۴ھ میں بمرض فالج کان پور میں انتقال ہوا، بوقتِ وفات عمر کل ۳۹ سال تھی۔ مرحوم کے صاحبزادگان مولوی عبدالمجید و مولوی عبدالشہید نے اپنے والد کے نام پر دلی میں کتب خانہ رشیدیہ قائم کیا جو اب تک کامیابی سے چل رہا ہے۔ (از رجسٹر جامع العلوم کانپور)

(۲) مولانا مفتی مقبول حسین بن حافظ محمد حسین قصبہ فتحپور ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے، ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ میں مدرسہ جامع العلوم کان پور میں مختصر المعانی کی جماعت میں داخلہ ہوا اور ۶ر شعبان ۱۳۲۳ھ میں دورۂ حدیث میں اول درجہ سے کامیاب ہوئے، حضرت تھانوی نے امتحان لیا تھا، فراغت کے بعد جامع العلوم میں مفتی سوم مقرر ہوئے، علمی استعداد بہت اچھی تھی، ساتھ ہی وعظ و تقریر میں بھی کامل دستگاہ تھی، بعد میں ریاست گوالیار کے مفتی تجویز ہوگئے تھے، وہاں ایک عربی مدرسہ بھی قائم کیا جس میں مولانا محمد عثمان فتحپوری اعظمی کو بلاکر مدرس رکھا۔ (از رجسٹر جامع العلوم کانپور، بقلم مولانا مفتی منظور احمد جون پوری ناظم مدرسہ ہذا)

کا علمی سفر کیا اور دار العلوم میں داخل ہو کر مولانا سہول احمد بھاگلپوری سے منطق وفلسفہ، مولانا حافظ احمدؒ مہتمم دار العلوم سے ہدایہ اور مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوریؒ سے بقیہ علوم متداولہ کی تحصیل کر کے حضرت شیخ الہندؒ سے بخاری وترمذی پڑھ کر ۱۳۲۹ھ میں سند فراغت حاصل کی۔

تعلیم وتحصیل سے فراغ کے بعد مدرسہ ضیاء العلوم کان پور میں تدریسی خدمت پر مامور ہوئے، لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد وہاں سے علاحدہ ہو گئے اور اپنے استاذ سیّد مقبول حسین کے قائم کردہ مدرسہ ریاست گوالیار میں استاذ مقرر ہوئے، آخر میں یہاں سے بھی الگ ہو کر کان پور چلے آئے اور مسجد شیخ للن واقع قلی بازار میں خود ایک عربی درسگاہ اشرف العلوم کے نام سے قائم کی، اس محلہ کے اکثر باشندے بدعتی تھے جو مولانا کو ایک منٹ کے لیے بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، لیکن شیخ للن کی وجہ سے جو اس محلہ کے نہایت بااثر رئیس اور مولانا کے بیحد معتقد تھے مبتدعین آپ کی راہ میں حائل نہ ہو سکے اور مدرسہ اشرف العلوم پوری کامیابی کے ساتھ چلتا رہا سیکڑوں علماء وفضلاء اس سے فیضیاب ہو کر نکلے، آج بھی مدرسہ کسی نہ کسی حد تک باقی ہے اور مولانا کے ایک شاگرد اس کے نظم ونسق کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔

مولانا محمد عثمان مرحوم کی یہ خصوصیت قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے اپنی چوبیس سالہ تدریسی زندگی میں کبھی معاوضہ قبول نہیں کیا تاحیات لوجہ اللہ علمی ودینی خدمت کرتے رہے۔

مولانا جملہ علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے بالخصوص فقہ میں آپ کو درجہ اختصاص حاصل تھا۔

آپ کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے جن میں مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری، مولانا حکیم ظہیر الدین سابق پرنسپل طبیہ کالج علی گڈھ، مولانا اسلام الحق کوپاگنجی، مولانا عبد القیوم بکھراوی استاذ مدرسہ بیت العلوم سرائے میر، مولانا حکیم فصیح اللہ اعظمی سابق صدر جمعیۃ علماء مہاراشٹر، مولانا عبد القیوم فتحپوری، مولانا قاری امداد اللہ مدرس ٹنڈوالہ کراچی، مولانا ظفیر الدین استاذ مدرسہ اشرف العلوم کان پور، مولانا عبد الوہاب استاذ

مدرسہ امدادیہ دربھنگہ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مولانا محمد عثمان مرحوم علمائے اعظم گڈھ میں اس لحاظ سے سب سے ممتاز ہیں کہ یہ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رومال کے ایک اہم رکن تھے اور دو مرتبہ حضرت شیخ الہند کے پیغامات لے کر افغانستان تشریف لے گئے، پہلی مرتبہ سوئے اتفاق سے سرحد پر گرفتار ہوگئے، چنانچہ پولیس نے آپ کا نام اور پتہ وغیرہ دریافت کر کے ایک تار مولانا ابوبکر جون پوری کے نام اور دوسرا اعظم گڈھ کے کلکٹر کے نام بھیجا کہ ایک شخص جو اپنا نام عثمان خاں بتاتا ہے سرحد پر گرفتار ہوا ہے اور اپنے کو کمپنی بٹالین نمبر ۶ کے حوالدار محمد جنید خاں کا بھتیجہ ظاہر کرتا ہے، محمد جنید خاں کو اس کی اطلاع دی جائے اگر یہ واقعی ان کا بھتیجہ ہے تو پشاور جیل میں آکر اس کی شناخت کریں۔

اس اطلاع پر حوالدار مرحوم مولانا ابوبکر شیث جونپوری کو ساتھ لے کر پشاور گئے اور بڑی جدوجہد کے بعد انھیں جیل سے رہا کرا کے ساتھ لائے، اس گرفتاری کے ایک سال بعد پھر حضرت شیخ الہند کا ایک خط جو حبیب اللہ خاں والیٔ کابل کے نام تھا، جوتا کے اندر سلا کر چوڑی فروش کا روپ بنا کر چمن کے راستہ سے کابل روانہ ہوئے اور بچتے بچاتے سرحد پار ہوگئے، مولانا نے خود اس سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا، رات کو سفر کرتا اور دن کو کہیں چھپ جاتا، کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ خطرے کی وجہ سے جانوروں کی طرح ہاتھ اور پیروں کے بل میلوں کا راستہ قطع کرنا پڑا، سرحد پار اسلامی سپاہیوں سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے جاسوس سمجھ کر ان کے تمام سامان چھین لیے، لیکن فوج کے کرنل نے سب اسباب انھیں واپس کردیے۔ فوجیوں نے تحقیق حال کے لیے مولانا سے بہت سے سوالات بھی کیے، جن کی تفصیل یہ ہے۔

سپاہی۔ ’’آپ کون ہیں؟‘‘

مولانا۔ ’’میں مسلمان ہوں‘‘

سپاہی۔ ’’آپ سکھ معلوم ہوتے ہیں‘‘

مولانا۔ ’’میں کلمہ پڑھتا ہوں تو سکھ کیوں کر ہوں گا!‘‘

سپاہی۔ ”کلمہ سکھ بھی پڑھ سکتے ہیں“

مولانا۔ ”میں حافظِ قرآن بھی ہوں“

سپاہی۔ ”اگر واقعی آپ حافظِ قرآن ہیں تو مسلمان ہیں“

جس وقت مولانا وہاں پہونچے تھے، رمضان کا مہینہ تھا، انھوں نے خود بیان کیا کہ فوجی بہت جلد تراویح پڑھ کر فارغ ہو جاتے تھے لیکن میں بہت دیر تک پڑھتا رہتا تھا جس سے فوجی بہت متاثر ہوتے، حاصل کلام اس بار مولانا اپنے سفر میں کامیاب ہو گئے اور حبیب اللہ خاں والی کابل کے دربار میں پہونچ کر حضرت شیخ الہند کے والا نامہ کو پیش کیا اور زبانی مولانا کے منصوبے کی تفصیل بیان فرمائی، لیکن امیرِ کابل اس سے متفق نہیں ہوا، اس لیے مولانا عثمان وہاں سے واپس چلے آئے۔

مولانا محمد عثمان مرحوم نے پچپن برس کی عمر میں ۱۴ر محرم ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۶ء کو اپنے آبائی وطن فتحپور تال نرجا میں وفات پائی اور اپنے پدری قبرستان میں دفن ہوئے۔

(معلومات از برادر خرد مولانا مرحوم)

مولانا شاہ محمد عزیز بھیرویؒ

مولانا شاہ محمد عزیز بن علی احمد بن نعمت اللہ حنفی موضع بھیرہ ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب سے مکمل کی، اس کے بعد مدرسہ حنفیہ جون پور میں مولانا عبدالحلیم صاحب فرنگی محلیؒ سے علوم فنون کی تحصیل و تکمیل کی، پھر یہاں سے سہارنپور گئے اور مولانا احمد علی مرحوم سے حدیث کی تحصیل کی، سہارنپور سے واپسی میں دہلی جا کر مولانا سیّد نذیر حسین محدث دہلویؒ سے بھی سند واجازت حاصل کی، علوم دینیہ کی تکمیل کے بعد لکھنؤ جا کر حکیم ابراہیم بن یعقوب حنفی لکھنوی سے طب وحکمت کی تعلیم حاصل کی۔

مولانا نہایت ذہین وطباع عالم تھے، صلاح وتقویٰ میں سلفِ صالحین کے نمونہ تھے۔ قدرت نے حسن صورت وحسن سیرت دونوں خوبیوں سے نوازا تھا ۱۳۱۰ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (نزہۃ ص ۴۴۳ ج ۸)

مولانا شاہ محمد علی بھیرویؒ

مولانا شاہ حاجی محمد علی بن شاہ عبدالعلیم بن شاہ ابوالغوث گرم دیوان موضع بھیرہ ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، مولانا عبدالحئی لکھنوی مرحوم نے نزہۃ الخواطر جلد ۷ ص ۴۵۲ پر شاہ محمد علی کے والد کا نام عبدالعلیم کے بجائے عبدالحکیم بن ابوالغوث تحریر فرمایا ہے، حالانکہ شیخ عبدالحکیم شاہ ابوالغوث کے بھانجے اور داماد تھے۔

شاہ محمد علی نے ابتدائی تعلیم مقامی طور پر حاصل کر کے مدراس کا تعلیمی سفر کیا، جہاں اس وقت مولانا بحرالعلوم عبدالعلی فرنگی محلی متوفی ۱۲۲۵ھ مرجع بنے ہوئے تھے، چنانچہ شاہ محمد علی نے ملا بحرالعلوم کے زیر تربیت علوم درسیہ متداولہ کی تحصیل کر کے سند فراغت حاصل کی اس کے بعد ملک عرب کا قصد کیا اور مدینہ منورہ میں تین سال قیام کر کے وہاں کے مشائخ وشیوخ سے حدیث اور اسماء الرجال کی تحصیل کی اور وطن مالوف واپس آئے، یہاں درس وتدریس کے ساتھ ذکر وشغل میں مصروف ہو گئے، ریاست مدراس نے شاہ صاحبؒ کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا تاحیات اسی وظیفہ پر قانع رہے اور معاش کے لیے کسی دوسری جانب نگاہ نہیں اٹھائی، شاہ صاحب اپنے دور میں علمائے احناف میں اپنے علمی وروحانی تبحر میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے، آپ کے تفصیلی حالات اور سنہ پیدائش ووفات کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکے، بہر حال آپ کا زمانہ تیرہویں صدی ہجری کے وسط کا ہے۔

(تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۴ و نزہہ ص ۴۵۲ و ۴۵۳ ج ۷)

مولانا محمد علی مئویؒ

مولانا ابوالمکارم محمد علی بن مولانا فیض اللہ کی ولادت ۱۳۰۸ھ میں قصبہ مئو میں ہوئی، کتب ابتدائیہ اپنے والد کے مخصوص شاگرد ملا حسام الدین مئوی سے پڑھی، بعد ازاں چشمۂ رحمت میں مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری اور دیگر اساتذہ سے درس نظامی کی تحصیل وتکمیل کی، حدیث کی تعلیم مولانا سید نذیر حسین دہلوی سے حاصل کی تھی۔

علوم دینیہ عربیہ کی تکمیل کے بعد حکیم سید عبدالحفیظ دہلوی سے طب وحکمت کی تحصیل

کی، مولانا محمد علی، صاحبِ ثروت وملکیت تھے اپنے جیب خاص سے مئو اور اس کے اطراف میں متعدد مسجدیں بنوائیں، دینی امور میں روپے خرچ کرنے میں نہایت باحوصلہ تھے، بالخصوص مسلکِ اہلحدیث کی ترویج واشاعت میں بڑی فراخ دلی سے خرچ کرتے تھے، تصنیف وتالیف سے خاص شغف تھا، مختلف موضوع پر بہت سے رسالے لکھے۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی جانب سے تیس روپیہ ماہانہ وظیفہ بھی پاتے تھے۔ آپ کی تصانیف یہ ہیں:

۱-۲- زینت الجیش بخلافۃ القریش، البحث القوی عن سیرۃ النبی: یہ دونوں رسالے ایک ساتھ شائع ہوئے ہیں، پہلا رسالہ خلافتِ قریش کی بحث میں ہے اور دوسرا علامہ شبلی نعمانی کی سیرۃ النبی کے بعض حصوں پر استدراک ہے۔

۳- تقریراتِ محققانہ بجواب سوالات دہ گانہ: یہ رسالہ خلافت کے زمانہ میں لکھا گیا ہے، اس میں مسلمانوں کو اہلِ ہنود کے ساتھ اشتراک وادغام سے منع کیا گیا ہے۔

۴- الجواب الاصوب عن مسئلۃ الخطبۃ بغیر لسان العرب: اس رسالہ میں ثابت کیا ہے کہ غیر عربی زبان میں خطبۂ جمعہ وغیرہ جائز نہیں ہے۔

۵- الابحاث السنیہ عن المقالۃ المرضیہ: اس میں ثابت کیا ہے کہ ایک بکری صرف ایک آدمی کی قربانی میں کفایت کرے گی، یہ رسالہ مولوی عبداللہ پٹنوی کی تردید میں ہے جنھوں نے لکھا تھا کہ ایک بکری میں گھر کے تمام افراد شریک ہو سکتے ہیں خواہ وہ ایک سو افراد ہوں۔

۶- الجواب السدید عن مقالات اہل التقلید: مولانا عبدالحیٔ رحمۃ اللہ علیہ کے بعض فتووں پر استدراک ہے۔

۷- التعقیب الحسن علی المولوی ظہیر الحسن: مولانا ظہیر الحسن شوق نیموی مرحوم کے رسالہ التعلیق الحسن کے رد میں ہے۔

۸- الجواب الاسنیٰ عن مسئلۃ المصافحۃ بالید الیمنیٰ، ۹- المباحث العلیۃ المتعلقہ بالابحاث السنیہ، ۱۰- اقامۃ الدلائل علی سماع علقمۃ عن ابیہ وائل: یہ تینوں رسالے یکجا شائع ہوئے ہیں۔

۱۱- عمدۃ التحقیق فی اثبات الضحایا الی آخر ایام التشریق۔

۱۲- التحقیق الحسن فی اثبات القمیص فی الکفن۔

۱۳- الروض الازہر فی منافع الدھن الاحمر: اپنے تیار کردہ تیل ''روغن احمر'' کے فوائد وتعریف میں۔ مولانا نے مختصر طور سے اس رسالہ میں اپنی سوانح حیات بھی سپرد قلم کی ہے۔

ان کے علاوہ بھی مختلف موضوعات پر چھوٹے چھوٹے رسائل آپ کی علمی یادگار ہیں۔

۷/رجب ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء میں آپ کی وفات ہوئی۔ تاریخ وفات یہ ہے:

''منہدم شد اساس ہمت وفضل''

(تراجم علمائے اہلحدیث ص ۴۲۳ وص ۴۲۴ ج اونزہۃ الخواطر ص ۳۹۹ ج ۸ وتذکرہ علمائے حال ص ۸۳)

مولانا محمد عمر گھوسویؒ

مولانا محمد عمر بن حافظ محمد ایوب گھوسوی حنفی کی ولادت یکم رمضان ۱۳۰۰ھ یوم جمعہ کو ہوئی، دس برس کی عمر میں حفظِ قرآن سے فارغ ہوکر اردو فارسی کی تعلیم اپنے چچا مولانا محمد اسحاق سے شروع کی اس کے بعد عربی وبقیہ فارسی کی کتابیں مولانا سلطان احمد مئوی اور مولانا محمود معروفی سے پڑھیں پھر یہاں سے مدرسہ حنفیہ جون پور میں داخلہ لیا اور مولانا ظہور الحسن صاحب رام پوریؒ سے فنون کی کتابوں کا درس لیا علاوہ ازیں مولانا عبداللطیف علی گڈھی، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی اور مولانا ماجد علی جون پوری سے بھی آپ کو شرفِ تلمذ حاصل تھا، فنون کی تکمیل کے بعد مولانا ابوالخیر دہلوی سے حدیث کی تحصیل کی اور بخاری شریف پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد تعلیم وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور مختلف مدارس میں تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دیں، لیکن آپ کی تدریسی خدمات کا بیشتر زمانہ مظہر العلوم بنارس میں گذرا، اس مدرسہ میں بہت سے طلبہ نے آپ سے فیض پایا جن میں مولانا محمد کوثر ندوی بانی مدرسہ ضیاء العلوم بنارس، مولانا عبدالحمید مکی بنارسی، مولانا عبدالمعید استاذ جامعہ سلفیہ بنارس، مولانا معزّ الدین بنگالی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مولانا آخر عمر میں خاص وجوہ سے مسلک رضاخانی کی طرف مائل ہوگئے تھے ورنہ

ابتدائی زمانے میں آپ صحیح العقیدہ اور معتدل مزاج تھے۔

تعلیم کے ساتھ تصوف سے بھی آپ کو خاص لگاؤ تھا، اپنے استاذ حدیث شیخ ابوالخیر سے آپ کو خلافت حاصل تھی۔ خود بھی بیعت کرتے تھے، اس دیار میں آپ کے مریدین ومعتقدین کا حلقہ بڑا وسیع تھا، آپ کے مزار پر سالانہ عرس ہوتا ہے جس میں آپ کے خلفاء ومریدین کا بہت بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ آپ کا وصال ۱۵ محرم الحرام ۱۳۹۱ھ میں ہوا، تاریخ وفات کو کسی نے یوں ضبط کیا ہے:

پندرہ ماہِ محرّم یومِ شنبہ وقتِ عصر
بدرِ عرفاں چھپ گیا پانچ بج کر سات پر

مولانا محمد عمرؒ نے ۱۳۸۱ھ میں اپنے مکان کے متصل مدرسہ خیریہ فیض عام کے نام سے ایک درس گاہ بھی قائم کی تھی جو آج بھی جاری ہے اور تشنگانِ علوم کو اپنے فیض سے سیراب کررہی ہے۔ (مقاماتِ خیر ص ۹۶ و ۹۷)

مولانا محمد فاروق چریا کوٹیؒ

استاذ العلماء مولانا محمد فاروق بن قاضی علی اکبر بن قاضی عطار سول عباسی ضلع اعظم گڈھ کے مردم خیز قصبہ چریا کوٹ کے رہنے والے تھے، فارسی اور نحو وصرف، منطق، فلسفہ اپنے بڑے بھائی مولانا عنایت رسول صاحب سے پڑھا، ہدایہ اور اصول فقہ مفتی محمد یوسف فرنگی محلی متوفی ۱۲۵۵ھ (استاذ مدرسہ حنفیہ جونپور) سے اور ہیئت کا فن مولانا رحمت اللہ فرنگی محلی متوفی ۱۳۰۵ھ (بانی مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور) سے اور حاشیہ زاہدیہ برشرح ملا جلال مولوی ابوالحسن منطقی متوفی ۱۲۹۲ھ سے اور بعض علوم مفتی نعمت اللہ فرنگی محلی (۱) متوفی ۱۲۹۹ھ

(۱) مفتی نعمت اللہ بن نور اللہ انصاری لکھنوی مشاہیر اصحاب درس میں تھے، ہیئت، ہندسہ اور حساب وغیرہ میں اس وقت ان کا کوئی نظیر نہیں تھا، اپنے والد شیخ نور اللہ اور چچا مفتی ظہور اللہ سے تعلیم پائی تھی، تکمیل کے بعد فیض آباد اور لکھنؤ کے مفتی مقرر ہوئے اور طویل عرصہ تک اس منصب پر رہے پھر بڑودہ صوبہ گجرات میں اقامت اختیار کرلی تھی، کچھ دنوں تک بتیا صوبہ بہار میں بھی رہے، آپ کا درس بڑا تفصیلی ہوتا تھا، مشہور ہے کہ ایک ورق کے درس میں تین گھنٹے صرف ہوجایا کرتے تھے، جب تک طلبہ کے ذہن میں بات اتر نہیں جاتی تھی سمجھاتے رہتے تھے، ۱۲۹۹ھ میں وفات ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر ص ۵۰۶ ج ۷)

سے پڑھا، علم ادب بطور خود حاصل کیا تھا، علوم معقول، منقول، ریاضی، ادبیات وغیرہ جملہ علوم وفنون پر ان کو کامل عبور تھا، یہاں تک کہ موسیقی کے فن میں بھی دسترس حاصل تھی، ان کے طرز تعلیم کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ وہ کتاب سے علیحدہ ہو کر نفس مسئلہ کی ایسی تعلیم دیتے تھے کہ اس کا ہر گوشہ طالب علم کے سامنے روشن ہو جاتا تھا، مختلف مدرسوں میں وہ مدرس رہے، سب سے پہلے مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں مدرس ہوئے، پھر اعظم گڈھ کے مدرسہ میں آئے، کان پور کے کسی مدرسہ میں بھی مدرسی کی، سہسرام کے مدرسہ خانقاہ میں بھی کچھ دنوں رہے، الٰہ آباد کے مدرسہ احیاء العلوم میں بھی قیام رہا، ۱۳۱۷ھ میں جب ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں اپنا دارالعلوم قائم کیا تو موصوف اس میں مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے، ۱۹۰۴ء میں جب علامہ شبلی دارالعلوم کے معتمد مقرر ہوئے تو مولانا نے ترکِ ملازمت کر کے بلیا میں وکالت شروع کی، اسی زمانہ میں بعض شائقین انگریز کو عربی پڑھائی، آخر میں ۱۹۰۹ء مطابق ۱۳۲۷ھ میں مولانا شبلی نعمانی نے پھر ان کو دارالعلوم میں ادیب اوّل کے عہدہ پر بلایا، چند روز رہ کر غازی پور گئے تھے کہ اسباب وسامان یہاں لے آئیں کہ وہیں ۲۸/اکتوبر ۱۹۰۹ء مطابق رمضان ۱۳۲۷ھ کو وفات ہوئی۔

مولانا محمد فاروق صاحبؒ کو علوم عربیہ کے علاوہ فارسی نظم ونثر میں بھی یدطولیٰ حاصل تھا اور اس زمانہ کے کمالات کے مطابق صنائع وبدائع کا خاص شوق رکھتے تھے، مثلاً غیر منقوط قصائد اور خطبے، مولانا کی تصنیفات میں عربی وفارسی نظم ونثر کے بعض رسائل یادگار ہیں مثلاً منظومۂ نحویہ فارسی، خالق باری، کشف الاقناع عن وجوہ الامناع اور تطلیقات ثلاثہ کی بحث پر ایک رسالہ اردو شاعری بھی کرتے تھے چنانچہ ان کے دو اردو مسدس چھپے ہیں، ایک مسدس فاروقی جس میں اعظم گڈھ کے ۱۸۹۲ء کے ہنگامۂ گاؤکشی کا واقعہ نظم کیا ہے اور دوسرا مسدس عوالی ہے جو مسدس حالی کے جواب میں ہے۔

مولانا فاروق صاحب کے مزاج میں سخت وارستگی، بے پروائی اور بے تکلفی تھی اس لیے ایک جگہ قیام نہیں کر سکتے تھے نہ کوئی کام باقاعدہ انجام دے سکتے تھے، اسی وجہ سے کوئی بڑا عہدہ نہ حاصل کر سکے اور نہ اس کی پروا تھی۔

علمی ذوق اس قدر غالب تھا کہ سخت سے سخت دنیاوی کشمکشوں میں بھی تعلیم وتعلّم کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا تھا، تمام مسائلِ علمیہ میں مجتہدانہ شان رکھتے تھے اور جب کوئی کتاب پڑھاتے تھے تو عموماً مصنف کی فروگذاشتوں سے تعرض ضرور کرتے تھے۔

مولانا کے فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے:

رسیدی و ربودی دین و دل در جنبش چشمے — بہ یک گردش چو جام بادہ کارم ساختی رفتی
بہ گلشن آمدی و غنچہ را درخوں جگر کردی — نسیم آسا سمند ناز بر گل تاختی رفتی

نہ دارد چشم من تاب جمالت — بیا چوں مردمک در دیدہ جا کن!
نہ دارد دل دگر تاب طپیدن — نگاہِ خویش را رحم آشنا کن!

زمانہ گر زخط حکم تو بہ پیچد سر — دو رشتۂ شب و روزش بہ تن شود زنار

نہ آں پیالہ نہ آں نے نہ آں چمن باقیست — مگر زبیخودیم قصۂ کہن باقیست
چناں گداختہ ام من کہ غیر یاد تونیست — زمن ہر آنچہ در آغوش پیرہن باقیست
بہ ہر چہ داد خداوند شادم ولیکن — درونِ دل ہوس طائف ویمن باقیست
خجل زمنت دشنامِ تو شدم اے جاں — کہ بر زباں توزیں حیلہ یاد من باقیست

مولانا محمد فاروق مرحوم کی ہوس طائف ویمن بھی پوری ہوگئی تھی، چنانچہ حج وزیارت سے مشرف ہوکر وہاں کے علماء ومشائخ کی مجلسوں سے استفادہ کیا۔

مولانا کے شاگردوں کی فہرست بڑی طویل ہے، جن میں علامہ شبلی نعمانی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، مولانا شبلی مرحوم نے لکھا ہے کہ میری تمام تر کائنات انھیں کے افادات ہیں۔ (تذکرہ علمائے ہندص ۱۶۰ وتذکرہ علمائے حال ص ۸۴ ونزہۃ ص ۵۱۴ ج ۸ وحیاتِ شبلی ص ۷۲ و ۷۳)

مولانا شاہ محمد کامل ولید پوریؒ

مولانا شاہ محمد کامل بن امام علی حنفی ۱۲۳۵ھ میں ولید پور ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی کتابیں اپنے وطن کے مشہور عالم وصوفی شیخ علی احمد بھیروی سے پڑھیں اور بقیہ تعلیم مدرسہ حنفیہ جونپور میں مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی متوفی ۱۲۸۵ھ اور دوسرے اساتذہ سے پڑھ کر فاتحۂ فراغ پڑھی، تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد شیخ عبدالعلیم حسینی قادریؒ سے بیعت کی اور سلوک وطریقت کی منزلیں طے کر کے خلافت حاصل کی۔ شاہ محمد کامل صاحب کو شیخ عبدالعلیم (۱) کے علاوہ شیخ گلزار شاہ کشنوی سے بھی خلافت واجازت حاصل تھی، آپ نے انگریزی حکومت کی ملازمت کر لی تھی اور مختلف جگہوں میں منصف کے عہدے پر رہے یکم جنوری ۱۸۵۸ء مطابق ۱۲۷۵ھ میں شہر جون پور کے منصف مقرر ہوئے تھے، جونپور کے زمانۂ قیام میں آپ نے مسجد اٹالہ کی مرمت کرائی، تقریباً ۳ سال میں مرمت کا کام ختم ہوا، آخر عمر میں پنشن کے ساتھ اپنے عہدے سے ریٹائر ہو گئے تھے اور گھر ہی پر رہنے لگے تھے، اس دیار میں آپؒ کے مریدین ومعتقدین بہت زیادہ تھے، اپنے وقت میں سلسلۂ نقشبندیہ کے مشہور مشائخ میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ سلوک ومعرفت میں انھوں نے متعدد رسائل اردو اور عربی میں تصنیف کیے، جن میں بعض کے نام یہ ہیں:

صراط التکمیل (عربی زبان میں)، جنت الفرائض، پنجۂ نور، سرّ الغیب، تیسیر، مثنوی میر اعظم مکتوبات چراغ ربانی، چراغ جنان، معراج نامہ۔

چھیاسی برس عمر پا کر ۶/ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ بروز پنجشنبہ بوقت دس بجے شب

---

(۱) شیخ عبدالعلیم بن جان محمد لوہاری اپنے والد کے ہمراہ بچپن میں دہلی آگئے تھے اور شاہ غلام علی دہلوی کے حلقہ میں داخل ہو کر ۲۵ برس کی عمر تک ان سے اکتساب فیض کرتے رہے بعد ازاں لوہاری واپس آئے اور یہاں شیخ احسان علی اجودھنی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور ایک عرصہ تک ان کی خدمت میں رہے اس کے بعد مختلف جگہوں کا سفر کیا، آخر میں حجاز کے ارادے سے بذریعہ کشتی جدہ کو روانہ ہوئے، مگر آٹھ ماہ تک مسلسل سمندر میں چلنے کی باوجود بھی جدہ نہ پہونچ سکے، بالآخر اسکندریہ کی راہ سے بمبئی واپس لوٹ آئے اور وہیں بیمار ہو کر بھوپال آئے جہاں ۱۳/ محرم ۱۲۶۶ھ کو آپ کا انتقال ہو گیا۔ (نزہۃ الخواطر ص ۲۸۸، ج ۷)

آپ کا وصال ہوا اور اپنے حجرہ میں دفن ہوئے۔ (نزہۃ الخواطر ص ۵۲ ۴ ورسالہ "صوفی" بنارس شمارہ ماہ فروری ۱۹۵۵ء)

مولوی محمد کبیر بکھراویؒ

مولانا حاجی محمد کبیر بن حاجی محمد بشیر بکھراوی اس دیار کے بڑے بااثر علماء میں تھے، قدرت نے انھیں علم وعمل کی دولت کے ساتھ دنیاوی وصوری وجاہت سے بھی وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔

مولوی صاحب نے ابتدائی تعلیم حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری اور حضرت مولانا شاہ عبدالرحمٰن بکھراوی سے حاصل کی تھی جب مولانا بکھراوی علالت کی وجہ سے پڑھنے پڑھانے سے معذور ہو گئے تو یہ وہاں سے پھولپور حضرت پھولپوری کے یہاں چلے آئے۔ اور حضرت پھولپوری سے نصاب کی اکثر کتابیں پڑھ کر دیوبند دارالعلوم میں داخلہ کے لیے گئے، لیکن اس زمانہ میں سیاسی انتشار کی وجہ سے جس کا اثر دارالعلوم میں نمایاں تھا، مولانا کو دلجمعی نہ ہو سکی اور سہارنپور چلے آئے اور مظاہر میں بقیہ نصاب کی کتابیں پڑھ کر غالباً ۱۳۴۷ھ میں فارغ ہوئے۔

حضرت الاستاذ مولانا عبدالقیوم صاحب بکھراوی نے اپنی یادداشت سے مولوی صاحب کا سن فراغت یہی لکھوایا ہے، لیکن تاریخ مظاہر میں ۱۳۴۷ھ کے فارغین طلبہ کی فہرست میں مولانا کا نام نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

تحصیل علوم سے فراغ کے بعد تھانہ بھون حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے تینوں قدیم اساتذہ کے پیرومرشد سے خود بھی بیعت ہو گئے۔ بعد ازاں وطن مالوف کی جانب مراجعت کی اور پھر خانگی امور اور موروثی جائداد کے انتظام واہتمام میں اس طرح الجھے کہ ساری زندگی اسی میں گذر گئی۔ درس وافادہ اور تصنیف وتالیف کا موقع نہ مل سکا۔

مولانا اپنے دیار کے ایک باحیثیت رئیس تھے، ملایا میں ربڑ اور ناریل کے پچاسوں

ایکڑ میں آپ کے باغات تھے، گھر پر بھی اچھی خاصی جائیداد تھی۔ بایں ہمہ تواضع وخاکساری کے مجسمہ تھے، امیر وغریب ہر ایک سے یکساں پیش آتے، مہمانوں کی تواضع اور خاطر مدارات میں انتہائی مبالغہ سے کام لیتے تھے، غرباء ومساکین کی دیکھ بھال بھی بڑے پیمانے پر کرتے رہتے تھے۔

حضرت پھولپوریؒ سے بڑا خاص تعلق تھا، مدرسہ بیت العلوم کے قیام کے سلسلے میں حضرت مولانا کے گویا دست راست تھے، ہفتہ میں ایک بار پھولپور تشریف لانے کا معمول تھا، جس میں آخر وقت تک فرق نہیں آیا۔

ان خوبیوں کے ساتھ صورت وشکل میں بھی فرد وحید تھے، لمبا قد، دہرا بدن، گورا چٹا رنگ بڑی بڑی آنکھیں کہ جس کی جانب نظر بھر دیکھ لیتے وہ سہم جاتا۔ میرے محترم بزرگ شیخ ابواللیث (۱) مرحوم جگدیش پوری سے مولانا کی بڑی صاحبزادی منسوب تھیں اسی تعلق سے مولانا جگدیش پور اکثر آیا کرتے تھے۔ ان کے دیکھنے والے ان کے رعب وجلال کی داستانیں آج بھی سنایا کرتے ہیں۔ ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء مارچ کے مہینے میں بمرض طاعون آپ کا وصال ہوا۔

ملا محمد ماہ دیوگامیؒ

ملا محمد ماہ بن شیخ عبدالشکور بن شیخ جنید بن شیخ عماد بن شیخ میا نجیو دیوگامی اپنے وقت میں آسمانِ فضل وکمال کے مہر درخشاں تھے، ان کی پیدائش ۱۰۱۳ھ میں قصبہ دیوگام ضلع اعظم گڈھ میں ہوئی، تجلی نور میں ہے کہ ملا محمد ماہ اپنے دور کے مشہور علماء میں تھے، ان کی جامعیت کا یہ حال تھا کہ ملا رکن الدین بحری آبادی سے تحصیل علم کے بعد مزید تحقیق وتکمیل

(۱) شیخ ابواللیث مرحوم جگدیش پوری متوفی ۱۹۷۳ء نہایت نیک نفس، خوش مزاج، مہمان نواز اور ہر رنج وغم میں مسکرانے کے عادی تھے مرحوم سے راقم کے گوناگوں تعلقات تھے۔ وہ میرے ایک دوست بھی تھے اور سرپرست بھی، رفیق بھی تھے اور مشیر بھی، مرحوم کے میرے اوپر بے پایاں احسانات ہیں جن کو میں کبھی بھلا نہیں سکتا، "جَزَاهُ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَاءِ" مرحوم کے صاحبزادگان عبدالباری عرف فیضان، حافظ عبدالقادر عرف عرفان بھی احقر کے ساتھ بڑے بھائی جیسا معاملہ کرتے ہیں، اول الذکر نے اس تذکرہ کے اسفار میں اکثر وبیشتر رفاقت ادا کرکے اپنے والد کی یاد تازہ کردی۔

ملانورالدین مداری جون پوری سے کی، حضرت دیوان محمد رشید جون پوری متوفی ۱۰۸۳ھ سے بھی فیض اٹھایا، وہ اپنے دور کے عالم اکمل اور فاضل اجل تھے، پچیس سال تک جونپور میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی اور سیکڑوں علماء وفضلاء ان کی درس گاہ سے پیدا ہوئے، ملا عبدالرسول سترکھی، حافظ امان اللہ بناری متوفی ۱۱۳۳ھ اور مفتی ابوالبقاء جونپوری، ان کے خاص شاگردوں میں تھے؛ آخر عمر میں سلس البول کی بیماری میں مبتلا ہوگئے تھے، اسی میں بیاسی سال کی عمر پاکر ۲۵ رجمادی الاخریٰ ۱۰۹۵ھ میں وفات پائی، ان کا مزار دیوگام میں میر علی حسین ولد سید حسین علی کے دروازہ کے سامنے آج بھی موجود ہے، بروقت مزار پاکڑ کی جڑوں کے اندر آ گیا ہے، اس لیے سرسری طور سے گذرنے والے کو نظر نہیں آتا۔ راقم نے ۵ر جنوری ۱۹۷۳ء میں دیوگام جاکر مزار کی تحقیق وتفتیش کی، بڑی تلاش وجستجو کے بعد پتہ چل سکا۔

آپ کے خاندان کے لوگ اب بھی دیوگام میں موجود ہیں، مگر بدقسمتی سے مسلکِ امامیہ کے پیرو ہو گئے ہیں۔ (تجلی نور ص ۶۲ ج ۲ ومظہر الاحدیہ ص ۱۹۵)

مولانا محمد مبین چریاکوٹیؒ

مولانا محمد مبین کیفی عباسی مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کے صاحبزادے تھے ۱۸۶۰ء مطابق ۱۲۷۷ھ میں چریاکوٹ میں پیدا ہوئے، عربی فارسی، ہندی، سنسکرت، فلسفہ، منطق، فقہ، حدیث اور ریاضی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، ترکی، عبرانی اور سریانی اپنے تایا (بڑے ابّا) مولانا عنایت رسول سے سیکھا، اس کے بعد جرمن، فرنچ اور لاطینی سے واقفیت حاصل کی ۱۹۱۶ء مطابق ۱۳۲۵ھ میں چریاکوٹ سے رسالہ العلم جاری کیا، ۱۹۱۸ء میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڈھ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، پھر گورکھپور سے سبحان جاری کیا روزنامہ زمانہ کلکتہ اور روزنامہ انقلابِ زمانہ کے بھی مدیر رہے ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۷ء میں ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد سے منسلک ہوئے جہاں جواہر سخن سات جلدوں میں مرتب کی ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۹۴۳ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کی لائبریری میں تقرر ہوا اور مشرقی علوم کی

کتابوں کی فہرست تیار کی، تصانیف میں جواہر سخن کے علاوہ فلسفۂ سیاست، فلسفہ عمر اور ترجمہ قانون مسعودی ہے، لیکن زیادہ شہرت انھیں شاعری سے ملی، ایک مختصر دیوان میکدۂ کیفی اور انجمن ترقی اردو سے غزلوں کا ایک انتخاب شائع ہوا ہے۔

یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء مطابق ۱۳۷۶ھ میں چھیانوے برس کی عمر میں اٹاوہ میں ان کا انتقال ہوا۔ (اسلام اور عصر جدید ص ۴۹ شمارہ جولائی ۱۹۷۲ء)

مولانا حکیم محمد محمود معروفیؒ

حضرت علامہ مولانا محمد محمود بن محمد ظاہر بن محمد طاہر بن شیخ پیر محمد معروفی نے علم و دولت اور سیادت و قیادت کے ماحول میں آنکھیں کھولیں، آپ کے دادا مولانا محمد طاہر معروفی ایک جید عالم اور طبیب کی حیثیت سے پورے ضلع میں مشہور تھے، اللہ تعالیٰ نے انھیں علمی و روحانی سیادت کے ساتھ مال و دولت سے بھی حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، جس کا اثر مولانا محمد محمود معروفی کی نشو و نما پر بڑا اچھا پڑا، سنِ شعور کو پہونچے تو گھر ہی پر قرآن مجید وغیرہ کی تعلیم کے بعد عربی و فارسی کی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد ۱۳۱۱ھ میں مدرسہ فیض عام کان پور میں داخل ہو گئے اور مولانا احمد حسن کانپوری اور دوسرے اساتذہ سے درسِ نظامیہ کی تحصیل کی، طالب علمی ہی کے زمانہ میں مولانا کو مطالعۂ کتب کا خاصا ذوق پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ اسی وقت سے درسی و غیر درسی کتابوں کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا اور مطالعہ کے بعد ہر کتاب کے سرورق پر اپنی یادداشت کی فہرست، مجمل و مشکل مقامات کی تشریح و توضیح کتابوں کے حوالے کے ساتھ تحریر کرتے رہتے تھے، یہ کتابیں آج بھی مولانا کے کتب خانہ میں موجود ہیں جن سے ان کی وسعتِ مطالعہ اور کثرت معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا محمود مرحوم نہایت ذہین و طبّاع واقع ہوئے تھے، آپ کے رفقائے درس میں کئی ایسے علماء تھے جو سالوں تدریس کا کام کرنے کے بعد مزید تحقیق و تدقیق کی غرض سے مولانا احمد حسن کانپوری سے دوبارہ پڑھ رہے تھے، مگر یہ حضرات بھی علمی و فنی شکوک و شبہات پیش کرنے میں کبھی مولانا محمود سے سبقت نہ لے جا سکے، اسی بنا پر حضرت مولانا احمد حسن

انھیں اپنے لڑکے کی طرح مانتے تھے، غرض تین برس تک مسلسل مولانا کانپوری کی خدمت میں رہ کر پورے انہماک اور دلچسپی کے ساتھ جملہ علوم وفنون کی تحصیل کر کے ۲۷ر رجب ۱۳۱۴ھ میں فاتحۂ فراغ پڑھی اور سند حاصل کی، مولانا کان پوری نے انھیں جو سند دی تھی اس میں مختلف علوم وفنون کی اکیس کتابوں کے نام مرقوم ہیں۔ تعلیم سے فارغ ہو جانے کے بعد دو برس تک گھر ہی پر مقامی طور سے طلباء کو پڑھاتے رہے اور جب ۱۳۱۷ھ میں مدرسہ احیاء العلوم کا قیام عمل میں آیا تو آپ اس کے پہلے مدرس منتخب ہوئے، تفہیم مطالب میں مولانا کو ایسا ملکہ حاصل تھا کہ سخت سے سخت تر مباحث کو ایسے سہل اور آسان انداز میں طلبہ کو سمجھا دیا کرتے تھے کہ گویا وہ سمجھتے کہ یہ کتاب کی آسان ترین بحث ہے، آپ کے مشہور شاگرد مولانا شکر اللہ مبارک پوری اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں نے بہت سے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی مگر مولانا محمد محمود صاحب جیسا پڑھانے والا کسی کو نہ پایا، مبارک پور میں آپ کے شاگردوں میں بڑے اچھے اچھے عالم پیدا ہوئے جن میں مولانا نعمت اللہ مبارک پوری، مولانا شکر اللہ مبارک پوری، مفتی محمد یٰسین مبارک پوری، مولانا محمد امین ادروی، مولانا محمد صابر مئوی وغیرہ بڑی شہرت کے مالک ہوئے۔

آپ نے ایک عرصہ تک احیاء العلوم میں تدریسی خدمت انجام دی، آخر میں پورہ معروف کے ملّی وقومی کاموں کی وجہ سے طویل رخصت لے کر کچھ دنوں کے لیے مکان پر رہے اور ایام رخصت گذر جانے کے بعد پھر احیاء العلوم میں آگئے، لیکن پورہ معروف کے گونا گوں امور اس بات کے متقاضی ہوئے کہ آپ پورہ معروف کے قریب ہی رہیں، اسلیے مجبوراً احیاء العلوم سے علیحدہ ہو کر دار العلوم مئو میں بحیثیت صدر مدرس کے آگئے، لیکن ۱۳۲۴ھ میں جب ان کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا تو ناچار دار العلوم کو بھی چھوڑ دیا اور گھر ہی پر رہنے لگے، یہاں بھی علمی سرگرمیاں جاری رکھیں اور ۱۳۳۰ھ میں مدرسہ معروفیہ کی بنا ڈالی اور اپنے تلمیذ رشید مولانا نعمت اللہ مبارک پوری کو مدرسی کے لیے مقرر کیا، مولانا نعمت اللہ نے ۱۳۳۷ھ تک یعنی پورے سات سال اس مدرسہ میں تعلیم وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، اس کے بعد ۱۳۵۶ھ میں ایک دوسرا مدرسہ اشاعت العلوم کے

نام سے جاری کیا۔

مولانا کے مزاج میں بڑی ظرافت تھی عموماً سوالات کے جواب ظرافت آمیز طور پر دیا کرتے تھے، ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ میں نے انتہائی ناراضگی اور غصہ کے عالم میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے کیا ایسی حالت میں بھی طلاق پڑ جائے گی، آپ نے برجستہ فرمایا، ہمارے یہاں تو جب لوگ اپنی بیوی سے بہت خوش ہوتے ہیں تب طلاق دیتے ہیں۔

ان علمی صلاحیتوں کے ساتھ مولانا طبّ وحکمت میں بھی ماہر تھے، کان پور میں اس فن کو بھی حاصل کیا تھا اور گھر پر اپنے والد حکیم ظاہر صاحب سے بھی استفادہ کیا تھا، راجہ عظمت گڈھ کے آپ خاص معالج تھے اور خطیر رقم بطور وظیفہ کے آپ کو یہاں سے ملتی تھی، بڑے اعزاز کے ساتھ پالکی پر سوار ہو کر راجہ کے یہاں جایا کرتے تھے، تشخیص وتجویز کا یہ عالم تھا کہ نبض پر ہاتھ رکھا اور اٹھایا اور ایک سکنڈ میں مرض کی شناخت کر لیتے تھے، ایک مرتبہ بعض منچلوں نے بطور امتحان کے بھینس کا قارورہ آپ کو دکھایا آپ نے اسے دیکھ کر نسخہ میں کھلی اور بھوسہ لکھ دیا، اسے دیکھ کر وہ لوگ آپ کی حذاقت ومہارت پر دنگ رہ گئے، ۱۳۵۴ھ میں حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے، حاصل کلام مولانا محمود مرحوم جامع کمالات عالم تھے اور آپ کی ذات سے علمی دنیا کو بڑا فائدہ پہونچا تھا، تالیفات میں آپ کے وہ حواشی جو اپنی کتابوں پر تحریر فرمائے ہیں، علم وفن کے اعتبار سے بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں، مگر شائع نہ ہونے کی وجہ سے علمی دنیا میں معروف نہ ہو سکے، مولانا نے اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر ۷/شعبان ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۴/اپریل ۱۹۵۱ء کو علی الصباح داعی اجل کو لبیک کہا اور بعد نماز ظہر آبائی قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ (حیات طاہر ص ۲۲۰ ومشاہیر پورہ معروف)

مولوی محمد مصطفیٰ اسکرویؒ

راجہ پور سکرور قصبہ سرائے میر سے دو میل اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے ایک میل کے فاصلے پر جانب شمال مسلمانوں کی ایک بہت بڑی بستی ہے، مشہور اہل قلم عالم مولانا نجم الدین اصلاحی مرتب مکتوبات شیخ الاسلام ومصنف کتب متعددہ یہیں کے رہنے

والے ہیں، مولوی محمد مصطفیٰ کو بھی اسی قریہ کے متوطن ہونے کا فخر حاصل ہے، مولوی صاحب ابتدائی تعلیم مقامی طور سے حاصل کر کے مولوی شیخ قدرت علی میاں صاحب کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے، میاں صاحب اس وقت اس دیار کے بڑے بافیض اور صاحب استعداد بزرگ تھے، بالخصوص فارسی زبان میں انھیں پورا ملکہ حاصل تھا، میاں صاحب سے فارسی کی درسیات کی تکمیل کر کے مزید تعلیم کی غرض سے مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں داخلہ لیا اور وہاں ملک کے مشہور فارسی کے عالم مولانا عبدالاحد شمشاد غازی پوری سے فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی، عربی کی تعلیم مولانا عبدالرحمٰن نگرامی سے حاصل کی تھی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد تدریسی سلسلہ شروع کیا، پہلے موضع بندول علامہ شبلی مرحوم کے وطن میں مدرس ہوئے پھر یہاں سے مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں چلے آئے جہاں ایک عرصہ تک فارسی کی تعلیم دیتے رہے، پھر یہاں سے الگ ہو کر محلہ میر پٹیو شہر اعظم گڈھ کے مدرسہ اسلامیہ میں صدر مدرس ہوئے، شہر ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں شادی بھی کر لی تھی، آخر عمر میں گرونرائن کھتری اسکول کانپور میں اردو فارسی کے ہیڈ مدرس ہو گئے تھے، وہیں ۱۳۵۹ھ مطابق مئی ۱۹۴۰ء میں انتقال ہوا۔

مولوی صاحب فارسی اور عربی کا بہت ستھرا مذاق رکھتے تھے، فارسی کے ہزاروں شعر انھیں زبانی یاد تھے، ایک مرتبہ مدرستہ الاصلاح کے تمام اساتذہ اور اعلیٰ جماعت کے طلبہ نے متحد ہو کر آپ سے بیت بازی میں مقابلہ کیا، عشاء کے بعد سے اس کا سلسلہ شروع ہوا اور فجر کا وقت ہو گیا، ایک طرف پورا مدرسہ تھا اور ایک جانب تنہا مولوی محمد مصطفیٰ صاحبؒ، مگر انھیں شکست نہ دے سکے۔

مولانا نے دو کتابیں بھی تصنیف کی تھیں، ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے عمران خاں نے ان کتابوں کو علامہ اقبال سہیل (۱) کے حوالے کر دیا، انھیں کے پاس سے وہ ضائع ہو گئیں۔

(۱) علامہ اقبال سہیل بن عزیز اللہ بن امانت اللہ خاں ۱۱ ربیع الآخر ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء کو بڈھریا ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، قرآن حکیم اور اردو فارسی کی تعلیم اپنے دیار کے نامور عالم مولانا محمد شفیع سید حا سلطان پوری سے پائی، البتہ گلستاں بوستاں اپنی والدہ ام کلثوم سے پڑھیں، چودہ پندرہ برس کی عمر میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو کر عربی ادبیات کی تحصیل کی ۱۹۱۴ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں داخل ہوئے، اسی زمانہ میں مولانا حمیدالدین فراہیؒ وہاں =

مولانا حافظ محمد منیرؒ

ابراہیم پور ضلع اعظم گڈھ کی ایک مشہور بستی ہے جو قصبہ مبارک پور سے جانب مشرق تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے، اسی بستی کو مولانا الحاج الحافظ محمد منیر رحمۃ اللہ علیہ کے مولد ومنشا ہونے کا فخر حاصل ہے، ۱۸۹۴ء مطابق ۱۳۱۲ھ کے حدود میں موضع ابراہیم پور ضلع اعظم گڈھ کے ایک معزز خاندان میں مولانا کی ولادت ہوئی والد ماجد کا اسم گرامی حافظ علیم اللہ ہے، مکتبی تعلیم قصبہ محمد آباد ضلع اعظم گڈھ میں منشی محمد اکرام محمد آبادی کی مسجد میں پائی اور مدرسہ قرآنیہ بڑی مسجد جونپور میں حفظ کیا، فارسی اور ابتدائی عربی کی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں پائی پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے دار العلوم مئو میں داخل ہوئے، اور فنون کی تکمیل کر کے دورۂ حدیث پڑھنے کے لیے دار العلوم دیوبند چلے گئے، لیکن یہاں زیادہ دنوں تک ٹک نہ سکے اور بیمار ہو کر گھر واپس چلے آئے۔ صحت یابی کے بعد دار العلوم مئو ہی میں داخل ہو کر دورۂ حدیث کی تکمیل کی اور سند فراغت حاصل کی۔

تعلیم سے فارغ ہو جانے کے بعد اپنے وطن ہی میں بچوں کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا، پھر چند ماہ کے بعد یہاں سے لار روڈ ضلع بلیا کے کسی مدرسہ میں مدرس ہو کر چلے گئے، یہاں دو برس تعلیمی خدمت انجام دے کر ۱۹۲۴ء مطابق ۱۳۴۳ھ میں کلکتہ کا سفر کیا اور وہیں

= عربی کے پروفیسر تھے، علامہ سہیل نے کالج کی تعلیم کے ساتھ مولانا فراہی سے تفسیر وحدیث کے علاوہ سبعہ معلقہ اور دیوان متنبی کی تعلیم حاصل کی، ۱۹۱۸ء میں کالج سے ایم، اے، ایل، بی کی ڈگری حاصل کی اور اعظم گڈھ میں وکالت شروع کردی، یہ سلسلہ ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۵۵ء تک جاری رہا، علی گڈھ میں سہیل کی ادبی وعلمی صلاحیت خوب چمکی، بقول ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند "علی گڈھ میں شعر وتنقید کے امام سہیل تھے۔" علامہ سہیل کے کمال علم وادب پر شہادت کے لیے یہ واقعہ کافی ہے، غالباً ۱۹۳۹ء میں افغانستان کے ملک الشعراء سرور خاں گویا دار المصنفین تشریف لائے، اس موقع پر ان کے اصرار پر سہیل نے اپنا ایک قصیدہ سنایا، سرور خاں پر حیرت واستعجاب کا عالم طاری ہو گیا اور جب سہیل قصیدہ سنا چکے تو اٹھ کر انھیں گلے لگا لیا، حریت پسندی اور وطن دوستی کا جذبہ سہیل کو ورثہ میں ملا تھا، چنانچہ جب حکومت برطانیہ کی مخالفت کا غلغلہ بلند ہوا تو سہیل بھی کاروان حریت کے ساتھ ہو گئے اور پھر زندگی بھر کانگریس کے ساتھ رہے، عمر کے آخری عہد میں ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ سہیل درخشاں جس کی تابانیوں سے بزم شعر وسخن روشن تھی ۸ر نومبر ۱۹۵۵ء مطابق ۱۳۷۵ھ کی شب میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

کارپوریشن کے ایک اسکول میں مدرس ہو گئے، مسلسل چالیس برس تک اسکول میں تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دے کر ۱۶؍جولائی ۱۹۶۲ء مطابق ۱۳۸۲ھ میں اس ملازمت سے ریٹائر ہوئے، کلکتہ ہی کے زمانۂ قیام میں تھانہ بھون حاضر ہو کر حضرت تھانوی سے بیعت کی اور اپنے شیخ ومرشد کی اجازت سے اصلاحی تعلق حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری سے قائم کیا، آپ کو حضرت فتحپوری سے عشق کے درجہ میں محبت تھی، حضرت فتحپوری کی جانب سے انھیں اجازت وخلافت بھی حاصل تھی۔ کلکتہ میں تدریسی خدمت کے ساتھ بڑی مسجد بیل گھچیا کلکتہ ۳۷ میں امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، مولانا کی ذات سے بیل گھچیا اور اس کے اطراف کے لوگوں کی بڑی اصلاح ہوئی، وہاں کے لوگوں نے آپ کے ساتھ شیخ ومرشد جیسا برتاؤ کیا، بہت سے افراد بیعت ہو کر آپ کے سلسلے میں بھی داخل ہو گئے تھے جن میں سے بعض حضرات خلافت واجازت سے بھی مشرف ہوئے، آپ کے خلفاء میں مولانا قاضی ابوصالح ادلان پارہ ہوڑہ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، کلکتہ ہی کے قیام میں ۱۹۲۸ء مطابق ۱۳۴۸ھ میں مولانا نے حرمین شریفین کا سفر کیا اور حج وزیارت سے مشرف ہوئے۔

اسکول کی ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد کلکتہ سے گھر چلے آئے اور اخیر عمر تک یہیں رہے، یہاں کے قیام میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر شدت سے عمل رہا، ساتھ ہی دیگر دینی امور میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیتے تھے، انتقال سے پندرہ یوم پیشتر ۲۹؍ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۹۷۲ء کو دروازہ پر ایک دینی جلسہ منعقد کیا جس میں مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور کے جملہ اساتذہ کو مدعو کیا اور علالت وضعف پیری کے باوجود علمائے کرام کے مواعظ نہایت ذوق وشوق سے سنا۔

تقریباً اٹھتر (۷۸) سال کی عمر میں دوشنبہ کے دن ۱۴؍جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ مطابق ۲۶؍جون ۱۹۷۲ء کو علم وفضل، زہد واتقا کا یہ نیّر تاباں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا، مولانا محمد یٰسین مفتی مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور نے نماز جنازہ پڑھائی اور بعد نماز عصر مقبرہ ابراہیم پور میں لب سڑک تدفین عمل میں آئی۔

مولانا کا جنازہ جنازہ مشہودہ تھا، ابراہیم پور کے علاوہ مئو، مبارک پور، اور خیرآباد وغیرہ

اطراف وجوانب کے مسلمانوں نے ہزاروں کی تعداد میں نماز جنازہ میں شرکت کی شاید سرزمین ابراہیم پور نے اتنا زبردست انسانی ہجوم کبھی نہ دیکھا ہو، مولانا مرحوم عبادت وریاضت وحسن اخلاق میں اسلاف کے نمونہ تھے۔ ہمہ وقت تسبیح ہاتھ میں رہتی اور زبان سے اللہ کا ذکر جاری رہتا، تکبیر اولیٰ کبھی فوت نہیں ہوتی۔ نماز تہجد بھی کبھی قضا نہ ہوتی، روزانہ دس پارہ تلاوت کے ساتھ ڈھائی سو رکعات نفل پڑھنے کا معمول تھا۔ مزید براں پینتالیس ہزار بار ذکر اسم ذات اور تین ہزار مرتبہ درود شریف بھی پڑھتے تھے، رمضان شریف میں ان معمولات میں بہت زیادہ اضافہ ہوجاتا تھا، بالخصوص عشرہ اخیرہ میں ایک ختم اور عشرہ کے آخری ایام میں چالیس پارے تلاوت کرتے۔ اعتکاف پر بھی پابندی سے عمل تھا، علالت کے زمانہ میں بستر پر پڑے رہتے تھے، لیکن نماز کے وقت کسی کے سہارے مسجد میں جا کر باجماعت نماز پڑھتے۔

مولانا محمد عثمان معروفی استاذ احیاء العلوم مبارکپور نے مولانا کے صاحبزادے جناب مولوی محمد یوسف صاحب کی فرمائش پر متعدد مادّہائے تاریخ برآمد کیے جن میں سے چند یہ ہیں:

"او بدارِ نعیم خوش برفت"	"مسلمِ غریب"	خجستہ فرجام
۱۹۷۲	۱۳۹۲	۱۳۹۲

مولانا حکیم محمد یحییٰ رسول پوری

مولانا حکیم محمد یحییٰ بن مولانا احمد حسین بن شیخ باب اللہ ۱۳۲۸ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنی والدہ ماجدہ سے حاصل کی پھر مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں داخل کیے گئے اور مولانا شکر اللہ، مولانا نعمت اللہ، مولانا محمد صدیق برئی پوری اور مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری وغیرہ سے عربی کی کتابیں قدوری تک پڑھیں، اس وقت ان کے والد ماجد ڈھاکہ میں رہتے تھے ان کے ساتھ ڈھاکہ گئے اور متوسطات تک تعلیم ان سے اور دیگر اساتذہ سے حاصل کی پھر مدرستہ الشرع سنبھل اور اس کے بعد مدرسہ اسلامیہ امروہہ میں داخل ہوئے اور وہیں مولانا انوار الحق امروہوی اور دیگر اساتذہ سے پڑھ کر سند فراغت پائی

امروہہ ہی میں طب وحکمت کی تعلیم مولانا حکیم محمد اسماعیل عباسی سے حاصل کی اس کے بعد دارالمبلغین لکھنؤ میں حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی (۱) رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا اسی درمیان میں معمولی سی انگریزی بھی سیکھ لی۔ نہایت ذہین، طباع اور صاحب استعداد عالم تھے، علوم عقلیہ ونقلیہ میں مہارت رکھتے تھے معقولات میں منطق، فلسفہ، ہیئت، ریاضی، مناظر، مرایا، اکر، اسطرلاب کے جامع تھے، علم ہیئت میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اس دیار میں یہ فن ان پر ختم ہوگیا۔ فقہ، تفسیر، حدیث، معانی وبلاغت اور عربی ادب میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے۔ عربی کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور، عربی کالج رائیدرگ آندھرا اور مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں مدتوں تدریسی خدمات انجام دیں، قیام غازی پور کے زمانہ میں جج محمد علی صاحب کو الاتقان فی علوم القرآن پڑھائی، جج صاحب محمد آباد کے رہنے والے تھے۔

انھوں نے تعلیم وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا بھی مشغلہ جاری رکھا ان کے کئی علمی وتحقیقی مقالات جرائد ومجلات میں چھپ کر منظر عام پر آچکے ہیں، مولانا محمد یحییٰ کی چند تصانیف یہ ہیں:

(۱) عمدہ شرح زبدہ: صرف کے مشہور فارسی متن زبدہ کی اردو میں شرح ہے جسے

---

(۱) الامام مولانا عبدالشکور بن ناظر علی کاکوروی لکھنوی ۲۴ رذی الحجہ ۱۲۹۳ھ میں بمقام کاکوری پیدا ہوئے، ابتدائی کتابیں مولانا نور محمد فتحپوری سے پڑھیں اس کے بعد جملہ علوم مروجہ کی تحصیل وتکمیل مولانا عین القضاۃ حیدرآبادی سے کی ۱۳۱۰ھ میں علوم دینیہ کی تحصیل سے فاتحہ فراغ پڑھ کر علم طب کی تحصیل شروع کی بعدازاں دارالعلوم ندوہ میں تدریسی خدمت پر مامور ہوئے پھر یہاں سے علیحدہ ہوکر دہلی چلے گئے جہاں مرزا حیرت دہلوی کی جانب سے ترجمہ قرآن اور ترجمہ بخاری کی خدمت انجام دی اس کے بعد پھر لکھنؤ چلے آئے اور مدرسہ قرآنیہ میں تدریسی خدمت انجام دینے لگے اور ۱۳۳۴ھ میں تدریس وتعلیم کے سلسلہ کو منقطع کر کے تصنیف وتالیف اور ردّ شیعیت کی جانب متوجہ ہوئے، آپ کی کوششوں سے ہندوستان سے بہت سی ایسی بدعتیں جو شیعوں کے اختلاط سے پیدا ہوگئی تھیں، ختم ہوگئیں، شیعوں کے مقابلہ میں آپ اپنی مثال آپ تھے، ۱۳۸۱ھ میں لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ شیعوں کے مقابلہ کے لیے دارالمبلغین کے نام سے ۱۳۵۱ھ میں لکھنؤ میں ایک ادارہ بھی قائم کیا، جس میں فارغ التحصیل طلبہ کو خاص طور سے تربیت دی جاتی تھی، یہ ادارہ آج بھی قائم ہے اور اپنی بساط کی حد تک اہم خدمت کو انجام دے رہا ہے۔"

مولانا نے ڈھاکہ میں طالب علمی کے زمانے میں لکھا تھا، رفاہ عام پریس گورکھپور سے چھپی، (۲) تحقیق رویت ہلال واختلاف مطالع: اس رسالہ میں رویت قبل زوال وبعد زوال، متشکلات قمریہ، کسوف وخسوف، اختلاف رویت واختلاف مطالع وغیرہ کا ذکر ہے۔ یہ پورا رسالہ فتاویٰ ثنائیہ جلد اوّل میں چھپا ہوا ہے۔ (۳) شرح سبعہ معلقہ عربی ناکمل غیر مطبوع (۴) دائمی جنتری (۵) دائمی نقشہ اوقات نماز، نیز ان کے عربی کے کئی قصائد ہیں جن میں سے بعض مطبوعہ ہیں، منظوم تاریخ گوئی میں بھی ملکہ تھا، فن تجلید کے بھی ماہر تھے اور نہایت عمدہ جلدیں بناتے تھے، اپنے کتب خانے کی کئی سو کتابوں کی جلد بندی خود ہی اپنے ذوق کے مطابق کی تھی۔ سل اور دق کے مریض تھے، مدرسہ احیاء العلوم میں تدریس وتعلیم کے فرائض انجام دیتے تھے، ایک دن شام کو گھر جاتے ہوئے طبیعت کچھ نڈھال معلوم ہوئی تو اپنے معالج خاص مولانا حکیم محمد صابر خاں صاحب ندوی کے مشورہ سے اس دن مدرسہ ہی میں رہ گئے، دوسرے دن بھی نہ جا سکے اور تیسرے دن دوشنبہ ۱۱رصفر ۱۳۸۷ھ کو چار بجے احیاء العلوم میں انتقال کر گئے، سورج نکلتے نکلتے طلبہ اور ملازمین کے کاندھوں پر رسولپور پہونچائے گئے اور اسی دن اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ مولانا موصوف ملک کے نامور مؤرخ ومصنف مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے ماموں تھے، اور قاضی صاحب سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ (تذکرہ علمائے مبارکپور ص ۲۶۱)

مولانا محمد یٰسین چریاکوٹیؒ

مولانا محمد یٰسین چریاکوٹی مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی کے فرزند تھے، فارسی وعربی پر انھیں پورا عبور حاصل تھا، فلسفہ اور منطق سے فطری مناسبت تھی، زمانہ طالب علمی میں فلسفیانہ تحقیقات ومعلومات کے لیے مشہور تھے، اس موضوع پر ان کے طویل مضامین اور رسالے موجود ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔ خلافت راشدہ پر ایک کتاب گورکھپور سے شائع ہو چکی ہے۔ رسالہ سبحان گورکھپور کے بہت دنوں تک مدیر رہے۔

(اسلام اور عصر جدید شمارہ جولائی ۱۹۷۲ء)

مولانا محمد یٰسین معروفیؒ

مولانا محمد یٰسین معروفی بن حاجی محمد سلیمان محلّہ بلوہ قصبہ پورہ معروف ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، ابتداءً محلّہ ہی میں حافظ حبیب اللہ معروفی سے قرآن حفظ کیا، پھر مدرسہ معروفیہ پورہ معروف میں مولانا نعمت اللہ مبارکپوری سے شرح جامی تک پڑھا بعدازاں مینڈھو تشریف لے گئے کچھ دنوں تک یہاں کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، پھر یہاں سے دارالعلوم دیوبند چلے گئے اور وہیں سے ۱۳۲۹ھ میں فراغت حاصل کی، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند آپ کے رفیق درس تھے، فراغت تعلیم کے بعد درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، پہلے ایک سال ۱۳۴۰ھ سے ۱۳۴۱ھ تک مدرسہ معروفیہ میں صدارت تدریس کے عہدے پر فائز رہے، پھر مولانا محمد ایوب مئوی نے جو اس وقت سینیر مدرسہ اکڑا چوبیس پرگنہ میں مدرس تھے، آپ کو اپنے پاس بلالیا، آپ ان کی طلب پر وہاں پہونچے اور نہایت محنت وجانفشانی سے کار منصبی کو انجام دینے لگے اور آہستہ آہستہ ترقی کرکے وہاں کے سب سے اعلیٰ عہدہ پر سپرنٹنڈ ہوگئے اور تقریباً ستائیس برس اس عہدہ پر متمکن رہے، یہیں کے زمانۂ قیام میں مولانا عبدالرؤف داناپوری مؤلف اصح السیر سے فن طب کی تعلیم حاصل کی، مولانا داناپوری کی عطا کردہ سند اب بھی آپ کے گھر پر موجود ہے، تدریسی مشاغل کے ساتھ احسان وسلوک میں بھی آپ کو دخل تھا، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری سے بیعت کی تھی اور خلافت واجازت سے بھی مشرف تھے، لیکن خود دوسروں کو بیعت نہیں کرتے تھے، آخر میں جب معتقدین کا اصرار بہت بڑھ گیا تو کچھ لوگوں کو بیعت کیا اور اپنے شیخ ومرشد کو مطلع کیا کہ۔ ''حضرت کی اجازت کے باوجود دل نہ چاہتے ہوئے بھی بعض مخلصین کے اصرار پر بیعت کرہی لیا ہے۔''

مولانا وقت کی بیحد قدر کرتے تھے، تہجد کبھی قضا نہیں ہوتی تھی، بعد نمازِ عصر تسبیح پڑھتے ہوئے تفریح میں نکل جاتے تھے، تواضع وانکساری حد درجہ تھی، کتابوں کے بہت شوقین تھے، اور ایک اچھا خاصا ذخیرہ کتابوں کا فراہم کرلیا تھا۔ کتب احادیث اکثر مطالعہ

میں رہتی تھیں۔ ۱۹۴۶ء میں زیارتِ حرمین سے بھی مشرف ہوئے۔ ۲۰/اپریل ۱۹۵۲ء مطابق ۱۳۷۱ھ کو اپنے آبائی وطن میں وفات پائی۔ (مشاہیر پورہ معروف ص۴۶ و ص ۴۷)

مولانا محمود احمد مئویؒ

حضرت مولانا محمد محمود بن غلام محمد بن دوست محمد مئوی علمائے اعظم گڈھ میں صلاح وتقویٰ اور علم فقہ میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے، ان کی ولادت ۱۲۷۵ھ میں قصبہ مئو میں ہوئی متوسطات تک کی تعلیم مقامی اساتذہ سے حاصل کر کے حضرت مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی متوفی ۱۳۰۴ھ کی خدمت میں لکھنؤ حاضر ہوئے اور ایک مدت تک ان کی صحبت میں رہ کر نصاب مروجہ کی تحصیل وتکمیل کر کے سند واجازت حاصل کی پھر حکیم عبدالعزیز حنفی لکھنویؒ سے طب وحکمت کی تحصیل کی۔ تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد کچھ دنوں تک دربھنگہ رہے پھر وہاں سے بھوپال چلے آئے اور کچھ دنوں یہاں قیام کرنے کے بعد وطن کی جانب مراجعت کی، مولانا طبابت کے ساتھ بنکاری بھی کرتے تھے ان مشاغل کے ساتھ ہمیشہ درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ آپ کی وفات جمعہ کے دن ۳/صفر ۱۳۳۷ھ میں ہوئی اور اپنے آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔ (نزہۃ الخواطر ص ۴۶۳ ج ۸)

مولانا مرتضیٰ بندویؒ

شیخ اجل مولانا مرتضیٰ بن محمد قاسم حنفی موضع بندی ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے مقامی طور سے ابتدائی کتابیں پڑھ کر رامپور کا تعلیمی سفر کیا اور وہاں مدرسہ عالیہ میں مولانا فضل حق رامپوری، مولانا محمد طیب مکی، مولانا ظہور الحسن اور اپنے ہم وطن عالم مولانا حفیظ اللہ وغیرہ سے درسِ نظامیہ کی تکمیل کی اور سند فراغت پائی، فراغت کے بعد گونڈہ کے کسی مدرسہ میں مدرس ہوئے، یہاں پانچ سال تعلیمی خدمات انجام دے کر منگلور ضلع سہارنپور کے مدرسہ میں چلے گئے اور وہاں ایک زمانہ تک درس وتدریس کے ذریعہ طلبۃ العلم کو فیض پہونچایا، اس کے بعد محمد آباد ضلع اعظم گڈھ کے مدرسہ میں استاذ مقرر ہوئے، کچھ دنوں کے

بعد یہاں سے بھی الگ ہو گئے اور لکھنؤ جا کر منشی نول کشور کے مطبع میں تصحیح کا کام کرنے لگے پھر آخر میں دارالعلوم ندوہ میں مدرس ہوئے اور ندوہ ہی کی مدرسی کے زمانہ میں ۱۳۰۷ھ کے حدود میں انتقال کر گئے۔ (نزہہ ص ۱۷۱ ج ۸)

شیخ میر مقیم سرائے میریؒ

سیّد میر مقیم حضرت میر علی عاشقاں سرائے میریؒ کی اولاد میں سے ہیں، آپ نے علوم وفنون کی تکمیل جونپور میں وہاں کے نامور علماء سے کی، فرخ سیر کے زمانہ میں دربار شاہی سے متعلق ہو گئے تھے، آپ کا شمار نامور ہیئت دانوں میں تھا، ایک کتاب علم ہیئت ونجوم اور فلکیات پر لکھی ہے، تاریخ تصنیف ۲۹/ جمادی الاخری ۱۰۳۹ھ ہے۔ غالباً یہ میر مقیم کی تاریخ وفات ہے، غلطی سے تاریخ تصنیف لکھ دیا گیا ہے، واللہ اعلم۔ (تجلی نور و تاریخ شیراز ہند)

مولانا منصور عباسی چریاکوٹیؒ

مولانا شیخ منصور بن ملا جلال عباسی چریاکوٹی اپنے وقت کے مشاہیر علماء وفضلا میں شمار ہوتے تھے جملہ علوم میں ماہر تھے بالخصوص ادب عربی میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ دور دراز سے طلباء تحصیل علم کے لیے آپ کی خدمت میں آتے تھے۔ امراء آپ کی علمی صحبتوں کے ہروقت متمنی رہا کرتے تھے، فارسی وعربی کے بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ تمام عمر اعلیٰ مناصب پر فائز رہے، دو مرتبہ دہلی دارالحکومت کا سفر کیا، سن ولادت ووفات اور مزید دیگر حالات دستیاب نہیں ہوئے۔ (یادداشات چریاکوٹ ص ۸۳)

مولانا حکیم منظور احمد کوپاگنجیؒ

مولانا حکیم منظور احمد بن مولانا سراج الدین بن فتح محمد کوپاگنجی اعظمی اس دیار کے مشہور حکیم اور عالم تھے۔ آپ کی ولادت ۱۳۱۴ھ میں ہوئی، آپ کے والد ماجد خود باصلاحیت عالم ومدرس تھے اس لیے ان کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی اور سن شعور کو پہونچتے ہی

مقامی درس گاہ مدرسہ مصباح العلوم میں مولانا عبدالصمد مرحوم کے حوالے کر دیا۔ مولانا نے نہایت توجہ اور سرگرمی کے ساتھ ابتدائی تعلیم دی۔ چونکہ گھر پر رہتے ہوئے کما حقہ پوری توجہ اور انہماک سے تعلیمی سلسلے کو جاری رکھنا نہایت دشوار ہوتا ہے، اس لیے اپنے استاذ مولانا عبدالصمد کے مشورہ سے مدرسہ سبحانیہ الہ آباد چلے گئے، جہاں مولانا عبدالصمد کے استاذ مولانا منیر احمد الہ آبادی تعلیمی خدمات انجام دے رہے تھے۔ چنانچہ یہیں رہ کر متوسطات تک کی تعلیم حاصل کی پھر یہاں سے ۱۳۳۲ھ میں حضرت مولانا ماجد علی جونپوری کی خدمت میں میڈھو پہونچے اور بقیہ کتابیں پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، علوم دینیہ کی تکمیل کے بعد پھر الہ آباد تشریف لائے اور حکیم محمد عثمانی بانی طبیہ کالج الہ آباد سے فن طب کی تحصیل وتکمیل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد تدریسی سلسلہ شروع کیا، پہلے اپنے والد ماجد کی جگہ پرٹمیابرج کلکتہ میں دو برس تعلیمی وتدریسی خدمت انجام دی، پھر یہاں سے اہل مئو کی طلب پر مدرسہ مفتاح العلوم مئو میں آگئے؛ لیکن یہاں ایک سال سے زیادہ نہ رہ سکے اور اہل وطن کے بار بار اصرار پر مفتاح العلوم سے علیحدہ ہوکر مصباح العلوم میں بحیثیت مہتمم کے چلے آئے۔ یہاں اہتمام کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اسی زمانہ میں آپ کو طبیہ کالج الہ آباد کی جانب سے دعوت نامہ ملا، چنانچہ آپ مصباح العلوم سے الگ ہوکر الہ آباد چلے گئے، ۱۹۳۱ء (۱۳۵۰ھ) سے ۱۹۳۹ء (۱۳۵۸ھ) تک طبیہ کالج الہ آباد سے متعلق رہے اس عرصہ میں آپ کو طبی دنیا میں خوب شہرت حاصل ہوئی، اور تکمیل الطب لکھنؤ، یونانی کالج الہ آباد، طبیہ کالج دلی اور الہ آباد عربی فارسی بورڈ کے عالم وفاضل اور طب کے مستقل ممتحن مقرر ہوگئے۔ اور طویل عرصہ تک مذکورہ مقامات کے امتحانی پرچے تحریر کرتے رہے آخر عمر میں دارالعلوم مئو میں بحیثیت نائب ناظم کے آپ کا تقرر ہوگیا اور تقریباً چھ برس اس خدمت کو انجام دے کر ۵۹ برس کی عمر میں ۱۳۷۳ھ مطابق ۱۹/جولائی ۱۹۵۳ء میں اپنے آبائی وطن کوپا گنج میں وفات پائی۔

مولانا منظور احمد مرحوم جملہ علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور آخر عمر تک نہایت تحقیق

وتدقیق سے بڑی بڑی کتابوں کا درس دیتے رہے، علمی استعداد کے ساتھ تنظیمی صلاحیت سے بھی متصف تھے۔ آپ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم میں بڑا سکون واطمینان رہا اور خوب علمی کام ہوا۔

شیخ منجھن کمال پوریؒ

موضع کمال پور قصبہ سرائے میر سے جنوب میں تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ایک قدیم بستی ہے، شیخ منجھن اسی بستی کے ایک باکمال فرزند اور حضرت علی عاشقاں کے اجل خلفاء میں تھے، شیخ عارف علی رسالہ عاشقیہ میں لکھتے ہیں کہ ابتداء میں شیخ منجھن کو شیخ علی عاشقاں سے ارادت وعقیدت نہیں تھی، ایک مرتبہ اتفاق سے یہ خانقاہ میں حاضر ہوئے، حضرت میر صاحب اس وقت سرخ لباس زیب تن کیے ہوئے تھے، شیخ منجھن نے ایک عالمِ دین کی حیثیت سے اس پر نکیر کی، میر صاحب کو اس سے ناگواری ہوئی، اسی شب شیخ منجھن نے خواب دیکھا کہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمارہے ہیں کہ تونے میرے لڑکے کو کیوں اذیت پہونچائی جس مقام پر وہ ہے تمھیں اس کا علم نہیں جاؤ اس سے معذرت طلب کرو اور حضرت علی عاشقاں کو بھی اسی رات آقائے دوجہاںؐ کی جانب سے حکم ہوا کہ مولانا منجھن سے دل آزردہ مت ہو، وہ میری شریعت کے محافظ ہیں۔ صبح کو شیخ منجھن کمال پور سے سرائے میر معذرت طلبی کی غرض سے روانہ ہوئے اور سرائے میر سے میر صاحب کمال پور کے لیے چلے، راستہ میں دونوں بزرگوں کی ملاقات ہوگئی، شیخ منجھن نے دیکھتے ہی فرمایا کہ حضرت مجھے معاف فرمادیں رات اس اعتراض کی وجہ سے مجھ پر آنحضورؐ کی طرف سے عتاب ہوا ہے، میر صاحبؒ نے انھیں اپنی سواری پر بٹھالیا اور اپنے ہمراہ خانقاہ میں لائے اور سلسلہ میں داخل کرلیا۔ اس سے زائد حالات دستیاب نہیں۔ (رسالہ عاشقیہ قلمی ص ۵۹-۶۱)

☆ ☆ ☆

(ن)

مولانا نجم الدّین چریّاکوٹیؒ

شیخ فاضل مولانا نجم الدین بن مولانا احمد علی بن شیخ غلام حسین بن شیخ سعد اللہ عباسی چریاکوٹی اپنے وقت میں شعر وادب اور علوم عربیہ میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے جملہ علوم کی تحصیل اپنے والد ماجد سے کی، مسائل ودلائل کے استحضار میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، آخر عمر میں علمی مشاغل سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی، نظم ونثر دونوں پر انھیں یکساں قدرت حاصل تھی جیسا کہ ان کی تصانیف شاہد ہیں، تصانیف میں مندرجہ کتابیں ان کی علمی یادگار ہیں:

ہفت اقسام حسینی (علم صرف میں) اعراب اربعہ (فن نحو میں) مثنوی فیض الٰہی، مثنوی چہار ضرب، رسالہ فی العروض والقافیہ، افسانۂ سیلاب (۱۲۸۸ھ میں شہر اعظم گڈھ میں ایک قیامت خیر سیلاب آیا تھا، یہ کتاب اسی سے متعلق ہے) خمسہ محمدیہ، مثنوی فیضِ الٰہی کا مطلع یہ ہے:

خدا وندا بجولان معانی ۔۔۔ کمیت خامہ ام دادہ روانی

مثنوی میں اپنے وطن چریاکوٹ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

چریاکوٹ خوانندش عوامش ۔۔۔ ولیکن یوسف آباد است نامش

فلک تا طرح ایں آباد بنہاد ۔۔۔ زخاک پاک جنت کرد بنیاد

چراغ آسماں روشن ز دودش ۔۔۔ زجنت می رسد ہر دم درودش

ایک اور کتاب علمائے چریاکوٹ کی مختصر تاریخ اور شجرۂ نسب میں فارسی زبان میں لکھی تھی، مگر اب بالکل نایاب ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ محمد اسلم عباسی وکیل عدالت دیوانی گھورکھپور کے پاس ہے، موصوف اسے ترجمہ واضافہ کے ساتھ شائع کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں، خدا کرے یہ کتاب شائع ہوجائے، میں نے اس تذکرہ میں علمائے چریاکوٹ کے سلسلے میں اس کتاب سے ماہنامہ اسلام اور عصر جدید کے حوالہ سے کافی استفادہ کیا ہے۔

(تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳۵ ونزہہ ص ۳۱۹)

مولانا نذیر احمد املوی رحؒ

مولانا نذیر احمد بن شیخ عبدالشکور بن شیخ جعفر رحمانی املوی ۱۰رذی الحجہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۶رفروری ۱۹۰۶ء کو املو ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے محلہ میں حاصل کر کے مدرسہ دارالتعلیم مبارکپور اور مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں متوسطات تک پڑھا، پھر مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی گئے اور وہاں کے اساتذہ سے منتہی کتابیں پڑھ کر شعبان ۱۳۴۶ھ میں سند فراغت حاصل کی اس دور میں ہر امتحان میں اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوتے رہے، آخری سال میں پورے مدرسہ میں اوّل آئے اور خصوصی انعام میں صحیح بخاری اور چالیس روپے نقد حاصل کیا، فراغت کے بعد دارالحدیث رحمانیہ ہی میں مدرس ہو گئے اور پہلے ہی سال نورالانوار اور رشیدیہ وغیرہ پڑھائی، اسی دوران میں مدرسہ کی طرف سے مشہور معقولی عالم مولانا فضل حسن صاحب کے پاس رامپور گئے مگر وہاں رہ نہ سکے اور بدایوں جاکر مولانا عبدالسلام صاحب سے منطق، فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی، یہ علوم مدرسہ رحمانیہ کے نصاب میں داخل نہ تھے بعد میں پھر مدرسہ رحمانیہ میں اپنی جگہ پر آگئے، اس درمیان میں مدرسہ کی طرف سے آپ کی تنخواہ جاری رہی، مدرسہ دارالحدیث سے ترکِ ملازمت کے بعد کچھ نوں وطن میں رہے، اس زمانہ میں ہمدرد دواخانہ کی ایجنسی لے لی تھی، اس کے بعد مدرسہ رحمانیہ مدن پورہ بنارس میں مدرس ہوکر گئے تو یوں جم کر رہے کہ مرکر ہی اس سے جدا ہوئے۔

مولانا نذیر احمد مرحوم تعلیم وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا مشغلہ بھی رکھتے تھے، ان کے مضامین ومقالات جرائد ومجلات میں کثر شائع ہوتے تھے، ان کی مستقل تصانیف میں مصابیح بجواب رکعات تراویح مصنفہ محدثِ عصر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی چھپ چکی ہے جس سے آپ کی وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے، انتقال کے بعد ان کی دوسری کتاب ''اہل حدیث اور سیاست'' کئی سو صفحات میں آب وتاب کے ساتھ بنارس سے شائع ہوئی ہے۔ مولانا آنتوں کے کینسر..کے موذی مرض میں مدتوں مبتلا رہے، مگر تعلیمی

خدمات میں مصروف رہے، آخر میں بنارس سے املو لائے گئے اور یہیں شنبہ ۲۸ر محرم ۱۳۸۵ھ مطابق ۳۰ر مئی ۱۹۶۵ء کو تین بجے انتقال ہو گیا۔

(تراجم علمائے اہل حدیث ص ۴۱۱ و تذکرہ علمائے مبارک پور ص ۲۷۵)

شیخ نصیرالدین عباسی قلندرؒ

شیخ نصیرالدین محمد قلندر نیگوی (قصبہ قلندر پور) سلسلۂ قلندریہ کے امام و پیشوا قطب الدین بینائے دل قلندر متوفی ۹۲۵ھ کے اعاظم خلفاء میں سے تھے، اور نسبی اعتبار سے عباسی تھے، شجرۂ نسب یہ ہے۔

شیخ نصیرالدین قلندر بن فتح محمد، بن شیخ رفیع الدین، بن شیخ نجم الدین، بن شیخ رکن الدین یک لکھی سمرقندی ظفر آبادی۔

شیخ نصیر کا اصل آبائی وطن سمرقند تھا، ان کے جدِ اعلیٰ شیخ رکن الدین یک لکھی سمرقندی خلجی عہد سلطنت (از ۶۸۹ تا ۷۲۰ھ) میں سمرقند سے نقل مکانی کر کے ہندوستان وارد ہوئے اور شیخ اسدالدین حسین آفتاب ہند متوفی ۷۹۳ھ کے حلقۂ ارادت منداں میں داخل ہو گئے، اوران کی اجازت وخلافت سے فائز المرام ہوئے، پھر شیخ ومرشد کی معیت میں دینِ اسلام کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں ظفر آباد ضلع جون پور آئے، یہ سرزمین ایسی پسند آئی کہ ہمیشہ کے لیے یہیں رختِ سفر کھول دیا۔

شیخ رکن الدین اپنے عہد میں مسلکِ احناف کے اکابر فقہاء میں شمار ہوتے تھے، فقہ، اصول فقہ، تفسیر اور حدیث میں یدِ طولیٰ حاصل تھا، ایک لاکھ حدیثوں کے حافظ تھے، اسی لیے عوام وخواص میں "یک لکھی" کے لقب سے مشہور تھے۔ ۸۲۰ھ میں ظفر آباد ہی میں وفات ہوئی اور اپنے شیخ آفتابِ ہند کے روضہ میں مدفون ہوئے۔

شیخ نصیرالدین ظفر آباد ہی میں پیدا ہوئے اور وہیں پروان چڑھے، خاندانی روایت کے مطابق یہ بھی علوم شریعت وطریقت دونوں میں دستگاہ رکھتے تھے، بالخصوص شیخ بینائے دل کی تلقین وتربیت نے انھیں طریقت کا امام ومقتدا بنا دیا تھا، شیخ نصیر کو قصبہ نیگو اور اس کے

اطراف میں شرقی حکومت کی جانب سے کئی مواضعات بطور جاگیر ملے تھے، غالباً اسی تقریب سے ظفر آباد کی سکونت ترک کر کے قصبہ نیگو میں مع اہل وعیال کے آباد ہو گئے تھے، یہ موضع سرائے میر سے جنوب مغرب میں تقریباً چار پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، اس وقت وہ سرکار جون پور اور پرگنہ ماہل سے متعلق تھا، شیخ نصیر قلندر کے یہاں سکونت پذیر ہو جانے کے بعد ان کی نسبت سے قصبہ قلندر پور کے نام سے مشہور ہو گیا، اب عوام اسے قصبہ پلندر پور کہتے ہیں۔

شیخ کی یہاں تقریباً ڈیڑھ دو ایکڑ کے وسیع وعریض احاطہ میں خانقاہ تھی، ہماری طالب علمی کے زمانہ تک احاطہ کی دیوار کے بعض حصے باقی تھے، البتہ خانقاہ کی عمارت زمین بوس ہو گئی تھی، بس ایک ٹیلہ کی شکل میں اس کا کچھ نشان باقی تھا۔

شیخ نصیر قلندرؒ سلسلہ کے امام شیخ قطب الدین بینائے دل سرہر پوری ثم جون پوری کی خلافت کے ساتھ ان کے پسر نسبی اور داماد ہونے کا بھی شرف حاصل تھا، پھر شیخ بنائے دل نے انھیں یہ اعزاز بھی بخشا تھا کہ اپنی حیات ہی میں سلسلۂ مداریہ قلندریہ کا علَم بھی ان کے سپرد کر دیا تھا، گویا یہ علَم دے کر یہ واضح کر دیا کہ اب اس طائفۂ علیہ کی سیادت اور علمبرداری کے منصب پر شیخ نصیر ہی فائز ہیں، اس وقت سے یہ علَم انھیں کے پاس رہا اور ان کی وفات کے بعد خانقاہ میں موجود تھا، چنانچہ بحر ذخّار کے مولف شیخ وجیہ الدین اشرف لکھنوی لکھتے ہیں کہ:

> ''آں علَم ہنوز..... در قصبہ نیگو کہ قریب جون پور است موجود است و مردماں زیارت می نمایند، نگارندۂ ذخار ہم بشرف زیارت آں علم مشرف شدہ از آہن است بقدر قد یک عصا'' (بحر ذخار ورق ۳۱۶ مملوکہ دائرہ شاہ محمدی الہ آبادی)

یہ علَم اب بھی قصبہ نیگو میں موجود ہے، لوگ زیارت کرتے ہیں، ذخار نویس بھی اس علَم کی زیارت سے مشرف ہوا ہے، لوہے کا ہے اور ایک لاٹھی کے بقدر لمبا ہے۔ بحر ذخّار کے اس نسخہ کے ورق ۳۱۶ کے حاشیہ پر درج ذیل تحریر ہے:

> ''قریب پنجاہ سال شدہ کہ مجاورے علم مذکور را از مزار حضرت شاہ نصیر الحق والدین جون پوری دزدیدہ در بانس بریلی بدست سیدے فروخت کرد الآن آں علم بر درگاہ

موصوف بمقام نیگو نیست" (حررہ محمد علی حسن نوری ۲۲ر صفر ۱۲۹۰ھ مقام الہ آباد)

پچاس سال کے قریب ہوا کہ اس علم کو حضرت شاہ نصیر الدین جون پوری کے مزار سے کسی مجاور نے چرا کر بانس بریلی میں ایک سید کے ہاتھ فروخت کر دیا اب وہ علم درگاہ موصوف "نیگو" میں نہیں ہے۔"

حاشیہ نگار نے اپنی نسبت "نوری" لکھی ہے جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیخ نصیر الدین کے صاحبزادے شیخ نور کی اولاد میں سے ہیں (واللہ اعلم)

"بحر ذخار" کی تالیف ۱۲۴۰ھ میں مکمل ہوئی ہے، اور حاشیہ ۱۲۹۰ھ میں یعنی بحر ذخار کی تکمیل کے پچاس سال بعد لکھا گیا ہے اور اس میں صراحت کی گئی ہے کہ اب سے تقریباً پچاس سال پیشتر یہ علم یہاں سے چوری ہو گیا، لہٰذا یہ اندازہ قرین صحت ہوگا کہ شیخ وجیہہ الدین اشرف لکھنوی نے اس علم کی جس وقت زیارت کی تھی اسی کے قریب زمانہ میں یہ وہاں سے چوری ہوا ہوگا۔

نیز یہ تحریر بھی بتا رہی ہے کہ آج سے دو سو سال پہلے تک شیخ نصیر قلندرؒ کی خانقاہ آباد تھی اور ان کے خانوادے کے لوگ نیگو (قصبہ قلندر پور) میں بود و باش رکھتے تھے۔

افسوس کہ سلسلۂ قلندریہ کے اس شیخ جلیل کے کشف و کرامات کے ذکر میں ان کے تذکرہ نگار اس قدر محو ہو گئے، کہ ان کی علمی و روحانی سرگرمیوں کی جانب ان کی توجہ ہی نہیں ہوئی، اس لیے ان کی حیات کا یہ پہلو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

شیخ نے ظفر آباد سے ترک سکونت کے بعد زندگی کا بقیہ حصہ نیگو ہی میں بسر کیا اور اپنے شیخ و مرشد قطب بینائے دل کی وفات سے دس سال قبل ۲۵ رجمادی الاولیٰ ۹۱۵ھ کو اس دنیائے دنی کو چھوڑ کر جانب خلد بریں روانہ ہو گئے، خانقاہ کے احاطہ کی مشرقی دیوار سے کچھ فاصلے پر جنوب میں ایک عالی شان قبہ میں آپ کا اور آپ کی اہلیہ کا مزار ہے۔ غالباً بعد میں مولانا عبد القادر سوگھر پوری نے تاریخ وفات سے متعلق یہ اشعار کہے ہیں۔

آنکہ شاہ نصیرِ دیں بودہ　　صاحبِ صدق و ہم یقین بودہ
او ز بینائے دل خلافت یافت　　علم پیر را بصدق افراشت

بعد چندے بہ قصبۂ نیگوں   کرد از حکم پیر خویش سکوں
بست و پنجم جمادی الاولیٰ بود   کہ ز دنیائے دوں سفر فرمود
سالِ تاریخ او بجا باشد
گفتہ ام شاہدِ خدا باشد

درگاہ سے بالکل قریب چند قدم کے فاصلے پر جنوب مشرق میں نو دس فٹ کی بلندی پر عالی شان اور پر شوکت ایک مسجد ہے جس کے طرز تعمیر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شیخ کی وفات کے بہت بعد تعمیر ہوئی ہے، مسجد بحمد اللہ شکست وریخت سے ابھی محفوظ ہے، مگر مسجد کی حالت تبا رہی ہے کہ اس کی صفائی ستھرائی کا کوئی انتظام نہیں ہے، شاید پنجوقتہ نماز بھی اس میں نہیں ہوتی ہے۔

شیخ کے مزار کی خستہ حالی اور اس کے ارد گرد کوڑے کرکٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں فاتحہ کے لیے کوئی ہاتھ اٹھانے بھی نہیں آتا ہے۔

برمزار ما غریباں نے چراغے نہ گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

اس موضع کے قدیم وجدید نام ''نیگو'' اور ''قلندر پور'' کے ساتھ، قصبہ کا لاحقہ بتا رہا ہے کہ اُس زمانہ میں یہ اگر چھوٹا شہر نہیں تو ایک بڑا گاؤں ضرور تھا، مگر آج اس کی حیثیت ایک کوردہ بستی سے زیادہ کی نہیں ہے، جس میں مسلمانوں کے چند گھر ہی ہوں گے اور وہ بھی دین ودنیا ہر اعتبار سے زبوں حالی کے شکار ہیں۔

حضرت شیخ کی اولاد میں سے ان کے ایک صاحبزادے شیخ نورالدین (عرف شیخ نور) کا ذکر تذکرہ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ یہ بھی سلسلۂ قلندریہ کے مشائخِ کبار میں سے تھے، اپنے والد شیخ نصیرالدین اور نانا شیخ قطب الدین بینائے دل کے تربیت یافتہ اور دونوں بزرگوں کے خلیفہ تھے، والد بزرگوار کے ایماء پر ''نیگو'' عرف قصبہ قلندر پور سے سکونت ترک کر کے اپنے نانا شیخ بینائے دل کی قدیم رہائش گاہ سرہرپور ضلع فیض آباد کو اپنی روحانی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا تھا، مشہور ہے کہ ''ہمایوں بادشاہ'' شیخ نور سے ارادت وبیعت کا تعلق

رکھتا تھا اور اس نے فیض آباد اور اعظم گڈھ کے خطے میں بہت سے مواضعات انھیں جاگیر میں دیئے تھے، جن میں سے بعض مواضعات پر برطانوی عہد حکومت تک ان کی اولاد کا قبضہ تھا۔

۲۱ رصفر ۹۶۳ھ میں سرہرپور ہی میں شیخ نور کی وفات ہوئی، روضہ کی عمارت انتہائی دیدہ زیب ہے، جسے عہد مغلیہ میں کسی امیر و رئیس نے تعمیر کرایا تھا۔

ایک گاؤں بنام نور پور موضع مہوارہ کے قریب ہے اور مشہور ہے کہ شیخ نور ہی نے اپنے نام سے اسے بسایا تھا، مگر یہاں بھی اس وقت کوئی قابل ذکر گھرانہ موجود نہیں ہے۔

مولوی نعمت اللہ مبارک پوریؒ

مولوی نعمت اللہ بن حافظ عبدالسبحان بن شیخ پکھن ساکن محلہ پورہ رانی کا خاندان کسی زمانہ میں مئو سے ترک وطن کر کے مبارک پور میں آباد ہوا، جہاں اسے بڑی خوشحالی اور فارغ البالی نصیب ہوئی، مولانا نے چودہویں صدی کی ابتداء میں آنکھیں کھولیں اور عیش وتنعم میں پروان چڑھے، قران مجید اور اردو وغیرہ کی تعلیم گھر اور محلہ میں حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ احیاء العلوم می داخل ہو گئے، جو ۱۳۱۷ھ میں ان کے مکان کے قریب کندھی کے کنویں کے پاس جاری ہوا تھا اور مولانا محمد محمود معروفی اس کے پہلے مدرس تھے، آپ نے مولانا محمود سے عربی کتابیں پڑھیں، اس وقت گھر کے بعض لوگ بہ سلسلۂ تجارت کان پور رہتے تھے، مولانا کان پور چلے گئے وہاں جامع العلوم اور فیض عام دو مدرسے چل رہے تھے، ان میں سے کسی ایک میں پڑھنے لگے، پھر وہاں سے دارالعلوم دیوبند گئے، اس زمانہ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن جامع ترمذی اور صحیح بخاری، مولانا حافظ احمد صاحب صحیح مسلم، حضرت مولانا محمد انور شاہ سنن ابی داؤد اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی تفسیر بیضاوی پڑھاتے تھے، مولوی نعمت اللہ نے ان اساتذہ وشیوخ کی خدمت میں یہی کتابیں پڑھنی شروع کردیں، مگر کچھ دنوں کے بعد وہاں طاعون کی وباء پھوٹ پڑی جس سے دارالعلوم میں بڑی ابتری پھیل گئی اور طلبہ ادھر ادھر جانے لگے، مولانا بھی وطن چلے آئے اور کچھ دنوں کے بعد پورہ معروف کے مدرسہ معروفیہ میں تعلیم دینے لگے اور سات

برس وہاں رہ کر عربی کتابیں پڑھائیں، پھر جب مدرسہ احیاء العلوم کے ناظم مولانا شکر اللہ صاحب ہوئے تو مولانا نعمت اللہ صاحب اسی سے وابستہ ہو گئے اور مدرسہ کی تعمیر میں دونوں بزرگوں نے یکساں حصہ لیا اس کے بعد مدرسہ میں فارسی کے مدرس کی حیثیت سے رہے اور انتقال کے چند سال پہلے تک علمی و دینی خدمت انجام دیتے رہے ۱۳۳۷ھ میں جب رضا خانی مسلک سے متعلق لوگوں نے اپنی نماز الگ مسجد میں قائم کر لی تو جامع مسجد کے دیوبندی طبقے کے خطیب و امام بنائے گئے اور آخر تک اس خدمت کو بوجوہ احسن انجام دیتے رہے، بہترین قاری تھے، بہترین خطاط و خوشنویس بھی تھے، ہندی و انگریزی بھی بہترین لکھتے تھے، مولانا شکر اللہ باہر کہیں جاتے تو مدرسہ کی نگرانی انھیں کے ذمہ ہوتی تھی، بڑے ذہین و فطین اور بذلہ سنج بزرگ تھے، سادگی، شرافت، صبر و شکر کے پیکر تھے، مدرسہ سے صرف بیس روپے تنخواہ ملتی تھی جو اس وقت کے تمام مدرسین سے زیادہ تھی اسی پر گذر بسر کرتے تھے آخر میں بڑھاپے کی وجہ سے تعلیم و تدریس کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا اور مختلف فرموں میں بھی کھاتہ لکھ کر گزر بسر کرتے تھے، یوم سہ شنبہ ۲۸ ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی اور اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے، آپ کی درسگاہ سے سیکڑوں طلبہ عالم و فاضل بنے۔ (تذکرہ علمائے مبارکپور ص ۲۲۶ تا ۲۲۹)

مولانا نور محمد مئویؒ

مولانا نور محمد بن محمد اسماعیل مئوی ۱۲۷۳ھ کے حدود میں قصبہ مئو میں پیدا ہوئے فارسی کی تعلیم میاں ولی اللہ اور میاں رمضان مئوی سے حاصل کی اور کتب عربیہ ملا حسام الدین مئوی سے پڑھ کر مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں داخل ہوئے، وہاں مولانا حافظ عبد اللہ غازیپوری اور مولانا عبد العلیم رسول پوری وغیرہ سے فنون کی تکمیل کی؛ اس کے بعد دہلی جا کر مولانا سید نذیر حسین محدث سے حدیث پڑھی اور سند و اجازت پائی سن فراغت ہی کے ساتھ یعنی ۱۲۹۶ھ میں قاضی محمد مچھلی شہری جونپوری سے ماہ رجب میں مسلسل بالاولیہ کی سند لی۔ مولانا نور محمد نے قاضی محمد مچھلی شہری سے مسلسلات کی سند کے علاوہ بلوغ المرام کی بھی

سند حاصل کی تھی، تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد گیان پور ضلع مرزاپور کے مدرسہ میں مدرس ہوئے اور پندرہ برس تک وہاں تعلیمی خدمت انجام دی، اس کے بعد مولانا عبداللہ غازیپوری کے مشورہ سے ڈیانواں (بہار) کے مدرسہ میں چلے گئے جہاں حکیم محمد ادریس صاحبِ عون المعبود کے صاحبزادے کوایک سال تک پڑھایا، ان مدارس کے علاوہ مقامی مدرسہ فیض عام میں بھی آپ نے تدریسی خدمت انجام دی، آخر میں پیرانہ سالی کی وجہ سے درس وتدریس کے سلسلہ کوختم کردیا تھا، مئو کے مشہور فرم محمد گرہست کی جانب سے دس روپے ماہانہ نذرانہ ملتا تھا اسی پر گذر بسر کرتے تھے۔ (تراجم علمائے اہلحدیث ص ۴۳۰، ۴۳۱)

=================

﴿۹﴾

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوریؒ

آپ کی ولادت ۱۳۱۰ھ میں فتح پور تال نرجا ضلع اعظم گڈھ میں ہوئی، نسبی تعلق اودے بنسی راجپوتوں سے ہے، اعظم گڈھ کا علاقہ قدیم زمانہ سے اجودھیا کے سورج بنسی راجپوتوں کی حدود مملکت میں شامل تھا، اسی بنا پر اسلامی یورش کے وقت اکثر راجپوت راجپوتانہ وغیرہ سے بھاگ کر اعظم گڈھ، فیض آباد وغیرہ میں آکر آباد ہوگئے تھے، چنانچہ اس نواح میں ان کی بستیاں آج بھی موجود ہیں، شجرۂ نسب یہ ہے:

مصلح الامت مولانا وصی اللہ بن یعقوب خاں بن فضل علی خاں بن حسن علی خاں بن رحم دین خاں بن شہادت خاں بن فاضل خاں بن مصاحب خاں بن پہاڑ خاں بن سیف خاں بن فیروز خاں بن .... خاں بن ملک فتح بن ملک مبارک بن ملک اودھرن بن ملک دیندار (کنور سنگھ) بن آری سنگھ بن بجر سنگھ بن دولہ سنگھ۔

آری سنگھ کے چار لڑکے تھے جن کے نام بالترتیب یہ ہیں: سروجو سنگھ، گنج سنگھ، کنور سنگھ، گنگا سنگھ۔

کنور سنگھ ۸۳۴ھ میں راج بھروں کے مقابلہ میں ابراہیم شاہ شرقی کے دربار میں

مدد لینے گئے تھے کہ طالع بیدار نے رہنمائی کی اور یہ وہیں شعبان ۸۳۴ھ میں جونپور سے ایمان واسلام کی قوت سے مسلح ہوکر واپس آئے۔

مولانا فتحپوری نے ابتدائی اور حفظ کی تعلیم فتح پور ہی میں حاصل کی اس وقت آپ کے گاؤں میں حافظ ولی محمد صاحب بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے، حافظ صاحب بڑے پاک طینت وخدارسیدہ بزرگ تھے، حضرت تھانوی قدس سرہ سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے، ادھر حضرت فتحپوریؒ مادرزاد ولی تھے، استاذ وتلمیذ کی طبعی مناسبت نے اپنا اثر دکھایا اور مولانا بہت جلد حافظ قرآن ہونے کے ساتھ صلاح وتقویٰ کے زیور سے بھی آراستہ ہوگئے۔ حضرت فتحپوری کے ایک ہم وطن عالم مولانا محمد عثمان صاب تلمیذ حضرت شیخ الہند اس وقت کانپور میں تدریسی خدمت انجام دے رہے تھے، مولانا جب حفظِ قرآن سے فارغ ہوگئے تو انھیں کے ہمراہ عربی کی تحصیل کے لیے کان پور چلے گئے اور مولانا عثمان صاحب کی قائم کردہ درس گاہ مدرسہ اشرف العلوم میں داخل ہوکر مولانا محمد عثمان اور مولانا عبدالستار صاحب سے نحو وصرف وغیرہ کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اس کے بعد اپنے اساتذہ کے مشورہ سے ۱۳۳۱ھ میں دارالعلوم دیوبند حاضر ہوئے اور قدوری وکافیہ وغیرہ کی جماعت میں پڑھنے لگے، آپ کے رفقاء درس میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم جیسے آفتاب وماہتاب تھے۔

طالب علمی کا زمانہ عموماً آزادی اور غفلت شعاری کا ہوا کرتا ہے؛ لیکن حضرت فتحپوری کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا، بچپن ہی سے رشد وصلاح ایثار وقربانی اور خدمتِ خلق جیسے اخلاقِ حسنہ کے آثار نمایاں تھے، حضرت مفتیٔ اعظم اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''آج سے چھپن سال پہلے ۱۳۳۱ھ میں جب احقر نے دارالعلوم دیوبند میں کافیہ قدوری وغیرہ اسباق میں داخلہ لیا تو ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے ایک ذہین و فطین مگر سیدھے سادے طالب علم سے ہم سبق ہونے کی حیثیت سے تعلق قائم ہوا اور دارالعلوم کے بہت سے اسباق میں ان کے ساتھ شرکت رہی، مگر دوران تعلیم

ہی میں ان کو اصلاح اعمال کی فکر اور ذوقِ عبادت حق تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا طالب علمانہ شوخیاں ان کے پاس سے ہو کر نہیں گذریں، اجتماعات سے الگ تھلگ رہنے کے عادی تھے۔ (البلاغ کراچی شوال ۱۳۸۷ھ)

مولانا نے دارالعلوم میں تقریباً چھ سال گذارے، اس دوران میں آپ ہمیشہ عزلت نشیں رہے، طلبہ سے اختلاط بالکل پسند نہیں کرتے تھے؛ بلکہ ہمیشہ حجرہ میں تنہا رہنے کی کوشش کرتے تھے، چنانچہ اسی ذوق کی تسکین کے لیے دارالعلوم کے حجروں میں رہنے کے بجائے ریلوے اسٹیشن کی مسجد کے کمرہ میں رہتے تھے۔ یہ مسجد اور اس سے ملحق مکان وزمین دارالعلوم ہی کی ملکیت میں ہے۔

دعوت وغیرہ کے کھانے سے بھی اس زمانہ میں بہت اجتناب کرتے تھے، چنانچہ جب کبھی طلبۂ دارالعلوم کی دعوت ہوتی اور مطبخ بند ہو جاتا تو اس وقت بھی مولانا دعوت میں نہ جاتے اور اس دن فاقہ ہی سے رہتے، حضرت مہتمم صاحب کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے اس وقت سے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ جس دن مدرسہ میں دعوت ہوا کرے اس روز آپ کھانا ہمارے یہاں کھالیا کریں۔

مولانا کے عہدِ تحصیل وتعلیم کے مجاہدات اور ایثار وقربانی کے واقعات اتنے حیرت انگیز ہیں کہ اس زمانہ میں ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، یہ سادہ ورنگین داستان اگرچہ اپنے اندر بے شمار فوائد سمیٹے ہوئے ہے، مگر یہ مختصر تذکرہ اس کی تفصیل کا متحمل نہیں ہے اس لیے بطور نمونہ کے ایک واقعہ لکھتا ہوں جس سے مولانا کی اٹھان کا پورا اندازہ ہو جائے گا۔

واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا بشیر احمد غالب پوری جب دیوبند تشریف لے گئے تو چونکہ ''شرح جامی کے معیار کی تعلیم نہیں ہوئی تھی اس لیے مدرسہ میں داخلہ نہ ہو سکا، اتفاقاً گھر واپس ہونے کے لیے کرایہ بھی نہیں تھا، اس لیے بڑی الجھن میں پھنس گئے، اعظم گڈھ کے دوسرے طلبہ کی زبانی مولانا بشیر صاحب کی پریشان حالی کی اطلاع مولانا کو ہوئی تو انھیں اپنے حجرہ میں بلایا اور تسکین اور حوصلہ افزائی کے بعد فرمایا کہ کھانے کی طرف سے آپ بالکل بے فکر رہیں، میرا دوپہر کا پورا کھانا اور شام کا آدھا آپ کو مل جایا کرے گا،

آپ ایک سال کے اندر اپنی علمی کمزوری کو دور کریں چنانچہ حسب وعدہ مکمل ایک سال تک آپ نے ایک وقت کے نصف کھانے پر اکتفاء کر کے دوسرے کی مدد کی، ایثار وقربانی کے اس سے اہم اور بڑے واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں، لیکن جس دور میں مولانا نے یہ قربانی پیش کی ہے، شاید اس عہد کی قربانیوں میں اس کی مثال نہیں دی جاسکے گی۔

انھیں حالات کی بنا پر حضرت تھانوی قدس سرہ نے خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ انھیں دیکھ لو ان کا ایک زمانہ آنے والا ہے۔

بہر حال ۶ سال تک دار العلوم میں سلسلۂ تعلیم جاری رکھا اور جملہ علوم متعارفہ اساتذہ دار العلوم سے پڑھ کر فاتحۂ فراغ پڑھی، دار العلوم کے اساتذہ میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ وغیرہم خاص طور سے قابل ذکر ہیں، فراغت کے بعد شیخ تھانوی علیہ الرحمہ کے آستانہ پر تھانہ بھون پہنچ گئے، مولانا فتحپوری کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں دوران تعلیم ہی میں حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کی خدمت میں حاضری اور تربیت باطنی کا شرف حاصل ہو گیا تھا، تعلیم سے فراغت کے بعد پورے طور سے خانقاہ تھانوہ بھون کے ہو رہے، ان کی فطری قابلیت کو حق تعالیٰ نے حکیم الامت کی تربیت سے چار چاند لگا دیے اور بہت جلد ظاہری تعلیم کی طرح باطنی تربیت میں بھی تکمیل کر کے حضرت حکیم الامت کے خلیفۂ مجاز ہو گئے۔

تھانہ بھون کے قیام کے دوران تلقین وتذکیر کے ساتھ خانقاہ کے مدرسہ میں درس بھی دیتے تھے، سلوک میں تکمیل کے بعد حضرت تھانویؒ کی اجازت سے کان پور میں کچھ دنوں تک تدریسی خدمت انجام دی، پھر یہاں سے علیحدہ ہو کر ۱۳۴۲ھ کے حدود میں احیاءُ العلوم مبارک پور میں مدرس دوم ہو کر چلے آئے، اس وقت احیاء العلوم میں ضلع اعظم گڈھ ہی کے ایک دوسرے عالم مولانا محمد صدیق تلمیذ حضرت مولانا ماجد علی مانویؒ صدارت تدریس پر فائز تھے، حضرت فتحپوری اور مولانا محمد صدیق صاحب کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے، مولانا بارہا اسی رفاقت کے تعلق سے مولانا محمد صدیق کے ہمراہ ان کے دولت خانہ پر بھی تشریف لاتے تھے، احیاء العلوم سے بھی چند سال کے بعد علیحدہ ہو گئے، یہ دور

مولانا کے تحیر و وارفتگی کا تھا، کہیں سکون نہیں ملتا تھا، کبھی تھانہ بھون رہتے تو کبھی کانپور میں، کبھی حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری کی صحبت میں رہتے تو کبھی حضرت مولانا عبدالرحمٰن بکھراویؒ کی خدمت میں، لیکن اس عالم میں بھی علمی مشغلہ قائم رہتا، چنانچہ جس زمانہ میں آپ حضرت پھولپوری کی خدمت میں رہتے تھے تو اپنے روحانی مشاغل کے ساتھ باقاعدہ طلبہ کو درس بھی دیتے تھے، چنانچہ استاذ محترم مولانا محمد سعید صاحب بمئی پوری سابق نائب ناظم مدرسہ بیت العلوم سرائے میر نے اسی عہد میں حضرت فتحپوریؒ سے شرح جامی کی بحث اسم پڑھی تھی، ناظم صاحب نے مجھ سے خود بیان کیا تھا کہ حضرت فتحپوری نے شرح جامی کے درس کے وقت مجھ سے حاصل محصول کی شرح اپنی نگرانی میں لکھوائی تھی، اس وقت کے حضرت فتحپوری کے بہت سے شاگرد اس دیار میں اب تک موجود ہیں اور ان کی ذہانت اور علمی استحضار کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

تقریباً دس برس کے بعد مولانا کی یہ کیفیت دور ہوئی تو اپنے وطن فتحپور میں مستقل طور سے اقامت گزیں ہوئے اور تجرّد و تفرّد کے بجائے سنّت طریقہ پر نکاح کیا اور ازدواجی سرگرمیوں کے ساتھ علمی و روحانی مشاغل میں منہمک ہوگئے، فتحپور تال نرجا ایک معمولی گاؤں ہونے کے علاوہ سڑک اور اسٹیشن سے بھی دور ہے جہاں شہر اور قصبات کی سہولتیں یکسر ناپید تھیں۔ مولانا نے اسی وادیٔ غیر ذی زرع میں ایمان و اخلاص اور علم کی تخم ریزی کا کام شروع کردیا، آپ کے اخلاص اور للّٰہیت کی برکت سے تھوڑے ہی عرصہ میں اس قدر مقبولیت ہوئی کہ اطراف و جوانب کے علاوہ ملک کے دور دراز مقامات سے بھی ارادت مندوں کی آمد شروع ہوگئی اور فتح پور کی یہ نئی خانقاہ جہاں پہونچنے کے لیے وقت کی جملہ سہولتیں یکسر معدوم تھیں مگر رشد و ہدایت کے پروانے ہر طرح کی کلفتیں برداشت کرتے ہوئے یہاں جمع ہونے لگے اور یہ سنسان دیہات "اللہ ہو" اور "لا الہ الا اللہ" کی تسبیحات سے گونجنے لگا، دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ اوسطاً ۲۵-۳۰/ افراد یومیہ خانقاہ میں رہتے تھے۔

مولانا فتح پوری ہر طرف سے بے نیاز ہوکر تزکیۂ نفس و تطہیر قلوب کے ساتھ طالبان علم کو درس بھی دیتے تھے، چنانچہ ایک اچھی خاصی تعداد اس رخ سے بھی مستفید ہوتی رہی جن

میں مولانا قمر الزماں داماد حضرت فتحپوریؒ، مفتی محمد حنیف جونپوری، مولانا عمار گھوسوی وغیرہ نے ابتداء سے موقوف علیہ تک کی کتابیں فتحپور میں ہی پڑھیں، حضرت فتحپوری کا چشمۂ فیض پوری توانائیوں سے جاری تھا اور خلق خدا ہر طرح سے مستفید ہو رہی تھی کہ ایک جزوی مسئلہ میں گاؤں کے باشندوں میں باہم اختلاف رونما ہو گیا جس نے آگے چل کر ایسی سنگین صورتحال اختیار کر لی کہ مولانا کو علم و معرفت کی اس بساط کو یہاں سے لپیٹنا پڑ گیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ فتحپور کے ایک طالب علم جن کا نام مولوی ظہیر الدین تھا، اس وقت مدرسہ اشرف العلوم کانپور میں حضرت مولانا محمد عثمان فتحپوری سے پڑھ رہے تھے، شرح وقایہ میں جب باب الجمعہ تک پہونچے اور اس میں دیہاتوں میں جمعہ کے عدم جواز کا مسئلہ پڑھا تو مولانا محمد عثمان صاحب مرحوم سے عرض کیا کہ ہمارا گاؤں بھی تو دیہات ہی ہے۔ لہٰذا وہاں جمعہ نہیں پڑھنا چاہیے، مولانا نے سمجھایا کہ ایک زمانہ سے یہاں جمعہ ہوتا آیا ہے اور جہالت کا بھی شیوع ہے اس لیے اس مسئلہ میں تشدّد مناسب نہیں، لوگوں میں جب دینی شعور پیدا ہو جائے گا اس وقت مناسب طریقے سے انھیں سمجھا دیا جائے گا۔

وقت کی اس مصلحت کو مولانا ظہیر سمجھ نہ سکے اور گاؤں میں آکر جمعہ کے عدم جواز کا اعلان کر دیا، گاؤں کے لوگوں نے مولانا عثمان مرحوم سے اس سلسلے میں استفسار کیا، مولانا نے مسئلہ کی نوعیت کو واضح کر دیا اور اس وقت سے خود بھی وہاں جمعہ پڑھنا چھوڑ دیا، جس پر مخالفت شروع ہو گئی اور اس جزئی مسئلہ نے آگے چل کر دیوبندیت اور بریلویت کے اختلاف کو کھڑا کر دیا اور گاؤں کا ایک طبقہ کھل کر حضرت فتحپوری کی مخالفت پہ تل گیا اور مخالفت کا جنون ایسا سوار ہوا کہ مولانا کے قتل کی سازشیں ہونے لگیں جس کے افشاء پر مولانا کے چاہنے والے برافروختہ ہو گئے اور مولانا کے روکنے کے باوجود مخالفین سے برسرپیکار ہو گئے جس کے نتیجہ میں ایک قتل بھی ہو گیا اور آپس میں مقدمہ بازی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا، جس کی لپیٹ میں حضرت فتحپوری کو بھی کھینچ لیا گیا، مگر مولانا کا قلب اب بھی دونوں فریق کے لیے کھلا ہوا تھا اور برابر آپس میں صلح و آشتی کی دعوت دیتے رہتے تھے، مگر مولانا کی اس دعوت کو نہ غیروں نے سنا نہ اپنوں نے۔ بالآخر مولانا نے فتحپور سے

ترک سکونت کا ارادہ کرلیا۔ اور اہل وعیال کو لے کر مشرقی پاکستان جانے کی تیاری کرنے لگے جب مولانا کے ہجرت پاکستان کی اطلاع ان کے مرید خاص مولوی حاجی نثار اللہ گورکھپوری کو ہوئی تو انھوں نے پاکستان کی بجائے گورکھپور آنے کی دعوت دی؛ چنانچہ ان کے اصرار پر ۷/رمضان ۱۳۷۵ھ کو فتحپور سے منتقل ہو کر گورکھپور چلے آئے اور حاجی نثار اللہ کے یہاں رہنے لگے، چند مہینوں کے اندر یہاں بھی رشد وہدایت کا بازار گرم ہو گیا اور جوق درجوق طالبان علوم ظاہری وباطنی آنے لگے۔ حضرت مصلح الامت کی مجلس کے حاضر باشوں میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہ کے مرید جناب حکیم وصی احمد علیگ گورکھپوری بھی تھے احقر کے استفسار پر حکیم صاحب نے گورکھپور کے زمانہ قیام کے حالات بایں الفاظ تحریر کیا:

تحریر جناب حکیم وصی احمد صاحب

حضرت اپنے موضع فتحپور سے گورکھپور غالباً ۱۹۵۶ء میں تشریف لائے ہیں تاریخ ومہینہ یاد نہیں ہے اتنا ضرور یاد ہے کہ گرمیوں کا زمانہ تھا، جناب حاجی مولوی نثار اللہ صاحب کے اصرار پر گورکھپور تشریف لائے ورنہ حضرت مشرقی پاکستان کا قصد فرما چکے تھے۔ جیسا کہ حضرت نے خود مجھ سے ارشاد فرمایا، حضرت کی مجلس میں اکثر وبیشتر حاضر ہوا کرتا تھا خیال آیا کہ لاؤ اپنے پیر سے بھی مجلس میں حاضری کی اجازت لے لوں چنانچہ مرشدی ومولائی حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا جس میں گورکھپور میں حضرت مولانا کی آمد کی اطلاع دی اور مجلس میں حاضری کی اجازت چاہی حضرت نے بہت جلد اپنے دست مبارک سے جواب تحریر فرمایا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی لکھا ہے اور آج ہی جواب آ گیا، پہلے حضرت اپنے ہر خط میں مکرمی ومحترمی جناب حکیم وصی احمد صاحب تحریر فرمایا کرتے تھے، مگر مذکورہ خط میں صرف عزیزم حکیم صاحب سے خطاب فرمایا، خط کے الفاظ یاد نہ رہے بالمفہوم لکھتا ہوں، حضرت نے مجھے حکماً تحریر فرمایا کہ حضرت مولانا وصی اللہ صاحب ہمارے اکابر کی یادگار ہیں ان کے گاؤں کے لوگوں نے انھیں اذیت پہنچائی جس سے غمزدہ ہو کر وہ تمہارے شہر میں گئے ہیں تم ان کا

پورا پورا خیال رکھو اب تمہاری ہی نہیں میری بھی لاج کا سوال ہے اس لیے کہ تم سے میری نسبت ہے۔

اس خط کا ملنا تھا کہ میں دوڑا ہوا حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، اتنا خوب یاد ہے کہ عصر سے پہلے کا وقت تھا اندر حاضری کی کسی کو اجازت نہ تھی، چنانچہ میں مسجد میں آپ کا منتظر رہا، عصر کی نماز کے لیے حضرت مسجد میں تشریف لائے اور بعد نماز میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے، صحن میں چارپائی پر بیٹھ گئے، مگر ہاتھ پکڑے ہی رہ گئے، تھوڑی دیر بعد فرمایا کہو کیسے آئے میں نے حضرت کا گرامی نامہ پیش کر دیا، کھول کر پڑھا اور پڑھتے ہی آبدیدہ ہو گئے، خط کو سر پر رکھ لیا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے، آنکھیں جاری تھیں، خط کبھی دل سے لگاتے تو کبھی سر پر رکھتے اور ساتھ ہی فرماتے جاتے۔ ''آج تو لا دیا آپ نے احسان سے'' حضرت کا یہ حال دیکھ کر میں شرمندہ ہو گیا کہ خط کہاں سے دے دیا مگر بڑی مسرت سے فرمایا بڑوں کی بڑی بات ہوتی ہے، میری زبان سے نکل گیا کہ احقر عصر سے قبل ہی حاضر ہو گیا تھا مگر اندر آنے کی اجازت نہ تھی، فرمایا کہ تمہیں ہر وقت آنے کی اجازت ہے، اس خط کا ذکر حضرت نے اپنی مجلس میں بڑے ذوق وشوق کے ساتھ کئی بار فرمایا، بہر حال احقر کی اکثر حاضری ہوتی رہتی تھی اور حضرت بڑی شفقت فرماتے تھے۔

اکثر فرماتے تھے کہ یہ لوگ حضرت مدنی کے آدمی ہیں ان کو اپنوں سے زیادہ قابل اعتماد سمجھتا ہوں، یہ وقت پر کام آنے والے لوگ ہیں ان کو پہچانو، ان میں اخلاص کی بو آتی ہے، غرض حضرت کی شفقت مجھ ہی پر نہیں بلکہ سارے خدام مدنی پر بہت زیادہ رہا کرتی تھی اور تقریباً سب ہی حاضر باش بھی تھے، حضرت ہم سب کو اپنے قریب بٹھاتے اور توجہ فرماتے اس طور پر ایک سال تک مولوی نثار اللہ صاحب کے مکان پر حضرت نے مجلس فرمائی اور وہیں قیام بھی کیا، اس دوران میں کچھ بیوقوفوں نے حضرت کے خلاف پمفلٹ بازی اور اشتہار بازی شروع کر دی، مگر حضرت کے علم میں یہ بات نہیں تھی، لوگوں نے اس بات کو آپ سے چھپایا، مولوی نثار اللہ صاحب محبت میں فرمایا کرتے کہ مکان میرا ہے کسی سے کیا مطلب مگر اندر ہی اندر بات بڑھتی رہی اور آخر ایک دن آپ کی لڑکیوں نے خود اپنے

کانوں سے لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ اگر اب بھی مکان نہ خالی کریں گے تو لولو اور تالی بجا کر مکان خالی کرایا جائے گا، ظاہر بات ہے یہ آپ اور آپ کے عیال کے لیے انتہائی تکلیف دہ بات تھی، چنانچہ صاحبزادیوں نے رونا شروع کر دیا، اس شور پر حضرت کو تمام حالات کا علم ہوا، فوراً حضرت تنہا میرے مکان پر تشریف لائے، میں سو رہا تھا، جگ وایا عصر کا وقت قریب تھا، معلوم ہوا حضرت مسجد میں تشریف فرما ہیں، چنانچہ میں وضو کر کے مسجد میں حاضر ہوا دیکھا تو ازحد جلال چہرے پر تھا، سلام کے بعد گفتگو کی ہمت نہ ہوئی، ہاتھ سے مصلے کی طرف امامت کے لیے اشارہ فرمایا، میں آگے بڑھا اور نماز پڑھائی بعد سلام تمام لوگ تسبیح کے اندر مشغول تھے کہ ایک چیخ کی آواز ہوئی، ساتھ ہی حضرت کے یہ الفاظ کانوں سے ٹکرائے حکیم وصی احمد صاحب میں مشرقی پاکستان جا رہا تھا، مگر لوگ یہاں لائے اور اب ذلیل کر کے اپنے مکان سے نکال رہے ہیں، کیا مجھے کہیں ٹھہرنے کی جگہ دو گے؟ میں آب دیدہ ہو گیا اور عرض کیا کہ حضرت یہ مکان تو آپ ہی کا ہے اگر دل سے کہتا ہوں تو اللہ والوں پر دل کی بات منکشف ہوتی ہے، آپ قبول فرمائیں یہ مکان حاضر ہے، آپ کو مکان کی کیا کمی ہے اس مکان میں آپ رہیں تو ہم اور ہماری سات پشت فخر کرے گی، حضرت نے مجھے سینے سے چپکا لیا اور فرمایا بیشک یہ مکان میرا ہے، اس کے بعد میرے بچے محمد احمد نے اندر جا کر اطلاع دی کہ حضرت آرہے ہیں، چنانچہ گھر میں پردہ ہو گیا، میں حضرت کو مکان دکھاتا رہا، اسی اثناء میں گھر میں لگی ہوئی پانی کی ٹونٹی کی طرف آپ نے اشارہ کر کے فرمایا یہ کیا ہے میں نے عرض کیا، حضرت! یہ واٹرورکس کی ٹونٹی ہے، آپ نے اسے ہاتھ سے کھولا، پانی گرنے لگا، پھر بند کر دیا، اس کے بعد فرمایا: آج ہی میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک مکان میں داخل ہوا ہوں جس میں ٹونٹی لگی ہوئی ہے، میں نے اسے کھولا پانی گرنے لگا پھر میں نے اسے بند کر دیا، اس خواب کو بیان کرنے کے بعد فرمایا: یہاں مجھے سکون ملے گا، یہ میرا ہی مکان ہے، اب کوئی مجھے یہاں سے نکال کر دیکھے تو جانوں، پھر مجھے حکم دیا کہ جاؤ اپنی بہنوں کو اور سارا سامان یہاں لے آؤ، یہ سن کر میں اور کچھ دوسرے لوگ دوڑ پڑے اور سارا سامان مکان پر پہونچا دیا، نیز خانقاہ کے تمام متعلقین اور احباب بھی ساتھ آگئے،

یہاں آ کر حضرت کی کچھ زندہ کرامتیں دیکھنے میں آئیں جنھیں تحریر کرتا ہوں۔

میں سوچ رہا تھا کہ حضرت کامل ایک سال تک بجلی کے پنکھے کے نیچے رات دن رہے، اب اس غریب گھر میں بجلی کہاں، از حد پریشان ہوا، معاً ذہن میں آیا کہ حضرت نے فرمایا ہے کہ یہ میرا امکان ہے، لہٰذا اب مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، یہ کہتا ہوا مطب میں آیا تو بجلی کے ایک آفیسر پر نگاہ پڑی جو میرے ہی مطب میں بیٹھے ہوئے تھے، چنانچہ ان کے سامنے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے کہا کہ گھبرائیے نہیں ابھی بجلی لگتی ہے غرضیکہ ادھر موذن نے اللہ اکبر کی ندا دی ادھر بجلی کا پنکھا گھومنے لگا۔ حضرت خوش ہو گئے اور فرمایا بھائی یہ بھی ایک ضرورت تھی جو پوری ہو گئی، اللہ تعالیٰ کسی کی ضرورت کو نہیں روکتے، ہم لوگ یہ کہتے ہوئے مسجد کی طرف چل دیے۔

نماز کے بعد دوسری عجیب وغریب کرامت دیکھنے میں آئی جس سے حضرت کا مقام تو سمجھنا مشکل ہے البتہ مومن کی شان سمجھنا آسان ہے، ہوا یہ کہ مولوی نثار صاحب یہ کہتے ہوئے اپنے گھر سے چلے کہ حضرت خفا ہو کر چلے گئے ہیں، وہاں بجلی نہیں ہے تکلیف ہوگی ''ابھی لاتا ہوں''۔ غرض جیسے ہی سامنے آئے حضرت شیر کی طرح جھپٹے اور فرمایا مولوی نثار اللہ صاحب جب آپ فتحپور تشریف لاتے تھے تو اکثر کہتے تھے کہ کوئی کرامت نہیں دیکھی کہیے تو اب دکھلاؤں (میں یہ سن کر گھبرا گیا خدا جانے کیا بددعا دے دیں) پھر معاً فرمایا جائیے میں نے معاف کر دیا اور دل سے معاف کر دیا اور آپ کے واسطے دعا بھی کروں گا، میری زبان سے نکلا وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ۔ پھر مجھے حکم فرمایا کہ بھائی ان کو کچھ کھلاؤ، چنانچہ حضرت کے لیے جو ناشتہ تیار تھا حاضر کیا جسے حضرت نے اپنے ہاتھ سے کھلایا پھر فرمایا مولوی نثار صاحب مجھے اپنے قیام کے سلسلے میں انتخاب کی غلطی ہوئی تھی اس کا خمیازہ بھگتنا تھا للہ اب مجھے دوبارہ وہاں چلنے پر مجبور نہ کیجیے گا، اس کے بعد مسلسل ایک سال سے کچھ زیادہ ہی میرے گھر پر قیام فرمایا، جب درد گردہ کا شدید دورہ پڑا تو بغرض علاج الٰہ آباد تشریف لے گئے، وہاں علاج سے فائدہ ہوا، اس لیے مستقل قیام کا ارادہ فرما کر بچوں کو بلا لیا، یہ واقعہ غالباً ۱۹۵۸ء جاڑے کے موسم میں پیش آیا۔ (انتہی)

۲/ربیع الثانی ۱۳۷۷ھ کو حضرت فتحپوری نے گورکھپور کی سکونت کو ترک کیا اور الٰہ آباد کو اپنا مسکن بنایا، جہاں آپ نے محلہ روشن باغ میں اپنا ذاتی مکان بنالیا تھا اور مع اہل وعیال کے مستقل طور سے وہیں رہنے لگے تھے، مکان ہی سے متصل وصیۃ العلوم کے نام سے ایک درس گاہ بھی قائم فرمائی، جس میں درس نظامی کی منتہی کتابوں تک کی تعلیم ہوتی تھی دیگر اساتذہ کے ساتھ مولانا خود بھی درس دیتے تھے، چنانچہ مولانا مفتی محمد حنیف جونپوری، مولانا عمار احمد گھوسوی، مولانا قمرالزماں نے دورۂ حدیث کی تکمیل حضرت مولانا سے یہیں کی، مولانا کو کتابوں کے اکٹھا کرنے کا بہت شوق تھا بالخصوص نادر ونایاب کتابیں تو ہر قیمت پر حاصل کرنے کے لیے تیار رہتے، کتابوں کی جلد اور ان کی حفاظت پر خاص توجہ دیتے تھے، کتابوں کے مطالعہ سے بھی بہت شغف تھا، مطالعہ میں شروحِ حدیث، تفسیر اور فقہ کی کتابیں بیشتر رہتی تھیں تفسیر روح المعانی، تفسیر ابن کثیر، بیضاوی، عینی، قسطلانی، شامی، البدائع، بحرالرائق، فتح القدیر تو آخر زندگی تک مطالعہ میں رہتی تھیں۔

الٰہ آباد میں بھی فتح پور اور گورکھپور کی طرح ارادت مندوں کا خوب رجوع ہوا جن میں عوام کے علاوہ علماء کی معتدبہ تعداد تھی، مریدین کی اصلاح وتربیت میں آپ کا طریقہ بعینہٖ اپنے شیخ ومرشد حضرت تھانوی کے اصولوں پر تھا، خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کا خانقاہ وصی اللّٰہی بالکل نقش ثانی تھی، وہی اصول وضوابط جو وہاں تھے الٰہ آباد میں بھی انھیں پر عمل تھا، مولانا کثرتِ مریدین کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے اور اپنی مجلسوں میں فرمایا کرتے تھے کہ آج کل تو لوگ کرتے دھرتے کچھ نہیں صرف بدن پر گرنا اور بھیڑ کرنا جانتے ہیں۔

الٰہ آباد میں آپ کا قیام تقریباً دس سال رہا، اس مدت میں آپ کی ذات قدسی صفات سے بطور خاص الٰہ آباد اور اطراف ومضافات کو بہت فائدہ ہوا، یہاں کی بہت سی بدعتیں ختم ہوگئیں اور اس کی جگہ پر سنت نے رواج پکڑا، شرپسندوں نے یہاں بھی آپ کے خلاف چہ میگوئیاں شروع کردیں، لیکن مولانا اپنے حال میں مست تھے ان کی جانب اصلا بھی توجہ نہیں کی، سچ تو یہ ہے کہ مولانا جس حال میں رہتے تھے اس میں ان خرافات کی جانب توجہ کی کوئی گنجائش بھی نہیں تھی، آپ کا حال اس آخری دور میں ایسا ہوگیا تھا کہ سوتے جاگتے ہر حال میں

امت کی زبوں حالی کی فکر دامن گیر رہتی تھی، ایک اضطراب اور بے چینی کا عالم تھا جس میں شب وروز آپ مبتلا رہتے جو بات بھی کرتے وہ امت کی اصلاح ہی سے متعلق ہوتی بالآخر شدّتِ کرب کی وجہ سے صحت نے جواب دے دیا، دوران راس اور دورۂ قلب جیسے موذی امراض کے آپ شکار ہو گئے اور مقامی ڈاکٹروں نے متفقہ فیصلہ دے دیا کہ الٰہ آباد کی آب وہواب آپ کے لیے مضر ہے، اس لیے ڈاکٹروں کے مشورہ سے آپ بمبئی چلے گئے اور محلہ کُرلا میں ایک مکان لے کر وہیں اکثر رہنے لگے، اس علاقے میں بھی آپ کی ذات سے بہت نفع ہوا اور بے شمار افراد آپ کے سلسلے میں داخل ہو کر تزکیۂ نفس کے کام میں لگ گئے، اس عہد میں مولانا فتحپوری کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ ان کے حلقۂ ارادت میں خود ان کے اساتذہ اور رفقاء درس بھی شامل تھے، اس کی مثال اس دور میں مولانا کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی۔

بمبئی کے زمانۂ قیام میں اگرچہ ضعف ونقاہت حد درجہ بڑھی ہوئی تھی لیکن مریدین کی اصلاح وتربیت کا کام بدستور جاری رہا، حسب سابق مجالس کا انعقاد بھی جاری رہا، مجلس میں بیٹھنے والوں کا کہنا ہے کہ اس آخری دور میں ضعف کی وجہ سے آپ کی آواز صاف سنائی نہیں دیتی تھی اور دور کے لوگ تو بالکل سمجھ ہی نہیں پاتے تھے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، لیکن اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ سخت سے سخت دل والا بھی مجلس سے اٹھتا تو اس حال میں کہ آنکھیں جاری ہوتیں اور دل خوفِ خدا سے کانپتا ہوتا، اسی زمانہ میں آپ نے حج بیت اللہ کا ارادہ فرمالیا، ڈاکٹروں اور متعلقین کی یہ خواہش تھی کہ مکمل صحت اور قوت آجانے کے بعد یہ مبارک سفر کیا جائے، لیکن اس کے برخلاف آپ کا خیال یہ تھا کہ جلد از جلد دیارِ حبیبؐ میں پہونچ جائیں، چنانچہ ۱۱ر شعبان ۱۳۸۷ھ کو مریدین وارادت مندوں کے کثیر مجمع کے ساتھ آپ جہاز پر سوار ہو گئے طبیعت میں اضمحلال تو پہلے سے تھا ہی، ۲۲ر شعبان کو بعد نماز مغرب بلڈ پریشر کا شدید دورہ پڑ گیا جس کے صدمہ سے سر کی رگ پھٹ گئی اور یہ رشد وہدایت کا امام بیت اللہ کے بجائے رب البیت سے جاملا، جہاز ہی سے فوراً مکہ معظمہ اطلاع دی گئی چنانچہ وہاں پر موجود معتقدین نے کوشش کر کے میت کو مکہ معظمہ لانے کی اجازت حاصل کر لی مگر اس کی اطلاع جہاز والوں کو دی نہیں جاسکی تھی کہ، لوگوں نے جہاز پر غسل وغیرہ

دے کر اس مقدس امانت کو سمندر کے حوالہ کر دیا۔

مولانا کو تعلیمی وروحانی مشاغل سے ایک ساعت بھی فرصت نہیں ملتی تھی، اس لیے آپ نے باضابطہ تصنیفی کام نہیں کیا، البتہ جو مضامین قلب پر وارد ہوتے تھے اسے املا کرادیا کرتے تھے، چنانچہ یہی املائی تصانیف آج آپ کی علمی یادگار ہیں جن کے دیکھنے سے مولانا کے وسعت علم کا اندازہ ہوتا ہے، فہرست یہ ہے:

(۱) وصیۃ الاخلاق (۲) وصیۃ الاحسان (۳) التذکیر بالقرآن (۴) عاقبۃ الانکار (۵) مضمون ذکر (۶) تحذیر العلماء (۷) الاصول النادرہ مع فوائد الصحبۃ (۸) علم کی ضرورت (۹) توقیر العلماء (۱۰) جنت (۱۱) ایقاظ الافکار (۱۲) ایجادات کی حقیقت (۱۳) حج رب البیت (۱۴) تلاوۃ القرآن (۱۵) وصیۃ السالکین (۱۶) نسبت صوفیہ (۱۷) طریقِ کار (۱۸) خوفِ آخرت (۱۹) اعتراف ذنوب (۲۰) مفتاح الرحمۃ (۲۱) طہارت (۲۲) اخوت (۲۳) اعتقاد وانکار (۲۴) طریق اصلاح (۲۵) الافادات الوصیۃ علیٰ ترصیع الجواہر المکیہ (۲۶) سعادتِ حقیقیہ کے حاصل کرنے کا طریقہ (۲۷) تعلیم وتربیت اولاد (۲۸) مضمون نمیمہ (۲۹) دیباچہ معرفت (۳۰) گلستان معرفت۔

ان تصانیف کے علاوہ حضرت فتحپوری نے اپنے اصلاحی وتبلیغی مشن کو جاری رکھنے کے لیے بہت سے خلفاء بھی تیار کیے جن میں مشاہیر حسب ذیل ہیں:

حضرت قاری مبین احمد صاحب جانشین، حضرت مولانا عبدالحلیم فیض آبادی ناظم مدرسہ ریاض العلوم گرینی، حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، جناب ڈاکٹر صلاح الدین الہ آبادی وغیرہ۔ خلفاء کی مکمل فہرست کے لیے معرفتِ حق کا مطالعہ کیا جائے۔

مولانا وقار احمد گھوسویؒ

مولانا محمد منظور الحسن عرف وقار احمد بن مولانا عبدالغفار بن مولانا محمد نصیر بن مولانا صاحب علی بہادر خاں صدیقی یکم رجب ۱۳۴۵ھ چہارشنبہ کو دس بجے دن میں اپنے ننیہال

ولید پور ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، آپ کا خاندان قصبہ گھوسی کے شیوخ صدیقی کا معروف و مشہور خاندان ہے، جس میں متعدد علماء و صلحاء پیدا ہوئے جس کی علمی و دینی روایت ہمیشہ اس دیار میں قابل ذکر رہی۔ دنیاوی وجاہت اور اثر ورسوخ بھی برابر حاصل رہا، آپ کے والد مولانا عبدالغفار عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے اور انھیں فارسی نظم ونثر میں ید طولیٰ حاصل تھا اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے، حضرت تھانوی نے انھیں مجاز صحبت سے سرفراز بھی کیا تھا، اس طرح آپ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ علمی وروحانی ذوق سے معمور ہونے کے ساتھ دولت وثروت اور فارغ البالی سے بھی مالا مال تھا، اس لیے بلند حوصلگی اور علمی ودینی رجحانات سے وابستگی کا ذوق بچپن ہی سے پیدا ہوگیا۔

فاضل وصالح باپ نے اپنے سب سے بڑے سعادت مند اور ہونہار فرزند کو بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ دینی تعلیم میں لگایا جس کا انھیں حد درجہ اہتمام تھا جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ایک بار ایک اعلیٰ افسر نے ان سے کہا کہ ''مولانا آپ ماشاء اللہ فارغ البال آسودہ حال ہیں، آپ کے لیے مناسب تھا کہ اپنی سب سے بڑی اولاد کو بیرسٹر یا جج بناتے اسے مولوی کیوں بنا رہے ہیں، مولانا عبدالغفار مرحوم نے جواب دیا اسی فارغ البالی کی وجہ سے تو دینی تعلیم میں لگایا ہے تاکہ علم دین معاش کے بجائے اللہ کی رضا کے لیے حاصل کرے۔''

مولانا نے اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم مشکوٰۃ و بیضاوی تک مدرسہ ناصر العلوم گھوسی میں مولانا عبدالمجید کوٹھیاوی سے حاصل کی اور ساتھ ہی گھر پر مولانا عبدالعزیز مئوی سے بھی مستفید ہوتے رہے، آپ کے والد ماجد کے خصوصی شوق وتاکید نیز آپ کی فطری ذکاوت وذہانت اور شوق وانہماک کے نتیجہ میں مولانا عبدالمجید صاحب نے نہایت شفقت وعنایت کے ساتھ تعلیم دی، مولانا عبدالمجید صاحب حضرت شیخ الاسلام کے تلمیذ اور غیر معمولی صلاحیتوں سے متصف نہایت وسیع المطالعہ عالم تھے، اس لیے شاگرد رشید نے بھی ان کے اوصاف وکمالات کا ایک گرانقدر حصہ حاصل کیا، چنانچہ مولانا کا خود بیان ہے کہ جب میں

دار العلوم دیوبند پہونچا تو چند اساتذہ کے علاوہ اکثر کے درس میں ایسا محسوس ہوتا جیسے سنی ہوئی باتیں دوبارہ سن رہے ہیں، ۱۳۶۲ھ میں جب آپ دورۂ حدیث کی تعلیم وتکمیل کی غرض سے دیوبند حاضر ہوئے تو آپ کے والد ماجد بھی ساتھ تھے، انھوں نے حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی کی سرپرستی ونگرانی میں آپ کو سونپ دیا، اس سال حضرت شیخ الاسلام جیل میں تھے اس لیے دورۂ حدیث کا ارادہ ترک کر کے دوبارہ مشکوٰۃ، بیضاوی اور ہدایہ اخرین وغیرہ کی جماعت میں شریک ہوگئے تاکہ حضرت شیخ الاسلام سے تلمذ حاصل ہوسکے، سالِ آئندہ ۱۳۶۴ھ میں حضرت رہا ہوچکے تھے، چنانچہ انھیں سے آپ نے بخاری وترمذی شریف پڑھی، آپ کے دیگر اساتذہ میں حضرت مولانا ادریس کاندھلوی، حضرت مولانا اصغر حسین محدث دیوبندی اور حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی وغیرہم شامل ہیں۔

آپ کے والد ماجد، والدہ ماجدہ اور خاندان کے دیگر افراد حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے، حضرت کے وصال کے بعد پورا خاندان حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری سے رجوع ہوا، آپ بھی حضرت فتحپوری کے شیفتہ وگرویدہ تھے اور حضرت کو بھی آپ سے خصوصی تعلق تھا، اس لیے آپ حضرت فتحپوری ہی سے بیعت ہوئے اور اذکار واشغال کی تعلیم حاصل کی۔

مولانا وقار احمد مرحوم کو کتب بینی وکثرت مطالعہ اور کتابوں کے جمع کرنے کا بہت شوق تھا، یہ شوق آپ کو خاندانی ورثے میں ملا تھا گو کہ بعض پیش آمدہ اسباب کی بناء پر آپ کی عمر عزیز کا بیشتر حصہ غم روزگار کی نذر ہوگیا اور نوخیزی ہی سے پریشان خاطری وبے اطمینانی تمام عرصۂ حیات پر محیط رہی، لیکن علوم کا استحضار حیرت انگیز طور پر بدستور رہا جس کا اظہار اس وقت ہوتا جب وہ کسی علمی مجلس میں شریک گفتگو ہوتے، تعلیم سے فراغت کے بعد جواں سالی اور کم عمری ہی میں اپنے والد ماجد کی ناگہانی وفات کے بعد زمینداری کی تمام تر ذمے داریوں اور مصروفیتوں کا شکار ہوگئے اور پھر چند ہی سالوں کے بعد زمینداری کا خاتمہ ہوتے ہی عائلی زندگی کا شیرازہ بکھر گیا جسے مجتمع کرنے اور سدھارنے میں آپ نے اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کردیں، لیکن حالات کی مسلسل نامساعدت اور زمانہ کی نیرنگیوں نے

ہرگز اس کا موقع نہ دیا کہ ادھر سے مطمئن ہوکر تصنیفی وتالیفی یا تعلیمی وتدریسی سرگرمیوں میں مشغول ہوتے، قدرت نے انھیں اس میدان کا مرد بنایا تھا، انجمن اسلام گورکھپور اور اس کے بعد حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیو بند کے اصرار پر دارالعلوم اشرفیہ کراچی میں کچھ دنوں درسی خدمت انجام دی، لیکن یہ مدت بہت معمولی اور تھوڑی تھی، حالات نے پھر حسب سابق اپنی طرف کھینچ لیا، پے بہ پے تلخیوں اور ناکامیوں اور ناگوار وغیر متوقع تبدیلیوں نے حساس دل ودماغ کو بری طرح مجروح کیا، ردعمل کے طور پر مزاج میں تلون اور ناپسندیدہ امر کے بعد اشتعال وغضب کا اظہار ہونے لگا۔

مولانا وقار مرحوم میں خدمتِ دین کا جذبہ بے پناہ تھا تن تنہا تیس سال تک سرفروشی کے ساتھ اپنے جدامجد مولانا صاحب علی صاحبؒ کے بناء کردہ مدرسہ ناصر العلوم کے احیاء وترقی کے لیے کوشاں رہے، علمی یادگاروں میں حضرت شیخ الاسلام کی تقریر بخاری وترمذی قرآن کریم کی ساتویں منزل کا ترجمہ وتشریح، فارسی وار دوشاعری کا مختصر مجموعۂ کلام، حضرت فتحپوری کے کچھ ملفوظات، مشائخ کے سیر وتراجم پر مشتمل بعض یادداشتیں ان کے ورثاء کے پاس موجود ہیں۔

۱۷ر جون ۱۹۶۹ء مطابق ۱۳۸۹ھ کی صبح کو درد شکم میں مبتلا ہوئے اور بوقت عصر دنیا سے رخصت ہوگئے، انتقال کے وقت عمر صرف چوالیس سال تھی، وفات آبائی وطن گھوسی میں ہوئی وہیں آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔

حضرت مولانا شاہ ولی محمد گھوسویؒ

حضرت مولانا حاجی شاہ ولی محمد بن شیخ خاں محمد حنفی گھوسوی تقریباً ۱۲۴۸ھ میں قصبہ کوپاگنج ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا، اس لیے ان کے ماموں شیخ نوازش علی گھوسوی بغرض پرورش انھیں گھوسی لائے، والدہ کی وفات کے چند ماہ بعد والد کا بھی وصال ہوگیا، جو اس وقت گورنمنٹ کی فوج میں کسی عہدہ پر تھے اور فوج میں کہیں جارہے تھے کہ ہزاری باغ صوبہ بہار میں چند دن کی علالت کے بعد انتقال

کر گئے اور وہیں دفن ہوئے۔

والدین کے سایہ سے محروم ہو جانے کے بعد شاہ ولی محمد کا شیخ نوازش علی کے علاوہ کوئی اور نگراں و سرپرست نہیں تھا اس لیے چھ ماہ کی عمر سے آپ انھیں کی کفالت میں آ گئے اور یہی تعلق بعد میں گھوسی میں سکونت کا سبب بنا۔ حاجی نوازش علی نے یتیم بھانجے کی ہر طرح سے نہایت محبت و شفقت کے ساتھ دیکھ ریکھ کی تا آنکہ آپ بارہ برس کے ہو گئے۔ اب آپ کو حصول علم کا شوق دامن گیر ہوا قصبہ میں تعلیم کا کوئی خاص نظم نہیں تھا اور نہ حاجی نوازش علی انھیں نگاہوں سے دور کرنے کے لیے تیار تھے۔ اس لیے شاہ ولی محمد صاحب اس صورت حال سے ایک نوع کی قلبی ضیق میں مبتلا ہو گئے۔ بالآخر فیصلہ کیا کہ کسی دن چپکے سے گھر سے بھاگ جائیں، چنانچہ ایک دن رات کو بغیر کسی اطلاع کے گھر سے نکل پڑے اور جاتے جاتے باندہ پہنچ گئے۔ جہاں نواب ذوالفقار مرحوم کے مدرسہ میں مولانا عبدالحکیم فرنگی محلی متوفی ۱۲۸۵ھ تعلیمی خدمت انجام دے رہے تھے۔ شاہ صاحب نے باندہ پہونچ کر انھیں سے تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی، چونکہ فطرتاً نہایت ذہین تھے اس لیے مولانا عبدالحکیم ان کا بہت خیال رکھتے اور خصوصی توجہ فرماتے ادھر آپ باندہ میں تحصیل علم میں مشغول تھے ادھر حاجی نوازش علی مرحوم یتیم بھانجے کے فراق میں بےچین و مضطرب۔ اطراف و جوانب میں پتہ لگایا کہیں خبر نہ لگی تو دل تھام کر صبر اختیار کیا، لیکن کچھ دنوں کے بعد کسی طرح سے معلوم ہو گیا کہ یہ لعل گمشدہ باندہ میں چمک رہا ہے، اطلاع ملتے ہی فوراً باندہ پہونچے، شاہ صاحب کو ماموں کی آمد کا علم ہوا تو اس ڈر سے کہ گھر جانا پڑے گا جس کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا روپوش ہو گئے، شیخ صاحب ناکام واپس چلے آئے، مگر صبر نہ ہو سکا، پھر باندہ گئے، اس بار بھی شاہ صاحب نے ملاقات نہ کی اور انھیں نامراد لوٹنا پڑا، کچھ دنوں کے بعد تیسری مرتبہ پھر گئے اس دفعہ شاہ صاحب نے ملاقات نہ کرنا خلاف مروّت سمجھا، اس لیے ماموں کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ شاہ صاحب کا اندیشہ درست نکلا اور انھیں ان کے ساتھ گھر آنا پڑا گھوسی آ کر آپ نے قریب کے قصبہ مئو میں مولانا فیض اللہ سے پڑھنا شروع کر دیا اور کچھ دنوں کے بعد ماموں کو کسی طرح سے راضی کر کے

جون پور کا علمی سفر کیا اور مولانا سخاوت علی جون پوری متوفی ۱۲۷۴ھ کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر اکثر علوم عربیہ کی تحصیل و تکمیل کی اسی دوران میں حضرت حافظ سید امام الدین قدس سرہ سے جو اپنے دور کے بہت ہی عابد و زاہد اور کامل بزرگ تھے بیعت کی اور علوم ظاہری کے ساتھ حافظ صاحب موصوف سے سلوک و طریقت کی تعلیم بھی شروع کر دی، اسی زمانہ میں جبکہ شاہ صاحب جونپور میں علمی و روحانی دولتوں کے سمیٹنے میں مصروف تھے حافظ صاحب حج و زیارت کے ارادہ سے عازم حرمین شریفین ہوئے، شاہ صاحب نے بھی حرم پاک کا سفر کا ارادہ کر لیا ان کے شیخ و مرشد حافظ امام الدین صاحب بمبئی کے راستے سے روانہ ہوئے اور یہ کلکتہ کے راستہ سے خیال تھا کہ مکہ معظمہ میں ملاقات ہو جائے گی اور شیخ برحق کی معیت میں فریضۂ حج کی ادائیگی کا شرف حاصل ہوگا، مگر حافظ صاحب کا جہاز ہی میں انتقال ہو گیا، مکہ پہونچنے پر شاہ صاحب کو اس سانحہ کی خبر ملی تو انھیں بہت صدمہ ہوا، الغرض حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہو کر گھر واپس آئے اور واپسی کے بعد تعلیم و تحصیل کا سلسلہ پھر جاری کر دیا، اور مدرسہ غفاریہ رسڑا ضلع بلیا میں داخل ہو گئے، ان دنوں یہ مدرسہ مولانا تراب علی لکھنوی کی وجہ سے مرجع بنا ہوا تھا اور ان کے قرب و جوار کے بہت سے طلبہ یہاں تعلیم حاصل کر رہے تھے، جن میں مولانا عبداللہ مئوی، مولانا عبدالرحمان مئوی، اور مولانا محمد طاہر معروفی خاص آپ کے رفیق درس تھے ان کے علاوہ مولانا الٰہی بخش کوپا گنجی اور شیخ الدلائل مولانا شاہ عبدالحق مہاجر مکی بھی اس وقت یہیں مولانا تراب علی سے کسب فیض کر رہے تھے۔

مولانا تراب علی کی وفات ۱۲۸۱ھ کے بعد شیخ الدلائل ان کی جگہ مدرس ہوئے تو شاہ صاحب نے ان سے بھی چار سال تک علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی اور جملہ فنون کو مکمل کر لینے کے بعد مزید چار برس اور رہ کر انھیں سے سلوک و طریقت کی بھی تحصیل کی اس طرح سے آٹھ برس شیخ الدلائل کی خدمت میں رہ کر علم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی کی بھی تکمیل کر لی، لیکن ابھی حدیث پاک کی تکمیل نہ ہو سکی تھی اس لیے یہاں سے سہارنپور تشریف لے گئے اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوری متوفی ۱۲۹۷ھ سے صحاح ستہ پڑھ کر سند و اجازت حاصل کی۔

علمی وروحانی دونوں سلسلوں میں مہارت تامہ حاصل کر لینے کے بعد شاہ صاحب خلق خدا کی اصلاح وتربیت کی جانب موتوجہ ہوئے اولاً مٹیا برج کلکتہ کو منتخب کیا اس وقت واجد علی شاہ تخت وتاج سے محروم ہوکر مٹیا برج میں قید وبند کی زندگی گذار رہے تھے، شاہ صاحب کے یہاں پہونچنے پر جب انھیں ان کی صلاحیتوں کا علم ہوا تو کہلا بھیجا کہ میرے گھر آکر بچوں کو فارسی پڑھا دیا کریں میں سو روپے ماہانہ دیا کروں گا۔شاہ صاحب نے اس پیشکش کو رد کر دیا اور واجد علی شاہ کے یہاں یہ کہلا بھیجا کہ اگر بچے مسجد میں آجایا کریں تو مفت میں پڑھا دیا کروں گا، وہاں آکر نہیں پڑھا سکتا۔مٹیا برج کے قیام کے زمانہ میں ایک کثیر جماعت کو آپ سے فیض پہونچا اور چند ہی مہینوں میں آپ کی علمی وروحانی سرگرمیوں سے وہاں کی حالت میں بہت سدھار آگیا۔ اس کے بعد بعض ارادتمندوں کی خواہش ودعوت پر بہار ضلع مونگیر تشریف لے گئے، بہار میں اس وقت مولانا سید ابونصر نے شاہ صاحب سے مختلف علوم وفنون پر مباحثہ کیا، بالخصوص روح کے مسئلہ پر دونوں حضرات میں کئی دن بحث رہی۔آخر میں مولانا ابونصر نے شاہ صاحب کے علمی وروحانی کمال کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور بیعت ہوکر آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے ان کے سلسلے میں آتے ہی گویا قبول عام کا دروازہ کھل گیا، لوگوں کا بیان ہے کہ ایک ایک وقت میں ڈیڑھ ڈیڑھ سو مریدوں کا حلقہ ہوتا تھا، ۱۲۹۹ھ میں شاہ صاحبؒ نے دوسرے حج کا ارادہ کیا، اس وقت آپ کے شیخ ومرشد شیخ الدلائل ہندوستان سے ہجرت فرما کر مکہ معظّمہ میں متوطن تھے، اس لیے یہ داعیہ اور قوی ہوگیا، چنانچہ سن مذکور میں آپ حرم پاک کی جانب روانہ ہوگئے اور مناسک حج کی ادائیگی کے بعد شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے، شیخ الدلائل مولانا عبدالحق صاحب کو آپ کی آمد سے بیحد مسرت ہوئی، شیخ الدلائل نے آپ کے علوئے مرتبت کو دیکھ کر دستخط خاص سے خلافت نامہ لکھ دیا اور اسی کے ساتھ حضرت مولانا محمد مظہر مہاجر مدنی کی خدمت میں ایک خط لکھا کہ آپ مولانا ولی محمد کی نسبت کو دیکھیے، حضرت مولانا مظہر صاحب نے شاہ صاحب کی نسبت ملاحظہ فرما کر اپنی خلافت واجازت سے مشرف فرمایا اور ساتھ ہی دو کتابیں، مناقبِ احمدیہ ومقاماتِ سعیدیہ اور عصا، تسبیح ومصلے بھی مرحمت فرمایا، دوسرے حج

سے واپسی کے بعد شاہ صاحب تہذیب اخلاق وتزکیۂ نفوس میں پوری طرح منہمک ہو گئے، خلق خدا کا رجوع بھی خوب ہوا، قرب وجوانب کے اضلاع کے علاوہ بنگال، چوبیس پرگنہ، کلکتہ، رانچی، بہار وغیرہ کے متعدد اصلاحی دورے کیے جس سے بے شمار لوگوں کی اصلاح وتربیت ہوئی اور کثیر لوگ ان کے سلسلے میں داخل ہوئے جن میں بہت سے افراد نے تعلیم مکمل کر کے خلافت واجازت حاصل کی، بعض خلفاء کے نام یہ ہیں، مولوی محمد صابر مئوی، حافظ حاجی عنایت اللہ مئوی، مولوی منظر حسن گھوسوی (نبیرہ شاہ صاحب) شاہ اظہار الحق بردوانی، مولانا سید ابونصر جلال الدین مونگیری، مولوی سید ارشد مونگیری، مولوی عبد العظیم ومولوی عبد الکریم برادران غازی پوری، حافظ مولا بخش لکھنوی، شیخ قادر بخش پھلتی۔

شاہ صاحبؒ اگرچہ ایک متبحر اور ماہر فنون عالم تھے، مگر آپ پر غلبہ تصوف کا تھا اس لیے تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف کا باقاعدہ سلسلہ قائم نہ ہوسکا، البتہ ایک رسالہ فن تصوف میں مخزن المعارف کے نام سے تالیف فرمایا تھا جن میں تصوف کی اصطلاحات اور تعریفات سے بحث کی ہے، اس رسالہ کے دیکھنے سے شاہ صاحب کے فنِ تصوّف میں تبحر کا اندازہ ہوتا ہے، رسالہ کے آخر میں اپنے خلفاء کی فہرست اوران کے مدارج تحریر کیے ہیں۔

آپ کی وفات ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۳۳ھ میں ۸۵ برس کی عمر میں ہوئی۔

مولوی سید زین العابدین نے تاریخ وفات میں مندرجہ ذیل اشعار کہے ؎

کرد رحلت ولی محمد شاہ — صوفی صافئ خدا آگاہ!
صوفئ پاک نفس بیشک وریب — عالم ومتقی بلا اشباہ!
شمع از بزم احمد سرہند — گل از باغ باقئ باللہ!
نفی واثبات فکر او ہردم — ذکر آں لا الٰہ الا اللہ!
سر بر آورد از ارم فرمود — رحم اللہ قبرہ وثراہ!

۱۳۳۳ھ

(ماخوذ از حیات ولی)

================

ی

شیخ یوسف حسن چریاکوٹیؒ

شیخ یوسف حسن حضرت مخدوم زادہ شیخ اسماعیل عباسی کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے، دلی میں ان کی پیدائش ہوئی، شیخ نصیرالدین چراغ دہلی رحمہ اللہ کے سایۂ عاطفت میں تعلیم وتربیت حاصل کی، عالم ربانی اور حدیث وتفسیر قرآنی کے ماہر تھے، ذہانت وجودت طبع میں جواب نہیں رکھتے تھے، ایک بار حضرت نظام الدین اولیا رحمہ اللہ کی مجلس میں نزہت الارواح کا درس ہورہا تھا، ہر ایک اپنی اپنی استعداد کے مطابق تشریح کررہا تھا، حضرت نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ نے شیخ یوسف حسن کی تشریح کو پسند فرمایا، ذیل کا دوہا جو حضرت نظام الدین اولیا سے منسوب ہے انھیں کے بارے میں ہے۔

سات، پانچ مل بِرہا بانچیں بولیں بولی قیاسی
ان سُبھن میں سانچیں بانچیں یوسف حسن عباسی

مخدوم زادہ شیخ اسماعیل نے انھیں کے نام پر چریاکوٹ کا نام یوسف آباد رکھا تھا، لیکن یہ نام رواج نہ پاسکا، شہرت سابقہ نام ہی کو حاصل رہی، شیخ یوسف حسن کا عین جوانی میں ۸۰۴ھ کے قریب چریاکوٹ میں انتقال ہوا، ان کی ایک تصنیف ''تحفۃ النصائح'' کے نام سے فارسی زبان میں تھی جو فرائض وسنن کے احکام پر مشتمل تھی۔ (یادداشت چریاکوٹ)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ نے ''اخبار الاخیار'' میں جن شیخ یوسف چریاکوٹی کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''درویشے بود مشرب شطاریہ'' اور اپنے والد ماجد شیخ سیف اللہ دہلوی متوفی ۹۹۰ھ کی ان سے ملاقات کا ذکر کیا ہے، وہ غالباً کوئی اور بزرگ ہیں۔ واللہ اعلم

بفضل الٰہی تذکرہ علماء اعظم گڈھ طبع دوم کی نظر ثانی کا کام مکمل ہوا۔

الحمدللہ اوّلاً وآخراً وصلی اللہ علی سیدنا وسندنا ومولانا محمد وعلی آلہ اصحابہ اتباعیہ اجمعین۔

حبیب الرحمٰن اعظمی

۲۸ ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ مطابق ۲۵ نومبر ۲۰۱۱ء

☆ ☆ ☆

تکملہ

مولانا ابراہیم عمادی فتن پوری

مولانا محمد ابراہیم عمادی بن شیخ اطہر حسین اپنے آبائی وطن فتن پور (نواح نظام آباد) میں ۱۹۱۰ء مطابق ۱۳۲۸ھ میں پیدا ہوئے، ان کے دادا شیخ عبدالرحیم اپنے علاقہ کے مشہور و معروف زمیندار تھے، نسلاً شیخ انصاری ہیں، ان کے مورث اعلیٰ قاضی قطب الدین انصاری (پیدائش ۹۸۸ھ وفات ۱۰۹۰ھ) اپنے اہل و عیال اور حشم و خدم کے ساتھ اس خطۂ زرخیز میں آکر آباد ہو گئے۔ تھے اور جائے سکونت کو "فتن پور" سے موسوم کیا تھا۔ شجرۂ نسب یہ ہے: مولانا محمد ابراہیم عمادی، بن شیخ اطہر حسین، بن شیخ عبدالرحیم، بن شیخ ارشاد حسین، بن شیخ حسن علی، بن شیخ محمد دائم، بن شیخ محمد عوض بن شیخ عنایت اللہ، بن شیخ غلام محی الدین، بن شیخ قطب الدین انصاری مدنی۔

سنِ شعور کو پہنچے تو خاندانی روایت کے مطابق رسم بسم اللہ گھر پر ہوئی، اور مولوی گدا علی اول استاذ مقرر ہوئے، گھریلو ماحول دینی تھا ادب و شعور اور سلیقہ پر خاص توجہ دی جاتی تھی، ملازمین کا ادب و اکرام بھی گھر کے ماحول میں داخل تھا، جس کا اثر مولانا ابراہیم عمادی کی شخصیت پر زندگی بھر نمایاں رہا۔

مروّجہ بنیادی تعلیم گھر پر حاصل کر لینے کے بعد ان کا داخلہ اردو اسکول راجہ بازار جون پور میں کرا دیا گیا، جو مسجد اٹالہ شہر جون پور کے سامنے واقع تھا، خاندان کے اکثر لڑکے یہیں زیر تعلیم تھے۔

مولانا مرحوم کے ماموں مولانا عبداللہ عمادی جو اپنے وقت کے نامور اہل قلم، مؤرخ، محقق اور صحافی تھے، اس وقت ریاست حیدرآباد کے قائم کردہ دارالترجمہ کے ناظم تھے، اتفاق سے گھر "امرتوان" آئے ہوئے تھے، آگے کی تعلیم کے لیے ان کے ساتھ حیدرآباد چلے گئے، مگر یہاں ان کا جی نہیں لگا، اس لیے مولانا عبداللہ عمادی نے انھیں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھیج دیا اور داخلہ وغیرہ میں سہولت کے لیے شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ اعظمی ناظم ندوہ کے نام ایک تعارفی خط بھی دیا، غالباً یہ ۱۹۲۴ء کا واقعہ ہے، اس

وقت مولانا ابراہیم کی عمر ۱۴ سال کے لگ بھگ تھی، مولانا نے دارالعلوم ندوہ میں پانچ سال گزارے، اور اس زمانہ کے اساتذہ سے ندوۃ کے نصاب کے مطابق علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل کی، جن میں مولانا سید علی زینبی، مولانا شبلی فقیہ جیراج پوری اور مولانا حیدر حسن خان ٹونکی بطور خاص قابل ذکر ہیں، آخر الذکر استاذ سے حدیث کی کتابیں پڑھیں جن کا درس حدیث بہت مشہور تھا، مولانا ابراہیم عمادی اپنے رفقاء درس کی صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"درس حدیث و درس قرآن وغیرہ میں میرے ساتھ سید ابوالحسن ندوی صاحب، محب اللہ لاری صاحب، مصطفیٰ کریم صاحب، نجم الدین قدوائی صاحب، مولانا عبدالسلام قدوائی وغیرہ تھے۔"

ہوسٹل (دارالاقامہ) کے رفقاء کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہوسٹل میں دلچسپ شب و روز گزرتے، باغ و بہار صحبتیں تھیں، رئیس احمد جعفری، ابوالحسن ندوی، مجیب سہالوی، عبدالسلام قدوائی، عبدالقدوس ہاشمی، رحمت علی، نجم الدین قدوائی غرض کس کس کا نام لیجیے، یہ منتخبۂ روزگار شخصیتیں شب و روز کے ساتھی و رفیق تھے۔"

مولانا مرحوم طلبۂ ندوہ کے رسالہ "الاصلاح" کے مدیر تھے، اس زمانہ میں کئی مضامین لکھے جن میں "عربوں کی تعمیرات" بعد میں جامعہ ملیہ دلی کے ترجمان "جامعہ" جیسے معیاری رسالہ میں شائع ہوا۔

مولانا عمادی دارالعلوم ندوہ میں ۲۴ء سے ۲۹ء تک پانچ سال زیر تعلیم رہے، اسی دوران لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل ادب کا امتحان دے کر سند لی، ندوہ سے فراغت کے بعد اپنے والد اور ماموں کے مشورہ پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے درجہ تخصص میں داخلہ لیا، یہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے عہد کا جامعہ تھا، پروفیسر مجیب، خواجہ عبدالحئی، اور حافظ اسلم جیراج پوری جیسے اساطین علم وفن اساتذہ کی فہرست میں شامل تھے۔

جامعہ ملیہ دلی میں تین سال رہے، اور اسی پر تعلیم وتحصیل کے دلچسپ وخوشگوار دور کا

اختتام ہوا، آگے کی زندگی اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں خود مولانا مرحوم کی زبانِ قلم سے سنیے فرماتے ہیں:

"تعلیم مکمل کر چکا تھا اور مکتبہ جامعہ میں ملازمت اختیار کر لی تھی، میری عمر اس وقت ۲۳ سال تھی، ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہونے لگا تھا، مضامین نویسی اور کتب بینی میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔"

اسی زمانہ (۱۹۳۳ء) میں مولانا شوکت علی مرحوم نے اخبار خلافت کی ادارت کے لیے چار افراد مولانا ابراہیم عمادی، مولانا رئیس احمد جعفری، مولانا عبدالسلام قدوائی اور حبیب احمد قنوجی کا انتخاب کیا۔ اس تقریب سے یہ چاروں رفقاء شہر انتخاب دلی کو خیر باد کہہ کر عروس البلاد بمبئی پہنچ گئے۔

اخبار خلافت سے مولانا عمادی تقریباً دس سال متعلق رہے، لیکن مشاہرہ کبھی پورا نہیں ملا، چنانچہ خود لکھتے ہیں: "میری تنخواہ پچاس روپے ماہوار مقرر تھی، لیکن مجھے یاد نہیں کہ پوری تنخواہ کبھی ملی ہو۔"

اس کے بعد چونا بھٹی بمبئی کے اسکول اینگلو عربک اسکول میں ۳۵ روپے ماہانہ پر مدرس ہو گئے، پھر جب ۱۹۳۴ء میں محمد علی روڈ پر "بیگ محمد ہائی اسکول" کی بنیاد پڑی تو ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی ہدایت پر اس سے منسلک ہو گئے اور تقریباً ۳۵ سال تک اسی سے وابستہ رہے، اسی دوران مولانا عمادی مرحوم نے درج ذیل کتابیں تصنیف کیں:

۱- خاتم النبیین: اس کتاب کو مولانا ماجد دریابادی نے بہت پسند کیا، مسلم مدارس میں ایک عرصہ تک داخل نصاب رہی اور اب تک اس کے سولہ ایڈیشن سے زاید شائع ہو چکے ہیں۔

۲- بمبئی کا جغرافیہ: یہ بھی طبع ہو چکی ہے۔

۳- خوشخطی کے چار کتابچے: جو غالباً اب تک مہاراشٹر کے ابتدائی اسکولوں کے نصاب میں داخل ہیں۔

۴- بچوں کا ادب: (تدریجی کہانیوں کا ۳۶ کتابوں پر مشتمل سلسلہ) یہ کتاب

بہت مقبول ہوئی، مہاراشٹر کے علاوہ مدراس، حیدر آباد دکن وغیرہ کے اسکولوں میں بھی رائج ہوئی، پاکستان میں بھی اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوے۔

۵- علم شہریت ونظام حکومت: ابتدائی وثانوی درجوں کے لیے لکھی گئی، جو اسکولوں میں ایک عرصہ تک داخل نصاب رہی۔

۶- مسلمان سائنس داں: جو مکتبہ الحسنات دلی سے جنوری ۸۵ء میں منظر عام پر آئی، جبکہ مولانا وفات پا چکے تھے، اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔

۷- ''شہر بمبئ کے مسلم مشاہیر'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھنی شروع کی تھی، لیکن اس کی تکمیل سے پہلے ہی پیغام اجل آ گیا، اس کے کچھ مضامین متعدد قسطوں میں بعض اخبارات ورسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

مولانا موصوف ۱۹۲۳ء مطابق ۱۳۴۲ھ میں تحریک خلافت کے بنیادی ومشہور قائد مولانا شوکت علی کی طلب پر بمبئ گئے تو پھر اسی کے ہو رہے اور اعظم گڈھ کا یہ ہلال بمبئ کے افق پر بدر کامل بن کر چمکا، اور ۲۵ر ربیع الآخر ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۸ر جنوری ۱۹۸۵ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

مولانا عربی علم وادب کے ایک اچھے عالم ہونے کے ساتھ انگریزی ادب میں بھی دستگاہ رکھتے تھے، اردو ادب وصحافت میں بھی بلند مقام پر فائز تھے، تحریر کی طرح تقریر کے بھی دھنی تھے، شعر وادب کے ایوان کے بھی مسند نشیں تھے، کبھی کبھی شعر کہتے تو خوب کہتے تھے، نمونۂ کلام یہ ہے:

میرے بھی دل میں اب کوئی حسرت نہیں رہی
آنکھوں میں بھی کسی کی مروت نہیں رہی
کس کے لیے اٹھائیں یہ ساری مصیبتیں
مہر ووفا کی اب کوئی قیمت نہیں رہی

نگاہ برق جو گرتی ہے سہم جاتا ہوں
نہ لطف میکش ومینا نہ لطف ساقی ہے
جب آن بان تھی سارا جہان اپنا تھا
مگر اس حال میں اب کون ہے جو ساتھی ہے

میرے دل میں بھی حوصلہ نہ رہا — وہ بھی اب خنجر آزما نہ رہا
دل میں آخر یہ درد کیسا ہے — وہ تو دل سے کبھی جدا نہ رہا
کہہ رہا ہے یہ کیا تو اے ہمدم — وہ تو مجھ سے کبھی خفا نہ رہا

کہوں کیوں کسی سے جو کچھ مجھ پر گزر چکی ہے — بھلا کام کا جو ہوتا تو ذلیل وخوار ہوتا
نہ یہ زندگی ہی ہوتی نہ یہ آرزو ہی ہوتی — نہ نگاہ اٹھتی گل پر نہ چمن میں خار ہوتا

مولانا ابوبکر بیناپاری اصلاحی

مولانا ابوبکر اصلاحی ۳؍جولائی ۱۹۲۲ء م ۱۳۴۱ھ کو ضلع اعظم گڈھ کے ایک معروف گاؤں بیناپارہ میں پیدا ہوئے، بیناپارہ قصبہ سرائے میر سے جانب شمال تقریباً تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ مولانا مرحوم پٹھان خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں، سلسلہ نسب یہ ہے:

مولانا ابوبکر اصلاحی، بن ذاکر علی خاں، بن وزیر علی خاں، بن جعفر علی خاں، اس سے اوپر شجرہ معلوم نہیں ہوسکا، مشہور ہے کہ آپ کے مورث اعلیٰ پاکرپور فیض آباد سے ترک سکونت کرکے بیناپارہ میں آباد ہوگئے تھے۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم ناظرۂ قرآن وغیرہ اپنے گاؤں ہی میں ''مکتب اسلامیہ'' میں مولوی مصطفیٰ صاحب سے حاصل کی، اس کے بعد جولائی ۱۹۳۲ء م ۱۳۵۱ھ میں مدرستہ الاصلاح سرائے میر کے مکتب درجہ سوم میں داخلہ لیا، اس وقت وہاں پرائمری کے درجات سوم وچہارم میں فارسی بھی داخل نصاب تھی، ابھی یہاں پڑھتے ایک ہی سال گذرا تھا کہ اگست ۱۹۳۳ء میں ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا، اس حادثہ سے متاثر ہوکر انھوں نے پڑھائی چھوڑ دی، پھر چند مہینوں کے بعد اپنے گاؤں سے قریب موضع منجیر پٹی کے مدرسہ میں داخل ہوئے جہاں مولانا قمرالدین فاضل دیوبند مدرس تھے، مولانا قمرالدین منجیر پٹوی کے زیر تعلیم وتربیت تقریباً دوسال رہ کر اپنے بڑے بھائی حافظ محمد مرتضیٰ کی

راے ومشورہ سے ۱۹۳۵ء م ۱۳۵۴ھ میں دوبارہ پھر مدرستہ الاصلاح کے درجہ عربی اوّل میں داخل لیا، اور یہیں سات برس تک پڑھ کر ۱۹۴۲ء م ۱۳۶۱ھ میں فارغ التحصیل ہو گئے، مدرستہ الاصلاح میں جن اساتذہ سے مولانا نے تعلیم وتربیت حاصل کی وہ یہ ہیں۔

مولانا شبلی متکلم بمھوری ندوی، مولانا عبدالصمد ندوی متوطن راجوپورسکرور، مولانا محمد سعید ندوی بندوی، مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا نبی احمد اصلاحی، مولانا حافظ عبدالاحد اصلاحی، مولانا اظہارالدین (یہ مولانا کے ہم وطن تھے) مولانا داؤد اکبر بمھوری اصلاحی، مولانا امین احسن اصلاحی وغیرہ رحمہم اللہ۔ تعلیم سے رسمی فراغت کے بعد دو سال مزید استاذ معید (معاون استاذ) کی حیثیت سے مولانا مدرستہ الاصلاح میں مقیم رہے، دو ایک اسباق پڑھاتے اور بقیہ اوقات مطالعہ وتحقیق میں صرف کرتے، اسی دوران جناب قاضی عدیل عباسی نے ''جامعہ رحمانیہ'' قادر آباد ضلع بستی کے لئے مدرستہ الاصلاح کے ذمہ داروں سے ایک استاذ طلب کیا جو درس وتدریس کے ساتھ نظامت کے فرائض بھی انجام دے سکے، تو ارباب مدرسہ نے ۱۹۴۴ء م ۱۳۶۴ھ میں انھیں بستی جامعہ رحمانیہ میں بھیج دیا، گویا اس تاریخ سے مولانا ابوبکر مرحوم نے باقاعدہ درس وتدریس کا آغاز کیا، جامعہ رحمانیہ قادر آباد بستی میں پوری تندہی اور حسن وخوبی کے ساتھ وہ اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں مصروف تھے کہ ۱۹۴۶ء م ۱۳۶۶ھ میں مدرستہ الاصلاح سے ان کی طلبی کا پیغام آ گیا، جس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مولانا مرحوم کے شریک کار تحریک جماعت اسلامی میں ان کے رفیق سفر لکھتے ہیں:

> ''۱۹۴۶ء میں پہلی مرتبہ مدرستہ الاصلاح میں بغرض مدرسی بلائے گئے، یہ وقت وہ تھا جب مدرستہ الاصلاح کے کہنہ مشق اور سینئر اساتذہ بیک وقت علاحدہ کر دیئے گئے، اس فیصلہ سے متاثر ہو کر مولانا شبلی متکلم بھی مدرستہ سے مستعفی ہو گئے، کیونکہ مذکورہ استاذہ مولانا شبلی متکلم صاحب کے خاص رفقاء کار تھے اور مولانا ہی اس وقت مدرسہ کے مہتمم تھے ان کو اعتماد میں لیے بغیر جب ان کے رفقاء کار کو علاحدہ کر دیا گیا، تو وہ خود بھی احتجاجاً مستعفی ہو گئے، اس طرح بیک وقت اونچے

اساتذہ کی جگہیں خالی ہوگئیں، مدرسہ کے ناظم مولانا بدرالدین صاحب اصلاحی نے مودودی سے درخواست کی کہ وہ مدرسہ کے لیے افراد فراہم کریں. چنانچہ باہمی بات چیت سے جن لوگوں کو مولانا مودودی نے مدرستہ الاصلاح میں بھیجا وہ ہیں: مولانا ابواللیث صاحب اکولہ سے، مولانا صدرالدین پٹھان کوٹ سے، مولانا جلیل احسن صاحب بریلی سے اور مولانا ابوبکر صاحب بستی سے. ان لوگوں نے مدرسہ ک سنبھالا" (حیاتِ نو جامعۃ الفلاح بلریاگنج)

یکم ستمبر ۱۹۴۶ء کو مولانا مرحوم نے باضابطہ مدرستہ الاصلاح میں درس وتدریس کا آغاز کیا جس کا سلسلہ ۱۹۵۷ء م ۷۷ ۱۳ھ تک جاری رہا، اسی دوران مدرسہ کے صدر مدرس مولانا اختر احسن اصلاحی نے صدارت تدریس سے استعفاء دے دیا تو ان کی جگہ منصب صدارت کے لیے مولانا مرحوم کا انتخاب عمل میں آیا، کچھ دنوں تک بڑے طلبہ کے نگراں واتالیق بھی رہے، اس طرح انھوں نے مدرستہ الاصلاح میں گیارہ سالہ تدریسی خدمت کے ساتھ صدر مدرسی اور طلبہ کی نگرانی کے فرائض بھی انجام دیئے۔

مولانا ابوبکر اصلاحی مرحوم چونکہ تحریک جماعت اسلامی کے ایک سرگرم کارکن تھے اس لیے انھیں مدرستہ الاصلاح کی صدارت تدریس پر رہتے ہوئے ضلع کا اعزازی ناظم بنادیا گیا اور مولانا نظام الدین اصلاحی ان کے معاون بنائے گئے، پھر اعظم گڈھ کے رفقاء جماعت کا اصرار ہوا کہ آپ مدرستہ الاصلاح سے اپنے آپ کو الگ کر کے جماعت کے لیے فارغ ہوجائیں، چنانچہ امیر جماعت مولانا ابواللیث ندوی نے مدرسہ کے اصحاب انتظام سے گفت وشنید اور ان کی رضامندی سے مولانا ابوبکر اصلاحی مرحوم کے متبادل کے طور پر "ثانوی درسگاہ رام پور سے مولانا عبدالودود ندوی مرحوم کو مدرستہ الاصلاح میں بھیجا اور مولانا مرحوم کو جماعت کے کام کے لیے فارغ کرلیا، اس طرح مدرستہ الاصلاح سے ان کا تدریسی تعلق ختم ہوگیا، اور وہ پورے طور پر جماعت اسلامی کے کاروبار میں مصروف ہوگئے، پھر ایک طویل عرصہ کے بعد جب جامعۃ الفلاح کا قیام عمل میں آیا اور ۱۹۶۹ء م ۱۳۸۹ھ میں وہ جامعۃ الفلاح کے ناظم بنائے گئے، تو پھر مدرسہ سے متعلق ہوگئے، اس

اجمال کی تفصیل بھی مولانا نظام الدین اصلاحی کی زبان قلم سے سنیے:

''۱۹۶۰ء م (۱۳۸۰ھ) میں مدرسۃ الاصلاح میں فضا پرسکون نہ رہی اور جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو انھیں لوگوں نے سبکدوش کر دیا جنھوں نے انھیں بلایا تھا، اب ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنی ضرورت کی تکمیل کے لیے ایک دارالعلوم کا انتظام کیا جائے، مولانا ابوبکر صاحب، مولانا ملک حبیب اللہ اور بشمول راقم ایک نشست میں جس میں مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی بھی شریک رہے، ایک درسگاہ ''جامعۃ الرشاد'' کے نام سے کھولنے کا فیصلہ کیا گیا، مولانا مجیب اللہ صاحب اس وقت جماعت اسلامی کے رکن تھے، ادارہ چل پڑا، چونکہ مولانا مجیب اللہ صاحب اس وقت دارالمصنفین اعظم گڈھ میں ہی قیام پذیر تھے اس لیے ان کو اس درسگاہ کا ذمہ دار بنایا گیا، اور بغرض سہولت اس درسگاہ کو شہر بلکہ ان کے محلہ میں ہی قائم کیا گیا، پہلے یہ مسجد میں شروع ہوا، پھر ایک دوسری مسجد بھی درس وتدریس کے لیے منتخب کی گئی اور کرایہ پر بھی مکان لیا گیا، مگر جلد ہی مولانا مجیب اللہ صاحب جماعت اسلامی سے دور ہونے لگے اور آہستہ آہستہ رکنیت سے ہی مستعفی ہو گئے اب مذکورہ دونوں ذمہ داران اور دیگر رفقاء نے یہ محسوس کیا کہ اب ہم اس درسگاہ کو آئندہ اپنی مرضی سے چلا نہ سکیں گے اس لیے اس سے ارکان جماعت بے تعلق ہو گئے، اور بلریا گنج کے ایک پرائمری اردو مکتب کی طرف رخ کیا گیا، مولانا عبدالحسیب اصلاحی رکن جماعت جامعۃ الرشاد سے منتقل کر کے اسی مکتب میں بھیج دیئے گئے، پھر دھیرے دھیرے تحریک سے متعلق لوگ مسند تدریس پر فائز کیے جاتے رہے، مولانا ابوبکر صاحب اور امیر حلقہ مولانا حبیب اللہ صاحب برابر اس کی دیکھ ریکھ کرتے رہے، قصبہ کے لوگوں کا بھرپور تعاون رہا اور آہستہ آہستہ یہ پرائمری مکتب وہ جامعۃ الفلاح بنا جو دنیا کے سامنے موجود ہے، مولانا ابوبکر صاحب بھی بعد میں اسی جامعہ میں منتقل ہو گئے، اور مختلف مناصب پر فائز رہے، مولانا مرحوم جتنے مناصب پر فائز ہوئے اتنے مناصب پر کوئی فائز نہ ہو سکا، مولانا جامعۃ الفلاح میں

ناظم، نائب ناظم، صدر مدرس، نگران اعلیٰ، نگران سبھی ذمہ داریوں پر فائز رہے۔ ناظم اور صدر مدرس تو بار بار بنائے گئے، ہر ذمہ داری کو دلجمعی وخوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔۔۔ جامعۃ الفلاح کے ننھے پودے کو سینچنے اور قد آور درخت بنانے میں بہت سے احباب نے اپنی زندگیاں لگائیں، مگر مولانا کی قربانیاں بہت اہم اور نمایاں ہیں۔'' (حیات نو جامعۃ الفلاح بلریا گنج)

۱۹۶۹ء م ۱۳۸۹ھ میں جب مولانا جامعۃ الفلاح بلریا گنج کے ناظم منتخب ہوئے تو امیر جماعت اسلامی کی منظوری سے جماعت کی علاقائی نظامت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے اور یکسو ہو کر پورے طور پر جامعۃ الفلاح کی خدمت میں مصروفِ کار ہو گئے، اس کے بعد جماعت اسلامی کے کسی منصبی ذمہ داری سے متعلق نہیں ہوئے البتہ تاحیات اس کے رکن رہے۔ مولانا اوراصل درس وتدریس ہی کے آدمی تھے، مگر بقول علامہ شبلی ''ع'' مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا، وہ درس وتدریس سے الگ دوسرے کاموں میں لگے رہے، اور ۱۹۶۹ء میں اپنے اصل مشغلہ میں پھر سے مشغول ہو گئے، جامعۃ الفلاح میں نظامت کی ذمہ داری کے ساتھ تدریسی خدمت بھی انجام دیتے رہے، پھر ۱۹۷۲ء م ۱۳۹۱ھ میں یہاں سے علیحدہ ہو کر بچیوں کی درسگاہ ''جامعۃ الصالحیات رامپور'' میں مسند درس کو سنبھالا، اور ۱۹۷۷ء م ۱۳۹۸ھ میں دوبارہ پھر جامعۃ الفلاح میں بحیثیت مدرس آ گئے، اس وقت سے تقریباً اٹھارہ برس تک مسلسل جامعۃ الفلاح میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا، اس مدت میں مولانا جامعہ کے صدر مدرس بھی رہے، نائب ناظم بھی اور نگراں واتالیق بھی، مولانا مرحوم چونکہ جامعہ کے بانیوں میں سے تھے، حتی کہ اس کا نام ''جامعۃ الفلاح'' مولانا ہی کا تجویز کردہ ہے، اس لیے انھیں اس سے غایت درجہ تعلق تھا، انھیں اس کی کسی بھی نوع کی خدمت سے گریز نہیں تھا، اسی لیے ایک زمانہ تک اس کے ناظم اور صدر مدرس رہنے کے باوجود نگراں بنائے جانے کو بھی بخوشی قبول کر لیا تھا، بالآخر ۱۹۹۵ء م ۱۴۱۶ھ کو ضعف پیری اور بصارت کی کمزوری کی بناء پر جامعہ سے مستعفی ہو کر گھر چلے آئے۔

مولانا مرحوم نے جامعۃ الفلاح میں اسرار شریعت، تفسیر، فرائض، فقہ اور نحو وصرف وغیرہ مختلف فنون کا درس دیا، صرف ونحو میں ان کی نظر بڑی وسیع تھی اور فرائض میں تو وہ جامعۃ الفلاح میں طلبہ ہی نہیں؛ بلکہ اساتذہ کے مرجع تھے، اس فن میں انھیں اختصاص کا درجہ حاصل تھا، مولانا کے درس سے استفادہ کرنے والے طلبہ وطالبات کی تعداد بہت کثیر ہے، ان میں قابل لحاظ وشمار چند تلامذہ یہ ہیں:

مولانا محمد ایوب اصلاحی، مولانا عبدالعلیم اصلاحی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا اشفاق احمد اصلاحی، مولانا مظفر احسن اصلاحی، مولانا امانت اللہ اصلاحی وغیرہ۔

مولانا ابوبکر اصلاحی مرحوم خاندانی طور پر پٹھان تھے اور پٹھان عام طور پر جذباتی ہوا کرتے ہیں؛ لیکن اس کے برعکس وہ بڑے نرم خو، حلیم وبردبار اور منکسر المزاج تھے، ملنے جلنے والوں سے بڑی خندہ پیشانی اور ملنساری سے پیش آتے تھے، طہارت وپاکیزگی اور صفائی ستھرائی کا بہت خیال رکھتے تھے۔

مولانا مرحوم کی صحت یوں تو بہت اچھی کبھی نہیں رہی؛ لیکن وہ عارضہ جو موت کا پیش خیمہ بنا وہ آنکھ کا آپریشن تھا، ایک آنکھ سے تو وہ سترہ برس پہلے معذور ہو چکے تھے، دوسری آنکھ میں موتیابند ہو گیا تھا، جس کے آپریشن کے لیے بنارس گئے، آپریشن روم جاتے ہوئے دماغ پر ہلکا سا فالج کا اثر ہوا، علاج ہوتا رہا مگر مرض بڑھتا ہی گیا ''ع'' الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا، بالآخر اسی مرض میں ۳؍مئی ۱۹۹۸ء م ۱۴۱۹ھ کی درمیانی شب میں اس دار فانی کو چھوڑ کر رہگرائے عالم جاودانی ہو گئے۔

مولانا ابوسفیان قاسمی

مولانا ابوسفیان ابن شیخ محمد الیاس ضلع اعظم گڈھ کے ایک معروف گاؤں موضع لونیہ ڈیہہ کے چشم وچراغ تھے، اپنے آبائی وطن میں ۱۹۵۵ء م ۱۳۷۵ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی مکتبی تعلیم اپنے وطن لونیہ ڈیہہ میں پائی، آگے کی تعلیم کے لئے مدرسہ فاروقیہ صبرحد ضلع جونپور داخل ہوئے اور تقریباً چھ سات سال وہاں رہ کر ابتدائی فارسی سے لے کر عربی

متوسطات تک کی کتابیں پڑھیں، مدرسہ فاروقیہ صبر حد میں دیگر اساتذہ کے علاوہ مولانا محمد یسین نوناروی اور مولانا عبدالرشید صاحب سے بطور خاص استفادہ کیا، پھر اپنے اساتذہ کے مشورہ سے اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند پہنچے اور یہاں نصاب کی بقیہ کتابیں پڑھ کر ۱۹۷۹ء م ۱۴۰۰ھ میں فارغ التحصیل ہوگئے، صحیح بخاری آپ نے حضرت مولانا نصیر احمد خاں بلند شہری شیخ الحدیث دارالعلوم سے پڑھی، آپ کے دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ میں حضرت مولانا نصیر احمدؒ کے علاوہ حضرت مولانا محمد حسین بہاری، حضرت مولانا معراج الحق دیوبندی، مولانا محمد سالم دیوبندی، مولانا انظر شاہ کشمیری، مولانا محمد نعیم دیوبندی وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

فراغت کے بعد کسب معاش، ورزقِ حلال کے لئے مہاراشٹر کے بعض اضلاع میں اپنی بیکری قائم کی اسی کے ساتھ بعض مدرسوں میں اعزازی طور پر دو ایک گھنٹے پڑھاتے بھی تھے، اس طرح چھ سات سال مہاراشٹر کی خاک چھاننے میں گزر گئے، اس کے بعد اپنے موضع کے مدرسہ جامعہ شرقیہ کے ارباب حل وعقد کے طلب واصرار پر بیکری کے کاروبار سے بڑی حد تک یکسو ہو کر بحیثیت ناظم جامعہ ۱۹۸۷ء م ۱۴۰۷ھ میں مدرسہ سے منسلک ہوگئے اور زندگی کی آخری سانس تک یہ وابستگی قائم رہی، ۲۰۰۴ء م ۱۴۲۵ھ کو جب موجودہ شیخ الجامعہ مولانا شبیر احمد حاجی پوری کی رحلت ہوگئی تو ناظم کی بجائے شیخ الجامعہ کے منصب سے سرفراز ہوئے۔

مولانا ابوسفیان مرحوم نے جامعہ شرقیہ لونیہ ڈیہہ سے وابستگی کے بعد جامعہ کی تنظیم وترقی میں اپنی ساری صلاحیتیں لگادیں، ان کا سارا وقت جامعہ کے نظم ونسق کی درستگی اور اسے بامِ عروج پر پہنچانے کی تگ ودو میں صرف ہوتا تھا، بس جامعہ شرقیہ ہی ان کے فکر کا مرکز اور جہد وعمل کا محور بن گیا تھا، ان کے دور ونزدیک کے اسفار ہوتے تو جامعہ ہی کے استحکام وترقی کے پیش نظر ہوتے اور جامعہ میں قیام ہوتا تو اسی کے انتظام وانصرام کی درستگی کے تحت ہوتا، اپنے حسنِ اخلاق اور حسن تدبیر سے جامعہ کے پورے عملے کو خوش ہی نہیں رکھتے تھے؛ بلکہ سب کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا، مولانا موصوف کے جہد وعمل اور اخلاص

وللّٰہیت کی برکت سے ان کے دور انتظام واہتمام میں جامعہ شرقیہ نے برق رفتاری کے ساتھ ہمہ جہت ترقی کی۔

موصوف طویل عرصہ سے سوگر جیسے موذی مرض کے شکار تھے، جس نے انھیں اندر سے کھوکھلا کردیا تھا، اس پر انتظامی امور کا بارگراں، جسے مولانا کی علیل طبیعت برداشت نہیں کرسکی، بالآخر جامعہ شرقیہ کا یہ مخلص اور بے لوث خادم اسی کے درد کو سینے سے لگائے ۱۳/مارچ ۲۰۰۹ء م ۱۵/ربیع الاول ۱۴۲۰ھ کو جمعہ کے مبارک دن زندگی کی آخری سانس لی اور جامعہ شرقیہ کے متصل ''مزار جامعہ'' میں سپردِ خاک ہوا۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

مولانا ابو اللیث ندوی

مولانا ابو اللیث ندوی بن شیخ توجہ حسین اپنے آبائی وطن ''چاند پٹی''، ضلع اعظم گڈھ میں ۱۹۱۶ء م ۱۳۳۵ھ میں پیدا ہوئے، بعض اہل قلم نے پیدائش کی تاریخ ۱۹۱۲ء بیان کی ہے جو مدرستہ الاصلاح کے رجسٹر میں داخل، خارج کے مطابق درست نہیں ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہی ہوئی، کچھ شد بد ہوجانے کے بعد ''محمد آباد گوہنہ'' کے مکتب میں داخل ہوئے، مکتبی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد ۶/اگست ۱۹۲۵ء م ۱۳۴۴ھ کو مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں داخلہ لیا، اس وقت ان کی عمر نو برس کی تھی، یہاں درجہ پنجم عربی تک پڑھ کر ۱۹۳۱ء م ۱۳۵۰ھ میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو چلے گئے، اور دو برس وہاں زیر تعلیم رہ کر ۱۹۳۳ء م ۱۳۵۲ھ میں فارغ التحصیل ہوگئے، ندوہ میں اس وقت عرب کے مشہور نحو وادب کے عالم شیخ تقی الدین ہلالی کا درس اپنے شباب پر تھا، اس دور میں شیخ ہلالی کی صحبت میں جو علماء پروان چڑھے ان میں ایک مولانا ابو اللیث ندوی بھی ہیں، چونکہ ان کی علمی استعداد بھی پختہ تھی اور ادب وانشاء میں بھی پوری قدرت تھی، اس لیے فارغ ہوتے ہی دار العلوم ندوہ میں مدرس مقرر ہوگئے، ندوہ میں ایک برس تدریسی خدمت انجام دے کر ۱۹۳۵ء میں بجنور چلے گئے اور وہاں اس وقت کے مشہور اخبار

''مدینہ'' کے ایڈیٹوریل بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے صحافتی زندگی کا آغاز کیا، تقریباً پانچ سال اخبار مدینہ بجنور میں قرطاس وقلم کی خدمت انجام دی، پھر یہاں سے ۱۹۴۰ء میں سرائے میر مدرستہ الاصلاح میں آگئے؛ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں یہاں سے منتقل ہوکر مدرستہ ضیاء العلوم اکولہ مہاراشٹر میں مدرس ہوکر چلے گئے، مولانا مرحوم اکولہ ہی میں درس وتدریس میں مصروف تھے کہ مدرستہ الاصلاح ایک بحران سے دوچار ہوگیا اور اس کے قدیم اساتذہ مع مہتمم مدرسہ مولانا شبلی متکلم کے مدرسہ سے الگ ہوگئے، تو مولانا مودودی صاحب کی تجویز پر جہاں دیگر اساتذہ ان خالی جگہوں کو پُر کرنے کے لیے سرائے میر آئے، مولانا ابواللیث ندوی مرحوم بھی ۱۹۴۶ء م ۱۳۶۲ھ کو اکولہ سے سرائے میر آگئے، انھوں نے مدرستہ الاصلاح میں صحیح امام بخاری، سنن ترمذی، حجۃ اللہ البالغہ، بدایۃ المجتہد وغیرہ کا درس دیا، جس سے ان کی علمی ودرسی صلاحیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مولانا ابواللیث ندوی جماعت اسلامی سے اس کے ابتدائے قیام ۱۹۴۰ء ہی سے وابستہ ہوگئے تھے، ملک کی تقسیم ۱۹۴۸ء کے بعد جب امیر جماعت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اور بعض دیگر اہم ارکان پاکستان چلے گئے تو ہندوستان کی جماعت اسلامی کی امارت کی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر آگئی، اس پر آشوب عہد میں انھوں نے جماعت کے منتشر امور اور افراد کی شیرازہ بندی کرکے پھر سے اسے نئی زندگی بخشی، اس وقت اس لٹے پٹے قافلے کی سربراہی بڑے دل گردہ کی بات تھی، اگر یہ صحیح ہے کہ پاکستان میں جماعت اسلامی کو استحکام بخشنے کا کام مولانا مودودی صاحب کے ہاتھوں انجام پایا تو اس واقعہ سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں اس کی بقاء مولانا ابواللیث ندوی ہی کی مرہون منت ہے ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۱ء تک مولانا نے امارت کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی پوری کرکے ۱۹۷۲ء میں اس بارگراں سے سبکدوش ہوکر اپنے وطن کے زاویہ میں عزلت نشیں ہوگئے، جماعت کی فعال ومتحرک زندگی سے یکایک یہ گوشہ نشینی اپنے اندر ایک طویل داستان رکھتی ہے، جس کا تذکرہ اب بے سود ہے، نو سال کی اس کنارہ کشی کے بعد ۱۹۸۲ء میں دوبارہ پھر تاجِ امارت سے انھیں سرفراز کیا گیا، اسی دورِ امارت

میں بزمانہ ایمرجنسی انیس ماہ کے قید و بند کی صعوبتیں بھی انھیں برداشت کرنی پڑھیں، لیکن ان کے پائے استقامت میں کوئی لرزش نہیں آئی۔

اس دوسری بار جماعت اسلامی کی امارت سے سبکدوشی کے بعد وہ اپنے گھر چاندپٹی آگئے، اب ان کا پورا وقت نماز، تلاوت، ذکر میں گزر رہا تھا، وہ اپنے ان مشاغل میں پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ زندگی کے شب و روز گذار رہے تھے، کہ ان کی جانب دست اجل نے دراز ہونا شروع کیا، ۲/دسمبر ۱۹۹۰ء کو جبکہ وہ نماز فجر کے بعد حسب معمول تفریح کو نکلے تو ان پر دل کا دورہ پڑا، مقامی ڈاکٹروں نے دوا علاج کیا، مگر حالت بگڑتی ہی گئی، ۳/دسمبر کو چاندپٹی سے اعظم گڈھ اپنے قریبی عزیز ڈاکٹر فرقان کے گھر لائے گئے، انھوں نے جو بہتر سے بہتر علاج ان کے لیے ممکن تھا کیا، گلوکوز چڑھایا، آکسیجن پہنچایا جس سے طبیعت قدرے سنبھل گئی، لیکن بعد میں طبیعت پھر بگڑ گئی تو ڈاکٹر فرقان صاحب نے انھیں گھر سے اپنے نرسنگ ہوم میں منتقل کر دیا، وہیں ۵/دسمبر ۱۹۹۰ء م ۱۷/جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ کو دس بجے دن میں روح جسد خاکی سے پرواز کر گئی اور زندگی بھر کا تھکا ہارا مسافر ابدی نیند سو گیا۔

مولانا ابواللیث ندوی مرحوم جہاں ایک بلند نگاہ قائد تھے، وہیں وہ اعلیٰ درجہ کے معلم و مدرس اور بالغ نظر صحافی و مصنف بھی تھے، انھوں نے اپنے ابتدائی مدرسی کے دور میں مجلہ ''الضیاء'' لکھنؤ اور ''الاصلاح'' سرائے میر میں کثرت سے مضامین تحریر کیے، اور اخبار مدینہ کے تو وہ متعدد اداریہ نویسوں میں سے ایک تھے، جماعت اسلامی میں سرگرم زندگی گذارنے کے بجائے اگر انھوں نے قرطاس و قلم کو سنبھالا ہوتا تو وہ قوم و ملت کو بہت سی مفید اور کارآمد تصانیف دے گئے ہوتے، ''ماشاء اللہ کان'' اس وقت خود مصروفیت کے باوجود بھی انھوں نے وقت و حالات کے تقاضے کے مطابق بعض رسائل اور کتابیں تصنیف کیں جو یہ ہیں:

(۱) مسئلہ انتخاب اور مسلمان، (۲) مسلمانان ہند کا لائحہ عمل، (۳) جماعت اسلامی کا مقصد اور طریقۂ کار، (۴) ملک و ملت کے مسائل اور ان کا حل، (۵) جماعت اسلامی

ہند، حقائق اور الزامات، (۶) بھارت کی تعمیر اور ہم، (۷) ہندوستان کا مستقبل اور جماعت اسلامی کی دعوت، (۸) دو یادگار تقریریں۔

مولانا ابواللیث مرحوم ایک نیک نفس، نیک دل، اور اعتدال پسند انسان تھے، ایثار وقربانی، صبر واستقامت، سادگی وبے نفسی کے زندہ نمونہ تھے، وہ لباس وہیئت نہیں بلکہ اپنی ذات وحقیقت سے سراپا زہد واتقا تھے، نماز باجماعت کے ساتھ وہ نوافل، تہجد اور ذکر واذکار کے بھی پابند تھے، ہندوستان کے اکثر مشائخ کی خدمت میں حاضری سے بھی انھیں گریز نہیں تھا، ان کی زندگی، گھر، مکان کسی چیز سے یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ ان کے دل میں دنیا کی کوئی ہوس ہے، نام ونمود اور اچھل کود والی شہرت سے وہ کوسوں دور تھے، غرضیکہ وہ جیسے صفات وخصائل کے حامل تھے ایسے لوگ خال خال ہی ملیں گے۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری ۴؍رجب ۱۳۳۴ھ م ۷؍مئی ۱۹۱۶ء کو ضلع اعظم گڈھ کے مشہور صنعتی قصبہ مبارک پور میں پیدا ہوئے، قاضی صاحب کا سلسلہ نسب یہ ہے:

قاضی اطہر، بن محمد حسن، بن حاجی لعل محمد، بن شیخ محمد رجب، بن شیخ محمد رضا، بن شیخ امام بخش، بن شیخ علی، آپ کے مورث اعلیٰ اصل باشندہ کڑا مانک پور کے تھے، شہنشاہ ہمایوں کے عہد میں خانوادۂ حامدیہ چشتیہ کے چشم وچراغ سید راجہ مبارک شاہ مانک پوری متوفی ۹۶۵ھ کے ہمراہ مبارک پور آئے، راجہ مبارک شاہ نے اس خطۂ ارض کو جو پہلے قاسم آباد کے نام سے موسوم تھا ازسرِ نو آباد کر کے اپنے نام پر اس کا نام "مبارک پور" رکھا، بعد میں وہ اپنے آبائی وطن کڑا مانک پور واپس چلے گئے اور وہیں وفات پا کر اپنے دادا سید راجہ نور شاہ کے مقبرہ میں دفن ہوئے، لیکن قاضی صاحب کا خاندان مستقل طور پر مبارک پور ہی میں آباد ہو گیا اور عہد بہ عہد حکومت وقت کی طرف سے نیابت قضا کے منصب پر فائز ہوتا رہا۔

قاضی اطہر صاحب کا اصل نام "عبدالحفیظ" تھا جو ان کے نانا مولانا احمد حسین رسول پوری نے رکھا تھا، مگر وہ اپنے قلمی نام قاضی اطہر مبارک پوری ہی سے معروف ومشہور ہوئے اور

اصل نام یوں متروک ہوگیا کہ اب کم ہی لوگ اس سے واقف ہوں گے۔

قرآن مجید، اردو، ریاضی وغیرہ کی مکتبی تعلیم مکمل کر کے ۱۳۵۰ھ میں اپنے قصبہ کے نامور مدرسہ ''جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور'' میں عربی تعلیم کا آغاز کیا اور وہاں کے اساتذہ مولانا مفتی محمد یٰسین مبارک پوری، مولانا شکر اللہ مبارک پوری، مولانا بشیر احمد مبارک پوری، مولانا محمد عمر مبارک پوری وغیرہ سے نحو، صرف، ادب، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق، فلسفہ وغیرہ مروّجہ نصاب کی تمام کتابیں پڑھیں، اور فن عروض وقوافی اور ہیئت کے کچھ اسباق اپنے ماموں مولانا محمد یحییٰ سے پڑھے جو ان فنون کے ماہر تھے، قاضی صاحب کی علمی تربیت میں مولانا محمد یحییٰ مرحوم کا بڑا حصہ ہے، قاضی صاحب میں کتب بینی اور مطالعہ کا چسکہ پیدا کرنے والے دراصل یہی ہیں، نئی نئی کتابیں لاکر انھیں دیتے اور ان کے مطالعہ پر انھیں اکساتے اس طرح رفتہ رفتہ کتب بینی ان کی گویا عادۃ ثانیہ بن گئی۔

جامعہ عربیہ احیاء العلوم کے نصاب تعلیم کو مکمل کر لینے کے بعد جامعہ قاسمیہ (مدرسہ شاہی) مرادآباد میں داخلہ لیا اور فخر المحدثین مولانا سید فخر الدین احمد شیخ الحدیث سے صحیح بخاری، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ اور مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلوی سے جامع ترمذی اور مولانا محمد اسماعیل سنبھلی سے صحیح مسلم وغیرہ کتب حدیث پڑھ کر ۱۳۵۹ھ میں فاتحہ فراغ پڑھا۔

قاضی صاحب کو کتب بینی کا ذوق ابتداء عہد طالب علمی ہی سے ہوگیا تھا، وہ اپنی خودنوشت سوانح حیات ''قاعدہ بغدادی سے بخاری تک'' میں لکھتے ہیں: ''غیر درسی کتابوں کے مطالعہ کا شوق جنون ودیوانگی کی حد تک بڑھ گیا تھا۔۔۔ کثرت مطالعہ اور کتب بینی سے بعض اوقات آنکھ میں سوزش پیدا ہوجاتی۔۔۔ اور چکر آنے لگتا تھا،؟ (ص ۲۱-۲۲)

اسی ذوق مطالعہ کی برکت تھی کہ انھوں نے مختلف موضوعات کی اہم کتابوں کا مطالعہ دورِ تحصیل ہی میں کر لیا تھا، چنانچہ خود انھوں نے اپنے مطالعہ سے گزری کتابوں کی جو فہرست درج کی ہے، اس میں فہرست ابن ندیم، وفیات الاعیان، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، دلائل النبوہ للبیھقی، سبحۃ المرجان فی آثار

هندوستان، آکام المرجان فی احکام الجان، حیاۃ الحیوان، الصواعق المحرقہ، العمدۃ فی الشعر ونقدہ، المحاسن والاضداد، الشعر والشعراء، المیزان الکبریٰ، سیرت ابن ھشام، وفاء الوفاء، المستطرف، کتاب الملل والنحل، العقد الفرید، رسالۃ الغفران، دیوان فرزدق، تھذیبِ التھذیب، توالی التاسیس وغیرہ اپنے موضوعات پر اہم کتابیں شامل ہیں۔

اس فہرست کے بعد لکھتے ہیں ''یہ ان کتابوں کے علاوہ ہے جن کو میں خریدتا تھا اور رات دن ان کے مطالعہ میں مشغول رہتا تھا... اسی طرح جمعیۃ الطلبہ (مدرسہ احیاء العلوم) کی لائبریری کی تقریباً تمام کتابیں کلی یا جزوی طور پر میرے مطالعہ میں رہ چکی ہیں اور میں نے ان سے استفادہ کیا ہے (ص ۲۳-۲۴)

اسی ذوق مطالعہ کا ثمرہ تھا کہ قاضی صاحب کا سینہ معلومات کا گنجینہ بن گیا تھا، جو بعد میں ان کی نوک قلم سے رواں ہوکر صفحۂ قرطاس پر ثبت ہوگیا، جسے دیکھ کر ایک خلقت انھیں مؤرخ اسلام کہنے پر مجبور ہوگئی۔

تعلیم وتحصیل سے رسمی فراغت کے بعد درس وتدریس سے نئے علمی دور کا آغاز کیا اور سب سے پہلے اپنی مادر علمی جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں چار پانچ سال تدریسی خدمت انجام دی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدرسی کا یہ اولین تجربہ موافق نہیں ہوا، جس کی جانب خود انھوں نے نہایت بلیغ پیرایہ میں اشارہ کیا ہے، لکھے ہیں: ''مدرسی کا یہ چار پانچ سالہ دور میرے حق میں صبر ایوب اور گریۂ یعقوب کا دور تھا'' اس لیے یہاں سے علیحدہ ہوکر نومبر ۱۹۴۴ء مطابق ۱۳۶۴ھ میں ''مرکز تنظیم اہلِ سنت امرتسر'' سے وابستہ ہوگئے، جہاں انھوں نے ردّ شیعیت اور ردّ قادیانیت سے متعلق اہم مضامین ومقالات سپرد قلم کیے، پھر زمزم کمپنی لمیٹڈ لاہور کے پیہم اصرار پر، مرکز تنظیم سے الگ ہوکر زمزم کمپنی سے منسلک ہوگئے، یہاں تقریباً ڈیڑھ دو برس تک کام کرتے رہے، اس مدت میں کمپنی کی جانب سے نو سو صفحات میں ''منتخب التفاسیر'' مرتب کی، افسوس کہ یہ علمی سرمایہ تقسیم ہند کے ہنگامہ کی نذر ہوگیا، اسی زمانہ میں قاضی صاحب کے والد ماجد فریضۂ حج کی ادائیگی کے

لیے حرمین شریفین کے سفر پر گئے تو خانگی ضروریات کے تحت تین چار ماہ گھر پر رہے، اور عارضی طور پر چند اسباق احیاء العلوم میں پڑھاتے رہے، اس کے بعد جنوری ۱۹۴۷ء مطابق ۱۳۶۷ھ سے ملک کے نامور صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط کی زیر نگرانی روزنامہ زمزم لاہور میں اخبار نویسی وصحافت کی خدمت انجام دی، اور تقسیم ملک سے کچھ پہلے فارقلیط صاحب کی معیت میں اس خیال سے گھر آئے کہ تقسیم کے ہنگامہ کے فرو ہوجانے پر واپس کام پر آجائیں گے، مگر حالات نے لاہور جانے کی اجازت نہیں دی، اس لیے ۱۹۴۸ء مطابق ۱۳۶۸ھ میں مولانا محفوظ الرحمٰن نامی مرحوم کی نگرانی میں ''بہرائچ'' سے ہفتہ وار اخبار ''انصار'' جاری کیا، مگر یہ اخبار حکومت کے عتاب کی بناء پر سات آٹھ ماہ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا، تو وہاں سے منتقل ہوکر ''جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گجرات'' چلے آئے اور ایک سال تک تدریسی خدمت انجام دی، اپنی مشہور تصنیف ''رجال السند والہند'' کی تدوین کا آغاز ڈابھیل کے زمانۂ قیام ہی میں کیا تھا، غرض تعلیم سے فراغت کے بعد تقریباً آٹھ برس مبارک پور، امرتسر، لاہور، بہرائچ اور ڈابھیل میں گزرے۔

ان مختلف تعلیمی وصحافتی اداروں کے تجربات سے انھیں یہ اندازہ ہوگیا کہ ان کا اندر بیٹھا ہوا فرہادِ علم وہنر ان اداروں کے رسوم وقیود کا پابند نہیں رہ سکتا ہے، اس لیے انھوں نے طے کیا کہ ان اداروں کی بندشوں سے آزاد کسی جگہ جم کر تصنیفی وتحقیقی کام میں لگ جانا چاہیے، لیکن معاشی وخانگی ضروریات سے صرف نظر بھی ممکن نہیں تھا، اس چکی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن جاری رکھنے کے لیے انھیں عروس البلاد شہر بمبئی سب سے زیادہ موزوں نظر آیا، چنانچہ نومبر ۱۹۴۹ء مطابق ۱۳۶۹ھ میں وہ بمبئی پہنچ گئے، جسے خود انھوں نے اپنے علمی سفر کی آخری منزل کہا ہے، ابتداء میں دفتر جمعیۃ علماء مہاراشٹر میں فتویٰ نویسی کی پھر جون ۱۹۵۰ء مطابق ۱۳۷۰ھ میں ''روزنامہ انقلاب بمبئی'' سے اپنا رشتہ استوار کرلیا اور ''جواہر القرآن'' اور احوال ومعارف کے عنوان سے علی الترتیب تفسیری اور تاریخی وسیاسی موضوعات پر مشتمل روزآنہ دو تین کالم لکھتے رہے۔ یہ سلسلہ چالیس سال کی طویل مدت تک جاری رہا، اور جب ۱۹۵۲ء مطابق ۱۳۷۲ھ میں تنظیم خدام النبی کی زیر نگرانی

''ماہنامہ البلاغ'' جاری ہوا تو اس کی ادارت میں شامل ہو گئے، تقریباً بیس پچیس سال تک یہ علمی و معلوماتی مجلہ جاری رہا جو علمی حلقہ میں وقعت و پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، یہ ناچیز اسی ماہنامہ کے ذریعہ غائبانہ طور پر سب سے پہلے قاضی صاحب سے متعارف ہوا، جو بعد میں قربت و مودت میں تبدیل ہو گیا، ان قلمی مصروفیات کے ساتھ دس سال تک ''انجمن ہائی اسکول بمبئی'' میں دینیات و اخلاقیات کی تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

قاضی صاحب کی یہ مصروفیتیں اگرچہ یک گونہ علمی ہی تھیں، مگر حقیقت میں ان کا تعلق ''چکی کی مشقت'' سے تھا جو اہل و عیال کی کفالت کے لیے ناگزیر تھی، ان کا اصل کام وہ تھا جسے وہ ایک چھوٹے سے حجرے میں بیٹھ کر انجام دیتے تھے، وہ خود لکھتے ہیں:

''تیس سال سے زائد مدت تک بمبئی میں قیام رہا، جس شہر میں ''شبلی مرحوم'' ''کنارِ آب چوپاٹی و گل گشت اپالو'' کی سیر کر کے غزل کہا کرتے تھے ان کے ہم وطن نے ایک معمولی سے کمرے میں ''مرکز علمی'' کا بورڈ لگا کر تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری و مقالہ نویسی کا دورِ شباب گذارا... بمبئی غریب پرور ہونے کے ساتھ علم کُش شہر ہے جس کا احساس مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی تھا، اس لیے میں نے دولت و ثروت کے اس ''اندرون قعر دریا'' میں تیس سال سے زائد ''تختہ بند ہونے کے باوجود اپنے دامن کو تر نہیں ہونے دیا، اور مختلف قسم کی مصروفیات کے باوجود عرب و ہند کے ابتدائی چار سو سالہ تعلقات پر عربی و اردو میں متعدد کتابیں لکھ کر ایک بڑے خلا کو پُر کیا (قاعدہ بغدادی سے بخاری تک ص ۵۱-۵۲)

قاضی صاحب نے تحقیق و تصنیف کے لیے جو موضوع منتخب کیا وہ اردو زبان کے لیے بڑی حد تک اجنبی ہونے کے ساتھ نسبتاً خشک تھا، لیکن اسی خشک و سنگ لاخ زمین میں انھوں نے علم و ہنر کے ایسے ایسے دیدہ زیب و دل کش بیل بوٹے سجا دیے اور اپنی تحریروں میں ادب و انشاء کی چاشنی اس طرح پیوست کر دی کہ، وہ ایک شگفتہ و دل آویز موضوع بن گیا کہ پڑھنے والا زبان و بیان کی سحر آفرینیوں اور معلومات و تحقیقات کی رعنائیوں میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ جب تک کتاب مکمل نہ ہو جائے اسے چھوڑتا نہیں۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم نے ان کی کتاب ''خلافت عباسیہ اور ہندوستان کے مقدمہ میں کس قدر مبنی بر حقیقت بات لکھی ہے کہ:

''واقعہ یہ ہے کہ موصوف نے اس ملک کی خالص اسلامی عربی تاریخ کے موضوع کو اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں کا محور بنا کر جو کارنامہ انجام دیا ہے، وہ ہر اعتبار سے لائق تحسین ہے، ان کی ان گرانقدر تصانیف کو اسلامی تاریخ کا بیش بہا و نادر خزانہ کہا جاسکتا ہے، اس میں شک نہیں کہ جناب مؤلف اس بے آب و گیاہ صحرا میں تنہا چلے اور جب منزل مقصود پر پہنچے تو اپنے ساتھ باغ و بہار کا پورا قافلہ لے کر آئے۔''

عرب و ہند تعلقات پر مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے اپنی گراں مایہ تصنیف ''عربوں کی جہاز رانی'' میں قدرے روشنی ڈالی ہے، مولانا موصوف نے اس وسیع اور پھیلے ہوئے موضوع کے ایک خاص و محدود حصہ کو اپنی بحث و تحقیق کا عنوان بنایا ہے، اس لیے وہ اپنے موضوع کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس سے زیادہ گفتگو کر بھی نہیں سکتے تھے، اس کے بالمقابل قاضی اطہر رحمہ اللہ نے اس موضوع کی وسعتوں اور اس کی ہمہ جہتی کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے ایک ایک گوشے پر تفصیلی نظر ڈالی ہے، اپنے مطالعہ کی وسعت اور ذہن رسا کی برکت سے بیش بہا معلومات کا ایک ایسا سدا بہار علمی و تاریخی گلستاں سجا دیا ہے جس کی رعنائیوں میں لیل و نہار کی گردش سے اضمحلال آنے کی بجائے اس کی تازگی و شگفتگی بڑھتی ہی جائے گی۔

اس خاص موضوع کے علاوہ قاضی صاحب نے تاریخ، طبقات اور رجال کے موضوع پر بھی نہایت وقیع کتابیں تصنیف کی ہیں، جو علمی حلقوں میں اپنا ایک مقام رکھتی ہیں۔ آیندہ سطور میں ان کی تصانیف کی فہرست ملاحظہ کیجیے، جس سے ان کے کام کی اہمیت و وسعت کا کسی حد تک اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اردو تصانیف: (۱) عرب و ہند عہد رسالت میں، (۲) خلافت راشدہ اور ہندوستان، (۳) خلافت امویہ اور ہندوستان، (۴) خلافت عباسیہ اور ہندوستان، (۵) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، (۶) اسلامی ہند کی عظمت رفتہ، (۷) دیار یورپ میں علم

وعلما، (۸) مختصر سوانح ائمہ اربعہ، (۹) تاریخ تدوین سیر ومغازی، (۱۰) خیر القرون کی درسگاہیں اوران کا نظام تعلیم وتربیت، (۱۱) خواتینِ اسلام، (۱۲) مآثر ومعارف، (۱۳) آثار واخبار، (۱۴) معارف القرآن، (۱۵) علی وحسین، (۱۶) طبقات الحجاج، (۱۷) تذکرہ علمائے مبارک پور، (۱۸) تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں، (۱۹) افادات حسن بصری، (۲۰) اسلامی نظام زندگی، (۲۱) حج کے بعد، (۲۲) مسلمان، (۲۳) اسلامی شادی، (۲۴) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک (خودنوشت سوانح)۔

عربی تصانیف: (۲۵) رجال السند والهند، (۲۶) العقد الثمین فی فتوح الهند ومن ورد فیها من الصحابة والتابعین۔

تحقیق وتعلیق: (۲۷) جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول از ابوالفیض محمد بن محمد حنفی فارسی متوفی ۸۳۷ھ پہلی مرتبہ قاضی صاحب کی تعلیق وتحقیق کے ساتھ چھپی، (۲۸) تاریخ اسماء الثقات از ابن شاہین بغدادی متوفی ۳۸۵ھ یہ بھی ان کی تحقیق وتعلیق سے مزین ہوکر پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔

ان تالیفات وتصنیفات کے علاوہ سیکڑوں علمی وتحقیقی مضامین ومقالات بھی تحریر کیے جوملک کے مؤقر واہم رسائل معارف اعظم گڈھ، برہان دہلی، البلاغ بمبئی، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، صدق لکھنووغیرہ میں شائع ہوئے۔

قاضی اطہر مبارک پوری طرز تحریر واسلوب بیان میں شبلی اسکول سے متاثر تھے، علامہ شبلی مرحوم اوران کے مخصوص تلامذہ کی طرح قاضی صاحب کی علمی وتاریخی کتابوں میں بھی ادب کی خوشبورچی بسی ہے، اسی کے ساتھ ان میں بیان کی قوت، سلاست ووضاحت اور علمی وقار پایا جاتا ہے، غیر علمی اور مبتذل الفاظ ان کے یہاں تلاش کرنے سے بھی شاید نہ ملیں، ماخذ ومصادر کے سلسلے میں بھی وہ قریب سے قریب تر اور قدیم ماخذوں پر بالعموم اعتماد کرتے ہیں، اور نقل وروایت میں بھی پوری احتیاط سے کام لیتے ہیں۔

اس ناچیز سے قاضی صاحب بہت مانوس تھے، کم وبیش پچیس سال تک مجھے ان کی صحبتیں نصیب رہیں، صرف علمی محفلوں میں نہیں نجی مجلسوں اور سفر وحضر میں ان کی معیت

رہی، ہر حال میں ان کی شفقتوں کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی علمی عظمتوں سے صرف نظر کر کے مجھ جیسے چھوٹے کے ساتھ بہ تکلف نہیں بتطلف چھوٹے بن جاتے تھے، قاضی صاحب ہی کی بے پناہ عنایتوں اور مخلصانہ ہمت افزائیوں نے مجھے قلم پکڑنے کا حوصلہ دیا، ورنہ ان سے راہ و رسم سے پہلے میں اس وادی سے بالکل نا آشنا تھا۔ وجزاہ اللہ عنی وعن العلم خیر الجزاء.

قاضی صاحب اگرچہ اسّی برس سے متجاوز تھے، لیکن ان کی عام صحت، جسمانی ساخت اور چستی و پھرتی کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے محاسن ومحامد اور شرف ومجد کا سلسلہ ابھی جاری رہے گا، لیکن اجل موعود نے اندازوں اور تخمینوں کو ہمیشہ شکست دی ہے، چنانچہ معمولی سی علالت میں وہ اچانک ۲۷ر صفر ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۴ر جولائی ۱۹۹۶ء یکشنبہ کو تقریباً دس بجے شب میں اس سرائے فانی سے رحلت کر گئے۔

قاضی صاحب ایک بلند پایہ محقق و مصنف ہونے کے ساتھ قادر الکلام شاعر بھی تھے اور ابتدا، میں تصنیف کے مقابلے میں شعر گوئی سے شغف زیادہ تھا، ان کی غزلیں و نظمیں اس وقت کے جرائد میں چھپا کرتی تھیں، لیکن بعد میں تصنیف و تالیف میں اس قدر انہماک ہوا کہ شاعری کی طرف التفات کا موقع ہی نہیں رہا۔

مولانا اظہار الدین بینا پاروی

مولانا اظہار الدین اصلاحی بن منشی محمد کامل ضلع اعظم گڈھ کے معروف گاؤں بینا پارہ میں پیدا ہوئے، جو قصبہ سرائے میر سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر جانب شمال واقع ہے، اور ''ابن سینا طبیہ کالج بینا پارہ'' کی وجہ سے خاص شہرت کا حامل ہے، مولانا موصوف کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں ہوسکی ان کے معاصر علماء کی سنین ولادت کے لحاظ سے اندازہ ہے کہ ۱۹۱۰ءم ۱۳۲۸ھ کے حدود میں پیدا ہوئے ہوں گے، وہ ایک پڑھے لکھے خاندان کے چشم و چراغ تھے، نوابین اودھ کے دور میں ایک فرمان کے ذریعہ ان کے آباء واجداد کو اطراف کے مواضعات کی شرعی رہنمائی کی خدمت سپرد کی گئی تھی، نیز موضع

بیناپارہ میں جمعہ وعیدین کی امامت وخطابت ان کے گھرانے سے متعلق تھی۔

چونکہ مولانا کے والد بزرگوار مدرستہ الاصلاح میں مدرس تھے، اس لیے ان کی تمام تر علمی نشوونما مدرستہ الاصلاح ہی کے زیر سایہ ہوئی، ابتدائی اردو فارسی سے لے کر تکمیل تک کی تعلیم انھوں نے یہیں حاصل کی، ان کے اساتذہ میں مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا امین احسن، مولانا شبلی متکلم ندوی، مولانا نجم الدین اصلاحی، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد اپنی مادر علمی مدرستہ الاصلاح ہی میں مدرس مقرر ہوگئے، اور ۱۹۴۶ء م ۱۳۲۶ھ تک یہاں تدریسی خدمات انجام دیں پھر نامعلوم وجوہ کی بناء پر مدرسہ کی انتظامیہ نے چند قدیم اساتذہ کو مدرسہ کی خدمت سے سبکدوش کردیا، جن میں سے ایک مولانا اظہار الدین بھی تھے، یہاں سے علیحدگی کے بعد اپنے استاذ مولانا نجم الدین اصلاحی کی دعوت پر ''مولانا آزاد تعلیمی مرکز اسرھٹہ، کھیتا سرائے ضلع جون پور میں مدرس رہے۔

مولانا اظہار مرحوم کی علمی استعداد نہایت پختہ اور ٹھوس تھی، ذہن رسا اور حافظہ قوی تھا، ادق سے ادق تر مضامین کا درس اس شان سے دیتے تھے، کہ طلبہ کو ان کے دقیق اور دشوار ہونے کا احساس تک نہیں ہوتا تھا، فقہ، حدیث اور اسرار شریعت ان کے خصوصی مضامین تھے، مولانا نجم الدین اصلاحی ان کے تدریسی کمال کے بیحد مداح تھے، متعدد بار ان کی زبان سے یہ بات سنی کہ مولوی اظہار دوسرے شبلی متکلم ہیں، اسلامی علوم وفنون پر وہ جس قدر حاوی ہیں ان کے ہم عصروں میں اس میں ان کا کوئی ہم پلہ نہیں ہے۔ ان کا ذہنی انتقال بھی قابل رشک تھا، برجستہ علمی تقریریں کرتے تھے۔

شعروسخن کا بھی ستھرا ذوق رکھتے تھے، متقدمین شعراء میں مرزا غالب ان کے سب سے زیادہ پسندیدہ شاعر تھے، بوقت شب کبھی کبھی عالم نشاط میں غالب کے اشعار بلند آواز سے دیر تک پڑھتے رہتے تھے، زندگی انتہائی سادہ تھی، انھیں دیکھ کر پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ یہ پڑھے لکھے ہیں، آخری عمر میں دماغی توازن میں قدرے خلل واقع ہوگیا تھا، اس عالم

بیخودی میں دن کہیں گذرتا اور رات کہیں اور بسر ہوتی، اسی حال میں ۲۶ نومبر ۱۹۹۴ء م ۱۴۱۵ھ یوم شنبہ کو اس دار رنج ومحن سے رحلت کر گئے۔

سر شوریدہ بر بالین آسائش رسید اینجا

مولانا افتخار احمد جگدیش پوری

مولانا افتخار احمد بن نظام الدین بن محمد شریف بن شیخ الٰہی بخش اپنے آبائی وطن موضع جگدیش پور ضلع اعظم گڈھ میں تقریباً ۱۳۵۱ھ میں پیدا ہوئے، ناظرہ اور حفظ قرآن کی تعلیم گاؤں ہی کے مکتب میں حافظ محمد حنیف صاحب رحمۃ اللہ علیہ والد ماجد مولانا قاری ابوالحسن استاذ تجوید وقرأت دارالعلوم دیوبند سے پائی، حافظ محمد حنیف صاحب حفظ کے کامیاب مدرس تھے، ان کے صلاح ونیکی کے معترف ان کے معاصرین بھی تھے، صوم وصلوٰۃ کے نہایت پابند اور تہجد گزار تھے، اس نقش اولیں کا اثر مولانا افتخار رحمہ اللہ کی زندگی میں نمایاں تھا۔

مکتب کی تعلیم مکمل کر کے مدرسہ بیت العلوم سرائے میر میں داخل ہوئے اور وہاں کے اساتذہ مولانا محمد سعید بمبئی پوری، مولانا محمد سجاد جونپوری ثم اعظمی، مولانا عبدالقیوم بکھراوی، مولانا علی احمد کوئریا پاری ثم سرائے میری، مولانا محمد مسلم جون پوری رحمہم اللہ سے ابتدائی عربی سے متوسطات تک کی تعلیم حاصل کی، اس وقت مدرسہ بیت العلوم کے صدر مدرس حضرت مولانا مسلم صاحب ہی تھے، جو معقولات ومنقولات دونوں علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے، ساتھ ہی بلند پایہ مدرس ومعلم بھی تھے، طلبہ کی علمی تربیت میں ید طولیٰ کے مالک تھے، مولانا مفتی منظور احمد مظاہری قاضی شہر کان پور اور مولانا عبدالحق اعظمی استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے انھیں کی تربیت ونگرانی میں نصاب تعلیم کے اکثر حصہ کی تحصیل کی ہے، مولانا افتخار احمد مرحوم نے انھیں دونوں حضرات کی رفاقت اور ایسے ماہر فنون ومربیٔ کامل کی زیر تربیت متوسطات تک کے تعلیمی مراحل طے کیے، اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند گئے اور یہاں دو سال رہ کر بقیہ نصاب اور دورۂ حدیث کی تکمیل کر کے ۱۳۷۳ھ میں فارغ التحصیل ہو گئے، دارالعلوم دیوبند میں انھیں اپنے عہد کے اساطین علماء وفضلاء

سے تلمذ کی سعادت میسر آئی جن میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی (جو اس وقت دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدرالمدرسین تھے) شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی امروہوی، شیخ المعقول علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا فخرالحسن مرادآبادی رحمہم اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا افتخار احمد مرحوم کو قدرت نے ذہانت وفطانت اور قوت حفظ سے حصۂ وافر عطا کیا تھا، پھر ماہر فنون شفیق اساتذہ بھی خوش نصیبی سے میسر آگئے تھے، اس لیے علمی استعداد بڑی پختہ اور ٹھوس تھی، نصاب مروّجہ میں داخل جملہ فنون کی کتابیں بے تکلف پڑھاتے تھے، مدرسہ مطلع العلوم کمن گڈھا علیؔ پور بنارس سے تدریسی سلسلہ کا آغاز کیا، جس کا اختتام جامع العلوم ٹپکاپور شہر کانپور کی تدریس پر ہوا، درس وافادہ کے اس تقریبی پچاس سالہ سفر میں انھوں نے مطلع العلوم بنارس، جامعہ حسینیہ گریڈیہہ بہار، مفتاح العلوم بھیونڈی مہاراشٹر، بیت العلوم سرائے میر اعظم گڈھ، دارالعلوم مئوناتھ بھنجن، جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس، جامعہ قاسمیہ (مدرسہ شاہی) مرادآباد، بیت العلوم دلی، جامعہ شرقیہ لونیہ ڈیہہ اعظم گڈھ، جامع العلوم کانپور میں تدریسی وتربیتی خدمات انجام دیں۔ دارالعلوم مئو، مدرسہ شاہی مرادآباد، اور جامع العلوم کانپور میں کتب حدیث کا ایک عرصہ تک درس دیا آخر الذکر دونوں مدرسوں میں دیگر حدیث کی کتابوں کے علاوہ صحیح بخاری کا درس آپ ہی سے متعلق رہا۔

مولانا مرحوم ایک کامیاب مدرس ومعلم ہونے کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے مقرر وخطیب بھی تھے، مدرسہ بیت العلوم سرائے میر میں ایک عرصہ تک تبلیغی خدمت انجام دی تھی، بیت العلوم سرائے میں وقفہ کے ساتھ دوبار آپ کا قیام رہا، پہلی بار آپ سے وعظ وتبلیغ کی خدمت متعلق رہی، اور دوسری مرتبہ بحیثیت نائب ناظم کے، ایک زمانہ میں ہمارے دیار کے دینی جلسوں میں مولانا افتخار احمد صاحب جگدیش پوری اور مولانا ضمیر احمد صاحب حاجی پوری مرحومین کی شرکت ان کے کامیابی کی ضمانت ہوا کرتی تھی، مولانا مرحوم کی تقریر علمی ہونے کے ساتھ عام فہم ہوتی تھی، زبان سشتہ اور طرز بیان دل نشیں تھا۔

مدارس دینیہ سے متعلق رہنے کے باوجود سیاستِ حاضرہ سے بھی باخبر رہتے تھے، ان کے سیاسی تبصرے بے لاگ اور مبنی بر حقیقت ہوا کرتے تھے، جمعیۃ علماء ہند سے دیوبند میں تعلیم کے دوران ہی ذہنی وفکری طور پر وابستہ ہو گئے تھے اور زندگی کے آخری لمحات تک یہ وابستگی قائم رہی، اس وقت کے صدر جمعیۃ علماء ہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی نور اللہ مرقدہ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، آخر میں ان سے بیعت بھی ہو گئے تھے، اور جب تک صحت نے ساتھ دیا رمضان کا آخری عشرہ بالعموم حضرت مولانا ہی کے معتکف میں گزارتے تھے۔

آخری عمر میں گھٹنے کی تکلیف کا عارضہ پیش آ گیا تھا، جس سے اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں زحمت ہوتی تھی، اس لیے پہلے کی بہ نسبت اسفار کم کر دیے تھے، وفات سے تین سال قبل ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا، ابتدائی علاج وتدبیر کے بعد کان پور سے گھر چلے آئے تھے، اور لگ بھگ تین سال بستر علالت پر گزار کر ۲۷ر رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ کی مبارک ترین رات کو اللہ کے پیارے ہو گئے۔

بیماری کا یہ تین سالہ دور تلاوت قرآن، درود شریف کے ورد اور دعاء واستغفار میں گزرا، اور سخت سے سخت تر حالت میں بھی کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں آیا، تحمل وبرداشت کا یہ عالم تھا کہ اپنے تیمارداروں کو خود تسلی دیتے تھے، معذوری کے باوجود بدن اور کپڑوں کی طہارت وپاکیزگی کا بڑا اہتمام کرتے، وقت پر نماز ادا کرنے کا بھی پورا پورا خیال رکھتے، مسجد سے اذان کی آواز سنتے ہی نماز کی تیاری شروع کر دیتے، نماز سے فارغ ہو کر دیر تک اذکار وادعیہ میں مشغول رہتے، عشاء کی نماز کے بعد کافی رات تک تلاوت قرآن اور درود شریف کے ورد میں منہمک رہتے تھے، وفات کی شب بھی حسب معمول گیارہ بجے رات تک ذکر واذکار میں مصروف رہے، جب اس سے فارغ ہو گئے تو فرمایا کہ آب زم زم میں تھوڑا سا زعفران ملا کر مجھے پلا دو، گھر میں زعفران نہیں ملا تو مولانا عبدالحق صاحب کے گھر صاحبزادے کو بھیجا کہ وہاں مل جائے تو لے آؤ، چنانچہ مولانا عبدالحق صاحب زید مجدہ کے صاحبزادے مولوی حافظ عبدالبر زعفران لے کر آئے اور زمزم میں

ملا کر انھیں پلا دیا، پینے کے بعد مولوی عبدالبر سے کہا کہ سورۂ یٰسین پڑھو، انھوں نے دوبار پڑھا، فرمایا اور پڑھو انھوں نے پھر سورۂ یٰسین کی تلاوت شروع کی تقریباً نصف سورہ تک پہنچے تھے کہ مولانا نے بلند آواز سے یا حیّ یا قیوم دو تین بار پڑھا بعد ازاں کلمۂ طیبہ پڑھنا شروع کیا اور اسی کلمۂ مبارکہ کو پڑھتے ہوئے روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

مولانا مرحوم نہایت خوش اخلاق، ملنسار، نرم گفتار اور باوضع انسان تھے، موافق ومخالف سب سے تپاک سے ملتے اور دل آویز باتیں کرتے تھے، اس ناچیز کا مولانا موصوف سے گونا گوں تعلق تھا، وہ میرے ہم وطن بھی تھے اور ہمسایہ بھی، اور میرے مشفق استاذ بھی، فقہ حنفی کا معتمد ومشہور متن ''المختصر القدوری'' کا کچھ حصہ میں نے ان سے پڑھا ہے، یہ کتاب دراصل بیت العلوم کے مفتی اور مقبول ترین استاذ مولانا محمد سجاد صاحب رحمہ اللہ سے متعلق تھی، مولانا اس سال سفر حج پر گئے تو ان کی کتابیں مولانا مرحوم سے متعلق کر دی گئیں اس وقت مولانا یہاں شعبۂ تبلیغ میں کام کرتے تھے، اس طرح مولانا محمد سجاد صاحب کی واپسی تک مولانا افتخار احمد صاحب مرحوم سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہو گئی۔

مولانا مرحوم ابتداء میں خوش پوشاک اور لذیذ کھانوں کے شوقین تھے، خود گوشت بہت لذیذ پکاتے تھے، لیکن آخر میں یہ سب باتیں قصۂ پارینہ اور ماضی کی داستان ہو گئی تھیں، وہ ہمارے گاؤں جگدیش پور اور محلہ کے پہلے عالم دین تھے، ان سے پہلے اس محلہ میں کوئی عالم تھا اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا، ان کے عالم ہونے کی برکت سے تو پھر ایک سلسلہ جاری ہو گیا اور اس وقت بحمد اللہ اس مختصر سی آبادی میں تقریباً دو درجن سے زاید فارغین دار العلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارن پور ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ اس مبارک سلسلے کو جاری وساری رکھے، آمین۔

مولانا امین احسن اصلاحی بمہوری

مدرسۃ الاصلاح کے گل سرسبد، اور فکر حمید کے سب سے نامور حامل مولانا امین احسن ضلع اعظم گڈھ کے مشہور گاؤں ''بمہور'' میں ۱۹۰۳ء م ۱۳۲۱ھ میں پیدا ہوئے، ان

کے والد حافظ محمد مرتضیٰ دیندار اور متوسط درجہ کے زمیندار تھے، وہ اپنے فرزند کو دینی تعلیم دلانا چاہتے تھے، جس کا تذکرہ انھوں نے اپنے ہم وطن عالم مولانا شبلی متکلم سے کیا، جو اس وقت مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے منصب صدارت واہتمام پر فائز تھے، انھوں نے مدرسۃ الاصلاح ہی میں ۱۹۱۴ء م ۱۳۳۳ھ میں مولانا امین احسن کا داخلہ کرادیا، جس زمانہ میں وہ یہاں آئے وہ مدرسۃ الاصلاح کے شباب علمی کا عہد تھا، مولانا شبلی متکلم ندوی، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، مولانا عبدالصمد ندوی، مولانا حکیم محمد احمد لہراوی جیسے فضلاء عصر تدریسی خدمات میں مصروف تھے اور خود مولانا حمید الدین فراہی کے علم وفضل کی تابناک شعاعوں سے یہاں کا پورا ماحول بقعۂ نور بنا ہوا تھا، مولانا امین احسن کی انھیں اساتذہ کی تعلیم وتربیت اور اسی علم وحکمت بداماں فضا میں علمی نشو ونما ہوئی، مولانا نے ان مذکورہ اساتذہ سے نصابی کتابوں کی تحصیل وتکمیل ۱۹۲۲ء م ۱۳۴۳ھ کے بعد بطور خاص مولانا حمید الدین فراہیؒ کے درس قرآن سے بھی اپنے قدیم رفیق درس مولانا اختر احسن اصلاحی کی رفاقت میں بھرپور استفادہ کیا، جس کا سلسلہ زمانۂ مدرسی یعنی ۱۹۲۴ء سے شروع ہوا اور مولانا فراہی کی وفات ۱۹۳۰ء تک جاری رہا۔ ان دونوں کا ذوق وشوق اور استعداد وصلاحیت دیکھ کر مولانا فراہی نے بھی ان کو اپنی توجہ وعنایت کا مورد بنایا۔

مولانا امین احسن کی یہ خوش بختی ہے کہ انھیں مولانا فراہی کی جانشینی کا امتیاز حاصل ہوا، اور وہی مولانا فراہی کے تلمیذ باختصاص کی حیثیت سے علمی حلقوں میں معروف ومشہور ہوئے، مولانا اصلاحی قرآنیات اور عربی زبان وادب ہی کے ماہر عالم نہ تھے؛ بلکہ دیگر دینی علوم اور جدید فنون پر بھی ان کی اچھی نظر تھی، مولانا فراہی سے اکتساب فیض کے ساتھ انھوں نے اس وقت کے مشہور اہل حدیث عالم ومحدث اور جامع ترمذی کے شارح مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری سے بھی بطور خاص حدیث پڑھی تھی، مولانا خود اپنی علمی زندگی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> فراغت کے بعد میرے والد نے جو صاحب ''تحفۃ الاحوذی'' مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ سے بڑا تعلق رکھتے تھے، مجھ سے کہا کہ چلو مولانا

عبدالرحمٰن صاحب سے حدیث کی کوئی کتاب پڑھ لو. میں نے دل میں کہا کہ میں جتنا پڑھ چکا ہوں وہ اس سے زیادہ کیا پڑھائیں گے. مگر والد کی خاطر ان کے ساتھ ان کی خدمت میں گیا. انھوں نے ترمذی کھول کر کہا کہ یہ حدیث پڑھو... میں نے ان سے کئی مہینہ استفادہ کیا۔"

مولانا اصلاحی مرحوم اپنے جن اساتذ کا اکثر تذکرہ کرتے تھے ان میں مولانا فراہی، مولانا نگرامی کے ساتھ مولانا مبارکپوری کا نام بھی لیتے تھے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا، سب سے پہلے وہ "مدینہ" بجنور سے بحیثیت ایڈیٹر وابستہ رہے، پھر وہاں سے منتقل ہو کر لکھنو آگئے اور اخبار "سچ" سے منسلک ہو گئے، دو ڈھائی برس اس مشغلہ میں مصروف رہ کر ۲۵-۱۹۲۴ء م ۱۳۴۳ھ کے لگ بھگ بحیثیت مدرس وہ اپنی مادر علمی مدرستہ الاصلاح سرائے میر آگئے، اور ۱۹۴۳ء م ۱۳۶۳ھ تک درس کی یہ خدمت انجام دیتے رہے، اسی دوران ۱۹۳۶ء م ۱۳۵۴ھ میں مولانا حمید الدین فراہی کے علوم وافکار اور ان کے مسودات کو محفوظ کرنے، ان کو مرتب کر کے شائع کرنے اور ان کے تراجم کے لیے "دائرہ حمیدیہ" کا قیام عمل میں آیا، جس کے مقاصد اور تقسیم کار کی تفصیل ذکر کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

مقاصد دائرہ:

(۱) مولانا حمید الدین فراہی کی عربی تصانیف اور انکے اردو ترجموں کی اشاعت۔

(۲) ایک ایسی جماعت کا قیام جو مولانا کے نہج پر قرآن حکیم پر تدبر کرے اور اپنے نتائج تحقیق، تصنیفات اور مضامین کی صورت میں شائع کرے۔

(۳) ایک ماہوار رسالہ کا اجراء جو قرآن مجید سے متعلق بلند پایہ مضامین شائع کرے، اور مسلمانوں کی مفید علمی و مذہبی خدمات انجام دے۔

(۴) ایک ہفتہ وار اخبار کی اشاعت جو کم سے کم قیمت اور سادہ سے لفظوں میں قوم کی مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اصلاح کر سکے۔

تقسیم کار:

(۱) ان مقاصد کی انجام دہی کے لیے فی الحال ایک پریس منگا لیا گیا ہے، جس کے انتظام وانصرام کی تمام ذمہ داری برادرم مولوی حافظ عبدالاحد صاحب اصلاحی، اور عزیزی مولوی عزیز الرحمٰن سلمہ، نے اپنے ذمہ لی ہے۔

(۲) مولانا کے مسودات کی ترتیب وتصحیح کی خدمت اخویم مولوی اختر احسن صاحب اصلاحی انجام دیں گے۔

(۳) دائرہ کے کاموں کی عام نگرانی، رسالہ کی ادارت، مولانا کی کتابوں کے ترجمہ کی خدمت مجھ سے متعلق ہوگی (مولانا امین احسن اصلاحی، ماہنامہ ''الاصلاح'' دائرۂ حمیدیہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر، جلد ۱، شمارہ: ۱، شوال المکرم ۱۳۵۴ھ مطابق جنوری ۱۹۳۶ء، ص: ۵-۶)

مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم نے اسی زمانہ میں مولانا فراہی کی چند تفاسیر اور کتابوں کے اردو ترجمہ کر کے شائع کیے، یہ تراجم انھوں نے اس خوبی اور قابلیت سے کیے ہیں کہ ان پر اصل کا دھوکہ ہوتا ہے۔ دراۂ حمیدیہ کی جانب سے منصوبہ کے مطابق رسالہ ''الاصلاح'' بھی جاری ہوا، مگر یہ تین چار برس ہی جاری رہ سکا، پھر بھی اس قلیل عرصہ میں تراجم اور قرآنیات کے موضوع پر خاص کام اس میں ہوگیا، کثرت سے بلند پایہ تحقیقی مضامین شائع ہوئے۔

اسی زمانہ میں جبکہ مولانا اصلاحی مرحوم سرائے میر میں درس وتدریس کی خدمت پر مامور رہ کر مولانا فراہی کی تصانیف کی اشاعت اور ''الاصلاح'' کی ادارت میں مشغول تھے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' کا غلغلہ بلند ہوا، جس سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے علاوہ علماء کی ایک جماعت بھی متاثر ہوئی، لیکن مولانا امین احسن اصلاحی نے کوئی اثر قبول نہیں کیا، کیونکہ ان پر اس وقت اپنے استاذ مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کے زیر اثر ترک موالات، تحریک خلافت اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی خیالات کا اثر تھا، اس کے علاوہ اس وقت وہ خود جس فکر کے حامل تھے اس

کے ساتھ دوسرے افکار اور تحریکوں کا میل نہیں ہوسکتا تھا، انھوں نے اسی زمانہ میں مولانا مودودی کی کتاب ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش پر'' الاصلاح کے کئی نمبروں میں تنقید لکھی۔

لیکن ۱۹۴۱ء م ۱۳۶۰ھ میں جب مولانا مودودی نے اپنے خیالات کی اشاعت اور اپنا حلقۂ اثر بڑھانے کے لیے ملک کا دورہ کیا تو وہ سرائے میر بھی آئے، جس کا سیدھا اثر یہ ہوا کہ دیگر علماء مدرسۃ الاصلاح کے ساتھ فکر حمید کا یہ سب سے بڑا داعی وشارح بھی ان کی ہم نوائی سے اپنے آپ کو بچا نہ سکا، اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ اپنی مادر علمی اور اپنے علوم وافکار کے محور اور سب سے عزیز ترین استاذ و مربّی کے آستانہ کو چھوڑ کر ۱۹۴۵ء م ۱۳۶۵ھ میں مولانا مودودی صاحب کی تحریک کے مرکز پٹھان کوٹ پہنچ گئے، جب وہ اپنے علمی مستقر کی حدود سے باہر نکل رہے ہوں گے تو ان کے ضمیر وعقل نے یہ احتجاج ضرور کیا ہوگا کہ ''ہر یکے را بہر کار ساختند'' تو اپنے اصل کام کو چھوڑ کر کہاں جارہا ہے تو ان مشاغل کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہے؛ مگر جوش کے عالم میں ہوش کی باتوں پر کون کان دھرتا ہے، قضاوقدر کے مطابق انھیں وہاں جانا تھا، گئے اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے جماعت اسلامی میں اپنا اہم اور نمایاں مقام ومرتبہ بنالیا، ''ترجمان القرآن'' پر تو نام مولانا مودودی کا ہوتا، لیکن عملاً وہی اس کے مدیر ہوگئے تھے، اسی لیے جب ملک تقسیم ہوا تو جماعت کا نظام سنبھالنے اور اس کی امارت کا بار اٹھانے کے لیے مولانا مودودی نے انھیں ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ کیا، لیکن تقسیم کے نتیجے میں کشت وخون کی ایسی قیامت بپا ہوئی کہ ان کے لیے ہندوستان آنا ممکن ہی نہ ہوسکا۔

پاکستان بننے کے بعد جب انتخاب کا مرحلہ آیا تو مودودی صاحب نے مع جماعت اس میں پوری سرگرمی سے حصہ لینے کا فیصلہ کیا، تو مولانا امین احسن اصلاحی نے محسوس کیا کہ اب حکومت الٰہیہ اور اقامت دین کا نعرہ بلند کرنے والے اپنے موقف سے منحرف ہوکر حصولِ اقتدار کی فکر میں مبتلا ہوگئے ہیں، نیز انھوں نے دیکھا کہ بعض کلامی مسائل میں مولانا مودودی جمہور امت کے بالمقابل تنہا کھڑے ہیں اور اپنے اس شذوذ پر انھیں اصرار بھی ہے، تو دیگر بہت سارے علماء کی طرح وہ بھی جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوگئے،

مولانا امین احسن مرحوم نے اس علیحدگی کے بعد اپنے اصل کام کی جانب رخ کیا، جس سے وہ جماعت کے جھمیلوں میں پھنس جانے کی وجہ سے بہت دور ہو گئے تھے، بہر حال انھوں نے حلقۂ تدبر قرآن قائم کیا، اس کے زیر اہتمام انھوں نے بعض ذی استعداد طلبہ اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو کتاب الٰہی، اور حدیث نبویؐ کا درس دینا شروع کیا، اور اپنے علوم ومقاصد کے اظہار واشاعت کے لیے رسالہ ''میثاق'' جاری کیا اور اسی کے ساتھ ''تدبر قرآن'' کے نام سے تفسیر لکھنی شروع کی، جو ''میثاق'' میں بالاقساط شائع ہوئی، پھر نو جلدوں میں کتابی صورت میں چھپی۔

مولانا حمید الدین فراہی نے اواخر قرآن کی بعض سورتوں کی تفسیر لکھی تھی، باقی سورتوں کے متعلق متفرق اشارات ہی لکھ سکے تھے، مولانا فراہی کے قدردانوں کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ انھیں کے اصول ومتعینہ خطوط کے مطابق مکمل قرآن کی تفسیر لکھی جائے، مولانا امین احسن اصلاحی نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا جو ان کا ایک کارنامہ ہے۔

''میثاق'' کو جب ان کے ایک شاگرد ڈاکٹر اسرار احمد نے اچک لیا، تو مولانا اصلاحی کی نگرانی میں ان کے خاص فیض یافتہ جناب خالد مسعود صاحب کی ادارت میں رسالہ ''تدبر'' جاری ہوا، مولانا مرحوم اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' مکمل کر چکے تو، تدبر حدیث، پر کام شروع کیا، مؤطا امام مالک اور صحیح بخاری کی حدیثوں کی شرح وترجمانی سے متعلق حصے ماہنامہ ''تدبر'' میں شائع ہو رہے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کی قلمی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا تھا اور تصنیفی کام کی بسم اللہ کلمۂ ''لا الٰہ الا اللہ'' کی تشریح سے ہوئی، پہلے ''حقیقت شرک'' تصنیف کی پھر ''حقیقت توحید'' ان کی بقیہ تصانیف یہ ہیں: حقیقت نماز، حقیقت تقویٰ، اسلامی ریاست میں فقہی اختلاف کا حل، تدوین قانون اسلامی، تزکیۂ نفس، دعوت دین اور اس کا طریقۂ کار، قرآن میں پردے کے احکام، مبادی تدبر قرآن، مبادی تدبر حدیث، مولانا حمید الدین فراہی، اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام، عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ، فلسفے کے بنیادی مسائل قرآن حکیم کی روشنی میں، تفہیم دین، مقالات اصلاحی جلد اوّل، ان

مستقل تصنیفات کے علاوہ مولانا فراہی کی متعدد کتابوں اور رسالوں کا اردو ترجمہ کیا، آخر میں تدبر قرآن کی نو جلدیں لکھیں، اور تدبر حدیث پر کام کر رہے تھے کہ پیام اجل آگیا، اور ۱۶ ردسمبر ۱۹۹۷ء م ۱۴۱۸ھ کو انھوں نے جان جانِ آفریں کے حوالہ کردی۔

ع خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

مولانا مرحوم نے بڑی مشغول اور متحرک زندگی گزاری، انھوں نے طویل عمر پائی جو درس وتدریس، تقریر وخطابت، تصنیف وتالیف اور اشاعت علم ودین کے لیے وقف رہی، وہ بڑے وجیہ وشکیل، بارعب، جامہ زیب، اور نظافت پسند تھے، ان میں حد درجہ غیرت وخودداری تھی، طبیعت شاہانہ پائی تھی، ہمیشہ اچھی اور قیمتی چیزیں استعمال کرتے تھے، کشادہ دست تھے پس انداز کرنے کی کبھی عادت نہیں رہی۔

مولانا اختر احسن اصلاحی اور مولانا امین احسن اصلاحی دونوں نے ابتدائی تعلیم سے لے کر انتہا تک ایک ہی اساتذہ سے تعلیم وتربیت پائی، مولانا فراہی سے اکتساب فیض میں بھی دونوں برابر کے شریک ورفیق رہے، بایں ہمہ مزاج وطبیعت کی کارفرمائی دیکھئے کہ ایک ایسا بحرِ بیکراں ہے جس کی ظاہری سطح بالکل پرسکون اور خاموش، جبکہ دوسرا ایک بحر مواج وپرشور، ایک اگر متانت ووقار اور فروتنی وانکساری کا نمونہ ہے تو اس کے برعکس دوسرے کی بزم علم ہل من مبارز کی صداؤں اور بلند بانگ دعووں سے رزمگاہ کا منظر پیش کرتی تھی، ایک نے اگر ایک خاص دائرہ میں رہ کر اپنے علوم وافکار کی تخم ریزی کو پسند کیا تو دوسرے نے پورے برصغیر کو اپنے علم وفکر کی جولانگاہ بنایا۔

ہر گلے را رنگ وبوے دیگر است

(معارف اعظم گڈھ، جنوری ۱۹۹۸ء)

مولانا بدرالدین اصلاحی نیاوجی

مولانا بدرالدین اصلاحی ضلع اعظم گڈھ کے ایک بڑے اور مشہور گاؤں ''نیاوج'' میں تقریباً ۱۹۰۴ء م ۱۳۲۲ھ میں پیدا ہوئے، ڈھائی تین سو گھروں پر مشتمل مسلمانوں کا

یہ گاؤں قصبہ سرائے میر سے جانب شمال ۵/ ۶ میل پر واقع ہے، مولانا کے والد کا نام حاجی نصر اللہ ہے، دستیاب شجرۂ نسب یہ ہے:

مولانا بدر الدین، بن حاجی نصر اللہ، بن حب علی، بن شیخ بخشی، بن شیخ یارو، بن شیخ نورو، بن شیخ کھنئی، بن شیخ مجاہد، بن شیخ بساوتی بن شیخ ابراہیم، بن شیخ احمد۔

مولانا بدر الدین ایک کھاتے پیتے بڑے گھرانے کے چشم و چراغ تھے، اعظم گڈھ کے شرفاء میں دستور تھا کہ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی تھی، اسی دستور کے مطابق مولانا بدر الدین نے ابتدائی مروجہ تعلیم، ناظرہ اور اردو فارسی کی کتابیں گھر پر مولوی صادق چناروی سے پڑھیں، اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں داخل کیے گئے، مگر گھر کے رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کے آگے مدرسہ کی بوریا نشینی پسند نہیں آئی، مدرسہ میں جی نہیں لگا، دماغ میں بوئے ریاست بھی تھی سختی ہوئی تو مدرسہ چھوڑ کر بھاگ گئے، ان کے والد شاہ گنج ضلع جون پور سے پکڑ کر لائے، اور مدرستہ الاصلاح کے صدر مدرس مولانا شبلی متکلم کے حوالہ کیا، مولانا شبلی صاحب نے خصوصی توجہ کی اور ان کے لیے الگ سے درس کا انتظام کیا، اس طرح اساتذہ کی انفرادی توجہ اور اپنی خداداد ذہانت وطباعی سے سات سال کا نصاب چند برسوں ہی میں مکمل کرلیا، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی اور بعض دیگر اساتذہ سے بھی کتابیں پڑھیں، لیکن ان کی اصل تعلیم وتربیت مولانا شبلی متکلم ندوی بمہوری کے سایۂ علم وحکمت میں ہوئی، مولانا بدر الدین نے اگرچہ باضابطہ مدرستہ الاصلاح میں داخلہ لے کر تعلیم حاصل نہیں کی، اس لیے وہ مدرسہ کے فارغ التحصیل وسند یافتگان میں شمار نہیں کیے جاتے، پھر بھی اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان کی تمام تر تعلیم وتربیت مدرستہ الاصلاح ہی کے احاطۂ علم وفن میں ہوئی ہے۔

مولانا بدر الدین زمیندار گھرانے کے فرد اور اپنے والد کے چہیتے تھے، گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا، اس لیے انھوں نے ملازمت یا درس وتدریس سے وابستہ ہونا پسند نہیں کیا، تعلیم سے فراغت کے قریب زمانہ میں رنگون (برما) میں کچھ باذوق لوگوں نے ایک حلقہ قرآن قائم کیا جس کی نگرانی ورہنمائی کے لیے ایک باصلاحیت عالم کے لیے

انھوں نے مدرستہ الاصلاح کے ذمہ داروں کو خط لکھا، سب کی نظر انتخاب مولانا بدرالدین پر پڑی، مگر ان کے والد انھیں اپنے سے جدا کرنا پسند نہیں کرتے تھے، تاہم مولانا شبلی متکلم وغیرہ کے اصرار پر بادل ناخواستہ راضی ہوگئے، برما میں ان کی بڑی پذیرائی ہوئی، لیکن ابھی سال بھی نہیں گذرا تھا کہ والد کی خبر علالت پاکر گھر واپس لوٹ آئے، والد کا وقت پورا ہو چکا تھا، ان کے انتقال کے بعد زمین جائیداد کے مسائل میں ایسا الجھے کہ برما سے مسلسل خطوط آنے کے باوجود گھر چھوڑنا ممکن نہیں ہوا۔

ایسے غیر علمی ماحول میں جہاں ہر وقت مزدوروں سے سابقہ، اور آئے دن زمین، جائیداد کے جھگڑے دردسر بنے رہتے تھے، پھر بھی اپنے ذوق مطالعہ وکتب بینی کے لیے وقت نکال لیتے تھے، شوق مطالعہ اور علمی اشتغال کی بناء پر وہ بعض رسالوں میں کبھی کبھی مضامین بھی لکھتے تھے، ۱۹۳۶ء میں مولانا حمیدالدین فراہی رحمہ اللہ کی تصانیف کی اور ان کے ترجمے کی اشاعت کے لیے دائرۂ حمیدیہ کا قیام عمل میں آیا، جس کی طرف سے ''الاصلاح'' کے نام سے ایک ماہنامہ علمی رسالہ مولانا امین احسن اصلاحی کی ادارت میں نکلا جس کے گنے چنے مضمون نگاروں میں ایک نام مولانا بدرالدین کا بھی تھا، انھوں نے جب ۱۹۴۵ء م ۱۳۶۵ھ میں نائب ناظم کی حیثیت سے ''مدرستہ الاصلاح'' کے کاروبار انتظام کو سنبھالا، وہ مدرسہ کا بڑا بحرانی دور تھا، اس کی مالی حالت اس قدر کمزور تھی کہ نہ اساتذہ کو وقت پر پوری تنخواہیں ملتی تھیں اور نہ ہی طلبہ کو باقاعدہ فراغت کے ساتھ دووقت کا کھانا مل پاتا تھا، لیکن ان کی جہد مسلسل، خوش انتظامی اور حسن تدبیر سے مدرسہ کی خراب حالت درست ہوگئی، اس کی مالی حالت مستحکم ہوگئی اور تعلیم وتربیت کا نظام بھی بہتر ہوگیا، ناظم مدرسہ حاجی رشید الدین کے انتقال کے بعد ۱۹۵۸ء م ۱۳۷۸ھ میں ناظم منتخب ہوئے، اس وقت سے چند برسوں کو چھوڑ کر انتقال کے وقت تک وہی اس منصب پر فائز رہے، وہ ایک کامیاب ناظم تھے، انھوں نے مدرستہ الاصلاح کو بڑی ترقی ووسعت دی، اور اس کی شہرت، وقار اور استحکام میں اضافہ کیا۔

ان کے دور نظامت میں دو بڑے بحران سے مدرسہ دوچار ہوا، ایک اس وقت

جب مولانا شبلی متکلم ندوی کی قیادت میں قدیم اساتذہ کی ایک جماعت مدرستہ سے الگ ہوگئی، دوسرا اس وقت جب جماعت اسلامی سے وابستہ اساتذہ کی ایک جماعت مدرسہ سے الگ ہوئی۔ مولانا نے ان دونوں بحرانوں پر حسن تدبیر اور انتظامی صلاحیتوں سے بڑی حد تک قابو پالیا۔

مولانا اختر احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے اپنی وفات کے وقت اپنے استاذ مولانا فراہی کے علمی متروکات ومسودات مولانا بدرالدین کو سپرد کر گئے تھے اس متاع گرانمایہ کی نہ صرف یہ کہ انھوں نے حفاظت کی؛ بلکہ ہمیشہ اس کی ترتیب واشاعت کے لیے کوشاں رہے، مولانا اختر احسن اصلاحی کے بعد وہ اکیلے ''دائرہ حمیدیہ'' کے محافظ رہ گئے تھے۔ چنانچہ مرتے دم تک وہی دائرہ کے ناظم رہے اور جہاں تک بن پڑا اس کے مقاصد کو بروئے عمل لانے کی سعی میں لگے رہے، چنانچہ انھوں نے اپنے دور میں مولانا فراہی کی حسب ذیل کتابیں شائع کیں۔

(۱) دیوان حمید عربی کلام جمع وتدوین بدرالدین اصلاحی ۱۹۶۷ء م ۱۳۸۷ھ
(۲) نوائے پہلوی فارسی کلام جمع وتدوین بدرالدین اصلاحی ۱۹۶۷ء م ۱۳۸۷ھ
(۳) دلائل النظام عربی تصنیف جمع وتدوین بدرالدین اصلاحی ۱۹۶۸ء م ۱۳۸۸ھ
(۴) التکمیل فی اصول التاویل عربی تصنیف، جمع وتدوین، بدرالدین اصلاحی ۱۹۶۸ء م ۱۳۸۸ھ
(۵) اسالیب القرآن، عربی تصنیف، جمع وتدوین بدرالدین اصلاحی ۱۹۶۹ء م ۱۳۸۹ھ
(۶) فی ملکوت اللہ عربی تصنیف جمع وتدوین بدرالدین اصلاحی ۱۹۷۱ء م ۱۳۹۱ھ
(۷) القائد الی عیون العقائد، عربی تصنیف، جمع وتدوین، بدرالدین اصلاحی ۱۹۷۵ء م ۱۳۹۵ھ
(۸) تفسیر سورۂ قیامہ، عربی تصنیف، جمع وتدوین، طبع ثانی نشر واشاعت ۱۹۸۲ء م ۱۴۰۳ھ

(انجمن طلبہ مدرستہ الاصلاح کا سالانہ مجلہ، مرحوم اصلاحی شخصیات نمبر ۱۹۹۶ء)

ان سب کتابوں پر انھوں نے کلمۃ الجامع کے عنوان سے عربی میں مقدمے تحریر کیے ہیں، نوائے پہلوی پر ''سرنامہ'' کے عنوان سے فارسی میں مقدمہ لکھا ہے، عربی، فارسی کی یہ تحریریں ان کی دونوں زبانوں میں اعلی صلاحیت کی منھ بولتی ثبوت ہیں، وہ تحریر کی

طرح تقریر میں بھی ماہرانہ دستگاہ رکھتے تھے، دو دو تین تین گھنٹے مسلسل تقریر کرتے رہتے مگر نہ خیالات کی روانی میں فرق آتا اور نہ الفاظ کا خزانہ خالی دکھائی دیتا، ان کی گفتگو بھی بڑی موثر، دل پذیر ہوتی، بات کرتے تو خیال ہوتا کہ

ع وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

مولانا بدرالدین مرحوم، بڑے خلیق، ملنسار، خوش مزاج اور باغ و بہار شخصیت کے حامل تھے، اس بات کا ملال علمی حلقوں کو ہمیشہ رہے گا کہ قدرت نے ان کو اعلیٰ دل و دماغ اور حیرت انگیز لیاقت وصلاحیت بخشی تھی، وہ سب زمینداری اور کھیتی باڑی کے جھمیلوں اور کھیتوں کی مٹی میں دب کر رہ گئی، اگر انھوں نے زرعی معیشت کو مستقل طور پر اختیار کرنے کے بجائے درس و تدریس، اور علم و ادب کو اپنا مشغلہ بنایا ہوتا تو علمی دنیا کو بڑا فائدہ پہنچتا، ''وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے''۔

مولانا کئی برس سے پیروں کی تکلیف میں مبتلا تھے، علاج کے لیے بمبئی گئے، مگر مرض کم ہونے کے بجائے بڑھتا رہا حتیٰ کہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے، اس کے ساتھ بخار مستقل طور پر رہنے لگا، جس نے جسم کو گھلا کر بالکل ہڈی، چمڑے کا ڈھانچہ بنا دیا تھا، آخر کے چند روز ایسے گذرے کہ ہوش و حواس بھی اچھی طرح بجا نہیں تھے، اسی حالتِ بے بسی میں یہ بلبل ہزار داستاں ۱۹ر جون ۱۹۹۶ء م ۱۴۱۷ھ کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا، اور موضع ''نیاوج'' جو ان کا مولد و منشا تھا، قضا و قدر کے مطابق وہی ان کا مدفن بھی بنا۔

مولانا بشیر احمد مبارک پوری

مولانا بشیر احمد مبارک پوری علمائے مبارک پور میں اپنے علم و فضل کے اعتبار سے ممتاز حیثیت کے مالک تھے، افسوس کہ مولانا کا سن پیدائش اور تفصیلی حالات معلوم نہیں ہو سکے، مولانا موصوف جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے عہد قدیم کے متعلمین میں ہیں، ابتدائی فارسی عربی سے متوسطات تک کی تعلیم احیاء العلوم ہی میں حاصل کی تھی، احیاء العلوم

میں آپ کے اساتذہ میں حضرت مولانا شکر اللہ ناظم جامعہ، حضرت مولانا نعمت اللہ دستِ راست مولانا شکر اللہ، حضرت مولانا علی احمد کوئریا پاری ثم سرائے میری، حضرت مولانا محمد صدیق برئی پوری اعظمی تلمیذ خاص مولانا ماجد علی جون پوری، حضرت مولانا وصی اللہ فتحپوری رحمہم اللہ جیسے اساطین علم ودین شامل ہیں، ان کے اساتذہ کی اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ احیاء العلوم کے دور اوّل کے فرزندوں میں سے ہیں۔

احیاء العلوم سے تعلیم مکمل کر کے مظاہر علوم سہارن پور میں حضرت مولانا عبداللطیف سہارن پوری ناظم مظاہر علوم، حضرت مولانا عبدالرحمٰن کیمل پوری، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی قدس اسرارہم وغیرہ اکابر اساتذۂ مظاہر علوم سہارن پور سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد علما وصلحاء کے طریقہ کے مطابق تدریس وتعلیم کا مشغلہ اختیار کیا اور معہد ملت مالیگاؤں، حیات العلوم مرادآباد، احیاء العلوم مبارک پور میں بحیثیت صدر مدرس وشیخ الحدیث کے ایک طویل عرصہ تک حدیث پاک اور نصاب میں شامل دیگر فنون کی بڑی اور اہم کتابوں کا درس دیا، احیاء العلوم میں آپ منصب نظامت پر بھی کچھ دنوں فائز رہے، پھر یہاں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ جامعہ سے علیحدگی اختیار کرلی اور قصبہ گھوسی کے مدرسہ مرکزی محمدیہ گھوسی میں صدر المدرسین ہوکر چلے گئے پھر آخر زندگی تک یہیں رہے۔

یہ بندۂ ناچیز جس وقت دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کا طالب علم تھا، تو مولانا مرحوم ایک بار دیوبند تشریف لائے تھے، مولانا کے چہرے بشرے وضع قطع، اور انداز گفتگو ہر ایک سے ان کی علمی شان نمایاں تھی، غالباً اس زمانہ میں مولانا حیات العلوم مرادآباد میں شیخ الحدیث تھے، اس کے بعد پھر مولانا سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوسکا۔

مرکزی مدرسہ محمدیہ گھوسی ہی کے زمانۂ تدریس میں ۳؍شوال ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۹۸۴ء یوم سہ شنبہ کو وفات ہوگئی، نماز جنازہ محدث کبیر حبیب الرحمٰن اعظمی رحمہ اللہ نے پڑھائی اور اپنے آبائی قبرستان شاہ پنجہ میں سپرد لحد ہوئے۔

آپ کے تلامذہ میں مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، مولانا محمد عثمان ساحر مبارک پوری، مولانا عبدالمنان باسوپاروی سابق شیخ الحدیث احیاء العلوم مبارک پور، مولانا محمد عارف جہانا گنجی سابق صدر المدرسین و شیخ الحدیث احیاء العلوم وغیرہ مشاہیر علماء شامل ہیں۔

مولانا موصوف معقولات و منقولات ہر فن کے زبردست عالم تھے، حدیث، فقہ، اصول فقہ، تفسیر اور معقولات کی بڑی بڑی کتابیں بے تکلف پڑھاتے تھے، مولانا کا مطالعہ وسیع اور علم مستحضر تھا، علم و فضل کے جس بلند و بالا مقام پر فائز تھے، اس کے لحاظ سے انھیں کام کا میدان نہیں مل سکا اس لیے ان کے علمی جوہر پورے طور پر آشکارا نہیں ہو سکے، افسوس کہ مولانا کے سوانح حیات اور ان کی خدمات کی تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں۔

مولانا جلیل احسن ندوی فاضل دیو بند

ادیب نکتہ سنج، فاضل محقق، فخر اماثل مولانا ابو سعید جلیل احسن بن علیم اللہ بن امیر علی کی پیدائش ۲۵ ر جنوری ۱۹۱۳ء م ۱۳۳۲ھ کو ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں ''کرمینی'' میں ہوئی، جو قصبہ بلریا گنج سے دس کلو میٹر شمال میں واقع ہے۔ مولانا کا خاندان راجستھان سے آکر فیض آباد میں آباد ہوا پھر یہاں سے اس علاقہ میں منتقل ہو گیا، جس کو مولانا جلیل احسن جیسے عالم و فاضل کے مولد و منشاء ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

ان کے والد شیخ علیم اللہ عام گاؤں والوں کی طرح پڑھے لکھے نہیں تھے، اور کلکتہ میں ایک جوٹ مل میں ملازم تھے، یہی ملازمت ان کے اہل و عیال کے گذر بسر کا واحد ذریعہ تھی، مولانا جلیل احسن ابھی مکتب کے درجہ دوم میں تھے کہ ان کے والد کا مرض طاعون میں انتقال ہو گیا، مولانا کے ایک بھائی اور ایک بہن اور تھے، ان کی والدہ اور ان تین بچوں کی کفالت کا بظاہر اب کوئی ذریعہ نہیں تھا، اس لیے اعزہ نے ان کی والدہ کو دوسری شادی کی ترغیب دی اور اصرار کر کے ان کا نکاح موضع ''طویٰ'' (جو قصبہ سرائے میر سے شمال میں تقریباً تین چار میل کے فاصلے پر واقع ہے) کے شیخ اسماعیل سے کرا دیا، لیکن وہ بھی جلد ہی وفات پا گئے، پھر ان کی تیسری شادی ''طویٰ'' ہی میں شیخ

عباس مرحوم سے ہوئی، عباس مرحوم نے اپنی جائیداد ان تینوں یتیم بچوں کے نام کردی تھی، اس طرح منجانب اللہ گذران کا ایک وسیلہ میسر آ گیا۔

مولانا نے ابھی عمر کے چوتھے سال میں قدم رکھا تھا کہ ایک اور ہمت شکن امتحان سے دوچار ہوئے، ان پر فالج کا حملہ ہوا، جس کے نتیجہ میں، لاچار اور بالکل بے بس ہوگئے، البتہ آنکھیں، اور ذہنی قوت محفوظ رہی، بظاہر یہ ایک جانگسل مصیبت تھی، لیکن اس کے پردے میں خدائے رحیم وکریم کی حکمت بالغہ اور تدبیر نافذہ اپنا کام کررہی تھی، اگر وہ تندرست اور صحیح وسالم ہوتے تو لازمی طور پر وہ گھریلو ماحول کے زیر اثر ایک کسان اور مزدور ہی ہوتے؛ لیکن اس بے بسی اور مجبوری کی حالت میں اس قابل تو رہے نہیں اس لیے ان کے ہر عزیز وقریب اور بہی خواہ کی یہی خواہش اور کوشش رہی کہ وہ لکھ پڑھ لیں، یوں وہ گھر کے ماحول سے آزاد ہوکر پڑھنے میں لگ گئے، یا لگا دیئے گئے تا کہ کسی طرح اپنا پیٹ پالنے کے لائق ہوجائیں۔

چنانچہ انھیں مکتب میں بیٹھا دیا گیا جہاں جناب ''ریاست علی'' کی صورت میں ایک نہایت شفیق ومہربان استاذ مل گیا، جس نے پوری توجہ سے انھیں قلم پکڑنا سکھا دیا، پھر یہاں سے قریب کے ایک دوسرے گاؤں سے پرائمری کے درجہ سوم وچہارم کو پاس کیا، بعد ازاں بلریا گنج کے مڈل اسکول میں داخل کردیئے گئے، اور پیروں سے معذوری کے باوجود روزانہ گھر سے دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے بلریا گنج آتے اور پھر بلریا گنج سے واپس شام کو گھر جاتے، اس طرح یومیہ بیس کلومیٹر کی مسافت پیروں کی شکستگی کے باوجود طے کرتے، اسی دوران ان کی والدہ ''طوی'' منتقل ہوگئیں تو کرمینی کی ایک نیک دل خاتون نے انھیں اپنی نگہداشت میں رکھ لیا، پھر کچھ دنوں کے بعد وہ بھی کرمینی سے طوی چلے آئے، اور مدرستہ الاصلاح میں پڑھنے لگے، لیکن ان کے اقرباء نے معاشی مقاصد کے تحت انھیں مدرستہ الاصلاح سے اٹھا کر بلریا گنج کے مڈل اسکول میں پھر داخل کردیا، کیونکہ ان کے پیش نظر یہی تھا کہ مڈل پاس کرلیں گے تو اعظم گڈھ کچہری کے کسی گوشہ میں بیٹھ کر اپنی دال روٹی بھر کما لیا کریں گے۔

مولانا مڈل اسکول میں زیر تعلیم ہی تھے کہ ایک دن ایک اجنبی دیہاتی نے سر راہ ان سے پوچھا کہ کیا پڑھتے ہو انھوں نے بتایا اس نے اپنی دیہاتی زبان میں ان سے کہا کہ اس پڑھائی سے کوئی فائدہ حاصل ہونے والا نہیں ہے، وہ پڑھائی پڑھو جس سے تم قرآن کے معنی و مطلب سمجھنے کے قابل ہو جاؤ، مولانا نے اس سے پوچھا یہ تعلیم کہاں حاصل ہوگی، اس نے کہا ٹانڈہ چلے جاؤ، مولانا کے دل میں اس کی یہ بات اس طرح پیوست ہوگئی کہ انھوں نے مڈل اسکول میں پڑھنا چھوڑ دیا، جس پر اپنے ہی خواہوں کی ملامت کا نشانہ بنے لیکن انھوں نے اس کی پرواہ نہیں کی اور اپنی والدہ کو کسی طرح راضی کر کے ٹانڈہ چلے گئے، گھر کی معاشی حالت اگر چہ ابتر تھی پھر بھی اللہ پر بھروسہ کر کے ٹانڈہ کے مشہور مدرسہ کنز العلوم میں داخل ہو گئے، اس وقت یہ مدرسہ مولانا علیم اللہ تلمیذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی تدریسی و تربیتی مساعی کی وجہ سے گہوارۂ علم و دین بنا ہوا تھا۔

مولانا جلیل احسن رحمہ اللہ نے یہاں پہنچ کر سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا، اپنی خداداد ذہانت اور شب و روز کی محنت سے پندرہ مہینے کی مختصر مدت میں حافظ قرآن ہو گئے، بعد ازاں فارسی پڑھنی شروع کی اور مولانا علیم اللہ رحمہ اللہ کی خصوصی توجہ اور اپنی بے پناہ ریاضت کی بدولت فارسی کے تین سالہ نصاب کو ایک ڈیڑھ سال میں مکمل کر لیا، اس کے بعد عربی شروع کی، مولانا خود بیان کرتے تھے کہ جس دن میں نے عربی شروع کی وہ میری زندگی کا سب سے پر مسرت و کیف آگیں دن تھا، میں خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا، حضرت مولانا علیم اللہ مرحوم نے ان کی جسمانی معذوری اور مالی تنگی کے پیش نظر درجہ کی پابندی سے الگ ان کے درس کے لیے خصوصی انتظام کر دیا تھا، ادھر ان کا ذوق فراواں بھی انھیں مہمیز کرتا رہا، پاشکستگی سے وہ اگر چہ بے بسی کے شکار تھے، لیکن دل و دماغ کی صلاحیتیں شباب پر تھیں اس لیے درس نظامی سے متعلق اکثر کتابیں انھوں نے کنز العلوم ٹانڈہ میں مکمل کر لیں، اور آگے کی تعلیم کے لیے تعلیم الدین ڈابھیل سورت کا رخ کیا، مولانا ڈابھیل کب گئے کتنے عرصہ وہاں تعلیم حاصل کی، پھر وہاں سے دیوبند کب پہنچے ان ضروری تفصیلات پر ان کے تذکرہ نگار مولانا عبد الرب اثری فلاحی نے یوں روشنی ڈالی ہے۔

"مزید تشنگی علم کو بجھانے کے لیے مشہور جامعہ "جامعہ اسلامیہ" (سورت) ڈابھیل کا رخ کیا جہاں اس وقت بہتیرے ارباب علم وکمال دارالعلوم دیوبند کے اہتمام سے جزوی اختلاف کی وجہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر مہ وانجم کی کہکشائیں آباد کیے ہوئے تھے، جب یہ اساتذہ پھر دارالعلوم دیوبند واپس آئے تو مولانا بھی ۱۹۲۳ء (اصل میں یہی ہے مگر درست ۱۹۳۳ء ہے) منتقل ہو گئے، لیکن مولانا کو افسوس ہوا کہ صحیح بخاری کا درس محدث کبیر حضرت مولانا انورشاہ کشمیری سے نہیں لے سکے، کیونکہ جس دن مولانا دیوبند پہنچے شاہ صاحب کا جنازہ اٹھ رہا تھا وہ صرف شکل دیکھ سکے"۔ (حیات نو بلریا گنج ستمبر ۱۹۹۸ء ص ۳۶-۳۷)

مگر اسے کیا کہیے کہ مولانا اثری کی یہ پوری تحریر از قبیل زیب داستان ہی ہے، حقیقت واقعہ سے اس کا راست تعلق نہیں ہے، کیونکہ دارالعلوم دیوبند سے اس وقت جو اساتذہ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل منتقل ہوئے تھے ان میں بجز حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کسی کو بھی دوبارہ دارالعلوم دیوبند آنے کا موقع میسر نہیں ہوا، اور حضرت مولانا عثمانیؒ بھی ۱۹۳۳ء میں نہیں بلکہ ۱۹۳۵ء میں بحیثیت صدر مہتمم کے یہاں آئے تھے، اور ابتداء میں تقریباً دو سال تک ڈابھیل سے بھی رسمی تعلق برقرار رہا کچھ مہینے دیوبند رہتے اور کچھ مہینے ڈابھیل، اس زمانہ میں صرف انتظامی امور دیکھتے تھے، درس ان سے متعلق نہیں تھا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اوائل ۱۳۴۶ھ م ۱۹۲۷ء میں دارالعلوم دیوبند کے درج ذیل اساتذہ ڈابھیل منتقل ہوئے تھے:

(۱) حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی (۲) حضرت مولانا سراج احمد رشیدی (۳) حضرت مولانا انورشاہ کشمیری (۴) حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، (۵) حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی (۶) حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مجاہد ملت رحمہم اللہ ان میں سے:

(۱) حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ م ۱۹۲۸ء کے اوائل میں ڈابھیل سے دیوبند آتے ہوئے راستہ میں علیل ہو گئے اور اسی علالت میں ۱۷ر جمادی الثانی کو ان کی رحلت ہو گئی۔

(۲) حضرت مولانا سراج احمد رشیدی تقریباً چار پانچ سال ڈابھیل میں رہے اور ڈابھیل ہی کے قیام میں فوت ہوگئے۔

(۳) حضرت مولانا انور شاہ کشمیری نے ۱۳۵۱ھ م ۱۹۳۲ھ تک ڈابھیل میں درحدیث دیا، پھر بیمار ہوکر اپنے وطن اقامت دیوبند آگئے اور یہیں ۳؍صفر ۱۳۵۲ھ مطابق ۲۹؍مئی ۱۹۳۳ء کووفات پاگئے۔

(۴) حضرت شاہ صاحب کی وفات کے بعد حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی ۱۳۵۲ھ م ۱۹۳۳ء میں جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل کے شیخ الحدیث مقرر ہوئے، اور دوسال کے بعد ۱۳۵۴ھ م ۱۹۳۵ء میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم منتخب ہوگئے، اس تقریب سے وہ دوبارہ دارالعلوم دیوبند واپس آئے۔

(۵) حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی تقریباً ۱۷؍سال ڈابھیل میں رہے، آخر میں وہاں کے صدر مدرس ہوگئے تھے، پھر خرابیٔ صحت کی بناء پر بھاول پور چلے گئے تھے، اور تقسیم ملک کے بعد پاکستان گئے اور پھر وہاں سے مدینہ منورہ ہجرت کرگئے اور اسی پاک سرزمین کے پیوند ہوئے۔

(۶) اور حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی تقریباً پانچ سال ڈابھیل رہے حضرت شاہ صاحب کی وفات کے سال ۱۳۵۲ھ م ۱۹۳۳ء میں وہاں سے انجمن تبلیغ الاسلام کلکتہ چلے گئے، پھر وہاں سے جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے دہلی آگئے اور یہیں زندگی بسر کردی۔ (ماخوذ از تاریخ دارالعلوم دیوبند ج ۲)

ان تاریخی حقائق کے مقابلہ میں مولانا اثری کا یہ بیان کیسے درست ہوسکتا ہے کہ ”جب یہ اساتذہ دارالعلوم دیوبند واپس آئے تو مولانا بھی ۱۹۳۳ء میں دیوبند منتقل ہوگئے، لیکن مولانا کو افسوس ہوا کہ صحیح بخاری کا درس محدث کبیر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری سے نہیں لے سکے، کیونکہ جس دن مولانا دیوبند پہنچے شاہ صاحب کا جنازہ اٹھ رہا تھا، وہ صرف شکل دیکھ سکے“ (بلفظہ) اسلامی جامعات اور درسگاہوں میں طلبہ علوم کا داخلہ ماہِ شوال ہی میں ہوا کرتا ہے تو مولانا بغرض تعلیم دیوبند صفر کے مہینہ میں حضرت شاہ

صاحب کی وفات کے دن کیونکر گئے ہوں گے۔

مولانا اثری صاحب کے اس بیان کے برخلاف تاریخی قرائن کی بنیاد پر ہمارا اندازہ یہ ہے کہ مولانا ڈابھیل ۱۹۳۳ء مطابق ۱۳۵۲ھ میں پہنچے ہیں جبکہ حضرت شاہ صاحب بیمار ہوکر دیو بند آ گئے تھے، اور ڈابھیل کم از کم دو سال رہے، کیونکہ خود مولانا اثری صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا نے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب سے یہاں جلالین، و بخاری اور مولانا عبدالرحمٰن امروہوی سے تفسیر بیضاوی پڑھی۔ (حیات نو جنوری و فروری ۱۹۹۹ء ص ۶۲)

اسلامی مدرسوں کے نظام تعلیم سے معمولی واقفیت رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ دارالعلوم دیو بند کے نہج پر جہاں تعلیم ہوتی ہے وہاں موقوف علیہ یعنی جلالین، ہدایہ اخیرین، بیضاوی وغیرہ پڑھنے کے بعد دورۂ حدیث (اصول ستہ وغیرہ) کا درس ہوتا ہے، اس لیے ڈابھیل میں مولانا نے پہلے سال جلالین، بیضاوی وغیرہ پڑھی ہوگی، اور دوسرے سال حدیث کی کتابیں صحیح بخاری وغیرہ، پھر یہاں سے شوال ۱۳۵۴ھ م ۱۹۳۵ء میں دیو بند آگئے ہوں گے، اس کی تائید خود مولانا کی اپنی تحریر سے بھی ہوتی ہے، وہ اپنے مضمون ''نقوش وتاثرات'' میں لکھتے ہیں: ''دارالعلوم دیو بند کے قیام کے دوران بعض ہم وطن دوست مدرستہ الاصلاح سے شائع ہونے والا ماہنامہ ''الاصلاح'' منگاتے تھے میرے اور ساتھی تو اسے پڑھ لیتے اور میں ''پڑھتا'' تھا (ص ۷ ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڈھ) اور الاصلاح کا اجراء شوال ۱۳۵۴ھ جنوری ۱۹۳۵ء کو ہوا ہے۔

یہاں پہنچ کر انھوں نے غالباً موقوف علیہ میں داخلہ لیا ہوگا، اس طرح یہاں کم از کم دو سال رہے ہوں گے ورنہ انھیں حضرت مولانا اعزاز علی رحمہ اللہ کے ذریعہ عربی ادب کا ذوق کیسے پیدا ہوتا، تاریخ کی تصحیح کے لیے یہ طوالت ناگزیر تھی اس لیے توقع ہے کہ اسے انگیز کیا جائے گا۔

دارالعلوم دیو بند سے تعلیم وتحصیل کے بعد جدید ادب عربی میں مہارت پیدا کرنے کی غرض سے وہ ''دارالعلوم ندوۃ العلماء'' لکھنؤ پہنچے، جہاں اُس وقت مولانا عبدالرحمٰن کاشغری اور مولانا محمد ناظم ندوی جیسے ادب عربی جدید کے ماہر اساتذہ درس وافادہ میں

مصروف تھے، وہ ندوہ اسی ارادہ اور خواہش پر آئے تھے کہ یہاں داخلہ لے کر ادب عربی میں اختصاص حاصل کریں گے، مگر وہ اپنے اس ارادہ کو روبہ عمل لانے میں کامیاب نہیں ہوئے، مدیر مجلہ ''الایمان'' دیو بند نومبر ۱۹۸۱ء ص ۳۸ پر اس کی تفصیل ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''مولانا شاید ندوی ایک ہفتہ کے لیے بھی نہیں تھے، کیونکہ مولانا جب دیوبند سے ندوہ صرف ادب کی تعلیم کے لیے آئے تو معلوم ہوا کہ یہاں ادب کے طالب علم کی حیثیت سے داخلہ کا اس وقت کوئی قانون نہیں تھا، مستقل کوشش کے باوجود ناکام رہے، تو یہ شکل نکلی کہ مدرس ہو کر استفادہ کریں، لیکن مولانا آمادہ نہ ہوئے۔''

(بحوالہ حاشیہ حیات نو اکتوبر ۱۹۹۸ء ذکر جلیل (۲) ص ۳۶)

مولانا مرحوم کے تعلیمی سفر کی روداد سے بظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں باضابطہ داخلہ نہ مل پانے کے باوجود انھوں نے اپنے طور پر یہاں قیام کر کے مولانا عبدالرحمن کاشغری اور مولانا محمد ناظم ندوی رحمہما اللہ سے فن ادب میں خصوصی استفادہ کیا اور ان کے فیض صحبت سے اپنے ذوق ادب وانشاء کی تسکین کی صورت نکال لی، اخذ و استفادہ اور تعلیم وتحصیل کے سلسلے کا یہ ان کا آخری سفر تھا، یہاں سے وہ مولانا محمد ناظم ندویؒ کی کوششوں سے مدرسہ اشاعت العلوم بریلی میں مدرس ومعلم ہو کر چلے گئے۔

مدرسہ اشاعت العلوم بریلی کی معلمی سے ان کی علمی زندگی کا دوسرا باب شروع ہوا، وہ لکھنؤ کے زمانۂ قیام ہی سے جماعت اسلامی کی تحریک سے متاثر تھے، یہاں پہنچ کر اس تاثر میں مزید اضافہ ہوا، یہاں تک کہ ۱۹۴۲ء میں انھوں نے باقاعدہ جماعت میں شمولیت کی درخواست اس کے مرکز دارالاسلام میں بھیج دی اور اس کے باضابطہ رکن بن گئے، اسی زمانہ میں مولانا مودودی صاحب نے اردو کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے کے لیے ایک ادارہ ''دارالعروبہ'' کے نام سے قائم کیا تھا جس کے مدیر مولانا مسعود عالم ندوی تھے، مولانا مودودی صاحب نے انھیں اس ادارہ سے متعلق ہو کر کام کرنے کی دعوت دی تو وہ اشاعت العلوم بریلی سے علیحدہ ہو کر جماعت اسلامی کے مرکز دارالاسلام منتقل

ہوگئے، اسی زمانہ میں مولانا مودودی صاحب کی مشہور کتاب ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' کا ترجمہ عربی میں کیا، اس کے علاوہ اسلام کا نظام حیات، اسلام کا اقتصادی نظام، وغیرہ کے عربی تراجم کیے، لیکن وہ یہاں تادیر ٹھہر نہیں سکے اور ڈیڑھ دو سال ہی میں وہاں سے واپس آگئے، اور شہر بریلی ہی کے ایک دوسرے مدرسہ ''مصباح العلوم'' میں تدریسی خدمت پر مامور ہوئے، اس وقت اس مدرسہ کے صدر مدرس مولانا عبدالقیوم اور صاحب ''مصباح اللغات'' مولانا عبدالحفیظ بلیاوی مدرس تھے، انھیں دونوں کی سعی مشکور سے مولانا یہاں بحیثیت مدرس پہنچے، وہ اپنے تدریسی مشاغل میں یہیں مصروف تھے کہ ۱۹۴۶ء م ۱۳۶۶ھ میں مدرستہ الاصلاح ایک شدید بحران کا شکار ہوگیا، اس کے چار اساتذہ جن میں مدرسہ کے قدیم استاذ مولانا شبلی متکلم صدر مدرس بھی تھے مستعفی ہوگئے، چونکہ اس وقت مدرستہ الاصلاح مکمل طور پر جماعت اسلامی کے زیر اثر تھا اس لیے ناظم مدرسہ مولانا بدرالدین اصلاحی نے مولانا مودودی صاحب کے تجویز پر ان چاروں اساتذہ کی خالی جگہوں کو پر کرنے کے لیے مولانا ابواللیث ندوی کو اکولہ مہاراشٹر سے، مولانا صدرالدین اصلاحی کو دارالاسلام پٹھان کوٹ، مولانا ابوبکر اصلاحی کو قادرآباد بستی سے اور مولانا جلیل احسن صاحب کو بریلی سے بلاکر مدرس بنایا گیا، بریلی سے سرائے میر آنے کی اصل وجہ یہی ہے، وہ نہیں ہے جس کو مولانا عبدالرب اثری فلاحی نے مولانا کے ترجمۂ ذکر جلیل میں لکھا ہے کہ ''مصباح العلوم کی خستہ حالی کے بعد مولانا سرائے میر آگئے'' مولانا جس زمانہ میں مدرستہ الاصلاح میں درس وتدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے، اسی زمانہ میں جماعت اسلامی نے عصری تعلیم یافتہ افراد کے لیے درسگاہ اسلامی ثانوی کے نام سے رامپور میں ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا، تو وہ اس وقت کے جماعت اسلامی ہند کے امیر کی دعوت پر سرائے میر سے اس ادارہ میں منتقل ہوگئے، یہاں ان سے متعلق قرآن کے ساتھ دیوان حماسہ، اور سبع معلقات کے اسباق متعلق ہوئے، مگر یہ ادارہ تقسیم ملک کے بعد اپنے وجود کو باقی نہ رکھ سکا، اس کے ختم ہوجانے کے بعد مولانا کو جماعت کے شعبۂ تصنیف وتالیف سے متعلق کردیا گیا، وہ اگرچہ خدمت لوح وقلم کی پوری

صلاحیت رکھتے تھے، مگر ان کا اصل موضوع درس وتدریس ہی تھا، اس لیے وہ اس شعبہ سے مستعفی ہو کر دوبارہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر آ گئے، لیکن جلد ہی ۱۹۶۲ء م ۱۳۸۲ھ میں وہاں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ جماعت اسلامی سے وابستہ تمام لوگوں کو وہاں سے علیحدہ کر دیا گیا، تو وہ بھی سرائے میر سے گھر چلے آئے، اسی اثنا میں چترپور ہزاری باغ بہار میں (موجودہ جھارکھنڈ) درسگاہ اسلامی ثانوی کے نہج پر ایک مدرسہ ''جامعہ کاشف العلوم'' کے نام سے جماعت اسلامی سے وابستہ بعض لوگوں نے قائم کیا تو ان کی طلب پر وہ بحیثیت استاذ وہاں گئے اور درس وافادہ کی محفل آراستہ کی، مگر اس مدرسہ نے بھی جلد ہی دم توڑ دیا۔ اس لیے وہاں سے ۱۹۶۴ء م ۱۳۸۴ھ کے اواخر میں اپنے شاگردوں سمیت جامعۃ الفلاح بلریا گنج ضلع اعظم گڈھ آ گئے، اور ۱۹۷۲ء م ۱۳۹۲ھ تک پوری دلجمعی کے ساتھ جامعۃ الفلاح کو واقعی جامعہ بنانے میں مصروف رہے۔ ان کے یہاں آتے ہی انھیں صدر مدرس بنا دیا گیا اور پورا تعلیمی نظام ان کے سپرد ہو گیا، مگر معذوری اور نقل وحرکت میں پریشانی کے باعث جلد ہی صدارت تدریس سے مستعفی ہو گئے، البتہ ناظم تعلیمات برقرار رہے، پانچ چھ ماہ جامعہ کے ناظم بھی رہے، کچھ دنوں تک معتمد تعلیمات بھی رہے، مگر اپنی معذوری اور حالات کی ناساعدت سے کسی عہدہ پر تادیر نہیں رہ سکے پھر بعض حالات ایسے رونما ہوئے کہ انھوں نے ۱۹۷۲ء م ۱۳۹۲ھ جامعہ ہی سے استعفا دے دیا، اور یہاں سے جامعۃ الرشاد شہر اعظم گڈھ منتقل ہو گئے، مگر یہاں بھی مکمل ایک سال قیام نہیں رہا، یہاں سے ''جامعہ دار الہدیٰ'' محمد نگر آندھرا پردیش چلے گئے، اس دوران جامعۃ الفلاح کی طرف سے ان کی واپسی کی کوشش ہوتی رہی بالآخر درج ذیل شرائط کے ساتھ دسمبر ۱۹۷۳ء م ۱۳۹۳ھ دوبارہ جامعۃ الفلاح آ گئے۔

شرائط واپسی: (۱) چار سو روپے ماہانہ مشاہرہ لوں گا، (۲) وہی کمرہ رہنے کے لیے لوں گا جس میں پہلے رہتا تھا، (۳) ایسے حالات پیدا نہ ہوں کہ مجھے جامعہ چھوڑنا پڑے (۴) اب میں کہیں نہیں جانا چاہتا اور میری کتابیں جامعۃ الفلاح کی ہوں گی۔

(سہ روزہ دعوت ۷/ اگست ۱۹۸۱ء بحوالہ حیات نو جنوری و فروری ۱۹۹۹ء)

اس کے بعد مولانا مرحوم نے اپنی پوری زندگی جامعۃ الفلاح ہی میں گذار دی، اور یہیں کے زمانہ قیام میں ۵؍رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ م ۸؍جولائی ۱۹۸۱ء کو رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے، جہاں پہنچ کر پھر کہیں اور جگہ جانا نہیں ہوگا۔

وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے، حسب معمول سارے کام انجام دیئے، فجر کی نماز حجرہ میں ادا کی، کچھ مہمان آئے ہوئے تھے انھیں رخصت کیا، اور اپنے خادم کو بازار ٹارچ لانے کے لیے بھیجا اور خود مطالعہ میں مشغول ہوگئے، ''تدبر قرآن'' پڑھ رہے تھے، اور جب مطالعہ کرتے کرتے تھک گئے تو اپنے خاص انداز میں کسی نکتہ کو سوچنے کے لیے لیٹ گئے اور لیٹتے ہی سانس تیز تیز آنے لگی ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سو گئے ہیں، اسی دوران خادم ٹارچ لے کر آ گیا، اس نے مولانا کو آواز دی، مگر اب جواب کی سکت کہاں تھی وہ تو سفر آخرت شروع کر چکے تھے، یہ تیز تیز سانس اسی کی وجہ سے آ رہی تھی، بس دو ہچکیاں لیں اور اپنے رب غفور کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔

دو ہی ہچکی میں ہوا بیمارِ غم کا فیصلہ
ایک ہچکی موت کی اور اک تمہاری یاد کی

مولانا جلیل احسن مرحوم علوم نحو، ادب اور تفسیر کے زبردست عالم تھے، اور ان گنے چنے علماء میں سے تھے جنھیں عربی ادب وانشاء پر پورا عبور حاصل تھا، وہ ایک ماہر تعلیم تھے، ان کا طریقہ درس بڑا جاذب تھا، طالب علم کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا انھیں اچھا سلیقہ تھا، ان کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرنے والے سب ان کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان، وہ طلبہ سے کہا کرتے تھے کہ ہمیشہ لفظوں کو پکڑ کر چلو، عبارت کے ذریعہ مفہوم کی تعیین کی جانی چاہیے نہ کہ مفہوم کے ذریعہ عبارت حل کی جائے۔

ہزاروں تلامذہ کے علاوہ ان کی قلمی یادگار یہ ہے:

(۱) راہ عمل، ۴۳۲ احادیث کا مجموعہ (۲) زاد راہ ۴۵۰ احادیث پر مشتمل مجموعہ (۳) سفینۂ نجات، اس میں ۴۳۸ احادیث کا ترجمہ وتشریح ہے، یہ تینوں کتابیں مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی اور مکتبہ ذکری رامپور سے شائع ہوئی ہیں اور اصلاح وتربیت سے متعلق

ہیں۔(۴) ''تدبرِ قرآن پر ایک نظر'' سورۂ اعراف آیت ۱۴۳ تک ہی کام مکمل ہوا تھا کہ داعیِ اجل کو لبیک کہا، اس کا بیشتر حصہ ''زندگی نو ۱۹۸۱ء، ۱۹۸۳ء، ۱۹۸۴ء میں چھپ چکا ہے، اور مولانا نعیم الدین اصلاحی کی ترتیب و تدوین کے ساتھ یکجا بھی دہلی سے اس کی طباعت ہوئی ہے۔(۵) نقوشِ راہ، اس میں ان کے متعدد دروسِ قرآن کو جمع کیا گیا ہے۔ جامع مولانا رضی الاسلام ندوی ہیں، (۶) نقوش و تاثرات، اس میں ان کے چند مضامین کو جمع کیا گیا ہے۔ ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڈھ سے یہ مجموعہ شائع ہوگیا ہے، (۷) جمہرۃ اشعار العرب، پر مختصر حاشیہ، قلمی، (۸) لغات عربی، الف سے تا تک ہی کام ہوسکا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا جس پایہ کے عالم و فاضل تھے، اس کے اعتبار سے انھیں کام کے مواقع حاصل نہیں ہوئے، اگر وہ ایک خاص دائرہ میں محدود ہوکر کام کرنے کے بجائے کشادہ اور کھلی فضا میں کام کرتے تو ان کے علم کا جوہر مزید نکھر کر سامنے آتا۔

مولانا حبیب الرحمٰن سیدھا سلطان پوری

مولانا حبیب الرحمٰن بن مولوی محمد خلیل اپنے آبائی وطن سیدھا سلطان پور ضلع اعظم گڈھ میں ۱۸؍دسمبر ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے، ان کے مورثِ اعلیٰ محلہ دربانی پور شہر جون پور کے اصل باشندہ تھے، وہاں سے منتقل ہوکر موضع سیدھا میں سکونت اختیار کرلی تھی اس وقت سے ان کا خاندان یہیں آباد ہے۔

ابتداء سے متوسطات تک کی تعلیم اپنے تایا (والد کے بڑے بھائی) مولانا زین العابدین سے انچہرا ضلع بستی کے مدرسہ تعلیم الدین میں حاصل کی، مولانا زین العابدین بڑے بافیض عالم دین تھے، ضلع بستی میں اسلامی علوم کی نشأۃ ثانیہ انھیں کے فیض کی مرہونِ منت ہے، یہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ کے اہم تلامذہ میں سے تھے، انھیں کے حکم کے مطابق اپنی پوری زندگی دینی علوم کی ترویج و ترقی میں صرف کردی ضلع بستی میں مدرسہ تعلیم الدین انچہرا، اور قاسم العلوم باغ نگران کی یادگار ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن کی تعلیم کے ابتدائی مراحل انہی کے زیر تربیت طے ہوئے، آگے کی تعلیم کے لیے انھیں کے مشورہ سے دیو بند پہنچے اور دار العلوم دیو بند میں داخلہ لے کر تین سال یہاں زیر تعلیم رہ کر ۱۳۶۵ھ میں فارغ التحصیل ہو گئے، ان کے رفقائے درس میں حضرت مولانا سید اسعد مدنی رحمہم اللہ بھی تھے، دار العلوم کے اہم اساتذہ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، صدر المدرسین دار العلوم دیو بند، حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ، حضرت شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علی امروہوی، حضرت مولانا سید فخر الحسن مراد آبادی، حضرت مولانا بشیر احمد خاں بلند شہری وغیرہ ہیں۔

فراغت کے بعد درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا، نوتنواں ضلع گورکھپور، بیرواچندن پور، صبرحد ضلع جون پور، جلال پور ضلع فیض آباد کے مدارس میں ایک طویل عرصہ تک درس وتدریس کی کامیاب خدمت انجام دی۔

مولانا موصوف کی علمی صلاحیت پختہ اور ٹھوس تھی، ہر فن کی کتابوں کا بخوبی درس دیتے تھے، جہاں بھی رہے نیک نام رہے، آخر میں گھر کے حالات کا تقاضا ہوا کہ باہر رہنے کے بجائے گھر پر ہی رہیں، اس لیے مجبوراً درس وتدریس کے مشغلہ کو ترک کر کے گھر آ گئے۔

دینی تعلیم سے فراغت کے بعد لکھنؤ سے ہومیو پیتھ ڈپلوما حاصل کیا تھا، اس لیے قصبہ سرائے میر میں ہومیو پیتھ مطب کر لیا تھا، صبح نو دس بجے سے شام پانچ بجے تک مطب میں رہتے پھر گھر چلے جاتے، قدیم جامع مسجد قصبہ سرائے میر کے ایک عرصہ تک جمعہ کے امام وخطیب رہے، نیز مسلم فنڈ سرائے میر کے ۱۹۸۵ء م ۱۴۰۶ھ سے تا حیات منیجر بھی رہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم ایک باوقار عالم دین تھے، کم سخن، خوش طبع، با اخلاق اور خود دار طبیعت کے مالک تھے، سخت سے سخت تر حالات میں بھی ان کے پائے صبر واستقامت میں لرزش نہیں ہوتی تھی، قومی وملی کاموں میں بھی اپنی بساط کی حد تک کوشاں رہتے تھے، آخر عمر میں بیماریوں نے گھیر لیا تھا، اسی حالت میں ۳۱ر جولائی ۲۰۰۱ء میں وفات پائی اور اپنے آبائی قبرستان سیدھا سلطان پور میں تدفین عمل میں آئی۔

مولانا داؤد اکبر بمہوری

مدرسۃ الاصلاح ایک علمی درسگاہ کی حیثیت سے کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، اس ادارہ کی بنیاد تو مولانا محمد شفیع نے رکھی، لیکن اس کی فکری اساس مولانا حمید الدین فراہی کے علم وعمل کی مرہونِ منت ہے۔ مولانا فراہیؒ جو خود علم قرآن کے نامور محقق کی حیثیت سے معروف ہیں، انھوں نے جب مدرسۃ الاصلاح کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا تو اپنے ذوق وفکر کے مطابق یہاں قرآن کی تعلیم وتدریس پر بطور خاص زور دیا اور مدرسہ کے باصلاحیت اور ذہین فضلاء کی ایک جماعت کو خود باضابطہ قرآن حکیم کی تعلیم دی، جنھوں نے مولانا فراہی کی وفات کے بعد اپنے استاذ محترم کے فکری خطوط کے مطابق خود بھی قرآن فہمی میں اختصاص پیدا کیا، اور اپنے پیچھے قرآنی علوم سے دلچسپی رکھنے والوں کی ایک کھیپ چھوڑی، انھیں میں ایک امتیازی شان کے حامل مولانا داؤد اکبر بمہوری اصلاحی مرحوم بھی ہیں۔

مولانا داؤد اکبر ضلع اعظم گڈھ کے ایک معروف موضع ''بمہور'' میں 1915ء م ۱۳۳۴ھ کے حدود میں پیدا ہوئے، مولانا کے والد ماجد کا نام محمد حسن تھا، جو قرآن مجید کے جید حافظ تھے اور قرآن کی تلاوت سے انھیں اس درجہ شغف تھا کہ راستہ چلتے بھی باآواز بلند تلاوت کرتے جاتے تھے، حافظ محمد حسن مرحوم کا آبائی وطن آنوک ضلع اعظم گڈھ تھا، جہاں سے وہ بچپن ہی میں ترک سکونت کرکے بمہور اپنے ننیہال میں رہنے لگے تھے، جو بعد میں ان کا اور ان کی اولاد کا وطن ہوگیا۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر اور گاؤں میں ہوئی، کچھ شد بد ہوجانے کے بعد تقریباً نو برس کی عمر میں مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہوئے، جہاں ان کے خاندانی چچا مولانا شبلی متکلم بحیثیت مدرس اعلیٰ تدریسی خدمت انجام دے رہے تھے، سن داخلہ تقریباً ۱۹۲۴ء م ۱۳۴۳ھ ہے۔ مولانا موصوف نے مکتب اور عربی درجات کی مکمل تعلیم اسی ایک مدرسہ میں حاصل کرکے ۱۹۳۵ء م ۱۳۵۴ھ میں فارغ التحصیل ہوگئے، یہاں انھوں نے جن اساتذہ سے کسب فیض کیا ان میں چند مشہور شخصیتیں یہ ہیں:

مولانا محمد شبلی متکلم بھوری، مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا محمد سعید ندوی، مولانا نجم الدین اصلاحی، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، اور مولانا امین احسن اصلاحی رحمہم اللہ، مولانا داؤد اکبر مرحوم نے گیارہ سالہ یہ طالب علمی کا زمانہ بڑی سادگی اور کفایت شعاری کے ساتھ گزارا، اس طویل مدت میں صرف دس بارہ مرتبہ ہی بازار گئے، تعلیم وتحصیل میں انہماک اور مزاج کی یک سوئی نے انھیں کسی اور طرف متوجہ ہونے کی فرصت ہی نہیں دی۔

مولانا مرحوم نے جس دلچسپی، انہماک اور یکسوئی کے ساتھ تعلیم حاصل کی تھی، اسی کے ساتھ قدرت کی طرف سے ذہن رسا اور قلب اخاذ ملا تھا، جس کے لازمی نتیجہ کے طور پر ان کی علمی استعداد نہایت پختہ اور معلومات کا ذخیرہ بہت وسیع تھا۔ ظاہر ہے مدرسۃ الاصلاح اپنے اس جوہر قابل کا سب سے اولین حقدار تھا، اس لئے ۱۹۳۶ء م ۱۳۵۵ھ میں یک سالہ وقفہ کے بعد آپ پھر اپنی مادر علمی کی آغوش میں پہنچ گئے، البتہ پہلے ایک متعلّم کی حیثیت سے وہاں قیام تھا اور اب معلم ومدرس تھے، تقریباً چھ سال تدریسی خدمات انجام دے کر ۱۹۴۲ء م ۱۳۶۱ھ میں یہاں سے علاحدہ ہوگئے، مدرسۃ الاصلاح سے الگ ہوجانے کے بعد جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور آگئے اور تقریباً سات آٹھ برس یہاں ادب وتفسیر کا درس دیا، یہاں سے پھر دوبارہ ۱۹۴۹ء م ۱۳۶۹ھ میں مدرسۃ الاصلاح آگئے، اور قرآن مقدس کے استاذ کی حیثیت سے مسند تدریس وتحقیق کو زینت بخشی، یہ سلسلہ عرصۂ دراز تک جاری رہا، ۱۹۷۰ء م ۱۳۹۰ھ میں دوبارہ پھر "مدرسۃ الاصلاح" کو خیر باد کہا، اس مرتبہ اعظم گڈھ کے بجائے انھوں نے اپنی علمی سرگرمیوں کا مرکز ضلع جونپور کے ایک تعلیمی ادارہ "مولانا آزاد تعلیمی مرکز اسرہٹہ" کو بنایا جو شاہ گنج سے جنوب میں چندمیل کے فاصلے پر واقع ہے، مولانا مرحوم نے یہاں ۱۹۷۷ء م ۱۳۹۸ھ تک تدریسی خدمت انجام دی، پھر یہاں سے سبکدوش ہوکر وطن آگئے اور چند سال گھر پر ہی مقیم رہے، اس دوران شہر اعظم گڈھ کی مشہور درسگاہ "جامعۃ الرشاد" کی طرف سے مولانا کو تدریس کی پیش کش ہوئی، جسے قبول نہیں کیا۔

اسی زمانہ میں جب جامعۃ الفلاح بلریا گنج کے استاذ تفسیر مولانا جلیل احسن ندوی

فاضل دیوبند کا سانحہ ارتحال پیش آیا تو جامعہ کے اس وقت کے ناظم نے بحیثیت استاذ تفسیر جامعۃ الفلاح میں آنے کی دعوت دی، تو جامعہ کی ضرورت اور قرآن کی خدمت کے پیش نظر یہ دعوت قبول کر لی اور ۱۹۸۱ء م ۱۴۰۲ھ سے وہاں درس قرآن کا زریں سلسلہ جاری کر دیا۔

مگر مولانا موصوف کو یہاں تدریس کا موقع اور مقامات کی بہ نسبت کم ملا، ابھی مشکل سے سال ڈیڑھ سال کا زمانہ گزرا تھا کہ جامعۃ الفلاح سے گھر جاتے ہوئے راستہ ہی میں ان پر دماغی فالج کا حملہ ہوا، کچھ وقفہ کے بعد دوبارہ شدید حملہ ہوا جس کے صدمہ سے بالکل نڈھال ہو گئے اور چند یوم بستر علالت پر گزار کر ۴ر فروری ۱۹۸۳ء م ۱۴۰۴ھ کو کتاب الٰہی کا یہ خادم اللہ کی رحمت و رضوان کی آغوش میں پہنچ گیا۔

نماز جنازہ ان کے قدیم ساتھی اور رفیق درس مولانا اظہار الدین اصلاحی نے پڑھائی اور تدفین آبائی قبرستان بمھور میں عمل میں آئی، مولانا مرحوم کے پسماندگان میں ایک بیٹے مولوی اشہد ہیں اور ایک بیٹی تھیں جو ہمارے محب قدیم مولانا محمد مستقیم اعظمی فاضل دیوبند، حال صدر جمعیۃ علماء صوبہ مہاراشٹر سے منسوب تھیں، تقریباً ڈھائی تین سال ہو رہے ہیں کہ وہ بھی اپنے ابا جان کے پاس پہنچ گئیں۔

مولانا داؤد اکبر نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ کلام الٰہی کے پڑھنے پڑھانے اور اس کے تفسیری نکات کے فہم و تفہیم میں گزارا، مولانا مرحوم قرآن حکیم کے بلند پایہ عالم تھے، ان کا مطالعہ قرآن بڑا وسیع و عمیق تھا، آیات کے ترجمے نہایت عمدہ اور ادبی اسلوب میں کرتے تھے، قرآن عزیز کے مشکل مقامات اور اہم اسالیب کی توضیح و تشریح کے لئے ڈیڑھ درجن سے زائد علمی و تحقیقی مقالات و مضامین تحریر کئے جو معیاری و اہم مجلّات میں شائع ہوئے اور اوساط علمیہ میں تحسین اور پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھے گئے، ان کے علاوہ ''مشکلات القرآن'' اور ''قرآن مجید کا چیلنج'' کے نام سے دو کتابیں بھی تصنیف کیں جو اپنے صفحات کے اعتبار سے گو مختصر ہیں، مگر اپنے علمی و تحقیقی مواد کے لحاظ سے بہت سی ضخیم کتابوں پر بھاری ہیں۔ مولانا مرحوم کی یہ دونوں کتابیں عرصہ سے نایاب تھیں، مقام شکر

ہے کہ ان کے لائق وفائق نواسے ڈاکٹر محمد عارف عمری ولد مولانا محمد مستقیم اعظمی نے ان دونوں کتابوں کے ساتھ ''ماہنامہ الاصلاح سرائے میر'' میں شائع قرآن مجید سے متعلق مقالات نیز ان کے متروکہ قابل انتفاع مسودات کو دیکجا کر کے'' مولانا داؤد اکبر کے قرآنی مقالات'' کے نام سے ۲۰۰۷ء میں شائع کردیا ہے، ان خالص علمی و تحقیقی مضامین قیمہ کی اشاعت پر وہ علمی حلقوں کی جانب سے بجاطور پر مستحق شکریہ ہیں۔

مولانا اگرچہ رسمی طور پر سلسلۂ سلوک سے وابستہ نہیں تھے، مگر ان کی پوری زندگی اسلامی تصوف کا مرقع تھی، وہ بالکل سادہ مزاج تھے، لباس معمولی، اور اپنے ہاتھ سے دھل کر پہنتے تھے، جمعہ کی تیاری جمعرات ہی سے شروع کردیتے تھے، وہ پاک طینت، خوش اخلاق، قناعت پسند، اور تسلیم ورضا کے خوگر تھے، بزرگوں کا اعزاز واکرام، اور خردوں کے ساتھ شفقت وعنایت ان کی عادت ثانیہ تھی۔

اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کا ہمیشہ پاس ولحاظ رکھتے تھے، اہل حقوق کے حق کی ادائیگی میں ہمیشہ چاک وچوبند رہے، عملاً حنفی تھے مگر روادار ایسے کہ سب لوگ ان سے خوش اور راضی تھے۔ غرض مولانا اسلامی طرز حیات کے نمونہ تھے، ایسے نمونے اب کم سے کم تر ہوتے جارہے ہیں۔

کہیں سے آپ بقائے دوام لا ساقی

(انجمن طلبہ مدرسۃ الاصلاح کا سالانہ مجلّہ شمارہ ۹، ۱۹۹۶ء مرحوم اصلاحی شخصیات نمبر)

مولانا رفیق احمد نندانوی

مولانا ابوالفیض رفیق احمد بن حاجی عبدالشکور مرحوم ضلع اعظم گڈھ کے معروف گاؤں نندانواں کے نیک نام وقابل قدر فرزند تھے، تاریخ ولادت معلوم نہیں ہوسکی، غالباً 1918ء م ۱۳۳۷ھ کے حدود میں پیدا ہوئے ہونگے، پڑھنے کی ابتداء اپنے وطن کے مکتب سے کی، ناظرۂ قرآن مجید اردو وغیرہ کی مکتبی تعلیم مکمل کرلینے کے بعد اپنے مربی وسرپرست حضرت مولانا شبلی نندانوی (جن کی زیر تربیت مولانا کا بچپن گزرا) کے مشورہ

سے ''بیت العلوم سرائے میر'' میں داخل ہوئے، پھر چند سالوں کے بعد یہاں سے ''مدرسۃ الاصلاح سرائے میر'' میں آگئے، انھیں دونوں مدرسوں میں صرف، نحو، ادب، منطق، فقہ، اصول فقہ، تفسیر وغیرہ نصاب میں داخل متوسطات تک کی کتابیں پڑھ کر، اپنے مربی وسرپرست مولانا شبلی کے حکم سے اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور یہیں نصاب کی بقیہ کتابیں اور دورہ حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے، افسوس کہ مولانا موصوف کے تعلیمی و تحصیلی دور کی تفصیلات کا علم نہیں ہوسکا کہ کہاں کتنے سال اور کن اساتذہ سے پڑھا، اندازہ ہے کہ دیوبند میں تین سال سے کم قیام نہیں رہا ہوگا، اور فراغت ۱۳۵۷ھ م ۱۹۳۸ء میں ہوئی ہے، کیونکہ آپ کے مخدوم ومربی حضرت مولانا شبلی کا حادثہ وفات اگست ۱۹۳۸ء میں شہر مظفر نگر میں پیش آیا ہے، جہاں وہ اپنے ایک مرید شیخ اکرم کے یہاں مقیم تھے، دوران علالت جس کا سلسلہ تقریباً ایک ماہ جاری رہا تیمارداری کی خدمت شیخ اکرم کے علاوہ مولانا رفیق احمد صاحب نے بھی انجام دی تھی، جو اس وقت دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھے، مدرسہ سے رخصت لے کر خدمت کے لئے مظفر نگر آگئے تھے۔ مولانا کی تعلیم کا غالباً یہ آخری سال تھا۔

مولانا مرحوم ذکاوت وذہانت، حاضر دماغی اور علمی استحضار میں امتیازی شان کے مالک تھے، علمی صلاحیت اعلیٰ درجہ کی اور فنی استعداد نہایت پختہ تھی، نصاب میں داخل جملہ فنون کی کتابیں بے تکان پڑھاتے تھے، فراغت کے بعد ہی سے درس وافادہ کا سلسلہ شروع کردیا تھا، اس لئے تدریسی تجربہ بھی اچھا تھا، درس وتدریس کا یہ سلسلہ زندگی کے آخری وقت تک جاری رہا، تقریباً ترپن سال کے اس تدریسی سفر میں مولانا مرحوم نے حسب ذیل مدارس میں بحیثیت صدر مدرس کے درس وافادہ کی محفل سجائی۔

جامعہ اسلامیہ مدن پورہ بنارس، مدرسہ قرآنیہ بڑی مسجد (جامع الشرق) جونپور، مدرسہ مفیض العلوم لاردیوریا، مدرسہ دارالعلوم فاروقیہ کاکوری لکھنؤ، مدرسہ بیت العلوم بہروا چندن پور گورکھپور۔

مولانا مرحوم ایک کریم النفس، رحم دل، ملنسار خوش اطوار انسان اور جید الاستعداد،

کامیاب معلم ومدرس تھے، البتہ مزاج میں قدرے تیزی تھی، انتظامی رسوم وقیود اور حدبندیوں کی پاسداری بھی حریت پسند طبیعت پر گراں گذرتی تھی، اس لئے اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود کسی جگہ جم کر کام نہیں کر سکے، جس کی بناء پر ان کی علمی صلاحیتیں پورے طور پر بروئے کار نہیں آسکیں۔

تقریباً نصف صدی کے اس مسلسل رواں دوران علمی سفر کا تھکا ہارا مسافر اپنے پیچھے اپنے تلامذہ کا ایک کارواں چھوڑ کر ۲۱ ؍ربیع الاوّل ۱۴۱۲ھ م ۱۹۹۱ء کو آسودۂ منزل ہو کر اپنے وطنی قبرستان میں ہمیشہ کے لئے محو استراحت ہو گیا۔

(معلومات از مولانا عبدالحق زید مجدہ داماد مولانا مرحوم وصاحب زادہ ضیاء اللہ فیضی)

مولانا شبیر احمد حاجی پوری

مولانا شبیر احمد بن مولوی حافظ محمد اسماعیل ضلع اعظم گڈھ کے معروف عالم دین اور نامور خطیب مولانا ضمیر احمد رحمہ اللہ کے برادر خرد ہیں، مولانا موصوف کی ولادت لگ بھگ ۱۹۲۶ء م ۱۳۴۵ھ میں اپنے آبائی وطن حاجی پور میں ہوئی، گھر پر ناظرۂ قرآن، ابتدائی اردو وغیرہ مکتبی تعلیم کے بعد تقریباً دس برس کی عمر میں مدرسہ بدرالاسلام شاہ گنج ضلع جونپور میں حضرت مولانا جمیل احمد جون پوری کی تعلیم وتربیت میں آ گئے، اور انھیں کی خدمت میں رہ کر پوری یک سوئی اور توجہ ومحنت سے فارسی سے لے کر مشکوٰۃ، ہدایہ اخرین وغیرہ تک کی کتابیں پڑھیں، مولانا جمیل احمد صاحبؒ ایک اعلیٰ درجہ کے مدرس ومعلم اور مردم ساز مربیؒ بھی تھے، مولانا نے اپنے اس لائق ومحنتی شاگرد کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی اور انھیں اپنی عنایتوں سے اچھی طرح آراستہ پیراستہ کر کے اعلیٰ تعلیم کے لئے دیوبند بھیج دیا۔ چنانچہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر اس وقت کے اساتذۂ علیا سے دورۂ حدیث کی تحصیل وتکمیل کر کے ۱۹۴۹ء م ۱۳۶۹ھ میں فاتحہ فراغ پڑھی، مولانا مرحوم کے دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی شیخ الحدیث وصدر المدرسین، حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی

امروہوی، حضرت مولانا فخر الحسن مرادآبادی، حضرت مولانا بشیر احمد خاں بلند شہری رحمہم اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت مولانا جمیل احمد صاحب جونپوریؒ نے اپنے اس ہونہار تلمیذ کو مدرسہ بدرالاسلام شاہ گنج میں مدرس رکھ لیا، مولانا شبیر احمد رحمہ اللہ کی علمی نشوونما بدرالاسلام ہی کے آغوشِ تربیت میں ہوئی تھی، اسی کی علمی وروحانی فضاؤں میں پروان چڑھے تھے، جس کا انھیں پورا پورا احساس تھا، اس لئے یہاں تقرر ہوجانے کے بعد ہر طرف سے بے نیاز ہوکر بس "بدرالاسلام" ہی کے ہو گئے اور اپنی تمام توانائیاں اسی کی تاریخ سازی میں صرف کردیں، مولانا مرحوم ایک باصلاحیت عالم وفاضل تھے، صرف، نحو، ادب، بلاغت، منطق، فلسفہ، فقہ، اصول فقہ وغیرہ نصاب میں داخل ہر فن کی کتابیں پڑھاتے تھے اور خوب پڑھاتے تھے، طلبہ کو اس وقت تک نہیں چھوڑتے تھے جب تک کہ انھیں اچھی طرح سبق سمجھ میں نہ آجائے، پڑھانے کا شغف اس قدر تھا کہ بیماری کی حالت میں بستر علالت پر لیٹے لیٹے عبارت پڑھوا کر درس کی تقریر کردیتے تھے، سبق کا ناغہ بار خاطر تھا اس لئے ہر مشقت برداشت کر کے سلسلۂ درس کو جاری رکھتے، مولانا نہ واعظ وخطیب تھے، اور نہ ہی مضمون نگار ومصنف وہ صرف اور صرف مدرس ومعلم تھے ان کے دن رات کا مشغلہ درس وتدریس ہی تھا، انھیں کو اپنی مادر علمی بدرالاسلام سے محبت وتعلق عشق کی حد تک تھا، وہ خانگی ضروریات کے تحت گھر بھی جاتے تو فکر وخیال بدرالاسلام ہی کا رہتا اس لئے جلدی جلدی خانگی ضروریات ومعاملات کو نبٹا کر مدرسہ واپس آجاتے تھے۔

مولانا مرحوم بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح مرضِ تنفس کے شکار تھے، ضعف پیری کے بڑھنے کے سات مرض بھی بڑھتا رہا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ آپ درس وتدریس سے معذور ہو گئے، مگر اس حال میں بھی بدرالاسلام مدرسہ کو نہیں چھوڑا بالآخر اسی کے ایک حجرہ میں روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی، یہ حادثہ ۸/جون ۲۰۰۴ء م ۱۴۲۵ھ بروز منگل کو پیش آیا۔ میت شاہ گنج سے وطن حاجی پور لائی گئی اور خاندانی قبرستان

میں تدفین عمل میں آئی۔

اپنے برادر کبیر مولانا ضمیر احمد جامعہ شرقیہ لونیہ ڈیہہ کے بانی وشیخ الجامعہ، کی وفات ۱۹۹۰م ۱۴۱۰ھ کے بعد جامعہ شرقیہ کے شیخ الجامعہ منتخب ہوئے اور تاحیات اس منصب پر فائز رہے، اپنی مستقل علالت کی وجہ سے جامعہ میں شاذ ونادر تشریف لا پاتے تھے اس لئے فکر وتاسف بھرے لہجے میں کہا کرتے تھے کہ کیا بتاؤں میں جامعہ پہنچ نہیں پاتا ہوں اورلوگوں نے مجھے ذمہ دار بنادیا ہے۔

مولانا مرحوم بڑے بااخلاق اور ملنسار تھے۔ یہ بندۂ ناچیز جب کبھی بدرالاسلام میں حاضر ہوتا تو اطلاع پاتے ہی فوراً تشریف لاتے، دارالعلوم دیوبند کے احوال وکوائف معلوم کرتے، خود میری مصروفیات کے بارے میں پوچھتے اور بطور خاص یہ بزرگانہ مشورہ دیتے کہ کھانے اور سونے کے اوقات کی پابندی کا لحاظ ضرور رکھنا، اور بوقت واپسی بالعموم یہ محبت آمیز شکوہ ضرور کرتے کہ تم تو بدرالاسلام آتے ہی نہیں۔

رہن سہن میں سادگی کے باوجود ایک نوع کا بانکپن تھا، عام طور پر کرتا پائجامہ سفید اورصاف ستھرا ہوتا تھا، جماعتِ علماء میں سے حضرت شیخ الاسلام اوران کی اولاد سے بیحد تعلق تھا، ضعف وبیماری کے باوجود جب حضرت فدائے ملت مولانا سید اسعد مدنی بیت العلوم سرائے میر کے سالانہ جلسہ میں تشریف لاتے تو ان سے ملاقات کے لئے شاہ گنج سے سرائے میر ضرور آتے۔

مولانا شمس الدین حسینی مبارک پوری

مولانا شمس الدین حسینی اپنے معاصر علماء مبارک پور میں زہد واتقا، تواضع ومسکنت، صبر واستقامت، اور عبادت وریاضت میں نمایاں مقام ومرتبہ کے حامل تھے، ان کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ہوسکی، مولانا محمد عثمان ساحر مبارک پوری، مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے معاصرین میں سے تھے، اس لیے اندازہ یہی ہے کہ ۱۹۱۵ء کے حدود میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

اردو، فارسی اور نحو وصرف وغیرہ کی ابتدائی تعلیم جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں حاصل کر کے مدرسہ شاہی مرادآباد چلے گئے تھے، وہیں نصاب کی اکثر کتابیں پڑھیں، مرادآباد کے اساتذہ میں: مولانا فخر الدین شیخ الحدیث مرادآبادی، مولانا محمد میاں دیوبندی وغیرہ زیادہ مشہور ہیں، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور ۱۳۵۷ھ میں دورۂ حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہو گئے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، سے صحیح بخاری، اور جامع ترمذی پڑھنے کا شرف انھیں حاصل ہے، دارالعلوم دیوبند کے دیگر مشاہیر اساتذہ میں حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، حضرت شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علی امروہوی، حضرت مولانا سید فخر الحسن مرادآبادی، حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی مہتمم دارالعلوم وغیرہ ہیں۔

فراغت کے بعد اپنے استاذ بخاری حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہ سے بیعت ہو گئے تھے، اپنے استاذ و شیخ حضرت مدنی سے غایت درجہ عقیدت رکھتے تھے، اسی بناء پر اپنے آپ کو حسینی کہتے اور لکھتے تھے، حضرت اقدس مولانا مدنی رحمہ اللہ بھی ان پر شفقت وعنایت فرمایا کرتے تھے۔

تعلیم و تحصیل سے فارغ ہو جانے پر اپنے استاذ مولانا فخر الحسن کی تجویز پر تاؤلی ضلع مظفر نگر میں مدرس ہو گئے تھے، کچھ دنوں یہاں تدریسی خدمت انجام دے کر گھر مبارکپور چلے آئے اور مدرسہ احیاء العلوم میں پڑھانے لگے، عام طور پر یہاں، نور الایضاح، ہدایۃ النحو، کافیہ، علم الصیغہ، فصول اکبری اور ترجمہ قرآن مجید وغیرہ کتابیں ان سے متعلق رہیں۔

مولانا محمد عارف جہاناگنجی، مولانا جمیل احمد والد ماجد مولانا محمد عارف مبارکپوری، مولانا مفتی محمد امین مبارک پوری وغیرہ ان کے تلامذہ میں سے ہیں۔ مولانا عبدالباری قاسمی کے عہد نظامت میں، مولانا شمس الدین مرحوم ایک طویل عرصہ تک نائب ناظم رہے، اور بڑے خلوص اور لگن سے جامعہ احیاء العلوم کی خدمت کی، جامعہ کی چھوٹی سی چھوٹی خدمت بھی اسی طرح انجام دیتے جس طرح انتظام واہتمام کی ذمہ داریوں کو پورا کرتے تھے، پھر کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ جامعہ احیاء العلوم کی رسمی ذمہ داریوں سے علیحدہ ہو کر

جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ ہو گئے، جمعیۃ سے یہ وابستگی زندگی کے آخری لمحہ تک قائم رہی۔

مولانا عبدالباری قاسمی کی وفات کے بعد جامعہ احیاء العلوم کی مجلس انتظامیہ نے انھیں ناظم منتخب کیا، انھوں نے اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے اس اہم منصب کے قبول کرنے سے انکار کیا، لیکن مجلس نے اصرار کر کے یہ ذمہ داری ان کے کاندھوں پر ڈال دی، جسے انھوں نے ضعف ناتوانی کے باوجود بحسن وخوبی انجام دی، اس زمانے میں نامساعد حالات بھی پیش آئے، مگر وہ پوری استقامت اور پامردی کے ساتھ ان سے گذر گئے، آخر میں جب عمر زیادہ ہو گئی، اور قوی بھی اس بار گراں کے تحمل کے لائق نہیں رہے بالخصوص سماعت سے بالکل معذور ہو گئے تو نظامت کے منصب سے مستعفی ہو گئے، مگر جامعہ سے اخلاص ومحبت کا تعلق بدستور قائم رہا۔

عمر کے آخری حصہ میں مولانا حسینی مرحوم بڑے صبر آزما امتحانات سے گذرے، ان کے دو عالم وفاضل، برسرروزگار جواں سال فرزند یکے بعد دیگرے حادثہ کا شکار ہو کر بے شان وگمان اچانک اللہ کو پیارے ہو گئے، مگر یہ کوہ استقامت بن کر راضی برضاء الٰہی رہے، ان کے منجھلے صاحبزادے مولوی مبارز الدین جو دارالعلوم دیوبند میں خاکسار کے رفیق تھے، ۲؍جولائی ۱۹۸۰ء م ۱۴۰۱ھ کو بذریعہ ٹرین بمبئی کے لیے روانہ ہوئے، ۳؍جولائی کو ناسک اسٹیشن پر کسی ضرورت سے اترے، اتنے میں ٹرین چل پڑی، انھوں نے دوڑ کر ٹرین پکڑنے کی کوشش کی پاؤدان پر پیر رکھ کر ہاتھوں سے دروازے پر لگے راڈ کو پکڑا مگر ہاتھ پھسل گیا اور یہ چلتی ٹرین سے نیچے گر گئے، اس جانکاہ حادثہ کی خبر جب مبارک پور پہنچی تو متعلقین اس تذبذب میں رہے کہ مولانا کو اس غیر متوقعہ حادثہ کی اطلاع کیسے دی جائے، بہر حال انھیں اس کی خبر دی جانی تھی جو دی گئی، جواں سال لخت جگر کی اس اچانک موت کی خبر پر زبان سے اناللہ، اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، مگر اس صبر کے پہاڑ کے منھ سے آہ وبکا کے ایک لفظ بھی نہیں نکلے اور فرمان الٰہی ”واستعینوا بالصبر والصلوۃ“ کی بجا آوری میں اس اندوہناک خبر کو سن کر فوراً وضو کیا اور نفل میں مشغول ہو گئے، جامعہ احیاء العلوم اور بعد میں جمعیۃ علماء ہند کی تنظیم وترقی کے سلسلے

میں کثرت سے اسفار کرتے تھے، جہاں جاتے لوگ ان کی پاک نفسی کی بناء پر ان کے ساتھ عزت واحترام کا معاملہ کرتے تھے، متعدد بار حج وعمرہ کی غرض سے حرمین شریفین بھی حاضر ہوئے، مولانا کے متعلقین بتاتے ہیں کہ اٹھارہ حج کیے تھے۔

ان کے استاذ ومرشد حضرت اقدس مولانا مدنی قدس سرہ تحریک آزادی کے عظیم مجاہد تھے، مولانا حسینی مرحوم پر بھی یہ رنگ چڑھا ہوا تھا، آزادی کی جنگ میں ایک نڈر سپاہی کی طرح اس میں شریک رہے اور اس راہ کی صعوبتیں برداشت کیں، مجاہدین آزادی کی فہرست میں یہ بھی شمار ہوتے تھے۔

مولانا مرحوم کے پیروں میں جب تک سکت رہی جہد وعمل میں مشغول رہے بالخصوص جمعیۃ علماء ہند کے سلسلے میں ان کے اسفار کا سلسلہ آخر تک جاری رہا، سال میں دو ایک مرتبہ دیوبند بھی حاضر ہوتے تھے، اس موقع پر مولانا کا قیام عام طور پر بندہ ہی کے کمرہ میں ہوتا تھا، دیوبند آتے ہی میری قیام گاہ پر تشریف لاتے، سامان وغیرہ رکھتے اور بے تکلفی کے ساتھ فرماتے کہ میرے کھانے کے لیے انتظار مت کرنا اگر وقت پر آگیا تو ساتھ کھالوں گا، میرا بار بار کا مشاہدہ ہے کہ مولانا پچھلے پہر بستر چھوڑ دیتے تھے، صبح صادق سے تقریباً ڈھائی تین گھنٹہ قبل بیدار ہو جاتے ضرورت سے فارغ ہو کر نوافل اور ذکر وفکر میں مشغول رہتے، آخر عمر میں مصائب کے ساتھ امراض کی بھی کثرت ہوگئی تھی، اور تن ومند جسم گھل کر ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوگیا تھا، اس چلنے پھرنے سے معذوری کے زمانہ میں عبادت وریاضت میں بہت اضافہ ہوگیا تھا، اسی حالت میں ۱۹ر جمادی الاخری ۱۴۲۱ھ م ۱۹ر ستمبر ۲۰۰۰ء سہ شنبہ کی صبح کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنے رب غفور وشکور کے دربار رحمت میں پہنچ گئے۔ ”عمر بھر کی بے قراری کو قرار آہی گیا“

مولانا صدر الدین اصلاحی

مولانا صدر الدین اصلاحی بن حافظ عبد الجلیل خاں اپنے آبائی وطن سیدھا سلطانپور میں ۱۷-۱۹۱۶ء م ۳۶-۱۳۳۵ھ میں پیدا ہوئے، مولانا کا نسبی تعلق افغانستان کے

یوسف زئی قبیلہ سے ہے، لودھی سلطنت کے بانی بہلول خاں لودھی کے عہد ۸۵۵-۸۹۴ھ م ۱۴۵۱-۱۴۸۸ء میں قبیلہ یوسف زئی کے کچھ لوگ افغانستان سے نقل مکانی کر کے ہندوستان میں آبسے تھے، سلطنت شرقیہ جون پور (بزمانہ حسین شاہ شرقی) پر سلطان بہلول لودھی کے حملہ کے دوران انھیں خوانین کے ایک فرد ''سالار خاں'' نے سلطان بہلول کی فوج میں شامل ہو کر قابل قدر جرأت وشجاعت کا مظاہرہ کیا، اس کے صلہ میں سلطان کی جانب سے سالار خاں کو ''سی دہ'' تیس دیہات (گاؤں) عطا ہوئے، یہی ''سی دہ'' کثرت استعمال سے ''سیدھا'' مشہور ہو گیا، ان تیس گاؤں میں سے ایک سلطان پور بھی تھا جہاں ''سالار خان'' اپنے خاندان کے ساتھ آباد ہوئے، اسی لئے اسے سیدھا سلطانپور کہا جانے لگا، یہی ''سالار خان'' مولانا اصلاحی کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔

شجرۂ نسب یہ ہے:

مولانا صدرالدین، بن عبدالجلیل خاں، بن بہادر خاں، بن بدّل خاں، بن غلام حسین خاں، بن ہمت خاں، بن فیض خاں، بن الٰہی خاں، بن کریم خاں، بن ہیبت خاں، بن شاہ محمد خاں، بن سالار خاں۔

مولانا اصلاحی صاحب نے تعلیم کا آغاز اپنے آبائی وطن سیدھا سلطان پور سے کیا، اور اپنے نانیہال ''بندول'' میں پرائمری تعلیم کی تکمیل کی اور مڈل ۱۹۲۹ء میں ''بلریا گنج'' ضلع اعظم گڈھ میں پاس کیا، پھر اپنی والدہ ماجدہ کی خواہش پر یکم نومبر ۱۹۲۹ء م ۱۳۴۸ھ میں اپنے پڑوس کی مشہور درسگاہ ''مدرستہ الاصلاح'' کے درجہ سوم مکتب میں داخل ہو گئے، اس وقت آپ کی عمر بارہ سال تھی، اور آٹھ سال کی مدت میں یہاں کا نصاب مکمل کر کے ۱۹۳۷ء م ۱۳۵۶ھ میں سند فضیلت حاصل کی، مولانا مرحوم کی پوری تعلیم ''مدرستہ الاصلاح'' میں ہی ہوئی ہے البتہ ۱۹۳۲ء م ۱۳۵۱ھ میں اپنے رفیق درس مولانا محمد ادریس سرائے میری کے ساتھ چپکے سے دارالعلوم چلے گئے تھے، چنانچہ مولانا اپنے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں ''۱۹۳۲ء میں خاموشی سے دیوبند چلا گیا کہ بڑا مدرسہ ہے، وہیں تعلیم حاصل کروں گا میں وہاں آٹھ مہینے رہا، اصول الشاشی، قدوری، نفحۃ الیمن وغیرہ پڑھی

اور امتحان بھی دیا، لیکن دل نہیں لگا'' (حیات نوبلریا گنج خصوصی اشاعت ص ۲۶) مولانا اصلاحی مرحوم دار العلوم کے اپنے اساتذہ میں مولانا جلیل احمد کیرانوی سے زیادہ متاثر ہوئے۔

آپ کے اہم اساتذہ یہ ہیں:

مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا نجم الدین اصلاحی، مولانا شبلی متکلم ندوی، مولانا حکیم محمد احمد لہراوی، مولانا محمد سعید ندوی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبد الصمد ندوی رحمہم اللہ ان میں بطور خاص مولانا نجم الدین اصلاحی کا ان کی علمی وقلمی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ہے۔

مولانا اصلاحی مرحوم نے درسی کتابوں پر پوری توجہ دینے کے ساتھ قرطاس وقلم کی ریاضت بھی جاری رکھی تھی، چنانچہ دورانِ تعلیم ہی ''البیان'' کے نام سے ماہانہ قلمی رسالہ نکالنا شروع کر دیا تھا، جس کے مارچ ۱۹۳۵ سے دسمبر ۱۹۳۵ تک آٹھ شمارے منظر عام پر آئے، اور مولانا عبد السلام ندوی جیسے صاحب علم وقلم سے داد تحسین حاصل کیا، علاوہ ازیں اس زمانہ میں آپ کے لکھے ہوئے بعض مقالات کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اپنے وقیع مجلّہ ''ترجمان القرآن'' میں بھی شائع کئے؛ بلکہ یہی مقالات بعد میں دونوں کے درمیان قربت و یگانگت کا ذریعہ بنے، چنانچہ تعلیم سے فراغت کے دو ماہ بعد مئی ۱۹۳۸ء م ۱۳۵۷ھ میں مولانا مودودی صاحب کی طلب پر ان کی خدمت میں پٹھان کوٹ حاضر ہو گئے، اور اس وقت سے اواخر ۱۹۴۰ء م ۱۳۵۹ء تک وہ مولانا مودودی صاحب کی خدمت میں دار الاسلام پٹھان کوٹ میں رہ کر ''ترجمان القرآن'' کی تیاری میں مولانا مودودی صاحب کا ہاتھ بٹاتے رہے، مضامین تحریر کرتے، ترجمے کرتے، تبصرہ کے لئے آئی ہوئی کتابوں پر تبصرے لکھتے، اور بسا اوقات ''اشارات'' بھی سپرد قلم کرتے، اسی زمانے میں ان کی معرکۂ اسلام و جاہلیت، اسلام و اجتماعیت اور حقیقت نفاق تصانیف وجود میں آئیں۔

۱۹۴۰ء م ۱۳۵۹ھ کے اواخر میں وہ وطن آئے تو شدید جنگی حالات کی وجہ سے

واپسی نہیں ہوسکی، اسی وقفہ میں اپنے محترم استاذ مولانا امین احسن اصلاحی کے ایماء پر جون ۱۹۴۱ء م ۱۳۶۰ھ میں ''دارالعلوم جمعیۃ اسٹرینڈ روڈ رنگون (برما) چلے گئے، ان کے قیام رنگون ہی کے دوران ۲۵ تا ۲۹/ اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں ''جماعتِ اسلامی کا تاسیسی اجتماع ہوا، چونکہ اس سے قبل مولانا مودودی کی ''تحریک دارالاسلام'' کے آپ باضابطہ رکن تھے، اس لئے اس تاسیسی اجتماع میں شریک نہ ہونے کے باوجود ''جماعت اسلامی'' کے ارکان میں انھیں بھی شامل رکھا گیا، جس کی اطلاع دیتے ہوئے مولانا مودودی صاحب نے لکھا ''چونکہ تم بڑے دور ودراز مقام پر تھے اس تاسیسی اجتماع میں تمھیں نہیں بلایا جاسکا، بہر حال اب جبکہ جماعت اسلامی قائم کی جاچکی ہے، اس کے رکن کی حیثیت سے وہاں دعوتی فرائض انجام دیتے رہو۔''

رنگون چونکہ ان کے لئے ایک اجنبی جگہ تھی علاوہ ازیں یہاں کے حالات بہت خراب تھے، اس لئے چھ ماہ کے بعد دسمبر ۱۹۴۱ء میں وطن لوٹ آئے اور حصار موجودہ ہریانہ میں جہاں جماعت اسلامی کا ایک مدرسہ قائم کیا گیا تھا، پڑھانے لگے، ۱۹۴۵ء م ۱۳۶۵ھ میں جب جماعت اسلامی کے اولین کل ہند اجتماع کا انعقاد ہوا تو ایک رکن کی حیثیت سے اس میں شرکت کی، اسی موقع پر یہ طے ہوا کہ وہ مرکز میں قیام کریں، چنانچہ اس فیصلہ کے تحت وہاں ٹھہر گئے، لیکن چند مہینے ہی قیام رہا ہوگا کہ ۱۹۴۶ء میں ان کی مادر علمی ''مدرستہ الاصلاح'' ایک ناگفتنی بحران میں پھنس گیا، تو مدرسہ کو اس بحران سے نکالنے اور حالات کو سازگار بنانے کے لئے مدرسہ کے اس وقت کے نائب ناظم مولانا بدرالدین اصلاحی کی طلب پر مولانا اصلاحی مرحوم جماعت اسلامی کے مرکز لاہور سے، مولانا ابوبکر اصلاحی بستی کے ایک مدرسہ سے اور مولانا ابواللیث ندوی اکولہ مہاراشٹر کے مدرسہ سے مدرستہ الاصلاح سرائے میر پہنچے، مولانا اصلاحی صاحب کے بارے میں اس وقت یہ طے کیا گیا تھا کہ ''مدرستہ الاصلاح'' کے حالات درست ہوجائیں گے تو انھیں واپس جماعت کے مرکز لاہور میں بلالیا جائے گا، لیکن ملک کی تقسیم نے ایسی دیوار کھڑی کردی کہ پھر تاحیات مولانا مودودی صاحب سے ملاقات نہ ہوسکی۔

مولانا اصلاحی مرحوم نے ۱۹۴۶ء م ۱۳۶۶ھ سے ۵ر فروری ۱۹۵۰ء م ۱۳۷۰ھ تک تقریباً چار سال مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں تدریسی خدمت انجام دی، یوں تو انھیں ہر فن میں دستگاہ حاصل تھی، لیکن ادب وتفسیر ان کا خصوصی موضوع تھا، طریقہ درس بڑا عالمانہ ومحققانہ تھا، زور استدلال اس قدر مضبوط کہ کسی اشکال واعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑتے تھے، مولانا پورے ذوق وشوق کے ساتھ مصروف درس وافادہ تھے کہ اس وقت کے امیر جماعتِ اسلامی ہند مولانا ابواللیث ندوی نے انھیں شعبہ تحقیق وتصنیف کے لئے جماعت کے مرکز آنے کی دعوت دی، تو آپ مسند تدریس کی بجائے سریر آرائے مسند تحقیق وتصنیف ہو گئے، غالباً اس کے بعد باقاعدہ مولانا اصلاحی مرحوم کو درس وتدریس کا موقع میسر نہیں ہوا، بس متاعِ لوح وقلم ہی سے لوگوں کو مالا مال کرتے رہے۔

مولانا اصلاحی مرحوم کا تصنیفی سفر اگرچہ بزمانۂ طالب علمی ۱۹۳۵ء میں ہی شروع ہو گیا تھا، لیکن ۱۹۵۰ء سے تو وہ پورے طور پر تحقیق وتصنیف کے ہو کر رہ گئے تھے۔

مولانا کی تصانیف:

(۱) دین کا قرآنی تصور، (۲) فریضۂ اقامت دین، (۳) اساس دین کی تعمیر، (۴) معرکۂ اسلام وجاہلیت، (۵) اسلام اور اجتماعیت، (۶) مسلمان اور امامت کبریٰ، (۷) حقیقت نفاق، (۸) قرآن مجید کا تعارف (۹) اسلام ایک نظر میں، (۱۰) راہ حق کے مہلک خطرے، (۱۱) نکاح کے اسلامی قوانین، (۱۲) دین کا مطالعہ (۱۳) یکساں سول کوڈ (۱۴) مسلم پرسنل لا دینی وملی نقطۂ نظر سے، (۱۵) مسلمان اور دعوت اسلام، (۱۶) تحریک اسلامی ہند (۱۷) اسلامی نظام معیشت، (۱۸) اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ، (۱۹) حقیقت عبودیت، (۲۰) تلخیص تفہیم القرآن، (۲۱) تیسیر القرآن وغیرہ۔

مولانا اصلاحی مرحوم جماعت اسلامی کی باضابطہ رسمی تاسیس وتشکیل سے پہلے ہی مولانا مودودی صاحب سے وابستہ ہو گئے تھے اور مولانا مودودی نے جب تحریک دارالاسلام تشکیل دی تو اس کے چھ ارکان میں سے ایک مولانا اصلاحی بھی تھے اور جب جماعت اسلامی کی تاسیس ہوئی تو اسی قدیم تعلق کی بناء پر اس موقع پر حاضر نہ ہونے کے

باوجود جماعت کے تاسیسی رکن مقرر ہوئے، اور تادم واپسیں برقرار رہے، حالانکہ ان کے بہت سے رفقاء واساتذہ دوران سفر اس قافلہ سے الگ ہوگئے، مگر ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی وہ زندگی بھر ایک مخلص و بے لاگ خادم کی حیثیت سے سرد و گرم حالات کو انگیز کرتے ہوئے جماعت سے وابستہ رہے۔

وہ اپنی بساط کی حد تک جماعت کی خدمت کرتے رہے، دراصل اپنی ان تصانیف سے بھی انھوں نے جماعت اسلامی ہی کی خدمت انجام دی ہے، یہ ایک واقعہ ہے کہ مولانا اصلاحی، اپنے علم وفہم، فکر ونظر، بانئ جماعت سے قدیمی رفاقت اور ان کے افکار ونظریات سے ہم آہنگی کے لحاظ سے جماعت اسلامی کے حلقہ میں اپنا الگ منفرد مقام رکھتے تھے، اس میں بلا استثناء ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا اپنی علمی وفکری صلاحیتوں کے اعتبار سے اپنے عہد کے بلند پایہ عالم ومفکر تھے، اگر ایک خاص دائرہ میں محدود رہ کر کام کرنے کے بجائے وسیع ماحول میں انھیں کام کا موقع ملا ہوتا تو ان کے مأثر وباقیات کی افادیت بڑی ہمہ گیر ہوتی۔ ماشاء اللہ کان۔

مولانا اصلاحی مرحوم کثیر العیال تھے، خانگی جملہ ضروریات کے متکفل تنہا وہی تھے، اس لئے زندگی کا ایک بڑا حصہ عسرت اور تنگ دستی میں بسر ہوا، مگر استغناء اور بے نیازی کی یہ شان تھی کہ اپنے احوال کی کسی اپنے و پرائے کو خبر نہیں لگنے دی، اپنا رہن سہن اس طرح بنائے رکھا کہ لوگ آپ کو پوری طرح فارغ البال ہی سمجھتے تھے، آخر میں اللہ تعالیٰ نے رزق کا دروازہ آپ پر کشادہ کردیا تھا، آخر میں نماز باجماعت کا اہتمام، اور ذکر وتلاوت کا التزام بڑھ گیا تھا، مولانا موصوف ایک اعلیٰ درجہ کے عالم، بلند پایہ محقق ومصنف ہی نہیں تھے، وہ ایک اچھے استاذ، ایک اچھے باپ، ایک اچھے بھائی، اچھے پڑوسی اور ایک اچھے انسان بھی تھے۔

وہ ایک طویل عرصہ سے بعض بیماریوں کا شکار تھے، پھر زیادتی عمر کے ساتھ امراض بھی زیادہ ہوتے گئے، تو اپنے اقامتی مکان قصبہ پھول پور ہی میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوگئے تھے، آخر میں تو کثرتِ امراض سے گویا صاحب فراش ہوگئے تھے، آخر اس بیماری

کی حالت میں ۱۳؍نومبر ۱۹۹۸ء م ۱۴۱۹ھ کو پیغام اجل آ گیا اور آپ نے جان جانِ آفریں کے حوالہ کر دی۔ تدفین قصبہ پھول پور کے قبرستان میں عمل میں آئی۔

(ماخوذ ماہنامہ حیاتِ نو خصوصی اشاعت رمضان۔ذی الحجہ ۱۴۲۱ھ م جنوری۔اپریل ۲۰۰۰ء)

مولانا ضمیر احمد حاجی پوری

مولانا ضمیر احمد ولد مولوی حافظ محمد اسماعیل ۱۳؍ربیع الاوّل ۱۳۴۳ھ م ۱۳؍اکتوبر ۱۹۲۴ء دوشنبہ کے دن اپنے آبائی وطن حاجی پور ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، موضع حاجی پور، قصبہ پھولپور سے جانب شمال مغرب تقریباً چار پانچ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے، اسی نسبتاً غیر معروف بستی کو مولانا ضمیر احمد جیسے بلند پایہ، عالم دین اور نامور خطیب کے مَولَد ومَنشأ ہونے کا فخر حاصل ہے، مولانا ضمیر احمد صاحب کا گھر اور خاندان حاجی پور میں علم، دین اور دولت ہر اعتبار سے ممتاز تھا۔

مولانا مرحوم کے والد بزرگوار مولوی حافظ محمد اسماعیل، بریلوی مسلک کے بانی مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے شاگرد اور مرید وخلیفہ تھے، اور اس دیار میں بریلوی مسلک کے داعی ومبلغ بھی تھے، اور اہل حق بالخصوص علمائے دیوبند کے شدید مخالف کہ ان کا نام سننا بھی انھیں گوارا نہیں تھا، سنسکرت زبان پر انھیں عبور حاصل تھا، ہندی اور سنسکرت میں بے تکلف تقریر کرتے تھے۔

اسے کرشمۂ خداوندی اور مولوی محمد اسماعیل کی خوش بختی کہئے کہ ان کی ابتک کی زندگی علمائے حق کے ساتھ مخاصمت میں گزری تھی، لیکن خدا کا چاہا ایسا ہوا کہ انھوں نے از خود اپنے فرزند ارجمند کو دارالعلوم دیوبند کی معنوی شاخ مدرسہ بدرالاسلام قصبہ شاہ گنج میں تعلیم وتربیت کے لئے داخل کر دیا، جہاں علمائے دیوبند کے دو خاص معتمد مولانا دین محمد صاحب اور مولانا جمیل احمد جون پوری (جو دیار مشرق کے نامور عالم تھے) کا فیض علم وتربیت پوری فراوانیوں کے ساتھ جاری تھا، مولانا جمیل احمدؒ کی شخصیت میں قدرت نے ایسی مقناطیسی صفت ودیعت کی تھی کہ ان کی تربیت میں جو آ گیا وہ زندگی بھر کے لئے

انھیں کا ہو جاتا تھا۔

ان دونوں بزرگوں کو مولوی محمد اسماعیل کے مسلک و مشرب سے اچھی طرح واقفیت تھی، اس لئے دونوں حضرات نے ان کے نونہال مولانا ضمیر احمد کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی اور اس لوح سادہ کو اپنے رنگ سے رنگین کر دیا، مولانا ضمیر احمد صاحب نے جب بدر الاسلام کے فارسی و عربی چہار سالہ نصاب کی تحصیل مکمل کر لی تو مولانا جمیل احمد صاحب رحمہ اللہ اپنی حسن تدبیر اور حکمتِ عملی سے مولانا ضمیر احمد صاحب کے والد کو اس پر آمادہ کر لیا کہ آگے کی تعلیم کے لئے انھیں دیوبند بھیج دیں، چنانچہ اک گونہ تشویش کے باوجود انھوں نے صاحبزادے کو دار العلوم دیوبند میں پڑھنے کے لئے روانہ کر دیا، اس زمانہ میں دار العلوم دیوبند حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی، علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب وغیرہ جیسے اساطین علم وعرفان کی علمی وروحانی سرگرمیوں سے قرطبۂ ثانی اور بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ (جزاہم اللہ خیر الجزاء)

مولانا ضمیر احمد صاحب نے دار العلوم دیوبند میں پانچ سال رہ کر پوری توجہ اور جانفشانی سے نصاب کے مطابق ساری کتابیں پڑھیں اور ۱۹۴۵ء م ۱۳۶۵ھ میں دورۂ حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہو گئے، دار العلوم دیوبند کے اساتذہ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی، علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا محمد سمیع دیوبندی، مولانا محمد جلیل کیرانوی، مولانا فخر الحسن مرادآبادی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

دار العلوم دیوبند میں دوران تعلیم مولانا مرحوم ایک انتہائی تکلیف دہ مگر خوش انجام حادثہ سے دوچار ہو گئے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ آپ کو اپنڈکس کا شدید درد اٹھا، ڈاکٹروں نے جواب دے دیا، آخر میں حضرت شیخ الاسلام کے حکم پر ان کے خصوصی معالج ڈاکٹر سندھی نے اپنے پرائیویٹ ہاسپیٹل میں داخل کر لیا، مگر فکر و مایوسی بدستور باقی تھی، مرض کی شدت اور حالت کی نزاکت کی اطلاع بذریعہ تار ان کے والد کو دی گئی، صاحبزادے کو دیوبند بھیجنے کی بدشگونی ونحوست کے تصور کے باوجود لخت جگر کی محبت میں بعجلت تمام دیوبند

پہنچ گئے، ادھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ حضرت شیخ الاسلام ایک دن مولانا ضمیر احمد کی عیادت کے لئے ہاسپٹل تشریف لائے، چونکہ مرض کا حملہ بہت شدید تھا اس لئے مولانا ضمیر احمد صاحب اپنی زندگی سے بڑی حد تک مایوس تھے، اس لئے حضرت شیخ سے دعائے مغفرت کی درخواست کی اور جنازہ پڑھانے کی خواہش کا اظہار کیا، حضرت شیخ رحمہ اللہ نے ان کی چارپائی کے پاس کھڑے ہوکر دعا کی اور فرمایا دل چھوٹا کیوں کر رہے ہو انشاء اللہ اچھے ہوجاؤ گے، اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ کی دعا قبول فرمالی اور اسی دن سے مرض میں تخفیف ہونے لگی تا آنکہ بغیر آپریشن کے مولانا مکمل صحت یاب ہو گئے۔

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کو جب معلوم ہوا کہ مولانا ضمیر احمد کے والد آئے ہیں تو انھیں اپنا مہمان بنالیا، حضرت شیخ نے عادت کے مطابق اس نو وارد مہمان کی بھی تواضع واکرام میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، جس سے ان کے والد بیحد متاثر ہوئے کہ ہم لوگ انھیں گالیاں دیتے ہیں اور یہ ہم پر اپنی محبت کے پھول نچھاور کر رہے ہیں، یہی تاثر انھیں دارالحدیث میں شیخ کے درس میں لے گیا وہاں کے روحانی ماحول کا کچھ عکس ان کے قلب پر پڑا، جس سے قلب پر نفرت ووحشت کا جو پردہ تھا وہ بڑی حد تک دور ہو گیا، اسی دوران مولانا ضمیر احمد صاحب کے ایک رفیق درس نے ان کے والد سے مزار قاسمی میں برائے فاتحہ خوانی چلنے کے لئے کہا، چونکہ اب تک انھیں بزرگوں کو برا بھلا کہا کرتے تھے، اس لئے حجاب محسوس کر رہے تھے، لیکن اصرار کرنے پر راضی ہو گئے، انھیں کشفِ قبور کے عمل سے واقفیت تھی، وہاں پہنچ کر مراقب ہوئے تو دیر تک بیٹھے رہے، وہاں سے اٹھے تو دل کی دنیا بدل چکی تھی، ایک دن تو وہ تھا کہ اکابر دیوبند کو سبّ وشتم ایک محبوب مشغلہ تھا، مگر اس وقت اسی محبوب مشغلہ پر آنکھوں سے ندامت کے آنسو اور زبان سے توبہ واستغفار کے الفاظ جاری تھے، طبیعت جب کچھ پرسکون ہوئی تو کہنے لگے کہ ہم نے ان بزرگوں کو بہت برا کہا تھا، مگر یہاں تو ان کی قبروں پر انوار کی بارش ہو رہی ہے، چنانچہ یہاں سے گھر لوٹے تو زندگی بھر سچے پکے موحد اور اہل حق کے طور طریقہ پر گامزن رہے، حتی کہ وفات سے کچھ پہلے گھر والوں کو بلا کر کہا کہ میں حضرت شیخ الاسلام سے بیعت ہو رہا ہوں اور خود

بیعت کے سارے کلمات زبان سے ادا کیے۔

''نگاہ مردِ مؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں''

کہنا چاہئے کہ قدرت کا یہی فیصلہ تھا کہ بیٹے کے سبب سے باپ کو ہدایت نصیب ہوگی اس لئے بلاشبہ فرزند بھی سعادت مند تھا اور والد بزرگوار بھی خوش بخت تھے۔

غرض مولانا ضمیر احمد صاحب فارغ ہوتے ہی اپنے استاذ محترم مولانا فخر الحسن مرادآبادی کے حکم سے ۱۳۶۵ھ م ۱۹۴۵ء میں سیوڑھی بیر بھوم (بنگال) کے مدرسہ میں بحیثیت شیخ الحدیث کے تشریف لے گئے، اور صحیح بخاری، صحیح مسلم وغیرہ کتب حدیث کا کامیاب درس دیا، حالانکہ ابھی نو آموختہ تھے اور عمر بھی اکیس، بائیس برس سے زیادہ نہیں تھی، یہاں ابھی ڈیڑھ دو سال ہی گزرے تھے کہ ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوگیا اور اسی کے ساتھ کُشت وخون کی جو گرم بازاری ہوئی وہ معلوم ہے، اس لئے گھر سے وہاں نہ جاسکے، سیوڑھی کے مدرسہ سے تعلق ختم ہوجانے کے بعد مدرسہ ''دعوۃ الحق'' سلطان پور میں مدرس ہوگئے، یہاں کے قیام کو ابھی چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ حضرت شیخ الاسلام نے مشورہ دیا کہ قصبہ جلال پور ضلع فیض آباد اگر چہ ایک صنعتی مقام ہے، مسلمانوں کی آبادی بھی خاصی ہے پھر بھی یہاں کوئی دینی تعلیمی ادارہ نہیں ہے اس لئے وہاں جا کر کام کرنا چاہئے۔ چنانچہ حضرت شیخ کے ایماء پر جلال پور چلے گئے اور حضرت سید احمد شہید بریلوی کے خلیفہ اور جون پور کے مشہور ومعروف عالم وشیخ طریقت مولانا شاہ کرامت علی کے صاحبزادے مولانا عبدالاوّل جون پوری کے قائم کردہ مدرسہ میں جو ایک مکتب سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا تھا درس وافادہ کا سلسلہ شروع کردیا، جلال پور ایک طرف کچھوچھہ سے بالکل قریب ہے، جہاں مشہور صاحب فیض بزرگ شیخ اشرف جہانگیر سمنانی متوفی ۸۰۸ھ کا مزار ہے، اور اس وقت اہل بدعت کی خرافات کا گہوارہ بنا ہوا ہے، تو اس کی دوسری جانب نور پور، اور متو پور کی مشہور شیعی ریاستیں تھیں جو اگر چہ ختم ہوچکی ہیں، مگر شیعیت ان علاقوں کے لوگوں کے دل ودماغ پر اب تک چھائی ہوئی ہے، دونوں طرف سے بدعت وشیعیت سے اس قرب مکانی کا اثر یہ تھا کہ اس وقت پورے قصبہ میں ایک گھرانے کے علاوہ کوئی

صحیح مسلک وعقیدہ پر نہیں تھا، اس بناء پر ابتداء میں آپ کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، یہاں تک کہ ایک ایک اور دو دو دن کے فاقے کی نوبت بھی آئی، ایک مرتبہ جہالت پسندوں نے کمرے کا سارا سامان اور بستر دریابرد کردیا، طعن وتشنیع اور ایذاء رسانیاں تو ایک معمولی مشغلہ تھا، وسط دسویں صدی کے صاحب جلال وجمال وکشف وکرامت بزرگ سید علی عاشقاں سرائے میری کی جانب منسوب یہ مقولہ کہ ''جلال پور میں نہ عالم ہوں گے نہ جاہل'' قصبہ میں زبانِ زدِ خاص وعام تھا، اس لئے یہاں کسی بڑے مدرسہ کے قیام کی کوشش عقل وفہم سے عاری ان جہالت کے پاسبانوں کے نزدیک شیخ علی عاشقاں رحمہ اللہ کی گویا ولایت کا انکار کرنا تھا، اس لئے مولانا مرحوم کی ہر ممکن مخالفت اور ایذارسانی کو حضرت علی عاشقاںؒ کی عین عقیدت باور کرتے تھے، لیکن مولانا مرحوم ان مخالفتوں وایذا رسانیوں کے طوفان کے مقابلے میں کوہِ استقامت بن کر اپنے ارادے پر قائم رہے اور صبر واستقلال کے ساتھ بدعت وجہالت کے بالمقابل علوم قرآن وسنت کا آوازہ بلند کرتے رہے، بالآخر دنیا نے دیکھا کہ بدعت سمٹ کر اپنے گھروندے میں روپوش ہوگئی، اور علوم اسلامیہ کی تابناکیوں کے آگے جہالت کی ظلمت نے ہتھیار ڈال دیئے اور جلال پور کے گلی کوچے علم دین کی روشنی سے منور اور سنت نبوی سے معطر ہوگئے، وہ مکتب جہاں سے اس مردِ حق آگاہ نے اپنے کام کی ابتداء کی تھی ایک قابلِ ذکر اسلامی درسگاہ کی حیثیت سے طلبہ وعلماء کا مرجع ومرکز بن گیا، اور وہ خستہ حال قدیم مسجد جس میں یہ مکتب تھا، دومنزلہ عالی شان عمارت کے قالب میں ڈھل گئی اور اس کے اطراف میں تعمیر دومنزلہ وسیع اور روشن دار حجروں سے شب وروز قال اللہ وقال الرسول کی دلنواز آوازیں بلند ہونے لگیں۔

اللہ رب العزت نے مولانا مرحوم کو بڑی گوناگوں صلاحیتوں سے نوازا تھا، وہ علوم معقولات ومنقولات پر حاوی زبردست عالم دین، اعلیٰ درجہ کے استاذ ومعلم، مردم ساز مربی، بلند پایہ نامور خطیب، کامیاب مناظر، اور پاک طینت انسان تھے، مولانا کی انھیں صلاحیتوں کی بناء پر ان کے استاذ علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمہ اللہ نے اپنے زمانۂ صدارت میں دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس کے لئے بلایا، حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب مہتمم

دارالعلوم نے بھی دعوت دی، پھر آخر میں حضرت مولانا مرغوب الرحمن نے اپنے عہد اہتمام میں مجلس شوریٰ کی ایماء پر بذریعہ مکتوب دارالعلوم آنے کی پیش کش کی، مگر ان کے استاذ اور شیخ ومربی نے جس خطۂ ارض کی دینی خدمت ان کے سپرد کر دی تھی اس سے علیحدگی گوارا نہیں کی اور جب تک مرض نے نڈھال اور بے دم نہیں کر دیا وہاں سے ہٹے نہیں۔

مولانا مرحوم کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے عمر کے آخری حصہ میں اپنے آبائی وطن سے قریب موضع لونیاڈیہہ میں جامعہ شرقیہ اسلامیہ کے نام سے ایک ادارہ کی بنیاد رکھی، اس کے لئے خود ایک نصاب مرتب کیا، اور جب تک باحیات رہے اس کی نگرانی وسرپرستی کرتے رہے، بحمد اللہ مدرسہ آج بھی مولانا کے قائم کردہ نہج پر علوم اسلامی کی تعلیم وترویج میں مصروفِ عمل ہے، اور دیار کے مدرسوں میں اپنی بہتر تعلیم وتربیت کے لحاظ سے نیک نام ہے۔

مولانا ایک عرصہ سے تنفس کے مرض میں مبتلا تھے، اس کے ساتھ آخر میں جگر کے عمل میں بھی فتور آ گیا تھا، اس کے علاج کے لئے دہلی آئے اور دیپک میموریل ہاسپٹل میں زیر علاج رہے، ساتھ ہی دواخانہ ہمدرد کے بانی حکیم عبدالحمید مرحوم کو بھی دکھایا گیا، ان کے علاج سے تھوڑا بہت افاقہ بھی ہوا، اسی دوران ان کی اہلیہ کے چچا ڈاکٹر مشیر الحق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی کے حادثۂ قتل کا واقعہ پیش آ گیا، مولانا مرحوم ان سے بہت زیادہ مانوس تھے، ایک تو سخت بیماری دوسرے یہ اچانک حادثہ مولانا اس دوہرے صدمہ کو برداشت نہیں کر سکے، ان پر غشی طاری ہوگئی، جو دو دن تک قائم رہی، تیسرے دن افاقہ ہوا تو طبیعت ہشاش بشاش معلوم ہوئی، کھانا بھی کھایا، انھیں روبصحت دیکھ کر متعلقین کو اطمینان ہوا، مگر کسے معلوم تھا کہ یہ آخری سنبھالا تھا، عصر کی نماز کے لئے تیمم کیا، اسی وقت طبیعت بگڑ گئی اور پھر بگڑتی ہی گئی یہاں تک کہ اسی دن یعنی ۱۸ر رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ م ۱۵ر اپریل ۱۹۹۰ء اتوار کو اپنے خالق ومالک کے دربار میں پہنچ گئے، جسد خاکی دلی سے دیوبند لایا گیا، اور دارالعلوم کے احاطۂ مولسری میں فدائے ملت مولانا سید اسعد مدنی کی اقتدا میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور طلبہ وعلماء کے دوش پر مزار قاسمی پہنچائے گئے اور حضرت

شیخ الہند کے پائیں پیوند خاک ہو گئے۔

''پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا''

زبان و بیان کے ساتھ قلمی صلاحیت کے بھی حامل تھے، تالیف وتصنیف کے لئے جیسی یکسوئی درکار ہوتی ہے وہ مولانا کو میسر نہیں ہوئی پھر بھی چند رسالے ان کی تصنیفی یادگار ہیں، جو یہ ہیں:

(۱) عاشورۂ محرم اور تعزیہ داری، (۲) ظہور قدسی، (۳) مسلمان کیا کریں، (۴) دین رحمت، (۵) مودودی صاحب کی تضاد بیانیاں (۶) دینی تعلیم اور ہندوستان، (۷) مسلم پرسنل لا سے متعلق سوالات کے جوابات وغیرہ۔

زیر نظر کتاب (تذکرہ علمائے اعظم گڈھ) کا پہلا ایڈیشن جب ۱۳۹۶ھ م ۱۹۷۶ء میں جامعہ اسلامیہ بنارس سے (جہاں یہ بندہ مدرس تھا) شائع ہوا تھا، اس کا افتتاح محلہ مدنپورہ (پچپڑوا) کے ایک جلسہ میں مولانا مرحوم ہی کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا، اس وقت یہ وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن خود ان کا ترجمہ وتذکرہ کتاب کی زینت بنے گا۔ ''کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ''.

مولانا ضیاء الدین سہریاوی اصلاحی

مولانا ضیاء الدین ابن شیخ عبدالرحمٰن اپنے نانیہال جیراج پور ضلع اعظم گڈھ میں ۱۹۳۷ء م ۱۳۵۶ھ میں پیدا ہوئے، مولانا کا آبائی وطن ضلع اعظم گڈھ کا ایک گاؤں ''سہریا'' ہے جو قصبہ نظام آباد کے جوار میں ہے، مولانا اصلاحی مرحوم کے والد نسبتاً ایک چھوٹے زمیندار تھے، اور علم سے بہرہ ور بھی تھے، اردو اور فارسی کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔

مولانا ضیاء الدین نے مکتب کی تعلیم مقامی طور پر حاصل کر کے تقریباً ۱۹۴۷ء م ۱۳۶۷ھ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں داخلہ لیا، اور دس سال کی مدت میں یہاں کے نصاب کے مطابق کتابیں پڑھ کر ۱۹۵۷ء م ۱۳۷۷ھ میں فارغ التحصیل ہو گئے، ان کے زمرۂ اساتذہ میں مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا

جلیل احسن ندوی فاضل دیوبند، مولانا صدرالدین اصلاحی، مولانا ابوبکر اصلاحی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان میں سب ہی اپنے علمی اور قلمی خدمات کے علاوہ جماعت اسلامی سے گونا گوں تعلقات کی بناء پر بڑی شہرت کے حامل ہیں، مولانا ضیاء الدین مرحوم کے مدرستہ الاصلاح میں داخلہ سے ڈیڑھ دو سال پہلے ہی مولانا امین احسن صاحب مدرستہ الاصلاح سے منتقل ہوکر پٹھان کوٹ مولانا مودودی کے پاس چلے گئے تھے، اس لیے ان سے تلمذ کا موقع میسر نہیں ہوا۔

وہ زمانۂ تعلیم میں ''انجمن طلبۂ مدرستہ الاصلاح سرائے میر'' کے ناظم بھی رہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اسی زمانہ میں تقریر وتحریر میں اپنا ایک مقام پیدا کرلیا تھا، علاوہ ازیں فراغت سے ایک سال قبل یعنی ۱۹۵۵ء میں ان کا ایک مضمون ''امام اعظم کی فقہ'' کے عنوان سے ''معارف اعظم گڈھ'' جیسے معیاری و تحقیقی رسالہ میں چھپا تھا، جو ان کے ذوق تحقیق اور قلم کی اٹھان کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

تعلیم و تحصیل سے رسمی طور پر فارغ ہوجانے کے بعد انھوں نے اپنی علمی سرگرمیوں کا مرکز ومحور ''دارالمصنفین اعظم گڈھ'' کو بنایا، اور تقریباً بیس، اکیس برس کی عمر میں وہ دارالمصنفین سے وابستہ ہوگئے، وہ دارالمصنفین اعظم گڈھ کے رفیق اس وقت ہوئے جب وہاں مولانا شاہ معین الدین ندوی، مولانا مجیب اللہ ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن جیسے اہل قلم علماء شبلی منزل کے افق پر علم وقلم کی تابانیاں بکھیر رہے تھے، علم و تحقیق کے میدان کے ان شہ سواروں کی موجودگی میں رفاقت کے لیے ان کا انتخاب ان کے مستقبل کا پتہ دے رہا تھا۔

دارالمصنفین میں آنے کے سال ان کے قرآنی موضوعات سے متعلق چند مقالات چھپے، مارچ ۱۹۵۸ء م ۱۳۷۸ھ سے مطبوعات جدیدہ کے تحت کتابوں پر ان کی تبصرہ نگاری کا آغاز ہوا۔

مولانا ضیاء الدین مرحوم ۱۹۵۷ء سے تا مدۃ العمر معارف و دارالمصنفین کی بزم علم و تحقیق میں کسی نہ کسی حیثیت سے موجود رہے، سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے بعد

اس ادارۂ علم وفن کے لیے سب سے زیادہ اپنی عمر عزیز کے اثاثۂ لیل ونہار کو وقف کرنے والوں میں ان ہی کا نام ہے۔

انھوں نے لگ بھگ نصف صدی کی اس مدت میں دارالمصنفین کے تصنیفی سرمایہ میں قابل ذکر اضافہ کیا، ان کی اولین تصنیف جو یہاں سے شائع ہوئی ''ہندوستان عربوں کی نظر میں'' ہے یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے، اس میں اکیس عرب سیاحوں، جغرافیہ نویسوں اور تاریخ نگاروں کی کتابوں میں ہندوستان کے متعلق جو کارآمد معلومات تھیں، مولانا مرحوم نے تالیف وترجمہ کے ذریعے اکٹھا کردیا ہے، یہ کتاب اوساط علمیہ میں قبولیت کی نگاہ سے دیکھی گئی اور حکومتِ ہند کے اس وقت کے وزیر ہمایوں کبیر نے اس کی قدر افزائی کی۔

ان کی دوسری تصنیف ''تذکرۃ المحدثین'' ہے جو تین ضخیم جلدوں میں ہے، ان کی تصانیف میں یہ سب سے اہم کتاب ہے، اس میں صرف صاحبِ تصانیف اکابر محدثین کا تذکرہ ہی نہیں ہے؛ بلکہ تدوین حدیث کی تاریخ اور کتب حدیث پر متوازن نقد وتبصرہ بھی ہے جس سے اس کی افادیت بہت بڑھ گئی، ان دو اہم کتابوں کے علاوہ ''مولانا ابوالکلام آزاد- مذہبی افکار، صحافت اور قومی جدوجہد'' کے نام سے ایک اور قابل قدر کتاب ان کے قلم سے نکلی، مولانا آزاد سے ان کو غیر معمولی عقیدت بلکہ سیفتگی تھی، جو کتاب کے ورق ورق سے نمایاں ہے، مولانا کی تالیفات میں چند ارباب کمال، انتخاب کلام سہیل، مسلمانوں کی تعلیم، بھی اپنے موضوع پر اچھی کتابیں ہیں، ان کی یہ سب تصانیف دارالمصنفین ہی سے شائع ہوئی ہیں، ایک اور کتاب ''ایضاح القرآن'' پاکستان سے شائع ہوئی ہے جو ان کے قرآنی مقالات کا مجموعہ ہے۔

ان مستقل تصانیف کے علاوہ ان کی علمی سرگرمیوں کا میدان رسالہ ''معارف'' رہا، ''مطبوعات جدیدہ'' کے زیر عنوان انھوں نے بیشمار کتابوں پر تبصرہ کیا، ''وفیات'' پر بھی ان کے مضامین چھپتے رہے، اور جب ۱۹۸۷ء م ۱۴۰۸ھ میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم ایک حادثہ میں شہید ہوگئے، تو ''معارف'' کی ادارت کی اہم ترین خدمت ان کے سپرد ہوئی، یہ ان کی قلمی حیات کا تابناک پہلو ہے کہ انھوں نے معارف کی ادارت اور

شذرات لکھنے کی ذمہ داری کا حق اس شان سے پورا کیا کہ معارف کے امتیازی معیار اور علمی وقار کے سلسلے کو نئی توانائیوں کے ساتھ آگے بڑھایا۔

معارف کی ادارت کے ساتھ انھوں نے دارالمصنّفین کے منصب نظامت کے ذمہ دارانہ بار کو بھی سنبھالا، وہ اپنی افتاد طبع کے اعتبار سے انتظامی معاملات سے چنداں مناسبت نہیں رکھتے تھے، لیکن جب یہ ذمہ داری بھی ان کے سر آگئی تو پورے تحمل اور عالمانہ وقار کے ساتھ اس دشوار گذار مرحلہ سے بھی مردانہ وار گذر گئے، قدیم کتابوں کی طباعت واشاعت ان کی تصحیح اور حوالوں کی مزید تحقیق وغیرہ میں انھوں نے اپنی راحت وصحت سے بے نیاز ہو کر جس طرح انتھک محنت کی، وہ ادارہ سے ان کی غیر معمولی محبت کی دلیل ہے، دارالمصنّفین میں تعمیرات کا اضافہ بھی ان کے دور میں ہوا۔

ان کے علم وعمل، اخلاق واخلاص کو تعلیمی اداروں، علمی حلقوں اور ثقافتی مراکز میں قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھا گیا، اور انھیں وہاں کی رکنیت سے نوازا گیا، اسی سلسلہ میں اردو اکادمی، اور میر اکادمی سے انھیں انعامات عطا کیے گئے، نیز ۱۹۹۵ء م ۱۴۱۶ھ میں سند اعزاز سے سرفراز کیا۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی شخصیت کا اخلاقی پہلو بھی بڑا تابناک اور روشن ہے، مولانا مرحوم سے جب بھی ملنے کا اتفاق ہوا تو اسی فکر اور سوچ کے ساتھ ان کے پاس سے اٹھا کہ یہ ایک اچھے اہل قلم ہیں یا اچھے انسان، بلاشبہ وہ ایک بڑے صاحب قلم بھی تھے اور انسانی شرافت کے پیکر بھی یہ دونوں وصف ان میں اس طرح رچے بسے تھے کہ ان کے درمیان خط امتیاز کھینچنا مشکل تھا، وہ نہایت شریف النفس، وسیع القلب، صاحب مروت ومحبت انسان تھے، تواضع وفروتنی، دل داری وملنساری ان کی سرشت میں داخل تھی، صبر وقناعت، کفایت شعاری اور سادگی میں اپنی مثال آپ تھے، تصوف کے کسی سلسلہ سے ان کا رسمی ربط وتعلق نہیں تھا، ممکن ہے کہ وہ اس کو غیر ضروری اور کار بیکاراں تصور کرتے رہے ہوں، کیوں کہ جس ماحول میں وہ پروان چڑھے تھے اور ان کی علمی وفکری نشوونما علماء کے جس طبقہ کے ذریعہ ہوئی تھی ان کے یہاں تصوف کی حیثیت چمنستان اسلام میں ایک

خودرو پودے کی ہے، الا ماشاءاللہ، بایں ہمہ مولانا مرحوم کی شخصیت صحیح اسلامی تصور کی جملہ اداؤں کی جامع تھی، اس لیے اس کہنے میں کوئی باک نہیں کہ وہ طبعی وفطری طور پر صوفی منش تھے، وہ اکابر صوفیا کا نام عزت واحترام سے لیتے تھے، اپنے زمانہ کے مشائخ ارشاد وسلوک کا تذکرہ بھی اچھے انداز میں کرتے تھے۔

مولانا مرحوم ۳رجنوری ۲۰۰۸ء کو سفرحج سے واپس آئے تھے، یکم فروری کو وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ ایک عزیز سے ملنے کے لیے سرائے میر کے پاس موضع کھریواں کے لیے قریب ساڑھے نو بجے صبح کو روانہ ہوئے، راستہ میں ان کی جیپ پلٹ گئی، جس کے صدمہ سے وہ اوران کی اہلیہ دونوں شدید زخمی ہوگئے، لیکن مولانا کی بہ نسبت ان کی اہلیہ کو چوٹ کم آئی وہ ہوش میں تھیں، جبکہ مولانا بیہوش تھے، اسی زخمی حالت میں انھیں اعظم گڈھ صدر ہسپتال لایا گیا، وہاں سے ایک مقامی سرجن ڈاکٹر فرقان کے ہسپتال میں لائے گئے، حالت تشویشناک تھی، اس لیے کچھ طبی امداد پہنچا کر بنارس کے بی، ایچ، یو ہسپتال میں منتقل کردیا گیا، وہاں کچھ ضروری ٹسٹ ہوئے دوائیں بھی دی گئیں، لیکن افاقے کے آثار نہیں تھے، بالآخر ۴رفروری ۲۰۰۸ء م ۱۴۲۹ھ کو طلوع آفتاب سے کچھ پہلے، علم وفضل کے اس نیر تاباں کی ضیا پاش کرنیں موت کی وادی میں روپوش ہوگئیں، اور علما وصلحا کی وفات پر تعزیتی مضامین لکھنے والا صاحب قلم خود داستانِ تعزیت بن گیا۔

مولانا عبدالباری اعظمی

مولانا عبدالباری شہر اعظم گڈھ کے محلہ آصف گنج میں ۱۹۰۲ء مطابق ۱۳۲۰ھ میں پیدا ہوئے، مکتب کی تعلیم شہر اعظم گڈھ ہی میں حاصل کی، اس کے بعد مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں درجہ اوّل عربی میں داخلہ لیا، مولانا کے رفقائے درس میں مولانا اختر احسن اصلاحی اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ''تدبر القرآن'' بھی تھے، درجہ عربی اوّل و دوم تک مولانا عبدالباری اپنے تمام ساتھیوں میں ممتاز رہے، امتحانات میں پہلی پوزیشن انھیں کی رہتی مگر بعد میں ان کے اوپر مذکور دونوں رفقاء ان سے آگے بڑھ گئے، مولانا کی

پوری تعلیم مدرستہ الاصلاح میں ہی ہوئی، عربی زبان وادب پر اچھی دسترس حاصل تھی، بے تکلف عربی بولتے اور لکھتے تھے، مولانا کے اساتذہ میں شبلی متکلم، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، مولانا عبدالصمد ندوی اور مولانا حکیم محمد احمد بڑے اہمیت کے حامل تھے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد دارالمصنفین اعظم گڈھ سے وابستہ ہوئے تو پھر اسی کے ہو رہے، وہ دارالمصنفین کے عہد زریں کی یادگار تھے، اس کے ابتدائی دور میں مولانا سید سلیمان ندوی نے، انھیں مضامین کی تصحیح اور کتب خانہ کی نگرانی کی خدمت سپرد کی تھی جسے وہ مستقل مزاجی کے ساتھ مدۃ العمر انجام دیتے رہے۔

انھوں نے سید صاحب کے علاوہ مولانا مسعود علی ندوی، مولانا شاہ معین الدین، مولانا عبدالسلام قدوائی وغیرہ کے زمانے اور زیر نظامت دارالمصنفین میں خدمات کے دن گزارے تھے، اس کی مکمل تاریخ ان کی نظروں کے سامنے تھی۔

مولانا عبدالباری مرحوم اپنے قلمی نام ابواعلیٰ اثری اور ابواعلیٰ اعظمی سے برابر علمی، ادبی، سیاسی مضامین زیب قرطاس کرتے رہے، جو ملک کے معیاری رسائل ومجلّات میں چھپتے تھے، وہ بڑے خوددار اور قناعت پسند تھے، نہایت شیر چشمی کے ساتھ دارالمصنفین کی قلیل تنخواہ پر زندگی گزاردی، مگر کسی امیر ورئیس کا مرہونِ منت ہونا گوارانہیں کیا۔

یہ ناچیز جس زمانے میں بنارس رہتا تھا، تو دارالمصنفین اکثر حاضری ہوا کرتی تھی، مولانا مرحوم بڑے تپاک سے ملتے اور دیر تک باتیں کرتے، گفتگو کا موضوع بالعموم اعظم گڈھ کی سیاسی سرگرمیاں یا دارالمصنفین کے ابتدائی عہد کی دلچسپ داستانیں ہوتیں، انھیں اپنے عہد کے صف علماء میں مولانا سید سلیمان ندوی، اور مولانا ابوالکلام آزاد سے خاص تعلق خاطر تھا، ان کے علم ودانائی کے واقعات مزہ لے لے کر بیان کرتے تھے۔

دارالمصنفین کے مؤسس اور اس کے علمی وفکری امام علامہ شبلی نعمانی کے بڑے مداحِ تھے، ان کے بارے میں کہتے کہ جب وہ تحریر لکھنے بیٹھتے ہیں تو جملے فقرے محاورے اور الفاظ دست بستہ ان کے سامنے کھڑے رہتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں موقع سے استعمال کر لیتے ہیں، وہ اگرچہ پروف کے مصحح تھے مگر شاید ہی کوئی ایسا دارالمصنفین کا

رفیق رہا ہو جس کی تحریر پر ان کا قلم نہ چلا ہو، حتیٰ کہ پروف پڑھتے ہوئے وہ سید صاحب کی تحریروں میں بھی اس طرح اصلاح کر دیا کرتے کہ ان کو پتہ نہیں چلتا تھا، خود کہتے تھے کہ علامہ شبلی کے علاوہ میری اصلاح سے کوئی بچ نہیں سکتا۔

وہ مسلکاً اہل حدیث تھے، مگر مزاج میں خشکی بالکل نہیں تھی، انھوں نے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں تفصیل کے ساتھ تحریر کیا تھا کہ میں اہل حدیث ہوں مگر یہ چیز برابر خلش پیدا کرتی رہی کہ اہل حدیث حضرات کے مسلک کا سارا مدار مستحبات پر ہے، جسے انھوں نے واجبات کا درجہ دے دیا ہے۔ اسے چھپنے کے لیے ایک رسالہ کے ایڈیٹر کے پاس بھیج بھی دیا مگر انھوں نے اپنے مصالح کے تحت اسے شائع نہیں کیا، جس پر مولانا عبدالباری کو گرانی تھی۔

مولانا عمر طبعی سے آگے بڑھ گئے تھے، یعنی وہ تقریباً ترانوے برس کے ہو چکے تھے مگر اخیر تک چاق و چوبند رہے روزانہ ایک ڈیڑھ میل ٹہلنے کا معمول تھا، جو انتقال سے چند ہفتے پہلے تک باقی رہا۔ چند ہفتہ قبل سڑک حادثہ میں ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی، اسی میں ۳۰؍ جون ۱۹۹۳ء مطابق ۱۴۱۴ھ کو ان کی وفات ہوگئی۔

مولانا عبدالباری مبارکپوری

مولانا عبدالباری قاسمی بن حاجی محمد زاہد ضلع اعظم گڈھ کے مشہور صنعتی قصبہ مبارکپور کے ایک باحیثیت وصاحب ثروت گھرانے کے چشم وچراغ تھے، پیدائش محلہ پورہ رانی مبارک پور میں ۱۹۱۸ء م ۱۳۳۷ھ میں ہوئی، ابتدائی فارسی وعربی سے مروجہ نصاب کی اکثر کتابوں تک اپنے قصبہ کے معروف ومشہور مدرسہ ''جامعہ احیاء العلوم'' میں پڑھیں، ان کے مشہور اساتذۂ احیاء العلوم میں مولانا مفتی محمد یٰسین مبارکپوری، مولانا شکراللہ مبارکپوری، مولانا بشیر احمد مبارکپوری، مولانا محمد عمر مبارکپوری جیسے ممتاز اصحاب درس علماء شامل ہیں، اعلیٰ تعلیم کے لئے یہاں سے دیوبند گئے، دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر نصاب کی باقی ماندہ کتابیں پڑھیں اور ۱۳۵۶ھ م ۱۹۳۷ء میں حضرت شیخ الاسلام مولانا

حسین احمد مدنی سے صحیح بخاری وسنن ترمذی اور بقیہ کتب حدیث دیگر اساتذۂ علیا سے پڑھ کر سندِ فراغت حاصل کی، آپ کے دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ میں حضرت شیخ الاسلام، حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی، حضرت مولانا فخر الحسن مرادآبادی، حضرت مولانا بشیر احمد خاں بلندشہری بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد اپنی مادر علمی جامعہ احیاء العلوم میں اعزازی طور پر دو ایک کتابیں پڑھانے کے ساتھ جامعہ احیاء العلوم کے ناظم اعلیٰ مولانا شکر اللہ کا انتظامی امور میں ہاتھ بٹاتے رہے، اور جب ۵/ربیع الاوّل ۱۳۶۱ھ کو حضرت مولانا شکر اللہ صاحب کی وفات ہوگئی تو جامعہ کی مجلس شوریٰ نے مولانا مرحوم کی جگہ پر ۹/ربیع الاوّل ۱۳۶۱ھ کو مولانا عبدالباری رحمہ اللہ کو ناظم اعلیٰ منتخب کرلیا، پھر تاحیات اس منصب پر قائم رہے، جامعہ کے اس اعلیٰ واہم ترین عہدہ پر منتخب ہوجانے کے بعد انھوں نے اپنی تمام توانائیاں اس کی تعمیر وترقی میں صرف کردیں، مولانا کے عہد نظامت میں جامعہ نے ہمہ جہت ترقی کی اور اس کا شمار قصباتی مدرسہ کی حد سے گزر کر مشرقی یوپی کے بڑے اور نیک نام مدرسوں میں ہونے لگا۔

چونکہ مولانا مرحوم ابتداء ہی سے جامعہ کے انتظامی جھمیلوں میں پھنس گئے تھے، اسی کے ساتھ ملی فلاح وبہبود کے کاموں میں بھی جمعیۃ علماء ہند کی وساطت سے مکمل دلچسپی لیتے تھے، مزید براں ملکی سیاست سے بھی وابستگی رہی، اس لئے درس وتدریس کے لئے وقت فارغ نہیں کرسکے، ورنہ وہ ایک ذی استعداد اور باصلاحیت عالم تھے، ''ہر یکے را بہر کارے ساختند''

مولانا مرحوم نے ایک طرف جامعہ عربیہ احیاء العلوم کے ذریعہ دینی عقائد اور اعمال واخلاق کی حفاظت وصیانت نیز اسلامی علوم کی ترویج اشاعت کے سلسلہ میں گرانقدر خدمات انجام دیں، تو دوسری طرف جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس پارٹی کے پلیٹ فارم سے قومی وملی اور سیاسی جہد وعمل کی ذمہ داریاں بھی پوری کیں، دیار مشرق میں مولانا مرحوم

ایک باصلاحیت عالم، بلند پایہ منتظم، اور سماجی وسیاسی رہنما کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے اور خود قصبہ مبارکپور میں دیوبندی مکتب فکر سے وابستہ مسلمانوں کے لئے ان کا وجود پشتیبان کی حیثیت رکھتا تھا۔

مولانا نے دولت وثروت میں آنکھیں کھولیں تھی اور عمر کا اکثر حصہ رفاہت وفارغ البالی میں ہی گزرا تھا، آخر میں حالات کچھ دگرگوں ہو گئے، جس کا اثر ان کے دل ودماغ کے ساتھ صحت پر بھی پڑا، پھر ہمہ جہتی مصروفیات نے بھی انھیں بے دم کر دیا تھا، جس کا اثر یہ ہوا کہ عمر کے ساتھ ساتھ عوارض بھی بڑھتے گئے بالآخر ایک عرصہ تک جانگسل علالت میں مبتلا رہ کر قوم وملت کا یہ خادم ۱۲ر ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ م ۵ر دسمبر ۱۹۸۷ء کو دنیا بھر کے جھمیلوں سے سبک دوش ہو کر رب ذوالمنن والاکرام کے دامن عفو وعافیت میں پہنچ گیا۔

مولانا مرحوم بڑے ملنسار، خوش اخلاق، مہماں نواز، اور ہر ایک کے کام آنے والی شخصیت کے مالک تھے۔

(معلومات از مولانا عبدالمعید قاسمی ناظم، جامعہ عربیہ احیاء العلوم)

مولانا عبدالحمید نظام آبادی

مولانا عبدالحمید اعظمی بن صادق علی کی ولادت اپنے آبائی وطن قصبہ نظام آباد ضلع اعظم گڈھ میں ۷ر جون ۱۹۱۷ء م ۱۳۳۶ھ کو ہوئی، ابتدائی تعلیم وطن ہی کے مدرسہ، شاہی جامع مسجد نظام آباد میں مولوی نظام الدین معروفی سے حاصل کی، آگے کی تعلیم کے لیے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں داخلہ لیا، اور عربی اوّل سے متوسطات تک کی تعلیم مبارک پور ہی میں پائی، یہاں کے اساتذہ میں مولانا شکر اللہ مبارکپوری، مولانا نعمت اللہ مبارکپوری، مولانا محمد یحیٰی رسول پوری وغیرہ اساتذہ احیاء العلوم کا تذکرہ مولانا کی زبان سے متعدد بار سنا۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے دیوبند کا سفر کیا اور دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر بقیہ تعلیم وہیں مکمل کی، سن فراغت غالباً ۵۶-۱۳۵۵ھ م ۷-۱۹۳۶ء ہے، صحیح بخاری اور جامع

ترمذی شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ سے پڑھی، باقی اساتذہ میں مولانا علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی، مولانا سید فخرالحسن مرادآبادی، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب رحمہم اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ سے بیعت بھی تھے اور ان کی ہدایت کے مطابق ذکر واذکار کرتے تھے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ ہوگئے، اور زندگی کا بیشتر حصہ اسی میں بسر ہوا، بہار جمعیۃ علماء کی طرف سے صوبہ بہار میں اسلامی مکاتب کے قیام کے سلسلہ میں گرانقدر خدمات انجام دیں، حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی ناظم جمعیۃ علماء ہند نے مکاتب دینیہ کے لیے جو نصاب تعلیم مرتب کیا تھا، اس نصاب کے طریقۂ تدریس سے اساتذۂ مکاتب کو روشناش کرنے کی غرض سے ملک کے مختلف حصوں میں تربیتی کیمپ قائم کرنے کا پروگرام بنایا تھا، مذکورہ کیمپ کے سلسلے میں بھی مولانا اعظمی نے کامیاب جدوجہد کی۔

آخر میں جمعیۃ علماء ہند کے شعبہ مرکزی تعلیمی بورڈ کے آرگنائزر مقرر ہوگئے تھے، چند سال اس شعبہ سے متعلق خدمات دیں بعد میں درازیٔ عمر، وخرابیٔ صحت کی بناء پر جمعیۃ کی رسمی وضابطہ کی خدمت سے سبکدوش ہوکر گھر پر ہی رہنے لگے تھے، اور قصبہ میں اسٹیشنری کی ایک دوکان کھول لی تھی، جو ان کے حسنِ اخلاق وحسن معاملہ کی وجہ سے آگے چل کر قصبہ کی سب سے بڑی دکان شمار ہونے لگی تھی، جس کی بدولت مولانا کی معاشی حالت بہت اچھی ہوگئی تھی اور ایک متمول عالم کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے تھے۔

مولانا اعظمی کے تعلقات جمعیۃ علماء کے اکابر سے آخر عمر تک بہت اچھے رہے ایک زمانہ میں تو وہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلوی کے خاص لوگوں میں گنے جاتے تھے، آخر میں حضرت مولانا سید اسعد مدنی سے بھی ان کے مراسم بڑے خوش گوار اور گہرے رہے، حضرت مولانا مدنی کو ہمیشہ صاحبزادۂ محترم ہی کہتے تھے۔

کانگریس پارٹی کے اہم لیڈروں سے بھی ان کی سناشائی بڑی اچھی تھی، کانگریس کے یہ سب رہنما ان کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

مولانا اعظمی ایک اچھے خطیب بھی تھے، دینی وسیاسی دونوں نوع کی کامیاب تقریریں کیا کرتے تھے، ان کی تقریروں میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا لب ولہجہ نمایاں طور پر محسوس کیا جاتا تھا، دینی جلسوں میں عام طور پر عربی جبہ اور عربی رومال وعقال سے ملبوس ہوکر وعظ کرتے تھے، زبان بڑی صاف وشستہ تھی۔

۱۹۷۷ء م ۱۳۹۸ھ میں اپنے وطن قصبہ نظام آباد میں ایک دینی درسگاہ ''منبع العلوم'' کے نام سے قائم کی تھی، جس کے آخر عمر تک خود ہی ناظم ومہتمم رہے، الحمدللہ یہ مدرسہ جاری ہے اور اپنی بساط کے مطابق علم ودین کی خدمت میں مصروف ہے۔

مولانا اعظمی ایک فعال ومتحرک شخصیت کے مالک تھے، ان کی نگاہ بلند، اور سخن دل نواز تھی، مہمانوں کی میزبانی میں بڑے کشادہ دست تھے، اپنے حسنِ اخلاق اور حسنِ گفتار سے لوگوں کا دل جیت لیتے تھے، اپنے اچھے کاموں کو خود بھی اہمیت دیتے تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرے بھی اسے اچھی نگاہ سے دیکھیں، اس معاملہ میں وہ کبھی کبھی اپنے دوست واحباب سے ناخوش بھی ہوجاتے تھے، مگر ان کی یہ ناخوشی وقتی ہی ہوا کرتی تھی۔

مولانا مرحوم آخر عمر میں سوء ہاضمہ کے مریض ہوگئے تھے، اسی ایک مرض نے بہت سے امراض کو جنم دے دیا تھا جس کی وجہ سے تن ومند جسم گل کر ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوگیا تھا، اسی ضعف وناتوانی کی حالت میں ۲رشوال ۱۴۲۰ھ م ۲۳رجنوری ۱۹۹۹ء کو وصال ہوگیا، اور اپنے آبائی قبرستان نظام آباد میں شاہراہ زندگی کا تیز گام مسافر ہمیشہ کے لیے آسودہ خواب ہوگیا۔

مولانا عبدالرحمٰن پرواز سیدھا سلطان پوری

مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی ضلع اعظم گڈھ کے ایک معروف گاؤں سیدھا سلطانپور میں ۱۷راکتوبر ۱۹۲۰ء مطابق ۱۳۳۹ھ کو پیدا ہوئے، ان کے والد مولانا محمد شفیع

مدرستہ الاصلاح کے بانی عالم باعمل اور صاحب نسبت بزرگ تھے، جماعت اسلامی کے صاحب قلم عالم مولانا صدرالدین اصلاحی، اور مولانا عبدالرحمٰن پرواز کے مورث اعلیٰ ایک ہی تھے، جو افغانستان کے یوسف زئی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے، مکمل شجرۂ نسب مولانا صدرالدین اصلاحی کے تذکرہ میں ذکر کیا جاچکا ہے۔ مولانا پرواز مرحوم کا خاندان پیشۂ زراعت کے علاوہ علمی و دینی حیثیت سے بھی ممتاز تھا۔

مولانا محمد شفیع مرحوم کے پانچ صاحبزادے تھے سب سے چھوٹے ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی ریڈر شعبۂ اردو علی گڈھ مسلم یونیورسٹی تھے، ان کا شمار عصر حاضر کے صفِ اوّل کے تنقید نگاروں میں ہوتا ہے، اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے، مولانا عبدالرحمٰن پرواز ان سے بڑے اور باقی تین بھائیوں سے چھوٹے تھے۔ ان کی مکمل تعلیم مدرستہ الاصلاح سرائے میر ہی میں ہوئی، ۱۹۲۷ء مطابق ۱۳۴۶ھ میں مکتب میں داخلہ لیا، مکتب پاس کرنے کے بعد شعبۂ عربی میں داخل ہوئے اور ۱۹۴۰ء مطابق ۱۳۵۹ھ میں شعبۂ عربی کی تعلیم مکمل کر کے فارغ التحصیل ہوگئے، مولانا کے اساتذہ میں مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا نجم الدین اصلاحی، مولانا شبلی متکلم، مولانا عبدالصمد ندوی جیسے اساطین علماء شامل ہیں۔ مضمون نگاری، سخن سنجی، اور کتب بینی کا ذوق شروع ہی سے تھے۔ مولانا پرواز خود رقمطراز ہیں:

''ابتدائے طالب علمی سے اردو ادب سے لگاؤ پیدا ہوا، کتب بینی کا ذوق اس قدر بڑھا کہ ہر اچھے مصنف کی کوئی کتاب نظر سے گذر جاتی تو اس کے مطالعہ کے لیے بے چین ہوجاتا مضمون نگاری، شعر و شاعری سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی مختلف اخبار و رسائل میں مضامین لکھے۔''

شعر و سخن کا یہ ذوق انھیں ورثہ میں ملا تھا، ان کے والد بزرگوار کو بھی دور شباب میں شعر گوئی سے دلچسپی تھی اور وہ شاہ محمد اکبر ابوالعلائی داناپوری سے مشورۂ سخن بھی کرتے تھے، لیکن بعد میں اس سے توجہ پھیر لی تھی، مولانا پرواز بھی نوعمری ہی سے مشق سخن کرنے لگے تھے، ان کا کلام رسائل و مجلّات میں چھپتا بھی تھا، نجی محفلوں میں اشعار سناتے بھی تھے، مگر آخری ایام میں اپنے والد کی طرح انھوں نے بھی اس سے رخ موڑ لیا تھا۔

تعلیم وتحصیل سے رسمی فراغت کے بعد مولانا درس وتدریس کے مشغلہ میں لگ گئے، سب سے پہلے صبرحد ضلع جون پور کے اسکول میں مدرس ہوئے، اس کے علاوہ بعض اور مقامی مدارس میں معلمی کی خدمت انجام دی، پھر ۱۹۴۶ء مطابق ۱۳۶۲ھ میں مشہور ساعر احسان دانش مرحوم کی دعوت پر وہ لاہور چلے گئے، مگر ابھی ایک برس بھی نہیں گزرا تھا کہ تقسیم ملک کی خبر سن کر گھر واپس آ گئے، اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد دار العلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ میں درس وتدریس کی خدمت پر مامور ہو گئے، یہاں سے ''الہدیٰ'' کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکلتا تھا، جس کے ایڈیٹروں میں ان کا نام بھی تھا۔ دار العلوم احمدیہ میں ان کا قیام تقریباً دس گیارہ سال رہا۔ ۱۹۵۸ء مطابق ۱۳۷۸ھ میں انھوں نے بمبئی کا رخ کیا، اور انجمن اسلام کے مختلف اسکولوں میں عربی کے استاذ رہے، آخر میں احمد سیلر ہائی اسکول ڈم ٹمکر روڈ سے وابستہ ہو گئے تھے، یہاں سے جب ریٹائر ہوئے تو بمبئی کو الوداع کہہ کر وطن آ گئے اور بحیثیت رفیق دار المصنفین سے متعلق ہو گئے۔

بمبئی کے قیام کے زمانہ میں مختلف اخباروں سے بھی وابستہ رہے، روزنامہ ہندوستان، آشکار، اردو ٹائمز، انقلاب وغیرہ میں عرصہ تک مذہبی، علمی، اور تاریخی کالم لکھتے رہے، گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر کے بھی رفیق تھے۔

وہ عمر بھر درس وتدریس کے مشغلہ سے وابستہ رہے، مگر تحریر وتصنیف سے ان کا رشتہ کبھی کمزور نہیں ہوا، ان کی مطبوعہ تصانیف حسب ذیل ہیں:

(۱) غرور اور اسلام، (۲) مومن حیات وشاعری، (۳) علم وہدایت کے چراغ، (۴) نظام حق کے معمار، (۵) حضرت مخدوم علی مہائمی حیات آثار وافکار، (۶) مفتی صدر الدین آزردہ۔

مولانا عبد الرحمٰن پرواز نے شاعر رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے حالات اور شاعری پر بھی کتاب لکھی تھی، مگر یہ ابھی تک شائع نہیں ہو سکی، اس کے کچھ حصے ماہنامہ برہان دہلی میں چھپے تھے، دو کتابیں اور زیر ترتیب تھی، ایک امیر خسرو پر اور دوسری حضرت شاہ وجیہ الدین احمد آبادی گجراتی پر، دار المصنفین اعظم گڈھ میں

انھوں نے ہندوستانی مفسرین پر کام شروع کیا تھا، تقریباً اس کا نصف حصہ مرتب کر چکے تھے کہ قضاوقدر نے خود ان کی کتاب حیات کا تمت بالخیر کر دیا۔

مولانا عبدالرحمٰن پرواز مرحوم کو تصوف سے محض علمی ونظری دلچسپی نہ تھی، بلکہ وہ اس راہ کے سالک تھے، آٹھ، دس سال قبل وہ اس دور کے مشہور سلسلۂ نقشبندیہ کے شیخ طریقت مولانا محمد احمد پرتاپ گڈھی کی خدمت میں حاضر ہوکر باقاعدہ ان سے بیعت ہوئے تھے، وہ کہتے تھے کہ اصلاح باطن، تزکیۂ نفس، اور نسبت مع اللہ پیدا کرنے کے لیے کسی شیخ طریقت کی رہنمائی ضروری ہے، وہ طبعاً خاموش، سنجیدہ، متین، حلیم، بردبار اور بے ضرر شخص تھے، مردم آزاری وایذا رسانی ان کی شرشت میں تھی ہی نہیں، طبیعت میں مروت وشرافت تھی، کسی کے رویہ سے تکلیف یا طرزعمل سے شکایت ہوتی تو ضبط وتحمل سے کام لیتے، تواضع وخاکساری ان کی ایک ایک ادا سے ٹپکتی تھی، ان کی زندگی نہایت سادہ اور تکلفات سے بری تھی، نام ونمود اور نمائش وظاہرداری سے انھیں نفرت تھی، ان کے خوبصورت چہرے اور نورانی داڑھی سے ان کا علم وفضل اور شرف ومجد عیاں اور ظاہر ہوتا تھا۔

مولانا سے میری پہلی ملاقات تقریباً ۱۹۷۴ء میں بنارس میں ہوئی، میں اس وقت مدرسہ اسلامیہ مدنپورہ بنارس میں مدرس تھا، مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کا یہ عام معمول تھا کہ وہ بمبئی آتے جاتے مدرسہ اسلامیہ میں کچھ دیر ہی کے لیے سہی مگر آتے ضرور تھے، وہ حسب معمول بمبئی سے آئے تو ان کے ساتھ مولانا پرواز صاحب بھی تھے، قاضی اطہر نے مولانا کا مجھ سے اور میرا مولانا سے تعارف کرایا، یہی اولین دید وشنید، مولانا مرحوم کے اخلاق کریمانہ کی بدولت گہرے تعلقات میں بدل گئی۔ وہ جب بمبئی سے گھر آتے تو اپنی آمد کی اطلاع ضرور کرتے، اسی طرح واپسی پر بھی اطلاع دیتے کہ فلاں تاریخ کو واپسی ہے، موقع ہوتا تو قیام بھی کرتے۔ تذکرہ اعظم گڈھ کی ترتیب کے زمانہ میں مولانا سے ان کے والد بزرگوار کے حالات کے بارے میں انھیں لکھا تو ازراہ نوازش ان کا مکمل تذکرہ تحریر کر کے بذریعہ ڈاک ارسال کر دیا، ان کی کتاب حضرت مخدوم علی مہائمی چھپی تو ایک نسخہ بذریعہ ڈاک میرے پاس بھیجا، میں جب بنارس سے دیوبند آگیا، اور یہاں

آتے ہی ایسے حالات وواقعات کے حصار میں گھر گیا کہ ایک عرصہ تک مراسلتی رابطہ بھی قائم نہ ہوسکا، اسی دوران وہ بمبئی سے دارالمصنفین آگئے، اور یہاں سے سفر آخرت پر چلے گئے۔ اس لمبے عرصے کے دوران ملاقات نہیں ہوسکی، جس کا آج تک صدمہ ہے۔

رحلت کے دن وہ بظاہر بالکل ٹھیک چاک وچوبند تھے، دن بھر کے اپنے سارے معمولات انجام دیئے، رات گیارہ بجے تک مطالعہ میں مصروف رہے، دفعتاً انھیں کچھ اضطراب وبے چینی سی محسوس ہوئی، اسی کیفیت میں چند لمحے گذرے ہوں گے کہ روح قفس عنصری سے پرواز کرکے اعلیٰ علیین میں جا بسی۔ یہ غمناک حادثہ ۳-۴/دسمبر ۱۹۸۴ء مطابق ۱۴۰۵ھ کو پیش آیا۔

مولانا مفتی عبدالروٴف منصف مبارک پوری

مولانا عبدالروٴف منصف بن محمد یوسف بن امین الدین بن شکر اللہ مبارک پوری اپنے ہم عصر علمائے مبارک پور میں اپنی گوناگوں صلاحیتوں کی بناء پر ایک خاص مقام ومرتبہ کے مالک تھے۔

مولانا کی تاریخ ولادت کا علم نہیں ہوسکا، جامعہ عربیہ احیاء العلوم کے اساتذہ کے ناموں سے جن سے آپ نے عربی تعلیم کی ابتداء کی تھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چودھویں صدی کی چوتھی دہائی کے حدود میں آپ کی پیدائش ہوئی ہوگی، واللہ اعلم بالصواب۔

مولانا منصف مرحوم کی علمی نشوونما جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں ہوئی، جامعہ ہی کی علمی ودینی فضاؤں میں آپ پروان چڑھے، ابتدائی عربی سے متوسطات تک کی ساری کتابیں یہیں پڑھی، تعلیم کا یہی زمانہ درحقیقت استعداد سازی کا ہوتا ہے، اس وقت جامعہ کے اساتذہ میں۔ مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب، مولانا بشیر احمد صاحب، اور مولانا عبدالجبار معروفی صاحب وغیرہ جیسے ماہر فنون علماء مسند تدریس پر متمکن تھے، مولانا منصف نے انھیں باکمال اساتذہ سے کسب فیض کیا۔

پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ پہنچے، اور داخلہ لے کر پڑھنا شروع

کر دیا، ابھی ندوہ میں قیام کو چند ماہ ہی گذرے تھے کہ شدید علالت میں مبتلا ہو گئے، ناچار لکھنؤ سے رخت سفر باندھ کر گھر واپس آگئے، بیماری کے اس عرصہ میں تعلیمی سلسلہ موقوف رہا، مہینوں کے بعد جب مرض نے پیچھا چھوڑا اور آپ پورے طور پر صحت یاب ہو گئے، تو تعلیمی سلسلہ کو آگے بڑھانے کے لیے کسی قریب مدرسہ میں داخلہ لینے کے بجائے سہارن پور کے لیے سامانِ سفر درست کیا، اور دار العلوم دیوبند پہنچ کر وہیں داخلہ لیا۔ اس وقت آپ کے خاص وطن کے قاری انوار الحق مرحوم اور قرب و جوار کے کچھ دیگر شناشا طلبہ بھی زیر تعلیم تھے، اس لیے اس نئی جگہ میں اجنبیت محسوس نہیں ہوئی اور پوری دلجمعی کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا، تا آنکہ ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۴۹ء کے حدود میں دورۂ حدیث پڑھ کر دار العلوم دیوبند سے سند فضیلت حاصل کی، کتب حدیث کے اساتذہ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی، حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، حضرت مولانا سید فخر الحسن مرادآبادی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد اپنے اساتذہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، خود بھی یہی مشغلہ اپنے لیے منتخب کیا، یوں تو مولانا مرحوم نے متعدد مدارس میں مسند تدریس کو زینت بخشی، لیکن فیض العلوم بڑہل گنج ضلع گورکھپور، اور جامعۃ الفلاح بلریا گنج ضلع اعظم گڈھ میں اور مدرسوں کی بنسبت قیام زیادہ رہا، آخر الذکر ادارے میں آپ کے تدریسی زندگی کے ایام سب سے زیادہ گزرے ہیں اور سچ پوچھئے تو اسی کے زمانۂ قیام میں مولانا منصف مرحوم کے کمالات کے جوہر نمایاں ہوئے۔

جامعۃ الفلاح میں بالعموم ان کے زیر درس قدوری، نور الانوار، ہدایہ اولین، بدایۃ المجتہد، سراجی، سنن ابوداؤد وغیرہ کتب حدیث وفقہ رہیں۔ تدریس کے ساتھ آپ سے فتویٰ نویسی کا کام بھی متعلق تھا، اس مدت میں ہزاروں فتوے تحریر کیے، افتاء کا کام گھر پر بھی مستقل طور پر جاری تھا۔

قصبہ مبارک پور کے نوجوان فضلاء اور ان کی علمی صلاحیتوں کو منظم کرنے اور علم ودانش کی لڑی میں پرونے کی غرض سے ایک انجمن نادیۃ الفضلاء کے نام سے مبارک پور

میں قائم کی، جس کے خود مولانا مرحوم سرپرست تھے، اس تنظیم کی جانب سے ایک دو ماہی مجلّہ ''ندائے فضلاء'' کے نام سے نکلتا تھا، جو اپنے تحقیقی و معیاری مضامین کی بناء پر اس علاقے میں بہت مقبول تھا، اس مجلہ میں مولانا منصف کے منظوم کلام بھی شائع ہوتے تھے۔

مولانا مرحوم عالم دین اور مفتی ہونے کے ساتھ ایک خوش گو شاعر بھی تھے، ایک زمانہ میں آپ کے اشعار رسائل و جرائد میں چھپا کرتے تھے، آخر میں مشق سخن کی طرف توجہ بہت کم ہوگئی تھی۔

مولانا مرحوم جامعۃ الفلاح کے آخری دور تدریس میں مدرسہ میں قیام کی بجائے خانگی ضرورت کے تحت شام کو روزآنہ گھر چلے آیا کرتے تھے، یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا، آخر میں پیرانہ سالی کی وجہ سے تدریسی سلسلہ کو ختم کردیا تھا اور جامعۃ الفلاح بلریاگنج سے مستعفی ہوکر گھر ہی پر مستقل طور سے رہنے لگے تھے۔

مرحوم کی تعلیم وتربیت علمائے حق کے آغوش میں ہوئی تھی، اس لیے زندگی بھر حق کی ترجمانی کی، ان کی اس حق گوئی وبیباکی کے مقابل دولت وثروت، عہدہ اور منصب جو بھی آیا غبار راہ کی طرح فضاؤں میں تحلیل ہوگیا، مولانا بڑے نڈر اور جری تھے، راست گو تھے اور راست گوئی کو پسند کرتے تھے، اپنے چھوٹوں پر بیحد مہربان تھے، ان کی علمی وفکری تعمیر و ترقی کے منصوبے اور تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔

ان کی عمر کا کاروان جس رفتار سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا، اسی رفتار سے امراض کا ہجوم بھی بڑھتا رہا، دوا علاج سے کبھی افاقہ ہوجاتا تو کبھی امراض کی شدت بڑھ جاتی، صحت ومرض کی اس آنکھ مچولی سے بالآخر آپ بالکل نڈھال ہوگئے، اور اسی ضعف وناتوانی کی حالت میں ۶ر جمادی الاخریٰ ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۱ رمئی ۲۰۱۰ء یوم جمعہ کو روح کلبد خاکی کو چھوڑ کر اپنی آخری منزل کو روانہ ہوگئی، دوسرے دن صبح نو بجے نماز جنازہ ادا کی گئی اور اس علم وفن، عقل وفہم اور جہد وعمل کے مجموعہ کو ہمیشہ کے لیے دفن کردیا گیا۔

مولانا مرحوم نے کوئی مستقل تصنیف تو نہیں چھوڑی، لیکن ان کے فتاوے اگر جمع کر کے شائع کیے جائیں تو وہ کئی ضخیم جلدوں کو حاوی ہوں گے، اس طرح ان کی غزلوں،

نعتوں اور نظموں کو تلاش کر کے اگر مرتب کر دیا جائے تو ایک اچھا خاصا دیوان بن جائے گا۔

مولانا عبدالسلام فراہی

اپنے عہد کے علوم قرآن کے منفرد عالم، صاحب نظام القرآن مولانا حمیدالدین فراہی رحمہ اللہ سے جن خوش نصیبوں کو براہ راست استفادہ، اور اخذ فیض کی توفیق میسر ہوئی ان میں مولانا عبدالسلام بن محمد عدیل فراہی بھی ہیں، مولانا موصوف اپنے آبائی وطن پھریہا ضلع اعظم گڈھ میں ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے، ابھی زندگی کی صرف ایک بہار ہی دیکھ پائے تھے کہ والد بزرگوار کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے، شیخ محمد عدیل کی وفات کے بعد یتیم بھتیجے کی پرورش اور دیکھ ریکھ کی ذمہ داری دونوں چچا شیخ حفیظ احمد قانون گو اور شیخ عبدالرؤف نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دی۔

مولانا عبدالسلام جب سات برس کے ہو گئے تو انھیں حافظ عبدالسلام نظام آبادی کے سپرد کر دیا گیا جو پھریہا کی جامع مسجد میں گاؤں کے بچوں کو ناظرہ قرآن مجید وغیرہ پڑھاتے تھے، حافظ صاحب بڑے پاک طینت، نیک نفس بزرگ تھے، تقریباً ترسٹھ برس تک ملت کے نونہالوں کی علمی و دینی تربیت کی اور اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا، اپنے اہل وعیال کی کفالت سلائی وغیرہ کی آمدنی سے کرتے تھے۔

مولانا نے حافظ عبدالسلام جیسے متقی و پرہیزگار کی خدمت میں دو سال رہ کر تعلیم وتربیت حاصل کی، اس اولین تربیت کا مولانا کی زندگی پر بڑا خوشگوار اثر پڑا، ناظرہ کی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد ۱۹۱۶ء مطابق ۱۳۳۵ھ میں گاؤں کے سرکاری اسکول میں داخل ہوئے اور اس میں درجہ دوم تک کی تعلیم حاصل کی، تعلیم کا یہ دوسرا دور بھی نہایت پاکیزہ تھا، اسکول کے سب اساتذہ مسلمان اور نیک اطوار تھے، بالخصوص مولوی نصیرالدین نظام آبادی صوم وصلوٰۃ کے نہایت پابند اور بڑے دیندار تھے، اس نیک صفت استاذ نے مولانا کی تعلیم اور دینی تربیت پر خصوصی توجہ دی، انھیں کی تربیت نے مولانا مرحوم کے دینی مزاج کو پروان چڑھایا اور روزہ نماز کا ایسا پابند بنا دیا کہ زندگی کے کسی مرحلے میں بھی اس

پابندی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اردو درجہ سے فراغت کے بعد ۱۹۱۸ء مطابق ۱۳۳۷ھ میں پھریہا کے مدرسہ اسلامیہ میں داخلہ لے لیا جو دینیات اور فارسی کی تعلیم وتدریس کے لیے قائم کیا گیا تھا، اس وقت اس مدرسہ میں اعظم گڈھ ہی کے ایک فارسی کے فاضل مولانا محمد ایوب فارسی پڑھاتے تھے، انھیں سے مولانا مرحوم نے فارسی کی تحصیل کی، تعلیم وتحصیل کے ان ابتدائی مراحل کے طے ہوجانے کے بعد ایک دن ان کے بڑے چچا قانون گو صاحب نے کہا بیٹے چلو تمہاری ملاقات مولانا حمیدالدین صاحب سے کرادوں، مولانا فراہی اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کو خیرباد کہہ کر اپنے وطن پھریہا ہی میں مقیم تھے، چنانچہ سعادت مند بھتیجا چچا کے ہمراہ مولانا فراہی کی خدمت میں پہنچ گیا، حضرت مولانا فراہی نے چچا سے ان کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرلینے کے بعد پوچھا کہ ''حفیظ'' تم اس بچے کو کس قسم کی تعلیم دلانا چاہتے ہو، چونکہ وہ خود ''قانون گو'' تھے اس لیے ان کا رجحان انگریزی تعلیم دلانے ہی کا تھا، انھوں نے اپنا عندیہ ظاہر کردیا، جدید تعلیم دلانے کا ارادہ ہے تاکہ آگے چل کر کسب معاش میں اسے دشواری نہ پیش آئے، یہ سن کر حضرت مولانا فراہی کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا، فرمایا حفیظ تم زندگی بھر بیل رہے کیا اس بچے کو بھی بیل بنانا چاہتے ہو، حضرت مولانا کا یہ تیور دیکھ کر ''حفیظ صاحب'' نے سر جھکا لیا پھر بولے یہ بچہ آپ کے حوالہ ہے اس کی تعلیم وتربیت سے متعلق اب آپ ہی کا حکم نافذ العمل ہوگا، حضرت مولانا فراہی نے قدرے توقف کے بعد فرمایا تو اس بچے کو میرے پاس بھیج دیا کرو میں اسے پڑھاؤں گا، دوسرے دن سے مولانا عبدالسلام ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور حضرت مولانا مطالعہ قرآن سے کچھ وقت ان کے لیے فارغ کرکے انھیں پڑھانے لگے، ایک سال کے اندر ہی ''اسباق النحو اوّل ودوم، فارسی کی دو کتابیں اور انگریزی کی کنگ ریڈر'' پڑھا دیں، اور اس کے بعد آگے کی تعلیم کے لیے انھیں ۱۹۲۱ء مطابق ۱۳۴۰ھ میں مدرستہ الاصلاح سرائے میر بھیج دیا، اس طرح حضرت مولانا فراہی نے انھیں گھر کے ماحول اور سرپرستوں کے رجحان کے برخلاف جدید عصری تعلیم کی بجائے عربی دینی تعلیم پر لگا دیا، مولانا عبدالسلام فراہی خود ایک موقع پر لکھتے ہیں ''یہ علامہ

فراہی کا فیضان نظر تھا کہ میں نے دینی تعلیم حاصل کی، اور فارسی، اردو، عربی اور انگریزی زبانیں سیکھیں، اللہ تعالیٰ کی مجھ پر بڑی رحمت تھی کہ اس نے شیخ المفسرین علامہ فراہی کی صحبت کا شرف بخشا۔''

مولانا فراہی کی ہدایت کے مطابق، مولانا عبدالسلام مرحوم مدرستہ الاصلاح میں داخل ہو گئے، اور ۱۹۲۷ء مطابق ۱۳۴۶ھ میں مدرستہ الاصلاح کی تعلیم مکمل کر کے سند فضیلت حاصل کی، مدرستہ الاصلاح سے فراغت کے بعد مولانا کی تعلیم کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ مولانا نے سرائے میر سے رخت سفر باندھا اور الہ آباد پہنچ گئے، اس وقت سرکاری تعلیمی ادارہ ''الہ آباد تعلیمی بورڈ'' سے ملحق مدارس میں مدرسہ ''مصباح العلوم الہ آباد'' ممتاز حیثیت کا حامل تھا، مولانا نے اسی مدرسہ سے ۱۹۲۸ء میں عالم کا امتحان دیا اور فرسٹ ڈویژن پاس ہوئے، پھر ۱۹۲۹ء میں فاضل کا امتحان دے کر اس کی ڈگری لی، سند فضیلت کی تحصیل کے ساتھ انھیں ایام میں فارسی کے دو امتحانات دیے اور حسب سابق ان امتحانات میں بھی فائز المرام ہوئے اور منشی، نیز منشی کامل کی اسناد حاصل کیں اردو، فارسی اور عربی میں کامل دستگاہ حاصل کر لینے کے بعد انگریزی تعلیم کا شوق دامن گیر ہوا، جس کی بنیاد علامہ فراہیؒ نے ابتداء ہی میں رکھ دی تھی، چنانچہ انھوں نے پرائیویٹ طور پر تیاری کر کے ۱۹۳۱ء میں ہائی اسکول کا امتحان دیا اور کامیابی نے آگے بڑھ کر قدم بوسی کی، پھر الہ آباد میں مقیم جون پور کے ایک رئیس خاندان کے رکن رکین ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کی خدمت میں پہنچے جو انگریزی ادب میں پوری مہارت رکھتے تھے، مولانا نے تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی رہنمائی میں انگریزی زبان کی اچھی خاصی لیاقت پیدا کر لی، اسی دوران مولانا حکیم فخر الدین صاحب سے بھی فن طب میں استفادہ کرتے رہے، اور اس فن میں بھی بڑی حد تک معلومات حاصل کر لیں، پھر ۱۹۳۲ء میں الہ آباد ہی میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا، بعد ازاں ۱۹۳۶ء میں آگرہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا، انھیں سرگرمیوں کے دوران انھیں فن تاریخ سے دلچسپی ہو گئی اور تاریخ کے مطالعہ میں پورے طور پر لگ گئے، تاریخ کے اسی شوقِ فراواں کی بدولت وہ الہ آباد پبلک لائبریری کے ممبر منتخب ہو گئے، اس

انتخاب کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے لیے یورپ، ایشیا، افریقہ، عرب، مصر، عراق، شام، ایران وغیرہ براعظموں کے قابل ذکر ملکوں کی تاریخوں کے مطالعہ کی راہیں ہموار ہوگئیں۔

اسی اثناء میں انھوں نے ایک اور امتحان میں شرکت کی جو "اردو ایڈوانس" کے نام سے اس وقت معروف تھا، برٹش حکومت نے ملازمت کے لیے اس امتحان کو لازمی ٹھہرا رکھا تھا، اس امتحان میں بھی وہ نمایاں کامیابی سے سرفراز ہوئے۔

مولانا عبدالسلام مرحوم نے اپنے وطن پھریہا کی جامع مسجد سے ۱۹۱۷ء میں جو رواں دواں تعلیمی سفر شروع کیا تھا وہ منزل بہ منزل آگے بڑھتے ہوئے بالآخر ۱۹۴۰ء مطابق ۱۳۵۹ھ کو اپنی آخری منزل پر پہنچ کر اختتام پذیر ہوا۔ اس کے بعد سیکھنے کے بجائے سکھانے اور پڑھنے کے بالمقابل پڑھانے کے دور کا آغاز ہوا، جس کی ابتداء مولانا محمد شریف صاحب مہتمم مدرسہ مصباح العلوم کی تجویز کے مطابق مولانا ضیاء الحسن کاکوروی (رجسٹرار مدارس عربیہ آف رجسٹرار الہ آباد بورڈ) کے صاحبزادے "حسن بن ضیاء" کو درس دینے سے ہوئی، یہ حسن بن ضیاء انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے، ان کے والد کی خواہش تھی کہ ان کا نونہال عصری تعلیم کے ساتھ عربی فارسی سے بھی ایک حد تک آشنا رہے، چنانچہ انھوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار مولانا محمد شریف صاحب سے کیا تو انھوں نے اس خدمت کے لیے مولانا عبدالسلام مرحوم کا انتخاب کیا اور مولانا حسن ضیاء کو فارسی اور عربی پڑھانے لگے، مولانا ضیاء الحسن کاکوروی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو کے تعلیم یافتہ عربی ادب کے اچھے عالم تھے، انھوں نے مولانا عبدالسلام کے طریقۂ درس کو دیکھا تو انھیں اندازہ ہوگیا کہ یہ ایک ذی استعداد و باصلاحیت عالم ہیں، اس لیے انھوں نے مولانا مرحوم سے کسی مشورہ وغیرہ کے بغیر ان کا تقرر مدرسہ مصباح العلوم الہ آباد میں کرادیا، اور مولانا باضابطہ مدرس کی حیثیت سے اس میں ادبیات و تاریخ کے ساتھ موطاء امام محمد کا درس دینے لگے، اس طرح ایک فرد کی جگہ اب اک جماعت کو پڑھانے لگے اور پانچ روپئے کے بجائے اب ان کا مشاہرہ پینتیس روپئے ہوگیا، جو آج کل کے پینتیس سو سے بھاری نہیں تو اس سے کم نہیں تھا، مولانا موصوف نے مدرسہ مصباح العلوم میں چودہ سال تدریسی

خدمات انجام دیں اور بڑی نیک نامی و کامیابی کے ساتھ یہ دور گذرا۔

اوپر سطور میں گذر چکا ہے کہ مولانا کے والد ان کے ایام طفولیت ہی میں وفات پا گئے، اور مولانا اپنے تعلیمی وتدریسی مشاغل کی وجہ سے گھر سے دور الہ آباد میں مقیم تھے، اب تک والدہ نے اس اکلوتے بیٹے کی دوری اور جدائی کو برداشت کیا، لیکن اب انھیں بتقاضائے عمر خدمت کی ضرورت ہوئی، تو مولانا نے ایک ولد صالح کے کردار کا مظاہرہ کیا، اور ۱۹۵۴ء مطابق ۱۳۷۴ھ کو مصباح العلوم کی ملازمت اور تدریسی خدمت سے مستعفی ہو کر گھر ماں کی خدمت میں حاضر ہو گئے، اور گھر سے قریب شبلی کالج اعظم گڈھ میں ٹیچر ہو گئے، شبلی کالج میں تدریس کا یہ سلسلہ جولائی ۱۹۵۴ء میں شروع ہوا، پھر تھوڑے ہی عرصہ میں ٹیچر سے ترقی کر کے پروفیسر ہو گئے اور مشاہرہ بھی بتدریج بڑھتے بڑھتے سات سو تک پہنچ گیا، پروفیسر ہو جانے کے بعد آپ سے متعلق صرف تین گھنٹے کے اسباق رہ گئے، بقیہ اوقات نماز، تلاوت، اوراد و وظائف میں صرف کرتے۔

انھیں بچپن سے حفظ قرآن کی بڑی تمنا تھی، مگر تعلیمی مشاغل کی بناء پر یہ تمنا بس تمنا ہی رہی، پروفیسری کے بعد اوقات فارغ ہوئے تو دیگر دنیوی مشاغل سے یکسو ہو کر اپنی اس دیرینہ تمنا کی تکمیل میں لگ گئے اور رفتہ رفتہ قرآن یاد کرتے کرتے پورے قرآن کے حافظ ہونے کی سعادت حاصل کر لی، اور اس سعادت کو قائم ودائم رکھنے کے لیے روزانہ کی تلاوت کو اپنا ایک فریضہ بنا لیا تھا، رمضان المبارک کی نماز تراویح میں الگ الگ تین مسجدوں میں تین ختم کرتے تھے۔

اعظم گڈھ سے گھر پھریہا ہمیشہ پیدل آیا کرتے تھے راستہ طے کرتے ہوئے قرآن کی تلاوت کا معمول تھا۔

گرمیوں میں جب شبلی کالج میں تعطیل ہوتی تو چھٹیوں کا یہ زمانہ مدرستہ الاصلاح میں درس ہدایہ میں گزارتے، علامہ فراہی کے بعد پھریہا کی جامع مسجد میں خطبہ وامامت کی ذمہ داری وہی نبھاتے تھے، جس کا سلسلہ تقریباً سینتیس، اڑتیس سال تک جاری رہا ۱۹۷۰ء مطابق ۱۳۹۰ھ میں وہ مسلسل بیمار رہنے لگے تھے، پھر کثرت تلاوت واذکار کی

وجہ سے ضعفِ دماغ کا عارضہ بھی ہو گیا تھا، اس لیے جمعہ و جماعت نیز تراویح سب کی امامت چھوڑ دی، ۱۹۷۲ء مطابق ۱۳۹۲ھ میں شبلی کالج سے ریٹائر ہو گئے، اس وقت سے مستقل قیام گھر ہی پر رہا، فراغت کے یہ ایام، پنجوقتہ فرائض کے علاوہ سنن ونوافل، تلاوت وذکر اور کتابوں کے مطالعہ میں صرف ہوتے، کچھ وقت تصانیف میں بھی لگاتے تھے، تصانیف کچھ زیادہ نہیں ہیں اور وہ بھی کسی مسیحا کے انتظار میں ہیں جو طبع کرا کے انھیں نئی زندگی بخش دے۔

مولانا عبدالسلام مرحوم کی کثرت عبادت وتلاوت کا سلسلہ بدستور جاری رہا، اسی کے ساتھ ساتھ بیماری اور ضعف ونقاہت میں بھی بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ تا آنکہ ۱۳/اپریل ۱۹۸۱ء مطابق ۱۴۰۲ھ یوم دوشنبہ کو حسب معمول نماز وتلاوت سے فارغ ہو کر بچوں کے درس میں مشغول ہو گئے، درس کا یہ سلسلہ ظہر تک چلتا رہا، اس کے بعد وضو کے لیے کمرہ سے باہر آئے، وضو کیا اور نماز ظہر ادا کی چونکہ ظہر بعد کچھ دیر آرام کا معمول تھا، اس لیے لیٹ گئے اور لیٹے لیٹے تسبیح پڑھنی شروع کی ابھی تسبیح کے الفاظ چند بار ہی زبان سے ادا ہو پائے تھے کہ دفعتاً داعیٔ اجل نے انھیں دستک دی اور اس بندۂ صاحب تسلیم ورضا نے جان جان آفریں کے حوالہ کر دی، اسی دن بعد نماز عشاء اس خزانۂ خوبی کو اس کے وطن کے قبرستان میں ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا گیا۔

دل کو سکون روح کو آرام آ گیا موت آ گئی کہ دوست کا پیغام آ گیا

مولانا مرحوم کو اردو، فارسی، عربی کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی عبور تھا، ذہانت وذکاوت سے بھی بہرہ ور تھے، زندگی کا ایک اچھا حصہ کالج جیسے آزاد ماحول میں گزارا، مگر ان کی دینداری، شریعت کی پابندی میں سر مو فرق نہیں آیا، بلکہ گرد و پیش کے ماحول ومعاشرہ کے برعکس عمر کے بڑھنے کے ساتھ توجہ الی اللہ کا جذبہ بڑھتا رہا، حافظ عبدالسلام نظام آبادی نے اپنے ہونہار شاگرد عبدالسلام فراہی کے قلب ودماغ میں، دین واسلام کی جو تخم ریزی کی تھی، اور علامہ فراہی جیسے پاک طینت بزرگ نے اپنی یک سالہ صحبت سے جس کی آبیاری کی تھی، وہی آگے چل کر مولانا عبدالسلام فراہی کی شکل میں ایک چلتا پھرتا شجرۂ ثمر دار بن گیا

تھا، مولانا اپنے ذوق، مزاج، عادات واخلاق، افعال وکردار اور فضائل وکمالات کے لحاظ سے ایک نمونہ کے انسان تھے۔ (ماخوذ از مضمون مولانا محمد یونس قاسمی نواسہ مولانا مرحوم)

مولانا عبدالظاہر کوٹیلوی

مولانا عبدالظاہر بن حاجی عبدالقدوس بن عبدالرحیم اپنے آبائی وطن موضع کوٹیلہ ضلع اعظم گڈھ میں ۶/ستمبر ۱۹۵۴ء م ۱۳۷۴ھ کو پیدا ہوئے، موضع کوٹیلہ ضلع اعظم گڈھ کے ان مواضع میں سے ایک ہے جو دین داری میں ممتاز ہیں، موضع کوٹیلہ میں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری کے متعدد متوسلین تھے جن میں ممکن ہے بعض اب بھی موجود ہوں، اس موضع میں اہل دین کی آمد مدت سے ہے، جس کی وجہ سے یہاں دینی تعلیم کا رواج ہے اور یہاں کئی ممتاز عالم پیدا ہوئے، ان میں ایک مولانا عبدالظاہر بھی تھے۔

مولانا مرحوم نے ابتدائی تعلیم قریبی گاؤں آنوک کے مکتب میں پائی، پھر رانی کی سرائے کے اسکول میں پڑھا، بعد ازاں دینی علوم کی تحصیل کے لیے مدرسہ بیت العلوم سرائے میر کا رخ کیا، اور ۲۰/شوال ۱۳۸۵ھ کو اس کے شعبۂ حفظ میں داخلہ لیا، حفظ قرآن کی تکمیل کے بعد فارسی اور عربی کے شعبہ میں آگئے اور اپنی ذہانت وفطانت کی بدولت مع حفظ قرآن نو سال کی مدت میں مشکوۃ تک کی کتابیں پڑھ لیں، ان کے مدرسہ بیت العلوم کے اہم اساتذہ میں مولانا محفوظ الرحمن سلطان پوری، مولانا محمد سجاد جون پوری اعظمی، اور مولانا عبدالقیوم بکھراوی ہیں، پھر یہاں سے دورۂ حدیث پڑھنے کی غرض سے مظاہر علوم سہارن پور کا سفر کیا، اور شوال ۱۳۹۴ھ میں وہاں داخلہ لے کر ایک سال میں اصول ستہ (دورۂ حدیث) کی تحصیل کرکے ۱۳۹۵ھ میں فارغ ہوگئے، حدیث پاک کے اساتذہ میں مولانا محمد یونس جون پوری، مولانا مفتی مظفر حسین صاحب، مولانا مفتی محمد یحیٰ، اور مولانا محمد عاقل بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد علماء وصلحاء کی طرح درس وتدریس کے مشغلہ کا انتخاب کیا اور اپنے گاؤں سے قریب مدرسہ قاسم العلوم منگراواں ضلع اعظم گڈھ میں سات سال تک

تدریسی خدمت انجام دی، یہاں درس سے متعلق بالعموم عربی اوّل سے عربی چہارم تک کی کتابیں رہیں، پھر یہاں سے منتقل ہوکر اپنی مادر علمی مدرسہ بیت العلوم سرائے میر میں مدرس ہوئے، چند سال شعبۂ حفظ سے وابستہ رہ کر ۱۴۰۴ھ میں شعبۂ عربی میں آگئے، شروع میں ابتدائی عربی کی کتابیں ان سے متعلق رہیں اور اپنی علمی صلاحیتوں کی بناء پر بتدریج ترقی کرتے کرتے درس حدیث تک پہنچ گئے، شرح معانی الآثار للطحاوی کا درس مسلسل کئی سالوں تک انھیں سے متعلق رہا۔ ان کی علمی استعداد بڑی پختہ تھی، طلبہ ان کے درس سے ہمیشہ مطمئن اور خوش رہے۔

مولانا عبدالظاہر مرحوم بڑے پاک طینت اور زہد ورع سے متصف عالم تھے، روزانہ ایک منزل قرآن پاک کی تلاوت کا معمول تھا، مظاہر علوم سہارنپور کے زمانۂ قیام میں حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی رحمہ اللہ سے اصلاحی تعلق قائم کیا، حضرت کی رحلت کے بعد ان کے خلیفہ اور اپنے استاذ خاص حضرت مولانا محمد سجاد رحمہ اللہ کی طرف رجوع کیا، ان کی وفات کے بعد سلسلہ نقشبندیہ کے معروف ومشہور شیخ مولانا محمد احمد پرتاب گڈھی سے وابستہ ہوگئے تھے اور جب وہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے تو حضرت محی السنہ مولانا ابرارالحق ہردوئی رحمہ اللہ سے بیعت ہوئے، غرضیکہ زندگی بھر اہل اللہ کے دامنِ رشدوہدایت کو تھامے رہے، اس سے ان کے فکر آخرت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اپنے خانگی معاملات میں بھی وہ بڑے چاک چوبند تھے، گھر کے ایک ایک معاملہ پر نظر رکھتے تھے، حدیث پاک "الاقتصاد نصف المعیشة" کے مطابق آمد وخرچ کے توازن کو کبھی بگڑنے نہیں دیتے تھے، غرضیکہ عقل معاش اور عقل معاد دونوں سے بہرہ ور تھے، ایسے لوگ خال خال ہی پائے جاتے ہیں۔

مولانا موصوف یکم صفر ۱۴۳۲ھ یوم پنجشنبہ کو معمول کے مطابق اسباق پڑھا کر گھر گئے، نماز مغرب کی حسب معمول امامت کی نماز پوری ہوجانے پر مصلیان مسجد سے کہا کہ آج عشاء میں نہیں آسکوں گا، طبیعت کچھ خراب ہے، فجر بھی گھر ہی پر ادا کی، نماز بعد

طبیعت اچانک زیادہ بگڑ گئی فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا، انھوں نے اپنی جیسی سب تدبیریں کر ڈالیں جو وقت موعود کے آگے بے اثر رہیں اور راہ آخرت کا سبک رو مسافر ۳؍صفر ۱۴۳۲ھ یوم شنبہ کو اپنی منزل پر پہنچ گیا، خاندانی قبرستان میں اپنے دو بزرگوں مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد عاصم رحمہم اللہ کے جوار میں تدفین عمل میں آئی۔

مولانا عبدالقیوم بکھراوی

استاذ محترم مولانا عبدالقیوم بن حضرت مولانا عبدالرحمٰن بن حافظ محمد رمضان کی پیدائش ۴؍محرم الحرام ۱۳۲۴ھ کو اپنے نانیہال موضع راجہ پور سکرور ضلع اعظم گڈھ میں ہوئی، آپ کا آبائی وطن موضع بکھرا ہے جو قصبہ سرائے میر سے پانچ میل مغرب میں واقع ہے، بکھرا ضلع اعظم گڈھ کا مشہور گاؤں ہے، جو علم و دولت اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ضلع کے ممتاز مواضعات میں شمار ہوتا ہے۔

مولانا بکھراوی اسی معروف و مشہور موضع کے ایک علمی و دینی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے، مولانا کے والد ماجد مولانا حافظ قاری عبدالرحمٰن دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ کے تلامذہ میں سے تھے، اور حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمہ اللہ کے مرید و خلیفہ تھے، آپ کے دادا حافظ رمضان صاحب کو سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نوراللہ مرقدہ سے اجازت و خلافت حاصل تھی، اسی روحانی و علمی سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی استاذ محترم تھے، مولانا نے ابھی عمر کی پندرہ، سولہ بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ والد بزرگوار کا ۱۳۴۰ھ میں وصال ہو گیا، وفات سے چند یوم قبل ایک دن بڑی حسرت و یاس سے فرمایا کہ: ”میرے ایک ہی لڑکا ہے جو حافظِ قرآن ہو گیا ہے، خیال تھا کہ عربی پڑھاؤں گا، حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کی تعلیم کا غیب سے بندوبست فرمائے، خدائے رحیم و کریم نے اپنے بندۂ مرتاض و مضطر کی دعا قبول کر لی کہ ظاہری اسباب و ذرائع سے بڑی حد تک محرومی کے باوجود ان کے نور نظر و لختِ جگر کو بلند پایہ عالم و فاضل بنا دیا۔

مولانا بکھراوی اپنے والد کے حیات ہی میں اپنے نانیہال کے مشہور حافظ کے مدرس حافظ اولیاء کی خدمت میں رہ کر حفظ قرآن کرلیا تھا، بعد میں ابتدائی فارسی وغیرہ کی تعلیم مقامی اساتذہ سے حاصل کی، جس کی تفصیل معلوم نہیں ہوسکی، پھر ۱۳۴۱ھ میں ''کانپور'' کا علمی سفر کیا، اور اپنے ہی ضلع کے مشہور بافیض عالم مولانا محمد عثمان فتح پوری کی قائم کردہ درسگاہ مدرسہ اشرف العلوم کانپور میں داخل ہوکر بانئ مدرسہ مولانا محمد عثمان وغیرہ سے تین چار سال کی مدت میں ابتدائی عربی، نحو وصرف، فقہ، منطق وغیرہ کی کتابیں پڑھیں اور اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم دیوبند چلے گئے، اور یہاں مسلسل پانچ سال رہ کر نصاب مروّجہ کی تکمیل کی، اور حضرت شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندی، حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، حضرت مولانا رسول خاں ہزاروی وغیرہ اساتذہ دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث پڑھ کر ۱۳۵۰ھ میں فارغ التحصیل ہو گئے۔

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد ضلع کے مشہور عالم دین اور صاحب بیعت وارشاد بزرگ، اور اپنے والد ماجد کے خواجہ تاش شیخ المشائخ مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری بانی مدرسہ بیت العلوم سرائے میر کی طلب پر ۱۳۵۱ھ میں مدرسہ بیت العلوم سرائے میر میں مسند تدریس کو زینت بخشی، چنانچہ ''تذکرہ علماء اعظم گڈھ'' کی ترتیب کے زمانہ میں بندہ کی درخواست پر اپنے والد محترم کی حیاتِ مبارکہ سے متعلق جو تحریر سپرد قلم فرمائی تھی اس کے آخر میں لکھتے ہیں:

''جب میں دیوبند سے فارغ ہوکر ۱۳۵۰ھ میں مکان آیا تو آنے کے ساتھ ہی حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری بانی مدرسہ بیت العلوم سرائے میر جو میرے والد کے پیر بھائی اور حقیقی دوست تھے، ۱۰ر محرم ۱۳۵۱ھ میں مجھے مدرسہ بیت العلوم میں مدرس رکھ لیا۔۔۔اب میری ملازمت کو چھیالیس سال ہورہے ہیں، بزرگوں کی دعا کا اثر ہے کہ حوادث ومصائب کے باوجود اتنے زمانہ تک علوم دینیہ کی خدمت کا موقع ملا، اب میری حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ میری بقیہ زندگی بھی انھیں طلبہ وعلماء وصلحاء کی خدمت میں گزرے اور انھیں

سے تجہیز و تکفین کراوے، اور حشر اللہ کے مقبول بندوں کے ساتھ ہو اور ایمان پر خاتمہ ہو"

یہ شوال ۱۳۹۵ھ کی تحریر ہے، اس کے بعد بیس سال تک استاذ محترم باحیات رہے، اور مدرسہ بیت العلوم ہی سے وابستہ رہے، اس حساب سے کل مدت تدریس ۶۴ برس ہوتی ہے، چونسٹھ سال کا یہ طویل زمانہ صرف ایک مدرسہ کی خدمت میں گزار دیا، جس کی مثال اصحاب درس علماء کی فہرست میں کم ہی ملے گی، جس سے ان کی قناعت پسندی اور استقامت واستقلال کا پتہ چلتا ہے، مولانا علیہ الرحمہ کو "بیت العلوم" سے تعلق عشق کی حد تک تھا، اس کی خدمت بر بنائے ملازمت نہیں؛ بلکہ اخروی سعادت سمجھ کرتے تھے۔

حضرت الاستاذ سے اس ہیچمدان نے مختلف سالوں میں یہ کتابیں پڑھیں، گلستاں، میزان الصرف ومنشعب، مفید الطالبین، روضۃ الادب، نفحۃ العرب، نفحۃ الیمن، شرح جامی، آپ کا طریقۂ درس قدیم اساتذہ کے طرز پر تھا، دوراز کار لمبی چوڑی تقریر کی بجائے کتاب کے حل کرنے پر زور دیتے تھے، عبارت کی تصحیح طالب علم کے ذمہ ہوتی، پھر اسی کے ساتھ یہ ہدایت تھی کہ کوئی از خود سبق کی عبارت نہ پڑھے؛ بلکہ جس سے کہا جائے وہی پڑھے، اس بناء پر درجہ میں شریک ہر طالب علم اچھی طرح تیار ہو کر سبق پڑھنے آتا تھا کہ کہیں مجھے ہی سبق کی عبارت پڑھنے کے لئے نہ فرمادیں، عبارت پڑھنے میں اعرابی غلطی پر تنبیہ ضرور فرماتے، یہ تنبیہ موقع ومحل کے لحاظ سے کبھی زبانی ہوتی اور کبھی دستی۔

پڑھانے کا انداز بڑا نرالا تھا، عبارت کا ترجمہ اور اس کی تشریح ایسے دل نشیں انداز میں بیان کرتے کہ سبق کا مفہوم ومطلب پوری طرح ذہن کی گرفت میں آجاتا تھا، ایک تو مولانا نہایت ذہین وفطین اور قوی الحافظہ تھے، دوسرے ایک طویل عرصہ سے تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، اس لئے درسی کتابیں تقریباً حافظہ میں محفوظ ہوگئی تھیں، اس لئے انھیں مطالعہ کی چنداں ضرورت نہیں رہ گئی تھی، پھر بھی درس سے پہلے کتاب پر ایک نظر ڈال لیتے تھے۔

حضرت مولانا سادگی اور کفایت شعاری میں اپنی مثال آپ تھے، اپنی اس صفت حسنہ کی بناء پر انھوں نے زندگی بڑی فارغ البالی سے بسر کی، تواضع اور خوش اخلاقی میں

اسلاف کے نمونہ تھے، اپنے شاگردوں تک سے نہایت متانت اور نرم لہجے میں گفتگو کرتے تھے، جس سے بھی ملتے خندہ پیشانی سے ملتے، اور مزاج پرسی فرماتے، پابند اوقات اس درجہ تھے کہ اس میں تخلف شاذ ونادر ہی پیش آتا تھا، اسی طرح کھانے پینے میں اس قدر محتاط کہ غذا کی جو مقدار مقرر کر رکھی تھی مجال کیا ہے کہ اس سے زیادہ کھالیں، شام کے کھانے کے بعد گنا کے موسم میں ایک دو بالشت گنا ضرور چوستے، دوسرے موسم میں امرود، کیلا وغیرہ کوئی پھل تھوڑا سا کھانے کا معمول تھا۔ غرض ان کی زندگی اس قدر منظم تھی کہ ایسی منظم زندگی گزارنے والا میں نے نہیں دیکھا، قرآن حکیم کی تلاوت تو ان کی عادت ثانیہ کے درجہ میں ہوگئی تھی، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے کلام الٰہی کی آیتیں ورد زبان رہتیں، ہمیشہ زبانی ہی تلاوت کرتے تھے، میں نے اپنے تین چار سالہ "بیت العلوم" کی دور طالب علمی میں قرآن دیکھ کر انھیں تلاوت کرتے نہیں دیکھا، کبھی کبھی بطور تحدیث نعمت فرماتے تھے کہ جس طرح عام لوگوں کو سورۂ فاتحہ یاد ہوتی ہے بحمد اللہ مجھے اسی طرح پورا قرآن مجید یاد ہے۔

عام طور پر نماز فجر میں امامت وہی کرتے تھے، سنت کے مطابق اس میں طوال مفصل کی قرأت کرتے، مگر اس طرح رواں دواں اور دلکش آواز میں پڑھتے تھے کہ سورۃ کی طوالت کا احساس نہیں ہوتا تھا، جماعت کے اس قدر پابند تھے کہ مشکل ہی سے کبھی چھوٹتی، اچھی آواز میں اچھے اشعار سننے کا بھی ذوق تھا، اپنے اسی ذوق کی تسکین کے لئے مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں کسی متدین اچھے شاعر کو ضرور مدعو کرتے، جب تک شفیق جون پوری مرحوم رہے بالالتزام انھیں کو بلاتے، ان کے بعد حمید لکھنوی وغیرہ شعراء بیت العلوم کے جلسے میں آیا کرتے تھے، اشعار سننے کے وقت وارفتگی میں جھومنے لگتے تھے۔

جہاں تک میرے علم میں ہے کہ حضرت مولانا رسمی طور پر کسی شیخ ومرشد سے بیعت وارشاد کا تعلق نہیں رکھتے تھے، پھر بھی انھوں نے جس تقویٰ وطہارت، زہد وقناعت، اور شریعت پر استقامت کے ساتھ زندگانی بسر کی، اس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ اویسی بزرگ تھے۔

حضرت الاستاذ مرحوم کی عمومی صحت بہت اچھی تھی، آج کل جس طرح سے لوگ امراض کے شکار ہوجاتے ہیں وہ اس سے پوری طرح محفوظ تھے۔ البتہ آخر عمر میں ان پر فالج کا ہلکا سا حملہ ہوا، جس کی وجہ سے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے میں دقت ہوتی تھی، کچھ زبان بھی متاثر ہوگئی تھی، ان پریشانیوں اور دقتوں کے باوجود مدرسہ بیت العلوم سے انھیں جو والہانہ تعلق تھا اس کی بناء پر ان کی خواہش یہی تھی کہ ساری عمر کے لیل ونہار اور ماہ وسال جہاں گزرے ہیں زندگی کے بقیہ یہ چند دن بھی وہیں پورے ہوجائیں، لیکن مدرسہ کے ارباب انتظام مولانا کی سہولت وراحت کے پیش نظر یہ چاہتے تھے کہ علالت کے یہ ایام وہ اپنے گھر ہی پر گزاریں، چنانچہ ان کے اصرار پر مولانا گھر پر آگئے اور وہیں ۱۶رذی الحجہ ۱۴۱۵ھ م ۱۷رمئی ۱۹۹۵ء یوم چہارشنبہ کو وقتِ موعود پورا ہوگیا اور آپ نے جان جانِ آفریں کے حوالہ کردی، ان کی خواہش کے مطابق طلبہ وعلماء کے دوش پر جنازہ بکھرا سے بیت العلوم پر لایا گیا، اور اسی کی قبرستان میں علماء وصلحاء کے جوار میں تدفین عمل میں آئی۔
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

استاذ محترم کا طبعی رجحان تصنیف وتالیف کی جانب نہیں تھا، ورنہ وہ جن ہمہ گیر صلاحیتوں کے حامل تھے، اس کے لحاظ سے تصنیفی کام ان کے لئے کچھ مشکل نہیں تھا، اسی عدم توجہ کی بناء پر انھوں نے کوئی تصنیفی یادگار نہیں چھوڑی، البتہ ملک میں پھیلے ہزاروں کی تعداد میں ان کے تلامذہ ان کی زندہ یادگار ہیں جن میں بہت سے اپنے علم وفضل کے اعتبار سے ملک کے مشاہیر ارباب فضل وکمال کی صف میں شامل ہیں۔ ذلك فضل الله يوتيه من يشاء.

مولانا عبدالمجید ندوی

مولانا عبدالمجید بن حاجی امام علی کی ولادت اپنے آبائی وطن چکیا حسین آباد ضلع اعظم گڈھ میں ۲۵رجون ۱۹۳۹ء م ۱۳۵۸ھ کو ہوئی، مولانا عبدالمجید ندوی کے والد اگرچہ ایک کسان اور کھیتی پیشہ تھے، لیکن انھوں نے اپنے نونہال کی تعلیم وتربیت پر خصوصی

توجہ دی، چنانچہ جب کچھ شد بد ہوگئی تو انھیں گاؤں کے مکتب میں بیٹھا دیا، ابتداء میں انھوں نے مکتب کے معلم حافظ عبدالحمید صاحب کے زیر درس کچھ دنوں تک قرآن مجید حفظ کیا پھر مکتب کی تعلیم پوری کر لینے کے بعد مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں داخل ہوئے، اور عربی چہارم تک کی تعلیم یہیں حاصل کی، اس کے بعد یہاں سے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو چلے گئے، اور بقیہ کتابیں وہیں پڑھ کر سند فراغ حاصل کی، عربی تعلیم سے فراغت کے بعد لکھنو یونیورسٹی سے بی، اے کیا، پھر پرائیویٹ طور پر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے عربی میں ایم، اے بھی کیا، اس طرح قدیم وجدید دونوں طریقۂ تعلیم سے بہرہ ور ہو کر رسمی تعلیم و تحصیل سے کم وبیش ۱۹۶۵ء م ۱۳۸۵ھ میں فراغت حاصل کر لی۔

ندوہ لکھنو کی آخری جماعت میں تفسیر کا درس مولانا عبدالباری ندوی فلسفی سے لیا جن کی تعلیم وتربیت کا خاص اثر ان پر پڑا وہ کئی برس تک ان کے مکان پر ان کے ساتھ رہے۔ اس معیت سے انھیں بڑا علمی فائدہ پہنچا، اس طرح تعلیم وتربیت سے آراستہ ہوجانے کے بعد ہائر سکنڈری اسکول محمد پور اعظم گڈھ سے درس وتدریس کا آغاز کیا، یہاں کچھ عرصہ گذار کر بحیثیت لائبریرین دارالمصنفین اعظم گڈھ میں آگئے، مگر اپنے بعض مشاغل کی وجہ سے وہ یہاں زیادہ دنوں تک قیام نہیں کر سکے، پھر کچھ عرصہ بعد نگرانِ اعلیٰ کی حیثیت سے مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں ان کا تقرر ہوگیا، اسی دوران صدارت تدریس کے فرائض بھی انھیں سپرد کر دیئے گئے، لیکن یہاں سے بھی وہ ۱۹۸۱ء میں علیحدہ ہو کر علی گڈھ آگئے، اور مسلم یونیورسٹی میں عارضی طور پر شعبہ دینیات کے لکچرر اور ناظم شعبہ کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوگیا، تقریباً سال ڈیڑھ سال کے بعد یہ عارضی ملازمت ختم ہوگئی تو علی گڈھ سے واپس گھر آگئے اور تقریباً پانچ سال گھر پر ہی مقیم رہے، اسی دوران علی گڈھ کے شعبہ دینیات کی خالی جگہ کے لئے انٹرویو دیا مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے، اس لیے علی گڈھ میں ملازمت کے خیال سے یکسو ہو کر بمبئی جانے کا ارادہ کیا، مگر یہ ارادہ بھی عملی شکل اختیار نہیں کر سکا، اور بمبئی کے بجائے جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ سے متعلق ہوگئے، جامعہ الرشاد ہی کے زمانۂ قیام میں مدرستہ الاصلاح کے ارباب حل وعقد

نے انھیں اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، چنانچہ اس طلب پر وہ اعظم گڈھ سے علیحدہ ہوکر بحیثیت صدر مدرس سرائے میر آگئے، مدرستہ الاصلاح ہی کے زمانۂ قیام میں وہ اپنے ایک رفیق کے صاحبزادے اور خود اپنے شاگرد کے عقد نکاح میں شرکت کے لیے جارہے تھے، شہر اعظم گڈھ سے جانب مغرب چند میلوں کے فاصلے پر واقع بازار ''رانی سرائے'' میں کوئی بچہ ان کی گاڑی کی زد میں آگیا، مگر ڈرائیور کی ہوشیاری سے وہ بالکل بچ گیا، اسے کوئی چوٹ نہیں آئی، اس کے باوجود وہاں کے بعض شر پسندوں نے ان کی گاڑی پر پتھراؤ کردیا، ایک پتھر مولانا مرحوم کی کنپٹی میں لگا، اس شدید ضرب کی وہ تاب نہیں لاسکے، اور بیہوش ہوگئے، اسی حالت میں انھیں اعظم گڈھ ہسپتال لایا گیا، وہیں ۲۳؍مئی ۱۹۹۱ء م ۱۴۱۲ھ کو دم توڑ دیا، اس طرح اعظم گڈھ کی ایک فعال و متحرک اور اپنے حلقۂ یاراں میں کئی اعتبار سے ممتاز شخصیت کی داستاں کا خاتمہ ہوگیا۔

مولانا عبدالمجید شہید میں پڑھنے لکھنے کی اچھی صلاحیت تھی، مگر اس کے لیے جس دلجمعی کی ضرورت ہے وہ انھیں تاحیات میسر نہیں آسکی، اس لیے وہ کوئی نمایاں علمی کام نہ کرسکے، دراصل وہ جس مزاج وطبیعت کے آدمی تھے اس کے لیے کہیں جم کر کام کرنے کا موقع مل جائے اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اس صلاحیتوں کے باوجود وہ کہیں تادیر ٹھہر نہیں سکے۔

اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی

مولانا عبدالمنان باسوپاروی

مولانا عبدالمنان بن محمد داؤد، موضع باسوپار ضلع اعظم گڈھ کے روشن چراغ تھے، آپ کا سن ولادت ۱۹۲۸ء م ۱۳۴۷ھ ہے۔ ابتدائی فارسی عربی سے مشکوۃ، ہدایہ، وغیرہ موقوف علیہ تک کی مکمل تعلیم جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں حاصل کی، آپ کے یہاں کے مشاہیر اساتذہ میں مولانا مفتی محمد یٰسین مبارک پوری، مولانا محمد یحیٰی رسول پوری، مولانا داؤد اکبر اصلاحی بمھوری، مولانا محمد عمر مبارک پوری، مولانا عبدالغنی بارہ بنکوی وغیرہ

اپنے عہد کے ممتاز اصحاب درس علماء وفضلاء شامل ہیں۔

پھر کتب حدیث کی تعلیم و تحصیل کی غرض سے ۱۹۴۷ء م ۱۳۶۷ھ دیوبند ضلع سہارنپور کا علمی سفر کیا، اور دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر دورۂ حدیث کی کتابیں ذیل میں مذکور تفصیل کے مطابق پڑھیں: حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی صدالمدرسین دارالعلوم دیوبند سے صحیح بخاری مکمل، اور سنن ترمذی جلد اوّل، حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم بلیاوی سے صحیح مسلم اور معانی الآثار للطحاوی، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی سے ابوداؤد مکمل، اور سنن ترمذی جلد ثانی، اور شمائل ترمذی حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی سے مؤطاء امام مالک، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند سے ابن ماجہ، اور حضرت مولانا فخرالحسن مرادآبادی سے سنن نسائی پڑھ کر ۱۳۶۸ھ میں سند فراغت حاصل کی۔

فراغت کے ایک سال بعد اپنی مادر علمی جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں فارسی کے استاذ مقرر ہوئے، اور خداداد ذہانت وذکاوت، اپنی علمی صلاحیت وطبعی صالحیت اور محنت وریاضت سے بتدریج ترقی کرتے کرتے شیخ الحدیث کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہوئے، مولانا مرحوم نہایت کامیاب مدرس ومعلم تھے، معقولات ومنقولات دونوں میں انھیں کامل دسترس حاصل تھی، تفہیم مطالب کا ایسا سلیقہ تھا کہ ادق سے ادق مباحث کو اس طرح ذہن نشین کردیتے تھے کہ طلبہ کو ان کے مشکل ہونے کا احساس تک نہیں ہوتا تھا، تدریس کے ساتھ نقل فتاویٰ میں اپنے استاذ محترم مولانا مفتی یٰسین صاحب کے ایک طویل عرصہ تک معاون بھی رہے۔

مولانا عبدالمنان نے پوری زندگی اپنی مادر علمی کی خدمت میں صرف کردی؛ بلکہ یوں کہیے کہ کھپادی، تقریباً ۱۳۶۹ھ میں بحیثیت مدرس فارسی یہاں آئے تو پھر مرکر ہی جدا ہوئے۔

مولانا مرحوم کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے۔ جن میں مولانا قمرالدین گورکھپوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد مسلم بمھوری، مولانا جمیل احمد قاسمی

سابق استاذ احیاء العلوم حال مقیم سعودیہ عربیہ، مولانا نیاز احمد سابق صدرالمدرسین احیاء العلوم، مولانا اعجاز احمد صدر مدرس مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور اعظم گڈھ، مولانا لیاقت علی قاسمی استاذ مصباح العلوم کوپا گنج وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

مولانا عبدالمنان رحمہ اللہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم کے لیے سراپا اخلاص تھے، تقریباً نصف صدی کے ان کے عہد میں احیاء العلوم کئی انقلابات سے گزرا، مگر ان کا نظریہ تھا ''کارخود کن کار بیگانہ مکن'' اس لیے خسروانِ مملکت کے کاروبار سے یکسو ہوکر اپنے کار تدریس وتربیت میں ہمہ تن مصروف رہے۔

مرحوم چاہے رسمی طور پر راہ سلوک کے مسافر نہ ہوں، مگر اپنے مزاج ومذاق کے لحاظ سے وہ یقیناً صوفی منش تھے، طبعاً کم گو، عزلت پسند، منکسرالمزاج، اور سادہ لوح تھے، گھر، مدرسہ اور مسجد بس یہی ان کا میدان عمل اور جولانگاہ تھی، طلبہ پر اس درجہ شفیق ومہربان کہ نیچے سے نیچے درجہ کا طالب بھی ان سے گفتگو میں جھجک محسوس نہیں کرتا تھا، قناعت اور جفاکشی ان کا اصلی سرمایہ تھا، ان کی سادگی، سنجیدگی، زہد پسندی اور سلامت روی دیکھ کر اسلاف واکابر کی یاد تازہ ہوجاتی تھی۔

عمر کے آخری حصے میں صحت نے ساتھ چھوڑ دیا تھا، اور آپ کے تن ضعیف میں مختلف قسم کے امراض نے اپنا ڈیرا جمالیا تھا، بالآخر ۱۸ر رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ م ۲۸ر جنوری ۱۹۹۷ء یوم سہ شنبہ کو عمر بھر کی رفیق اور ساتھی روح بھی ساتھ چھوڑ کر اپنے آشیانہ کو رخصت ہوگئی، اور اسی پر جامعہ عربیہ احیاء العلوم کی زریں تاریخ کا ایک روشن وتابناک باب مکمل ہوگیا۔

مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری

شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ بن مولانا عبدالسلام بن شیخ خان محمد بن شیخ امان اللہ بن شیخ حسام الدین مبارک پور ضلع اعظم گڈھ کے مایۂ ناز علمائے حدیث سے تھے، مولانا کا خاندان قصبہ مبارک پور میں اپنے علم وفضل کی بناء پر بڑی عزت وشہرت کا مالک تھا، ان

کے والد گرامی منزلت مولانا عبدالسلام اپنے عہد کے مشاہیر علمائے اہل حدیث میں شمار ہوتے تھے، اور اعلیٰ درجہ کے مدرس ہونے کے ساتھ بلند پایہ مصنف بھی تھے۔

مولانا عبیداللہ شیخ الحدیث علم ودین کے اسی گہوارہ میں محرم الحرام ۱۳۲۷ھ میں پیدا ہوئے، فارسی کی مروّج کتابیں اور عربی شرح جامی قطبی، شرح وقایہ وغیرہ تک اپنے والد ماجد مولانا عبدالسلام مرحوم سے پڑھیں، اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں داخلہ لیا اور پانچ سال وہاں زیر تعلیم رہ کر نصاب میں شامل معقولات ومنقولات کی جملہ کتابیں پڑھیں، اپنی ذہانت وفطانت، اور محنت وریاضت کی بناء پر ہر سال امتحان میں اوّل آتے رہے، حدیث پاک کی کتابیں اس وقت کے شیخ الحدیث مولانا احمداللہ پرتاب گڈھی دہلوی متوفی ۱۹۴۳ء م ۱۳۶۳ھ سے پڑھ کر ۱۳۴۵ھ میں فارغ التحصیل ہوگئے۔

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد دارالحدیث رحمانیہ کے مہتمم شیخ عطاء الرحمٰن دہلوی نے ان کی علمی قابلیت اور طبیعت کی سلامتی کے پیش نظر مدرس رکھ لیا، اور ایک کامیاب ونیک نام مدرس ومعلم کی حیثیت سے ایک عرصہ تک مدرسہ رحمانیہ دہلی میں تدریسی خدمت انجام دیتے رہے۔

اسی دوران ان کے استاذ اور ہم وطن عالم ومحدث مولانا عبدالرحمٰن صاحب تحفۃ الاحوذی شرح سنن ترمذی، اس شرح کی تکمیل سے پہلے بینائی سے معذور ہوگئے، اس لئے انھیں ایک ایسے مستعد عالم کی ضرورت پیش آگئی، جو ادب عربی کے ذوق کے ساتھ فن حدیث سے بھی مناسبت رکھتا ہو تاکہ شرح کی تکمیل میں حسب منشا ان کی اعانت کرسکے، اس اہم خدمت کے لئے ان کی نگاہ مولانا عبیداللہ مرحوم پر پڑی اور خود انھیں کے اشارہ پر مدرسہ رحمانیہ کے مہتمم شیخ عطاء الرحمٰن نے اسی مشاہرہ پر جو مدرسے سے ملتا تھا مولانا مرحوم کو مبارک پور حضرت مولانا عبدالرحمٰن کی خدمت میں بھیج دیا، چنانچہ انھوں نے دو سال بطور معاون وہاں قیام کرکے تحفۃ الاحوذی کی آخری دو جلدوں کو مکمل کیا، اس اہم ترین خدمت کے انجام پذیر ہوجانے پر پھر مدرسہ رحمانیہ میں آگئے اور اپنے کار درس وافادہ میں

مصروف ہو گئے اور جب ۱۳۶۳ھ میں مدرسہ کے شیخ الحدیث مولانا احمد اللہ کی رحلت ہوگئی تو ان کی جگہ آپ کو شیخ الحدیث مقرر کیا گیا، پھر ۱۳۶۷ھ میں شاہی مہمان کی حیثیت سے سعودیہ عربیہ گئے، مولانا ابھی وہیں موجود تھے کہ تقسیم ملک کے نتیجے میں ہندوستان میں قیامتِ صغریٰ برپا ہوگئی، اس لئے آپ سعودیہ سے براہ کراچی اپنے وطن مالوف آ گئے، اس لئے کہ دلی اس قیامت کی نذر ہوگئی تھی اور اس کی تمام محفلیں اجڑ گئی تھیں۔

گھر واپس آجانے پر کچھ وقفہ کے بعد اپنا علمی سفر از سرنو پھر شروع کر دیا، پہلے اپنے والد بزرگوار کی گرانقدر اور نہایت وقیع تصنیف ''سیرت البخاری'' کو مفید حواشی کے ساتھ دوبارہ طبع کرایا، اس سے فارغ ہوئے تو پھر اپنی مایۂ صد افتخار تصنیف ''مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح'' کی تالیف وتدوین میں منہمک ہو گئے، کام اپنی رفتار کے ساتھ جاری تھا، اور مولانا موصوف اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر علوم حدیث کے بحر بیکراں سے معلومات وتحقیقات کے موتیوں کو چن چن کر صحیفۂ قرطاس پر بکھیر رہے تھے کہ مختلف امراض کے پے بہ پے حملے شروع ہو گئے۔ مولانا مرحوم نے اس حالت میں بھی اپنے اوپر جبر کر کے سست رفتاری کے ساتھ ہی سہی ایک عرصہ تک اس سلسلے کو جاری رکھا اور افتاں وخیزاں نصف مشکوٰۃ کے قریب کام مکمل کر لیا، لیکن یہاں تک پہنچتے پہنچتے امراض نے آپ کو اس طرح نڈھال اور بے دم کر دیا کہ آپ صاحبِ فراش ہو گئے اور اپنی نوعیت کی یہ منفرد شرح ادھوری ہی رہ گئی۔ مولانا مرحوم کی اس تصنیف کی افادیت اور گرانقدری کا اندازہ اس وقت ہوا جب دارالعلوم دیوبند میں اوّل اوّل مشکوٰۃ کا درس احقر سے متعلق ہوا تو میں نے حضرت فقیہ الامت مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہی رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ حضرت مشکوٰۃ کے درس کے لئے کونسی شرح کا مطالعہ زیادہ مفید ہوگا، تو مفتی صاحب نے برجستہ فرمایا کہ ''مرعاۃ المفاتیح کو دیکھو'' ابھی تک اس کا نام تو سنا تھا، لیکن مطالعہ کی نوبت نہیں آئی تھی، حضرت مفتی صاحب کے فرمانے پر کتب خانہ سے اسے حاصل کر کے دیکھنا شروع کیا، تو اس کتاب کی اور اسی کے ساتھ حضرت مفتی صاحب کے مشورہ کی اہمیت کا علم وتجربہ ہوا، اس کے بعد تو جب تک مشکوٰۃ کے ابتدائی حصے کا درس مجھ سے متعلق رہا، اس شرح کو

دیکھنے کا التزام رہا، واقعہ یہ ہے کہ اس شرح کو بہتر سے بہتر بنانے میں مولانا مرحوم نے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے۔

علم حدیث میں مولانا کے اسی شغف کی بناء پر طبقہ جماعت اہل حدیث میں وہ شیخ الحدیث کے نام سے اس قدر معروف ومشہور ہوئے کہ اس حلقہ میں جب مطلقاً ''شیخ الحدیث'' کا لقب بولا جاتا ہے تو اس سے مولانا مرحوم ہی مراد ہوتے ہیں۔

مولانا موصوف جس طرح ایک بڑے عالم دین اور ایک بڑے محدث تھے، اسی طرح سے وہ ایک بڑے مسلمان، اور ایک بڑے انسان بھی تھے، مولانا قاضی اطہر مبارک پوری رحمہ اللہ کی معیت میں متعدد بار مولانا مرحوم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، ان سے مل کر جب جب واپس لوٹا تو اسی احساس کے ساتھ لوٹا کہ ان کے جیسا منکسر المزاج اور مہمان نواز شاید تلاش بسیار کے بعد بھی نہیں ملے گا، ان سے جب بھی ملا تو بستر پر پڑے ذکر الٰہی میں رطب اللسان پایا، حدیث رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا یہ مخلص خادم، اور اپنے اعمال واخلاق کے اعتبار سے اکابر واسلاف کی یادگار طویل علالت ومعذوری کے بعد ۲۲ رجب ۱۴۱۴ھ م ۵ جنوری ۱۹۹۴ء یوم چہار شنبہ کو اپنے آقا ومولیٰ کی رحمتوں کے آغوش میں پہنچ گیا، نماز جنازہ مولانا مرحوم کے صاحبزادے مولانا عبدالرحمٰن نے پڑھائی، اور قصبہ کی مشہور قبرستان سمودھی میں تدفین عمل میں آئی۔

مولانا غالب احسن اصلاحی

مولانا غالب احسن اصلاحی سیدھا سلطان پور میں پیدا ہوئے، تاریخی نام ''فرید معظم'' ہے اس کے حساب سے سن پیدائش ۱۳۴۴ھ م ۱۹۲۵ء ہے، وہ مشہور عالم دین مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کے فرزند ارجمند تھے، ان کی ابتدائی تعلیم موضع ابڈیہہ اور ''بینا پارہ'' میں ہوئی، اس کے بعد سرائے میر مڈل اسکول میں پڑھا، پھر مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں باضابطہ داخلہ کے بغیر وہاں کے مختلف اساتذہ سے درجہ پنجم عربی تک کی کتابیں پڑھ کر نومبر ۱۹۴۵ء م ۱۳۶۴ھ میں باقاعدہ عربی ششم میں داخلہ لیا، اور دو سال میں یہاں کے نصاب

تعلیم کی تکمیل کرکے ۱۹۴۸ء م ۱۳۶۷ھ میں فارغ التحصیل ہو گئے، ان کے اساتذہ میں مولانا شبلی متکلم، خود ان کے والد مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا اظہار الدین اصلاحی، مولانا محمد سعید ندوی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

ان کے والد ماجد کی خواہش تھی کہ بطور خاص حدیث پاک کی مزید تعلیم شارح مشکوۃ مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری سے حاصل کریں، مگر مولانا رحمانی صاحب اپنی تصنیفی مصروفیتوں کی وجہ سے اس کے لیے وقت نہ نکال سکے، اس لیے اس نیک خواہش کی تکمیل نہیں ہوسکی، تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں مدرستہ الاصلاح کے ناظم مولانا بدرالدین کی صحبت میں ''نیاوج'' ان کے گھر پر رہے، پھر یہاں سے در بھنگہ بہار میں درسگاہ اسلامی اسلام نگر میں مدرس ہو کر چلے گئے، مگر وہاں کی آب و ہوا موافق نہیں آئی اس لئے وہاں سے کچھ دنوں کے بعد واپس لوٹ آئے، اور مدرسہ دینیات کوہنڈہ ضلع اعظم گڈھ میں پڑھانے لگے، چند سال یہاں پڑھانے کے بعد ذی قعدہ ۱۳۷۵ھ م ۱۹۵۶ء میں مدرستہ الاصلاح میں بحیثیت ابتدائی مدرس عربی ان کا تقرر ہو گیا، پھر اپنی علمی صلاحیتوں سے بتدریج ترقی کرکے قرآن وادب اور فقہ وحدیث کا درس دینے لگے، مولانا مرحوم حدیث میں مؤطا امام مالک کے مستقل استاذ رہے اور فقہ میں بدایۃ المجتہد، اور ہدایہ کا درس بھی کثرت سے دیا، آخر میں متون اصولیہ، سبعہ معلقہ، اور آخری درجات کے طلبہ کو قرآن مجید پڑھاتے تھے، ان کے شاگردوں میں مولانا عبدالمجید ندوی، ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی، مفتی محمد شعیب قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی وغیرہ اپنی علمی وقلمی خدمات کی بنا پر شہرت کے حامل ہیں۔

مولانا غالب احسن مرحوم طبعی طور پر ذکی و ذہین تھے، پھر برسہا برس کے تدریسی تجربہ نے ان کے درس کو اور نکھار دیا تھا اس لیے وہ ایک کامیاب مدرس تھے، مزاج میں ظرافت بھی تھی جس کی بنا پر طلبہ پورے انبساط کے ساتھ ان کے درس سے مستفیض ہوتے تھے، ان کا ادبی ذوق بھی ستھرا اور بلند تھا، کبھی کبھی خود بھی اشعار کہتے تھے، البتہ اپنے والد بزرگوار کی طرح تقریر وتحریر کی جانب کبھی رجحان نہیں ہوا بلکہ ایک حد تک اس سے

گریزاں ہی رہے۔ ہاں مجلس یاراں میں کھلتے اور ایسی شستہ وشگفتہ گفتگو کرتے کہ پوری مجلس کے مرکز توجہ بن جاتے۔

جماعتِ اسلامی کے ابتدائے قیام ہی کے وقت سے چونکہ مدرستہ الاصلاح پر اس کی چھاپ رہی ہے اس لیے یہاں کے اکثر اساتذہ کی طرح مولانا غالب احسن صاحب بھی بحیثیت رکن زندگی بھر اس سے وابستہ رہے، انھوں نے کل ترسٹھ برس کی عمر پائی، اور عمر کے آخری وقت تک مدرستہ الاصلاح سے تعلق قائم رہا، مولانا مرحوم کے مرض وفات کا سلسلہ مارچ ۱۹۸۷ء سے شروع ہوا، اسی وقت سے دوا علاج بھی جاری رہا، مگر یہ کوئی معمولی عارضہ نہیں تھا؛ بلکہ بیماریٔ اجل تھی، اس لیے اس کے آگے ساری تدبیریں الٹی ہوگئیں اور مولانا ۱۲ر مئی ۱۹۸۷ء م ۱۷ر رمضان ۱۴۰۷ھ کو اس سرائے فانی کو چھوڑ کر منزل جاودانی کو رحلت کر گئے۔

مولانا علی عباد نندانوی

استاذ محترم مولانا محمد سجاد سابق استاذ و مفتی مدرسہ بیت العلوم سرائے میر کے خلف اکبر مولانا علی عباد ۱۳۶۳ھ م ۱۹۴۴ء میں اپنے والد ماجد کے جائے قیام مدرسہ بیت العلوم سرائے میر میں پیدا ہوئے، مکتب کی ابتدائی تعلیم، حفظ قرآن اور عربی اوّل سے شرح وقایہ، شرح جامی وغیرہ تک مدرسہ بیت العلوم سرائے میر ہی میں پڑھا، البتہ تصحیح مخارج وغیرہ کے لیے تقریباً چھ ماہ مدرسہ اشرف المدارس ہردوئی میں حضرت مولانا ابرار الحق ہردوئی رحمہ اللہ کی زیر سرپرستی میں رہے، پھر آگے کی تعلیم کے لیے مدرسہ جامع العلوم کانپور میں داخلہ لیا اور کانپور ہی میں زیر نگرانی حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ بقیہ نصاب کی تکمیل کر کے ۱۳۸۳ھ م ۱۹۶۳ء میں دورۂ حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہوگئے، دورۂ حدیث کے اساتذہ میں مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی، مولانا نصیر الدین کانپوری، مولانا مفتی محمد منظور مظاہری جونپوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ایک سال تبلیغی جماعت میں لگایا، بعد ازاں علماء وصلحاء

کے طریقہ کے مطابق درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا، سب سے پہلے ۱۳۸۵ھ میں جامع العلوم کانپور میں مدرس مقرر ہوئے، جہاں ابتدائی کتابوں سے لے کر متوسطات تک کی کتابیں زیر درس رہیں، پانچ سال یہاں تدریسی خدمت انجام دے کر ۱۳۹۱ھ میں مدرسہ بیت العلوم سرائے میر آگئے، مگر یہاں ان کا قیام ڈیڑھ دو سال سے زیادہ نہیں رہا، مدرسہ بیت العلوم سے علیحدگی کے بعد مدرسہ قاسم العلوم منگرانواں ضلع اعظم گڈھ، مدرسہ روضۃ العلوم قصبہ پھول پور ضلع اعظم گڈھ میں ۱۴۰۰ھ م ۱۹۷۹ء تک مدرسی کے فرائض انجام دیئے، پھر یہاں سے ۱۹۸۰ء م ۱۴۰۱ھ میں جامع مسجد گریڈیہہ ضلع ہزاری باغ بہار کے امام وخطیب مقرر ہوئے، یہاں چند ماہ گزار کر یکم اکتوبر ۱۹۸۰ء کو مدرسہ مطلع العلوم کمن گڈھا علئی پور بنارس میں مدرس ہوکر آگئے، پھر یہاں جم کر تقریباً چھبیس سال رہے اس مدت میں نصاب میں شامل بڑی کتابوں کے ساتھ مسلسل حدیث کی کتابوں کا بھی درس دیا، مدرسہ مطلع العلوم سے ۲۰۰۷ء م ۱۴۲۸ھ کو ریٹائر ہوکر گھر آگئے، پھر بقیہ عمر گھر پر پوری کر کے ۲۱ رصفر ۱۴۲۹ھ م ۲۰ رفروری ۲۰۰۸ء کو رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے۔

مولانا علی عباد مرحوم کی علمی صلاحیت بڑی پختہ تھی، ہرفن کی کتابیں تحقیق سے پڑھاتے تھے بالخصوص فقہ اور حدیث پر پورا عبور تھا، مزاج میں رابطہ کے مقابلہ میں ضابطہ کا پاس ولحاظ زیادہ تھا، شہرت ونا موری کے بجائے گمنامی زیادہ عزیز تھی، محفل آرائی کی بہ نسبت عزلت گزینی پسند تھی، تعلیم سے فراغت کے سال ہی اپنے والد بزرگوار کی معیت میں سہارنپور حضرت سیدی ومولائی شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت ہوگئے تھے اور جب تک حضرت اقدس حیات سے رہے ان کی زیر ہدایت سلوک کی راہیں طے کرتے رہے، ان کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ اجل حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی سے اصلاحی تعلق قائم کیا، اوران سے خلافت پائی۔

جس زمانہ میں یہ ناچیز مدرسہ بیت العلوم سرائے میر میں عربی کے ابتدائی درجات میں زیر تعلیم تھا، مرحوم اس وقت حفظ قرآن کررہے تھے، اسی وقت سے میرا ان سے یارانہ تعلق رہا، وہ بھی اس رفاقت کا بڑا پاس ولحاظ رکھتے تھے، جب بھی ملاقات ہوتی بڑی

گرم جوشی سے ملتے، عادت کے خلاف دیر تک باتیں کرتے، جب تک میں بنارس رہا ان سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی؛ لیکن میرے دیوبند آجانے کے بعد یہ سلسلہ کم ہو گیا تھا پھر بھی جانبین سے ایک دوسرے کے احوال سے واقفیت کا سلسلہ قائم تھا، میری ان سے آخری ملاقات ان کے گھر پر نندا وں میں ہوئی، میں پنے قدیم کرم فرما مخلص دوست ڈاکٹر مولانا حافظ مبین احمد قاسمی کی دعوت پر ان کے نواسے کے حفظ قرآن کے آغاز کی تقریب میں نندا وں گیا ہوا تھا، تقریب سے فراغت کے بعد مولانا موصوف سے ملاقات کے لیے ان کے مکان پر گیا وہ اس وقت تقریباً نیم فراش تھے، ان کی ران میں پھوڑا ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل تھا، اطلاع پاتے ہی اپنے صاحبزادے کے سہارے گھر سے باہر آئے اور تکلیف کے باوجود دیر تک باتیں کرتے رہے اور بار بار منع کرنے کے باوجود چائے وغیرہ سے ضیافت بھی کی، ان کی تکلیف کو دیکھ کر میں یہی چاہتا تھا کہ ان سے جلدی سے رخصت ہو جاؤں، مگر وہ اس ملاقات کو طول دیتے ہی رہے، کیا معلوم تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے ورنہ میں بھی جی بھر کر ان کی حسن صحت سے مستفید ہوتا۔

مولانا محمد ادریس سرائے میری

مولانا محمد ادریس بن حافظ محمد رمضان بن حاجی باب اللہ بن حاجی رجب علی خاندان ہی کے نہیں؛ بلکہ قصبہ سرائے میر کے روشن چراغ تھے، تاریخ ولادت محقق طور پر معلوم نہیں ہو سکی، مولانا کے معاصرین و رفقاء درس کے سنین پیدائش کے لحاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کی ولادت بھی ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۵ء کے حدود میں ہوئی ہوگی، (واللہ اعلم)

مولانا نے ابتدائی ناظرہ قرآن وغیرہ کی تعلیم گھر اور قصبہ میں حاصل کر کے ''مدرسۃ الاصلاح'' سرائے میر میں داخلہ لیا، اور یہیں مکتب کی بقیہ تعلیم اور فارسی وعربی کی درجہ دوم تک کی کتابیں پڑھیں، مولانا کو اپنے مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ میں سے مولانا نجم الدین اصلاحی سے بطور خاص انس تھا، مولانا اصلاحی مرحوم بھی ان سے بڑی مودّت و محبت کا معاملہ کرتے تھے۔

تقریباً ۱۹۳۲ء مطابق ۱۳۵۱ھ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے دیوبند گئے، دار العلوم دیوبند میں داخل ہوکر، کافیہ، قدوری، نفحۃ الیمن وغیرہ داخل نصاب کتابوں سے وہاں اپنی تعلیم کا آغاز کیا اور تقریباً پانچ چھ سال دار العلوم دیوبند میں زیر تعلیم رہ کر ۱۳۵۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ صحیح بخاری وسنن ترمذی حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ سے پڑھیں، مولانا مرحوم کے اساتذہ دار العلوم دیوبند میں حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے علاوہ شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی، مولانا علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا عبد السمیع دیوبندی، مولانا سید اصغر حسین دیوبندی، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا محمد جلیل کیرانوی جیسے نابغۂ روزگار اصحاب درس شامل ہیں۔

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد مولانا مرحوم نے علماء وصلحاء کے طریقہ کے مطابق تعلیمی وتدریسی مشغلہ کو اختیار کیا، اور انسٹھ ساٹھ سال کے اس طویل تدریسی سفر میں آپ نے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، جامعہ اسلامیہ مدن پورہ بنارس، قاسم العلوم منگرانواں ضلع اعظم گڈھ، جامعہ حسینیہ لال دروازہ جون پور، جامعہ شرعیہ فیض العلوم سرائے میر میں تدریسی خدمات انجام دیں، جامعہ اسلامیہ بنارس میں کم وبیش پچیس، تیس سال قیام رہا، مولانا ادریس صاحب کے اس طویل عہد تدریس میں تقریباً دس بارہ سال تک اس ناچیز کو ان کی رفاقت کی سعادت حاصل رہی۔ نیز قاسم العلوم منگرانواں میں ان کی مکمل مدتِ اقامت میں بھی اس شرف سے ہم کنار رہا، پھر یہ رفاقت بھی ایسی کہ ہمیشہ ان کا اور میرا دسترخوان ایک رہا، ناشتہ وکھانا سب ایک ہی ساتھ ہوتا؛ بلکہ جامعہ اسلامیہ بنارس کے ابتدائی چار پانچ سالوں میں میرا قیام بھی مولانا ہی کے حجرہ میں رہا، اس زمانہ میں مولانا مرحوم کے لطف وعنایت سے یہ بندہ کس قدر سیراب ہوا الفاظ اس کی پہنائیوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے سے قاصر ہیں، یہ میری مدرسی کی ابتداء تھی، اس وادیٔ سنگلاخ وپر پیچ میں اول اول قدم رکھا تھا، میں اسے اپنی خوش بختی باور کرتا ہوں کہ آغاز سفر میں ہی مجھے مولانا مرحوم جیسے پاک طینت، فرشتہ صفت انسان کے علم وتجربہ کی رہنمائی میسر آگئی، فجزاہ اللہ خیر الجزاء.

مولانا مرحوم کی علمی استعداد پختہ تھی، انداز درس قدیم اساتذہ جیسا تھا، ان کے یہاں تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں زجر وضرب کا کوئی خانہ نہیں تھا، بس شفقت ومحبت، دلداری دلجوئی ہی ان کا طریق درس تھا، مجھے بھی سختی سے منع کرتے اور فرماتے کہ اب طلبہ پر سختی کا زمانہ نہیں ہے۔ ہر فن کی اور ہر درجہ کی کتابیں پڑھانے پر قادر تھے، البتہ ادب اور تفسیر سے خاص مناسبت تھی، اعلیٰ درجہ کے خوش نویس تھے، مولانا محترم صدر المدرسین تھے، اور یہ بندہ اور مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی حال مہتمم دار العلوم دیوبند مستقل طور پر درجات عربی کے مدرس تھے، اس کے علاوہ مولانا عبدالمتین بنارسی اور مولانا محمد یونس بنارسی بھی اعزازی طور پر چند اسباق پڑھاتے، یہ تینوں حضرات مولانا کے شاگرد تھے، لیکن مولانا سب کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتے تھے، بعد میں اس مخمس میں مولانا اسیر ادروی صاحب، مولانا ظفر احمد ندوی گھوسوی بھی شامل ہو گئے تھے، سارے اساتذہ باہم موافقت وموانست سے اپنی مفوضہ خدمات انجام دیتے تھے، بڑا ہی پرسکون اور طمانینت بخش ماحول تھا، یہ سب مولانا مرحوم ہی کے حسنِ اخلاق وحسن تدبر کا ثمرہ تھا، پھر بندہ ۱۹۸۰ء میں دیوبند آ گیا اور مولانا چند سال کے بعد وہاں سے ریٹائر ہو کر گھر آ گئے، اس طرح یہ بزمِ علمی تاریخ کا ایک حصہ بن گئی۔

جامعہ اسلامیہ سے ریٹائر ہونے کے بعد تقریباً ڈیڑھ دوسال جامعہ حسینیہ میں رہے، پھر جامعہ شرعیہ فیض العلوم کے بانی ومہتمم مولانا مفتی اشفاق قاسمی زید مجدہ نے اپنے حسنِ سلوک سے مولانا کی خدمات حاصل کرلیں، جہاں انھوں نے تقریباً گیارہ سال تدریسی خدمت انجام دی، چنانچہ مولانا آخر تک یہاں کے ناظم تعلیمات رہے، بالکل عمر کے آخری حصہ میں جب گھٹنوں سے معذور ہو گئے تھے، تو مولانا کی حسن خدمت کے پیش نظر عہدہ کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا تھا اور بطور پنشن کے ایک ہزار روپئے تاحیات مدرسہ سے انھیں ملتے رہے۔

مولانا کا خاندان قصبہ سرائے میر میں اپنی دینی ودنیوی وجاہت کی بناء پر عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، مولانا کے دادا حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ

سے ارادت وعقیدت کا تعلق رکھتے تھے، ان کی دعوت پر حضرت اقدس مولانا تھانوی نے سرائے میر کو اپنے شرف قدوم سے نوازا تھا اور وعظ بھی فرمایا تھا جو ''الباب لاولی الالباب'' کے نام سے طبع ہو کر شائع ہوا۔

مولانا مرحوم اپنے استاذ بخاری حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے اہم ترین متوسلین میں تھے، حضرت کے یہاں ٹانڈہ میں رمضان بھی گذارا تھا، جب تک حضرت حیات سے رہے ان کی خدمت میں حاضری دیتے رہے اور ان کی زیر تربیت سلوک کی راہیں طے کرتے رہے، مولانا اپنے معمولات کے بڑے پابند تھے، گرمیوں میں ڈھائی تین بجے اور جاڑے کے موسم میں چار بجے شب کو بستر چھوڑ دیتے، ضروریات سے فارغ ہو کر وضو کرتے اور تہجد پڑھتے پھر اوراد و وظائف میں مصروف رہتے، یہ سب امور تاریکی میں ٹارچ کے سہارے ہی انجام دیتے، صبح صادق کے پندرہ بیس منٹ کے بعد سنت فجر ادا کرتے اور لائٹ جلا کر تلاوت میں مشغول ہو جاتے، تلاوت سے فارغ ہو کر پھر طلبہ کو نماز کے لیے بیدار کرتے یہی ہمیشہ کا معمول تھا۔

مولانا مرحوم تدریسی مشاغل کے ساتھ جمعیۃ علماء ہند کے کاموں میں بھی عملی دلچسپی لیتے تھے، حضرت فدائے ملت مولانا سید اسعد مدنی سے خاص تعلق تھا وہ جب اس دیار میں تشریف لاتے تو مولانا ان کی معیت میں ان کے ہر پروگرام میں شریک رہتے، مولانا قصبہ سرائے میر کے جمعہ اور عیدین کے مستقل امام تھے، جب تک حیات سے رہے اس دینی فریضہ کو بڑی خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے، نماز سے پہلے اصلاحی وعظ بھی بیان کرتے، یہاں کے عوام وخواص سب ہی مولانا کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے، انتہائی خوش اخلاق، ملنسار، با مروت اور مہمان نواز تھے، بندہ جب دیو بند سے گھر جگدیش پور آتا تو مولانا ملاقات کے لیے جگدیش پور ضرور تشریف لاتے، میں عرض بھی کرتا کہ آپ کیوں تکلیف فرماتے ہیں میں خود سرائے میر آکر شرف ملاقت حاصل کرتا، مگر مولانا تو اپنی وضع کے نہایت پابند تھے، جب تک پیروں میں طاقت رہی اپنے اس معمول میں فرق نہیں آنے دیا، کیا بتاؤں مولانا بڑی خوبیوں کے آدمی تھے اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے۔

یوں تو وہ گھٹنوں کی تکلیف کی بناء پر چلنے پھرنے سے بڑی حد تک معذور ہو گئے تھے، پھر بھی رکشا یا کسی کے سہارے جمعہ و جماعت میں حاضر ہونے کی کوشش کرتے تھے، وفات سے تقریباً ڈیڑھ دو ماہ قبل بندہ مولانا کی خدمت میں ان کے گھر حاضر ہوا، تو گھنٹوں باتیں کرتے رہے، میرے منع کرنے کے باوجود چائے ناشتے کے ساتھ کھانے کا بھی اہتمام کیا، میں جب کافی دیر کے بعد واپس ہونے لگا تو لرزتی ہوئی آواز میں فرمایا کہ یہ آخری ملاقات ہے، میرے لیے دعا کرتے رہنا۔

وفات سے پندرہ بیس یوم قبل مولانا کو بخار آگیا، اسی کے ساتھ غذا بھی چھوٹ گئی، تقریباً اس دوران دس بارہ یوم ایسے گزرے کہ کچھ بھی کھایا پیا نہیں، گھر والوں نے اصرار کیا تو کہا کہ اب وہیں جا کر کھاؤں گا، وفات سے دو تین دن پہلے اہلیہ محترمہ کو بلا کر کہا کہ سب لوگ مل جل کر رہنا، نماز اور تلاوت کی پابندی کرنا، ناداروں، غریبوں کا خیال رکھنا، ۳؍ربیع الاوّل ۱۴۲۷ھ م یکم اپریل ۲۰۰۶ء کو انتقال کے دن دھلے ہوئے کپڑے طلب کیے اور کہا کہ مجھے نہلاؤ اور کپڑے پہناؤ آج جمعہ ہے لوگوں نے کہا آج تو سنیچر ہے، فرمایا نہیں جمعہ ہے، گھر والوں نے انھیں نہلایا اور ان کے حسب حکم دھلے ہوئے کپڑے پہنا دیے، پھر گھر والوں سے کہا سب لوگ کھانا کھالو، خود بھی دس بارہ دن کے بعد انار کا جوس اور تھوڑا سا دودھ پیا، گھر والوں کو اطمینان ہوا کہ اب آپ مائل بہ صحت ہیں، کسے معلوم تھا کہ یہ سب سفر آخرت کی تیاری ہے۔ غرض اسی تیاری میں دن کے تین بج گئے اور اسی وقت چند لمحے میں نزع کی کیفیت طاری ہوگئی اور لا الہ الا اللہ، اللہ اکبر کہتے ہوئے، خدائے حی وقیوم کی رحمتوں کے آغوش میں پہنچ گئے، زندگی رب کائنات کے ذکر وفکر میں بسر کی تھی، لہٰذا اسی ذکر کے ساتھ داعیٔ اجل کو لبیک کہا، کما تعیش وتموت۔

مولانا محمد ایوب جیراج پوری

مولانا محمد ایوب بن محمد صدیق اپنے آبائی وطن موضع جیراج پور ضلع اعظم گڈھ میں ۱۹۱۸ء م ۱۳۳۷ھ میں پیدا ہوئے، مکتب کی تعلیم گھر اور گاؤں میں حاصل کی، پھر مدرستہ

الاصلاح سرائے میر میں داخلہ لیا، اور یہاں کے نصاب کے مطابق علوم وفنون کی تحصیل کر کے فاتحہ فراغ پڑھا، اساتذہ میں مولانا شبلی متکلم، مولانا اختر احسن، مولانا امین احسن بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

تعلیم وتحصیل کے مراحل طے کر لینے کے بعد درس وافادہ کا سلسلہ شروع کیا، اور قصبہ نگرام لکھنؤ کے مدرسہ میں تقریباً دو سال تدریسی خدمت انجام دی، بعد ازاں مولانا احمد سعید دہلوی ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند کی دعوت پر جمعیۃ کے شعبۂ تصنیف وتالیف سے وابستہ ہوگئے، اسی زمانہ میں ''سیرت رسول'' پر ایک کتاب مرتب کی جس کے متعدد ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں، یہاں سے الگ ہو کر شہر اعظم گڈھ کے محلہ میر باغ پیٹو کے مدرسہ اسلامیہ میں بحیثیت معلم چند سال بچوں کی تعلیم وتربیت میں مشغول رہے، بعد ازاں مدرسہ الہیات کان پور آگئے اور چار سال یہاں بھی درس وتدریس کی خدمت انجام دی، اسی دوران یہ درسگاہ مالی اور انتظامی بحران میں مبتلا ہو کر ختم ہوگئی، تو یہاں سے درسگاہ اسلامی رامپور منتقل ہوگئے، اور یہیں سے ۱۹۸۶ء میں ریٹائر ہو کر وطن واپس آئے، اور تقریباً ڈھائی تین سال گھر پر قیام کے بعد یکم جون ۱۹۸۹ء میں جامعۃ الفلاح بلریا گنج کے شعبہ کلیۃ البنات سے وابستہ ہوگئے، تقریباً دس سال یہاں تدریسی خدمت انجام دی، پھر پیرانہ سالی کی بناء پر وہاں سے سبکدوش ہو کر گھر چلے آئے، اور گھر ہی کے زمانہ قیام میں ۲۹ رجنوری ۱۹۹۹ء م ۱۴۲۰ھ کو راہئ دار آخرت ہوگئے۔

مولانا مرحوم کا خصوصی مضمون صرف ونحو تھا، جو برابر ان کے زیر درس رہا، ان دونوں فن میں انھیں اچھی مہارت حاصل ہوگئی تھی، چنانچہ ''تعلیم النحو'' کے نام سے فن نحو میں دو حصوں میں ایک کتاب بھی مرتب کی جو مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے نصاب تعلیم سے متعلق مدارس میں مقبول ہوئی، کتاب کی ترتیب میں مولانا فراہی کی ''اسباق النحو'' کی پیروی کی گئی ہے۔ اور مسائل نحو کے بیان میں ''النحو الواضح'' کے طرز کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اس لیے تعلیم النحو، النحو الواضح اور اسباق النحو دونوں کے لیے معاون کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسی طرح عام لوگوں کو عربی زبان سکھانے کی غرض سے دو جلدوں میں ''آؤ عربی

سیکھیں'' کے نام سے ایک ریڈر مرتب کی جو شائع ہو کر مقبول ہوئی، مولانا مرحوم ایک اچھے مترجم بھی تھے، چنانچہ علامہ ابن القیم کی کتاب ''امثال القرآن'' کا ترجمہ کیا جو پہلے بالاقساط ''ترجمان القرآن'' میں شائع ہوا، پھر کتابی شکل میں بھی طبع ہوا، اس کے علاوہ ان کی دو کتابیں اور چھپ کر شائع ہوئیں: (۱) عورت تہذیب کے دوراہے پر، (۲) پردہ اور اسلام، ان مستقل کتابوں کے علاوہ انھوں نے کثرت سے مضامین بھی تحریر کیے، جو زیادہ تر ماہنامہ ''الفرقان'' میں شائع ہوئے، نیز ترجمان القرآن، الحسنات، زندگی، ذکریٰ وغیرہ ماہناموں میں بھی ان کے مقالات شائع ہوئے ہیں، اگر ان سب مضامین کو یکجا کر دیا جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب بن جائے گی۔

مولانا موصوف نماز کے بہت پابند تھے جب تک اپنے گاؤں میں رہے پنج وقتہ اور جمعہ کی نمازوں کی امامت یہی کرتے تھے، نماز اور تدریس ان کے ذہن پر چھائی رہیں حتیٰ کہ آخری لمحات میں جب ہواس بجا نہیں رہ گئے تھے، کہا کرتے تھے کہ پانی لاؤ وضو کرنی ہے، چھڑی اور شیروانی لاؤ مدرسہ جانا ہے۔ ''کما تعیش، تموت''

سادگی، کم گوئی، اور قناعت واستغناء ان کے جوہری اوصاف تھے۔

مولانا محمد سجاد جون پوری ثم اعظمی

مولانا محمد سجاد بن شیخ واجد علی، بن شیخ اشرف علی، بن شیخ گوما بن شیخ لال محمد شہید اپنے آبائی وطن موضع عیسیٰ پور ضلع جون پور میں ۱۹۱۳ء م ۱۳۳۲ھ میں پیدا ہوئے، پانچ سال کی عمر میں تعلیم وتحصیل کی ابتداء کی، سب سے پہلے سرکاری اسکول میں داخل ہو کر درجہ سوم تک پڑھا، پھر اسکول کی تعلیم ترک کر کے مدرسہ جامع مسجد مانی کلاں جون پور میں حافظ عبدالحئیؒ مانوی کی خدمت میں آ گئے، حافظ عبدالحئی مرحوم بڑے بافیض، فرشتہ صفت بزرگ تھے، ہزاروں لڑکے اور لڑکیوں نے ان سے حفظ قرآن کی تکمیل کی، یہاں ناظرہ اور تین بار حفظ کرنے کے بعد جامع الشرق (بڑی مسجد) شہر جون پور کے مدرسہ فاروقیہ میں آ گئے، مدرسہ فاروقیہ میں حفظ کی تکمیل کی اور ابتدائی تجوید کی کتابیں پڑھیں، اس وقت

اس مدرسہ میں بس اتنی ہی تعلیم ہوتی تھی، اس لئے فارسی وغیرہ پڑھنے کی غرض سے بیت العلوم سرائے میر، دار العلوم مئو اور بنارس کے بعض مدارس کی سیر میں دو سال گزر گئے پھر قسمت نے یاوری کی اور آپ ضلع فیض آباد کے مدرسہ ،، عین العلوم ٹانڈہ میں پہنچ گئے، جہاں مولانا محمد اسماعیل بن مولانا قدرت اللہ کا شبابِ علم پوری توانائیوں کے ساتھ علمی وروحانی فیض رسانیوں میں سرگرم عمل تھا، مولانا محمد اسماعیل حضرت شیخ الہند کے تلمیذ رشید اور دیار پورب کے معروف ومشہور بزرگ حضرت چاند شاہ ٹانڈوی کے خلیفہ اجل تھے، یہ مدرسہ حضرت چاند شاہ کی منشاء کے مطابق قائم کیا گیا تھا اور خود شاہ صاحب اپنے جیب خاص سے ہر ماہ پانچ روپے بمد تنخواہِ مدرس دیتے تھے۔

مولانا موصوف کی فارسی وعربی کی تعلیم صحیح معنوں میں مدرسہ عین العلوم ٹانڈہ ہی سے شروع ہوئی، وہ یہاں تین سال جم کر رہے اور میزان الصرف سے جلالین وغیرہ تک یہیں مولانا محمد اسماعیل رحمہ اللہ سے پڑھا، پھر اپنے استاذ کے مشورہ سے آگے کی تعلیم کے لئے شوال ۱۳۵۵ھ میں سہارنپور مدرسہ مظاہر علوم میں داخلہ لیا اور دو سال یہاں زیر تعلیم رہ کر ۱۳۵۷ھ میں اقلیدس، شرح عقائد خیالی، صدرا، مقدمہ مشکوٰۃ، مشکوٰۃ، شمس بازغہ، تصریح، نخبۃ الفکر، امور عامہ، شرح چغمینی، سبع شداد، خلاصۃ الحساب پڑھ کر ۱۳۵۷ھ میں دورۂ حدیث پڑھا، دورۂ حدیث کی کتابیں اور ان کے اساتذہ کی تفصیل یہ ہے:

صحیح بخاری: حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب سے، ابوداؤد: حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی سے، سنن ترمذی وطحاوی: مولانا امیر احمد کاندھلوی سے، صحیح مسلم: مولانا منظور احمد صاحب سے، سنن نسائی وسنن ابن ماجہ: مولانا محمد اسعد اللہ صاحب ناظم مدرسہ سے پڑھیں، دورۂ حدیث میں آپ پوری جماعت میں سب سے اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہوئے، اس اعلیٰ کامیابی پر بطور انعام کے بہت سی کتابیں اور دس روپے منجانب مدرسہ انھیں کو ملے۔

دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد بھی ایک سال مزید مظاہر علوم میں رہ کر، بیضاوی، رسم المفتی، حمد اللہ، توضیح تلویح، سراجی، مدارک التنزیل، قاضی مبارک اور مسلم الثبوت کی تحصیل کی۔

تعلیم وتحصیل سے مکمل فارغ ہوجانے کے بعد اپنے استاذ اور مظاہر علوم کے ناظم حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب کے حکم سے ۲۵/ذیقعدہ ۱۳۵۹ھ کو مدرسہ رحمانیہ قصبہ ٹانڈہ بادلی مرادآباد سے بحیثیت صدر تدریسی سلسلہ کا آغاز کیا، یہاں مولانا کا قیام صرف ایک ہی سال رہا، گھر سے دوری کی بناء پر شعبان ۱۳۶۱ھ کی تعطیل میں وطن گئے تو پھر واپس یہاں نہیں آئے، پھر اپنے ضلع سے قریب قصبہ دوست پور ضلع سلطانپور میں ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ میں ''دعوۃ الحق'' کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، اور تقریباً چار سال اپنے اس مدرسہ میں تدریسی خدمات انجام دیں، بعدازاں اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری قدس سرہ کی طلب پر ماہِ ذی قعدہ ۱۳۶۶ھ میں مدرسہ بیت العلوم سرائے میر آگئے پھر زندگی کی آخری سانس تک اسی سے وابستہ رہے۔

حضرت مولانا مرحوم کا علمی جوہر اور تدریسی وتربیتی کمال دراصل بیت العلوم سرائے میر کے زمانۂ قیام ہی میں نمایاں ہوا، مولانا مرحوم یہاں چالیس سال کے لگ بھگ رہے، تدریس کے ساتھ فتویٰ نویسی کی خدمت بھی ان ہی کے سپرد تھی، وہ فتاویٰ کی تحریر میں حضرات اکابر حکیم الامت حضرت تھانوی اور فقیہ النفس حضرت گنگوہی کے اسلوب کی پیروی کرتے تھے، انھیں بزرگوں کی طرح ان کے فتویٰ کی عبارت مختصر مگر جامع ہوا کرتی تھی، مولانا کی علمی استعداد نہایت پختہ اور ٹھوس تھی، درس نظامی میں شامل جملہ فنون میں انھیں دستگاہ حاصل تھی بالخصوص علم فقہ میں انھیں کمال حاصل تھا، درس کا طرز نہایت دل نشیں تھا، مطالب ومسائل کی تفہیم میں یدطولیٰ حاصل تھا، سخت سے سخت تر مباحث اور ادق سے ادق تر مسائل کی ایسی مرتب اور سلجھی تقریر فرماتے تھے کہ زیر درس طلبہ کو ان کے سخت اور ادق ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا، طویل تقریر کی بجائے حل کتاب پر اکتفا فرماتے تھے، فرماتے تھے کہ درس میں لمبی تقریروں کا سہارا دراصل وہی مدرسین لیتے ہیں جنھیں کتاب کے حل کرنے پر قدرت نہیں ہوتی، درس میں یہ طویل طویل تقریریں استعداد کے لئے روڑا ہیں، بالخصوص ابتدائی کتابوں سے متوسطات تک لمبی تقریروں سے احتراز کرنا چاہئے۔

طلبہ آپ کے درس سے اٹھتے تو اپنے قلوب میں علم وفہم کی طمانینت لے کر اٹھتے تھے، دورانِ سبق حضرات اکابر رحمہم اللہ کے تحصیل علم اور زہد وتقوی سے متعلق واقعات ذکر کرنے کا معمول تھا، جس سے تعلیم کے ساتھ طلبہ کی دینی تربیت بھی ہوتی رہتی تھی، اللہ رب العزت کے فضل وکرم سے اس بندۂ ناچیز کو بھی حضرت مولانا کے آگے زانوے تلمذ تہہ کرنے کی سعادت حاصل ہے، میں نے مختلف سالوں میں حضرت الاستاذ رحمہ اللہ سے درج ذیل کتابیں پڑھی ہیں:

مفتاح القواعد، مالابدمنہ، اخلاق محسنی، پنج گنج، مرقاۃ، قدوری، اصول الشاشی، قطبی، شرح وقایہ، مالابدمنہ کا درس عام طور پر کتاب الایمان کو چھوڑ کر کتاب الطہارت سے شروع ہوتا ہے، اس لئے کہ جس عمر میں یہ کتاب طلبہ کو پڑھائی جاتی ہے، ان میں ایمان کے مباحث سمجھنے کی صلاحیت عموماً نہیں ہوتی ہے، چنانچہ حضرت الاستاذ نے بھی مالابدمنہ کا درس طہارت کے باب سے ہی شروع کیا، تقریباً ایک مہینہ سبق ہوجانے کے بعد ایک دن مجھ سے کہا کہ ایک کاپی لاؤ میں اس میں کتاب الایمان کا ترجمہ لکھ دوں، اس ترجمہ کو دو تین بار پڑھ کر پھر کتاب کی عبارت سے ترجمہ کو ملا کر پڑھو گے تو امید ہے کہ اس کا مفہوم ذہن کی گرفت میں آجائے گا، میں نے حسب ہدایت مجلد کاپی خدمت میں پیش کردی، ایک ہفتہ کے اندر پوری کتاب الایمان کا ترجمہ مع مختصر تشریح کے ساتھ میرے حوالہ کردیا، میں نے حسب ہدایت اسے پڑھا تو الحمد للہ پوری بحث اچھی طرح ذہن نشین ہوگئی، افسوس کہ اس کاپی کو محفوظ نہیں رکھ سکا، ورنہ وہ بھی حضرت الاستاذ کی دیگر دستیاب تحریروں کی طرح ایک مختصر مگر وقیع تحریری یادگار رہوتی۔

حضرت الاستاذ نے عربی کی ابتدائی کتابوں سے جلالین تک کی تعلیم حضرت مولانا محمد اسماعیل رحمہ اللہ سے پائی تھی، جو حضرت چاند شاہ ٹانڈوی کے خلیفہ خاص تھے، مولانا محمد اسماعیل صاحب خود اپنے شیخ مرشد کی طرح نہایت پاک طینت اور متبع سنت بزرگ تھے، استاذ محترم کی اخاذ طبیعت نے استاذ کا صلاح وتقوی اپنے اندر جذب کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی اور اسی وقت سے تعلیم کے ساتھ آپ کا رجحان تصوف کی جانب

ہوگیا، چنانچہ مظاہر علوم کے زمانہ طالب علمی میں تعطیل کے وقت حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ کے یہاں تھانہ بھون حاضری کا معمول تھا، اور فراغت کے بعد حضرت اقدس مولانا تھانوی کے خلیفہ اجل مولانا محمد عیسیٰ الہ آبادی رحمہ اللہ سے اصلاحی تعلق قائم کرلیا، مولانا الہ آبادی کی وفات کے بعد حضرت حکیم الامتؒ کے دوسرے خلیفہ خاص حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری نوراللہ مرقدہ سے ۱۳۶۴ھ میں بیعت ہوگئے اورانھیں کی زیر تربیت سلوک کی راہیں طے کرتے رہے، ۱۳۸۳ھ میں جب وہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے، توحضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی نوراللہ مرقدہ سے بیعت وارادت کاتعلق قائم کیا، اور حضرتِ اقدس شیخ الحدیث رحمہ اللہ کے زیرارشاد وتربیت رہ کرسلوک کی منزلیں طے کرکے ۲۷/رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ کوحضرت شیخ کی اجازت وخلافت سے مشرف ہوئے۔

حضرت الاستاذ زہد وقناعت، تقویٰ وطہارت اوراستغناء عن الخلق میں حضرات اکابرواسلاف رحمہم اللہ کے نمونہ تھے، شہرت کے مقابلہ میں گمنامی عزیز تھی، اپنے گرد بھیڑ جمع کرنے کے بجائے فکرآخرت رکھنے والے مخلصین ہی کوحلقہ ارادت میں داخل کرتے تھے، اہل ثروت سے رسم وراہ پسندنہیں تھی، خاموشی ویکسوئی کے ساتھ علم ودین کی خدمت ہی مزاج تھا، اس لئے اسفار سے بالعموم اجتناب کرتے تھے، حضرت مولانا کے یہی وہ علمی، عملی وذاتی فضائل ومحاسن ہیں جن سے تقریباً چالیس سال تک مدرسہ بیت العلوم سرائے میر سے متعلق طالبانِ علوم دین مستفید ہوتے رہے ہیں، اس لئے بلاتردد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بیت العلوم کی نیک نامی میں حضرت مولانا محمد سجاد جون پوری ثم اعظمی کی ذات عالی صفات کانمایاں کردار ہے، نگاہ حقیقت شناش سے اگردیکھا جائے تو بانی مدرسہ اوراس کے اولین ناظم حضرت اقدس مولانا پھولپوری نوراللہ مرقدہ کے علاوہ حضرت مولانا عبدالقیوم بکھراوی، حضرت مولانا محمد سجاد جونپوری اور حضرت مولانا محمد سعید بمئی پوری وہ مثلث ہیں جنھوں نے مدرسہ بیت العلوم کے استحکام اوراس کی علمی واسلامی تعمیروترقی میں بنیادی کردارادا کیا ہے، تاریخ بیت العلوم کی یہی وہ اہم ترین شخصیات ہیں، جنھیں بانیٔ

مدرسہ کی نظر عاقبت بیں نے اپنے نہال تازہ کو شجر سایہ دار بنانے کے لئے منتخب کیا تھا، یہی وہ بلند ہمت وسیر چشم خدام علم ودین ہیں جنھوں نے اس انتخاب کے بعد ساری طرف سے نظریں پھیر کر اپنی توجہات کا محور ومرکز بیت العلوم ہی کو بنایا اور بالآخر اسی پر اپنی کائنات حیات نچھاور کردی۔ فجزاھم اللہ خیر الجزاء۔

اس سرائے دنیا میں جو بھی آتا ہے وہ جانے ہی کے لئے آتا ہے، چنانچہ استاذ محترم نے بھی اس چالیس سالہ خدمت کے بعد سفر آخرت کے لیے رختِ سفر کو سمیٹا اور چند ہفتوں کی علالت کے بعد شب یکشنبہ ۱۴ رشعبان ۱۴۰۵ھ م ۵ رمئی ۱۹۸۵ء کو بعد از نمازِ عشاء جان جانِ آفریں کے حوالہ کردی، نماز جنازہ فرزند اکبر مولانا علی عباد مظاہری خلیفہ حضرت مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہی رحمہ اللہ کی امامت میں ادا کی گئی، اور اس خزانۂ خوبی کو ہمیشہ کے لئے بیت العلوم کی گورِ غریباں میں دفن کردیا گیا۔

حضرت الاستاذ نے اپنی زندگی کا نظام الاوقات متعین کر رکھا تھا، اس میں تصنیف وتالیف جیسے فرصت طلب وقت کی گنجائش کہاں تھی، پھر بھی محض دینی واصلاحی تقاضے کے تحت چند رسائل مرتب فرمائے جو یہ ہیں:

(۱) اسلامی عقیدے، یہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی عقیدہ کے موضوع پر معروف کتاب فقہ اکبر کا مختصر تشریحات کے ساتھ سلیس ترجمہ ہے، حضرت کی وفات کے بعد ۱۴۱۴ھ میں ان کے آخری عہد کے تلمیذ رشید مولانا عبد الرشید سلطانپوری استاذ بیت العلوم کے اہتمام میں شائع ہوا ہے۔

(۲) ہدایت المبتدی: علم اخلاق کے موضوع پر امام غزالی رحمہ اللہ کی مشہور کتاب بدایۃ الہدایہ کا مفہوم خیز ترجمہ ہے، جابجا مفید اضافے ہیں، اور مباحثِ کتاب کو عنوانات کے ذریعہ ممتاز کردیا ہے جس سے اس ترجمہ کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے، امام غزالی علیہ الرحمہ چونکہ فقہ شافعی پر عامل تھے، طہارت ونماز وغیرہ کے مسائل کی وضاحت فقہ حنفی کے مطابق حاشیہ میں کردی ہے، ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ بھی مولانا عبد الرشید کے اہتمام میں ۱۴۰۴ھ میں شائع ہوا۔

(۳) ماثور ومسنون دعاؤں کا یہ مجموعہ دو حصوں میں ہے۔ یہ بڑا مفید رسالہ ہے، اپنی افادیت کی بناء پر اس لائق ہے کہ یہ ہر گھر میں موجود رہے۔

(۴) اتحاد کی ضرورت: بمبئی سے ایک صاحب نے ایک سوالنامہ بھیجا تھا جس میں بطور خاص دیو بندی، وہابی اور بریلوی مکاتیب کے باہمی اتحاد پر زور صرف کیا گیا تھا، یہ رسالہ اسی سوالنامہ کے جواب میں سپرد قلم کیا ہے۔

(۵) امتحان خلیل اور قربانی: یہ حضرت مولانا کے قربانی کے موضوع پر چند مواعظ کا مجموعہ ہے ۱۴۱۴ھ میں مولانا سلطان پوری موصوف کی نگرانی میں شائع ہوا ہے۔

(۶) شب برأت وحقیقت عاشورۂ محرم: یہ بھی استاذ محترم کے مواعظ کا مجموعہ ہے، موضوع نام سے ظاہر ہے۔

ضروری وضاحت: حضرت الاستاذ کا اگرچہ آبائی وطن ضلع جون پور میں ہے، لیکن آپ نے وہاں سے ترک سکونت کر کے بیت العلوم سرائے میر ضلع اعظم گڈھ کو اپنا وطن بنالیا تھا، اعظم گڈھ میں اپنی اولاد کی شادیاں کیں، ان کے دونوں صاحبزادوں مولانا حافظ علی عباد مرحوم اور حافظ محمد عارف زید مجدہ نے اعظم گڈھ ہی میں گھر بناو بسالیا ہے۔ اس لئے ''تذکرہ علماء اعظم گڈھ'' میں آپ کا ذکر بہر حال مناسب بلکہ ناگزیر تھا۔

☆ ☆ ☆

مولانا محمد سعید ہمئی پوری

از: ڈاکٹر خورشید احمد شفقت اعظمی

سابق ڈپٹی ڈائرکٹر سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیشن، نئی دہلی-۱۱۰۰۵۸

حضرت الاستاذ مولانا محمد سعید ہمئی پوری سابق نائب ناظم مدرسہ بیت العلوم سرائے میر کے ترجمہ سے متعلق ضروری معلومات کے لیے استاذ محترم کے خلف الرشید برادر عالی مرتبت ڈاکٹر خورشید شفقت اعظمی زید مجدہ سے گذارش کی تھی، ڈاکٹر صاحب نے ازراہِ نوازش ناظم صاحب رحمہ اللہ کی حیات و خدمات پر ایک گرانقدر مقالہ تحریر کر کے بھیج دیا، برادر گرامی قدر سے بندہ کے تعلقات کی نوعیت اور خود اس مضمون کی افادیت کا تقاضا یہی ہے کہ بغیر کسی ترمیم و تنسیخ کے اسے من وعن ''تذکرہ علماء اعظم گڈھ'' کی زینت بنایا جائے۔

رہی بات حضرت الاستاذ کی ذات وصفات کی تو جس کی شخصیت سازی اور اسلامی علوم وثقافت سے آراستہ وپیراستہ کرنے میں اپنے وقت کے مجدد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے دو اجل خلفا شیخ المشائخ مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری، ومصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری نور اللہ مراقدھما کے ہاتھ شامل ہوں وہ علم وعمل اور اخلاق واخلاص کا کیسا پیکر جمیل ہوگا، اہل نظر پر مخفی نہیں، عیاں راچہ بیاں۔ (حبیب الرحمٰن اعظمی)

ہوگا کسی فلک پہ وہ خورشید جلوہ گر

سنتے ہیں آفتاب کبھی ڈوبتا نہیں

والد محترم مولانا محمد سعیدؒ موضع ہمئی پور، تحصیل پھولپور، ضلع اعظم گڈھ میں آج سے کم وبیش ۱۲۴ر سال پیشتر اس عالم رنگ وبو میں آئے، ان کے والد یعنی میرے دادا اصغر علی مرحوم تحصیل پھولپور میں امین کے منصب پر فائز تھے۔

ابتدائی تعلیم موضع گُسہا میں ہوئی، جہاں فارسی درسیات کی تکمیل مشہور عالم دین مولوی بھیکو شاہ کھنڈوی سے کی، پھر پھولپور میں مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ سے شرف تلمذ حاصل کیا، جن کی عدم موجودگی میں مولانا شاہ وصی اللہؒ پڑھاتے تھے۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے کانپور تشریف لے گئے، جہاں حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کے قائم کردہ مدرسہ جامع العلوم کانپور کے اساتذہ سے دورۂ حدیث کی تکمیل ہوئی۔

تکمیل تعلیم کے بعد مشہور دینی وتربیتی درسگاہ مدرسہ بیت العلوم، سرائے میر ضلع اعظم گڈھ میں ۴۰ رسال تک نظامت کے فرائض نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ انھوں نے اس طویل مدت میں دلوں پر حکومت کی۔ اساتذہ اور تلامذہ ان کی کارکردگی سے یکساں طور پر مطمئن نظر آتے تھے۔ ساتھ ساتھ تدریسی فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ عربی، فارسی ادبیات کے علاوہ حدیث وقرآن کے ادق نکات بھی بڑی خوبی سے حل کردیا کرتے تھے۔ ان کا علم مستحضر اور حافظہ غضب کا تھا۔ گھر سے مدرسہ پہنچتے ہی نظامت اور تدریس کے فرائض بے تکلف انجام دینے لگتے تھے، فارسی زبان وادب میں تو ید طولیٰ حاصل تھا، اور ان کی شہرت ملک گیر سطح تک پہنچ گئی تھی، ان کے اردو، عربی وفارسی کلام الفرقان بریلی میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے تھے (لکھنؤ سے پہلے یہ رسالہ بریلی سے شائع ہوتا تھا) انھوں نے علامہ اقبالؒ کے فارسی کلام (ارمغان حجاز اور بال جبریل) کا منظوم اردو ترجمہ اور منتخب اردو کلام کا فارسی منظوم ترجمہ کیا تھا، جنھیں بالترتیب ''الباس اردو''، اور ''الباس فارسی'' سے موسوم کیا تھا۔ افسوس کہ ان کی بیشتر نگارشات ضائع ہوگئیں۔ انھوں نے دیکھا کہ اس میں بھی نمود ونمائش ہے تو شاعری ہی ترک کردی۔ مرحوم نے حدیث کے موضوع پر بھی ایک کتاب تالیف کی تھی۔ اگر اس کی بازیابی ہوگئی تو اس کی اشاعت طلبہ واساتذہ کے لئے ارمغان ثابت ہوگی۔

ایک دفعہ حیدرآباد میں حکیم اختر صاحب سے دریافت کیا تھا کہ آپ نے کہیں مزید فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی، انھوں نے کہا کہ نہیں حضرت، وہی جو آپ نے پڑھائی تھی، بس۔

برادر محترم حکیم رشید احمد مرحوم، جو مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری کے داماد تھے، ان

کے نکاح کے موقع پر ایک سہرا والد محترم نے پیش کیا تھا، جس کے چند اشعار یاد ہیں، جنھیں بھائی صاحب پڑھا کرتے تھے۔

الحمد لمن وفق فی الدین قرارا — والشکر لمن انعم سرّا وجهارا
اسفٌ علیّ لم اریٰ مخدومتی(۱) فینا — واجعلها فی الجنۃ یارب قرارا
ایں عقد کہ منظور نظر گشت خدارا — از عرش ملک آمدہ دروے بہ نظارا
دنیا ہمہ معمور نہنگان بلا بود — بر ساحل تو کردم ازیں بحر کنارا

فرزند حسب بود سعید رضا جوئے
فرزند نسب گشت رشید اکنوں شمارا

اسی طرح مدرسہ بیت العلوم، سرائے میر، ضلع اعظم گڈھ کے گیارہویں سالانہ جلسہ میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بحیثیت صدر شرکت پر ایک تہنیتی نظم فارسی زبان میں پیش کی تھی۔ اس مرصّع و مسجّع تہنیت نامہ کو پروفیسر اشتیاق احمد ظلّی ڈائرکٹر دارالمصنفین و مدیر اعلیٰ معارف نے معارف کے شمارہ جون ۲۰۱۰ء میں تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع کیا تھا۔

مرحوم کا لکھا ہوا ایک غیر مطبوع مرثیہ بھی دستیاب ہوا، جسے انھوں نے حاجی محمد نذیر کے برادر عم زاد محترم مولانا محمد کبیر بکھراوی کی وفات پر موزوں کیا تھا۔ یہ مرثیہ حال ہی میں نوائے طب و صحت، الہ آباد کی تازہ اشاعت ''ڈاکٹر اے۔ یو۔ اعظمی نمبر'' میں شائع ہوا ہے، جذبات نگاری، منظر نگاری اور کردار نگاری کا دلکش مرقع ہے۔

عربی و فارسی کے تو وہ استاد تھے ہی، اردو زبان و ادب پر بھی انھیں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ آج خاکسار میں لکھنے پڑھنے کی جو تھوڑی بہت شد بد ہے، مرحوم ہی کی مشفقانہ تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے۔ ان کی علمی و فنی صلاحیتوں سے کہیں زیادہ نمایاں ان کی محبت تھی، جسے انھوں نے تربیت کا ذریعہ بنایا، جس کے سائے میں کتنے نوجوانوں (تلامذہ اور اساتذہ) کی صلاحیتیں پروان چڑھیں۔ بقول جگر۔

(۱) مولانا پھولپوریؒ کی اہلیہ مرحومہ، والد صاحب کی سمدھن۔

وہ ظلم و تشدد سے کبھی ہو نہیں سکتا جو کام نکلتا ہے محبت کی نظر سے

والد مرحوم کو گھر گرہستی سے بھی یکساں لگاؤ تھا، یہی وجہ ہے کہ مدرسہ بیت العلوم کی مجلس شوریٰ کی بار بار وارننگ کے باوجود انھوں نے ''خاک وطن زنجیر پاست'' کے بمصداق گھر نہیں چھوڑا اور پوری مدت ملازمت گھر سے مدرسہ آمدورفت کا سلسلہ جاری رہا وہ بھی بذریعہ سائیکل، جبکہ آج کے نوجوانوں کے لئے بذریعہ موٹر سائیکل بھی یہ فاصلہ طے کرنے میں تکلف ہوتا ہے۔

بیت العلوم میں انھیں امتیاز حاصل کرنے یا افراط زر کا وسیلہ بنانے کی آرزو کبھی نہیں رہی اور نہ اس کی کبھی کوشش کی، تاہم یہ بھی سچ ہے کہ اراکین بیت العلوم نے انھیں ہمیشہ سر آنکھوں پر رکھا۔ درحقیقت مدرسہ سے انھیں جو والہانہ محبت تھی، دوسروں کے ذوق وشوق کو مہمیز کرنے کا ذریعہ بن گئی۔ مدرسہ تاخیر سے پہنچنے کے نتیجے میں وہ اپنے مشاہرہ میں سے حساب لگا کر اہتمام کے ساتھ رقم منہا کرادیا کرتے تھے۔ تاخیر سے مدرسہ پہنچنے ہی کے نتیجے میں انھیں مدرسہ سے دو تین بار رخصت بھی کیا گیا، لیکن جب مدرسہ کی کشتی ڈگمگانے لگتی، دوبارہ جلد ہی طلب کرلیا جاتا۔ وہ اپنے پیر مرشد اور استاد محترم حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ کے حکم کی تعمیل میں بلا اکراہ واپس آکر نظامت سنبھال لیتے تھے۔ کسر نفسی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اسے کبھی وقار کا مسئلہ نہیں بنایا۔ انانیت کا ان کے اندر شائبہ بھی نہیں تھا؛ بلکہ اس کے برعکس سادگی اور انکساری کا بحر بیکراں تھے، انھیں بیت العلوم سے مادری محبت تھی۔ ماں کی جبلی محبت والد صاحب میں توفیق کا درجہ رکھتی تھی اور یہ توفیق، جس طرح انھیں عطا ہوئی تھی، مدرسہ میں شاید کسی اور کو میسر نہ تھی۔

تقسیم ہند کے بعد مدرسہ جس مالی بحران سے دوچار ہوا تھا، بہت سے لوگوں کے اوسان خطا ہو گئے تھے، لیکن اس پر آشوب دور میں بھی ان کے پائے ثبات میں تزلزل نہیں آیا اور اسے چلانے کے لئے انھوں نے فاقہ مستی اور دریوزہ گری تک سے گریز نہیں کیا، جس پر مولانا پھولپوریؒ بھی عش عش کر اٹھے تھے۔ بیت العلوم سے قلبی لگاؤ کا اندازہ اس واقعہ سے بآسانی ہوسکتا ہے کہ مولانا مسعود علی ندوی ناظم دارالمصنفین ومنیجر شبلی نیشنل

کالج، اعظم گڈھ فارسی کے استاد کی حیثیت سے والد صاحب مرحوم کو لے جانے کے لئے مصر تھے۔ مولانا عبدالغنی پھولپوریؒ نے فرمایا کہ مولانا جانا چاہیں تو چلے جائیں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں، لیکن والد صاحب مرحوم کو جب لکچرر (فارسی) کا عہدہ آفر کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ دینی ادارہ یعنی بیت العلوم کی خدمت ہی میری زندگی کا نصب العین ہے، اسے چھوڑنا میرے لئے ممکن نہیں، جبکہ مدرسہ میں ۱۵/روپے ماہانہ مشاہرہ تھا اور شبلی کالج میں ۵۰۰ روپے ماہانہ کی پیشکش تھی۔

والد صاحب مرحوم انتہائی وجیہہ تھے۔ ان کا کھلتا ہوا متبسم چہرہ آج بھی نگاہوں میں رقصاں رہتا ہے۔ ان کی شخصیت میں بڑی دلکشی اور جاذبیت تھی۔ ان سے ایک بار مل کر لوگ بار بار ملنے کی آرزو کرتے تھے۔ وہ تہذیب وشرافت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ وہ انتہائی بلند حوصلہ کے حامل تھے، دوں ہمتی کا ان کے یہاں گزر بھی نہیں تھا۔ وہ انتہائی دیندار تھے، لیکن دینداری میں بھی بڑی رواداری تھی، کوئی کسی عقیدے اور خیال کا ہو، سب سے ایک ہی طرح سے ملتے تھے۔ کسی کی غیبت کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا اور اگر کوئی تذکرہ شروع کردیتا تو یہ کہہ کر قدغن لگا دیتے کہ جانے دو اس کی عادت ہی ایسی ہے۔ وہ صبر کا پہاڑ تھے۔ سنگین سے سنگین حالات میں بھی ان کی پیشانی پر بل نہیں پڑتا تھا۔ مرحوم کی رواداری، وضعداری، صبر، شکر، اخلاص وایثار، بےنفسی، استغنا اور فیاضی وغیرہ جیسی گوناگوں خصوصیات نے ان کے اندر مقناطیسی کشش پیدا کردی تھی۔ ان کی تربیت اور نظامت کا انداز بھی نرالا تھا، کہ جس میں نہ خفگی ہوتی، نہ سختی اور ترشی۔ اس میں ماں کی سی محبت اور باپ کا شفقت آمیز رعب موجود ہوتا تھا۔ وہ اصاغر کی عزت نفس کا بڑا خیال رکھتے تھے، بلکہ ان کے سامنے کوئی کسی کی عزت کو پامال کرنے کی جرأت بھی نہیں کرسکتا تھا۔

گھر پر دینی کتب کے علاوہ معیاری اردو، فارسی اور عربی ادبیات کا شاندار ذخیرہ موجود تھا، خصوصاً دارالمصنفین اعظم گڈھ کی تقریباً جملہ مطبوعات، معارف کی مکمل فائلیں، الابقا کی فائلیں۔ طبی کتب ورسائل کا بھی خاصا ذخیرہ تھا۔ وہ زاہد خشک بھی نہیں تھے۔ دینی کتب ورسائل وجرائد کے ساتھ ساتھ اردو کی کتابیں، رسائل وجرائد نہ صرف پڑھنے

کی آزادی تھی، بلکہ بچپن میں "غنچہ" بجنور بھی پابندی سے ہمارے نام جاری کرادیا تھا، تاکہ ادبی ذوق بھی پروان چڑھتا رہے، الحکیم، ہمدرد صحت، الابقا، النور، الامداد، الحرم، تذکرہ کراچی وغیرہ وغیرہ گھر میں موجود تھے یا جاری تھے، جن سے ہم لوگوں کو بھی استفادہ کے خوب مواقع ملے۔

وفات ۱۳ر جولائی ۱۹۸۴ء کو گورکھپور میں گھر پر نماز عصر ادا کرتے ہوئے ہوئی، جبکہ وہ برادر محترم ڈاکٹر رشید احمد صاحب کے پاس ایک ماہ سے مقیم تھے۔ نماز جنازہ مولانا افتخار الحق نے پڑھائی اور وہیں کچی باغ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

والد مرحوم کے مایہ ناز تلامذہ میں مولانا افتخار احمد جگدیش پوریؒ، مولانا عبدالحق صاحب استاذ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور مولانا حبیب الرحمن اعظمی صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند اور مدیر اعلیٰ ماہنامہ دارالعلوم، دیوبند شامل ہیں۔

نوٹ: اس ناچیز کو حضرت الاستاذ رحمہ اللہ سے بوستان سعدی، تہذیب، اور شرح تہذیب پڑھنے کی سعادت حاصل ہے۔

اولاد:

(۱) ڈاکٹر رشید احمد مرحوم داماد مولانا پھولپوریؒ، بیت العلوم سے فراغت کے بعد طبی تعلیم کی تکمیل یونانی میڈیکل کالج الہ آباد سے کی تھی اور پرائمری ہلیتھ سنٹر (PMC) کاشی سے بحیثیت میڈیکل آفیسر وظیفہ یاب ہوئے۔

(۲) حفیظ احمد مرحوم: بچپن میں ہی رحلت کر گئے تھے۔

(۳) صفیہ مرحومہ: بچپن میں ہی داغ مفارقت دے گئیں۔

(۴) حکیم فرید احمد: رکن مجلس شوریٰ، مدرسہ بیت العلوم، گھر پر ہی رہتے ہیں۔

(۵) خورشید احمد شفقت اعظمی: ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کرکے یونانی میڈیکل کالج، الہ آباد میں ۱۹۶۳ء میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۸ء میں ایف، ایم، بی، ایس کی ڈگری حاصل کی۔ ابتدا میں پریکٹس کی، پھر ملازمت میں آگیا اور ۲۰۰۷ء میں سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، وزارت صحت، حکومت ہند دہلی سے ڈپٹی ڈائرکٹر

کے عہدہ سے سبکدوش ہوا۔ نصف درجن سے زائد طبی کتب کا مصنف، قابل ذکر ہے کہ راقم کی کوئی تصنیف آج تک فلاپ نہیں ہوئی۔ یہ کتابیں طبی کالجوں کے طلبہ، اساتذہ اور عام حاملین طب کے حلقوں میں بیحد مقبول ہیں۔ ۱۵۰ سے زائد مقالات قومی و بین الاقوامی رسائل وجرائد میں چھپ چکے ہیں، جن میں سے ٪۷۵ اردو میں، ماںقی انگریزی میں ہیں، کم وبیش ۶۰ قومی و بین الاقوامی سیمینار اور کانفرنس میں طبی علمی مقالات پیش کر چکا ہوں، جن میں سے ٪۷۵ انگریزی میں اور ٪۲۵ اردو میں ہیں۔ پرورش لوح وقلم کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

مولانا مفتی محمد شعیب نندا وی قاسمی

مولانا مفتی محمد شعیب ولد محمد محمود شیخ اپنے آبائی وطن موضع نندا وں ضلع اعظم گڈھ میں ۱۰ / دسمبر ۱۹۴۸ء م ۱۳۶۸ھ کو پیدا ہوئے، مکتب کی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی، آگے کی تعلیم کے لیے ۱۹۶۲ء م ۱۳۸۲ھ میں مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں عربی اوّل میں داخلہ لیا اور سات برس زیر تعلیم رہ کر ۱۹۶۹ء م ۱۳۸۹ھ میں یہاں سے فارغ التحصیل ہو گئے، ان کے مدرستہ الاصلاح کے اساتذہ میں مولانا داؤد اکبر اصلاحی، مولانا مشتاق احمد اصلاحی، مولانا غالب احسن اصلاحی، مولانا احتشام الدین اصلاحی، مولانا محمد ایوب اصلاحی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یہاں کی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد دیو بند کا رخ کیا، اور دارالعلوم دیو بند میں داخل ہو کر ۱۹۷۰ء میں دورۂ حدیث، ۱۹۷۱ء میں تکمیل تفسیر اور ۱۹۷۲ء میں افتاء کی تحصیل وتکمیل کی، دارالعلوم دیو بند میں انھوں نے جن اساتذہ سے درسی استفادہ کیا ان میں مولانا فخرالدین مرادآبادی شیخ الحدیث، مولانا علامہ محمد ابراہیم بلیاوی صدالمدرسین، مولانا فخرالحسن مرادآبادی، مولانا اسلام الحق اعظمی، مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی، مولانا مفتی نظام الدین اعظمی، آخرالذکر دونوں بزرگوں سے نقل فتاویٰ کی مشق کی۔

تعلیم وتحصیل سے رسمی فراغت کے بعد درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا، سب سے

پہلے احمد نگر مہاراشٹر میں حاجی محمد حنیف کے مدرسہ میں چار برس تدریس کی خدمت انجام دی، اس کے بعد ۱۹۷۷ء م ۱۳۹۸ھ میں بحیثیت مدرس عربی مدرستہ الاصلاح سرائے میر آگئے، اور پھر پوری زندگی یہیں گزار دی، تقریباً بارہ سال صدر مدرسی کے فرائض بھی انجام دیئے، حجۃ اللہ البالغہ، صحیح بخاری کا ایک عرصہ تک یہاں درس دیا۔

مفتی صاحب کی علمی استعداد نہایت ٹھوس تھی، حدیث، فقہ، ادب، اسرار شریعت، منطق وفلسفہ ہر فن میں انھیں عبور حاصل تھا، ان کے درس سے طلبہ بہت ہی مطمئن اور شادکام رہتے تھے، ان کے بعض تلامذہ کا بیان ہے کہ وہ مضامین جو ان سے متعلق نہ ہوتے، طلبہ کو ان میں اگر کہیں الجھن پیش آتی اور ان کی جانب رجوع کیا جاتا تو وہ بسہولت تمام اسے حل کر دیا کرتے تھے، اور طلبہ ہی نہیں بلکہ بعض اساتذہ بھی اپنے اسباق کی تیاری میں ان سے استفادہ کرتے تھے۔

ان کے ایک شاگرد مولوی ضیاء الرحمٰن اصلاحی اپنے تعزیتی مضمون میں لکھتے ہیں کہ

"ان کے زمانۂ صدارت سے پہلے مدرستہ الاصلاح کے طلبہ میں آزادی وروشن خیالی عام تھی، لیکن جب مفتی صاحب نے تعلیمی وتربیتی ذمہ داریاں سنبھالیں تو اس بے لگام آزادی پر قدغن لگائی، اور طلبہ کو وعظ وتلقین اور تنبیہ وتحریض کرتے رہے ان کی یہ کوشش بارآور ہوئی اور مدرستہ الاصلاح کے طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے اسلامی وضع اختیار کی اور جو کچھ وہ تعلیم حاصل کرتے رہے اس پر عمل کرنے کا جذبہ بھی ان میں پیدا ہوا۔۔۔ مجھے یاد پڑتا ہے، جمعرات کے دن عموماً اور گرمی، عید الفطر، عید الاضحیٰ کی چھٹیوں میں خصوصاً گھر جانے سے پہلے مفتی صاحب تمام طلبہ کو مسجد میں جمع کر کے دیر تک پند ونصیحت کرتے اور سمجھاتے کہ گھر میں کس طرح رہنا ہے، ماں، باپ، بڑے، بزرگ گاؤں، محلہ اور چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ کس انداز سے پیش آنا ہے۔ (آہ مفتی محمد شعیب اصلاحی قاسمی، دعوت سہ روزہ)

مفتی محمد شعیب مرحوم تعلیم وتدریس کی اہم خدمت کے ساتھ قومی وملّی خدمات سے بھی پوری دلچسپی لیتے تھے، وہ مسلم فنڈ سرائے میر کے سکریٹری، محکمہ شرعیہ سرائے میر کے نائب قاضی، سرائے میر عید گاہ کے امام، اور جامع مسجد سرائے میر کے امام وخطیب

تھے، نیز مدرسہ دینیہ اشاعت العلوم چیک پوسٹ سرائے رانی کے ناظم تعلیمات اور جمعیۃ علماء ضلع اعظم گڈھ کے ناظم تھے، الحاصل وہ اس دیار کے معروف عالم ومفتی اور ملی کارکن مولانا مفتی اشفاق احمد کے دست وبازو تھے، اوران کی غیر موجودگی میں اس طرح کے تمام امور کے مرجع وہی ہوتے تھے۔

مفتی صاحب کے لباس، وضع قطع، اور دینی امور میں ان کے تصلب کو دیکھ کر یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ مدرستہ الاصاح کے تعلیم یافتہ ہیں، مدرستہ الاصاح کی بہ نسبت ان پر دیوبند کی چھاپ تھی، حلم وبردباری، فروتنی وانکساری، قناعت پسندی وکفایت شعاری اور معاملہ فہمی میں وہ اپنے معاصرین اور رفقائے کار میں نمایاں مرتبہ کے حامل تھے۔

میری ان سے آخری گفتگو فون پر ہوئی، ۷ رشوال ۱۴۳۱ھ کو بعد نماز ظہر ابھی میں مسجد ہی میں تھا کہ ان کا فون آگیا، کہ تم کہیں جانا مت بغرض ملاقات میرا ارادہ تمہارے یہاں آنے کا ہے، اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی، میں نے ان سے کہا کہ آپ تکلیف نہ فرمائیں کل میں خود سرائے میر آنے کے لیے سوچ رہا ہوں، آپ سے اور دیگر سب ہی احباب سے ملاقات ہوجائے گی، انھوں نے مجھ سے پوچھا کب تک یہاں پہنچ جاؤ گے؟ میں نے کہا انشاء اللہ ظہر کی نماز بینارہ مسجد میں جماعت سے پڑھوں گا، انھوں نے کہا ٹھیک ہے میں بھی موجود رہوں گا، دوسرے دن ظہر سے کچھ پہلے سے بارش شروع ہوگئی، جس کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ اس لیے میں نے فون پر ان سے رابطہ کیا اور کہا کہ ایسے میں آنا مشکل ہے، انھوں نے بھی اس کی تائید کی کہ سڑک بہت خراب ہے، اس لیے ایسے میں سرائے میر آنا مناسب نہیں ہے، چونکہ ۹ رشوال کو صبح ہی میری دیوبند کے لیے واپسی تھی، اس لیے میں نے کہا اب انشاء اللہ عید الاضحیٰ کی تعطیل میں ملاقات ہوگی، کیا پتہ تھا کہ یہ ان سے آخری گفتگو ہے اور اس عالم ناسوت میں اب ان کی آواز کبھی بھی سننے کو نہیں ملے گی، میں ۹ رشوال کو طے شدہ پروگرام کے مطابق دیوبند آگیا، ۱۶ رشوال ۱۴۳۱ھ کو مولانا محمد شاہد قاسمی نائب سکریٹری جمعیۃ علماء ضلع اعظم گڈھ نے فون پر یہ اندوہناک خبر سنائی کہ مفتی محمد شعیب صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے، بے شان وگمان کے اچانک اس انتہائی

غیر متوقع خبر سن کر دھک سے رہ گیا، کچھ دیر کے بعد اوسان درست ہوئے تو تفصیل معلوم کی، تو مولانا شاہد قاسمی صاحب نے بتایا کہ وہ بحرین جارہے تھے، مسقط ہوائی اڈہ پر وقفہ سفر کے دوران حرکت قلب بند ہو جانے سے وہیں ایر پورٹ ہی پر ۲۶/ستمبر ۲۰۱۰ء م ۱۶/شوال ۱۴۳۱ھ کو ان کی وفات ہوگئی، میت مسقط ایر پورٹ سے اعظم گڈھ لائی گئی اور اپنے آبائی قبرستان میں ہمیشہ کے لیے آسودۂ خاک ہوگئے۔

بس اتنی سی حقیقت ہے فریبِ خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہوجائے

مولانا محمد عارف جہاناں گنجی

مولانا محمد عارف بن محمد شفیع ضلع اعظم گڈھ کے مشہور صنعتی قصبہ جہاناں گنج کے چشم وچراغ تھے۔ ۶/رجب ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء کو آپ کی ولادت ایک ایسے خاندان میں ہوئی، جس کی دینداری ومہمان نوازی پورے قصبہ میں معروف ومشہور تھی، پڑھنے لکھنے کی عمر کو پہنچے تو جہاناں گنج کے مدرسہ جامعہ انوار العلوم میں داخل کردئے گئے، جہاں پرائمری کی تعلیم مکمل کی، اس کے بعد فارسی وعربی پڑھنے کے لئے گھر سے باہر نکلے اور وطن سے قریب قصبہ مبارک پور کی مشہور اسلامی درسگاہ ''جامعہ عربیہ احیاء العلوم'' یں داخلہ لے کر فارسی اور عربی اوّل سے چہارم تک کی کتابیں پڑھیں، یہاں کے مشاہیر اساتذہ میں مولانا مفتی محمد یٰسین مبارکپوریؒ، مولانا محمد عمر مبارکپوریؒ، مولانا بشیر احمد مبارکپوریؒ، مولانا داؤد اکبر بمھوریؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

احیاء العلوم مبارک پور کے بعد تقریباً ۱۳۶۸ھ میں دیوبند ضلع سہارنپور پہنچے، اور ''دارالعلوم دیوبند'' میں داخلہ لے کر نصاب کے مطابق بقیہ درجات کی تحصیل وتکمیل کی اور ۱۳۷۳ھ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی اور دیگر اساتذہ علیا سے دورۂ حدیث پڑھ کر سندِ فراغ حاصل کی، دارالعلوم دیوبند میں آپ کا قیام کم وبیش پانچ سال رہا، آپ کے دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی، حضرت علامہ محمد ابراہیم

بلیاوی، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہویؒ، حضرت مولانا فخر الحسن مرادآبادی، حضرت مولانا بشیر احمد خاں بلند شہری، حضرت مولانا معراج الحق دیوبندی، حضرت مولانا محمد حسین بہاری رحمہم اللہ جیسے نادرہ روزگار اصحاب درس وارباب کمال علماء شامل ہیں۔

تاریخ رجال کے مصنفین عام طور پر اساتذہ کی علمی عظمت شان سے تلامذہ کے مقام ومرتبہ کا اندازہ لگاتے ہیں، اس اعتبار سے مولانا محمد عارف رحمہ اللہ بجا طور پر اپنے عہد کے افاضل علماء کی صف میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا مرحوم نے علماء وصلحاء کے طریقہ کے مطابق تدریسی مشغلہ کو اختیار کیا، سب سے پہلے قصبہ جانسٹھ ضلع میرٹھ کے مدرسہ میں مسند افادہ کو زینت بخشی، پھر یہاں سے علیحدہ ہو کر صوبہ مہاراشٹر کو اپنی علمی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور شہادہ و دھولیہ کے مدارس میں تدریسی خدمات دے کر مفتاح العلوم ہندوستانی مسجد بھیونڈی میں بحیثیت صدر مدرس آگئے، مولانا نے یہاں نہایت استقلال کے ساتھ برسوں جم کر پڑھایا اور اچھے اچھے طلبہ تیار کر کے دارالعلوم دیوبند اور ملک کے دیگر بڑے مدارس میں بھیجا، مولانا مرحوم کا تدریسی کمال بڑی حد تک یہیں نمایاں ہوا اور بڑے مدارس کے اربابِ اہتمام کی نگاہیں آپ پر پڑھنے لگیں، چنانچہ دارالعلوم مئو کے اس وقت کے ناظم اعلیٰ نے اپنے مدرسہ میں بحیثیت مدرس علیا آنے کی دعوت دی اور ایک حد تک اصرار بھی کیا، دارالعلوم مئو مشرقی اضلاع کے بڑے مدارس میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے، پھر اپنے ضلع کا مدرسہ اور گھر سے بھی قریب تھا، اس لئے مولانا نے یہ دعوت قبول کر لی، اور مفتاح العلوم بھیونڈی صوبہ مہاراشٹر سے مستعفی ہو کر دارالعلوم مئو آگئے، اس وقت دارالعلوم مئو میں حضرت مولانا عبدالحق صاحب اعظمی (جگدیش پوری) صدر مدرس اور شیخ الحدیث تھے، مولانا مرحوم کے ان سے پہلے سے اچھے تعلقات تھے، اس لئے اس نئی جگہ میں مولانا کو کسی نوع کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا اور پوری جمعیت خاطر کے ساتھ کارِ مفوضہ کی انجام دہی میں مصروف ہو گئے، اس مدت میں دیگر بڑی کتابوں کے ساتھ حدیث شریف کا ایک دو سبق آپ سے متعلق رہتا، پھر جب ۱۹۸۱ء مطابق ۱۴۰۲ھ میں

مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ کا دارالعلوم دیوبند میں استاذ حدیث کی حیثیت سے تقرر ہوگیا تو دارالعلوم مئو کی مجلس انتظامیہ نے صدرالمدرسین اور شیخ الحدیث کے دونوں مناصب مولانا محمد عارف رحمہ اللہ کو تفویض کردیئے، اس وقت سے صحیح بخاری کا درس آپ سے متعلق ہوگیا، صدارت تدریس کے انتظامی فرائض کے ساتھ درس بخاری شریف کا سلسلہ جب تک آپ دارالعلوم مئو میں رہے، جاری رہا۔

دارالعلوم مئو چونکہ سرکاری تعلیمی ادارہ ''الہ آباد بورڈ'' سے ملحق ہے اور سرکاری اداروں میں ریٹائرمنٹ کے قانون کا نفاذ ہوتا ہے، اس لئے غالباً ۱۹۹۹ء م ۱۴۲۰ھ میں مولانا مرحوم دارالعلوم مئو سے ریٹائر ہوکر گھر آگئے اور دارالعلوم مئو سے آپ کا تدریسی تعلق ختم ہوگیا، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک کے زیرک وبیدار مغز ناظم اعلیٰ مولانا عبدالمعید قاسمی زید مجدہ نے اس موقع کو غنیمت شمار کیا، اور مولانا مرحوم کو ''احیاء العلوم'' میں خدمت حدیث کی دعوت دیدی، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مولانا مرحوم کی مادر علمی ہے اسی کی آغوش تربیت میں ان کا علمی نشوونما ہوا تھا، عمر کی اس آخری منزل میں اس نے ایک بار پھر اپنا آغوش ان کے لئے پھیلا دیا تھا، اس سعادت کو بھلا مولانا مرحوم جیسا صاحب عقل وخرد کیسے ہاتھ سے جانے دیتا اس پیش کش کو انھوں نے جذبہ تشکر وامتنان کے ساتھ قبول فرمالیا، گویا! دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی، اور ربیع الاوّل ۱۴۲۰ھ م جولائی ۱۹۹۹ء میں بحیثیت شیخ الحدیث احیاء العلوم مبارکپور میں رونق افروز ہوکر زینت بخش مسند تدریس ہوئے، تھوڑے سے وقفہ کے بعد جامعہ احیاء العلوم، کی مجلس شوریٰ نے صدرالمدرسین کے منصب بلند سے بھی سرفراز کردیا، اس وقت سے زندگی کے آخری لمحہ تک بحیثیت شیخ الحدیث وصدرالمدرسین اپنے فرائض منصبی کو خوش اسلوبی ونیک نامی کے ساتھ انجام دیتے ہوئے اپنی مادر علمی ہی کی آغوش میں ۷ رمحرم ۱۴۳۳ھ م ۳ ردسمبر ۲۰۱۱ء کو جان جان آفریں کے حوالہ کردی۔

جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر

وفات کا حادثہ بالکل اچانک پیش آیا، پہلے سے نہ کوئی عارضہ نہ مرض حسب معمول

جمعرات کو گھر گئے اور جمعہ کی شام کو گھر سے مدرسہ آ گئے عصر اور مغرب کی نماز باجماعت پڑھی پھر خود ہی سبزی پکائی اور معمول کے مطابق کھانا کھایا، اور عشاء کے بعد لیٹ گئے، تقریباً گیارہ بجے بستر سے اٹھے اور اپنے حجرے سے متصل حجرہ کے دروازہ پر آ کر ایک طالب علم کو آواز دی وہ باہر نکلا تو اس سے کہا کہ میری طبیعت بہت زیادہ گھبرا رہی ہے ناظم صاحب کو فوراً جا کر اطلاع دو یہ کہہ کر بستر پر آ کر لیٹ گئے، ناظم اعلیٰ مولانا عبدالمعید صاحب اس وقت مدرسہ ہی کے کام سے قصبہ کے ایک محلہ میں گئے ہوئے تھے، انھیں فون پر اطلاع دی گئی، انھوں نے اسی جگہ سے ایک ڈاکٹر کو فون کیا کہ فوراً مدرسہ جا کر مولانا کو دیکھیں، چنانچہ ڈاکٹر صاحب بعجلت تمام آئے، مگر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی مولانا اپنی منزل آخرت پر پہنچ چکے تھے۔

مولانا مرحوم نے دارالعلوم مئو میں تقریباً اٹھارہ سال صحیح بخاری کا درس دیا، اور احیاء العلوم مبارک پور میں تیرہ برس اس طرح آپ نے اکتیس سالوں تک کتاب اللہ کے بعد دنیا کی سب سے صحیح کتاب اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے مستند ترین مجموعہ کا درس دیا۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

مولانا جس طرح ایک بڑے عالم اور بلند پایہ معلم و مدرس تھے، اسی طرح وہ ایک بڑے انسان بھی تھے، کسی انسان کے بڑے ہونے کے لئے جس قدر انسانی صفات درکار ہوتی ہیں، مولانا ان صفات کے حامل تھے، ان کے سینے میں ایک دردمند دل تھا، وہ دوسروں کی تکلیف پر تڑپ اٹھتے تھے، وہ ہاتھ کے چاہے تہی رہے ہوں، لیکن ان کا دل غنی تھا، اپنے میدانِ عمل میں عروج و بلندی کی آخری منزل پر فائز ہونے کے باوجود اس قدر متواضع اور منکسر المزاج تھے کہ ان کی رفتار و گفتار اور لوگوں کے ساتھ میل ملاپ سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کسی بڑے مقام و مرتبہ کے مالک ہیں۔

مولانا تدریسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ سماجی خدمات میں بھی دلچسپی لیتے تھے، جمعیۃ علماء ہند مولانا کی خدمات کا پلیٹ فارم تھا، اسی کے توسط سے وہ قوم و ملت کی خدمات انجام دیتے تھے۔

اس ناچیز کے ساتھ مولانا بڑی شفقت وعنایت کا معاملہ فرماتے تھے، دیوبند آتے تو میرے ہی یہاں قیام فرماتے اور فرماتے کہ دیگر جگہوں کے مقابلے میں مجھے یہاں زیادہ راحت وسکون ملتا ہے، غرض مولانا مرحوم بڑی خوبیوں کے آدمی تھے، ایسے لوگ آج کے زمانہ میں شاذونادر ہی پائے جاتے ہیں۔

مولانا محمد عاصم کوٹلوی

مولانا محمد عاصم بن شاہ محمد ضلع اعظم گڈھ کے معروف ومشہور گاؤں کوٹیلہ کے ایک دیندار اور معزز خاندان میں ۱۳۳۳ھ م ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے، سلسلۂ نقشبندی کے مشہور شیخ طریقت سلطان شاہ جون پوری کے خلف رشید مولانا دین محمد وعظ وتبلیغ کی غرض سے کوٹیلہ اکثر آیا کرتے، مولانا محمد عاصم کے والد ماجد ان کے عقیدت مندوں میں سے تھے، انہی مولانا دین محمد جون پوری کے مشورہ سے مولانا محمد عاصم صاحب کو دینی تعلیم دلائی گئی، اور مولانا دین محمد صاحب کے ایک لائق شاگرد مولانا عقیل احمد کے ذریعہ گھر ہی پر ان کی عربی تعلیم کی ابتداء ہوئی، ہدایۃ النحو تک پڑھ لینے کے بعد مولانا دین محمد انھیں جون پور لے گئے اور اپنی درسگاہ ''مدرسۃ الاسلام'' واقع مسجد اٹالہ میں داخل کر دیا، کچھ دنوں بعد یہ مدرسہ مالی تنگی کی بناء پر بند ہو گیا، تو مولانا محمد عاصم وہاں سے گھر آ گئے، اور تعلیم جاری رکھنے کے لیے ۱۹۲۸ء م ۱۳۴۷ھ کے حدود میں مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں داخلہ لے لیا، یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا نجم الدین اصلاحی مرحوم یہاں استاذ تھے اور مولانا عبدالرحمٰن پرواز، مولانا صدرالدین وغیرہ کے ساتھ مولانا محمد عاصم بھی ان کی تربیت میں آ گئے تھے، مولانا نجم الدین کو ان کی سلامت روی، متانت وسنجیدگی اور استعداد کی پختگی پر بڑا اعتماد تھا، چنانچہ وہ اپنی ایک تحریر میں اس کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''دو عزیز مدرستہ الاصلاح میں اپنی گوناگوں خصوصیات کی بناء پر ممتاز رہے، ان میں سے ایک عزیزم محترم مولوی صدرالدین اصلاحی سلمہ کی ذات ہے...

دوسرے فاضل عزیز مولوی محمد عاصم اصلاحی سلمہ ہیں جو ۱۹۳۶ء میں مدرسہ سے

فارغ ہونے کے بعد بغرض تکمیل حدیث حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی شیخ الحدیث دیوبند کی خدمت میں لگئے ہوئے ہیں، فاضل عزیز اپنی متانت واطاعت کیشی اور ٹھوس استعداد کی وجہ سے بہت سی قدیم روایات اور خوبیوں کے حامل ہیں۔" (یادگار سلف ص ۹،۸)

مولانا اصلاحی کی اس تحریر سے معلوم ہوا کہ ۱۹۳۶ء م ۱۳۵۵ھ میں مولانا محمد عاصم صاحب نے مدرستہ الاصلاح کے نصاب کی تکمیل کر لی تھی، یہاں کے ان کے اساتذہ میں مولانا نجم الدین اصلاحی کے علاوہ مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا شبلی متکلم ندوی، مولانا محمد سعید ندوی، مولانا حکیم محمد احد لہراوی خصوصی اہمیت کے ہیں۔

مدرستہ الاصلاح سے تکمیل کے بعد دورۂ حدیث پڑھنے کی غرض سے دارالعلوم دیوبند آئے، اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی صدرالمدرسین، حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی وغیرہ سے حدیث کی کتابیں پڑھیں۔

مولانا مرحوم اگرچہ مولانا اختر احسن اصلاحی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے تلمیذ تھے، پھر بھی جماعت اسلامی سے فکری ونظری اختلاف رکھتے تھے، تاحیات مدرستہ الاصلاح کے رکن رکین اور مختلف کمیٹیوں کے ممبر رہے، مدرستہ الاصلاح کے نصاب تعلیم میں فقہ کی اہم کتابوں کے داخل کرنے پر ہمیشہ اصرار کرتے رہے، اسی طرح عصری علوم کے شامل کرنے کی ہمیشہ مخالفت کرتے رہے کہ اسے پڑھ کر ہمارے طلبہ بس اسی کے ہو جائیں گے۔

مولانا مرحوم درس وتدریس سے وابستہ نہیں تھے پھر بھی ان کا علم مستحضر تھا بالخصوص اصول فقہ، اصول حدیث اور حجۃ اللہ البالغہ پر ان کی اچھی نظر تھی اور مدرستہ الاصلاح میں آخر تک اعلی درجات کے ممتحن رہے، وہ ایک دیندار گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔ اس لیے دین سے ان کی وابستگی زندگی کے ہر مرحلہ میں رہی، لیکن زندگی کے آخری دور میں تزکیۂ نفس اور تطہیر باطن کی جانب ان کا میلان بہت بڑھ گیا تھا، چنانچہ وفات سے تقریباً دس بارہ سال قبل بقیۃ السلف حضرتِ اقدس مولانا محمد احمد پرتاب گڈھی سے اصلاح کا

تعلق قائم کرلیا اور یہ تعلق ان کا والہانہ تھا، عبادت وریاضت سے معموران کی محتاط زندگی کو دیکھ کر رشک آتا تھا، حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی رحمہ اللہ کی یہ شہادتِ حق ہے کہ ''الہ آباد کے سفر میں اکثر ساتھ رہا، جب بھی صبح صادق سے پہلے اٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی تو اپنے کو ان سے مسبوق پایا'' (کاروان رفتگاں ص ۶۱)

مرحوم اپنے موضع کی جامع مسجد کے طویل عرصہ تک امام وخطیب رہے، خطبہ سے پہلے تقریر کرتے تھے ان کا یہ بیس پچیس منٹ کا بیان اتنا پرکشش، دل پذیر اور موثر ہوتا تھا کہ لوگ دور دور سے وہاں جمعہ پڑھنے کے لیے کشاں کشاں چلے آتے تھے، ان کی جمعہ کی ان تقریروں سے بہت سی سنتیں زندہ ہوئیں، اور بدعتیں ختم ہوگئیں۔

عمر کے آخری ایام میں ان کی طبیعت اکثر ناساز رہا کرتی تھی، پھر بھی چلتے پھرتے رہتے تھے، وفات والے دن یعنی ۳۱/ مارچ ۱۹۸۷ء م ۱۴۰۸ھ بروز دوشنبہ کو بھی عصر کی نماز جامع مسجد میں ادا کر کے گھر آئے تو اچانک طبیعت بگڑ گئی، ایک مقامی ڈاکٹر کو بلایا گیا، معاینہ کے بعد طے پایا کہ شہر اعظم گڈھ لے جایا جائے، ابھی لے جانے کی تیاری ہورہی تھی کہ قبیل مغرب طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر کے اعلیٰ علیین میں پہنچ گیا، دوسرے دن تدفین عمل میں آئی، نماز جنازہ مدرسہ ریاض العلوم گورینی جون پور کے استاذ ومفتی مولانا محمد حنیف مدظلہ نے پڑھائی، جن سے مولانا مرحوم کا گہرا یارانہ تھا۔

مولانا محمد عثمان ساحر مبارک پوری

مولانا محمد عثمان ساحر مبارک پوری ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴ء میں قصبہ مبارک پور ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابوں سے مشکوٰۃ وغیرہ تک کی تعلیم وتحصیل اپنے قصبہ کی مشہور درسگاہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں، مولانا شکر اللہ مبارک پوری، مولانا محمد عمر مبارک پوری، مولانا بشیر احمد مبارک پوری، مفتی محمد یٰسین مبارک پوری وغیرہ اساتذۂ احیاء العلوم مبارک سے حاصل کی، دورۂ حدیث پڑھنے کے لیے مراد آباد گئے، اور جامعہ قاسمیہ (مدرسہ شاہی) مراد آباد میں داخلہ لے کر حضرت مولانا فخر الدین

مرادآبادی سے صحیح بخاری، سنن ابوداؤد، سنن ابن ماجہ اور حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم دہلوی سے سنن ترمذی اور مولانا محمد اسماعیل سنبھلی سے صحیح مسلم وغیرہ کتب حدیث پڑھ کر فاتحہ فراغ پڑھی اور سند فضیلت حاصل کی۔

فراغت تعلیم کے بعد مسند تدریس کو زینت بخشی اور مختلف مدارس میں درس وافادہ کی محفلیں آراستہ کیں، چنانچہ سب سے پہلے آپ نے مدرسہ بیت العلوم مالیگاؤں مہاراشٹر میں دو سال تدریسی خدمت انجام دی، پھر یہاں سے ''سراج العلوم'' دھولیہ مہاراشٹر میں آگئے، جہاں آپ کا قیام دس برس رہا اس بارہ سالہ تدریسی تجربہ کے بعد اپنی مادر علمی ''جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور'' میں تدریسی بزم سجائی، اور گیارہ سال تک یہاں نہایت کامیاب مدرسی کی، پھر اپنے شاگرد عزیز اور احیاء العلوم میں تدریس کے رفیق مولانا مسلم بمھوری کے ساتھ احیاء العلوم مبارک پور سے علیحدہ ہو کر ۱۳۸۹ھ کے حدود میں اپنی تدریسی سرگرمیوں کا مرکز بڑی مسجد (جامع الشرق) جون پور کے مدرسہ قرآنیہ کو بنایا، یہاں تقریباً چار، ساڑھے چار سال تعلیمی خدمات انجام دے کر جون پور ہی میں مسجد لال دروازہ میں مولانا محمد مسلم بمھوری کی رفاقت ومعیت میں ''جامعہ حسینیہ'' کے نام سے ۱۳۹۴ھ میں ایک مدرسہ جاری کیا اور مدرسہ قرآنیہ سے منتقل ہو کر اپنے اسی مدرسہ میں آگئے، جہاں گیارہ بارہ برس تک بڑے انہماک کے ساتھ تعلیمی وتربیتی خدمات انجام دیں، اسی دوران مدرسہ میں کچھ ایسے ناگفتہ بہ حالات رونما ہو گئے جن سے مولانا کو سخت ناگواری ہوئی اور وہ مدرسہ چھوڑ کر گھر چلے گئے، پھر مدرسہ منبع العلوم خیرآباد کے ارباب اہتمام کی طلب وخواہش پر ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۴ء کو منبع العلوم میں بحیثیت صدر مدرس آگئے اور تاحیات اسی مدرسہ میں رہے۔

مولانا محمد عثمان ساحرؔ رحمہ اللہ صرف ونحو اور ادب وتفسیر کے نہایت کامیاب مدرس تھے، طلبہ کی دینی تربیت میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، مدرسہ قرآنیہ بڑی مسجد جون پور کے زمانۂ قیام میں شوال ۱۳۹۱ھ تا ۲۹ رجمادی الثانی ۱۳۹۲ھ آٹھ ماہ یہ بندۂ ناچیز بھی مولانا موصوف کی رفاقت بلکہ سرپرستی میں مدرسہ قرآنیہ میں مدرس رہا، اس مدت میں مولانا کو

قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، مولانا بڑے پاک طینت، کریم النفس، نرم خو، کم سخن اور حلیم وبردبار تھے، البتہ اگر کبھی غصہ آجاتا تو پھر سنبھالنا مشکل ہوتا، اس وقت ان کے تلمیذ رشید اور مزاج شناس مولانا محمد مسلم مرحوم ہی اپنی حکمت عملی سے ان کے غصہ کو ٹھنڈا کرتے تھے۔

میں نے قرآنیہ جون پور میں اپنے آٹھ ماہ قیام کے زمانہ میں یہ پروگرام بنا رکھا تھا کہ ہر جمعرات کو جون پور کے قدیم علماء وصوفیاء کے مزار ومدفن کی تعین وتحقیق کے لیے تذکروں میں مذکور مقامات پر جاتا اور اس جگہ کے واقف کاروں سے اس کی تحقیق کرتا، میرے اس شہر خموشاں کی سیر میں مولانا محمد عثمان رحمہ اللہ ازراہِ شفقت وعنایت رُفیق ورہنما ہوتے تھے، ان کی معیت میں سیکڑوں بزرگوں کے مرقد ومدفن کو دیکھنے اور فاتحہ پڑھنے کی توفیق ملی۔

پوری زندگی طلبہ علوم کی تعلیم وتربیت کی گرانقدر خدمت انجام دے کر اسلام کا یہ مخلص خادم ۲۱/اپریل ۱۹۹۳ء مطابق شوال ۱۴۱۳ھ کو اس سرائے فانی سے دار جاودانی کو سدھار گیا۔

مولانا عربی اور اردو دونوں زبانوں کے بلند پایہ ادیب اور قادر الکلام شاعر تھے، اردو کی ہر صنف سخن میں اشعار کہتے تھے اور خوب کہتے تھے، نمونۂ کلام یہ ہے:

رخ پہ گیسو ترے بل کھائے ہوئے البیلے ۔۔۔ سانپ مہتاب سے ہے آنکھ مچولی کھیلے
آؤ ہنس بول لیں کل جانے کہاں کون رہے ۔۔۔ دائمی ہوتے نہیں جانِ جہاں یہ میلے
لے لے یہ جنس گرانقدر پس وپیش نہ کر ۔۔۔ جس جگہ جیسے ملے درد محبت لے لے

جتنا جی چاہے میری راہ میں کانٹے بو لے ۔۔۔ پھول بن جائیں گے حق میں مرے ہولے ہولے
قتل کر کے مجھے او ناز سے جانے والے ۔۔۔ ترے دامن پہ مرا خونِ وفا ہے دھو لے
دیکھ کر شوقِ طلب جذبۂ دل کا میرے ۔۔۔ رہنما بن گئے رہزن بھی بدل کر چولے
ہر طرف پھیل گئے عطر بداماں جلوے ۔۔۔ وہ جو آنکلے ادھر زلف معنبر کھولے

حجاج کرام کی واپسی سے متعلق چند اشعار:

مجلّٰی جلوہ گاہ مصطفٰے سے ہو کے آئے ہیں ۔۔۔ غبار شیشۂ دل، دماغِ عصیاں دھو کے آئے ہیں
جہاں کے ذرہ ذرہ کے لیے دنیا ترستی ہے ۔۔۔ وہاں کی چاندنی کے فرش پر یہ سو کے آئے ہیں

حضور مالک کونین بیت اللہ کے پردوں سے　　لپٹ کر پے بہ پے صبح ومسا رو رو کے آئے ہیں
مدینے والے کی مدحت سرائی نعت کے موتی　　مقدر میں ازل سے ساحر خوش گو کے آئے ہیں

مولانا محمد عثمان ساحر رحمہ اللہ تصنیف وتالیف کے میدان سے بھی آشنا تھے، دیوان غنی پر کچھ کام کیا تھا، اسی طرح دیگر دوسرے موضوعات پر بھی کام کیا، مگر وسائل وذرائع کی کمی کی بناء پر طبع نہیں کرا سکے، پتہ نہیں یہ مسودات اب کہاں اور کس حال میں ہیں، البتہ دو رسالے طویل عرصہ ہوا شائع ہوئے تھے: (۱) القصائد الغالیۃ، جس میں خود مولانا مرحوم کے چند عربی قصائد تھے۔ (۲) نور وسرور، چند منتخب نعتوں پر مشتمل ایک مختصر رسالہ۔

مولانا محمد عمر مبارک پوری

استاذ العلماء مولانا محمد عمر بن حاجی حکیم سعید احمد بن شیخ عبدالکریم، بن شیخ محمد عالم بن شیخ بدل اپنے آبائی وطن پورہ صوفی قصبہ مبارک پور میں ۱۹۰۹ء م ۱۳۲۷ھ میں پیدا ہوئے، مولانا کے والد حاجی محمد سعید یہاں کے مشہور اطباء میں سے تھے، مطب کے ساتھ بازار میں ان کا دواخانہ بھی تھا۔

مولانا محمد عمر کے آباء واجداد موضع اکروڑا سے غالباً سلطان عالمگیر کے آخری دور میں نقل مکانی کر کے مبارک پور میں آبسے تھے، اکروڑا اعظم گڈھ سے جین پور کی طرف جانے والی قدیم سڑک کے دونوں جانب مشہور گاؤں ہے۔

مولانا نے ایک پڑھے لکھے خاندان میں آنکھیں کھولی تھیں، اس لیے سن تمیز میں پہنچتے ہی پڑھنے میں لگا دیئے گئے، ابتداء میں اپنے والد وغیرہ سے گھر ہی میں تھوڑا بہت پڑھا، پھر قصبہ کے مشہور مدرسہ جامعہ احیاء العلوم مبارک پور میں داخل کر دیئے گئے، یہاں متوسطات تک پڑھنے کے بعد اپنے دیار کے ایک دوسرے مدرسہ ''ناصر العلوم گھوسی'' میں داخلہ لے لیا جہاں اس وقت غالباً ضلع اعظم گڈھ کے مشہور صاحب درس عالم مولانا علی احمد کوئریا پاری ثم سرائے میری کا فیض علم پوری توانائیوں کے ساتھ جاری تھا، یہاں ابھی ایک ہی سال گزرا تھا کہ مولانا علی احمد صاحب یہاں سے مستعفی ہو گئے، اس لیے

مولانا موصوف ۱۳۴۶ھ میں بنارس مظہر العلوم پچی باغ بنارس چلے گئے جہاں اس وقت محدث عصر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی بحیثیت صدر مدرس کے درس وافادہ میں مصروف تھے۔ مولانا محمد عمر مرحوم محدث اعظمی سے ایک سال مظہر العلوم میں پڑھ کر ۱۳۴۸ھ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے مظاہر علوم سہارن پور چلے گئے، دو سال میں شرح نخبۃ الفکر، مشکوٰۃ، ملاحسن، جلالین، شاطبیہ کے علاوہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ترمذی، سنن ابی داؤد وغیرہ دورۂ حدیث میں شامل کتب حدیث پڑھ کر ۱۳۵۰ھ میں فارغ التحصیل ہوگئے، آپ کے مظاہر علوم کے اساتذہ میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی، مولانا عبدالرحمٰن کیمل پوری، مولانا عبداللطیف ناظم مظاہر علوم رحمہم اللہ جیسے نابغۂ عصر علماء درس شامل ہیں، تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے قصبہ کے مشہور مدرسہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم سے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، اور ایک مدت تک یہاں تدریسی خدمات انجام دیں، مشہور صاحب قلم عالم ومؤرخ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، مولانا محمد عثمان ساحر مبارک پوری، مولانا شمس الدین حسینی مبارک پوری، مولانا قاری انوار الحق مبارک پوری، مولانا محمد عارف جہاناں گنجی وغیرہ اپنے عہد کے نامور علماء ان کے تلامذہ میں ہیں۔

بعد میں کچھ ایسے حالات رونما ہوگئے کہ وہ احیاء العلوم کی تدریسی خدمت سے الگ ہوگئے، چونکہ اپنے گھر، گرہستی کے ذمہ دار اور نگراں یہی تھے اس لیے کہیں باہر جانا ان کے لیے مشکل تھا، اس بناء پر درس وتدریس کے مشغلہ کو موقوف کر کے قصبہ میں ریشم کی دوکان کرلی، بعد میں ان کے اس کاروبار میں بڑی ترقی ہوئی، اس زمانہ میں بھی علم وعلماء سے ان کا تعلق برقرار رہا، احیاء العلوم وغیرہ کے طلبہ کو گھر پر پڑھانے کا سلسلہ جاری رہا، اسی طرح ضلع اور اس کے اطراف میں دینی اجلاسوں میں بحیثیت واعظ وخطیب برابر شرکت کرتے رہے۔

مولانا کا وعظ عام فہم اور علمی ہوتا تھا، وعظ میں کثرت سے باحوالہ احادیث پڑھتے تھے، اس لیے عوام ہی نہیں بلکہ علماء بھی ان کے وعظ کو بہت پسند کرتے تھے، دو دو تین تین گھنٹے وعظ کہتے مگر مضامین کی آمد اور وعظ کی روانی میں کوئی فرق نہیں پڑھتا تھا۔

ان کا مشغلہ اگرچہ تعلیمی وتدریسی نہیں تھا، مگر علم مستحضر تھا، مسائل پر ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ کاروبار میں مشغولیت کے باوجود ان کے مطالعہ اور کتب بینی کا سلسلہ تاہنوز جاری ہے۔

مولانا طبعی طور پر چاک وچوبند تھے، سواری کے بالمقابل پیدل چلنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اہل تعلق سے ملنے جلنے کا خاص اہتمام کرتے تھے، نادار طلبہ وعلماء کی خبر گیری رکھتے تھے، پاس پڑوس کے حاجت مندوں کا بھی انھیں خیال رہتا تھا۔

۱۳/ اپریل ۱۹۹۵ء م ۱۴۱۶ھ کو مختصر علالت کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اور اپنے آبائی قبرستان مبارکپور میں دفن ہوئے۔

مولانا قاسم کوٹلوی

عالم ربانی مولانا محمد قاسم بن عبدالرحیم ضلع اعظم گڈھ کے معروف گاؤں ''کوٹیلہ'' کے ایک دیندار اور باحیثیت خاندان کے چشم وچراغ تھے، تاریخ ولادت ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴ء ہے، مکتب کی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد ۱۳۴۶ھ م ۱۹۲۷ء میں شہر جون پور کے قدیم مدرسہ قرآنیہ جامع الشرق (بڑی مسجد) میں داخل ہوکر فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابوں سے قدوری تک کی تعلیم حاصل کی، آگے کی تعلیم کے لیے اپنے رفیق درس مولانا جمیل احمد متوطن لپری ضلع جون پور کے ہمراہ دیوبند ضلع سہارن پور کا رخ کیا اور دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر مسلسل چار پانچ سال تک یہاں رہ کر بقیہ نصاب کی تکمیل کر کے ۱۳۵۵ھ م ۱۹۳۶ء میں فارغ التحصیل ہوگئے۔ ان کے دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، حضرت شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علی امروہوی، حضرت مولانا عبدالسمیع دیوبندی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی مفتی اعظم پاکستان وغیرہ اپنے عہد کے مشاہیر علمائے دین شامل ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ قیام میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی

متوفی ۱۳۶۲ھ کی خدمت میں تھانہ بھون جانے کا معمول تھا، مولانا مرحوم کے نواسے مولانا ضیاء الدین قاسمی لکھتے ہیں:

''احقر جب طالب علمی کے دور میں مدرسہ بیت العلوم سرائے میر سے جمعرات کی چھٹی میں کوٹلہ آتا تو اکثر نانا جان فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح آپ لوگوں کو گھر آنے کی خوشی ہوتی ہے اسی طرح ہم کو پانچ سالہ دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانہ میں پیرومرشد مولانا اشرف علی تھانوی کی مجلس میں تھانہ بھون جانے کی خوشی رہتی تھی''

(سالانہ مجلہ مدرسہ دینیہ اشاعت العلوم ص ۵۱-۵۲)

دارالعلوم دیوبند میں ان کے ہم وطن رفقاء میں ایک مولانا عبدالمجید کوٹھیاوی متوفی ۱۳۷۴ھ مجاز صحبت حضرت تھانویؒ بھی تھے جن سے مولانا مرحوم کا غایت درجہ تعلق تھا، دونوں بزرگوں نے باہمی اشتراک وتعاون سے قصبہ گھوسی ضلع اعظم گڈھ کے محلہ قاضی پورہ میں ایک مدرسہ قاسم العلوم کے نام سے ۱۳۶۶ھ میں جاری کیا تھا، جس میں مولانا کوٹھیاوی زندگی کے آخری ایام تک درس وافتاء کی خدمت انجام دیتے رہے، اور مولانا اس کے نظم ونسق کی نگرانی کرتے تھے، جب تک مولانا عبدالمجید رحمہ اللہ حیات سے رہے مولانا مرحوم کا قیام زیادہ تر گھوسی ہی میں رہتا تھا۔

مولانا مرحوم طبعاً صوفیانہ مزاج کے حامل تھے، دیگر مشاغل کے مقابلہ میں ذکر واشغال اور عبادت وریاضت کی طرف میلان زیادہ تھا شیخ المشائخ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ سے بیعت وارادت کا تعلق رہا۔ حضرت پھولپوری رحمہ اللہ کے خاص متوسلین میں شمار ہوتے تھے، اور حضرت پھولپوری کے خلیفہ الحاج منشی محمد ناظر مانوی سے انھیں اجازت وخلافت بھی حاصل تھی، حضرت مولانا پھولپوریؒ بھی ان سے خصوصی تعلق رکھتے تھے، چنانچہ انھیں اپنے مدرسہ بیت العلوم کا ایک زمانہ میں نائب ناظم بھی مقرر کیا تھا، خاکسار کے دور طالب علمی میں ایک عرصہ تک وہی مدرسہ میں حضرت پھولپوری کی نیابت کی خدمت انجام دے رہے تھے، اس زمانہ میں اساتذہ اور طلبہ سب ہی ان کے اخلاص وللّٰہیت کے معترف رہے، مدرسہ کی مالیات کے سلسلہ میں اس دور میں انھوں نے اہم

خدمت انجام دی۔

مولانا مرحوم کی علمی استعداد پختہ تھی، تصنیف وتالیف کی صلاحیت بھی رکھتے تھے، طبیعت بھی موزوں پائی تھی، مگر تصوف کے غلبہ کی بناء پر درس وتدریس، تصنیف وتالیف اورشعر گوئی کی طرف توجہ نہیں رہی پھر بھی ''مفتاح الذکر'' کے نام سے ان کی ایک تصنیفی یادگار ہے جو عرصہ ہوا شائع ہوئی تھی، اسی طرح ان کے اشعار کا ایک مختصر مجموعہ بنام ''اشعار محمودہ'' ان کے نواسہ مولوی ضیاء الدین قاسمی اور مولوی عبدالرب سلطان پوری کی سعی سے مدرسہ عربیہ دعوۃ الحق دوست پور ضلع سلطان پور سے شائع ہوا ہے۔

ان کی طہارت باطنی اور صفت ورع وتقویٰ کے آثار ان کے چہرے بشرے پر نمایاں تھے، کہ رعب کی وجہ سے انھیں نظر بھر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، یوں تو وہ ہمیشہ ہی سے عزلت پسند اور تنہائی کے دلدادہ تھے، آخر میں یہ عزلت گزینی بہت بڑھ گئی تھی، بس اپنا گھر اور محلہ کی مسجد ان کی جائے قرار، تلاوت قرآن، مطالعہ کتب اور عبادت وریاضت ان کے شب وروز کا مشغلہ تھا۔

۲۳/ذی الحجہ کو ان پر دل کا دورہ پڑا، اعزہ واقربا نے بغرض علاج ہسپتال میں داخل کر دیا، جب ہوش آیا تو فرمانے لگے مجھے وضو کراؤ نماز پڑھاؤ، مجھے یہاں کیوں لائے ہو، موت گھر پر بھی آئے گی اور یہاں بھی، گھر پر رہتے تو کم از کم سکون سے نماز وتلاوت کا موقع ملتا، بیماری کا حال سن کر گاؤں اور اطراف کے بہت سارے لوگ عیادت کے لیے جمع ہو گئے تھے، چنانچہ ۲۴/ذی الحجہ کو اس مجمع کو مخاطب کر کے ''وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین'' کے مضمون پر وعظ فرمایا، جس کے لفظ لفظ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس مردِ حق آگاہ کے یہ آخری کلمات ہیں، اسی دن دوسرا دورہ پڑا، پھر ظہر کے وقت کچھ افاقہ ہو گیا ظہر، عصر، مغرب، اور عشا کی چار نمازیں ہوش وحواس کی حالت میں ادا کیں، ۹/بجے شب میں تیسرے دورہ کا حملہ ہوا، اور ۲۵/ذی الحجہ ۱۴۰۵ھ چہارشنبہ کو جب کہ آسمان کا سورج طلوع ہونے کے قریب تھا خطہ اعظم گڈھ کا یہ نیر تاباں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ ''آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے''۔

مولانا محمد مسلم بمھوری

مولانا محمد مسلم بن مولوی حاجی محمد الیاس، بن حاجی محمد سلیمان ۱۳۵۵ھ م ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ اپنے آبائی وطن بمھور ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، موضع بمھور قصبہ مبارک پور سے تقریباً ڈھائی میل کے فاصلے پر جنوب مشرق میں ایک قدیم آبادی ہے۔

مولانا نے ایک پڑھے لکھے خانوادہ میں آنکھیں کھولیں، آپ کے والد حاجی شیخ محمد الیاس ''مدرستہ الاصلاح'' سرائے میر کے فارغ التحصیل تھے، عصر حاضر کے بلند پایہ مشہور معلم ومدرس مولانا محمد شبلی متکلم ندوی مولانا محمد مسلم کے خاندانی بزرگ تھے، ابتداء سے مڈل تک کی تعلیم اپنے نانیہال بلریا گنج میں حاصل کی، اس کے بعد علوم عربیہ دینیہ کی تحصیل کیلئے ''جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور'' میں داخل ہوئے، اور وہیں ابتدائی عربی سے متوسطات تک پڑھا، آپ کے یہاں کے اساتذہ میں مولانا محمد عثمان ساحر مبارکپوری، مولانا عبدالمنان بانسوپاروی، مولانا محمد یحییٰ رسول پوری، مولانا مفتی محمد یٰسین بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے دیوبند سہارنپور گئے، اور دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر نصاب کی بقیہ کتابیں پڑھیں اور ۱۳۷۸ھ م ۱۹۵۷ء میں دورۂ حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہوگئے، صحیح بخاری حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادی سے پڑھی جو اسی سال شیخ الحدیث کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تھے، بقیہ اساتذہ میں حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا فخر الحسن مرادآبادی، مولانا بشیر احمد خاں بلندشہری، مولانا معراج الحق دیوبندی اور مولانا محمد حسین بہاری رحمہم اللہ وغیرہ ہیں۔

مولانا محمد مسلم بمھوری ذکاوت وذہانت میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز مقام رکھتے تھے، پوری محنت وجانفشانی سے پڑھا بھی تھا، ساتھ ہی قسمت سے ماہر فن اساتذہ میسر آگئے تھے، اس لئے ان کی تعلمی استعداد بڑی پختہ تھی، اور نوآموخت ہونے کے باوجود درسیات پر قابو یافتہ تھے۔

مولانا نے تدریس کا آغاز دارالعلوم مئو سے کیا جس کی تقریب یہ ہوئی کہ دارالعلوم دیوبند

کے رفقاء میں مولانا قاری فیاض احمد غازی پوری، اور مولانا انعام الحق مئوی سے آپ کے تعلقات بہت اچھے تھے؛ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس مثلث کا باہم یارانہ تھا، مولانا انعام الحق مئوی نے یہ تجویز رکھی کہ فراغت کے بعد ہم تینوں دار العلوم مئو میں ایک ساتھ تدریسی خدمت انجام دیں گے، جس کو ان دونوں نے منظور کرلیا، چونکہ مولانا انعام الحق کے والد ماجد حاجی سیٹھ محمد صالح مدرسہ کی انتظامی مجلس کے صدر تھے اور بااثر بھی تھے۔ اس لئے مولانا انعام الحق کی حسب خواہش مولانا محمد مسلم بمہوری کا شعبۂ عربی میں، اور مولانا قاری فیاض احمد غازی پوری کا قرأت کے شعبہ میں تقرر ہوگیا اور مولانا انعام الحق اعزازی طور پر درس دینے لگے، اس طرح یہ تینوں ایک ساتھ ایک جگہ کام کرنے لگے، قاری فیاض کو قدرت نے بڑی فیاضی سے حسنِ صوت کی نعمت عطا کی تھی، اس لئے وہ اپنے شعبہ میں بہت جلد ہردلعزیز ہوگئے، ادھر مولانا محمد مسلم صاحب بھی نہایت باصلاحیت، اور نوآموز ہونے کے باوجود تفہیم کا سلیقہ ایسا کہ کہنہ مشق اس پر رشک کرے، اس لئے یہ بھی اپنے درجہ میں سب پر چھاگئے، ان نووارد، غیر مقامی استادوں کی یہ غیر معمولی مقبولیت ان کے حق میں اچھی ثابت نہیں ہوئی اور ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ ان دونوں کو بیک وقت دارالعلوم مئو سے یہ رسمی تعلق ختم کرلینا پڑا، دار العلوم مئو میں ان دونوں حضرات کا قیام ڈیڑھ دو سال سے زیادہ نہیں رہا، وہاں سے علیحدگی کے بعد قاری فیاض احمد صاحب نے اس تجربہ کے بعد قصبہ دلدارنگر ضلع غازی پور میں خود اپنا مدرسہ ''مخزن العلوم'' کے نام سے قائم کرلیا جو اس وقت غازی پور کے بڑے اور نیک نام مدرسوں میں شمار ہوتا ہے۔

اور مولانا محمد مسلم مرحوم غالباً ۱۳۸۱ھ میں اپنی مادر علمی ''جامعہ عربیہ احیاء العلوم'' آگئے، یہاں تقریباً نو سال تک نہایت خوش اسلوبی و نیک نامی کے ساتھ تعلیمی و تربیتی خدمات انجام دیں، مولانا کے اس دور کے تلمیذ رشید مولانا اعجاز اعظمی زید مجدہ جو خود بھی ایک لائق و فائق معلم و مربی ہیں ان کی شانِ تدریس کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''میرے درجے کی ایک کتاب ''علم الصیغہ'' کا سبق ان کے پاس تھا، مولانا نہایت اعلیٰ درجہ کے مدرس تھے، بڑے بارعب و باوقار، پڑھاتے ایسا تھے کہ

جیسے گھول کر پلا دینا چاہتے ہوں، ان کا انداز تدریس نمونہ کا تھا، مشکل سے مشکل بات اس طرح سمجھاتے تھے کہ اس کے مشکل ہونے کا ذرا بھی احساس نہ ہوتا تھا، طالب علم کے ذہن میں وہ بات اس طرح بیٹھ جاتی جیسے پہلے سے معلوم رہی ہو، میں نے مولانا سے چار سال تعلیم حاصل کی ہے، پڑھانے کا انداز انھیں سے سیکھا، خود مقرر وخطیب نہ تھے، لیکن بہتوں کو خطیب بنا دیا، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں مولانا کا تدریسی وتربیتی کمال ظاہر ہوا، باوقار و بارعب بھی تھے، مہربان و بااخلاق بھی بہت تھے، ہر طالب علم ان سے ڈرتا بھی تھا اور ان سے محبت بھی کرتا تھا

(ماہنامہ دارالعلوم ستمبر ۱۹۹۳ء)

مولانا محمد مسلم رحمہ اللہ کی یہی وہ روشنی طبع ہے جس کے ہاتھوں انھیں تعلیم وتدریس میں ہزار کامیابیوں کے باوجود دارالعلوم مئو کو خیرباد کہنا پڑا تھا، وہی ''احیاء العلوم'' میں بھی بلا بن کر ان کے گرد منڈلانے لگی، یہاں تک کہ وہ دن بھی آ گیا کہ انھیں اپنی علمی مادر مہربان کو الوداع کہنا پڑ گیا، احیاء العلوم مبارک پور سے علیحدگی کے بعد ۱۳۸۹ھ کے حدود میں اپنی تعلیمی وتدریسی سرگرمیوں کا مرکز ''جامع الشرق'' (بڑی مسجد) جون پور (۱) کو بنایا،

(۱) نویں صدی ہجری کے معروف ومشہور بزرگ شیخ محمد بن عیسیٰ تاج جون پوری متوفی ۸۷۰ھ کے حسب منشاء سلطان محمود شرقی متوفی ۸۶۲ھ نے شیخ محمد بن عیسیٰ تاج کے مکان کے قریب ۸۴۲ھ میں اس کی بنیاد رکھی، اور دس سال کی مدت میں یہ عالیشان اور قدیم مسلم طرز تعمیر کی یادگار مسجد بن کر تیار ہوگئی ''مسجد جامع الشرق'' سے تکمیل تعمیر کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ مسجد جامع الشرق کا اندرو مسقف حصہ ۲۱۷×۲۱۹ فٹ ہے اور پورا احاطہ پچھم پورب ۳۲۰ فٹ اور اتر دکھن ۳۰۷ فٹ ہے، بلندی ۲۰۰ فٹ سے زیادہ ہے، یہ مسجد اپنی تعمیر کے وقت سے اسلامی علوم وفنون کا گہوارہ رہی ہے، ''مشہور ہے کہ ۱۴۹۴ء م ۹۰۰ھ میں سلطنت افاغنہ کے بانی شیر شاہ سوری نے اپنے زمانہ قیام جون پور میں اس مسجد میں تعلیم پائی ہے، اس قدیم ترین مسجد نے عروج وزوال اور مدوجزر کے بہت سارے ادوار دیکھے ہیں، نوابان اودھ کے عہد میں جو تاریخی اعتبار سے دیار پورب میں شیعیت کے فروغ کا دور تھا یہ مسجد اہل تشیع کے تصرف میں چلی گئی تھی، اور انھوں نے اللہ کے اس گھر کے ایک حصہ کو تعزیہ خانہ، اور بقیہ کو بارات گھر بنا دیا تھا، حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی کے خلیفہ اجل مولانا سخاوت علی جون پوری مہاجر مکی متوفی ۱۲۷۴ھ کی سعی مشکور سے یہ عظیم مسجد شیعوں کے تصرف سے آزاد ہوئی، اور پھر سے اس میں جمعہ وجماعت کا سلسلہ قائم ہوا، اسی کے ساتھ مولانا سخاوت علی نے مسجد کی مستقل آبادی کے خیال سے اس میں ایک مدرسہ جاری کر دیا اور حافظ امام الدین لاہوری کو جو ایک خدارسیدہ بزرگ تھے کو اولین مدرس مقرر کیا، بعد میں اس مدرسہ نے بڑی ترقی کی، مولانا سخاوت علی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے مولانا ابوالخیر محمد مکی متوفی ۱۳۲۲ھ کے دور نظامت میں اس مدرسہ میں دورۂ حدیث تک کی تعلیم ہوتی تھی۔ ان کی وفات کے بعد یہ مدرسہ روبزوال ہوا اور اس کی پہلی سی رونق باقی نہ رہی، بس صرف مدرسہ کا نام ہی باقی رہ گیا تھا۔ (باقی رہے اللہ کا نام)

بڑی مسجد جون پور میں ''مدرسہ قرآنیہ'' کے نام سے ایک درسگاہ اگر چہ پہلے سے موجود تھی، لیکن یہاں تعلیم وتربیت کے نام کی فی الواقع کوئی چیز نہیں تھی، مولانا یہاں آئے تو اپنے استاذ محترم مولانا محمد عثمان ساحر مبارک پوری کو بھی ساتھ لائے، جو صرف ونحو اور ادب عربی کے لاثانی مدرس تھے، پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ مدرسہ قرآنیہ کے تن بیجان میں حیاتِ تازہ آگئی، اطراف واکناف ہی کے نہیں؛ بلکہ دور و دراز علاقوں کے بھی خاصی تعداد میں طلبہ اکٹھا ہوگئے، اور عربی پنجم تک کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہوگیا، شوال ۱۳۹۱ھ تا ۲۹ / جمادی الثانی ۱۴۲۰ھ بندۂ حقیر نے بھی مولانا موصوف کی سرپرستی میں یہاں تدریسی خدمت انجام دی ہے، میں نے اس آٹھ ماہ کی مدت میں مدرسہ کے سلسلہ میں مولانا کی جو تگ ودو اور فکرمندی دیکھی ہے اس کو آج بھی جب سوچتا ہوں تو حیرت زدہ ہوجاتا ہوں کہ خدایا ان کے قالب میں وہ کیسی طاقت تھی جو انھیں شب و روز فعال و متحرک رکھتی تھی، وہ پوری مستعدی سے چار پانچ گھنٹے درس بھی دیتے، مطبخ کے نظام کی بھی نگرانی کرتے، دارالاقامہ میں مقیم طلبہ کی راحت وآسائش اور ان کے مشاغل پر بھی نظر رکھتے، مالیات کی فراہمی پر بھی توجہ رہتی، نماز عصر سے عشاء تک کا وقت بالعموم اسی مقصد سے شہر میں گزرتا، علاوہ ازیں جمعرات کا نصف اور جمعہ کا پورا دن اسی کام کے لئے وقف تھا، مدرسہ کی آمدنی کے سلسلہ میں اس درجہ حساس کہ اگر ایک روپیہ بھی ضرورت سے زیادہ کسی سے صرف ہوگیا تو تڑپ اٹھتے تھے، اس وقت ان کے چہرے بشرے سے کرب واضطراب کی کیفیت صاف محسوس ہوتی تھی۔

مولانا کی بے لوث تگ ودو اور مخلصانہ جہد وعمل سے مدرسہ قرآنیہ اپنے عروج وترقی کے سفر میں رواں دواں تھا کہ مسجد ومدرسہ کی انتظامیہ میں کشمکش شروع ہوگئی، جو ختم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی گئی، اگرچہ مدرسہ کے مینیجر جناب عین الحسن کے اثر ورسوخ کی وجہ سے اس آویزش میں مدرسہ کا پلڑا ابھی تک بھاری ہی تھا؛ لیکن تابکے پھر آئے دن کی اس کشاکش سے یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ مدرسہ کے تعلیمی وانتظامی امور کی انجام دہی میں فتور لازمی تھا، اس لئے مولانا اور ان کے رفقاء کار نے باہم یہ فیصلہ کیا کہ کام کے لئے

کسی ایسے مقام کو تلاش کرنا چاہئے جو پوری طرح سے اوروں کے تسلط سے آزاد ہو، چنانچہ مولانا مرحوم اور ان کے استاذ محترم مولانا محمد عثمان کی نظر انتخاب میں اس کے لئے مسجد لال دروازہ (۱) ہر طرح سے موزوں ٹھہری، یہ مسجد اودھ میں شیعوں کے اقتدار اور ملک پر انگریزوں کے تسلط کے وقت سے اذان ونماز سے محروم بالکل ویران، چمگادڑوں کا مسکن بنی ہوئی تھی۔ مسجد کے احاطہ (گھیرے) میں خودرو درختوں اور قد آدم جنگلی گھاسوں کی وجہ سے مسجد کی بجائے بظاہر ایک جنگل معلوم ہوتی تھی، جابجا سے عمارت کے پتھر بھی اکھڑ گئے تھے، اس کی بلند و بالا پیشانی کا بھی ایک حصہ ٹوٹ گیا تھا۔

یہ طے ہو جانے کے بعد کہ اپنی تعلیمی وتدریسی جدوجہد کا مرکز ''مسجد لال دروازہ'' کو بنانا ہے، پہلے مرحلہ میں احاطۂ مسجد سے خودرو پودوں اور گھاسوں کو صاف کیا گیا، مسجد کے مسقّف اندرونی حصہ کی بھی صفائی ستھرائی کی گئی، اور مدرس رکھ کر مکتب کے ساتھ اذان ونماز کا قیام کیا گیا، پھر احاطۂ مسجد کے جنوبی، شمالی اور مشرقی جانب بنے دالانوں میں پاٹیشن قائم کر کے حجرے بنالئے گئے، نیز دیگر ضروری امور کی تکمیل کے بعد تقریباً ۱۳۹۴ھ میں مولانا مع اپنے استاذ محترم و دیگر رفقاء کار کے بڑی مسجد سے منتقل ہو کر ''لال دروازہ'' آ گئے اور ''جامعہ حسینیہ جونپور'' کے جدید نام سے عہد ماضی کے شیراز ہند شہر جونپور میں ایک دینی درسگاہ کی داغ بیل ڈال دی، وہ مسجد جو صدیوں سے اذان ونماز اور ذکر وتلاوت کی آواز کو ترس رہی تھی، ایک مرد مسلم کی نظر التفات نے اس کی تاریخ بدل

---

(۱) اس عالیشان مسجد کو سلطان محمد شرقی کی زوجہ ''رضیہ بیگم'' معروف بہ راجے بی بی نے ۸۰۶ھ میں تعمیر کرایا تھا، مولوی خیر الدین ''جون پور نامہ'' میں لکھتے ہیں ''ایں بی بی۔۔۔ در برابر کوشک بدیع منزل بہ طرف شمال بیرون از شہر پناہ برائے استقامت خود عمارت عالیشان تعمیر کنانید۔۔۔ و در سنہ ہشت صد و شش ہجری متصل عمارت خود مسجدے جامع بکمال رفعت تعمیر کرد و در اطراف آں مدارس و خانقاہ آرستہ آں محلہ را نماز گاہ نام نہادہ (جون پور نامہ قلمی ص ۴۴)

یہ عالیشان مسجد اتر و دکھن ۱۶۴ فٹ پانچ انچ چوڑی اور پچھم پورب ۱۶۲ فٹ لمبی ہے، پیشانی کی بلندی ۴۵ فٹ ہے، مسجد کے اتر، دکھن اور پورب سمت دوہری دالان ہے۔

سلطان بہلول لودھی کے حکم سے جب بی بی راجے کے محلات منہدم کئے گئے تو اسی کے ساتھ مسجد کے گرد بنے مدارس اور خانقاہ بھی مسمار کر دیئے گئے۔

دی، اب اسی ویران مسجد سے پانچ مرتبہ اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہونے لگیں، اور جمعہ وجماعت سے آباد اور قال اللہ وقال الرسول کے جاں نواز زمزموں سے معمور ہوگئی۔

مولانا محمد مسلم رحمہ اللہ نے ''جامعہ حسینیہ جونپور'' کی تنظیم وترقی میں اپنی جملہ صلاحیتوں اور پوری توانائیوں کو جھونک دیا، اور چند ہی سالوں میں اسے عروج وترقی کے اس مقام پر پہنچادیا کہ وہ قدیم ومشہور مدارس کی صف میں کھڑا ہوگیا، ابتداء میں ایک عرصہ تک احاطۂ مسجد کی دالانوں میں بنائے گئے حجرے طلبہ کی رہائش کے کام آتے رہے، اور مسجد وصحن مسجد میں اسباق ہوا کرتے تھے، لیکن جلد ہی مسجد سے متصل جانب شمال ایک قطعۂ اراضی خرید کر اس میں درسگاہیں اور طلبہ واساتذہ کی رہائش کے لئے کمرے تعمیر کر لئے گئے، یہ مکمل عمارت مولانا مرحوم کے مجوزہ نقشہ کے مطابق بنائی گئی ہے، جو تعمیر میں مولانا کے حسنِ ذوق کا پتہ دیتی ہے، ضرورت کے مطابق اس خوبصورت عمارت کے وجود میں آجانے کے بعد ''جامعہ حسینیہ'' اپنی تدریسی واقامتی ضرورتوں کے بارے میں خود کفیل ہوگیا۔

مولانا مرحوم گردوپیش سے بے فکر اپنے اس نہال تازہ کو تناور درخت بنانے میں ہمہ تن مصروف عمل تھے کہ زمانہ قیامت کی چال چل گیا، امام ابویوسف رحمہ اللہ کے تذکرہ میں ہے کہ ایک موقع پر اپنے ایک تلمیذ رشید کے طرز عمل سے متاثر ہوکر انھوں نے یہ شعر پڑھا تھا ؎

اعلمه الرماية كل يوم   ولما اشتد ساعده رماني

خلاف توقع مولانا مرحوم کو بھی اسی نوع کے تجربہ سے گزرنا پڑ گیا، جس کی بناء پر وہ اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ ''جامعہ حسینیہ'' کو خیر باد کہہ کر گھر چلے گئے، یہ سانحہ غالباً ۱۴۰۵ھ میں پیش آیا۔

کیا اس لئے تقدیر نے چنوانے تھے تنکے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگادے

یہ ایک نہایت سنگین حادثہ تھا معمولی قلب وجگر کا آدمی تو شاید اسے برداشت ہی نہ

کر پاتا، مگر مولانا محمد مسلم صاحب بڑے عزم و حوصلہ کے مالک تھے، وہ اس غم بیکراں کو بھی انگیز کر گئے، اور آگے سفر کے لئے منصوبہ بنانے کی فکر میں لگ گئے۔

ادھر جب جمعیۃ علماء ہند کے صدر گرامی قدر کو یہ خبر لگی کہ مولانا محمد مسلم صاحب نے جامعہ حسینیہ جون پور سے تعلق ختم کرلیا ہے تو انھیں اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کا اچھا موقع مل گیا، چونکہ حضرت صدر محترم، مولانا کی فعال و متحرک شخصیت سے بیحد متاثر اور ایک عرصہ سے جمعیۃ علماء ہند کے لئے ان کی خدمات حاصل کرنے کو سوچ رہے تھے، اس لئے انھوں نے احقر سے فرمایا کہ مولانا سے بات کر کے انھیں آمادہ کرو کہ تنظیم و ترقی کے ناظم کی حیثیت سے وہ دہلی جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں آجائیں۔

مولانا مرحوم کو خانوادۂ مدنی بالخصوص حضرت فدائے ملت سے جو بے پناہ تعلق خاطر تھا، اس بناء پر وہ اس کے لئے آمادہ تو ہو گئے مگر ساتھ ہی مجھ سے اس خدشہ کا ظہار بھی کیا کہ میں حضرت مولانا کی توقعات پر پورا اتر بھی سکوں گا؟ غرض وہ حضرت صدر محترم کی خواہش کے احترام میں دہلی دفتر میں آگئے، لیکن اب تک کی ساری زندگی مدرسہ کے ماحول میں بسر ہوئی تھی، اور مدرسہ ہی ان کا مزاج بن چکا تھا، اس لئے اس نئے ماحول سے ''جمعیۃ علماء'' کے ساتھ مکمل طور پر فکری و قلبی ارتباط کے باوجود اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں کر پائے، مجھ سے اس عرصہ میں جب بھی ملاقات ہوتی تو بس یہی کہتے کہ حضرت مولانا کو کسی طرح راضی کر کے مجھے یہاں سے چھٹی دلا دو، بالآخر حضرت مولانا نے خوشی خوشی انھیں اجازت دیدی اور وہ دلی سے اپنے گھر چلے آئے۔ اور ستمبر ۱۹۸۶ء م ۱۴۰۷ھ کی کسی تاریخ میں ایک عظیم الشان اجتماع میں محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، فدائے ملت مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند وغیرہ کے ہاتھوں اپنے آبائی وطن بھہور میں ''جامعہ رشیدیہ بھہور'' کا سنگ بنیاد رکھوایا اور پھر جدید مدرسہ کے خاکہ میں رنگ بھرنے کی جدوجہد میں جٹ گئے، اور دیکھتے دیکھتے جامعہ رشیدیہ کی نہایت دیدہ زیب عمارت کھڑی کردی گاؤں کا ایک مکتب ان کی مساعی جمیلہ سے ایک اچھا خاصا عربی مدرسہ بن گیا، اور یہ سب اس سیر چشمی اور حوصلہ کی بلندی کے ساتھ کیا کہ وہ جامعہ رشیدیہ کے ن

صدر مدرس تھے اور نہ مہتمم، کسی عہدہ کو قبول ہی نہیں کیا، یہی معاملہ انھوں نے جامعہ حسینیہ جون پور کی زندگی میں بھی کیا کہ جامعہ حسینیہ میں سب کچھ انھیں کا کیا ہوا ہے، لیکن وہ نہ مہتمم تھے نہ صدر مدرس بلکہ ایک مخلص و بے لوث خادم اور بس۔

مولانا مرحوم اپنے مزاج وطبیعت کے مطابق پورے انشراح قلب اور دلجمعی کے ساتھ ''جامعہ رشیدیہ'' کی ہمہ جہت خدمت میں مصروف کار تھے کہ ۲۳ رمحرم الحرام ۱۴۱۴ھ م ۱۴؍ رجولائی ۱۹۹۳ء کو آپ پر فالج کا حملہ ہوا، علاج کے لئے اعظم گڈھ شہر میں لائے گئے، پھر یہاں سے ڈاکٹروں کے مشورہ سے میڈیکل کالج لکھنؤ لے جائے گئے، آخر وہیں ۲۹ رمحرم مطابق ۲۰ رجولائی کو زندگی کی راہ میں رواں دواں مسافر نے منزل پر پہنچ کر آخری دم لیا۔ آج آرام سے سونا میری تقدیر میں تھا۔

مولانا مفتی محمد یٰسین مبارک پوری

حضرت مولانا مفتی محمد یٰسین بن شیخ عبدالسبحان محلہ پرانی بستی قصبہ مبارپور ضلع اعظم گڈھ کے ایک معزز خاندان کے چشم وچراغ تھے۔

لگ بھگ ۱۳۲۲ھ میں آپ کی پیدائش ہوئی ''چراغ حسن'' سے سن ولادت برآمد ہوتا ہے، ابتدائی تعلیم جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں حاصل کی، اس وقت ضلع کے مشہور اور نہایت باصلاحیت عالم حضرت مولانا علی احمد کوئریا پاری وہاں مدرس تھے، مفتی محمد یٰسین صاحب مولانا کوئریاپاری سے بہت مانوس تھے، اس لئے جب وہ احیاء العلوم سے علیحدہ ہوکر ''ناصر العلوم'' گھوسی میں مدرس ہو گئے تو مفتی صاحب بھی مدرسہ ناصر العلوم میں چلے گئے اور پانچ سال مسلسل مولانا علی احمد صاحب کی خدمت میں رہ کر مروّجہ نصاب کی متوسطات تک کتابیں پڑھیں، کچھ دنوں تک حضرت مولانا ابوالحسن عراقی مئوی سے بھی مئوناتھ بھنجن میں پڑھا، پھر آگے کی تعلیم کے لئے شوال ۱۳۴۲ھ کو دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے لیا، وہاں تین سال تک پوری توجہ ومحنت سے انتہائی کتابیں پڑھ کر ۱۳۴۵ھ میں فارغ التحصیل ہوگئے، آپ کے دیوبند کے اساتذہ میں حضرت علامہ

انورشاہ محدث کشمیری متوفی ۱۳۵۲ھ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی متوفی ۱۳۶۹ھ، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی متوفی ۱۳۷۴ھ اور حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی متوفی ۱۳۸۷ھ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے نمایاں اساتذہ یہ ہیں: مولانا محمد محمود معروفی، مولانا شکر اللہ مبارک پوری، مولانا علی احمد کوئریاپاری، مولانا نعمت اللہ مبارک پوری۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد آپ کو درج ذیل خصوصی سارٹیفکیٹ دیا گیا۔

۱۲۱۶ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ سارٹیفکیٹ منجانب دارالعلوم دیوبند

''ہم تصدیق کرتے ہیں کہ مولوی محمد یٰسین ولد شیخ عبدالسبحان صاحب ساکن مبارکپور ضلع اعظم گڈھ ۶/شوال المکرم ۱۳۴۲ھ کو بغرض تحصیل علوم عربیہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، اور تقریباً تین سال رہ کر علوم مندرجہ ذیل:

تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، ادب، منطق، فلسفہ، ہیئت کو نہایت محنت وشوق سے پڑھا، امتحانات سالانہ وغیرہ میں بہت اچھی کامیابی حاصل کرتے رہے، زمانۂ تعلیم میں اساتذۂ کرام واراکین مدرسہ ان سے خوش ورضامندرہے، وہ چال چلن کے نیک، ہونہار ومستعد شخص ہیں، وہ اپنی لیاقت علمی واخلاقی حیثیت سے اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کو دارالعلوم کی جانب سے ایک سارٹیفکیٹ دیا جائے، اور اس میں ظاہر کردیا جائے کہ جو خدمات علمیہ وغیرہ ان کے سپرد کی جائیں گی وہ ان کو مستعدی وخوش اسلوبی سے انجام دے کر ہمیشہ نیک نامی حاصل کرتے رہیں گے۔''

محمد طیب غفرلہ نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند

۱۴/رجب المرجب ۱۳۴۵ھ

اس سارٹیفکیٹ کے علاوہ جو عمومی سند فراغ دارالعلوم سے ملی اس کا نمبر (۱۲۸۵) اور تاریخ اجراء ۱۴/ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ ہے، اس سند پر بھی جلی خط میں ''قادر علی الافادۃ والاستفادہ'' کی شہادت درج ہے۔ اور کتابوں کی تفصیل جو دارالعلوم میں

پڑھیں یہ ہے، تفسیر بیضاوی، بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف، ابوداؤد شریف، نسائی شریف، طحاوی، ابن ماجہ، مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد، ہدایہ اخیرین، درمختار، توضیح تلویح، مسلم الثبوت، امور عامہ، دیوان متنبی، حمد اللہ، قاضی مبارک، میر زاہد رسالہ مع غلام یحییٰ، صدرا، شمس بازغہ، تصریح، شرح چغمینی۔

فراغت کے بعد درس وتدریس کے مشغلہ کو اختیار کیا، اور بحیثیت مدرس عربی چند ماہ پٹنہ بہار کے کسی مدرسہ میں درس دیا، اس کے بعد موضع ابراہیم پور میں (جو مبارکپور سے جانب مشرق تین میل کے فاصلے پر ہے) بھی چند ماہ کے لئے مدرس ہوئے، یہاں صرف فارسی اور عربی ابتدائی تک ہی تعلیم تھی، پھر یہاں سے ۱۳۴۶ھ میں اپنی مادر علمی جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں مدرس منتخب ہوئے، پھر تو ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے احیاء العلوم ہی میں پوری زندگی گزار دی اور ابتدائی کتابوں سے لے کر نصاب کی انتہائی کتابوں تک پڑھایا، آخر میں آپ کے زیر درس صرف صحیح بخاری جلد ثانی رہتی تھی بقیہ اوقات افتاء کے کام میں مصروف رہتے تھے۔

احیاء العلوم میں مختلف عہدوں پر فائز رہے، شوریٰ کے ممبر، ناظم تعلیمات، صدر المدرسین اور مفتی جامعہ، مفتی صاحب ایک کامیاب مدرس تھے ان کا درس نہایت مقبول تھا، جس نے بھی ان کے آگے زانوے تلمذ تہہ کیا وہ ان کے درس کی تعریف میں رطب اللسان ہو گیا۔ اسی کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے مفتی بھی تھے، فتوی نویسی میں ان کو اپنے دیار ہی میں نہیں پورے ملک میں اعلیٰ مقام حاصل تھا، فتوی کی عبارت ایسی آراستہ و پیراستہ اور مہذب ہوتی کہ کہیں ایک لفظ بھی گھٹانے بڑھانے کی گنجائش نہیں ہوتی تھی، فتویٰ نویسی میں ان کی ذات سند کی حیثیت رکھتی تھی، دور و دراز مقامات سے کثرت سے استفتاء آتے تھے۔

مسائل دریافت کرنے کے لئے قصبہ و بیرون قصبہ سے برابر لوگ آتے رہتے وہ سب کو تشفی بخش جواب دیتے، مسائل کا استحضار تھا، مگر سائل کو زبانی جواب دینے کے ساتھ اطمینان قلب کے لئے کتاب کی عبارت اور حوالہ بھی ضرور دکھا دیتے، مفتی صاحب نے

افتاء کی خدمت ۱۳۵۰ھ سے شروع کردی تھی، لیکن باقاعدہ نقول فتویٰ کے رجسٹر کا اہتمام دس سال بعد ۱۳۶۰ھ سے کیا، اس لئے ان دس سالوں کے فتاوے محفوظ نہیں ہیں، بقیہ سارے فتوی کی نقل رجسٹر میں محفوظ ہے، جنھیں اگر مرتب کر کے شائع کیا جائے تو وہ دسیوں جلد پر مشتمل ہوں گے۔

احیاء العلوم کے اس زمانہ کے ناظم حضرت مولانا شکر اللہ صاحب اپنی طویل بیماری کی سبب بغرض علاج لکھنؤ میں مقیم تھے، تو مفتی صاحب عیادت کے لیے لکھنؤ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت مولانا شکر اللہ رحمہ اللہ نے مفتی صاحب کو جو وصیت فرمائی تھی، ماہنامہ الفرقان بریلی کے شمارہ ربیع الاوّل ۱۳۶۱ھ میں شائع ہوئی تھی، جو حسب ذیل ہے:

(۱) ہمیشہ دینی کام کرنا، (۲) تم سے مجھ کو بہت فائدہ پہنچا خصوصاً فتویٰ میں، (۳) مسائل میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مدظلہ سے ہمیشہ رجوع کرنا اور ان پر اعتماد کرنا، (۴) حضرت مولانا حسین احمد صاحب، وحضرت مولانا اشرف علی صاحب مدظلہما کو ہمیشہ ایک نظر سے دیکھنا، دونوں ملت کے مسلمہ بزرگ ہیں، میرے دل میں ان دونوں حضرات کی قدر و منزلت یکساں ہے۔

اس وصیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم کے ناظم حضرت مولانا شکر اللہ علیہ الرحمہ کو مفتی صاحب کی علمی استعداد اور طبیعت کی سلامتی پر مکمل اعتماد تھا اور مدرسہ کے لئے ان کے وجود کو ضروری سمجھتے تھے۔

قصبہ مبارکپور میں مفتی صاحب کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ ان کی حیثیت وہاں کے گویا قاضی کی ہوگئی تھی، نکاح پڑھانے، نماز جنازہ پڑھانے اور جمعہ وعیدین کی امامت کی ذمہ داری انھیں کے سر تھی۔

مفتی صاحب کا اوڑھنا بچھونا بس مدرسہ ہی تھا، شب و روز کے چوبیس گھنٹے مدرسہ ہی میں گزرتے تھے مشکل ہی سے ایک، آدھ گھنٹہ کے لئے گھر جاتے تھے، طلبہ کی تعلیم وتربیت کا حد درجہ خیال رکھتے تھے جو طالب علم بھی سامنے آجاتا، اس سے یہ ضرور دریافت

کرتے کہ کیا پڑھتے ہو؟ کتاب کا نام بتانے پر اس کتاب سے زبانی کوئی سوال کرتے اگر جواب دے دیتا تو بہت خوش ہوتے ورنہ پھر اسے محنت سے پڑھنے کی ترغیب دیتے۔

خود ان کی علمی ریاضت کا حال یہ تھا کہ پیدائشی طور پر نحیف الجثہ اور کمزور ہونے کے ساتھ بیمار بھی رہتے تھے، اس کے باوجود کتابوں کا مطالعہ پوری تندہی کے ساتھ جاری تھا، اپنی درسگاہ میں کتابوں کے انبار کے درمیان بیٹھے مصروف مطالعہ رہتے، دائیں بائیں تپائیوں پر بھی کتابیں لدی رہتی تھیں، مزید براں بڑی بڑی چند الماریوں میں بھی کتابیں بھری رہتی تھیں گویا ان کی درسگاہ کیا تھی ایک اچھا خاصا کتب خانہ تھا، اور مفتی صاحب دنیا ومافیہا سے بے نیاز انھیں کتابوں میں محو رہتے تھے۔

عصر حاضر کے عظیم اسلامی مؤرخ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری رحمہ اللہ جو مفتی صاحب کے تلامذہ میں سے تھے، ان کے فضائل وکمالات کا جب تذکرہ کرتے تو پھر ایسا لگتا کہ یہ سلسلہ اب ختم نہیں ہوگا، ان کی طرز تدریس ان کی علمی بصیرت، مسائل فقیہ پر ان کی وسعت نظر، ان کی امانت ودیانت، دینی معاملات میں غایت درجہ احتیاط ان کی شرافت نفس بایں ہمہ کمالات دنیاوی امور میں ان کی یک گونہ سادہ لوحی، ہر ایک کو اس طرح مزہ لے لے کے بیان کرتے گویا ان کا اصل موضوع حیاتِ مفتی یٰسین ہی ہے۔

ایک تو پیدائشی طور پر نحیف ونزار تھے ہی اس پر مستزاد ضعف پیری اور مسلسل بیماریوں کا حملہ جس کی وجہ سے جب بالکل نڈھال ہو گئے تو بستر علالت پر پڑ گئے تقریباً دس ماہ اسی حالت میں گھر پر گزار کر حدیث وفقہ کا یہ مخلص خادم اور اپنی مادر علمی کا عاشق زار رات کے ساڑھے بارہ بجے ۲۱ر محرم ۱۴۰۴ھ م ۲۹ر اکتوبر ۱۹۸۳ء کو ابدی نیند سو گیا۔

عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا

مولانا محمد یونس سنجرپوری نندانوی

مولانا محمد یونس اصلاحی بن حیدر حسین ایک زمیندار اور پڑھے لکھے خاندان کے چشم وچراغ تھے، ان کے دادا شیخ ولی اللہ فارسی کے اچھے عالم تھے، اور ان کے چچا صفدر حسین

ورسیر تھے، زمین کی پیمائش کے ماہر تھے، ایک عرصہ تک ملایا (ملیشیا) میں یہی کام کرتے رہے، مولانا محمد یونس اپنے آبائی وطن سنجرپور ضلع اعظم گڈھ میں ۵ رنومبر ۱۹۱۲ء م ۱۳۳۱ھ کو پیدا ہوئے۔ سنجرپور ضلع اعظم گڈھ کا ایک مشہور گاؤں ہے جو شہر اعظم گڈھ سے جانب مغرب تقریباً ۱۵، ۱۶ کلومیٹر پر واقع ہے۔

مولانا محمد یونس کی ابتدائی تعلیم سنجرپور ہی میں ہوئی، اعلیٰ تعلیم کے لیے ۵ رنومبر ۱۹۲۴ء م ۱۳۴۳ھ کو مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں درجہ اوّل عربی میں داخلہ لیا اور وہیں اپنی تعلیم مکمل کر کے تقریباً ۱۹۳۱ء میں فارغ التحصیل ہو گئے، مولانا کے اساتذہ میں مولانا شبلی متکلم، مولانا محمد سعید ندوی، مولانا عبدالصمد ندوی، مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا امین احسن اصلاحی جیسے مشہور علماء وفضلا شامل ہیں۔

فراغت کے بعد مولانا حمید الدین فراہیؒ انھیں اپنے گھر کے بچوں کی تعلیم کے لیے پھریہا لے گئے، جہاں انھوں نے تقریباً چھ ماہ مولانا کے بچوں کو پڑھایا، مولانا ابوالحسن علی اصلاحی سابق ناظم مدرستہ الاصلاح سرائے میر مولانا محمد یونس مرحوم کے اسی دور کے شاگردوں میں سے ہیں، پھریہا سے اعظم گڈھ جناب مولوی اقبال سہیل مرحوم کے یہاں چلے گئے، اعظم گڈھ کے قیام کے زمانہ میں بچوں کو پڑھاتے بھی تھے اور خود کتابت سیکھتے رہے اور تھوڑی ہی مدت میں فن کتابت میں ایسی مہارت پیدا کرلی کہ ان کا شمار شہر کے اچھے کاتبوں میں ہونے لگا، اعظم گڈھ میں قیام دراصل فن کتابت کی تحصیل ہی کے لیے تھا، اس لیے اس میں کمال حاصل ہو جانے کے بعد وہ اپنے سسرال نندأوں کے مکتب میں آگئے، یہاں تقریباً دو برس بچوں کو پڑھانے کے بعد مہاراشٹر کے شہر پونا چلے گئے اور پھر تیبھا پریس پونا میں کتابت کے لیے ان کا تقرر ہو گیا، پونا میں انھوں نے تیس سال کی طویل مدت کتابت کے مشغلہ میں گذار دی، پھر وہاں سے علیحدہ ہو کر گھر چلے آئے تو جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کے ناظم مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم نے انھیں اپنے مدرسہ میں رکھ لیا جہاں وہ تدریس کے ساتھ طلبہ کو کتابت بھی سکھاتے تھے، نیز چھوٹے بچوں کی نگرانی بھی کرتے تھے، مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم ان کی کارکردگی اور حسن عمل سے کافی متاثر

تھے، چنانچہ ان کی وفات پر اپنی تعزیتی تحریر میں لکھتے ہیں:

"آخر عمر میں وہ جامعۃ الرشاد آگئے تھے اور بڑی محنت اور خلوص سے اس کی خدمت کی، عام اصلاحیوں کے برخلاف وہ انتہائی درجہ کے نہ صرف صوم وصلاۃ کے بلکہ نوافل اور اذکار کے بھی پابند تھے، تبلیغی جماعت کے کاموں سے خاص شغف تھا، راقم الحروف سے ان کو بڑا قلبی تعلق تھا۔ (کاروان رفتگاں ص ۱۳۰)

آخر میں اپنی مادر علمی مدرسۃ الاصلاح میں آگئے تھے، اور بحیثیت استاذ فارسی کے یہاں پندرہ سال تک تدریسی خدمات انجام دیں، یہاں بھی فارسی کی کتابیں پڑھانے کے ساتھ طلبہ کو خوش خطی کی مشق بھی کراتے تھے، اور دینیات وغیرہ کے بھی بعض مضامین پڑھاتے تھے، بعد میں پیرانہ سالی کی بناء پر یہاں سے مستعفی ہوکر نندواؤں چلے آئے، جس کو انھوں نے اپنا وطن بنالیا تھا، مولانا محمد یونس مرحوم ضلع اعظم گڈھ کے مشہور عالم مولانا محمد شبلی نندانوی کی صاحبزادی سے منسوب تھے، مولانا نندانوی کے چونکہ ان کے علاوہ کوئی اولاد نہیں تھی، اس لیے مولانا یونس کی اہلیہ ہی ان کی جائیداد اور مکان وغیرہ کی وارث ہوئیں، اسی بناء پر انھوں نے سنجرپور سے نقل مکانی کرکے نندواؤں میں اقامت اختیار کرلی تھی، اور خود مولانا نے بھی اپنا وارث دو بیٹیوں کو چھوڑا، جن میں سے ایک کا عقد مولانا عباد علی بن مولانا محمد سجاد سابق استاذ مدرسہ بیت العلوم سے ہوا تھا، اور دوسری صاحبزادی مولانا مفتی محمد شعیب سے منسوب تھیں، مولانا مرحوم کے یہ دونوں داماد بھی منزل حیات طے کرکے اپنے بزرگ خسر کے پاس پہنچ گئے ہیں۔

مولانا نے چونکہ تعلیم مدرسۃ الاصلاح میں پائی تھی، جہاں کے اکثر اساتذہ جماعت اسلامی سے وابستہ تھے، اس لیے ابتداء میں یہ بھی جماعت سے متعلق رہے، بعد میں اس سے ذہنی فکری ہر اعتبار سے الگ ہوگئے تھے، اور اپنے آپ کو تبلیغی جماعت سے وابستہ کرلیا تھا، یہ وابستگی آخر تک بحالہ قائم رہی۔

مولانا مرحوم قناعت پسند اور کفایت شعار تھے، اس لیے انھیں زندگی کے کسی مرحلے میں بھی معاش کی طرف سے کوئی پریشانی ووقت پیش نہیں آئی، طبیعت کے بیحد سخی

تھے، اپنی آمدنی کا ایک اچھا خاصا حصہ وہ غریب طلبہ پر بغیر کسی اظہار کے خرچ کر دیا کرتے تھے، وہ جس مجلس میں بیٹھتے وہی میر مجلس ہوتے، اپنے علمی لطائف، بزرگوں کے واقعات اور اپنے ذاتی تجربات کے تذکروں سے سارے اہل مجلس کی توجہ اپنی جانب پھیر لیتے تھے، اگست ۱۹۹۲ء م (۱۴۱۳ھ) میں اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر رہگرائے عالم آخرت ہو گئے۔

مولانا مشتاق احمد اساڑھوی اصلاحی

مولانا مشتاق احمد اصلاحی بن شمس الحق کی ولادت ۱۹۱۴ء م ۱۳۳۳ھ میں اعظم گڈھ کے ایک معروف گاؤں اساڑھا میں ہوئی، قرآن مجید ناظرہ، حفظ وغیرہ مکتبی تعلیم اپنے گاؤں کے مکتب میں حافظ عظمت علی نوناروی سے حاصل کی، پھر موضع گوسڑی اور نندا ؤں کے پرائمری اسکول سے درجہ سوم و چہارم پاس کیا، بعدازاں ۱۹۳۱ء م ۱۳۵۰ھ میں بعمر سترہ سال مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے درجہ چہارم مکتب میں داخلہ لیا، اور آٹھ برس یہاں زیر تعلیم رہ کر ۱۹۳۹ء م ۱۳۵۸ھ میں ممتاز نمبروں کے ساتھ سند فراغت حاصل کی، مولانا کے اساتذہ میں مولانا شبلی متکلم، مولانا عبدالصمد ندوی، مولانا محمد سعید ندوی، مولانا اختر احسن اصلاحی اور مولانا امین احسن بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

فراغت کے بعد مدرسۃ الاصلاح ہی میں معلم و مدرس مقرر ہو گئے، مدرسۃ الاصلاح میں درس و تدریس کا سلسلہ ۱۹۴۶ء م ۱۳۶۶ھ تک جاری رہا، پھر بعض وجوہ سے یہاں سے علیحدہ ہو کر اپنے رفیق درس اور یار غار مولانا شمیم احمد اصلاحی کی رفاقت میں بسلسلۂ تجارت بہرائچ میں رہے، مولانا نے وہاں ایک مدرسہ بھی قائم کر لیا تھا، اب پتہ نہیں کہ اس کا وجود ہے یا اپنے بانی کی طرح وہ بھی وادیٔ فنا میں تحلیل ہو گیا۔

بہرائچ میں بارہ سالہ قیام کے بعد کاروبار تجارت سے دست کش ہو کر اپنے پہلے مشغلہ درس و تدریس کی جانب رجوع کیا، اور مولانا نجم الدین اصلاحیؒ کی طلب پر مولانا آزاد تعلیمی مرکز، اسرہٹہ ضلع جون پور آ گئے، لیکن یہاں زیادہ دنوں نہیں رہ سکے، اس لئے

کہ ان کی مادر علمی نے اپنا آغوش محبت ان کے لیے پھر وا کر دیا تھا اس لیے وہ اسرہٹہ سے سرائے میر آگئے، مگر چندے یہاں قیام کر کے پھر اسرہٹہ چلے آئے، اسرہٹہ سے دوبارہ پھر انھیں مدرسۃ الاصلاح میں دعوتِ درس دی گئی تو پھر یہاں آگئے، اس طرح انھوں نے وقفہ کے ساتھ تین بار مدرسۃ الاصلاح میں تدریسی خدمات انجام دیں، تیسری اور آخری بار ۱۹۸۹ء م ۱۴۱۰ھ میں یہاں سے رٹائر ہو گئے، رٹائر ہونے کے بعد بالترتیب لونیا ڈیہہ، طوی، اور راجہ پور سکرور کے نسواں مدرسوں میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا، پھر جب ضعف پیری کی بناء پر نسیان کا عارضہ لاحق ہو گیا تو تعلیمی وتدریسی سلسلے کو چھوڑ کر گھر پر رہنے لگے تھے۔

مولانا کی علمی استعداد بڑی ٹھوس تھی، جہاں بھی رہے ایک کامیاب معلم ومدرس کی حیثیت سے نمایاں رہے، مولانا دیگر بہت سے اساتذہ کی طرح یک فنّی نہیں تھے بلکہ نصاب میں شامل جملہ فنون کو بڑی شان سے پڑھاتے تھے، وہ صرف طلبہ واساتذہ یعنی مدرسہ کے حلقہ میں ہی مقبول وپسندیدہ نہیں تھے؛ بلکہ اپنے گاؤں اور دیار میں بھی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، اصلاح معاشرہ میں ہمیشہ کوشاں رہے، ان کے گاؤں میں بر بنائے جہالت سنیوں کے یہاں بھی عشرۂ محرم میں تعزیہ داری وغیرہ کا رواج تھا، خود ان کے والد بھی تعزیہ دار تھے، مولانا نے جب اس مذموم بدعت سے لوگوں کو منع کیا تو خود ان کے والد ان کے مقابلہ میں آگئے، تو انھوں نے والد سے قطع تعلق کو منظور کر لیا، مگر اس بدعت سے چشم پوشی گوارا نہیں کی اور اس وقت تک گھر نہیں آئے جب تک کہ ان کے والد نے اس بدعت سے توبہ نہ کر لی، انھیں اپنے گاؤں میں گویا قاضی کی حیثیت حاصل تھی، سب لوگ اپنے مسائل ومعاملات میں انھیں کی طرف رجوع ہوتے تھے، اور ان کے مشورے وفیصلے کو برضا ورغبت قبول کرتے تھے۔

مولانا کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے گاؤں کے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے ''تنظیم القوم'' کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، اور جب تک زندہ رہے اس کے استحکام وترقی میں کوشاں رہے، مولانا کم سخن، راست گو، اور بڑے بامروت انسان تھے،

تہجد ونوافل اور تلاوت واذکار کے پابند تھے، طعام ولباس میں سادگی کو پسند کرتے تھے، ان کے پسندیدہ اخلاق وعادات اور کریمانہ خصائل سے طلبہ، ذمہ داران مدرسہ، گاؤں اور دیار کے لوگ سب ہی ان کے ساتھ عزت واحترام سے پیش آتے تھے، مولانا ۱۲/۱اکتوبر ۱۹۹۷ء کو علیل ہوئے اور ۱۸/۱اکتوبر ۱۹۹۷ء م ۱۸ ۱۴۱۸ھ کو بعد نماز ظہر ان کی وفات ہوگئی۔

(سالانہ مجلہ انجمن طلبہ مدرستہ الاصلاح، شمارہ: ۱۰، ۱۹۹۷ء)

مولانا نجم الدین اصلاحی سکروروی

مولانا نجم الدین، بن شیخ منصب علی، بن شیخ قدرت علی تقریباً ۱۹۰۴ء مطابق ۱۳۲۲ھ میں ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں راجہ پور سکرور میں پیدا ہوئے، راجہ پور سکرور ضلع اعظم گڈھ کا مشہور اور مسلم آبادی کے لحاظ سے ایک بڑا گاؤں ہے۔ اس کی قدیم آبادی موجودہ آبادی سے پورب راجہ پوکھری پر تھی، اسی سے متصل ''ہرکھانگر'' کے نام سے ایک بازار بھی تھا، بعد میں جب سلسلۂ شطاریہ کے مشہور بزرگ علی عاشقاں نے راجہ پور سکرور سے جنوب مغرب میں ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر واقع بستی مرتضیٰ آباد میں ارشاد وسلوک کی بزم آراستہ کی تو یہی مرتضیٰ آباد، سرائے میر کے نام سے ایک بارونق قصبہ بن گیا اور ''ہرکھانگر'' بازار بے رونق ہوکر دھیرے دھیرے ختم ہوگیا۔

راجہ پور سکرور اپنے ابتداے قیام سے زمینداری کے دور تک مسلمانوں ہی کی عملداری میں رہا، اور آج بھی اس میں مسلمانوں کی کثرت ہے، اور اپنے تمدن وتہذیب کے اعتبار سے ضلع کے ممتاز گاؤں میں شمار ہوتا ہے۔

مولانا نجم الدین کے مورث اعلیٰ اصل باشندہ مچھلی شہر ضلع جونپور کے تھے، جو یہاں آکر آباد ہوگئے تھے، آپ کے جدامجد شیخ قدرت علی فارسی کے باصلاحیت عالم تھے، اسی لئے اس زمانہ کے رواج کے مطابق انھیں لوگ ''میاں صاحب'' کہا کرتے تھے، میاں قدرت علی نے اپنے گھر میں ایک مدرسہ قائم کر رکھا تھا، جس سے ایک بڑی تعداد نے فیض پایا، خود مولانا نجم الدین رحمہ اللہ نے بھی فارسی کی ابتدائی تعلیم اسی مدرسہ میں دادا سے

حاصل کی تھی، اور گاؤں کے ایک دوسرے بزرگ حافظ عبدالرحیم کی خدمت میں رہ کر قرآن مجید حفظ کیا تھا، پھر مزید تعلیم کے لئے یکم ستمبر ۱۹۱۷ء م ۱۳۳۶ھ کو مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں درجہ چہارم میں داخلہ لیا، اس وقت مدرسہ میں مولانا امین احسن اصلاحی، اور مولانا اختر احسن اصلاحی بھی پڑھ رہے تھے۔

مولانا نجم الدین مرحوم نے درجہ چہارم سے آخر تک کی تعلیم مدرستہ الاصلاح ہی میں حاصل کی سن فراغت غالباً ۱۹۲۴ء م ۱۳۴۳ھ ہے، مولانا کے اساتذہ میں مولانا شبلی متکلم، مولانا عبدالصمد ندوی، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، مولانا حکیم محمد احمد لُہراوی اور مولانا سعید احمد ندوی جیسے اپنے وقت کے مشہور علماء درس ہیں، مولانا علوم عربیہ میں کامل دستگاہ کے ساتھ فارسی زبان وادب میں مہارت رکھتے تھے۔

اسی زمانہ میں مولانا حمیدالدی فراہی نے جب حیدرآباد کو خیرباد کہہ کر مدرستہ الاصلاح کو اپنی علمی سرگرمیوں کا مرکز بنایا تو مدرسہ کے تعلیمی امور میں اصلاحات کے علاوہ اپنے نہج پر یہاں کے منتہی طلبہ اور اساتذہ کو قرآن مجید کا درس بھی دیتے تھے، اس خصوصی درس میں مولانا نجم الدین بھی شریک ہوتے، اور آیات درس کی قرأت بھی یہی کرتے تھے، مولانا موصوف مدرستہ الاصلاح سے فراغت کے بعد یہیں مدرس مقرر ہو گئے تھے، تدریس کے ساتھ دارالاقامہ میں مقیم طلبہ کی اتالیقی ونگرانی کی خدمت بھی انجام دیتے تھے، ذہین اور ہونہار طلبہ پر وہ خصوصی توجہ دیتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، جماعتِ اسلامی کے مشہور صاحب قلم مولانا صدرالدین کی تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ تھا، مولانا مرحوم کے اصلاحی تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے، جن میں مولانا ابواللیث ندوی سابق امیر جماعت اسلامی ہند، مولانا صدرالدین اصلاحی، مولانا محمد عاصم کوٹلوی اصلاحی، مولانا اظہارالدین اصلاحی بیناپاروی، مولانا داؤد اکبر بمھوری، مولانا عبدالرحمٰن پرواز، مولانا احتشام الدین منڈیاری وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

مولانا نجم الدین رحمہ اللہ جس زمانہ میں مدرستہ الاصلاح میں معلمی کی خدمت انجام دے رہے تھے، مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری کی دعوت پر ملک کے نامور معقولی فاضل

ومحدث مولانا ماجد علی مانوی جونپوری متوفی ۱۳۵۳ھ مدرسہ بیت العلوم میں صحیح بخاری وسنن ترمذی کا خصوصی درس دے رہے تھے، مولانا نجم الدین روزانہ مدرستہ الاصلاح سے یہاں آکر درس حدیث میں شرکت کیا کرتے تھے، اس طرح انھیں بیک وقت اس عہد کے رئیس المفسرین اور رئیس المحدثین سے استفادہ کا شرف حاصل ہے۔

مولانا مرحوم اپنے استاذ خاص علامہ حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد زیادہ دنوں تک مدرستہ الاصلاح پر نہ رہ سکے اور حاجی رشید الدین فراہی کے دور نظامت میں ۱۹۴۰ء م ۱۳۵۹ھ میں یہاں سے مستعفی ہوگئے، پھر تقریباً دو برس گھر پر قیام کے بعد ۱۹۴۳ء میں سدھاری اعظم گڈھ کو اپنی خدمات کا مرکز بنایا، یہاں مولانا کا قیام تقریباً چالیس سال رہا، یہ پورا زمانہ سدھاری کے بابوان کے بچوں کی تعلیم وتربیت، تصنیف وتالیف اور اصلاح معاشرہ کے کاموں میں گزرا، یہ مولانا ہی کی سعی محمود کا نتیجہ ہے کہ سدھاری اور اس کے اطراف واکناف کی بستیوں سے بدعات وخرافات کا زور ٹوٹ گیا، ۱۹۷۱ م ۱۳۹۱ھ میں کبرسنی کی بنا پر سدھاری سے رخصت ہوکر گھر پر رہنے لگتے تھے، اور گھر ہی پر نوے سال کی عمر میں ۱۴/ اگست ۱۹۹۴ء م ۱۴۱۵ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

مدرستہ الاصلاح سے متصل موضع حسن پور میں مولانا نے تقریباً چالیس سال تک جمعہ وعیدین کی امامت کے فرائض بھی انجام دیے اس طویل مدت میں اس قریہ کے سبھی لوگ محبت وعقیدت کے ساتھ ان کے پیچھے نماز جمعہ وعیدین ادا کرتے اور ان کے مواعظ ونصائح سے مستفید ہوتے رہے۔

مولانا نجم الدین ایک پڑھے لکھے دیندار گھرانہ کے چشم وچراغ تھے، اور خود ان کا رجحان بھی شروع سے صلحاء واتقیا کی جانب رہا، ان کے بچپن اور جوانی کے زمانہ میں مولانا سید محمد امین نصیر آبادی اصلاحی وتبلیغی سلسلے میں اعظم گڈھ آیا کرتے تھے، یہاں کے قصبوں اور دیہاتوں میں ان کا وعظ ہوتا تھا، اس کی وجہ سے یہاں ان کے ہزاروں معتقدین ومریدین تھے، مولانا نجم الدین کا گاؤں راجہ پور سکرور ان کا خاص مرکز تھا، وہ یہاں کئی کئی روز قیام کرتے تھے، مولانا نجم الدین کے دادا شیخ قدرت علی ان کے خاص مریدین وعقیدت

مندوں میں تھے، خود مولانا بھی ان کے ایسے گرویدہ تھے کہ "یادگار سلف" کے نام سے ان کی حیات وخدمات پر ایک کتاب لکھی جس کا مقدمہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے لکھا تھا، وہ اپنے مقدمہ میں اس کتاب کے سلسلہ میں لکھتے ہیں: اس کتاب کو جستہ جستہ دیکھا ہے، مؤلف کی متانت تحریر، سنجیدگی، بیان کی خوبی اور معنی کی بلندی سے دل خوش ہوا۔

اس صدی کی چوتھی دہائی میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے مقالات ومضامین نے بہت سے لوگوں کی طرح مولانا نجم الدین کو بھی اپنی جانب مائل کیا، چنانچہ مولانا مودودی نے انھیں کی دعوت پر سرائے میر کا سفر کیا اور ان کے گھر راجہ پور سکرور بھی گئے، لیکن بعد میں بہت سے علماء کی طرح وہ بھی مولانا مودودی اور ان کی تحریک جماعت اسلامی سے برگشتہ ہو گئے تھے۔

مولانا نجم الدین صاحب کے عقیدت ونیاز کا اصل مرکز مولانا حمید الدین فراہی اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی تھے، اول الذکر ان کے استاذ تھے اور ان کے زہد واتقا کی طرح ان کے علم وفضل کے بھی بڑے قائل تھے، اور مؤخر الذکر سے بیعت وارشاد کا تعلق تھا، ان کو وہ تدین وتقویٰ، اور سیرت واخلاق میں صحابہ کا نمونہ کہتے تھے، ان دونوں بزرگوں کا ذکر کرتے تو ان پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی، آنکھیں بھیگ جاتیں، انھوں نے برسوں کی محنت شاقہ کے بعد حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے مکاتیب جمع کر کے اپنے مفید حواشی کے ساتھ چار جلدوں میں شائع کیا، جو ان کا بڑا کارنامہ ہے، جس کی وجہ سے وہ برصغیر کے علماء وصلحاء میں متعارف ہو گئے، چند برس پہلے ان کی آخری کتاب سیرت شیخ الاسلام چھپی تھی، حضرت شیخ الاسلام بھی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے، ان کی دعوت پر راجہ پور سکرور تشریف لاتے اور اہل قریہ اور قرب وجوار کے لوگوں کو مستفیض فرماتے، حضرت ہی کے ایما سے حکومت ہند نے ان کا ماہانہ وظیفہ جاری کر دیا تھا جو انھیں آخری دم تک ملتا رہا۔

مولانا مرحوم کی تصانیف یہ ہیں:

یادگار سلف، دلائل السنن والآثار، مکتوبات شیخ الاسلام چار ضخیم جلدیں، امحاح البدع

واحیاء السنن، انتخاب رباعیات مولانا روم، ترجمہ التبیان فی آداب حملۃ القرآن، دلائل السلوک، دلائل القرآن، احسن العقائد، آموزگار فارسی، اصلی قولِ فیصل، سیرت شیخ الاسلام۔

مولانا موصوف کی بعض کتابیں ورسائل ذرائع کی کمی کی بناء پر تکمیل واشاعت سے محروم رہیں، دلائل القرآن کے بعض حصے ماہنامہ برہان دہلی میں شائع ہوئے، وہ تفسیر ابن جریر طبری کا ملتقط بھی شائع کرنا چاہتے تھے جس کا کچھ حصہ مجلہ الحج مکہ میں چھپا تھا، غالباً یہ کام مکمل نہیں ہو سکا۔

مولانا کا گھر پر اپنا ذاتی کتب خانہ بھی تھا جو، ادب، تفسیر، تاریخ، طبقات وتراجم کی منتخب کتابوں پر مشتمل تھا، شیخ علی عاشقاں سرائے میری کے ذکر میں قلمی کتاب رسالہ عاشقیہ مولفہ شیخ عارف علی کو ۱۹۷۳ء میں میں نے مولانا ہی کے کتب خانہ میں دیکھا تھا اور اس سے بعض اقتباسات نوٹ کئے تھے۔

مولانا مرحوم زندگی بھر علم ودین کی خدمت اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہے، ان کی زندگی سادہ اور فقیرانہ تھی، صبر وقناعت کے خوگر اور حرص وطمع سے نفور تھا، دینی حمیت کی وجہ سے غیر مشروع اعمال پر برہم ہوجاتے تھے، حق کے اظہار میں بڑے جری تھے، مصلحت کوشی اور موقع ومحل کی رعایت ان کی حق گوئی کی راہ میں حائل نہیں ہوتی تھی، قدرے سریع الغضب تھے، مگر اسی سرعت سے یہ غضب نا کی سرد بھی ہوجاتی تھی۔

حق کے اظہار میں ان کے یہاں مصلحت اندیشی یا کسی رورعایت کی گنجائش نہیں تھی۔

معذرت کے ساتھ ایک شکوہ: مولانا نجم الدین اصلاحی مرحوم کو دیکھنے والے ہی نہیں ان سے علمی استفادہ کرنے والوں میں سے بھی ابھی بہت سے اصحاب علم وفہم موجود ہوں گے، کیا ان میں کوئی اس کی شہادت دے سکتا ہے کہ ان کا علمی پایہ کمزور اور ان کی استنادی حیثیت قابل اعتماد نہیں تھی؟ مگر اسے کیا کہا جائے کہ ''ذکر فراہی'' کے مصنف نے ان کی روایات اور اس کے ضمن میں خود انھیں ناقابل اعتبار ٹھہرانے پر بس نہیں کیا؛ بلکہ ان کے حسب ونسب کو بھی مورد بحث ونقد بنایا ہے، جبکہ اقامتِ دین کے ایک داعی کی حیثیت سے انھیں بالخصوص اپنے اس... رویہ پر ہزار بار سوچنا چاہئے تھا، پھر اس کا یہ

پہلو کس قدر افسوسناک ہے کہ ''دائرۂ حمیدیہ مدرستہ الاصلاح'' نے یہ کتاب طبع کی مگر مدرستہ الاصلاح کے اس قدیم سپوت کی اس ناروا کردار کشی پر نکیر کا ایک لفظ بھی کسی رجل رشد وصلاح کے قلم کی نوک پر نہیں آیا، یاللعجب۔

تذکرہ نویسی میں اسی قسم کی روش پر فن رجال کے عظیم و منفرد محقق و ناقد، امام ذہبی نے ایک موقع پر لکھا ہے: ''قد یضرّ نفسه''.

مولانا نیاز احمد عمری سریانوی

مولانا نیاز احمد بن حاجی محمد عمر بن محمد قاسم بن شیخ کتوارو موضع سریاں ضلع اعظم گڈھ میں ۱۹۴۵ء م ۱۳۶۵ھ میں پیدا ہوئے، مولانا عمری کے جد اعلیٰ شیخ کتوارو مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڈھ سے ترک سکونت کر کے سریاں میں آکر آباد ہو گئے تھے، یہاں ان کی اولاد پھلی پھولی، اسی خانوادہ کے مولانا نیاز احمد چشم و چراغ تھے۔

موضع سریاں قصبہ مبارک پور سے شمالِ مشرق میں چند فرلانگ پر واقع ہے، مشہور ہے کہ گورکھپور اور کچھار کی طرف جانے والے قافلوں کے لئے یہاں متعدد سرائیں تھیں، جن میں مسافر ٹھہرا کرتے تھے، بعد میں کثرت استعمال سے یہی سرائیں، سریاں ہو گئیں، یہاں قدیم زمانے میں راج بھر قوم کی بہت بڑی اور خوش حال آبادی تھی، اس کے آثار اب بھی نمایاں ہیں۔

مولانا نیاز احمد نے خانگی پڑھائی اپنے گھر اور گاؤں میں مکمل کر کے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں داخلہ لیا، اور فارسی سے عربی متوسطات تک کی تعلیم یہیں مولانا مفتی محمد یٰسین، مولانا عبدالمنان، مولانا قاری ظہیرالدین وغیرہ اساتذۂ احیاء العلوم سے حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۹۶۱ء م ۱۳۸۱ھ کو دیوبند ضلع سہارنپور کا علمی سفر کیا اور دارالعلوم دیوبند میں درجہ ششم میں داخلہ لیا، اور مولانا سید اختر حسین دیوبندیؒ، مولانا نصیر احمد خاں بلند شہریؒ، مولانا محمد نعیم دیوبندیؒ، مولانا محمد حسین بہاریؒ، مولانا معراج الحق دیوبندیؒ، وغیرہ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ سے درجہ ششم، ہفتم کی کتابیں دو سال میں

پڑھیں اور ۱۳۸۳ھ م ۱۹۶۳ء میں دورۂ حدیث کی کتابیں ایک سال میں پڑھ کر ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹۶۴ء میں فارغ ہوکر دارالعلوم دیوبند سے سندِ فضیلت حاصل کی۔

دورۂ حدیث کی کتابیں اوران کے اساتذہ کی تفصیل حسب ذیل ہے:

صحیح بخاری مکمل: حضرت مولانا سید فخر الدین مرادآبادی شیخ الحدیث۔

سنن ترمذی جلد اوّل: حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی صدر المدرسین

صحیح مسلم وسنن ابن ماجہ باستثنائے چند اسباق اوّل وآخر: حضرت مولانا بشیر احمد خاں بلندشہری۔

سنن ابن ماجہ کے اوّل وآخر کے چند اسباق: حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

سنن ابوداؤد مکمل، وسنن ترمذی جلد ثانی، وشمائل ترمذی: حضرت مولانا سید فخر الحسن مرادآبادی۔

معانی الآثار للطحاوی: حضرت مولانا اسلام الحق کوپا گنجی اعظمی۔

سنن نسائی: حضرت مولانا سریف حسن دیوبندی۔

مؤطائے امام مالک ومؤطا امام محمد: حضرت مولانا عبدالاحد دیوبندی۔

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد شہر میرٹھ کے ایک مدرسہ سے تدریس کا آغاز کیا، وہاں دوسال رہ کر غازی پور مدرسہ دینیہ میں آگئے، یہاں بھی تقریباً تین چار سال تدریسی خدمات انجام دیں، پھر یہاں سے علیحدہ ہوکر ۱۳۸۹ھ م ۱۹۶۹ء میں اپنی مادر علمی جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور کی آغوش میں آگئے اور اسی کے پہلوئے عزت میں عمر ناتمام کو تمام کیا۔

مولانا موصوف تیس سال تک جامعہ کے استاذ حدیث رہے، عام طور پر صحیح مسلم، صحیح بخاری جلد ثانی، جلالین، مقامات حریری وغیرہ کتابیں آپ کے زیر درس رہیں، آخر میں صدارت تدریس کا منصب بھی آپ کو تفویض ہوگیا تھا، اور اسی منصب جلیل پر قائم رہتے ہوئے یکم صفر ۱۴۲۰ھ م ۱۸؍مئی ۱۹۹۹ء یوم دوشنبہ کو رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے۔

مولانا مرحوم دورۂ حدیث میں اس بندۂ ناچیز کے رفیق درس تھے، اور باہم رسم وراہ بھی تھی، دیگر بہت سے شرکائے دورۂ حدیث کی طرح ہم دونوں بھی درس کی تقریریں لکھا کرتے تھے، بالخصوص درس بخاری، اور درس ترمذی جلد اوّل کی درسی تقریروں کو ضبط تحریر میں لانے کا زیادہ اہتمام تھا، اگر کبھی کسی وجہ سے تقریر کا کوئی حصہ ان کے لکھنے سے رہ جاتا تو میری کاپی سے اسے مکمل کر لیتے تھے، اسی طرح اگر مجھ سے کوئی حصہ لکھنے سے چھوٹ جاتا تو میں ان کی کاپی سے اسے نقل کر لیتا تھا، ہم دونوں میں یہ علمی تعاون پورے سال جاری رہا۔

اعظم گڈھ کے سنجیدہ، محنتی اور درس کی پابندی کرنے والے طلبہ میں مولانا کا بھی شمار ہوتا تھا، موصوف زمانۂ طالب علمی میں سیر وتفریح کے عادی نہیں تھے، بالعموم ان کا وقت احاطۂ دارالعلوم ہی میں گزرتا تھا، وفات سے چند سال قبل دیوبند آئے تھے، ملاقات ہوئی تو پرانی یادیں تازہ ہوگئیں، بڑی دیر تک ہم باہم گزرے دنوں کی داستانیں ایک دوسرے کو سناتے رہے، کیا خبر تھی کہ یہ ان سے آخری دید وشنید ہے۔

راہ میں کتنے رفیقانِ سفر چھوٹ گئے ۔۔۔ دیر تک یاد رفیقانِ سفر ساتھ رہی

رفیق محترم ایک صاحب استعداد باصلاحیت عالم دین اور لائق وفائق معلم ومدرس کے ساتھ ایک پاک طینت، نیک نفس، سلیم الفطرت انسان بھی تھے، نسبتاً کم سخن، اور تنہائی پسند تھے، طالب علمی کے زمانہ میں صحت بڑی اچھی تھی، مشرقی یوپی کے طلبہ عام طور پر دیوبند آکر نزلہ وزکام میں گرفتار ہوجاتے ہیں، لیکن انھیں یہاں کی آب وہوا راس آگئی تھی، اس لئے تندرست وتوانا تھے، یہاں جب ایک طویل عرصہ کے بعد دیکھا تو چہرہ مضمحل نظر آیا، اس کی وجہ دریافت کی تو بتایا کہ ذیابطس نے یہ حال بنادیا ہے ورنہ الحمدللہ اور کوئی فکر نہیں ہے، بالآخر اسی موذی مرض نے ان کے نہ صرف دمکتے چہرے کی رنگت بدل دی؛ بلکہ ان کے پورے وجود کو گھلا دیا تھا۔

اُس دیار میں مولانا کے تلامذہ کثیر تعداد میں ہیں، جن میں ایک اچھی تعداد علم دین کی خدمت میں مصروف ہے۔

☆ ☆ ☆

مصادر و مآخذ

١	تذکرہ علمائے ہند	مولانا رحمان علی
٢	تراجم علمائے اہل حدیث	مولانا ابو یحییٰ نوشہری
٣	تذکرہ علمائے مبارک پور	مولانا قاضی اطہر مبارک پوری
۴	نزہۃ الخواطر	مولانا عبدالحیٔ حسنی رائے بریلوی
۵	سرو آزاد	مولانا غلام علی آزاد بلگرامی
٦	تذکرۃ الرشید	مولانا عاشق الٰہی میرٹھی
٧	تجلی نور	مولوی نورالدین زیدی ظفر آبادی
٨	تذکرۃ الشیخین	
٩	تذکرہ کاملانِ رام پور	حافظ احمد علی شوقؔ رام پوری
١٠	مقدمہ دیوانِ احمد عربی	
١١	قاریان ہند	مرزا بسم اللہ بیگ بی، اے
١٢	الحیات بعد الممات	
١٣	احوال علمائے فرنگی محل	
١۴	نفحۃ العنبر	مولانا محمد یوسف بنوری
١۵	حیاتِ انور	مولانا انظر شاہ کشمیری
١٦	فیوضِ عثمانی	
١٧	التاج المکلل	نواب صدیق حسن خاں
١٨	مقدمہ عون المعبود	
١٩	نخبۃ الاخبار من سوانح ابی الانوار	مولانا عبدالغفار

۲۰	مکتوبات حضرت شیخ الاسلامؒ جلد ۲	مولانا نجم الدین اصلاحی
۲۱	تذکرہ مشائخ بنارس	مولانا عبدالسلام نعمانی بنارسی
۲۲	القول الجلی	مولانا محمد حفیظ غازی پوری
۲۳	یادگار سلف	مولانا نجم الدین اصلاحی
۲۴	تذکرہ علمائے حال	مولانا محمد ادریس نگرامی
۲۵	حیاتِ شبلی	مولانا سیّد سلیمان ندوی
۲۶	رسالہ عاشقیہ قلمی (مملوکہ مولانا نجم الدین اصلاحی)	شیخ عارف
۲۷	بحر ذخار قلمی (مملوکہ دائرہ محمدی شاہ الٰہ آباد)	شیخ وجیہہ الدین اشرف لکھنوی
۲۸	مظہر الاحدیہ	مولوی عبدالاحد ظفر آبادی
۲۹	تذکرۃ العلماء	مولوی خیر الدین جونپوری
۳۰	تذکرہ الخلیل	مولانا عاشق الٰہی میرٹھی
۳۱	ظفر المحصلین	مولانا محمد حنیف گنگوہی
۳۲	بحر العلوم	محمد یوسف کوکن عمری ریڈر شعبۂ عربی فارسی مدراس یونیورسٹی
۳۳	قصص الجمیل فی سوانح الخلیل	خلیل الرحمن فاروقی
۳۴	شعر غیر شعر اور نثر	ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی
۳۵	تذکرہ مشاہیر پورہ معروف	مولانا محمد عثمان معروفی
۳۶	چراغِ حکمت	احمد مکرم عباسی چریاکوٹی
۳۷	حیاتِ طاہر	مولانا محمد عثمان معروفی
۳۸	اصول المقصود	شیخ تراب علی قلندر کاکوروی
۳۹	فصول مسعودیہ	شاہ مسعود علی قلندر الٰہ آبادی
۳۸	انتصاح عن ذکر اہل الصلاح	شاہ حافظ علی انور قلندر کاکوروی
۳۹	حیاتِ ولی	مولانا شاہ فخر الدین گھوسوی
۴۰	تذکرہ مولانا عبداللطیف	مولانا ظفیر الدین مفتاحی

۴۱	نوادرات	حافظ اسلم جیراج پوری
۴۲	مکاتیبِ شبلی خط نمبر ۲۵	علامہ شبلی نعمانی
۴۳	حسن العزیز	مواعظِ حضرت تھانویؒ
۴۴	اخبار الاخیار	شاہ عبدالحق محدّث دہلوی
۴۵	سفینۃ الاولیاء	شاہزادہ دارا شکوہ
۴۶	خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر	شیخ محمد امین شامی
۴۷	مآثر الکرام	مولانا غلام علی آزاد بلگرامی
۴۸	سبحۃ المرجان	مولانا غلام علی آزاد بلگرامی
۴۹	گنج ارشدی قلمی	ملفوظات شیخ ارشد جون پوری جامع شیخ نصرت جمال
۵۰	روزنامچہ قلمی	از مولانا محمد نصیر گھوسوی
۵۱	بیاض خاص	مولانا علی احمد کوریا پاری سرائے میری
۵۲	بیاض	مولانا شبلی نندانوی
۵۳	رجسٹر مدرسہ جامع العلوم کان پور	
۵۴	معارف اعظم گڈھ شمارہ مارچ ۱۹۵۰ء	مدیر شاہ معین الدین ندوی
۵۵	ماہنامہ البلاغ بمبئی تعلیمی نمبر فروری ۱۹۷۰ء	مدیر قاضی اطہر مبارک پوری
۵۶	معارف شمارہ دسمبر ۱۹۷۵ء	سید صباح الدین
۵۷	رسالہ صوفی بنارس شمارہ جولائی ۱۹۵۵ء	ذکی اللہ اسد القادری
۵۸	اسلام اور عصر جدید شمارہ جولائی ۱۹۷۳ء	ڈاکٹر عبداللطیف اعظمی
۵۹	الاصلاح	مدیر مولانا امین احسن اصلاحی
۶۰	البلاغ کراچی شمارہ شوال ۱۳۸۷ھ	مدیر مولانا امین احسن اصلاحی

☆☆☆

تذکرہ علمائے اعظم گڈھ

☆ خطۂ اعظم گڈھ کی مختصر معلومات افزا تاریخ

☆ آٹھویں صدی ہجری سے پندرہویں صدی تک کی
تعلیمی وثقافتی فکر انگریز داستان

☆ شخصیات، خدمات اور کارناموں کا مستند عارف

☆ محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی،
فاضل گرامی مولانا نجم الدین اصلاحی
اور مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کی
تقریظ وتقدیم سے مزین کتاب

☆ بافیض عالم دین مولانا اعجاز احمد اعظمی کی سند تائید وتصدیق

☆ تالیف لطیف مشہور صاحب علم وقلم عالم مولانا حبیب الرحمٰن
اعظمی، استاذ حدیث دار العلوم دیوبند
ومدیر ماہنامہ دار العلوم دیوبند

مرکز دعوۃ وتحقیق دیوبند